سلسلہ فتاوی علمائے اہلِ حدیث 2

مجموعہ فتاویٰ

اُستاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ مُحدّث غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ

(1260-1337ھ)



تحقیق وتخریج

حافظ شاہد محمود
فاضل مدینہ یونیورسٹی

دار ابی الطیب
للنشر والتوزیع



سلسلہ فتاوی علمائے اہلِ حدیث

مجموعہ فتاویٰ

اُستاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ مُحدّث غازی پُوری رحمۃ اللہ علیہ

(1337-1260ھ)



تحقیق وتخریج

حافظ شاہد محمود

فاضل مدینہ یونیورسٹی

دار ابی الطیب
نشر و توزیع

گل روڈ، حمید کالونی، گلی نمبر 5، گوجرانوالہ
055-3823990, 0321-6466422

سلسلہ فتاوی علمائے اہلِ حدیث (2)

مجموعہ فتاویٰ

اُستاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ مُحدث غازی پوری رحمہ اللہ
(1260-1337ھ)

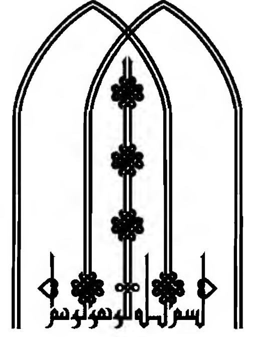
اشاعت اول .... فروری 2015

تعداد 1100

دار ابی الطیب
للنشر والتوزیع

گل روڈ جدید کالونی گلی نمبر 5۔ گوجرانوالہ

055-3823990, 0321-6466422





مجموعہ فتاویٰ

آہ! عبداللہ فنا فی اللہ شد

یہ وہ فقرہ ہے، جو مولوی عبداللہ صاحب غزنوی رحمہ اللہ کے انتقال پر حضرت میاں صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے قلم سے نکلا تھا۔ جسے آج ہم عبداللہ ثانی رحمہ اللہ کے حق میں لکھتے ہیں، یعنی حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری مرحوم و مغفور۔ مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری ایک ہفتہ ہی بیمار رہ کر ۲۶/ نومبر کو ۳ بجے دوپہر کے فوت ہوگئے۔ انا للہ۔

آہ مرحوم! مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کو جن لوگوں نے دیکھا، ان کو تو معلوم ہوگا، مگر جنھوں نے نہیں دیکھا، وہ یہ سمجھیں کہ جن سلف صالحین کو ہم سنا کرتے ہیں، ان کا نمونہ حافظ صاحب موصوف تھے۔ ایسے بے نفس کہ کیا مجال کسی مقابلے میں آپ کو طیش آجائے یا کسی مخالف کی گالی گلوچ کا بدلہ لیں۔ باوجود جامع معقول و منقول عالم ہونے کے کیا مجال کہ کبھی کوئی امتیازی صورت یا نشست تلاش کریں۔ آپ کی صحبت متکبر علما کے لیے اکسیر تھی۔ آپ اتنے کم گو تھے کہ ضرورت سے بھی زیادہ۔ آپ کے فضائلِ علمی کا ثبوت اس سے کیا زیادہ ہوگا کہ سیکڑوں علما آپ کے شاگرد جامع اس وقت کام کر رہے ہیں۔ آپ اہلِ حدیث کانفرنس کے بانیوں میں سے پہلے صدر کانفرنس تھے۔ کہاں تک مَیں لکھوں کہ آپ کیا تھے؟ مَیں تو آپ کو دیکھ کر سیر نہیں ہوتا تھا۔ جن لوگوں نے حضرت عبداللہ غزنوی مرحوم کو دیکھا ہے، وہ سمجھیں کہ حافظ صاحب؛ عبداللہ ثانی تھے۔ فرق اتنا تھا کہ حضرت غزنوی ہر وقت مستغرق فی اللہ رہتے تھے اور حافظ صاحب غازی پوری مشغول فی اللہ۔ حافظ صاحب مرحوم کے انتقال سے وہ مجمع علماے کرام یاد آیا، جو آرہ وغیرہ مقامات پر جمع ہوا کرتا تھا تو دیر تک میں روتا رہا اور میرے منہ پر یہ مصرع جاری تھا:

واحسرتا یارانِ من تنہا مرا بگذاشتند [1]

شیخ الاسلام مولانا ثناء امرتسری رحمہ اللہ (۱۸۶۸۔ ۱۹۴۸ء)

---

[1] ہائے افسوس! میرے دوستوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ (ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر، ۶/ دسمبر ۱۹۱۸ء)

''جناب مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کا واقعۂ وفات علما کے طبقہ میں خاص حیثیت سے اثر انگیز ہے۔ مولانائے مرحوم نے گو طبعی عمر پائی، لیکن اس خیال سے کہ وہ اس عہد میں اگلی صحبتوں کے تنہا یادگار تھے، ہم ان کے لیے اس سے دراز عمر کے متوقع تھے۔ مولانا اتباعِ سنت، طہارت وتقویٰ، زہد و ورع، تبحرِ علم، وسعتِ نظر اور کتاب و سنت کی تفسیر و تعبیر میں یگانۂ عہد تھے۔ اپنی عمر کا بڑا حصہ انھوں نے علومِ دینیہ خصوصاً کتابِ مجید اور حدیث شریف کے درس و تدریس میں گزارا اور سیکڑوں طلبا ان کے فیضِ تربیت سے علما بن کر نکلے۔ ابتداءً چشمۂ رحمت غازی پور میں، پھر مدرسہ احمدیہ آرہ میں اپنا مسندِ درس بچھایا۔ آخر عمر میں دلّی کے دار الحدیث میں قیام فرمایا، لیکن خانگی حوادث کے باعث پریشان حال رہے۔ اب افسوس کہ یہ شمعِ نور و ہدایت ۲۱/ صفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۶/ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ.

''مجھے لکھنؤ میں مولانا سید عبدالحی صاحب ناظم ندوہ کی قیام گاہ پر مولانا سے ملاقات کی سعادت ایک دو دفعہ حاصل ہوئی۔ دبلے، پتلے، نحیف، ڈاڑھی کے بال خفیف، سادی وضع، صورت سے متواضع اور حلیم معلوم ہوتے تھے۔

''مرحوم کا اصلی وطن گو مئو ضلع اعظم گڑھ تھا، مگر قیام بیشتر غازی پور میں رہا، اس لیے غازی پوری کے نام سے شہرت پائی۔ ابتدائی تعلیم چشمۂ رحمت غازی پور میں ہوئی۔ یہاں مولوی رحمت اللہ صاحب غازی پوری اور مولوی فاروق صاحب چریاکوٹی سے پڑھا، پھر جونپور جا کر مدرسۂ امام بخش میں مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے درسیات پڑھیں اور آخر میں حدیث کی کتابیں مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی سے پڑھیں اور مسلک میں انھیں کی تعلیم کا اثر ان پر غالب ہوا۔''[1]

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ (۱۸۸۴۔۱۹۵۳ء)

[1] یادِ رفتگاں (ص: ۴۰)

مقدمہ فتاویٰ جناب حافظ محمد عبداللہ صاحب غازیپوری رحمۃ اللہ علیہ

(۱) بعض فتاویٰ ایسے درج مسودہ ہیں جنکے سوالات مذکور نہیں ہیں لیکن جوابات سے سوالات معلوم ہو جاتے ہیں ایسے فتووں کے متعلق اپنی طرف سے سوالات قائم کرکے جوابات نقل کئے گئے ہیں۔

(۲) اس مجموعہ میں حافظ صاحب کے بعض ایسے فتوے بھی درج ہیں جو ان کے بعض دوسرے فتوی کے مخالف ہیں ایسی صورت میں فقط وہی فتوی نقل کیا گیا ہے جو محقق و مدلل اور صحیح معلوم ہوا ہے۔ دیکھو فتوی نمبر ۱۱۳ صفحہ ۱۲۵/۱۲ و صفحہ ۶۲/۱۲ فتوی نمبر ۳۵۔

(۳) اس مجموعہ میں فرائض کے بہت سے مسئلے درج ہیں وہ کل نقل نہیں کیے گئے ہیں صرف وہی فتوے نقل ہوئے ہیں جنمیں تقسیم کے علاوہ علم فرائض کے متعلق کوئی مفید مضمون بھی واقع ہے

(۴) اس مجموعہ کے متعدد فتاویٰ کی تصحیح علمائے ذیل نے کی ہے۔ ابوالعلی محمد عبدالرحمن مبارکپوری۔ ابوالہدیٰ سلامت اللہ مبارکپوری۔

ابوالعلی محمد عبدالرحمن سے مراد یہ خاکسار ہے۔ اور ابوالھدی سلامت اللہ سے مراد مولوی عبدالسلام صاحب مبارکپوری مصنف سیرۃ البخاری ہیں۔

(۵) جیسا کہ بہت سے تلامذہ متقدمین نے اپنے شیوخ کبار متقدمین کی رائے و اجتہاد سے موافقت نہیں کی ہے اسیطرح بعض بعض فتووں میں مجھ ناچیز کی رائے حضرت شیخنا المکرم مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری کی رائے سے بھی موافق نہیں ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں حضرت شیخنا المکرم کا فتوی نقل کرنے کے بعد میں نے اپنی رائے بھی ظاہر کردی ہے۔

(۶) اس مجموعہ میں ایسے متعدد فتاوی بھی درج ہیں جو نہ حافظ صاحب کے لکھے ہوئے ہیں اور نہ انپر حافظ صاحب کی تصحیح ہے ~~پس ان فتووں کو بھی نقل کر دیا گیا ہے~~ ان میں سے فقط وہی فتاوے نقل کیے گئے ہیں جو میرے نزدیک مدلل اور صحیح تھے اور میں نے انکی تصحیح بھی کردی ہے۔

(۷) میں نے بعض بعض ابواب میں بعنوان تکمیل بعض بعض اپنے فتاوی بھی نقل کردے ہیں۔

(۸) جناب حافظ صاحب کے بعض بعض فتاوی کے مخالف بعض دیگر اکابر علمائے اہلحدیث کے فتاوی واقع ہوئے ہیں ایسی صورت میں ان دیگر اکابر علماء اہل حدیث کے فتوی بھی نقل کردے گئے ہیں

(۹) بعض بعض فتاوی میں اجمال یا اختصار واقع ہوا ہے ایسے فتووں کی تشریح و تفصیل میں نے اپنی طرف سے بعنوان "ھو الموفق" کردی ہے۔

(۱۰) جس قدر عبارات کتب حدیث و فقہ فتووں کے اندر درج ہیں ہر ایک عبارت کا مقابلہ اصل کتاب سے غور سے کر لیا گیا ہے۔

(۱۱)

اس نمبر ۶ پر غور کر کے ... [illegible]

مقدمہ فتاویٰ از قلم علامہ محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری

والاعتصام بالكتاب والسنۃ والاجتناب

کتاب الایمان

سوال۔ بادیہ قوم کو جو ملک بنگال میں آباد ہیں مسلمان بنا کر انکے ساتھ کھانا پینا کیسا ہے اور مسلمان بنانیوالا اسلام سے خارج ہو جائیگا یا مستحق ثواب ہوگا۔

الجواب۔ بادیہ قوم کو مسلمان کرنے کی وجہ سے مسلمان کرنیوالے اور ان نومسلموں کے ساتھ کھانے پینے والے از روے شرع شریف ﷺ پکے اور عمدہ مسلمان ہیں اور وہ اس وجہ سے دین مسلمانی سے نکل تو کیا جائینگے بلکہ اسلام میں بہت کچھ ترقی کر گئے۔ اسلئے کہ شرع شریف کا یہ قانون ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو کسی اچھے کام کی ہدایت کرتا ہے تو جتنے لوگ اس ہدایت کی پیروی کرتے ہیں ان سب کے ثواب کے برابر اس ہدایت کرنے والے کو ثواب ملتا ہے اور ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم نہیں کیا جاتا (دیکھو مشکوۃ شریف چھاپہ دہلی انصاری صـ۲۱) تو اس قانون کی رو سے جن مسلمانوں نے بادیہ قوم کو اسلام کی ہدایت کی اور وہ قوم انکی ہدایت سے مسلمان ہوگئی اور اپنے ان ناجائز افعال سے جو قبل اسلام کے کرتے تھے تائب ہوگئی اور ان افعال کو ترک کر دیا اس قوم کے مسلمان ہو جانے اور ناجائز افعال سے تائب ہو جانیکا جسقدر ثواب ہوا ان سب کے ثواب کے برابر ان مسلمان کرنیوالوں کو ثواب ملا تو ان مسلمان کرنے والوں نے مسلمان کرنیکی وجہ سے اپنے اسلام میں بہت کچھ ترقی کی۔ اور قوم بادیہ یا اور کسی قوم کو مسلمان کرنے سے دین اسلام میں کسی قسم کے عیب و نقص کا داغ نہیں لگ سکتا بلکہ قرآن مجید میں خداے پاک نے ہمارے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین اسلام کی طرف کل آدمیوں کو بلانے اور اسکی منادی کرنیکا حکم صادر فرمایا ہے (دیکھو قرآن مجید سورہ اعراف رکوع ۱۹ پارہ ۹) اور از روے قانون اسلام کے درباب مسلمان کرنیکے کسی قوم کی تخصیص نہیں ہے قانون اسلام کی رو سے ہر قوم اور ہر شخص اسلام میں داخل ہو سکتا ہے اور اسلام کی نعمتوں اور برکتوں کو پا سکتا ہے (دیکھو قرآن مجید سورہ بقرہ رکوع ۸ پارہ ۱) اور بھی قرآن میں یہ فرمایا ہے کہ کل آدمی ایک مرد اور ایک عورت کر بنائے گئے ہیں اور یہ فرمایا ہے کہ ان میں سے جو جتنا ہی خدا سے پاک سے ڈریگا اتنا ہی خداے پاک کے نزدیک وہ عزت پائیگا (دیکھو قرآن مجید سورہ حجرات رکوع ۲ پارہ ۲۶) اور جو لوگ قوم بادیہ کو مسلمان کرنے والوں اور ان کے ساتھ کھانے پینے والوں کو اسوجہ سے ستاتے اور ایذا پہونچاتے ہیں اور انکو دین اسلام میں عیب لگانیوالا اور اسلام کو نقصان پہونچانیوالا کہتے ہیں قانون اسلام کے سراسر خلاف کرتے ہیں اور دائرہ اسلام کو جو نہایت وسیع ہے تنگ بنانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بادیہ قوم کو مسلمان کرنیوالوں نے تو

مجموعہ فتاویٰ کے پہلے صفحہ کا عکس

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله محمد وآله وأصحابه أجمعين
أما بعد فإن المولوي محمد موسى بن محمد علي المتوطن تبت
قد قرأ علي ترجمة القرآن المجيد وفرقان الحميد وصحيح البخاري وصحيح مسلم
وسنن أبي داود وترمذي وابن ماجة ونسائي قد قرأ كلهن
فلأن يشتغل بإقراء هذه الكتب المذكورة وتدريسها لأنه أهلها
وأحق بها حرره أذل خلق الله محمد عبد الله عفى الله عنه في الدنيا والآخرة



إجازة الرواية بخط المحدث الحافظ محمد عبدالله الغازيفوري للشيخ محمد موسىٰ البلتستاني[1]

---

[1] حضرت مولانا محمد موسیٰ بلتستان کے رہنے والے تھے۔ حضرت میاں صاحب محدث دہلوی سے بھی انھیں اجازۃ حاصل تھا اور حضرت حافظ غازی پوری صاحب سے بھی۔ یہ بلتستان میں جماعت اہلِ حدیث کے بانیوں میں سے تھے۔ رحمه الله رحمة واسعة. [عارف جاوید محمدی]

بسم الله الرحمن الرحيم

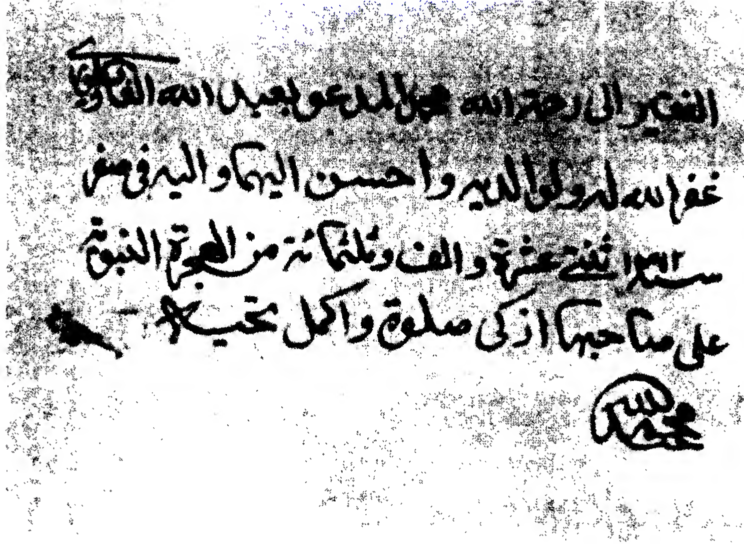
نحمد الله العلي العظيم ونصلي ونسلم على رسوله الكريم
وعلى آله وصحبه ذوي الفضل الجسيم - اما بعد
فقد قرأ علي حبي في الله محمد الشهير بادريس سلمه الله
ابن الشيخ العلامة ناشر الوية السنة النبوية في البلاد
الهندية مولانا ابي الطيب محمد شمس الحق العظيم ابادي
الديانوي اطرافا من صحيح البخاري ومسلم وموطا مالك
وسنن ابي داود وسنن الترمذي وسنن النسائي
وسنن ابن ماجة وسنن الدارقطني وسنن الدارمي
ومسند الشافعي والادب المفرد للبخاري رحمهم الله
وطلب مني الاجازة وان كنت لست اهلا لذلك
فاجزته بكل ما وصفت وبكل ما انبأني واجازني به
من كتب متون الحديث وشروحه واصوله وكتب
التفسير وما يتعلق به وكتب الفقه واصوله شيخان

إجازة الرواية بخط المحدث الحافظ محمد عبدالله الغازيفوري

للشيخ محمد إدريس بن شمس الحق العظيم آبادي

الاجلان الاجلان اولهما المحدث الفقيه
شيخ العرب والعجم مولانا العلامة السيد
محمد نذير حسين الدهلوي متع الله المسلمين
ببقائه وثانيهما الشيخ العلامة زينة اهل
الاستقامة مولانا السيد عباس بن عبد الرحمن
ابن محمد بن الحسين [illegible] اليمني الشهاري اما إسناد
شيخنا الاول فموجود عندي واما شيخنا الثاني
فهو يروي عن شيخ الاسلام البدر الرباني التمام
مولانا العلامة القاضي محمد بن علي الشوكاني رحمه الله
عن مشائخه الكرام اعلى الله درجاتهم في دار السلام
مذكورة في اتحاف الاكابر في اسناد الدفاتر
واوصيه بتقوى الله في السر والعلن ومتابعة المصطفى
صلى الله عليه وعلى اله وسلم ظاهرا وباطنا وان ينسانى
ومشائخي من صالح دعواته في خلوات الاجابات
ولا سيما بعد الصلوات قاله بفمه وكتبه بيده

[illegible]



الفقير الى رحمة الله محمد المدعو بعبد الله الغازيفوري
غفر الله له ولوالديه واحسن اليهما واليه في صفر
سنة اثنتي عشرة والف وثلثمائة من الهجرة النبوية
على صاحبها ازكى صلوة واكمل تحية
محمد عبد الله

فہرست مضامین

كتاب الطهارة



کتاب الصلاۃ

کتاب الجنائز

کتاب الزکاۃ والصدقات

كتاب الصوم

كتاب الحج

كتاب النكاح

کتاب الطلاق و الخلع



کتاب الحدود

کتاب الوقف

کتاب البیوع

کتاب الصید و الذبائح



كتاب الأطعمة

كتاب اللباس والزينة

كتاب الأدب

كتاب الحظر و الإباحة

کتاب الوصایا

کتاب الفرائض



مقدمة التحقیق

استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ صاحب محدث غازی پوری رحمہ اللہ (۱۸۴۴۔ ۱۹۱۸ء) برصغیر کے اکابر علمائے دین میں بلند مقام کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علومِ دینیہ کے درس و تدریس میں گزارا اور بے شمار لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا۔ ہندوستان میں جب دسمبر ۱۹۰۶ء کو جماعت اہلِ حدیث کی اولین تنظیم ''آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس'' آرہ شہر میں معرضِ وجود میں آئی تو بڑے بڑے نامور علما کی موجودگی میں آپ ہی کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا تھا اور تاحیات آپ اس مقتدر جماعت کے عہدۂ صدارت پر فائز رہے۔

آپ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) کو ضلع اعظم گڑھ کے شہر مئو میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش میں واقع ہے۔ آپ نے سب سے پہلے بارہ سال کی عمر میں قرآنِ مجید حفظ کیا، پھر حصولِ علم کے لیے غازی پور اور جون پور گئے اور وہاں کے بعض اساتذہ سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں دہلی جا کر میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے کتبِ حدیث پڑھیں۔ ۱۲۹۷ھ میں حج کے لیے حجاز گئے اور وہاں امام شوکانی کے شاگرد علامہ عباس بن عبدالرحمٰن یمنی سے سندِ حدیث لی۔ آپ نے منگل کے روز دو پہر تین بجے ۲۱ / صفر ۱۳۳۷ء (۲۶ / نومبر ۱۹۱۸ء) کو لکھنو میں وفات پائی۔[1]

حضرت حافظ صاحب غازی پوری رحمہ اللہ مختلف مقامات پر درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ آپ نے غازی پور، آرہ، دہلی اور لکھنؤ میں سالہا سال علومِ نقلیہ وعقلیہ کا درس دیا اور بے شمار علمائے کرام نے آپ سے کسبِ فیض کیا، جن میں اپنے دور کے بڑے بڑے نامور مدرسین اور مصنفین شامل ہیں۔ ہندوستان میں میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے بعد ان کے دو ہی شاگردوں کو تلامذہ کا اتنا بڑا حلقہ میسر آیا۔ ایک تھے محدثِ پنجاب حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی اور دوسرے حضرت حافظ صاحب غازی پوری رحمہما اللہ۔ سالہا سال علوم وفنون کے درس و تدریس کا نتیجہ تھا کہ آپ اس دور کے متداول علوم میں رسوخ کے مالک اور علما وعوام کے لیے مرجع کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ عوام تو عوام بڑے بڑے نامی گرامی علمائے دین بھی بعض مسائل کی توضیح و تفہیم کے لیے آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔

تراجم علمائے حدیث کے مصنف ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی بیان کرتے ہیں کہ صاحبِ عون المعبود علامہ شمس الحق

[1] نزھة الخواطر (۸/ ۳۰۵۔ ۳۰۷) گلستانِ حدیث (ص: ۱۳۵) نیز دیکھیں: ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۶ / دسمبر ۱۹۱۸ء) تراجم علمائے حدیث ہند (ص: ۴۵۹)

(وفات ۱۳۴۹ھ) نے چند علما کے سامنے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ میرے کتب خانے میں منطق کی ایک بہت پرانی کتاب تھی۔ عبارت کی پیچیدگی کے ساتھ مسائلِ منطقیہ کا بیان کچھ ایسا تھا کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جناب حافظ صاحب اتفاق سے ڈیانواں تشریف لائے۔ میں نے وہ کتاب دکھا کر کہا کہ چیستاں معلوم ہوتی ہے۔ حافظ صاحب نے کتاب کے چند اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے تو فرمایا: کوئی ایسی بات نہیں، مسائل وہی ہیں، عبارت ذرہ پیچیدہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی مضامین کا مطلب عام فہم الفاظ میں بیان فرما دیا۔[1]

زیرِ نظر فتاویٰ میں سید الاتقیاء مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ (وفات ۱۳۳۱ھ) اور دیگر کئی اکابر علما کے استفسارات بھی شامل ہیں، جو انھوں نے حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں جواب کے لیے ارسال کیے۔ بعض مواقع پر تو آپ کو علماے کرام کے مابین اختلافی مسائل میں حَکَم بنایا گیا، جیسے آرہ میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی (وفات ۱۳۲۹ھ) اور شاہ عین الحق پھلواری (وفات ۱۳۳۳ھ) کے ساتھ آپ بھی مشہور ثنائی غزنوی نزاع میں منصفین میں شامل تھے۔ نیز اس مجموعہ میں بعض مسائل پر آپ کے وہ فتاویٰ بھی مندرج ہیں، جو بعض علما کی طرف سے نزاع کے وقت فیصلے کے لیے آپ کی خدمت میں ارسال کیے گئے، جو حضرت حافظ صاحب کے رسوخ فی العلم اور جماعتِ علما میں بلند مرتبت ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ مزید برآں حضرت حافظ صاحب کے فتاویٰ میں ان کے جوابات اور ان کی دیگر کتب کو پڑھ کر یقین کامل ہو جاتا ہے کہ آپ کو جملہ علومِ دینیہ میں رسوخ و اتقان حاصل تھا اور تفسیر و حدیث اور فقہ و ادب میں تو آپ بلاشبہہ درجۂ امامت پر فائز تھے۔

تراجم علماے حدیث کے نامور مصنف ابو یحییٰ امام خان نوشہروی رقم طراز ہیں:

''جن کی ذات پر علم کو فخر اور عمل کو ناز تھا۔ تدریس جن کے دم سے زندہ تھی۔ اساتذہ جن پر اس قدر نازاں کہ حضرت شیخ الکل جناب میاں صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے: ''میرے درس میں دو عبداللہ آئے ہیں: ایک عبداللہ غزنوی، دوسرے عبداللہ غازی پوری۔'' جناب مستطاب استاذ الاساتذہ مولانا حافظ عبداللہ صاحب رحمہ اللہ کی ذات مستجمع الصفات جن مغتنمات میں سے تھی، اس کا یہ بالکل مختصر مرقع ہے کہ آپ جس زمانے میں مدرسہ ''احمدیہ'' آرہ میں تھے، روزانہ بانکی پور تشریف لے جاتے، درسِ قرآن میں وکلا اور بیرسٹر حاضر ہونا اپنے لیے سعادت سمجھتے۔ تدریس کی ہمہ گیری کا کیا ذکر، جس درس سے مولانا محمد سعید بنارسی جیسے کامل الفن مستفیض ہوئے۔ مولانا عبدالنور صاحب (حاجی پوری مظفر پوری) جیسے ماہر نکلے۔ حضرت شاہ عین الحق جیسے صاحبِ علم و عمل نے جن سے استفادہ کیا۔ مولانا عبدالسلام مرحوم (مبارک پوری) جیسے بزرگ نے جن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے۔ مولانا عبدالرحمٰن (مبارک پوری) صاحبِ ''تحفۃ الاحوذی''

[1] تراجم علماے حدیث ہند (ص: ۴۶۰، ۴۶۱) نیز دیکھیں: ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' امرتسر (۴؍ ربیع الاول ۱۳۴۸ھ)

نے جن سے اکتساب کیا۔ ایسے تبحر عالم کی تو مستقل سوانح حیات لکھنا چاہیے تھی، چہ جائے کہ ان اوراق میں ان کے متعلق چند اشارات پر اکتفا کر لیا جائے۔" [1]

مجموعہ فتاویٰ:

حضرت حافظ صاحب غازی پوری رحمہ اللہ کے فتاویٰ کا یہ مجموعہ سب سے پہلے ان کے لائق شاگرد مولانا محمد عبدالرحمن محدث مبارکپوری (وفات ۱۹۳۵ء) نے جمع کیا اور متعدد مقامات پر فتاویٰ کے بعد اضافی نوٹ لکھے۔ بعض مقامات پر تو مستقل فتاویٰ بھی لکھے، جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوری رحمہ اللہ (وفات ۱۹۲۴ء) نے بھی ان فتاویٰ کی تصحیح میں حصہ لیا ہے، جیسا کہ مولانا عبدالرحمن مبارک پوری نے اس مجموعہ فتاویٰ کے آغاز میں اپنے مقدمہ میں صراحت کی ہے، بعد ازاں ان کے ایما پر مولانا عبدالصمد مبارک پوری حسین آبادی رحمہ اللہ (وفات ۱۹۴۸ء) نے ازسرِنو اس مجموعہ کو مرتب کیا، جس پر مولانا عبدالرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ نے نظر ثانی کی اور جابجا ہدایات اور اصلاحی تجاویز رقم کیں۔ بعض مقامات پر مولانا حکیم عبدالسمیع مبارک پوری رحمہ اللہ (وفات ۱۹۸۶ء) کے چند حواشی بھی مذکور ہیں، جو انھی کے نام سے زیرِنظر طباعت میں درج کر دیے گئے ہیں۔

اس مجموعے کے علاوہ بھی ہمیں حضرت حافظ صاحب کے متعدد فتاویٰ دستیاب ہوئے تھے، جنھیں مناسب حال مقامات پر درج کیا گیا ہے اور حواشی میں ان کے مصادر کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

زیرِنظر مجموعہ میں پانچ صد سے زیادہ فتاویٰ شامل ہیں، جن میں عقائد، عبادات اور معاملات کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ذیل میں ان فتاویٰ کی اجمالی تعداد درج کی جاتی ہے، تاکہ ان کے عناوین کو دیکھ کر فتاویٰ کا ایک اجمالی خاکہ ہمارے سامنے آجائے:

1	كتاب الإيمان:	18 فتاویٰ۔	2	كتاب العلم:	8 فتاویٰ۔
3	كتاب الطهارة:	10 فتاویٰ۔	4	كتاب الصلاة:	116 فتاویٰ۔
5	كتاب الجنائز:	13 فتاویٰ۔	6	كتاب الزكاة والصدقات:	14 فتاویٰ۔
7	كتاب الصوم:	8 فتاویٰ۔	8	كتاب الحج:	4 فتاویٰ۔
9	كتاب النكاح:	101 فتاویٰ۔	10	كتاب الطلاق والخلع:	71 فتاویٰ۔
11	كتاب الحدود:	3 فتاویٰ۔	12	كتاب الوقف:	7 فتاویٰ۔
13	كتاب البيوع:	55 فتاویٰ۔	14	كتاب الصيد والذبائح:	3 فتاویٰ۔
15	كتاب الأطعمة:	10 فتاویٰ۔	16	كتاب اللباس والزينة:	7 فتاویٰ۔

[1] تراجم علمائے حدیث ہند (ص: ۲۶۰)

(17) **كتاب الأدب:** 11 فتاویٰ۔ (18) **كتاب الحظر والإباحة:** 24 فتاویٰ۔

(19) **كتاب الوصايا:** 3 فتاویٰ۔ (20) **كتاب الفرائض:** 30 فتاویٰ۔

زیرِ نظر مجموعہ میں ہمیں بعض مختصر فتاویٰ بھی پڑھنے کو ملیں گے اور مفصل بھی۔ حضرت حافظ صاحب عموماً فتویٰ لکھنے میں حسبِ ضرورت طوالت و اختصار سے کام لیتے ہیں۔ بعض فتاویٰ چند سطری ہیں، لیکن بیشتر مقامات پر آپ تفصیل سے فتویٰ رقم کرتے ہیں، جس میں قرآنِ مجید کی آیات، احادیثِ مبارکہ اور فقہ وغیرہ کی طویل عبارتیں بھی درج فرماتے ہیں اور ان سے استدلال کی نوعیت ذکر کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر خداداد ملکہ اجتہاد سے مسائل کی خوب توجیہ و تعبیر بیان کرتے ہیں تو بعض مواقع پر علمائے سابقین اور فقہا کے استدلالات کے سقم پر بھی تنبیہ فرماتے ہیں۔

اسلوبِ تحقیق:

1. زیرِ نظر مجموعہ میں آیات کے ساتھ سورتوں کے نام اور ان کی ترقیم کا اہتمام کیا گیا ہے، کیوں کہ مولف رحمہ اللہ نے عموماً آیات کو سورت کے نام اور آیت نمبر کے بغیر ہی ذکر کیا تھا۔
2. تمام احادیث و آثار کی مقدور بھر تحقیق و تخریج کی گئی ہے۔ جس حدیث کے ضعف کی علت و سبب پر اطلاع ہوئی، اسے اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، کیوں کہ عصرِ حاضر میں قلتِ علم اور انتشارِ جہل کے سبب اگر کسی ضعیف یا موضوع روایت کا ذکر سببِ وضع یا علتِ ضعف کو بیان کیے بغیر کیا جائے تو اس کے نتیجے میں کئی طرح کے مفاسد اور نقصانات کے جنم لینے کا اندیشہ ہوتا ہے۔[1]
3. فتاویٰ کا یہ مجموعہ مختلف کتب کے عناوین کے تحت مرتب تھا، جسے مزید سہولت اور استفادے میں آسانی کی خاطر مختلف کتب و ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور تمام فتویٰ جات کے آغاز میں عناوین اور سرخیاں درج کی گئی ہیں۔
4. تمام آیات، احادیث و آثار اور عربی و فارسی عبارات و اَشعار کا ترجمہ کیا گیا ہے اور انھیں بریکٹوں [ ] کے درمیان درج کیا گیا ہے۔
5. فتاویٰ میں منقول تمام عبارات کا حتی الامکان اصل مصادر و مراجع کو مدنظر رکھتے ہوئے مقارنہ کیا گیا ہے، جس کی بدولت کئی اَغلاط کی تصحیح ہوگئی ہے۔
6. بعض مقامات پر حسبِ ضرورت تعلیقات و حواشی بھی رقم کیے گئے ہیں۔

---

[1] افسوس کہ عصرِ حاضر میں بعض لوگ سلفِ امت اور ائمہ محدثین کی اِتباع پر مبنی اس طرزِ عمل کو بڑا ناروا اور غیر محمود سمجھتے ہیں، بلکہ حفاظتِ حدیث کی اساس پر قائم اس منہج پر مختلف طریقوں سے اظہارِ نفرین کرتے رہتے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ بسا اوقات اس طنز و تشنیع میں پیش پیش وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اس فن کے اصول و قواعد سے ناواقف اور اس علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور ان

7. جہاں جہاں مولف رحمہ اللہ نے حواشی لکھے تھے، ہم نے انھیں برقرار رکھا ہے اور ان کے آخر میں اس کی صراحت کر دی ہے۔

اظہارِ تشکر:

سب سے پہلے ہم اللہ رب العزت کے شکر گزار ہیں، جس کے فضل و احسان کی بنا پر ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد ہمیں اس علمی خزینے کی خدمت و اِشاعت کی توفیق میسر آئی، پھر ہم ان تمام اَحباب و اِخوان کے ممنون ہیں، جنھوں نے کسی بھی مرحلے پر ہماری معاونت اور حوصلہ افزائی کی ہے۔خصوصاً فضیلۃ الشیخ فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ (مدیر لجنۃ القارۃ الہندیہ، کویت) اور محترم المقام مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ ہمارے خصوصی شکریے کے سزاوار ہیں، جن کے تعاون اور سرپرستی کی وجہ سے اس علمی تراث کا احیا عمل میں آیا۔ مجموعہ فتاویٰ کا یہ قلمی نسخہ ہمیں شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری رحمہ اللہ کے فرزندِ ارجمند فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن رحمانی مبارک پوری حفظہ اللہ، محترم مولانا عبداللطیف اثری حفظہ اللہ اور فضیلۃ الشیخ مولانا مظہر حسن ازہری (جامعہ عالیہ عربیہ، مئو ناتھ) نے فراہم کیا ہے، جس پر ہم ان کے بے حد ممنون ہیں۔ میں استادِ محترم فضیلۃ الشیخ حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ کا بھی شکر گزار ہوں، جن کی علمی معاونت تمام مراحل میں شاملِ حال رہی۔

اللہ تعالیٰ انھیں اور دیگر تمام معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس عمل کو قبولیت سے سرفراز فرما کر ہمارے لیے توشہ آخرت بنائے۔ آمین یا رب العالمین

والسلام

حافظ شاھد محمود

1436/1/26ھ = 2014/11/20ء

hasanshahid85@hotmail.com

مقدمہ

فتاویٰ جناب حافظ محمد عبداللہ صاحب غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ

1 بعض فتاویٰ ایسے درج مسودہ ہیں، جن کے سوالات مذکور نہیں ہیں، لیکن جوابات سے سوالات معلوم ہو جاتے ہیں، پس ایسے فتووں کے متعلق اپنی طرف سے سوالات قائم کر کے جوابات نقل کیے گئے ہیں۔

2 اس مجموعہ میں حافظ صاحب کے بعض ایسے فتوے درج ہیں، جو ان کے بعض دوسرے فتوے کے مخالف ہیں۔ ایسی صورت میں فقط وہی فتویٰ نقل کیا گیا ہے، جو محقق و مدلل اور صحیح معلوم ہوا ہے۔ (دیکھو: فتویٰ نمبر: ۱۱۳، ج ۱، ص ۱۳۵ و ج ۱، ص ۶۲، فتویٰ نمبر: ۳۸)

3 اس مجموعہ میں فرائض کے بہت سے مسئلے درج ہیں، وہ کل نقل نہیں کیے گئے، ان میں سے فقط وہی فتوے نقل ہوئے ہیں، جن میں تقسیم حصصِ ورثہ کے علاوہ علمِ فرائض کے متعلق کوئی مفید مضمون بھی واقع ہے۔

4 اس مجموعہ کے متعدد فتاویٰ کی تصحیح علماے ذیل نے کی ہے:

① ابو العلی محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری۔[1] ② ابو الہدیٰ سلامت اللہ مبارکپوری۔

5 جیسا کہ بہت سے تلامذہ متقدمین نے اپنے شیوخ کبار متقدمین کی رائے و اجتہاد سے موافقت نہیں کی ہے، اسی طرح بعض بعض فتووں میں مجھ ناچیز کی رائے حضرت شیخنا المکرّم مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کی رائے سے بھی موافق نہیں ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں حضرت شیخنا المکرّم کا فتویٰ نقل کرنے کے بعد میں نے اپنی رائے بھی ظاہر کر دی ہے۔

6 اس مجموعہ میں ایسے متعدد فتاویٰ بھی درج ہیں، جو نہ حافظ صاحب کے لکھے ہوئے ہیں اور نہ ان پر حافظ صاحب کی تصحیح ہے، ان میں سے فقط وہی فتاویٰ نقل کیے گئے ہیں، جو میرے نزدیک مدلل اور صحیح تھے اور میں نے ان کی تصحیح بھی کر دی ہے۔

7 میں نے بعض ابواب میں بعنوان تکمیل بعض اپنے فتاویٰ بھی نقل کر دیے ہیں۔

8 جناب حافظ صاحب کے بعض فتاویٰ کے مخالف بعض دیگر اکابر علماے اہلِ حدیث کے فتاویٰ واقع ہوئے ہیں، ایسی صورت میں ان دیگر اکابر علما اہلِ حدیث کے فتوے بھی کر دیے گئے ہیں۔

[1] ابوالعلی محمد عبدالرحمٰن سے مراد خاکسار ہے اور ابوالہدیٰ سلامت اللہ سے مراد مولوی عبدالسلام صاحب مبارک پوری مصنف "سیرۃ البخاری" ہیں۔

9 بعض فتاویٰ میں اجمال یا اختصار واقع ہوا ہے، ایسے فتوؤں کی تشریح وتفصیل میں نے اپنی طرف سے بعنوان "ھو الموفق" کردی ہے۔

10 جس قدر عبارات کتبِ حدیث وفقہ فتوؤں کے اندر درج ہیں، ہر ایک عبارت کا مقابلہ اصل کتاب سے غو سے کرلیا گیا ہے۔

[مولانا محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری]

کتاب الإیمان



غیر اللہ کی تعظیم اور حاجت روائی کا نظریہ:

سوال کسی مسلمان کو بلا حکمِ شرع مسجد میں نماز پڑھنے سے روکنا کیسا ہے اور مسجد کے کنویں سے باوجود غیر قوم کے پانی بھرنے کے کسی مسلمان کو پانی نہ لینے دینا کیسا ہے؟ بعد نمازِ صبح کے مسجد کے منبر کے دائیں طرف منہ کر کے کھڑے ہونا اور کچھ دیر کے بعد رکوع کے مانند جھک کر تعظیم کرنا اور یہ سمجھنا کہ یہ تعظیم سید عبدالقادر رحمہ اللہ کی کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھنا اور کہنا کہ پیرانِ پیر جس کو جو چاہیں دے سکتے ہیں، کیسا ہے؟ ایسے شخص کے پیچھے جس میں یہ سب باتیں بھری ہوں، نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ ان کے ساتھ میل ملاپ رکھنا اور ان کی دعوت قبول کرنا چاہیے یا نہیں؟

جواب کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے نمازی کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ [البقرۃ: ۱۱۴]

[اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے]

مسجد سے روکنا بڑا ظلم ہے اور ظلم کو جو باوجود قدرت کے نہ روکے، وہ مثل ظالم کے ہے اور ظلم کی در پردہ اعانت کرنا بھی ظلم ہے اور فسق۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر ان کی تعظیم کے لیے رکوع کی طرح جھکنا سخت بدعت ہے اور یہ سمجھنا کہ بڑے پیر رحمہ اللہ جس کو جو چاہیں دے سکتے ہیں، محض غلط اور بڑے گناہ کی بات ہے، چونکہ ایسا شخص کلمۂ توحید اور رسالت کا بلا اکراہ دل سے مقر ہے، اس لیے ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے۔ حدیث میں ہے: «صلوا خلف کل بر وفاجر»[1] ''برے بھلے سب کے پیچھے نماز پڑھو۔''

فاسقوں سے نہ ملنا، اگر اپنے بچانے کو ہے یا اس نظر سے کہ نہ ملنے سے گمان ترکِ فسق کا ہے تو واجب ہے۔ فاسق کی دعوت میں اگر کوئی فسق کی چیز شامل ہے تو دعوت نہ قبول کرنی چاہیے۔

کتبہ: محمد عین الحق. الجواب صحیح. کتبہ: محمد عبداللہ.

---

[1] سنن الدارقطني (۲/ ۵۷) واللفظ له، سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۱۲۵) امام دارقطنی رحمہ اللہ اس کی سند کے متعلق فرماتے ہیں: ''مکحول لم يسمع من أبي هريرة، ومن دونه ثقات'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواه الدارقطني... من طرق، كلها واهية جداً'' نیز امام عقیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ليس في هذا المتن إسناد يثبت'' نیز امام احمد اور امام دارقطنی رحمہما اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

غیر اللہ کی نذر و نیاز اور گیارھویں کا ختم:

سوال ① جانور زندہ بنام بڑے پیر صاحب کے نامزد کر کے رکھنا، گیارھویں تاریخ کو نہلا کے ذبح کرنا اور کھانا پکا کے زمین لیپ پوت کے تھال بھر کے رکھنا اور بڑی تعظیم سے سامنے کھڑے ہو کے اس کھانے پر فاتحہ پڑھنا اور اس وقت پیر صاحب کو وہاں حاضر و ناظر فریاد رس جان کے مرادیں مانگنا درست ہے یا نہیں؟

② وقت مصیبت کے بڑے پیر صاحب کو پکارنا کہ یا بڑے پیر میری مراد بر لایئے اور وقت پکارنے کے پیر صاحب کو سننے والا جاننا درست ہے یا نہیں؟

③ قبروں پر عرس کرنا اور چراغ بہت جلانا، روشنی ہر طرح کی کرنا اور تیل بہت خرچ کرنا اور کھانا مٹھائی چڑھانا اور راگ گانا اور قوال خوانی کرانا اور اہلِ قبور کو سننے والا جاننا درست ہے یا نہیں؟

④ مٹھیا کا چاول واسطے خرچ متعلق مسجد کے نکالا جاتا تھا، اس کو جو آدمی منع کر کے اُس چاول سے نیاز گیارھویں کرنے کو کہے، وہ آدمی کیسا ہے؟

جواب جانور زندہ بنام بڑے پیر صاحب کے نامزد کر کے رکھ کر گیارھویں تاریخ کو نہلا کے ذبح کر کے اور کھانا پکا کے زمین لیپ پوت کے تھال بھر کے رکھ کر بڑی تعظیم سے کھڑے ہو کے اس کھانے پر فاتحہ پڑھنا اور اس وقت پیر صاحب کو وہاں حاضر و ناظر و فریاد رس جان کے مرادیں مانگنا اور وقت مصیبت کے بڑے پیر صاحب کو پکارنا کہ یا بڑے پیر میری مراد برلایئے اور وقت پکارنے کے پیر صاحب کو سننے والا جاننا اور قبروں پر عرس کرنا، چراغ بہت جلانا، روشنی ہر طرح کی کرنا اور کھانا مٹھائی چڑھانا اور اہلِ قبور کو سننے والا جاننا؛ یہ سب امور نادرست ہیں۔ کسی آیت یا مستند حدیث سے یا عملِ صحابہ سے ثابت نہیں۔ اس لیے یہ بدعت و ضلالت ہیں۔ جو شخص ان امور کو جائز بتائے، محض جاہل اور قرآن و حدیث سے بے خبر ہے۔ اس قسم کے امور نہ خود حضرت ﷺ نے کبھی کیے ہیں نہ کسی کو ان کی تعلیم فرمائی ہے۔

جو شخص کہے کہ یہ امور درست ہیں، اس کو جھوٹا جاننا چاہیے۔ وہ محض پیٹ کے واسطے بندگانِ خدا کو بہکاتا ہے اور یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ: ﴿وَ لٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ﴾ [1] [سورة الأحزاب ركوع: ٥]

← "فقد تبين من هذا التجريح والتتبع لطرق الحديث أنها كلها واهية جدا، كما قال الحافظ ابن حجر في التلخيص (ص: ١٢٥) ولذلك فالحديث يبقىٰ علىٰ ضعفه، مع كثرة طرقه، لأن هذه الكثرة الشديدة الضعف في مفرداتها لا تعطي الحديث قوة في مجموعها، كما هو مقرر في علم الحديث، فالحديث مثل صالح لهذه القاعدة التي قلما يراعيها من المشتغلين بهذا العلم الشريف" (إرواء الغليل: ٢/ ٣٠١)

خلاصہ کلام یہ کہ یہ حدیث سخت ضعیف ہے، جو قطعاً قابلِ احتجاج نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا سوال میں جس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کی بابت سوال کیا گیا ہے، سائل کے حسبِ تصریح اس کے عقیدے میں غیر اللہ کی عبادت اور اس کے لیے قدرت و تصرف جیسے شرکیہ عقائد پائے جاتے ہیں، جن کی موجودگی میں اس کے پیچھے نماز درست نہیں، کیوں کہ بلاشبہہ یہ عقائد شرکِ اکبر میں داخل ہیں۔

① سورة الأحزاب [آیت: ٤٠]

سے پیغمبری حضرت ﷺ پر ختم کر دی۔ اب آپ ﷺ کے بعد نہ کوئی پیغمبر ہوا ہے نہ ہوگا۔ جس قدر احکامِ خداوندی کہ بندوں کے حق میں مفید تھے، وہ سب اللہ پاک حضرت محمد ﷺ پر اتار کر دین کو پورا کر چکا اور جب دین پورا ہو چکا، تب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے پاس بلا لیا۔ اب جو کوئی احکام مذکورہ کے سوائے کوئی دوسرا حکم جاری کرے، وہ حکم ہرگز پابندی کے قابل نہیں ہے اور کسی مسلمان کو اس حکم کا ماننا جائز نہیں ہے۔ مسلمان کو اس حکم کے ماننے سے بچنا چاہیے، ورنہ قیامت میں ضرور پکڑ ہوگی اور اللہ تعالیٰ پوچھے گا (ہم تو تمھارا دین پورا کر چکے تھے اور ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ [المائدة: ٣] نازل کر کے اس کی اطلاع بھی دے دی تھی، پھر تم نے دین کو ناقص کیوں سمجھا اور ہماری بات کو باور کیوں نہ کیا، سچ کیوں نہ سمجھا؟) اس وقت اِس کا کچھ جواب بن نہ آئے گا۔

گیارھویں کی نیاز کرنے کا بھی کوئی ثبوت قرآن مجید یا حدیث شریف سے نہیں ہے، اور مسجد کا بنوانا یا مسجد کی مرمت کرنا، اس کا بہت ثواب ہے، پس جو شخص اس مال کو، جو مسجد کے لیے نکالا گیا ہے، گیارھویں کی نیاز میں خرچ کرنے کو کہے، محض نادان اور بے خبر اور مناّعِ خیر ہے۔ والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبدالله

کلمہ طیبہ کا حقیقی معنی:

سوال شخصے می گوید کہ معنی حقیقی و مفہوم تحقیقی این کلمۂ توحید یعنی لا الٰہ الا اللہ ہمین است کہ ہیچ چیز غیر حق نیست، بلکہ تمامی اشیاء باعتبار حقیقت عین وے اند، اگر چہ باعتبار تعین وتشکل اعتباری غیر ہستند و در حق ہمگی علمائے سابقین کہ قائلیں ایں معنی نبودند میگوید کہ تمامی محدثین ومفسرین و جملہ فقہائے متکلمین شرقاً وغرباً، جنوباً وشمالاً وسلفاً وخلفاً کلمہ طیبہ را بکلمہ خبیثہ بدل کردند، یعنی لا الٰہ الا اللہ ولا الٰہ غیر اللہ بلا الٰہ الا غیر اللہ تبدیل دادند و از صراط مستقیم توحید پا بیروں نہادند الرزیۃ کل الرزیۃ تمت عبارتہ بالفاظہ. و دیگرے دریں قول وے نظرے میکند کہ معنی مذکور از ادق مسائل است وکدامی ادق مسائل تعلیم اولین ہرامی و دانشمند نتواند و حال این کہ معنی حقیقی کلمہ طیبہ تعلیم اولین ہرامی و دانشمند است پس لا بدی معنی کلمہ طیبہ نہ آنست کہ مذکور شد وسپس آں میگو یدکہ ترکیب کلمہ طیبہ مثل ترکیب لا کاتب الا زید، ولا خاتم النبیین الا محمد است، و چوں مراد ازیں ہر دو ترکیب ہمین است کہ حصر صفتِ کتابت در زید است وحصر صفتِ ختم نبوت در محمد ﷺ و در غیر آں یافتہ نشود پس ہم چنیں لا الٰہ الا اللہ را باید فہمید، چہ الٰہ بمعنی معبود است، پس معنی وی لا معبود الا اللہ است یعنی حصر صفت معبودیت در اللہ است و در غیر آں نیست چہ در اعتقاد مشرکین بود کہ اللہ تعالیٰ و دیگر مخلوق وے لا معبود در صفتِ معبودیت مشترک اند وعبادت غیر وے را نیز می کردند کلمہ طیبہ از بہر رد اعتقاد اوشاں نازل گردید پس معنی لا الٰہ الا اللہ جز ایں نیست کہ نیست معبودے مگر اللہ ہم چنیں معنی لا کاتب الا زید نیست کاتبے مگر زید، و در حق علمائے کرام از اہل اسلام ایں زعم کردن کہ او شایاں کلمہ طیبہ را بکلمہ خبیثہ تبدیل دادند و از صراط مستقیم پا بیروں نہادند نافہمی زاعم است وخوف تلف ایمان وی والله أعلم وعلمه أتم و أحكم.

الحال استفسار است کہ قول شخص اول صحیح است یا شخص آخر بہ تقدیر اول جواب نظر مطلوب است بر تصدیر ثانے تصدیق وتصحیح آں.

[ایک شخص کہتا ہے کہ کلمۂ توحید یعنی "لا إلٰه إلا الله" کا حقیقی معنی اور تحقیقی مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز غیرِ حق نہیں ہے، بلکہ حقیقت کے اعتبار سے تمام اشیا اس کا عین ہیں، اگرچہ تعین وتشکل کے اعتبار سے غیر ہیں۔ سابقہ علما میں سے جو اس معنی کے قائل نہیں تھے، ان کے حق میں وہ کہتا ہے کہ مشرق ومغرب، شمال وجنوب اور سلف وخلف کے تمام محدثین، مفسرین اور جملہ فقہاے متکلمین نے کلمۂ طیبہ کو کلمۂ خبیثہ کے ساتھ بدل دیا ہے، یعنی "لا إلٰه إلا الله" اور "لا إلٰه غير الله"، کو "لا إلٰه إلا غير الله" کے ساتھ بدل دیا ہے اور توحید کے راہِ مستقیم سے اپنا پاؤں ہٹا لیا ہے۔

دوسرا شخص اس کے اس قول کو محلِ نظر ٹھہراتا ہے کہ مذکورہ بالا معنی دقیق ترین مسائل میں سے ہے اور ایسا دقیق مسئلہ ہر اَن پڑھ اور دانش مند کی ابتدائی تعلیم نہیں بن سکتا، حالاں کہ کلمہ طیبہ کا حقیقی معنی ہر اَن پڑھ اور دانش مند کی ابتدائی تعلیم ہے۔ پس لامحالہ کلمہ طیبہ کا معنی وہ نہیں ہے جو ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ دوسرا شخص کہتا ہے کہ کلمہ طیبہ کی ترکیب "لا كاتب إلا زيد" اور "لا خاتم النبيين إلا محمد" کی طرح ہے۔ جس طرح ان ہر دو جملوں کا مفہوم یہ ہے کہ صفتِ کتابت زید میں منحصر ہے اور ختمِ نبوت کی صفت محمد (ﷺ) میں منحصر ہے، ان کے غیر میں یہ صفت نہیں پائی جاتی ہے، اسی طرح "لا إلٰه إلا الله" کا معنی سمجھنا چاہیے۔ وہ اس طرح کہ الٰہ کا معنی معبود ہے، لہٰذا کلمہ طیبہ کا معنی یہ ہوا کہ "لا معبود إلا الله"، یعنی صفتِ معبودیت اللہ تعالیٰ میں منحصر ہے، اس کے غیر میں یہ صفت نہیں۔ مشرکین کا اعتقاد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی دوسری مخلوق صفتِ معبودیت میں مشترک ہیں، لہٰذا وہ اللہ کے سوا دوسروں کی بھی عبادت کرتے تھے۔ کلمہ طیبہ ان کے اس عقیدے کو رد کرنے کے لیے نازل ہوا۔ چناں چہ "لا إلٰه إلا الله" کا معنی اس کے علاوہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں ہے۔ جس طرح "لا كاتب إلا زيد" کا معنی ہے کہ زید ہی کاتب ہے۔

چنانچہ اہلِ اسلام علماے کرام کے حق میں یہ گمان کرنا کہ انھوں نے کلمۂ طیبہ کو کلمۂ خبیثہ کے ساتھ بدل دیا ہے اور وہ ایسا کر کے راہِ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں، گمان کرنے والے کی نافہمی ہے اور اس کا ایمان تلف ہونے کا خدشہ ہے۔ والله أعلم وعلمه أتم و أحكم.

اب یہ سوال ہے کہ پہلے شخص کا قول صحیح ہے یا دوسرے آدمی کی بات درست ہے؟ پہلے کا قول درست نہ ہونے کی صورت میں محلِ نظر ہونے کا سبب مطلوب ہے اور دوسرے کی بات صحیح ہے تو اس کی تصدیق وتصحیح درکار ہے]

جواب قول شخص آخر صحیح است، وقول شخص اول از صحت بمراحل دور ست. والله تعالیٰ أعلم بالصواب.

[دوسرے شخص کی بات صحیح ہے، جب کہ پہلے آدمی کی بات صحت وصواب سے نہایت بعید ہے۔ واللہ أعلم بالصواب] کتبہ: محمد عبداللہ

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی نذر:

سوال حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی نذر شرک ہے یا نہیں؟

جواب اس سے کیا مراد ہے؟ اگر کچھ خیرات کر کے ان کو ثواب پہنچانا ہے تو شرک نہیں ہے اور اگر ان کو معبود سمجھ کے کوئی فعل کرے اور خدا کا شریک ٹھہرائے تو شرک ہے۔ واللہ أعلم

ایک شرکیہ وظیفہ:

سوال عامل اس کلام کا "أجیبوا أو توکلوا أیها الوسواس الخناس لقلب کذا وکذا، بالمحبة والمودة، وعطفوا قلبه علي" [اے وسواس خناس! فلاں فلاں کی محبت ومودت کی فرمایش پوری کرو یا اس کے ضامن بن جاؤ اور اس کا دل میری طرف مائل کر دو] بایں طور کے واسطے محبت یا کسی اور امر کے عمل میں رکھے اور قبل اس کلام کے تین سو بار سورہ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پڑھے اور ہر سیکڑے کے بعد اس کلام کا اعادہ کرے۔ للہ فرمایئے کہ عامل اس کا مومن رہا یا داخل گروہِ مشرکین ہوا؟ بینوا تؤجروا!

جواب جو کلام کہ سوال میں مذکور ہے، یعنی "أجیبوا وتوکلوا أیها الوسواس الخناس..." ناجائز کلام ہے اور ایسے کلام کا عامل سخت گنہگار ہے۔ اس لیے کہ اس کلام میں ارواحِ خبیثہ سے دعا اور ندا و استمداد اور حاجت روائی چاہی گئی ہے اور یہ بات اصولِ اسلام کے خلاف ہے۔ اسلامی مسئلہ یہ ہے کہ سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اور کسی سے اس طور سے استمداد جائز نہیں ہے۔ ترمذی شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

«وإذا استعنت فاستعن باللہ»[1] یعنی اور جب تو مدد چاہے تو اللہ سے مدد چاہ۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں اپنے بندوں کو اس طرح کہنا تعلیم فرمایا: ﴿ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ [الفاتحة: ٤] یعنی ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ واللہ أعلم بالصواب کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

مجلسِ میلاد کا شرعی حکم:

سوال مجلسِ میلاد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب مجلسِ میلاد کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ خود اس مجلس کو کبھی کیا اور نہ امت کو اس کے کرنے کی کبھی ہدایت فرمائی اور نہ یہی ہوا کہ آپ کے عہدِ مبارک میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے کیا اور آپ نے اس کو بحال رکھا، پھر اس مجلس کے جواز کی کیا صورت ہے؟ ہاں اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی آیا ہوتا اور اس نے اس

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٦)

مجلسِ میلاد کو جائز بتایا ہوتا تو البتہ اس کے جواز کی گنجایش تھی، لیکن نبوت کو تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر ختم کر دیا، نہ آپ ﷺ کے بعد اب تک کوئی نبی آیا اور نہ آیندہ کبھی آ سکتا ہے تو پھر اس مجلس کا کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟

ہدایہ میں ہے کہ طلوعِ فجر کے بعد سنتِ فجر سے زیادہ کوئی اور نفلی نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس کی وجہ یہی بتائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے باوجود نماز پر حریص ہونے کے اس سے زیادہ اور کوئی نفلی نماز نہیں پڑھی:

''ويكره أن يتنفل بعد طلوع الفجر بأكثر من ركعتي الفجر، لأنه عليه السلام لم يزد عليهما مع حرصه على الصلاة'' (هداية: ١/ ٨٢)

نیز ہدایہ میں ہے کہ عید گاہ میں جا کر قبل نمازِ عید کے کوئی نفلی نماز نہ پڑھے اور اس کی وجہ بھی یہی بتائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے باوجود نماز پر حریص ہونے کے عید گاہ میں قبل نمازِ عید کے کوئی نفل نماز نہیں پڑھی:

''ولا يتنفل في المصلیٰ قبل صلاة العيد، لأن النبيﷺ لم يفعل ذلك مع حرصه على الصلاة'' (هداية: ١/ ١٥٥) كتبه: محمد عبد الله (١٣/ ربيع الاول ١٣٣١هـ)

الجواب صحيح. كتبه: ابو یوسف محمد عبدالمنان غازی پوری، مدرس مدرسہ ریاض العلوم دہلی۔

صوفیہ کی ایک بدعی تلقین:

سوال وقتِ تلقین صوفیہ کرام مریدوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ تم اپنے دل کے اندر خدا کا تصور کرو اور ضرب ''اللہ، اللہ'' کا مارو، زبان کو جنبش نہ ہو۔ اس ترکیب سے دل ذاکر ہوجاتا ہے اور تجربہ سے بھی یہ بات دیکھی گئی ہے، پس شریعت سے اس بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب جو طریقہ اس سوال میں مذکور ہے، جہاں تک میں جانتا ہوں یہ کوئی اسلامی طریقہ نہیں ہے، بلکہ یہ طریقہ غیر ملت والوں سے ماخوذ ہے، جیسا کہ کتاب ''بستان المذاهب'' سے واضح ہوتا ہے۔ کسی آیت یا حدیث میں یہ طریقہ تلقین نہیں بتایا گیا ہے۔ والله تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (ذو الحجه ١٣٢٦هـ)

کیا مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرو کار مسلمان ہیں؟[1]

سوال کیا مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرو کار مسلمان ہیں؟

جواب میں نے ان اوراق[2] کو اول سے آخر تک پڑھا اور مرزا کے عقائد و مقالات کو اس کی اصل تصانیف میں بھی

---

[1] دیکھیں: ''پاک و ہند کے علماے اسلام کا اولین متفقہ فتویٰ'' (ص: ٩٦) دار الدعوۃ السلفیہ لاہور۔

[2] ان اوراق سے مراد وہ فتواے تکفیر ہے، جو شیخ الاسلام مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ نے مرزا غلام قادیانی کے عقائد و نظریات کی بابت حضرت میاں صاحب نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا اور میاں صاحب نے قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں مرزائی عقائد کو الحاد و زندقہ قرار دیا۔ بعد ازاں مولانا بٹالوی رحمہ اللہ نے مذکورہ فتوے پر ملک بھر کے دوصد علما کی تصدیقات حاصل کیں اور اسے شائع کیا۔ مرزا غلام قادیانی نے بھی اس فتوے کا اپنی کئی کتب میں ذکر کیا ہے، مثلاً دیکھیں: روحانی خزائن (١٦/ ٤٣٨)

دیکھا۔ میری رائے میں وہ ضرور اُن عقائد و مقالات کی نظر سے دجال و کذاب ہے اور پابندیِ اسلام و اہلِ سنت سے خارج ہے۔ کتبہ: محمد عبداللہ غازی پوری

قادیانیوں سے راہ و رسم:

سوال قادیانیوں سے راہ و رسم ہے اور بھاگل پوری کپڑے ان کے یہاں بیچنے جاتا ہوں۔ ان لوگوں کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہیں اور لین دَین رکھیں یا نہیں؟ کھانا کھائیں اور کھلائیں یا نہیں؟ سلام علیک ان کے ساتھ کریں یا نہیں؟ اگر پہلے وہ لوگ سلام علیک کریں تو اس کا جواب دیں یا نہیں؟ مقام ناتھ نگر، ڈاکخانہ چمپانگر بھاگل پور، نوازش حسین پسرا مومیان

جواب انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کلمہ گو ہو اور کعبہ رخ نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے اور ہماری طرح ذبح کرے تو وہ شخص مسلمان ہے۔ جو احکام مسلمان کے ہیں، وہی اس کے ہیں، تو اگر قادیانی ایسے ہیں تو ان کے پیچھے نماز پڑھ لیں اور ان کے ساتھ لین دَین بھی رکھیں اور کھانا کھلانا بھی اور سلام علیک بھی۔[1]

حدیث مذکورہ کے الفاظ یہ ہیں:

«أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا إلٰه إلا الله فإذا قالوها، وصلوا صلاتنا، واستقبلوا قبلتنا، وذبحوا ذبيحتنا، فقد حرمت علينا دماءهم وأموالهم إلا بحقها، وحسابهم على الله»[2]

[مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے قتال کروں، حتی کہ وہ کلمہ توحید کا اقرار کر لیں، پس جب وہ اس کا اقرار کر لیں اور ہماری نماز پڑھیں اور ہمارے قبلے کو تسلیم کریں اور ہمارے طریقے کے مطابق ذبح کریں تو ہمارے لیے ان کے خون اور مال محترم ہیں سوائے ان کے حق کے، اور ان کا حساب اللہ کے پاس ہے]

دوسری روایت میں ہے:

«من شهد أن لا إلٰه إلا الله، واستقبل قبلتنا، وصلىٰ صلاتنا، وأكل ذبيحتنا فهو المسلم، له ما للمسلم، وعليه ما على المسلم» والله تعالىٰ أعلم. (بخاري شريف، مصري: ١/ ٥٢)[3]

[جس نے کلمہ توحید کی گواہی دی، ہمارے قبلے کو تسلیم کیا، ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارا ذبیحہ کھایا پس وہ

---

[1] لیکن قادیانی چوں کہ ایسے نہیں کہ ان کے کلمے اور قبلے وغیرہ کے متعلق وہی تصورات ہوں، جو دیگر مسلمانوں کے ہوتے ہیں، اس لیے ان کے ساتھ رشتہ تعلق اور علیک سلیک وغیرہ دیگر معاملات عام مسلمانوں کی طرح نہیں، بلکہ ایک غیر مسلم قوم کی طرح ہونے چاہئیں، اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے شیخ الاسلام مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ کا مرتب کردہ ''علماے اسلام کا اولین متفقہ فیصلہ'' دیکھیں، جس میں تمام مسالک کے سربرآوردہ علما نے قادیانیوں کے گمراہ کن عقائد و نظریات کی بدولت انھیں غیر مسلم قرار دیا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٥)

[3] مصدر سابق۔ یہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں۔

مسلمان ہیں اس کے وہی حقوق ہیں جو ایک مسلمان کے ہیں اور اس کے ذمے وہی فرائض ہیں جو ایک مسلمان کے ہیں]

کتبہ: محمد عبداللہ

کس کی سنت حجت ہے؟

سوال زید کہتا ہے کہ سوائے افعال و اقوالِ رسول اللہ ﷺ و خلفاے راشدین وصحابہ مجتہدین رضی اللہ عنہم کسی کا فعل سنت نہیں ہے اور عمرو کہتا ہے کہ سوائے قسمین سنت متذکرہ بالا کے افعال و اقوالِ علما بھی سنت ہیں؟

جواب زید اور عمرو جس سنت میں اختلاف کرتے ہیں، اگر ان کی مراد اس سے شرعی سنت ہے، جس کی پیروی علی العموم کل اہلِ اسلام پر لازم ہے تو ما سوا رسولِ مقبول ﷺ کے کسی کے اقوال و افعال و تقاریر سنت نہیں ہوسکتے۔ باقی خلفاے راشدین کے اقوال و افعال بحکم «علیکم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدین» [1] سنت میں داخل ہوں گے۔ پس خلفاے راشدین کے اقوال و افعال گویا رسول اللہ ﷺ کی سنت قولی ٹھہری۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: أبو الفیاض محمد عبدالقادر اعظم گڑھی مؤی

تقلیدِ شخصی کی شرعی حیثیت:

سوال بعض علما وفقہا نے ایک امام کی تقلید کو واجب ٹھہرایا ہے اور اس پر بہت کچھ دلائل پیش کیے ہیں، چنانچہ نواب قطب الدین خان صاحب مرحوم نے تنویر الحق میں تقلید شخصی کے وجوب پر بڑا زور دیا ہے اور مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی مرحوم نے "الإنصاف" میں لکھا ہے: "والتقلید فیه مصلحة عظیمة" [تقلید میں بہت بڑی مصلحت ہے]

جواب ایک امام کی تقلید کتاب و سنت سے ثابت نہیں ہے۔

کیا عباداتِ بدنیہ کا ثواب مردوں کو پہنچتا ہے؟

سوال عباداتِ بدنیہ مثل نماز و روزہ و اعتکاف و تلاوتِ قرآن شریف کا ثواب اموات کو مطابق احادیثِ صحیحہ و اقوالِ ائمہ اربعہ پہنچتا ہے یا نہیں؟

جواب عباداتِ بدنیہ مثل نماز و روزہ وغیرہ اموات کی طرف سے احادیث کے مطابق جائز نہیں۔

کیا مردے سنتے ہیں؟

سوال کیا مردے سنتے ہیں یا نہیں؟ اگر سنتے ہیں تو «نم کنومة العروس» والی حدیث کا کیا مطلب ہے؟

مرسلہ: مولوی ابو اسحاق عبداللہ صاحب صدر مدرس مدرسہ شمسیہ، ویرووال مسجد اہل حدیث متصل تھانہ۔ ضلع امرتسر

جواب آیت: ﴿اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى﴾ اور آیت ﴿وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ﴾ سے صریح طور پر ثابت ہوتا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٢)

ہے کہ مردے سنتے نہیں ہیں اور اسی کی تائید حدیث «نم کنومة العروس»[1] [دلہن کی طرح سو جا] سے بھی ہوتی ہے، لیکن بعض احادیث صحیحہ سے خاص اوقات و مواقع میں مردوں کا سننا ثابت ہوتا ہے، جیسے حدیثِ انس رضی اللہ عنہ سے، جس میں یہ لفظ واقع ہے:

«إنه ليسمع قرع نعالهم»[2] (رواه البخاري) [وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے]

اور جیسے حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے، جس میں یہ لفظ واقع ہے:

«ما أنتم بأسمع منهم»[3] (رواه البخاري أيضاً) [تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے]

اور جیسے حدیثِ بریدہ رضی اللہ عنہ سے، جس میں یہ لفظ واقع ہے:

"كان رسول اللهﷺ يعلمهم إذا خرجوا إلى المقابر: السلام عليكم أهل الديار... الخ"[4] (رواه مسلم)

[جب وہ قبرستان جانے کا ارادہ کرتے تو رسول اللہ ﷺ ان کو یہ دعا سکھایا کرتے تھے: ''اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو...الخ'']

پس دونوں آیات مذکورہ بالا اور ان احادیث کے درمیان جمع و توفیق کی صورت یہ ہے کہ مُردے سنتے نہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی خاص وقت یا کسی خاص موقع میں ان کو سنانا چاہتا ہے تو وہ سن لیتے ہیں۔

تفسیر فتح البیان مصنفہ نواب صدیق حسن خان صاحب (۷/ ۸۵) میں ہے:

"وظاهر نفي سماع الموتىٰ العموم، فلا يخص منه إلا ما ورد بدليل، كما ثبت في الصحيح أنهﷺ خاطب القتلىٰ في قليب بدر، فقيل له: يا رسول اللهﷺ إنما تكلم أجسادا لا أرواح لها؟ وكذلك ما ورد من أن الميت يسمع خفق نعال المشيعين له إذا انصرفوا" انتهى

[مردوں کے سننے کی نفی کا ظاہری مفہوم اس کا عموم ہے، اس سے صرف وہی خاص ہوسکتا ہے، جو دلیل کے ساتھ وارد ہوا ہو، جیسا کہ صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے بدر کے ایک کنویں میں پڑے ہوئے مقتولین سے خطاب کیا۔ آپ ﷺ سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ ﷺ! آپ ایسے جسموں سے کلام کر رہے ہیں، جن میں روحیں نہیں ہیں؟ اسی سلسلے میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ مردہ اس وقت رخصت کرنے والوں کے جوتوں کی آہٹ کو سنتا ہے، جب وہ اسے رخصت کر کے واپس لوٹتے ہیں]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٧١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٩١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٣)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٥)

فتح الباری شرح صحیح بخاری (۵/ ۴۰۷) میں ہے:

"قال ابن التين: لا معارضة بين حديث ابن عمر والآية، لأن الموتىٰ لا يسمعون بلا شك، لكن إذا أراد الله إسماع ما ليس من شأنه السماع، لم يمتنع، كقوله تعالىٰ: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ﴾ الآية، وقوله: ﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا﴾ الآية. انتهى"

[ابن التین رحمہ اللہ نے کہا: ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اور آیت میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیوں کہ بلاشبہہ مردے نہیں سنتے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کو سنانے کا ارادہ کرے، جو سنا نہیں کرتا تو اس میں کوئی مانع اور رکاوٹ بھی نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ﴾ [الأحزاب: ۷۲] (بے شک ہم نے امانت کو (آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے) پیش کیا) اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا﴾ [حم السجدة: ۱۱] (تو اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ آؤ خوشی یا ناخوشی سے)]

اس مسئلے کے متعلق میرا ایک مضمون فتاویٰ نذیریہ (۱/ ۴۱۱ و ۴۱۲ و ۴۱۳) میں بھی درج ہے، اس کو بھی دیکھ لینا چاہیے۔ هذا ما عندي، والله تعالىٰ أعلم.

أملاه: محمد عبد الرحمن المباركفوري ـ عفا الله عنه (۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ)

فضیلتِ شیخین:[1]

سوال ① کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس میں کہ یہ جو کتبِ عقائد مثل عقیدہ صابونیہ وعقیدہ واسطیہ و انتقادِ رجیح وغیرہا میں مندرج ہے کہ افضل اس اُمت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ، یہ امر شرعی ہے یا غیر شرعی ہے؟ برتقدیرِ ثانی یہ کہنا جائز ہے یا نہیں کہ حضرت علی افضل ہیں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے اور عمر رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے؟

سوال ② جس شخص کا یہ مقولہ ہو کہ اگر کوئی علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل کہے تو اس کو بھی سچا دین دار جانتا ہوں اور اس ترتیب کو کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں عمر رضی اللہ عنہ سے اور عمر رضی اللہ عنہ عثمان رضی اللہ عنہ سے اور عثمان رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ سے غیر شرعی جانتا ہوں، ایسا شخص کیسا ہے؟ مخالف عقیدہ سلف کے ہے یا موافق اور سلف اہلِ سنت و علمائے محدثین کا اس میں کیا عقیدہ تھا؟

سوال ③ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیوں لڑیں: آیا بوجہ خلافت کے یا بجہتِ طلب قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ کے؟ برتقدیرِ ثانی، اہلِ جمل کا قتال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بحکم یا رضا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تھا یا درمیان

[1] فتاویٰ نذیریہ (۱/ ۲۵۰)

میں مفسدوں نے فساد ڈال دیا تھا؟ بر تقدیرِ ثانی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اطلاق باغیہ کا کرنا اس وقت میں صحیح تھا یا صحیح نہیں تھا اور سلف کا اس میں کیا عقیدہ ہے؟

جواب ① یہ جو کتبِ عقاید میں مندرج ہے کہ افضل اس امت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر رضی اللہ عنہ، پھر عثمان رضی اللہ عنہ، پھر علی رضی اللہ عنہ یہ امر شرعی ہے اور دلیل اس پر حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما ہے:

"قال كنا نخير بين الناس في زمان رسول الله ﷺ فنخير أبا بكر رضي الله عنه ثم عمر بن الخطاب رضي الله عنه ثم عثمان بن عفان" [1] رواه البخاري

[ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صحابہ میں بعض کو بعض پر فضیلت دیتے تھے، ہم کہتے تھے ابوبکر سب سے افضل ہیں، ان کے بعد عمر، پھر عثمان رضی اللہ عنہم]

اور یہ حدیث حکماً مرفوع ہے، جیسا کہ علمِ اصول سے معمولی تعلق رکھنے والے پر بھی مخفی نہیں ہے۔ طبرانی [2] کی روایت میں ہے: "فيسمع النبي ﷺ ولا ينكره" [3] یہاں سے صراحتاً تقریرِ نبوی سمجھی جاتی ہے۔

جواب ② قائل مقولہ مذکورہ کا عقیدہ جمہور سلف و علماے محدثین کے مخالف ہے۔

جواب ③ جنگ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بجہتِ طلب قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے تھی، مفسدوں نے درمیان میں فساد ڈال دیا تھا، اس لیے باغیہ کا اطلاق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر صحیح نہیں ہے، سلف کا اس بارے میں یہی عقیدہ ہے۔ والتفصيل إلى كتب العقائد. والله أعلم.

کتبہ: محمد بشیر ۱۲۹۴ عفی عنہ۔ الجواب صحیح: کتبہ محمد بن عبد العزیز القاضی فی بھوپال۔ شیخ محمد عفی عنہ۔

جواب ① فی الواقع افضل اس امت کے بعد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور یہ امر شرعی ہے اور اس پر ایک دلیل حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے:

"إن النبيّ صعد أحدا و أبوبكر و عمر، و عثمان رضي الله عنهم فرجف بهم، فقال: اثبت أحد! فإنما عليك نبي وصديق وشهيدان" [4] (رواه البخاري)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٥٥)

[2] "مجمع الزوائد" (٩/ ٤٩) میں لکھا ہے: "رواه الطبراني في الكبير والأوسط بنحوه باختصار إلا أنه قال: أبو بكر و عمر و عثمان رضي الله عنهم ثم استقر الناس فبلغ رسول الله ﷺ فلا ينكره علينا، وأبو يعلى بنحوه الطبراني في الكبير، ورجاله وثقوا، وفيهم خلاف" انتهى.

"طبرانی نے اوسط اور کبیر میں اس حدیث کو بیان کیا ہے کہ صحابہ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں افضلیت میں حضرت ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا نام لیا کرتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس بات کا علم تھا، لیکن آپ نے منع نہیں کیا۔ ابو یعلی نے بھی اسے بیان کیا ہے اور اس کے رجال کی توثیق کی گئی ہے اور ان میں اختلاف بھی ہے۔" (ابو سعید محمد شرف الدین۔عفي عنه)

[3] المعجم الكبير (١٢/ ٢٨٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٢)

''نبی ﷺ اور ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اُحد پہاڑ پر چڑھے ہوئے تھے تو پہاڑ کانپنے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اُحد! ٹھہر جا، تیرے اوپر نبی اور صدیق اور دو شہید ہیں۔''

وجہ دلالت اس حدیث کی اس امر پر یہ ہے کہ افضل ناس مطلقاً نبی ہوتے ہیں، پھر صدیق، پھر شہید، جیسا کہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ [النساء: ٦٩] ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین میں سے۔'' اس پر دال ہے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق ہیں اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما شہید۔

جواب ٢ ایسا شخص مخالف ہے عقیدہ سلف صالحین و ائمہ محدثین و مجتہدین کے۔

جواب ٣ جنگ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بوجہ طلب قصاص قاتلانِ حضرت عثمان سے تھی، مفسدوں نے بیچ میں فساد ڈال دیا تھا۔ اس لیے اطلاق باغیہ کا ان پر صحیح نہیں ہے، سلف صالحین کا اس میں یہی عقیدہ ہے۔

نمقه محمد عبدالله غازی پوری (مدرس چشمه رحمت) الجواب صحيح وخلافه قبيح. العاجز سيد محمد نذير حسين عفي عنه بقلم خود.

یہ جواب صحیح ہے۔ شریف حسین۔ یہ جواب صحیح ہے۔ غلام اکبر خاں

المجیب مصیب۔ تلطف حسین عفی عنہ اَصاب من اَجاب۔ محمد عبدالرحمٰن۔

الجواب صحیح۔ ابونصر عبداللہ فضل حسین مظفر پوری۔ عبدالرحیم۔

للہ در المجیب فإنہ فیما قال مصیب۔ ابومحمد ابراہیم

نعم الجواب وھو الصواب۔ محمد ادریس الجواب صحیح۔ محمد اسماعیل۔

اچھا جواب لکھا ہے۔ عبدالعزیز مظفر پوری۔ اصاب من اجاب واللہ اعلم بالصواب۔ نظیر حسین آروی۔

کیا کوئی نبی جولاہا تھا؟

سوال هل أحد من الأنبياء كان حائكا؟

جواب لا يخفىٰ أن الذي يعلم من كلام هذا السائل ادعاء الإحاطة بما ثبت من الأحاديث، وما لم يثبت، فإنه ادعى أنه لم يثبت عن أحد من الأنبياء أنه كان حائكا، ثم خصص ذلك بآدم عليه السلام بأنه لم يثبت وجود الحياكة، ثم ادعى أيضاً أن آدم كان زراعا، وهذه جرأة منه، وتقول على الله وعلى رسوله ﷺ، قال الله تعالىٰ:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ﴾ [الصف: ٧]

وقال تعالىٰ: ﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ [الإسراء: ٣٦]

فإن كون آدم عليه السلام حائكا، لم يثبت من طريق صحيح، على قاعدة المحدثين الذين إذا عبروا بالثبوت، مرادهم به الصحة، بل هو حديث واهٍ، قال الحافظ ابن حجر رحمه الله في فتح الباري:

"ووقع في المستدرك عن ابن عباس رضي الله عنهما بسندٍ واهٍ: كان داود زرادا، وكان آدم حراثاً، وكان نوح نجارا، وكان إدريس خياطا، وكان موسىٰ راعيا"[1]

فانظر كيف صرح الحافظ بأن سند الحديث واه، فكيف يتجاسر هذا الجاهل بكونه ثابتا؟

فإن كان مراده بالثبوت مجرد الورود من غير ملاحظة الصحة ولا الحسن، فقد أخرج الديلمي في مسند الفردوس من حديث أنس بن مالك رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم: «أول من حاك آدم عليه السلام»[2]

فينبغي على زعم هذا المعترض قبول ما أخرجه الديلمي وإن كان ضعيفاً، ولا يبادر إلى إنكار ذلك واحتقار الناس، والطعن في أعراضهم، الذي هو من عادات أهل الجاهلية والمتكبرين، قال الله تعالىٰ:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لاَ يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلاَ نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسَى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلاَ تَلْمِزُوْٓا اَنفُسَكُمْ وَلاَ تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [الحجرات: ١١]

وقال تعالىٰ: ﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ [الحجرات: ١٣]

وأخرج مسلم في صحيحه من حديث أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «المسلم أخو المسلم، لا يظلمه، ولا يخذله، ولا يحقره، التقوى هٰهنا، ويشير إلى صدره، بحسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم، كل المسلم على المسلم حرام، دمه وعرضه وماله»[3]

و أخرج مسلم أيضاً من حديث ابن مسعود رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «لا يدخل الجنة من في قلبه مثقال ذرة من كبر، فقال رجل: إن الرجل يحب أن يكون ثوبه حسنا، ونعله حسنا، فقال: إن اللّٰه جميل يحب الجمال، الكبر بطر الحق وغمط الناس»[4]

قال الحافظ المنذري في الترغيب والترهيب: قوله: «بطر الحق» أي دفعه ورده «وغمط

---

[1] فتح الباري (٤/ ٤٠٦)

[2] مسند الفردوس للديلمي (٥/ ٣٥) رقم الحديث (٧٣٨١) وانظر: التدوين في أخبار قزوين للرافعي (٤/ ٦٥) والحديث ضعيف جدا، ذكره ابن عراق في تنزيه الشريعة (٢/ ٢٤٣) والشوكاني في الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة (ص: ١٥٤) والألباني في السلسلة الضعيفة (٣٣٠٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤)

الناس» بفتح الغين المعجمة وسكون الميم وبالطاء المهملة، هو احتقارهم وازدراؤهم، كما جاء مفسرا عند الحاكم.[1] انتهىٰ

وأخرج الترمذي من حديث أبي هريرةؓ قال قال رسول اللهﷺ: «إن الله قد أذهب عنكم عبية الجاهلية، وفخرها بالآباء، إنما هو مؤمن تقي، وفاجر شقي، الناس بنو آدم، وآدم من تراب، ليدعن رجال فخرهم بأقوام، إنما هم فحم من فحم جهنم، أو ليكونن أهون على الله من الجعل التي ترفع بأنفها النتن»[2]

وأخرج الترمذي أيضاً من حديث ابن عمرؓ أن رسول اللهﷺ خطب يوم فتح مكة فقال: «يا أيها الناس إن الله قد أذهب عنكم عبية الجاهلية، وتعاظمها بآبائها، الناس رجلان، رجل بر تقي كريم على الله، و فاجر شقي هين على الله، والناس بنو آدم، وخلق الله آدم من التراب، قال الله تعالىٰ: ﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰي وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾[3] [الحجرات: ١٣] »

وأخرج الطبراني في الكبير من حديث حبيب بن خراش قال قال رسول اللهﷺ: «المسلمون إخوة، لا فضل لأحد على أحد إلا بالتقوىٰ»[4] قال المناوي: وإسناده حسن.[5] انتهىٰ

وأخرج البيهقي مرسلا عن الحسن البصري قال قال رسول اللهﷺ: «إن المستهزئين بالناس، يفتح لأحدهم في الآخرة باب من الجنة، فيقال له: هلم هلم، فيجئ بكربه وغمه، فإذا جاء أغلق دونه، ثم يفتح له باب، فيقال له: هلم هلم، فما يأتيه من الإياس»[6]

وأخرج أحمد و البيهقي من حديث عقبة بن عامرؓ أن رسول اللهﷺ قال: «إن أنسابكم هذه ليست بسباب على أحدٍ، أنتم ولد آدم، طف الصاع [بالصاع] لم تملؤوه، ليس لأحد فضل على أحد إلا بالدين أو عمل صالح»[7] ولفظ البيهقي: «ليس لأحد على أحد فضل

---

[1] الترغيب والترهيب للمنذري (٣/ ٣٥٦) وانظر: المستدرك للحاكم (١/ ٧٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٥٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٧٠)

[4] المعجم الكبير للطبراني (٤/ ٢٥) والحديث موضوع، لأن في إسناده عبد الرحمن بن عمرو بن جبلة، قال الذهبي: كذاب. قال أبو حاتم: كان يكذب، فضرب على حديثه، وقال الدارقطني: متروك يضع الحديث. (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٦٧٧)

[5] قال المناوي: طب عن حبيب بن خراش، رمز (السيوطي) لحسنه، قال الهيثمي: فيه عبد الرحمن بن عمرو بن جبلة، وهو متروك. (فيض القدير: ٦/ ٢٧١) وانظر: مجمع الزوائد (٨/ ٨٤)

[6] شعب الإيمان للبيهقي (٥/ ٣٠١) وقال العراقي في المغني: "أخرجه ابن أبي الدنيا في الصمت [ص: ١٦٨، رقم الحديث: ٢٨٥] من حديث الحسن مرسلًا، و رويناه في ثمانيات النجيب من رواية هدبة أحد الهالكين"

[7] مسند أحمد (٤/ ١٤٥، ١٥٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٣٨)

إلا بالدين أو عمل صالح، حسب الرجل أن يكون فاحشا بذيا بخيلا»[1] وفي رواية له: «ليس لأحد على أحد فضل إلا بدين أو تقوىٰ، وكفىٰ بالرجل أن يكون بذيا فاحشا بخيلا»[2]

وقوله: «طف الصاع» بالإضافة أي قريب بعضكم من بعض. كذا في الترغيب،[3] وأخرج الإمام أحمد من حديث أبي ذر رضي الله عنه أن النبي ﷺ قال له: «انظر فإنك لست خيراً من أحمر ولا أسود إلا أن تفضله بتقوىٰ»[4] قال الحافظ المنذري: ورواته ثقات إلا أن أبا بكر بن عبد الله المزني لم يسمع من أبي ذر.[5]

و أخرج البيهقي عن جابر بن عبدالله رضي الله عنه قال: خطبنا رسول الله ﷺ في أوسط أيام التشريق خطبة الوداع، فقال: «يا أيها الناس إن ربكم واحد، وإن أباكم واحد، ألا لا فضل لعربي على عجمي، ولا لعجمي على عربي، ولا لأحمر على أسود، ولا لأسود على أحمر إلا بالتقوىٰ، إن أكرمكم عند الله أتقاكم، ألا هل بلغت؟» قالوا: بلىٰ يا رسول الله، قال: «فليبلغ الشاهد الغائب» ثم ذكر الحديث في تحريم الدماء والأموال [والأعراض، رواه البيهقي، وقال: في إسناده بعض من يجهل][6]

و أخرج الطبراني في الأوسط والصغير من حديث أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا كان يوم القيامة، أمر الله مناديا ينادي: ألا إني جعلت نسباً، وجعلتم نسباً، فجعلت أكرمكم أتقاكم، فأبيتم إلا أن تقولوا فلان بن فلان [خير من فلان بن فلان] فاليوم أرفع نسبي، وأضع نسبكم» وأخرجه البيهقي مرفوعاً وموقوفاً، وقال: المحفوظ الموقوف.[7]

فانظر ما ورد في هذه الأحاديث من الزجر عن احتقار المسلم، وأنه لا فضل لأحد على أحد، كائنا من كان إلا بالتقوىٰ، وهب أنه لم يكن أحد من الأنبياء تعاطىٰ هذه الحرفة، أفيكون متعاطيها سواهم منقصا لقدرهم؟ سبحانك هذا بهتان عظيم. فقد كان في الصحابة رضي الله عنهم والتابعين وغيرهم من يتعاطىٰ الدباغة والحياكة والحمالة والنجارة وبيع الحطب وحمله، والإسكاف

---

(1) شعب الإيمان، رقم الحديث (٥١٤٦)

(2) مشكاة المصابيح (٣/ ٦٤)

(3) الترغيب والترهيب (٣/ ٣٧٥)

(4) مسند أحمد (٥/ ١٥٨)

(5) الترغيب والترهيب للمنذري (٣/ ٣٧٥) قال الحافظ العلائي: "بكر بن عبدالله المزني عن أبي ذر رضي الله عنه، قال أبو حاتم: هو مرسل" (جامع التحصيل، ص: ١٥)

(6) الترغيب والترهيب (٣/ ٣٧٥) وانظر: شعب الإيمان (٤/ ٢٨٩)

(7) الترغيب والترهيب (٣/ ٣٧٥) وانظر: المعجم الصغير للطبراني (٢/ ٣٨٣) شعب الإيمان (٤/ ٢٨٩) وقال الهيثمي: "رواه الطبراني في الصغير والأوسط، وفيه طلحة بن عمرو، وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٨/ ١٦٠)

واللحام، وأخرج مسلم في صحيحه من حديث جابر بن عبدالله رضی اللہ عنہ أن رسول الله ﷺ رأى امرأته زينب بنت جحش، وهي تمعس منيئة لها، فقضىٰ حاجته منها.[1]

وقوله: "تمعس" قال النووي: أي: تدبغ، والمنيئة بوزن صغيرة وكبيرة وذبيحة، هو الجلد أول ما يوضع في الدباغ.[2] انتهى

وأخرج الجماعة إلا ابن ماجه عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: تصدق على ميمونة بشاة، فماتت فمر بها رسول الله ﷺ، فقال: «هلا أخذتم إهابها فدبغتموه؟» فقالوا: إنها ميتة، فقال: «إنما حرم أكلها»[3] وفي رواية لأحمد: أن داجنا لميمونة رضی اللہ عنہا ماتت، فقال رسول الله ﷺ: «ألا انتفعتم بإهابها؟ ألا دبغتموه؟ فإنه ذكاته»[4]

وأخرج البخاري وأحمد والنسائي من حديث ابن عباس رضی اللہ عنہما عن سودة زوج النبي ﷺ و رضي عنها قالت: ماتت لنا شاة، فدبغنا مسكها، ثم ما زلنا ننبذ فيه حتى صار شنا،[5] وأخرج البخاري أيضاً من حديث أبي مسعود الأنصاري رضی اللہ عنہ قال: كان رسول الله ﷺ إذا أمرنا بصدقة، انطلق أحدنا إلى السوق فيحامل.[6] الحديث

وأخرج البخاري أيضاً من حديث ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: كان لما نزلت آية الصدقة، كنا نحامل. الحديث،[7] وأخرج البخاري من حديث سهل بن سعد رضی اللہ عنہ قال: جاءت امرأة ببردة منسوج في حاشيتها، قالت: يا رسول الله نسجت هذه بيدي لأكسوكها. الحديث[8]

وأخرج البخاري من حديث أبي حازم قال: أتى رجال إلى سهل بن سعد رضی اللہ عنہ يسألونه عن المنبر، قال: بعث رسول الله ﷺ إلى فلانة، امرأة قد سماها سهل، أن مري غلامك النجار، يعمل لي أعواداً، أجلس عليهن إذا كلمت الناس فأمرته فعملها من طرفاء الغابة، ثم جاء بها فأرسلت إلى رسول الله ﷺ بها فأمر بها فوضعت فجلس عليها.[9]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٣)

[2] شرح النووي على صحيح مسلم (٩/ ١٧٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٣٤)

[4] مسند أحمد (١/ ٢٢٧)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٠٨) مسند أحمد (٦/ ٤٢٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٤٠)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٥٣)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٨)

[8] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٨٧)

[9] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٨٨)

وأخرج البخاري من حديث أبي هريرةؓ: «لأن يحتطب أحدكم حزمة على ظهره، خير من أن يسأل أحدا فيعطيه أو يمنعه»[1]

وأخرج أبو داود من حديث أنس بن مالكؓ أن رجلا من الأنصار أتىٰ النبيﷺ يسأل، فقال: «أما في بيتك شيئ؟» قال: بلى، حلس، نلبس بعضه ونبسط بعضه، وقعب، نشرب فيه من الماء، فقال: «ائتني بهما» فأتاه بهما فأخذهما رسول اللهﷺ بيده، وقال: «من يشتري؟» قال رجل: أنا أخذتهما بدرهمين، فأخذ الدرهمين فأعطاهما الأنصاري، وقال: «اشتر بأحدهما طعاما، فانبذه إلى أهلك، واشتر بالآخر قدوما، فأتني به» فأتاه به، فشد فيه رسول اللهﷺ عودا بيده، ثم قال: «اذهب فاحتطب، وبع ولا أرينك خمسة عشر يوما...» الحديث[2]

وأخرج البخاري من حديث أبي مسعود الأنصاريؓ قال: كان رجل من الأنصار، يقال له: أبو شعيب، وكان له غلام لحام، فقال: اصنع لي طعاما، أدعو رسول اللهﷺ خامس خمسة، فدعا رسول اللهﷺ. الحديث[3]

قال الحافظ في الفتح: وفي الحديث إجابة الإمام والشريف والكبير دعوة من هو دونهم وأكلهم طعام ذي الحرفة غير الرفيعة كالجزار، وأن تعاطي مثل ذلك الحرفة، لا يضع قدر من يتوقى فيها ما يكره، ولا تسقط بمجرد تعاطيها شهادته. انتهى[4]

وقد كان بعض المحدثين من رجال البخاري إسكافا، وهو يونس بن أبي الفرات الإسكاف، وهو صانع النعال، فقد ثبت الترغيب في الكسب باليد، وأنه أفضل المكاسب، أخرج البخاري من حديث المقدام بن معديكرب عن النبيﷺ أنه قال: «ما أكل أحد طعاما قط خيراً من أن يأكل من عمل يده، وإن نبي الله داودؑ كان يأكل من عمل يده»[5] قال الحافظ في الفتح: والمراد بالخيرية ما يستلزم العمل باليد من الغنى عن الناس.[6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٤٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٤١) وإسناده ضعيف، لأن فيه أبا بكر الحنفي، قال ابن حجر في التقريب: لا يعرف حاله، وقال في التلخيص: وأعله ابن القطان بجهل حال أبي بكر الحنفي، ونقل عن البخاري أنه قال: لا يصح حديثه. (إرواء الغليل: ٣/ ٣٧١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٢٤)

[4] فتح الباري (٩/ ٥٦٠)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٦)

[6] فتح الباري (٤/ ٣٠٦)

ولابن ماجه من طريق عمر بن سعد عن خالد بن معدان عنه: «ما كسب الرجل أطيب من عمل يده»[1]

وفي فوائد هشام بن عمار عن بقية حدثني عمر بن سعد بهذا الإسناد مثل حديث الباب، وزاد: «من مات كالا من عمله مات مغفورا له»[2] وللنسائي من حديث عائشة رضي الله عنها: «إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه»[3] وفي الباب من حديث سعيد بن عمير عن عمه عند الحاكم،[4] ومن حديث رافع بن خديج عند أحمد،[5] ومن حديث عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده عند أبي داود،[6] وفي الحديث فضل العمل باليد، وتقديم ما يباشره الشخص بنفسه علىٰ ما يباشره بغيره، ويأتي حديث عائشة رضي الله عنها أن الصحابة رضي الله عنهم كانوا عمال أنفسهم.[7]

قال ابن المنذر: إنما يفضل عمل اليد سائر المكاسب، إذا نصح العامل،[8] كما جاء مصرحا به في حديث أبي هريرة رضي الله عنه،[9] والحكمة في تخصيص داود بالذكر أن اقتصاره في أكله على ما يعمله بيده، لم يكن من الحاجة، لأنه كان خليفة في الأرض، كما قال الله تعالىٰ،[10] وإنما ابتغى الأكل من طريق الأفضل، ولهذا أورد النبي ﷺ قصته في مقام الاحتجاج بها على ما قدمه من أن خير الكسب عمل اليد.[11] انتهى

وفي البخاري من حديث أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: «لأن يحتطب أحدكم حزمة على ظهره، خير من أن يسأل أحدا فيعطيه أو يمنعه»[12] وعن رفاعة بن رافع الأنصاري رضي الله عنه أن

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٣٨)

[2] لم أجده بهذا اللفظ، وقد أخرج الطبراني حديثا، ما نصه: «من أمسىٰ كالا من عمل يديه أمسىٰ مغفورا له» وهو ضعيف. انظر: السلسلة الضعيفة (٦/ ١٣٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٢٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٤٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٣٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢٠٨)

[4] المستدرك للحاكم (٢/ ١٢)

[5] مسند أحمد (٤/ ١٤١)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٣٠)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٥)

[8] الأوسط لابن المنذر (١٠/ ٤٤١)

[9] مسند أحمد (٢/ ٣٣٤) ولفظه: «خير الكسب كسب يد العامل إذا نصح»

[10] انظر: سورة صٓ [الآية: ٢٦]

[11] فتح الباري (٤/ ٣٠٦)

[12] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٨)

النبيﷺ سئل: أي الكسب أطيب فقال: «عمل الرجل بيده، وكل بيع مبرور»[1] قال الحافظ ابن حجر في بلوغ المرام: رواه البزار وصححه الحاكم.[2] انتهى

قال العلامة الشرقاوي: قوله: «أيّ الكسب أفضل؟» أي أيّ طرق الكسب بمعنى المكسوب، والمسئول عنه الطرق بدليل الجواب، والرجل وصف طردي، لا مفهوم له، والتقييد باليد جرىٰ على الغالب، فمثل ذلك عملوا به بنوا عليه، والحديث فيه إشارة إلى الصناعة، وقال السيد محمد الأمير في شرح بلوغ المرام: والحديث فيه دليل على ما جبلت عليه الطبائع من طيب المكاسب، وإنما سئلﷺ عن أطيبها أي أجلها وأبركها، وتقديم عمل اليد على البيع المبرور دال على أنه الأفضل، ويدل له حديث البخاري، ودل على أطيبية الصنعة والتجارة. انتهى[3]

وقد استدل بالحديث أيضاً على مشروعية الإجارة من جهة أن عمل اليد عام من أن يكون للغير وللنفس، ولا يخفىٰ أيضاً أن الكسب أعم من أن يكون بعمل اليد وبغيرها، ولا يخفىٰ أن الحياكة فرد من أفراد الكسب باليد فهي أفضل المكاسب فالطاعن بأن متعاطيها ليس بشريف، وأن عقله في دبره، وأنه رذيل، طاعن في سلف الأمة وخلفها، فيجب عليه التوبة والاستغفار وإلا فيبوء من الله العزيز القهار بأقبح عذاب في دار الدنيا قبل دار البوار، فإنه قد ارتكب الاثم العظيم بتحقير المسلم المتعاطي بيده ما يغنيه عن سؤال الناس، وفقنا الله وإياه لما يحب ويرضىٰ.

هذا وأما حديث: «العرب أكفاء بعضهم لبعض، قبيلة لقبيلة، وحي لحي، ورجل لرجل إلا حائك أو حجام» فقال الحافظ ابن حجر في التلخيص: رواه الحاكم من حديث ابن جريج عن ابن أبي مليكة عن ابن عمر به، والراوي عن ابن جريج لم يسم، وقد سأل ابن أبي حاتم عنه أباه، فقال: هذا كذب لا أصل له. وقال في موضع آخر: هذا باطل.

ورواه ابن عبد البر في التمهيد من طريق بقية عن زرعة عن عمران بن أبي الفضل عن نافع عن ابن عمر. قال الدارقطني في العلل: ولا يصح. وقال ابن حبان: عمران بن أبي الفضل، يروي الموضوعات عن الثقات، وقال ابن أبي حاتم: سألت أبي عنه، فقال: منكر، وقد حدث به هشام عن عبيد الله الرازي فزاد فيه بعد أو حجام: أو دباغ، فاجتمع عليه الدباغون، وهموا به، وقال ابن عبد البر: هذا منكر موضوع.

وذكره ابن الجوزي في العلل المتناهية من طريقين إلى ابن عمر، في أحدهما علي بن

---

[1] مسند البزار (٢/ ٥٥)

[2] بلوغ المرام من أدلة الأحكام (٧٨٤)

[3] سبل السلام شرح بلوغ المرام للصنعاني (٣/ ٤)

عروة، وقد رماه ابن حبان بالوضع، وفي الأخرى محمد بن الفضل بن عطية، وهو متروك، والأولىٰ في ابن عدي، والثانية في الدارقطني، وله طريق أخرى عن غير ابن عمر، رواه البزار في مسنده من حديث معاذ بن جبل: «العرب بعضها لبعض أكفاء، والموالي بعضها أكفاء لبعض» وفيه سليمان بن أبي الجون، قال ابن القطان: لا يعرف، ثم هو من رواية خالد بن معدان عن معاذ، ولم يسمع منه، ويخالف هذا الحديث ما رواه أبو داود من طريق محمد بن عمرو عن أبي سلمة عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ مرفوعا: «يا بني بياضة! انكحوا أبا طيبة، وأنكحوا إليه، وكان حجاما»[1] إسناده حسن. انتهى كلام الحافظ في التلخيص.[2]

وقد ثبت أن كسب الحجام خبيث، ولكن لا يلزم من خباثة الكسب خباثة المكتسب، ولا كونه رذيلًا، كما تقدم فيما نقلنا عن فتح الباري، ولهذا أمر النبي صلی اللہ علیہ وسلم بأن ينكحوه وينكحوا إليه، فالحائك أي خباثة في كسبه، حتى ينسب إلى أنه رذيل؟ فهو أعلىٰ من الحجام، مع كون الحجام متعاطيا لإخراج الدم المستقذر شرعاً وعقلًا. والله سبحانه وتعالىٰ أعلم[3]

[اس سائل کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صحیح اور غیر صحیح تمام احادیث کو جاننے کا دعویٰ کیا ہے، کیوں کہ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی نبی کے متعلق یہ ثابت نہیں کہ وہ جولاہا تھا۔ پھر بالخصوص آدم علیہ السلام کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ ان کا جولاہا ہونا ثابت نہیں، پھر اس نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کاشت کار تھے۔ یہ درحقیقت اس سائل کی ڈھٹائی اور اللہ اور اس کے رسول پر افترا پردازی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰى اِلَى الْاِسْلَامِ﴾ [الصف: ٧]

[اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، جب کہ اسے اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو]

نیز فرمایا:

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ [الإسراء: ٣٦]

[اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک، اس کے متعلق سوال ہوگا]

کیوں کہ آدم علیہ السلام کا ان محدثین کے قاعدے کے مطابق جولاہا ہونا کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے کہ جب وہ ثبوت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد صحت ہوتی ہے، بلکہ یہ ایک سخت ضعیف حدیث ہے۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٠٢)

[2] التلخيص الحبير (٣/ ١٦٤)

[3] هذه الفتيا للشيخ الإمام حسين بن محسن الأنصاري، وهي موجودة في فتاواه المطبوعة (١/ ٤٤)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں:

''مستدرک حاکم میں ایک سخت ضعیف سند کے ساتھ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ داود (علیہ السلام) زرہ ساز تھے، آدم (علیہ السلام) کسان تھے، نوح (علیہ السلام) بڑھئی تھے، ادریس (علیہ السلام) درزی تھے اور موسیٰ (علیہ السلام) چرواہے تھے۔''

دیکھو! کس طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ حدیث کی سند سخت ضعیف ہے! پھر دیکھو یہ جاہل شخص کتنی ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ وہ ثابت ہے؟

لیکن اگر اس کے نزدیک ثبوت سے مراد صحت اور حسن سے قطع نظر صرف حدیث کا وارد ہونا ہے تو دیلمی نے مسند فردوس میں انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے بُنائی کا پیشہ اختیار کیا، وہ آدم علیہ السلام تھے۔ چناں چہ اس معترض کے دعوے کے مطابق دیلمی کی روایت کردہ اس حدیث کا قبول کرنا بھی لازم ہے، اگر چہ وہ ضعیف ہے اور اسے چاہیے کہ وہ اس حدیث کا انکار نہ کرے، لوگوں کو حقیر جاننے اور ان کی عزتوں میں طعن و تشنیع میں جلد بازی نہ کرے، کیوں کہ یہ اہلِ جاہلیت اور تکبر پسند لوگوں کا شیوہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ [الحجرات: ۱۱]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کوئی قوم کسی قوم سے مذاق نہ کرے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ کوئی عورتیں دوسری عورتوں سے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ اپنے لوگوں پر عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں کے ساتھ پکارو، ایمان کے بعد فاسق ہونا برا نام ہے اور جس نے توبہ نہ کی، سو وہی اصل ظالم ہیں]

نیز فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۳]

[اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادے سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ تقوے والا ہے]

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، جو اس پر ظلم کرتا ہے، اسے رسوا کرتا ہے اور نہ اسے کمتر سمجھتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سینے کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ کسی آدمی کے بدتر ہونے کے لیے یہی کافی

ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو کم تر خیال کرے۔ ایک مسلمان کی ہر چیز: خون، ناموس اور مال دوسرے مسلمان پر حرام (احترام کے لائق) ہے۔''

نیز صحیح مسلم ہی میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا، جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہے۔ یہ سن کر ایک آدمی نے کہا: بے شک بندہ پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اور جوتا اچھا ہو؟ فرمایا: تکبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔''

حافظ منذری رحمہ اللہ ''الترغیب والترھیب'' میں فرماتے ہیں کہ ارشادِ نبوی میں مذکور لفظ «بَطَرُ الْحَقِّ» کا معنی حق کا انکار کرنا اور اس کو رد کر دینا ہے اور «غَمْطُ النَّاسِ» کا معنی لوگوں کو حقیر اور کم تر خیال کرنا ہے، جیسا کہ مستدرک حاکم کی حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

سنن ترمذی میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک اللہ نے تمھارے جاہلی غرور اور آبا و اجداد پر فخر کو ختم کر دیا ہے، اب صرف مومن پرہیز گار ہے اور فاجر بدبخت۔ تمام لوگ آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے (پیدا کیے گئے) ہیں۔ مرد حضرات مختلف اقوام کے ساتھ فخر کرنا چھوڑ دیں، وہ تو صرف دوزخ کے کوئلے ہیں، وگرنہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کیڑے سے بھی زیادہ حقیر ہو جائیں گے، جو اپنی ناک سے گندگی اٹھاتا ہے۔''

نیز سنن ترمذی ہی میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے جاہلی غرور اور آبا و اجداد پر فخر کا خاتمہ کر دیا ہے۔ لوگوں کی اب دو ہی قسمیں ہیں: نیک پرہیز گار اللہ کے نزدیک معزز اور فاجر بدبخت اللہ کے نزدیک حقیر ترین شخص۔ تمام لوگ آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں اور آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ [الحجرات: ۱۳]

[اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادے سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ تقوے والا ہے، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے]

معجم کبیر طبرانی میں حبیب بن خراش رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں، کسی ایک کو دوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں سوائے تقوے کے۔''

حافظ مناوی نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسل حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یقیناً لوگوں کا مذاق اڑانے والوں میں سے ایک شخص کے لیے آخرت میں جنت کا ایک دروازہ کھولا جائے گا، پھر اسے کہا جائے گا: ادھر آؤ! ادھر آؤ! جب وہ اپنے دکھ اور تکلیف کے ساتھ آئے گا تو اس کے سامنے اسے بلند کر دیا جائے گا۔ پھر اس کے لیے ایک دروازہ کھولا جائے گا تو اسے کہا جائے گا: ادھر آؤ! ادھر آؤ! تو وہ ناامیدی کی بنا پر اس کے پاس نہیں آئے گا۔''

امام احمد اور بیہقی رحمہما اللہ نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تمھارے یہ نسب کسی کے لیے باعثِ عار نہیں ہیں۔ تم آدم کی اولاد ہو، جیسے ایک صاع دوسرے صاع کے برابر ہوتا ہے۔ کسی کو دوسرے پر دین یا صالحیت کے علاوہ کسی لحاظ سے کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''کسی کو دوسرے پر دین یا نیک عمل کے علاوہ کسی لحاظ سے برتری حاصل نہیں ہے۔ آدمی (کے برا ہونے) کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ فحش گو، زبان دراز اور بخیل ہو۔''

اسی کی ایک دوسری روایت میں ہے:

''کسی کو دوسرے پر دین یا تقوے کے سوا کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ کسی شخص (کے برا ہونے) کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ زبان دراز، فحش گو اور بخیل ہو۔''

مذکورہ بالا حدیث میں مذکور لفظ «طف الصاع» کا مطلب ہے کہ تم ایک دوسرے کے قریب ہو، جیسا کہ ترغیب وترہیب میں ہے۔

مسند احمد میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ یقیناً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''دیکھو! تم کسی سفید اور نہ کالے رنگ والے سے بہتر ہو، البتہ تم اس پر تقوے کی بنا پر برتری حاصل کر سکتے ہو۔'' حافظ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے روات ثقہ ہیں، البتہ ابوبکر بن عبداللہ بن مزنی نے ابو ذر سے نہیں سنا۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایامِ تشریق کے درمیان والے دن میں خطبہ ارشاد فرمایا تو کہا:

''لوگو! یقیناً تمھارا رب ایک ہے اور یقیناً تمھارا باپ بھی ایک ہے۔ سن لو! کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سفید کو کالے پر اور نہ کالے کو سفید پر کوئی برتری حاصل ہے، سوائے تقوے کے۔ بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ شخص ہے، جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ سن لو! کیا میں نے (رب کا پیغام) پہنچا دیا ہے؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں! اے اللہ کے رسول ﷺ! فرمایا: پس

یہاں موجود شخص غیر حاضر کو بھی یہ پیغام پہنچا دے۔'' پھر خون اور مال کی حرمت کے سلسلے میں (بیہقی نے) مکمل حدیث روایت کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں راوی مجہول ہے۔

معجم طبرانی اوسط وصغیر میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب قیامت کا دن ہوگا، اللہ ایک اعلان کرنے والے کو حکم دے گا تو وہ اعلان کرے گا: سن لو! بے شک میں نے ایک نسب مقرر کیا تھا اور ایک نسب تم نے بنایا تھا، چناں چہ میں نے تم میں سے سب سے زیادہ اس شخص کو معزز بنایا تھا، جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے، لیکن تم نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا اور صرف یہی کہا کہ فلاں شخص فلاں شخص سے بہتر ہے۔ چناں چہ آج کے دن میں اپنا (مقرر کیا ہوا) نسب بلند کروں گا اور تمھارے (طے کردہ) نسب کو پست کروں گا۔ اس حدیث کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح سے بیان کیا اور کہا ہے کہ اس کا موقوف ہونا ہی محفوظ اور درست ہے۔''

دیکھو! ان احادیث میں مسلمان کو کم تر سمجھنے پر کتنی زجر وتوبیخ مذکور ہے اور یہ کہ کسی ایک کو، خواہ وہ کوئی ہو، دوسرے پر تقوے کے سوا کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ قطع نظر اس بات سے کہ کوئی نبی اس پیشے سے وابستہ نہیں تھا تو ان کے علاوہ جو شخص ایسے پیشے سے منسلک ہے، کیا وہ اس کی قدر ومنزلت کو کم کرنے والا ہے؟ یہ تو صریحاً بہتان طرازی ہے۔ یقیناً کئی صحابہ کرام اور تابعین عظام وغیرہم چمڑا رنگنے، بنائی، بوجھ برداری، لکڑیاں بیچنے اور اٹھانے، جوتا سازی اور گوشت فروشی کے پیشے سے منسلک تھے۔

صحیح مسلم میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی زینب بنت جحش کو دیکھا کہ وہ کھال کو دباغت دے رہی ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اپنی حاجت پوری کی۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں مذکور لفظ «تَمْعَسُ» کا معنی ہے کہ وہ چمڑا رنگ کر اس کی صفائی کر رہی تھیں اور ''المنیئۃ'' کا معنی وہ چمڑا جسے رنگنا شروع کیا جائے۔

صحیح بخاری ومسلم، سنن ابی داود وترمذی اور نسائی میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا (کی لونڈی) کو صدقے میں ایک بکری دی گئی تو وہ مر گئی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا: تم نے اس کی کھال لے کر اسے رنگ کیوں نہیں لیا؟ تو انھوں نے کہا کہ وہ مردار ہے؟ فرمایا: اس کا صرف کھانا حرام ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی ایک بکری مر گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے اس کی کھال سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا اور اس کو رنگ کیوں نہیں لیا؟ کیوں کہ وہ اس کو پاکیزہ بنا دیتا ہے۔

صحیح بخاری، مسند احمد اور سنن نسائی میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ام المومنین سودہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

''ہماری ایک بکری مر گئی تو ہم نے اس کا چمڑا رنگ لیا، پھر ہم اس میں ہمیشہ نبیذ بناتے رہے، حتی کہ وہ

ایک بوسیدہ مشکیزہ بن گیا۔"

صحیح بخاری ہی میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت ایک بُنی ہوئی حاشیہ دار چادر لے کر آئی اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ چادر میں نے اپنے ہاتھوں سے بنی ہے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہناؤں۔

صحیح بخاری میں ابو حازم کی حدیث مروی ہے کہ چند اشخاص سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کے پاس منبر سے متعلق پوچھنے کے لیے آئے تو انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں عورت (سہل رضی اللہ عنہ نے اس کا نام لیا تھا) کی طرف پیغام بھیجا کہ اپنے بڑھئی غلام کو حکم دو کہ وہ میرے لیے لکڑی (کا منبر) بنائے، جس پر لوگوں سے بات چیت کرتے وقت میں بیٹھ جایا کروں، چنانچہ اس عورت نے اپنے غلام کو حکم دیا تو وہ جنگل کی ایک لکڑی جھاؤ سے منبر بنا کر لے آیا۔ پھر اس عورت نے وہ منبر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رکھنے کا حکم دیا، پھر اس کے اوپر بیٹھے۔

صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ وہ شخص جو اپنی پیٹھ پر لکڑی کا گھٹا اٹھا کر لائے، اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی سے بھیک مانگے تو کوئی دے یا نہ دے۔

سنن ابی داود میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مانگنے کے لیے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھارے گھر میں کچھ نہیں ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں! ایک معمولی چادر ہے، جس کا ایک حصہ ہم اوڑھتے اور دوسرا حصہ بچھا لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے، جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ فرمایا: وہ دونوں چیزیں میرے پاس لے کر آؤ۔ وہ انھیں لے کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا: کون یہ خریدے گا؟ ایک شخص نے کہا: میں یہ دونوں چیزیں دو درہم میں خریدتا ہوں، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دو درہم لے کر انصاری کو دیے اور فرمایا: ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر والوں کو دے دو اور دوسرے کا ایک کلہاڑا خرید لو اور میرے پاس لے کر آؤ۔ وہ لے کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس میں دستہ ٹھونک دیا، پھر فرمایا: جاؤ، لکڑیاں کاٹو اور بیچو اور میں تمھیں پندرہ دن نہ دیکھوں۔

صحیح بخاری میں ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ انصار قبیلے کا ایک شخص تھا، جسے ابو شعیب کہا جاتا تھا، اس کا ایک غلام قصاب تھا تو اس (ابو شعیب) نے کہا: میرے لیے کھانا تیار کرو، میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ افراد کے ساتھ بلانا چاہتا ہوں، پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے امام، رئیس اور بڑے شخص کا اپنے سے کم تر کی دعوت قبول کرنا اور معمولی پیشے سے، جیسے قصاب ہے، وابستہ افراد کا کھانا کھانا مستفاد ہوتا ہے اور یہ کہ اس طرح کا پیشہ اپنانا اس کے مکروہات سے اجتناب کرنے والے کی قدر و منزلت کم کرتا ہے نہ اس کو اپنانے سے اس کی شہادت رد ہوتی ہے۔ صحیح بخاری کے رواۃ میں سے بعض محدثین موچی تھے، جن کا نام یونس بن ابی الفرات الاسکاف ہے، وہ جوتا سازی کا کام کرتے تھے۔

نیز ہاتھ سے کمانے کی ترغیب بھی مروی ہے اور یہ کہ وہ تمام کاموں میں سے افضل ہے۔ صحیح بخاری میں مقدام بن معدیکرب کی حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کسی شخص نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے زیادہ بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا اور بے شک اللہ کے نبی داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھایا کرتے تھے۔''

حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ خیریت سے مراد ہے کہ کوئی شخص اپنے ہاتھ کی کمائی کی بنا پر لوگوں سے مستغنی ہو جائے۔ سنن ابن ماجہ میں مروی ہے کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے زیادہ پاکیزہ کمائی کسی شخص نے نہیں کی ہے۔ فوائد ہشام بن عمار میں اس حدیث کے بعد یہ زائد الفاظ مروی ہیں کہ جو شخص اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتا ہوا وفات پا گیا، اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔

سنن نسائی میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مروی ہے کہ آدمی کا سب سے پاکیزہ کھانا، اس کی کمائی سے ہوتا ہے۔ اسی موضوع پر مستدرک حاکم میں ایک حدیث سعید بن عمیر رحمہ اللہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں اور مسند احمد میں رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور سنن ابی داود میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے۔ حدیث میں ہاتھ کے ساتھ کام کرنے کی فضیلت اور دوسرے سے کام کروانے کے بجائے اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی فوقیت کا ذکر ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے کام از خود کیا کرتے تھے۔

امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہاتھ کی کمائی دوسرے کاموں پر اس وقت فوقیت رکھتی ہے، جس وقت کام کرنے والا خیر خواہی کا مظاہرہ کرے، جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کی صراحت آتی ہے۔ داود علیہ السلام کو خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کی کمائی پر جو اکتفا کرتے تھے وہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ ضرورت مند تھے، کیوں کہ وہ تو زمین میں بادشاہ تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، بلکہ صرف افضل ہونے کی بنا پر انھوں نے اس کمائی کو اختیار کیا تھا، اسی وجہ سے نبیِ کریم ﷺ نے یہ بات فرمانے کے بعد کہ ہاتھ کی کمائی سب سے بہتر ہے، داود علیہ السلام کا تذکرہ اس کی دلیل کے طور پر فرمایا ہے۔

صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اپنی کمر پر لکڑی کا گٹھا اٹھا کر لائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے کہ کسی سے بھیک مانگے، وہ اس کو دے یا نہ دے۔''

رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ سے سوال کیا گیا: کون سی کمائی سب سے زیادہ پاکیزہ ہے؟ فرمایا: ''آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور شریعت کے مطابق ہر حلال تجارت۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''بلوغ المرام'' میں کہا ہے کہ اس حدیث کو بزار رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

علامہ شرقاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "أي الكسب أفضل"کا مطلب ہے کہ کون سا پیشہ سب سے بہتر ہے، کیوں کہ سوال پیشوں کے بارے میں ہوا تھا، جیسا کہ جواب سے معلوم ہوتا ہے اور آدمی کا وصف عام ہے، جس کا کوئی مفہوم (مخالف) نہیں ہے۔ ہاتھ کی قید بھی کثرت کی بنا پر لگائی گئی ہے، اسی پر انھوں نے اپنے عمل کی بنیاد رکھی ہے اور اس حدیث میں صنعت وحرفت کی طرف اشارہ ہے۔ امام صنعانی (سبل السلام) شرح بلوغ المرام میں فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ تمام پیشے پاکیزہ ہیں، جیسا کہ لوگوں کی طبیعتیں انھیں پسند کرتی ہیں۔ نبیِ کریم ﷺ سے صرف یہ سوال کیا گیا تھا کہ کون سا پیشہ سب سے زیادہ پاکیزہ ہے؟ یعنی سب سے زیادہ افضل اور برکت والا ہے۔ حلال تجارت کو ہاتھ کے عمل پر مقدم کرنا اس کے افضل ہونے کی دلیل ہے اور صحیح بخاری کی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی اور بتاتی ہے کہ صنعت وتجارت ہی سب سے زیادہ پاکیزہ ہیں۔

نیز اس حدیث سے اجرت پر کام کرنے کے جواز کی دلیل معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ ہاتھ کے ساتھ کام کرنا، دوسرے اور اپنے دونوں کے لیے ہوتا ہے، اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ کمائی کرنا ہاتھ اور کسی دوسرے آلے دونوں سے ہٹ کر بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بُنائی کرنا بھی ہاتھ سے کمائی کرنے ہی کا ایک فرد ہے، پس یہ تمام پیشوں میں سے افضل ہے، لہٰذا یہ طعن وتشنیع کرنے والا کہ اس پیشے کو اپنانے والا آدمی معزز نہیں اور یہ کہ اس کی عقل پچھواڑے میں ہے اور وہ حقیر شخص ہے، درحقیقت امت کے سلف وخلف میں طعن کرنے والا ہے، چناں چہ اس پر توبہ واستغفار کرنا واجب ہے، وگرنہ وہ ہلاکت کے گھر (جہنم) سے قبل ہی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبیح ترین عذاب کا حق دار ہوگا، کیوں کہ اس نے ایک مسلمان کو، جو اپنے ہاتھ سے کام کر کے لوگوں سے بھیک مانگنے سے بچنے کا بندوبست کر رہا ہے، حقیر جان کر بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور اسے اپنے مرضیات کی توفیق سے نوازے۔

علاوہ ازیں اس حدیث ''عرب کا ایک قبیلہ، دوسرے قبیلے کے، ایک خاندان دوسرے خاندان کے اور ایک شخص دوسرے شخص کا ہم پلہ (برابر) ہے، سوائے جولاہے اور حجام (سینگی لگانے والے) کے۔'' کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص میں فرماتے ہیں کہ اسے حاکم نے ابن جريج عن ابن أبي عن ابن عمر کی سند سے روایت کیا ہے اور ابن جریج سے روایت کرنے والے شخص کا نام مذکور نہیں۔

امام ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: یہ جھوٹ ہے، اس کی کوئی اصل نہیں اور ایک دوسری جگہ کہا کہ یہ باطل ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے ''تمہید'' میں اسے بقية عن زرعة، عن عمران بن أبي الفضل عن نافع عن ابن عمر کی سند سے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے علل میں کہا ہے کہ یہ (حدیث) صحیح نہیں ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمران بن ابی الفضل ثقہ راویوں سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے اپنے والد سے اس (حدیث) کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ یہ منکر ہے۔

اس حدیث کو ہشام نے عبیداللہ رازی سے روایت کیا تو اس میں ''حجام'' کے بعد "أو دباغ" (یا چمڑا رنگنے والا) کے الفاظ کا اضافہ کر دیا، جس کے نتیجے میں چمڑا رنگنے والے اس کے خلاف اکٹھے ہوگئے اور انھوں نے اسے قتل کرنے کا تہیا کر لیا۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت منکر اور موضوع ہے۔ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس کو عللِ متناہیہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما تک دو سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ایک میں علی بن عروہ راوی ہے، جسے ابن حبان رحمہ اللہ نے وضع (حدیث بنانا) کے ساتھ متہم قرار دیا ہے اور دوسری سند میں محمد بن فضل بن عطیہ ہے جو متروک ہے۔ پہلی روایت (الکامل) ابن عدی میں ہے اور دوسری دارقطنی میں ہے۔ اس کی ابن عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ ایک اور سند بھی ہے، جسے بزار رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ عرب ایک دوسرے کے برابر ہیں اور موالی (غلام) آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اس کی سند میں سلیمان بن ابی جون راوی ہے۔ ابن القطان نے کہا ہے: وہ نامعلوم ہے۔

مزید برآں یہ حدیث خالد بن معدان نے معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، حالاں کہ اس نے معاذ رضی اللہ عنہ سے سماع ہی نہیں کیا اور اس کے مخالف وہ حدیث ہے جو سنن ابی داود میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اے بنی بیاضہ! ابو طیبہ سے نکاح کرو اور کرواؤ۔ حالاں کہ وہ حجام (سینگی لگانے والا) تھا۔ اس کی سند حسن ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا کلام ختم ہوا۔

ایک صحیح حدیث میں مروی ہے کہ حجام کی کمائی خبیث ہے، لیکن کمائی کی خباثت سے پیشے کا ناپاک اور حقیر ٹھہرنا ضروری نہیں، جیسا کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں فتح الباری سے نقل کیا ہے۔ اسی لیے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ نکاح کرنے اور کروانے کا حکم دیا تھا۔ پس جولاہے کی کمائی میں کون سی ناپاکی ہے کہ اسے حقیر اور کم تر کہا جائے؟ حالاں کہ وہ حجام سے برتر ہے، جب کہ حجام تو عقلی اور شرعی لحاظ سے گندے خون کو نکالنے کا کام کرتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم]

مسئلہ امامت و بیعت:[1]

سوال کیا فرماتے ہیں علماے دین و مفتیانِ شرع متین مسائل ذیل میں:

① متعدد مواضع کے لوگوں نے ایک عالم متدین کو پسند کر کے اسلامی امور کے بندوبست کے لیے اس کے ہاتھ پر بطوع خاطر بیعت کی اور چند مدت تک تابع داری کرتے آئے۔ اب بعض لوگوں کے اغوا سے بجرم ایں کہ متبوع حقہ نوش وغیرہ کے مکان میں ضیافت کھاتا ہے، لہٰذا بیعت سابقہ توڑ کر دوسرے عالم کے ہاتھ پر کریں تو یہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

② جو لوگ جدوجہد سے لوگوں کو بیعت سابقہ توڑنے کی فتنہ میں ڈالے اور اغوا سے جماعت مستقرہ میں یہ فساد ڈال

---

[1] فتاویٰ علماے کرام دربارہ تقرر امام، مرتبہ ابو العصام محمد عبدالرحمٰن رحمہ اللہ گنگولی (ص: ۲۷)

کر آپس کی اصلاح توڑنے کو برانگیختہ کریں تو یہ لوگ کیسے ہیں اور شرعاً یہ کارروائی جائز ہے یا نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمين، وصلىٰ الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه، وأفضل رسله خاتم النبيين محمد وآله وأصحابه وأزواجه وذرياته وأهل بيته أجمعين. أما بعد!

فالجواب عن السؤال الأول: إذا ولىٰ أهل قرية أو قريات من المسلمين الذين هم تحت ولاة غير مسلمين، رجلًا مسلماً، من العلماء المتدينين علىٰ أنفسهم، ليأمرهم بالمعروف، و ينهاهم عن المنكر، ويقيم فيهم الجمع والجماعات والأعياد وغير ذلك من الأحكام الشرعية التي لا يزاحمها تلك الولاة، وبايعوه علىٰ أن لا يعصوه في ذلك أو أقروا به علىٰ أنفسهم، جازت هذه التولية بلا مرية، بل يجب علىٰ كل عدد يبلغون ثلاثة فصاعداً أن يولوا عليهم أحدهم، وذلك لأن التفريق منهي عنه. قال الله تعالىٰ: ﴿وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ فلا بد من الاجتماع، والاجتماع لا يتأتىٰ إلا بناظم ينظمهم، ووال يجمعهم، فلا بد من النظم والتولية، وقد قال رسول الله ﷺ: ((إذا كان ثلاثة في سفر فليؤمروا أحدهم)) رواه أبو داود عن أبي سعيد الخدري.[1] (مشكاة)

وإذا وجب هذا التأمير علىٰ ثلاثة يسافرون فوجوبه علىٰ عدد أكثر من ذلك أولىٰ، ثم لما ولوا من ولوه علىٰ أنفسهم لم يجز لهم عزله و خلعهم لبيعته وخروجهم عن طاعته، وإن رأوه يأتي شيئاً من معصية الله ما أقام فيهم الصلاة، نعم يجب عليهم أن يكرهوا ما يأتي من معصية الله لما قال رسول الله ﷺ: ((خيار أئمتكم الذين تحبونهم، ويحبونكم، وتصلون عليهم ويصلون عليكم، وشرار أئمتكم الذين تبغضونهم ويبغضونكم، وتلعنونهم ويلعنونكم)) قال: قلنا: يا رسول الله أفلا ننابذهم عند ذلك؟ قال: ((لا! ما أقاموا فيكم الصلاة. لا! ما أقاموا فيكم الصلاة إلا من ولي عليه وال فرآه يأتي شيئاً من معصية الله فليكره ما يأتي من معصية الله، ولا ينزعن يدا من طاعة)) رواه مسلم عن عوف بن مالك الأشجعي. (مشكاة، ص: ٢١٩)[2]

وبهذا تبين أن الأمور المذكورة في السؤال من مخالطة الوالي من يشرب التنباك وغير ذلك مما ذكر، ليس شيئ منها يسوّغ لهم عزله وخلعهم لبيعته، وخروجهم عن طاعته فضلا أن يوجب عليهم ذلك، لأنه ليس منها ترك إقامته الصلاة الذي هو شرط جواز ذلك. والله

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٠٩) مشكاة المصابيح (٢/ ٣٨٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٥)

تعالىٰ أعلم بالصواب.

فالجواب عن السؤال الثاني: أما حكم هذه البيعة الثانية فهو أنها غير جائزة أصلًا، لما فيها من التفريق والغدر، وهما غير جائزين لما مر ولما سيأتي، وأما حكم الساعيين فيها فهو أنهم ساعون فيما لا يجوز من التفريق والغدر فهم عصاة، وكذلك حكم المولوي المذكور، وأما حكم الجماعة الذين خرجوا من طاعة الوالي الأول فهو أنهم غادرون، والغدر خصلة من خصال النفاق، ومعصية كبيرة، فقد قال رسول اللهﷺ: ((أربع من كن فيه كان منافقاً خالصاً، ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها: إذا اؤتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر)) رواه الشيخان عن عبدالله بن عمرو.[1] (مشكاة)

وقال رسول اللهﷺ: ((لكل غادر لواء يوم القيامة، يعرف به)) رواه الشيخان عن أنس.[2] (مشكاة) و روى مسلم عن أبي سعيد عن النبيﷺ: قال لكل غادر لواء عند استه يوم القيامة.[3] (مشكاة)

وأما ما يجب علىٰ جميع هٰؤلاء فهو التوبة والإنابة إلىٰ الله تعالىٰ عن جميع ما ارتكبوه من الغدر والسعي في الفساد وغير ذلك. قال الله تعالىٰ: ﴿قُلْ يَا عِبَادِیْ...﴾ إلىٰ آخر الآيتين، والله تعالىٰ أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله الغازيفوري

أصاب من أجاب. حرره: عبد النور الدربهنگوی

الجواب صحيح. كتبه: أبو بكر محمد شيث جونفوري

جواب سوال اول:

جب ایک یا کئی بستی والے مسلمان، رعایا غیر حکامِ اسلام، کسی مسلمان کو علمائے متدینین سے اپنے لیے والی بنا دیں، تا کہ ان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے اور ان میں جمعہ، جماعات و اعیاد وغیرہ احکامِ شرعیہ قائم کرے کہ جن کی حکامِ وقت مزاحمت نہیں کرتے اور بیعت کریں اس سے اس امر پر کہ اس میں نافرمانی نہ کریں گے اور اقرار کر لیں اپنی جانوں پر تو اس طرح کی تولیت بلاشک جائز ہے، بلکہ واجب ہے ہر ان عدد پر کہ تین یا زائد کو پہنچ جائیں کہ ایک کو اپنے لیے ان میں سے والی بنا دیں، اس وجہ سے کہ تفریق شرعاً منہی عنہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (یعنی فرقہ فرقہ مت ہو جاؤ) لہٰذا اجتماع ضروری ہے اور بلا ناظم و والی کے یہ انتظام و اجتماع حاصل نہیں ہو سکتا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٨)

بدیں وجہ انتظامِ ناظم وتولیتِ والی ضروری ہے۔ تحقیق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کہ تین ہوں سفر میں تو ان کو چاہیے کہ ایک کو ان میں سے امیر بنائیں۔ جب یہ امیر بنانا تین مسافروں کے لیے واجب ہوا تو پھر وجوب اس کا اِن سے زائد پر بہت ہی لائق و اولیٰ ہوا۔ پھر جب وہ اس کو والی اپنے نفسوں پر قرار دے چکے ہیں، اب ان کے واسطے جائز نہیں کہ اس کو معزول کر دیں یا اس کی بیعت اتار دیں اور اس کی اطاعت سے نکل جائیں، اگرچہ اس کو کسی شئے کا معصیتِ خدا سے مرتکب دیکھیں، جب تک وہ ان میں نماز قائم کرتا رہے۔

ہاں البتہ واجب ہے ان پر کہ برا جانے اس امر کو جو وہ معصیتِ خدا کرتا ہے، بدلیل فرمانِ رسول اللہ ﷺ کہ بہتر امام تمھارے وہ ہیں، جو تمھیں دوست رکھیں اور تم ان کو دوست رکھو اور تم دعا کرو ان کے حق میں اور وہ دعا کریں تمھارے حق میں اور بدتر امام تمھارے وہ ہیں، جو تم کو مبغوض جانیں اور تم ان کو جانو، وہ تم پر لعنت برسائیں اور تم ان پر لعنت برساوَ۔ ہم نے کہا: اے رسولِ خدا! کیا ہم ایسے موقع پر ان کی بیعت وعہد ان کی طرف ڈال نہ دیں؟ فرمایا: نہیں! جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں۔ خبردار! جس شخص پر کوئی والی ہو اور اس کو معصیتِ خدا کا مرتکب دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اُسی معصیتِ خدا ہی کو برا جانے اور اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ وہ امور جو سوال میں مذکور ہیں مثل تنباک وغیرہ پینے والے کے ساتھ والی کا ملنا تو ان میں ایسا کوئی امر نہیں ہے کہ جس کے سبب سے اس کا معزول کرنا یا اس کی بیعت توڑ دینا یا اس کی اطاعت سے خارج ہونا جائز ہو، چہ جائے کہ ان پر اس کو واجب قرار دیا جائے، کیوں کہ سوال میں مذکورہ بالا امور میں ترک اقامتِ صلاۃ نہیں ہے جو اس کے جواز کی شرط ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب.

جواب سوال ثانی:

بیعت ثانیہ کا حکم یہ ہے کہ وہ ہرگز جائز نہیں، چوں کہ اس سے تفریق اور بے وفائی لازم آتی ہے، لہٰذا یہ دونوں جائز نہیں، جیسا کہ گزر چکا اور عن قریب آتا ہے۔ نیز حکم اس امر میں کوشش کرنے والوں کا یہ ہے کہ وہ ناجائز امر مثل تفریق و بے وفائی میں سعی کرنے والے ہیں، لہٰذا وہ عاصی ٹھہرے، اسی طرح سے حکم مولوی صاحب مذکور کا (جو سوال میں واقع ہوئے ہیں) اور حکم اس جماعت کا؛ جو طاعتِ والی اول سے خارج ہو بیٹھی ہے، بے وفا ہیں اور بے وفائی نفاق کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے اور کبیرہ گناہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چار چیزیں ہیں، جن میں وہ ہوں وہ خالص منافق ہوتا ہے اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو، اس میں ایک خصلت نفاق کی ہے، حتی کہ وہ اس کو ترک کر دے: ① امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ ② جب باتیں کرے تو جھوٹی کرے۔ ③ جب عہد و پیمان کرے تو بے وفائی کرے۔ ④ جب

جھگڑا کرے تو فحش بکے۔'' نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر بے وفا کے لیے قیامت کے دن جھنڈا ہوگا کہ وہ اس کی وجہ سے پہچانا جائے گا۔''

امام مسلم نے بروایت ابوسعید نبی اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ہر بے وفا کے لیے قیامت کے دن اس کے چوتڑوں کے پاس جھنڈا ہوگا۔ (مشکاۃ)

یہاں سب پر جو واجب ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف جھکیں اور تمام ان چیزوں سے کہ جن کے وہ مرتکب ہوئے ہیں، مثل بے وفائی وسعی فی الفساد وغیرہ کے توبہ کرلیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کہو اے بندو میرے جنھوں نے زیادتی کی اوپر جانوں اپنی کے! مت ناامید ہو رحمت اللہ کی سے، تحقیق اللہ بخشتا ہے گناہ سارے، تحقیق وہی بخشنے والا مہربان ہے اور رجوع کرو طرف پروردگار اپنے کے اور مطیع رہو واسطے اس کے پہلے، اس کے کہ آئے تم کو عذاب، پھر نہ مدد کیے جاؤ گے۔''



کتاب العلم

سورۃ النساء کی آیت ﴿اَوْ نِسَآئِهِنَّ﴾ سے کیا مراد ہے؟

سوال سورت نساء میں در باب پردہ ﴿اَوْ نِسَآئِهِنَّ﴾ کا لفظ جو وارد ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

جواب سورہ نور رکوع (۴) اور سورہ احزاب رکوع (۷) میں جو ﴿نِسَآئِهِنَّ﴾ کا لفظ وارد ہے، اس سے مسلمان عورتیں مراد ہیں، یعنی مسلمان عورتیں اپنے پوشیدہ سنگار مسلمان عورتوں کو دکھائیں، نہ کہ کافر عورتوں کو، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو مسلمان عورتوں کے سامنے آنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

آیتِ کریمہ ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ کا صحیح معنی کیا ہے؟

سوال آیتِ کریمہ ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ [تو اسے پایا کہ وہ دلدل والے چشمے میں غروب ہو رہا ہے] کا صحیح معنی اور تفسیر کیا ہے؟ مخالفینِ اسلام کا عقلاً جو اس پر اعتراض ہوتا ہے، اس کا جواب کیونکر ہے؟

جواب مخالفین جو اس آیت پر اعتراض کرتے ہیں، وہ لفظ ﴿وَجَدَهَا﴾ کا خیال نہیں کرتے۔ اگر ﴿وَجَدَهَا﴾ کا لحاظ کرلیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ مخالفین کی یہی غلطی ہے۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ ایک چیز واقع میں کچھ ہوتی ہے اور کسی وجہ سے معلوم کچھ ہوتی ہے۔ پانی کے کنارے صبح یا شام کو کھڑے ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب پانی سے نکل رہا ہے یا پانی میں ڈوب رہا ہے، حالانکہ واقع میں ایسا نہیں ہے۔ اسی حالت کا بیان اس آیت میں ہے کہ آفتاب ذوالقرنین کو ایک چشمہ میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوا، حالانکہ ایسا نہ تھا۔ الحاصل مخالفین کا جو اعتراض یہاں پر ہے، اس کا کافی جواب خود لفظ ﴿وَجَدَهَا﴾ میں موجود ہے۔

کتبہ: محمد عبد اللہ (۸/ محرم ۱۳۳۱ھ)

آیتِ کریمہ: ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً﴾ کا مطلب:

سوال آیتِ کریمہ ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے، یا کسی مشرک عورت سے، اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے] کا کیا مطلب ہے؟

جواب آیتِ کریمہ ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ﴾ کا صحیح مطلب وہی ہے جو کتاب ''زاد المعاد'' للحافظ ابن القیم جلد (۲) میں مذکور ہے، وہاں ملاحظہ ہو۔[1] جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زانی جب تک زنا سے تائب نہ ہو، اس کا نکاح کسی عورت کے

[1] زاد المعاد (٥/ ١٠٤)

ساتھ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح زانیہ جب تک زنا سے تائب نہ ہو، اس کا نکاح کسی مرد کے ساتھ جائز نہیں ہے۔
کتاب مذکور میرے پاس نہیں ہے، ورنہ اس کی عبارت بحوالہ صفحہ نقل کر دیتا۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

آیتِ کریمہ: ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ کا معنی:

سوال معجزہ شق القمر کا قرآن سے ثابت ہے تو کس آیت سے؟ اگر سورۃ قمر کی پہلی آیت سے اس کا ثبوت ہے تو ﴿اِقْتَرَبَتِ﴾ صیغہ ماضی ہے۔ معنی میں استقبال کے اور اسی طرح ﴿انْشَقَّ﴾ بھی صیغہ ماضی ہے تو اس کے بھی معنی استقبال کے ہونا چاہیے، اس مسئلے کی پوری تحقیق ہونا بہت ضروری ہے۔

جواب معجزہ شق القمر سورت قمر کی پہلی آیت ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ [القمر: ۱] [قیامت بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا] سے ثابت ہے اور اس میں دونوں صیغے (اقتربت وانشق) لفظاً و معناً ماضی ہیں، کوئی ان میں سے معناً مستقبل نہیں ہے۔

حدیثِ نبوی: «من رأى منكم منكراً... الخ» کا مطلب:

سوال اس حدیث: «من رأى منكم منكراً... الخ» کا بہتر مطلب جو الفاظِ حدیث سے ملتا جلتا ہو، کیا ہے؟ اس لیے کہ شراحِ حدیث نے اس حدیث کا مطلب کئی طور سے بیان کیا ہے۔ (سائل عبدالرحیم از لاہور)

جواب حدیث: «من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان»[1] [جو تم میں سے برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ کے ساتھ بدل دے، پس اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان کے ساتھ، پھر اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنے دل کے ساتھ اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے] کا مطلب میری سمجھ میں اس سے بہتر اور کوئی نہیں آتا کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں:

① مسلمانوں کی باعتبارِ قوت وضعف کے کتنی قسمیں ہیں۔
② یہ کہ ان قسموں میں سے ہر ایک کا فرض کیا ہے؟

پس فرمایا کہ مسلمانوں کی باعتبارِ قوت وضعف کے تین قسمیں ہیں، ایک اَقوی جیسے بااختیار حکام جو اپنے پورے اختیار سے منکر کو مٹا سکتے ہیں، ان کا فرض یہ ہے کہ وہ منکر کو اپنے ہاتھ سے مٹا چھوڑیں۔ دوم اوسط جیسے وہ علما جو منکر کو اپنے ہاتھ سے تو نہیں مٹا سکتے، مگر صرف زبان سے منع کر سکتے ہیں، پس ان کا فرض یہ ہے کہ صرف زبان سے مناسب طریقے سے منع کر دیں۔

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ [النحل: ۱۲۵]
[اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۴۹)

سوم اضعف جیسے وہ لوگ جو ہاتھ سے مٹانا تو درکنار زبان سے بھی منع نہیں کر سکتے، ان کا فرض یہ ہے کہ صرف دل سے اس منکر کو برا جانیں وبس۔ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ٢٨٦]

اس بیان سے ظاہر ہوا کہ اس حدیث میں قوت اور ضعف سے ایمانی قوت اور ضعف مراد نہیں ہے، بلکہ تغییرِ منکر کے متعلق قوت اور ضعف مراد ہے، حتی کہ اگر کوئی شخص جو ایک درجے کا ایمان رکھتا ہو، جب تک وہ قسم سوم کے افراد سے ہے، اس کا فرض وہی ہے جو قسم سوم کا ہے اور جب وہ قسم سوم سے قسم دوم کی طرف ترقی کر جائے تو اس کا فرض قسم دوم کا فرض ہوجائے گا اور جب قسم دوم سے قسم اول کی طرف ترقی کر جائے گا تو اس کا فرض قسم اول کا فرض ہوجائے گا، اگرچہ ایمانی حالت اس کی بدستور ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۹/ جمادی الاولیٰ ۳۲ھ)

حدیث: «ستفترق أمتي على ثلاث وسبعين فرقة» کی صحت:

سوال حدیث: «ستفترق أمتي على ثلاث وسبعين فرقة» درجاتِ احادیث میں کونسا درجہ رکھتی ہے؟ یہ حدیث موضوع ہے؟ «مَا أنا عليه وأصحابي» اسی کا ٹکڑا ہے یا کہیں دوسری جگہ میں آیا ہے؟ مولوی شبلی نے ''سیرۃ النعمان'' میں اس کو موضوع لکھا ہے۔[1] کیا یہ بالکل صحیح ہے؟ بینوا توجروا.

جواب حدیث: «ستفترق أمتي علىٰ ثلاث وسبعين فرقة» کو ترمذی نے اپنی سنن کی کتاب الایمان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ و عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مع سند روایت کیا ہے۔[2]

اول حدیث کی نسبت یہ عبارت تحریر فرمائی ہے: ''حديث أبي هريرة حسن صحيح'' اور ثانی کی نسبت یہ لکھا ہے: ''هذا حديث حسن غريب''

ثانی کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم افریقی ہیں، جو کسی قدر ضعیف ہیں، لیکن نہ اس وجہ سے کہ فاقد صلاح و تقویٰ کے تھے، بلکہ ان کے ضعف کی اور وجہ ہے، جس سے ان کی حدیث درجہ حسن سے نازل نہیں ہوسکتی،[3] لہٰذا ترمذی نے اس حدیث کی تحسین کی اور فی الواقع ترمذی کی یہ تحسین قابلِ تحسین ہے۔ اول کی سند ہر طرح درست ہے۔ کہیں اُس میں کوئی کھونٹ نہیں ہے، لہٰذا ترمذی نے اس کی تصحیح کی اور اس تصحیح میں بھی ترمذی حق بجانب ہیں۔ ترمذی رحمہ اللہ نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اس مضمون کی حدیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے، چنانچہ فرمایا: ''وفي الباب عن سعد وعوف بن مالك'' مجھ کو ائمہ حدیث میں سے باوجود تفحص اب تک کوئی ایسا نہیں ملا، جس نے اس حدیث کی تضعیف کی ہو، فضلًا عن نسبة الوضع إليه. [چہ جائے کہ اس کی طرف وضع کی نسبت کی ہو]

«مَا أنا عليه وأصحابي» [جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں] ثانی حدیث کا ٹکڑا ہے۔[4] ہاں ایک حدیث

---

[1] سیرۃ النعمان از مولانا شبلی نعمانی (ص: ١٣٢) مفید عام، آگرہ۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٠، ٢٦٤١)

[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ضعيف في حفظه، وكان رجلا صالحاً'' (تقريب التهذيب، ص: ٣٤٠)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

اور ہے، جس کو عقیلی اور دارقطنی نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ یہ ہے:

«تفترق أمتي على سبعين أو إحدى وسبعين فرقة... الحديث»[1] [میری امت ستر یا اکہتر فرقوں میں بٹ جائے گی] یا «تفترق أمتي على بضع وسبعين فرقة... الحديث»[2] [میری امت ستر سے کچھ اوپر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی]

اس حدیث کو ضرور ائمہ حدیث نے ضعیف یا بے اصل یا موضوع قرار دیا ہے۔ اس کی زیادہ تفصیل "اللآلئ المصنوعة" (ص: ۱۸۸) و دیگر کتبِ موضوعات میں ملے گی۔ شاید مولف "سیرة النعمان" کو ایک حدیث کا دوسری حدیث سے اشتباہ ہوگیا ہو، جو ایک صحیح حدیث کو موضوع کہہ دینے کا سبب ہوگیا اور یہ کچھ عجیب بات نہیں ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما پر شیعہ کے اعتراضات کا جواب:

سوال حضرت ام المومنین عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما نے افشاءِ راز پیغمبر خدا کا کیا، جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۂ تحریم میں بتاکید توبہ دی ہے اور بعدہ اللہ تعالیٰ نے فعل کو ان کے بلفظ کفر تعبیر فرما کر مثال اُن ہر دو بزرگواروں کی ساتھ زنانِ نوح و لوط علیہما السلام کے دی ہے، جو دونوں کافرہ تھیں اور وہ دونوں حالتِ کفر میں مریں، پس ایسی نص صریح کے مقابلے میں کس آیت قرآنی سے اُن کی توبہ کا ثبوت ہوگا؟ امید ہے کہ ثبوت اس کا نص قرآنی سے فرمایا جائے گا، چونکہ یہ اعتراض شیعوں کی جانب سے ہے۔ اگر انھیں کی معتبر کتابوں سے ثابت کیا جائے تو بہت خوب ہوگا۔

جواب اس سوال میں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما پر دو الزام قائم کیے گئے ہیں اور ان دونوں الزاموں کی نسبت قران میں نص صریح کے وجود کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

اول: ان دونوں بیبیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے راز کو فاش کیا اور اس وجہ سے اللہ نے توبہ کا حکم نازل کیا تو جب تک ان کی توبہ قرآن سے ثابت نہ ہو، اس وقت تک قابلِ تسلیم نہیں۔

دوم: اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بیبیوں کے فعل کی تعبیر بلفظ کفر کی ہے اور ان کی مثل زنانِ نوح اور لوط علیہما السلام کے ساتھ دی ہے۔

الزام اول دو وجہ سے مدفوع ہے:

اولاً: کسی آیت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا افشاءِ راز کیا، بلکہ سورت تحریم میں پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے عتاب کے قالب میں خطاب فرمایا ہے کہ اپنی بیبیوں کی خاطر سے اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو؟

قال اللہ تعالیٰ: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ﴾ [التحریم: ۱]

---

[1] الضعفاء للعقيلي (٤/ ٢٠١) لسان الميزان (٦/ ٥٦)

[2] الضعفاء للعقيلي (٤/ ٢٠١) تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٠٣٥)

[اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟ تو اپنی بیویوں کی خوشی چاہتا ہے]

پھر اس کو معاف بھی کر دیا اور فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ [التحریم: ۱] [اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے] اس کے بعد جن بیبیوں نے افشاءِ راز کیا، جس کا علم صحیح قطعی اللہ ہی کو ہے کہ وہ فلاں فلاں بیبیاں تھیں، اُن کا ذکر مبہم فرمایا۔ کما قال: ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ...﴾ [التحریم: ۳] [اور جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے پوشیدہ طور پر کوئی بات کہی، پھر جب اس (بیوی) نے اس بات کی خبر دے دی] اس کے بعد افشاءِ راز کرنے والی بیبیوں کو توبہ کی ہدایت فرمائی۔ کما قال: ﴿اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ [التحریم: ٤] [اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرو (تو بہتر ہے) کیوں کہ یقیناً تمھارے دل (حق سے) ہٹ گئے ہیں]

اس کے بعد یہ نصیحت فرمائی کہ اگر تم لوگ آپس میں صلاح ومشورہ کی مدد سے نبی ﷺ کو اذیت دو گی تو پھر نبی ﷺ کا مولا خود اللہ ہے اور جبرئیل اور صلحاے مومنین اور کل فرشتے نبی ﷺ کے مددگار ہیں اور نبی ﷺ اگر تم بیبیوں کو طلاق دے دیں گے تو اللہ تعالیٰ اُس کے بدلے میں اچھی اچھی بیبیاں مومنہ صالحہ نبی ﷺ کو دے گا۔

کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ ۝ عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا﴾ [التحریم: ٤، ٥]

[اور اگر تم اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو یقیناً اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومن اور اس کے بعد تمام فرشتے مددگار ہیں۔ اس کا رب قریب ہے، اگر وہ تمھیں طلاق دے دے کہ تمھارے بدلے اسے تم سے بہتر بیویاں دے دے، جو اسلام والیاں، ایمان والیاں، اطاعت کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں ہوں، شوہر دیدہ اور کنواریاں ہوں]

الحاصل جن بیبیوں کو افشاے راز کی وجہ سے توبہ کی ہدایت ہوئی تھی، اُن بیبیوں کو اگر حضرت طلاق دیتے تو بلاشک اُن سے اچھی بیبیاں آپ ﷺ کو ملتیں اور جب نہ قرآن سے اور نہ کسی ایسی حدیث سے جو اہل السنۃ والجماعت یا شیعہ کے یہاں متمسک بہ ہو، یہ بات ثابت ہوئی کہ اُن بیبیوں کو نبی ﷺ نے طلاق دی، خصوصاً حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کا نبی ﷺ کی زوجیت میں تمام عمر رہنا اخبار اور واقعاتِ متواترہ فریقین سے ثابت ہے۔ تو لا محالہ اُن بیبیوں کا تائب ہونا قرآن سے ثابت ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ اگر ان بیبیوں نے توبہ نہ کی ہوتی اور اُن کی توبہ قبول نہ ہوئی ہوتی تو نبی ﷺ مبغوضاتِ الٰہی کی مصاحبت اور مواصلت ہرگز ہرگز گوارہ نہ فرماتے اور بموجب ایماے حق سبحانہ تعالیٰ ضرور ان بیبیوں کو طلاق دے کر ان سے اچھی بیبیاں ان کے عوض میں اللہ سے لیتے، نعمتِ الٰہی کو باوجود وعدہ کے ہرگز ترک و رد نہ فرماتے۔ پس ان بیبیوں کو طلاق نہ دینا اور حضرت عائشہ وحضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کا

خصوصاً تمام عمر حضرت ﷺ کی زوجیت میں رہنا دلیل صریح اس کی ہے کہ وہ بیبیاں جو مفشی راز ہوئی تھیں، بلاشک وشبہہ تائب ہوئیں اور ان کی توبہ قبول کر کے اللہ تعالیٰ نے جمیع صفتیں مسلمات ومومنات وقانتات وعابدات وسائحات وغیرہا کی اپنے فضل وکرم سے ان میں جمع کر دیں۔

آیت کریمہ: ﴿اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ﴾ [النور: ٢٦] جو خاصتاً نبی ﷺ پر بعد واقعہ سورۂ تحریم کے نازل ہوئی اور کسی نبی ﷺ پر یہ آیت نازل نہ ہوئی، جو شخص اس آیت کی تلاوت کے بعد ازواج مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مبشر بہ آیت کریمہ: ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ [الأحزاب: ٣٢] کو خباثت اور غیر تائب ہونے کا الزام دے گا، بلاشک وشبہہ وہ شخص خبیث النفس اور بندہ ہویٰ و ہوس ہوگا۔

صرف آیتِ کریمہ: ﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰهِ﴾ میں تامل کرنے سے صاف ظاہر تھا کہ جب اللہ نے خود توبہ کی ہدایت کی اور قبولِ توبہ اس شرط کی جزا مقدر فرمائی تو ضرور وہ حضرات تائب ہوئیں، صراحتاً ان کی توبہ کے ذکر کرنے کی کلام میں کوئی حاجت نہ تھی اور آیت: ﴿اِنْ طَلَّقَکُنَّ﴾ وغیرہا تو نص ہے کہ بلاشک ان کی توبہ مقبول ہو کر مراتب و مدارج علیا سے سرفراز ہوئیں۔

ثانیاً: ظاہر ہے کہ افشاءِ راز میں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے ذکرِ صریح سے قرآن ساکت ہے، بلکہ ان حضرات کی طرف افشاءِ راز کی نسبت صریح صرف حدیث کے رو سے کی جاتی ہے، تو جب حدیث سے ان بیبیوں کا تعین قابلِ تسلیم سمجھا گیا تو پھر حدیثوں سے اور قابلِ اعتبار کیوں نہیں سمجھا جائے گا، جو اس سوال کے جواب میں نص قرآنی کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے۔ بعونہ تعالیٰ اگرچہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کا الزام سے بَری ہونا محض قرآن سے ثابت ہوگیا، پھر جب اس کا تعین حدیث ہی سے ثابت ہے تو دوسرا جواب حدیث سے لیجیے۔

صحیحین میں مروی ہے کہ لوگوں نے مشہور کر دیا کہ نبی ﷺ نے اپنی بیبیوں کو طلاق دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خبر کو سن کر نبی ﷺ سے آ کر دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ لوگوں نے یہ مشہور کر دیا ہے تو ہم کہہ دیں کہ یہ بات غلط مشہور ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے اجازت دی، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کے پاس آ کر بآواز بلند پکار دیا کہ حضرت کے طلاق دینے کی خبر غلط مشہور ہے اور آیتِ کریمہ: ﴿وَ اِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْھُمْ﴾ [النساء: ٨٣] [اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں] نازل ہوئی۔

اسی حدیث میں سورت تحریم کے نزول کا واقعہ مروی ہے کہ جب آیتِ کریمہ: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْکُنَّ وَ اُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا۝ وَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ [الأحزاب: ٢٨، ٢٩] نازل ہوئی، یعنی

اے نبی ﷺ! اپنی بیبیوں سے کہہ دو اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو ہم تم کو مال و متاع دیں اور اچھی طرح سے تم کو رخصت کریں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا گھر چاہتی ہو تو تم محسنات میں سے ہو اور بے شک اللہ نے محسنات کے لیے بہت بڑا ثواب مہیا کیا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کو سب سے پہلے نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پڑھ کر سنا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ ہم نے اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا گھر قبول کیا، پھر اور بیبیوں سے بھی آیتِ کریمہ تلاوت کرنے کے بعد یہی جواب ملا، پس جب ازواجِ مطہرات خصوصاً جن کا زوجیت میں تمام عمر رہنا یقینی ہے، مبشر بہ آیتِ کریمہ: ﴿نُؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا﴾ [الأحزاب: ۳۱] [اسے ہم اس کا اجر دو بار دیں گے اور ہم نے اس کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے] اور مشرف بہ آیتِ کریمہ: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ [الأحزاب: ۳۳] [اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اے گھر والو! اور تمھیں پاک کر دے، خوب پاک کرنا] ہیں اور انھوں نے دنیا اور زینتِ دنیا پر لات مار کر اللہ اور رسول اور دارِ آخرت کو اختیار کیا ہے اور ﴿اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب: ۲۹] [تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے] کی خلعت پہنی ہے تو اس سے زیادہ ان کی قبولیتِ توبہ اور ان کے محسنہ ہونے کا ثبوت قرآن و حدیث سے اور کیا ہوگا؟

جو شخص نبی ﷺ کی بیبیوں کو غیر تائب یا غیر محسنہ سمجھے، لا ریب خسر الدنیا والآخرۃ ہوگا۔ اگر ان بیبیوں نے سچے دل سے اللہ اور رسول اور دارِ آخرت کو اختیار نہ کیا ہوتا یا کسی فاحشہ مبینہ کی معاذ اللہ حضرت کی زندگی میں مرتکب ہوئی ہوتیں تو ضرور اللہ تعالیٰ ان کے حال کی خبر اپنے رسول کو دیتا اور ان بیبیوں کو اپنے رسول کی صحبت سے جدا کر دیتا، چنانچہ الفاظِ قرآن جو کچھ سورت تحریم اور سورت احزاب میں ہیں، صاف صاف اس امر پر دال ہیں، جو ادنیٰ تامل سے ہر ذی فہم پر ظاہر ہے تو جب تک قرآن سے یا حدیث صحیح سے، اگرچہ شیعوں کے یہاں حدیث صحیح سے، یہ ثابت نہ ہو کہ ازواجِ مطہرات نبی ﷺ میں سے کسی بی بی نے بعدِ آیتِ کریمہ ﴿قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ﴾ کے معاذ اللہ کسی فاحشہ مبینہ کا ارتکاب کیا اور نبی ﷺ نے اپنی زوجیت سے اس کو نکال دیا، یعنی طلاق دے دی، اس وقت تک خیالاتِ باطلہ ایسی مقدس بیبیوں کی نسبت ظاہر کرنا سخت جہالت ہے۔

افسوس ہزار افسوس کہ خیالاتِ باطلہ اور توہمات رکیکہ سے اَبرار کی اگر طرف برائیوں کا انتساب کیا جائے۔ ہائے اتنا بھی پیغمبر کا لحاظ نہیں کہ پیغمبر کی بیبیوں کی شان میں یہ تہمت تراشیاں اور اپنے حقیقی عیوب کا تذکرہ اگر کسی سے سنیں تو اس کی جان کے دشمن ہو جائیں۔ نعوذ باللہ من الجھل والحمق والکفر.

الزامِ ثانی بھی دو وجہ سے مدفوع ہے:

اولاً: اللہ تعالیٰ نے کسی جگہ محمد رسول اللہ ﷺ کی کسی بی بی کے کسی فعل کو بلفظ کفر تعبیر نہیں کیا اور نہ کسی بی بی کی مثال زنانِ نوح و لوط علیہما السلام کے ساتھ دی ہے اور بعض بیبیوں نے جو افشاءِ راز کیا، وہ کوئی ایسے امر سے متعلق ہی نہ تھا

کہ اُس میں کفر کا وہم ہو۔ بات تو یہی تھی جو حدیثوں سے سنی و شیعہ دونوں کے یہاں ثابت ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اِذن لے کر اپنے باپ کے گھر کسی ضرورت سے گئی ہوئی تھیں اور ان کی غیبت میں اُن کے فراش پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ اپنی لونڈی کی عزت افزائی کی۔ اُسی دوران میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا لوٹ کر آ گئیں اور اس امر سے مطلع ہو کر انھوں نے بہت کچھ رنج وغیرہ ظاہر کی اور رو کر کہنے لگیں کہ میری جگہ پر لونڈی سرفراز کی جائے!!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی خاطر سے فرمایا کہ ہم نے ماریہ قبطیہ کو حرام کر لیا، اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا، جس پر آیتِ کریمہ نازل ہوئی: ﴿يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ﴾ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کمال مسرت سے اور بمقتضائے اُس جبلت کے جو عورتوں میں ہوتی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہہ دیا کہ حضرت نے ماریہ کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کرنے کو دنیا کے امور سے سمجھ کر اس کی اطاعت ضروری نہ سمجھا۔ یہ قصورِ فہم ہوا۔

اس خبر کی شہرت سے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے توبہ کی ہدایت فرمائی اور تہدید کی۔ بعض روایت میں وہ راز یوں مروی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض ازواج کے یہاں شہد پیا کرتے تھے اور بیبیوں پر یہ شاق گزرا تو صلاح کر کے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اِن لوگوں نے یہ بات کہی کہ آپ کے پاس سے مغافیر کی بو آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے شہد پیا ہے، اب پھر اس کو نہ پیوں گا، اس کو کسی سے ظاہر نہ کرنا، جن بی بی سے کہا تھا، وہ کمال خوشی سے کہ اب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہد نہ پینے جائیں گے، نہ زیادہ قیام فرمائیں گے، نہ ہم لوگوں کو رشک ہوگا، دوسری بی بی سے کہہ دیا، اس پر آیت مذکور الصدر سورۂ تحریم کی نازل ہوئی۔

الحاصل روایت کوئی ہو، وہ بات جو ظاہر کی گئی، اُس کو بیبیوں نے امورِ دین سے نہ سمجھا اور یہ نہ سوچا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ظاہر کر دینے میں اگر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و اذیت ہوگی تو اللہ کا عتاب ہوگا۔ گو بات تو خفیف وحقیر ہے، بات محبوبِ رب قدیر کی ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت جو اس بات کے افشا سے آپ کو پہنچی پسند نہ آئی، لہٰذا بیبیوں پر تہدید اور چشم نمائی کر دی اور جو کچھ ان آیتوں میں بحث ہے، الزام اول کے جواب میں مذکور ہے اور کہیں اللہ تعالیٰ نے ان بیبیوں کے کفر کی طرف اشارہ کیا ہے اور نہ زنانِ نوح ولوط علیہما السلام کے ساتھ ان کی مثال دی۔

ثانیاً: معلوم ہو کہ شاید سائل نے تمھیں آیتِ کریمہ: ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ﴾ [التحریم: ١٠] [اللہ نے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی، وہ ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں] سے سمجھا ہے کہ یہ آیت بھی اول سورۂ تحریم میں ہے اور اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی عورتوں سے بحث ہے، لہٰذا ﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کا مصداق معاذ اللہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج طیبات کو اور ان کے فعل کو معبر بکفر سمجھا، ان کی مثال امراۃِ نوح ولوط کے ساتھ دی۔ نعوذ باللہ من ذلك۔ حالانکہ سائل اگر اس قدر بھی خیال کرتا کہ یہ آیت آخر سورہ تحریم میں ہے اور ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ﴾ اول سورہ میں ہے، درمیان میں اور

امور سے بحث ہے تو اس کا ذہن اس سوال کی طرف نہ جاتا اور ذی فہم پر تو یہ امر خوبی منکشف ہے کہ ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ سے قبل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ [التحريم: ٩] [اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے]

صریح ﴿كَفَرُوْا﴾ صیغہ جمع مذکر غائب کا ہے اور ﴿اَلَّذِيْنَ﴾ اسم موصول جمع مذکر کے لیے ہے، اس سے وہی کفار اور منافقین مقصود ہیں، جن کا ذکر صدرِ آیت میں ہے۔ زبردستی عورتوں کی طرف وہ بھی عورتیں مومنہ وہ بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی بیبیوں کی طرف ضمیر پھیر دی جائے تو اس کا کیا علاج ہے؟ باقی رہی تمثیل امراۃِ نوح اور امراۃِ لوط کی اور شاید سائل کو اسی نے دھوکے میں ڈالا ہے تو قطع نظر اس کے کہ ممثل لہ مذکر ہے اور ﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ مذکر کے لیے ہے، اصل مقصود ظاہر کیا جاتا ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو کفار اور منافقین سے جہاد کا حکم دیا، اور اس لیے کہ کفار اور منافقین میں اکثر عزیز وقریب نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے میں امراۃِ نوح اور لوط کی مثال بیان فرمائی کہ قرابت اور معیت نبی کی کافر و منافق کو مفید نہیں، جس طرح امراۃِ نوح اور لوط کو نبی کی قرابت اور معیت بوجہ کفر کے مفید نہیں ہوئی، اس جگہ عورت کی مثال میں دو نکتے ہیں۔

اولاً یہ کہ مرد پر جس قدر بارِ کفالت زوجہ کا اور اس کو تعلق زوجہ کے ساتھ ہوتا ہے، اس قدر دوسرے قریب کے ساتھ نہیں ہوتا تو جب زوجہ کافرہ کی زوجیت نبی کے ساتھ کے باوجود بارِ کفالت وقوتِ تعلق کے کچھ مفید نہیں تو دوسری قرابت کا تعلق کافر کا نبی کے ساتھ کب مفید ہوگا؟ اس کے ساتھ جہاد اور اس کا قتل بر تقدیر کفر ہرگز محلِ تامل نہیں۔

ثانیاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت ناقص العقل اور ناقص الفہم ہوتی ہے، اس کی شان سے وقوعِ خطا اکثری ہے، لہٰذا عورت کی گرفت بمقابلہ مرد کے مناسب نہیں ہے، لیکن کفر وشرک وہ خطا افحش ہے کہ نبی کی بیبیاں جو اس میں مبتلا ہوئیں تو ان کو نبی کی زوجیت باوجود عورت اور ناقص العقل ہونے کے کچھ کام نہ آئی، دیکھو امراۃِ نوح اور لوط کو، پھر جب عورتوں کا یہ حال ہے تو کفار اور منافقین جو رجال ہیں، تو ان کو نبی کی قرابت کب کام آ سکتی ہے، ان سے ضرور جہاد کرو، بلکہ ﴿وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ اور جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے مثال دی کہ کافر کو نبی یا ولی کی قرابت کام نہیں آتی تو مومن کی قرابت کافر سے مومن کو مضر ہوگی یا نہیں؟ تو اس کا بتانا بھی مناسب مقام ہوا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے امراۃِ نوح ولوط کے بعد امراۃِ فرعون اور حضرت مریم علیہا السلام کی مثال مومنین کے لیے دی۔ قال اللہ تعالیٰ:

﴿وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ

فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ﴾ [التحریم: ۱۱، ۱۲]

[اور اللہ نے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی، جب اس نے کہا: اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے۔ اور عمران کی بیٹی مریم کی (مثال دی ہے) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی ایک روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت کرنے والوں میں سے تھی]

حاصل یہ کہ ایمان مضبوط ہونا چاہیے، اگر ایمان مضبوط ہے تو نجات ہے، جس طرح زنِ فرعون کہ عورت ہو کر کامل الایمان تھیں تو فرعون کی زوجیت و معیت اور اس کا ظلم ان کے ایمان اور عاقبت کے لیے کچھ بھی مضر نہ ہوا، اسی طرح جن لوگوں کا ایمان کامل ہے، اگرچہ ان کے عزیز و اقارب کافر ہوں، لیکن وہ ہرگز اپنے ایسے قرابت مندوں کا لحاظ و خیال نہیں کرتے اور ان کی معیت سے پناہ اور نجات کی دعا کرتے ہیں۔ اس تمثیل سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ جانبین تمثیل میں بصورت تحقق علاقہ زن و مرد ہونے کا اختلاف ہرگز مانعِ تمثیل نہیں۔

الحاصل دونوں آیتوں میں دونوں مثالیں اس غرض سے دی گئی ہیں کہ کافر اور منافق سے جہاد میں تغافل و تکاسل بہ پاسِ قرابت نہ ہو اور دونوں مثالوں میں عورت ہی کی مثال دی گئی، تا کہ مردوں کو غیرت آئے کہ ایمان میں پاسِ قرابت کیسا؟ کافر باپ ہو اور خدا کی مقرر کی ہوئی شرائط پائی جائیں تو قتل کر دو، اللہ کے دشمن کو زمین پر حتی الامکان نہ چھوڑو اور حضرت مریم علیہا السلام کی تمثیل سے اس سورۂ مبارک میں ایک فائدہ عظیم یہ ہے کہ اول سورہ میں ازواجِ مطہرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت چشم نمائی اور ان کی تعلیم ہوئی، جس طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تعلیم ہوئی:

﴿يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ...﴾ [التحریم: ۱]

[اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟]

تو اس قدر عتاب بھی منافقین کے لیے موجبِ مضحکہ اور طعن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کے ساتھ ہوا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی خطا کو عفو کر کے بڑے بڑے مراتب اور مدارج عنایت فرمائے، ۔کما سبق۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کی مثل کے ساتھ ازواجِ مطہرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مومنین کو تسکین دی کہ اگر منافقین کچھ مضحکہ و طعن مقدس بیبیوں کی شان میں کر لیں تو صبر مناسب ہے، جس طرح حضرت مریم علیہا السلام کو ان کی قوم نے معاذ اللہ زنا کی تہمت دی، مگر انھوں نے صبر کیا اور صابرین و قانتین میں داخل ہوئیں اور کفار و منافقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جہاد اور سختی کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورہ میں حکم دیا۔ اگر مخالف کو عقل اور تمیز ہو تو اب سے بھی سنبھل جائیں اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کی شان پاک میں بیہودہ گوئی نہ کریں۔ سوال اول کا جواب تمام ہوا۔

سوال دوم:

صحیح مسلم (۳۹۴/۲) میں ہے:

"عن عائشة سمعت رسول اللهﷺ يقول: لا يذهب الليل والنهار حتى تُعبُدُ اللّاتِ[1] والعزى. فقلت: يا رسول الله إن كنت لأظن حين أنزل الله ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ﴾ إلى قوله ﴿وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ أن ذلك تام. قال: إنه سيكون من ذلك ما شاء الله، ثم يبعث الله ريحا طيبة فتوفي كل من في قلبه مثقال حبة من خردل من إيمان فيبقىٰ من لا خير فيهم فيرجعون إلى دين آبائهم"[2]

یعنی دنیا ختم نہ ہوگی، اے عائشہ! جب تک کہ تم لات وعزی کو نہ پوجو۔ کہا ام المومنین نے اے رسول اللہ! مجھے گمان تھا کہ جو مشرف بہ اسلام ہوا، رستگار ہے۔ فرمایا حضرت نے کہ عنقریب میرا گفتہ واقع ہوگا، یعنی جس کے قلب میں برابر دانہ خردل کے ایمان نہ ہو، اگرچہ بظاہر مومن ہو، اپنے دینِ آباءِ کفار میں داخل ہوتا ہے۔

یہ حدیث وترجمہ اس کا مجمع البحرین سے نقل کی گئی ہے، فقط۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ عائشہ نے لات وعزی کی پرستش کی اور طرف دین کفار کے اپنے کو رجوع کیا۔ اگر یہ امر واقع نہ ہوا تو معاذ اللہ پیغمبر خدا پر جھوٹ فرمانا لازم آتا ہے اور اگر بموجب خبر کے صنم پرستی عائشہ سے صادر ہوئی تو ان کے کفر میں کیا شک ہے؟ فقط

جواب:

میں نہیں جانتا کہ صاحبِ مجمع البحرین کون شخص اور کس پایہ کا آدمی ہے اور اگر سائل کی نقل صحیح ہے اور جو عبارت ترجمہ کی سائل نے نقل کی ہے، وہ عبارت درحقیقت صاحب مجمع البحرین کی ہے تو صاحب مجمع البحرین محض ایک سادہ آدمی معلوم ہوتا ہے، اس کے ترجمہ کو حدیث سے کچھ تعلق نہیں اور ترجمہ کی صحت تو ایک طرف، صیغہ تک نہیں پہچانتا۔ شاید میزان بھی یاد نہیں ہے۔ حدیث کو صیغہ واحد مونث حاضر مضارع معروف اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب اور ضمیر مخاطب کو فاعل سمجھا ہے، حالانکہ میزان پڑھنے والا طالب العلم بھی اس صیغہ کو ایسا نہ سمجھتا۔ صیغہ واحد مونث غائب مضارع مجہول کا پڑھتا اور صیغہ واحد مونث حاضر مضارع معروف سمجھنے والے کو ہنستا اور کہتا کہ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے خطاب ہوتا اور صیغہ واحد مونث حاضر مضارع معروف کا استعمال مقصود ہوتا تو "تعبدين" اور "أن" مقدرہ بعد "حتى" کے عمل سے نون اعرابی گر کے "تعبدي" پڑھا جاتا۔ اب صاحبِ مجمع البحرین کی غلطی کہاں تک بیان کریں؟ حدیث کا ترجمہ صحیح بیان کر دیتے ہیں، اس سے ناظرین غلطی سمجھ لیں گے اور سوال کا لغو ہونا جان جائیں گے۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ رات

[1] اصل سوال میں ایسے ہی مرقوم ہے۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۰۷)

اور دن ختم نہ ہوجائے گا جب تک لات وعزی پوجی نہ جائے گی۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں تو سمجھتی تھی کہ آیت کریمہ: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ﴾ إلی قوله ﴿وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ جس وقت اتری، یہ امر پورا ہونے والا ہے (یعنی سوائے دینِ اسلام کے کوئی دوسرا دین نہیں رہے گا اور آخر تک اسلام ہی کو قیام وثبات رہے گا) آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا ہوگا، جب تک اللہ کو منظور ہے، پھر اللہ تعالیٰ ایک خوشبودار ہوا بھیجے گا، جس کی وجہ سے ہر مومن جس کے دل میں دانہ خردل برابر بھی ایمان ہوگا، مر جائے گا اور جس میں نہ ہوگا وہی لوگ باقی رہ جائیں گے اور وہ لوگ اپنے باپ دادا کے دین پر لوٹ جائیں گے (تو جس کے باپ دادا لات وعزی پوجنے والے تھے، وہ لات وعزی کو پوجنے لگیں گے اور پھر دنیا ختم ہوجائے گی اور قیامت آئے گی۔ فقط)

بھلا حدیث سے اور سوال سے کیا واسطہ ہے؟ اگر ہم حسبِ زعم باطل سائل فرض بھی کر لیں کہ وہ صیغہ واحد مونث حاضر مضارع معروف کا ہے تو اس وقت حدیث کا مطلب یہ ہو جائے گا کہ اے عائشہ! جب تک تم لات و عزیٰ کو نہ پوجو گی، اس وقت تک دنیا ختم نہ ہوگی اور وہ زمانہ وہ وقت ہوگا کہ اس وقت سوا بت پرست مشرکین کے کوئی مومن زندہ نہ ہوگا تو معاذ اللہ اس سے تنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کا بت پرست ہونا لازم نہ آئے گا، بلکہ اکثر اہلِ بیت اطہار و ائمہ اہلِ بیت رحمہم اللہ کا بھی بت پرست ہونا لازم آ جائے گا، کیونکہ حضرت عائشہ کا کوئی زمانہ کوئی دن کوئی آن تمام عمر نہ گزرا کہ اس وقت میں نبی ﷺ یا کوئی امام ائمہ اہلِ بیت اور رجال ونساءِ اہلِ بیت میں سے نہ رہا ہو۔ سائل سے کمال تعجب ہے کہ مجمع البحرین کے ایک غلط ترجمے کے بھروسے پر سوال کر بیٹھا، یہ بھی نہ سوچا کہ اس حدیث کی راوی خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں، وہ کیونکہ ایسی حدیث کو دعویٰ مومنیت کے ساتھ اعلان کرتیں۔ ضرور صاحبِ مجمع البحرین سے حدیث کے سمجھنے میں غلطی فاحش ہوئی ہے یا نقل ہی صحیح نہ ہو۔

سوال سوم:

بخاری (۵/ ۱۶۰) میں ہے: ''قال النبي ﷺ خطیبا فأشار نحو مسکن عائشة فقال: ھھنا ثلاثاً من حیث یطلع قرن الشیطان'' فرمایا رسولِ خدا ﷺ نے طرف خانہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے تین بار کہ اس جگہ شاخ ابلیس کی ہے۔ یہ حدیث اور ترجمہ مجمع البحرین سے لکھا گیا ہے، اس حدیث سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس گھر میں ضلالت بھری ہوئی تھی اور یہاں پر شاخِ ابلیس سے کیا مراد ہے اور سخت تردد کا مقام ہے کہ جس گھر میں شاخِ ابلیس ہو، وہاں پیوستہ پیغمبر خدا کی اوقات بسر ہو، در بعد رحلت کے وہی خانہ عائشہ مدفن پیغمبر ﷺ ہو۔ فقط

جواب:

اس حدیث میں لفظ ''فتنہ'' و ''قام'' کا سائل نے شاید غلطی سے نہیں لکھا، ورنہ لفظ حدیث کا یوں ہے:

"عن نافع عن عبداللہ قال: قام رسول اللهﷺ خطيبا فأشار نحو مسكن عائشة فقال: هنا الفتنة ثلاثاً من حيث يطلع قرن الشيطان"[1]

[نافع رحمہ اللہ عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطاب کیا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی طرف تین بار اشارہ کر کے فرمایا: یہاں فتنہ ہوگا، جہاں سے شیطان کا سینگ (شاخ) نکلے گا]

اس حدیث میں قرنِ ابلیس سے وہی مراد ہے، جو سائل نے سمجھا ہے، یعنی ضلالت و فتنہ۔ باقی رہا حدیث کا مطلب تو اس حدیث میں ظاہراً تین احتمال ہیں:

احتمال اول یہ ہے کہ طلوع ہونا قرنِ ابلیس کا حضرت عائشہ کے گھر سے مراد ہے۔

احتمال ثانی یہ ہے کہ قرنِ ابلیس سے معاذ اللہ صاحبِ خانہ، یعنی حضرت عائشہ کی ذات مراد ہے۔

احتمال ثالث یہ ہے کہ طلوع ہونا قرنِ ابلیس کا اس جانب سے مراد ہے، جس جانب حضرت عائشہ کا مسکن تھا اور وہ مشرق کی طرف تھا، یعنی مشرق کی جانب سے فتنہ اُٹھے گا۔

احتمال اول تو صریح باطل ہے، جو سائل کے نزدیک بھی محل تردد ہے، چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی، اور پھر باوجود اور احتمالات کے اس احتمال کو متعین کر کے ناحق تردد اور گمراہی میں کیوں پڑے؟

احتمال ثانی کے یقین پر باوجود احتمال ثالث کے کوئی دلیل نہیں، خصوصاً یہ احتمال احتمال اول سے بھی زیادہ تردد میں ڈالتا ہے اور مومن کی شان سے بہت بعید ہے کہ اس احتمال کو متعین کرے اور کیونکر اس احتمال کو کوئی مومن متعین کرسکتا ہے کہ اس میں صریح اہانت نبی ﷺ کی ہوتی ہے۔

اگر یہ احتمال فی الواقع صحیح ہوتا تو بعد علم کے نبی ﷺ ایسی زوجہ کی صحبت ایک آن کے لیے بھی گوارا نہ کرتے، چہ جائیکہ اور کثرت صحبت و محبت کی ہو اور تمام صحابہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ضلالت و فتنہ کا شعور ہو جاتا، خصوصاً راوی اس حدیث کے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کبھی اکرام اور احترام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نہ کرتے اور ان کے فضائل اور مناقب مشہور نہ کرتے، کیونکہ ان کے مناقب اور اس احتمال ثانی میں بہت بڑا تعارض اور تضاد ہے تو باوجود ان قباحتوں کے اور احتمال ثالث کے ہوتے ہوئے کسی مومن کا کام نہیں کہ احتمال ثانی کو متعین کر لے اور جب احتمال ثانی بھی کسی طرح متعین نہیں ہوسکتا تو لا محالہ احتمال ثالث متعین ہوا اور اس حدیث کے رو سے کسی اعتراض یا خدشہ اور شبہہ کرنے کی جگہ باقی نہ رہی اور قطع نظر اس بحث کے احتمال ثالث کا تعین دلیل سے ثابت ہے۔

اولاً یہ کہ "نحو مسكن عائشة" لفظ نبی ﷺ کا نہیں ہے، بلکہ یہ لفظ راوی کا، یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ہے، جو کلمہ "هنا" کی شرح میں مذکور ہوا ہے اور یہی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس واقعہ کی دوسری روایت میں اس کلمہ "هنا" کی شرح

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٣٧)

میں یہ عبارت فرماتے ہیں: "أومیٰ بیده نحو المشرق"[1] (کما رواہ مسلم) [(آپ ﷺ نے) اپنے ہاتھ کے ساتھ مشرق کی طرف اشارہ کیا] خود بخاری نے کتاب الفتن میں انھیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اسی واقعہ میں یہ حدیث مرفوع روایت کی ہے: "عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما أنه سمع رسول اللہ ﷺ وهو مستقبل المشرق يقول: ألا إن الفتنة هنا من حيث يطلع قرن الشيطان"[2] [عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مشرق کی طرف منہ کر کے یہ کہتے ہوئے سنا: خبردار! یہاں سے فتنہ اٹھے گا جہاں سے شیطان کا سینگ طلوع ہوگا]

مسکن عائشہ رضی اللہ عنہا کا اس وقت رسول اللہ ﷺ سے پورب ہی طرف تھا، چنانچہ قسطلانی شرح بخاری میں لکھتے ہیں: "فأشار نحو مسكن عائشة أي هنا فقال: هنا أي جانب الشرق"[3] [پس (آپ ﷺ نے) مسکن عائشہ کی طرف، یعنی یہاں کہہ کر اشارہ کیا اور فرمایا: یہاں سے، یعنی جانبِ مشرق سے] اس تحقیق سے اور ان تینوں روایتوں کے ملانے سے "كالشمس في نصف النهار" روشن ہوگیا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقصود "هنا" کی شرح میں جانب مشرق کی تعیین ہے، نہ کہ تعیین مسکنِ عائشہ بخصوصہ۔ کسی سے "نحو المشرق"، کسی سے "وهو مستقبل المشرق" فرمایا، کسی سے "نحو مسكن عائشة" بھی سہی، کیونکہ مسکنِ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مشرق کی جانب تھا، غرض کہ الفاظ تین ہیں اور مقصود واحد، یعنی جانب مشرق سے فتنہ اور قرنِ ابلیس کا ظہور ہوگا۔

ثانیاً: ظہورِ فتنہ و قرنِ ابلیس جانب مشرق میں جس مقام سے ہوگا، دوسری حدیث مرفوع سے وہ مقام بھی متعین ہے، یعنی نجد جو مدینے سے جانبِ مشرق ہے۔ بخاری نے کتاب الفتن میں انھیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے:

عن نافع عن ابن عمر قال: ذكر النبي ﷺ: «اللهم بارك لنا في شامنا، اللهم بارك لنا في يمننا» قالوا: يا رسول الله! وفي نجدنا؟ قال: «اللهم بارك لنا في شامنا، اللهم بارك لنا في يمننا» قالوا: يا رسول الله! وفي نجدنا؟ فأظنه قال في الثالثة: «هناك الزلازل والفتن، وبها يطلع قرن الشيطان، يبدأ من المشرق»[4]

[نافع رحمہ اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے بیان کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ذکر فرمایا: اے اللہ! ہمارے شام میں برکت فرما۔ اے اللہ! ہمارے یمن میں برکت فرما۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمارے نجد میں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ ہمارے شام میں برکت فرما۔ اے اللہ! ہمارے یمن میں برکت فرما۔ انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے نجد میں؟ میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا: وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور شیطان کا سینگ وہیں سے طلوع ہوگا]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٠٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٠٥)

[3] إرشاد الساري للقسطلاني (٥/ ١٩٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٨١)

شرح قسطلانی میں ہے: "نجد۔ بفتح النون وسكون الجيم۔ قال الخطابي: نجد من جهة المشرق، ومن كان بالمدينة كان نجده بادية العراق، ونواحيها، وهي شرق أهل المدينة" [1] ["نجد" نون کی زبر اور جیم کی سکون کے ساتھ ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے فرمایا: نجد مشرق کی جانب ہے، جو شخص مدینے میں ہو، اس کا نجد بادیہ عراق اور اس کے نواحی میں آتا ہے اور وہ اہلِ مدینہ کا مشرقی حصہ ہی بنتا ہے] اب بعد ان دلائلِ ساطعہ و براہینِ قاطعہ کے احتمال ثالث اچھی طرح متعین ہوگیا ولا محذور فيه.

سوال چہارم:

جناب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو بعد افشاءِ راز کے طلاق دیا اور طلاق عائشہ بدست علی سپرد کیا، چنانچہ حضرت علی نے بعد جنگِ جمل کے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دیا اور زوجیتِ پیغمبرِ صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے خارج کر دیا؟

جواب:

یہ محض غلط اور بے اصل بات ہے۔ اگر دعویٰ ہے تو کسی کتاب معتبر کی روایت صحیح سے، عام اس سے کہ وہ کتاب سنی کی ہو یا شیعہ کی، ثابت کیا جائے اور اس دعوے کا جھوٹا اور اس قول کا اتہام محض ہونا اس شخص پر ظاہر ہوگا، جس نے فریقین کی کتبِ معتبرہ اور روایاتِ صحیحہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت اور وفات کا واقعہ دیکھا ہوگا اور صحابہ کی روایات ازواجِ مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ و حضرت حفصہ و اُم سلمہ وغیرہن رضی اللہ عنہن سے دیکھی ہوگی اور اس سوال کے واضع سے سخت تعجب ہے کہ اس نے یہ خیال نہیں کیا کہ کہیں قرآن و حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہے کہ زوج کی موت کے بعد زوجہ مطلقہ ہو؟!

سوال پنجم:

تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما کو پہلوے مبارک میں جناب پیغمبرِ خدا کے عائشہ نے دفن ہونے دیا اور ان کے فرزند امام حسن کو اپنے جد امجد کے پہلو میں دفن ہونے سے باز رکھا، بلکہ لاش حسن علیہ السلام پر اس قدر تیر باران کیا کہ کئی تیر ان کی کفن میں چسپاں ہو گئے۔ اگر عائشہ کو دعویٰ ملک تھا تو اس کا ثبوت کافی ہونا چاہیے اور اگر ترکہ کا زعم تھا تو عباس عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا بھی اس مکان میں ترکہ تھا۔

جواب:

بروے تعجب اور افسوس کا تو یہ مقام ہے کہ ناحق دین و دنیا برباد اور خراب کرنے کو کیوں مقدس لوگوں پر تہمتیں وضع کی جاتی ہیں؟ کسی روایتِ صحیحہ قابل الاعتماد میں نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دفن ہونے نہ دیا اور اس قدر تیر باران کیا کہ کئی تیر کفن حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں چسپاں ہوگئے۔ نعوذ بالله من هذه التهمة! [2]

---

[1] إرشاد الساري (۱۹/ ۱۸۹)

[2] اس کی تفصیل "سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا" (ص: ۱۴۱۔۱۴۴) مصنفہ سید سلیمان ندوی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (عبد السمیع غفرلہ)

جہاں تک بات ہے وہ صرف مروان کا مفسدہ اور فتنہ ہے اور جب حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا اس تہمت سے بری ہیں تو پھر اس بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ اس مکان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دعویٰ وراثت تھا یا دعویٰ ملک۔ نفس الامر تو یہ ہے کہ دعویٰ وراثت آپ کو تھا ہی نہیں، کیونکہ آپ خود حدیث حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ کے ترکہ کا کوئی وارث نہیں ہے، بلکہ صدقہ ہے۔ باقی آپ کی ملک ہونے میں شبہہ نہیں۔ سوال سوم کی حدیث جس میں "نحو مسکن عائشه" مروی ہے، اس میں ظاہر ہے اور اگر وہ مکان آپ کی ملک نہ تھا تو حضرت شیخین یا حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ سے اپنے دفن ہونے کی اجازت کیوں طلب کرتے؟ فقط بعونہ تعالیٰ۔ پانچوں سوالوں کے جواب شافی تمام ہوگئے۔

حررہ: محمد رشید غازیپوری عفي عنه

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مذاق اڑانا اور تفاسیرِ صحابہ کی حجیت.

سوال ① صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہنسی اور تمسخر کرنا کیسا ہے؟

② تفاسیرِ صحابہ رضی اللہ عنہم اوروں کی تفاسیر پر مقدم ہیں یا نہیں؟ سائل: مولوی احمد اللہ صاحب امرتسری

جواب ① صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہنسی اور تمسخر کرنا، ایسے احمق، نادان یا سخت بیہودہ لوگوں کا کام ہے، جو ان بزرگوں کے فضائل و مناقب سے بے خبر یا منکر ہیں۔ بھلا کوئی ایسا شخص جو اس بات کو جانتا اور ایمان رکھتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «أکرموا أصحابي، فإنھم خیارکم»[1] [میرے صحابہ کا احترام کرو، کیوں کہ وہ تم میں سب سے زیادہ بہتر ہیں] اور فرمایا: «لو أن أحدکم أنفق مثل أحد ذھبا ما بلغ مد أحدھم ولا نصیفه»[2] [یقیناً اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا (راہِ خدا میں) خرچ کرے تو وہ ان (صحابہ کرام) کے ایک مد (تقریباً آدھا کلو) یا اس کے آدھے حصے کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا]

ان بزرگوں پر ہنسی اور تمسخر کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز ہرگز نہیں۔ ہاں صرف اتنی بات کہ "کسی شخص (کائناً من کان) کے قول کو اس وجہ سے قبول نہ کرنا کہ قول مذکور اُس شخص کی محض ایک رائے ہے۔" کوئی قابلِ ملامت امر نہیں ہے اور نہ یہ اُس شخص پر ہنسی اور تمسخر کرنے میں معدود ہو سکتا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص اپنی رائے کی نسبت صاف فرما دیا کہ «إذا أمرتکم بشيئ من رأیي فإنما أنا بشر»[3] [جب میں تمھیں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو میں صرف ایک بشر ہوں] تو دوسرے کسی شخص کی رائے کس شمار و قطار میں ہے؟

② تفاسیرِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلکہ تمام آثارِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو مرفوع حکمی کے درجے کو پہنچے ہوئے ہیں، تمام پچھلوں کی تفاسیر اور اقوال اور آرائے محض پر بلاشبہہ مقدم ہیں، کیونکہ تفاسیر و آثار مذکورہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفاسیر اور اقوال اور افعال اور تقاریر ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم

کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۴/ ذی القعدہ ۱۳۲۹ھ)

[1] سنن النسائي الکبریٰ (۵/ ۳۸۷) مشکاۃ المصابیح (۳/ ۳۰۸)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳٤۷۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٥٤۱)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۶۲)

خلفائے اربعہ کی خلافت کا ثبوت:

سوال خلفائے اربعہ کی خلافت کسی صریح حدیث سے ثابت ہے یا کہ صرف اجماعِ مسلمین سے؟

جواب خلافت خلفائے اربعہ کی حدیث سے بھی ثابت ہے اور خلافت خلفائے ثلاثہ اول کی اجماع صحابہ سے بھی، لیکن اس باب میں کوئی نص جلی موجود نہیں ہے۔

قرآن و حدیث کی تعریف:

سوال ① قرآن یعنی کلام اللہ کس کو کہتے ہیں؟

② حدیث یعنی حدیثِ رسول اللہ کس کو کہتے ہیں؟

③ اصطلاحِ شرع میں حدیثِ قدسی کس کو کہتے ہیں؟

④ ہم مسلمان بہت آسانی کے ساتھ کیونکر معلوم کر سکتے ہیں کہ قرآن شریف اور حدیثِ رسول اللہ ﷺ اور حدیثِ قدسی میں کیا فرق ہے؟

⑤ عام طور پر یہ جو مشہور ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ اور اس کا مفہوم یہ دونوں منزل من اللہ ہیں اور حدیث شریف کا مفہوم تو مع حدیث قدسی محض قرآن پاک کا ہے اور اس کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہیں، یہ خیال عوام کا کیسا ہے؟ چونکہ ترمذی میں ایک حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: «فضل كلام الله علىٰ سائر الكلام كفضل الله على سائر خلقه»[1] یعنی بزرگی کلام اللہ کی تمام کلاموں پر ایسی ہے، جیسے بزرگی اللہ عزوجل کی اپنی مخلوق پر۔

اب میں محض اسی وجہ سے کہ حدیث شریف اور کلام اللہ کو اگر کلامِ الٰہی مان لوں اور درحقیقت قرآن کلامِ الٰہی اور حدیث شریف صرف کلامِ رسول ہوا تو دونوں کو بحیثیت کلام مساوی ماننے کی حالت میں ایسا نہ ہو کہ شرک لازم آجائے، اس لیے بخوف ﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ اس مسئلے کی تحقیق کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ امید ہے کہ آپ بھی برائے خدا اگر کوئی فرق ہو تو اس باریکی سے مطلع فرمائیں، اگر نہ ہو تو تحریر فرما دیجیے، تاکہ ہم اس کے موافق عمل کریں، کیونکہ حدیث کے ماننے میں تو ہمارا پورا عقیدہ ہے کہ بموجب حکم خدا ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ حدیث و قرآن کو اپنا واجب العمل گردانتے ہیں، کیونکہ جب ہم خدا و رسول کے ماننے کا اقرار کرتے ہیں تو اس صورت میں ماننے والے دونوں کے ہیں، لیکن خدائے تعالیٰ کو خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ کو اس کا رسول جانتے ہیں، کیونکہ ''رب'' اور ''عبد'' کا فرق نہ کرنے کی صورت میں شرک لازم آجائے گا، اسی وجہ سے کلامِ رب اور کلامِ عبد میں فرق کرنے کا خیال ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ جناب کی خدمت میں اپنے شکوک کو پیش کیا گیا۔

المستفتي: سید جواد علی رضوی۔ تاریخ ۱۵/ جمادی الاول ۱۳۳۱ھ۔ از علی گڑھ بازار سبزی منڈی۔

جواب ① قرآن اللہ تعالیٰ کے اس کلام مقدس کو کہتے ہیں، جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا، جس کا نزول

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٢٦) سنن الدارمي (٢/ ٥٣٣) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' راوی ضعیف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣٣٥)

حضرت رسول اللہ ﷺ پر بطریق تواتر ثابت ہوا، جس کے ساتھ مخالفینِ اسلام سے تحدی، یعنی معارضہ طلب کیا گیا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ﴾ الآیۃ، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع کیا گیا، جس کی نقلیں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے کرا کر تمام اسلامی دنیا میں شائع کیا، جو آج تک تمام دنیا میں شائع ہے، جس کو اس وقت سے اب تک ہر زمانے میں لاکھوں حافظ حفظ کرتے چلے آئے۔

② حدیث، یعنی حدیثِ رسول اللہ ﷺ اس قول و فعل اور تقریر کو کہتے ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو یا وہ قول جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور وہ مندرجہ قرآن نہ ہو، گو وہ قول و فعل یا تقریر کلامِ الٰہی ہی سے ماخوذ ہو، لیکن اس کی نسبت صراحتاً فرمایا گیا ہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

③ اصطلاحِ شرع میں حدیثِ قدسی (حدیثِ الٰہی) اس حدیث کو کہتے ہیں، جس میں رسول اللہ ﷺ نے تصریح فرما دی ہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جیسے: «عن أبي هريرة قال قال رسول اللهﷺ: قال الله تعالىٰ: أعددت لعبادي الصالحين ما لا عين رأت، ولا أذن سمعت، ولا خطر على قلب بشر» (متفق علیه، مشکوۃ، ص: ٤٨٧)[1] [سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے تیار کیا ہے، جو کسی آنکھ نے دیکھا ہے، کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی آیا ہے]

④ ان تینوں امور میں فرق جوابات نمبر ہائے مذکورہ بالا سے بآسانی معلوم کر سکتے ہیں۔

⑤ قرآن پاک کے الفاظ یقیناً باعیانہا منزل من اللہ ہیں اور حدیث شریف کے الفاظ کی نسبت یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ منزل من اللہ ہیں، اگرچہ حدیث قدسی ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ حدیثیں جو فی الواقع رسول اللہ ﷺ سے صادر ہوئی ہیں، جو متعلق بہ تبلیغِ رسالت ہیں، وہ داخلِ وحی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ [النجم: ٣، ٤]

[اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے]

اور حدیث ترمذی منقولہ سوال نمبر ⑤ صحیح نہیں ہے، اس میں ایک راوی عطیہ ہے، جو کثیر الخطا اور مدلس ہے اور اس نے اس حدیث کو ''عن'' کے ساتھ روایت کی ہے اور مدلس جو حدیث ''عن'' کے ساتھ کرے، وہ حدیث صحیح نہیں ہے اور ابوسعید جس سے عطیہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، معلوم نہیں کون ہے؟ ظنِ غالب یہ ہے کہ یہ ابوسعید محمد بن سائب کلبی ہے، جو متہم بکذب و متہم بالوضع ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔

کتبہ: محمد عبداللہ (۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ)

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٧٢) صحيح مسلم رقم الحديث (٢٨٢٤) مشكاة المصابيح (٣/ ٢٣٠)

قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کرنا:

سوال اگر کوئی شخص قرآن مجید کا ترجمہ نظم میں کرے تو وہ درست ہے یا نہیں؟

جواب درست بھی ہے، نا درست بھی ہے۔ اگر مترجم ماہرِ قرآن مجید ہے اور صحیح ترجمہ نظم میں کرے تو درست ہے، جیسے نثر میں، ورنہ نادرست ہے جیسے نثر میں۔ کتبہ: محمد عبداللہ (۱۳۱۴ھ)

واجب اور فرض میں کیا فرق ہے؟

سوال واجب اور فرض میں کیا فرق ہے؟ یعنی جس بات کو اللہ تعالیٰ نے حکم کیا ہے وہ بات تو فرض ہے اور واجب کیا چیز ہے؟

جواب فرض اور واجب فقہاء رحمہم اللہ کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ بعض نے اپنی اصطلاح میں فرض و واجب میں فرق کیا ہے اور بعض نے فرق نہیں کیا ہے۔ جن لوگوں نے فرق کیا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جو حکم شرع نے کیا اور اس کے منعِ ترک پر قطعی دلیل قائم ہے، یعنی ایسی دلیل جس میں کسی طرح کا شبہہ نہیں ہے، تو وہ فرض ہے اور اگر اس پر دلیل ظنی قائم ہے، یعنی شبہہ ہے تو واجب ہے، جیسا کہ توضیح تلویح (ص: ۳۳۵، ۳۳۶ چھاپہ نولکشور ۱۲۸۸ھ) میں ہے:

(عبارتِ توضیح) "فإن كان الفعل أولى من الترك مع منعه أي منع الترك بدليل قطعي فلا فعل فرض، و بظني واجب. (عبارتِ تلویح) فالفرض لازم علما وعملا أي يلزم اعتقاد حقيته، و العمل بموجبه لثبوته بدليل قطعي حتى لو أنكره قولًا واعتقاداً كان كافراً، والواجب لا يلزم اعتقاد حقيته لثبوته بدليل ظني"

[(توضیح کی عبارت) پس اگر وہ فعل منع کے ساتھ ساتھ ترک سے زیادہ اولی اور بہتر ہو، یعنی اس کے منعِ ترک پر قطعی دلیل قائم ہو تو وہ فرض ہے اور اگر ظنی دلیل قائم ہو تو وہ واجب ہے۔ (عبارتِ تلویح) پس فرض علم و عمل کے اعتبار سے لازم ہے، یعنی اس کی حقیقت کا اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ رہا اس کے موجب کے ساتھ عمل تو وہ اس کے قطعی دلیل کے ساتھ ثابت ہونے کی بنا پر ہے، حتی کہ اگر وہ قولی اور اعتقادی طور پر اس کا انکار کرے گا تو وہ کافر ہوگا، رہا واجب تو اس کے حق ہونے کا اعتقاد اس کے ظنی دلیل کے ساتھ ثابت ہونے کی وجہ سے لازم نہیں ہے]

منار متن نور الانوار (ص: ۱۶۴ چھاپہ مصطفائی) میں ہے: "فالأول فريضة وهي ما لا يحتمل زيادة ولا نقصانا، ثبت بدليل لا شبهة فيه، كالإيمان والأركان الأربعة وحكمه اللزوم" [پس پہلا فرض ہے اور وہ وہ ہے جو زیادتی اور نقصان کا احتمال نہ رکھتا ہو، ایسی دلیل کے ساتھ ثابت ہو جس میں کوئی شبہہ نہ ہو، جیسے ایمان اور ارکانِ اربعہ، اس کا حکم لزوم ہے]

جن لوگوں نے فرض اور واجب میں فرق نہیں کیا ہے، اُن میں سے امام شافعی رحمہ اللہ بھی ہیں، جیسا کہ توضیح

(ص: ۳۳۹ چھاپہ مذکورہ) میں ہے: "والشافعي رحمه الله لم يفرق بين الفرض والواجب" [امام شافعی رحمہ اللہ نے فرض و واجب میں فرق نہیں کیا ہے] تلویح (ص: ۱۱ و ۲۱۴ چھاپہ مذکورہ) میں ہے: "فالمراد بالواجب ما يشتمل الفرض أيضا، لأن استعماله بهذا المعنى شائع عندهم، كقولهم: الزكاة واجبة والحج واجب" [پس واجب سے مراد یہ ہے جو فرض پر بھی مشتمل ہو، کیوں کہ ان کے نزدیک اس کا استعمال اس معنی میں شائع اور عام ہے، جیسے ان کا کہنا: زکات واجب ہے اور حج واجب ہے]

كتبه: نذير الدين حسين. المجيب مصيب. حرره محمد محمود، عفا الله عنه. الجواب ناطق بالصواب. كتبه: أضعف عباد الرحمن محمد سليمان. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله. مہر مدرسہ۔

تقیہ اور توریہ:

سوال ① تقیہ اور توریہ میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

② توریہ کیا چیز ہے؟

③ تقیہ تو شیعہ مذہب میں ہے اور توریہ کس مذہب میں ہے؟

جواب ① تقیہ اور توریہ میں ضرور فرق ہے۔ تقیہ تو صاف صاف ہر ایک پہلو سے جھوٹ ہے اور توریہ ایسا نہیں۔

② توریہ یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنے ہوں، ایک معنی قریب اور دوسرا معنی بعید، اور بولنے والا اس لفظ کو بول کر اس سے بعید معنی مراد لے، گو سننے والا اس سے اپنی غلط فہمی کی وجہ سے قریب معنی سمجھ جائے، مثلاً زید ایک شخص کو جو اس کا نسبی بھائی نہیں ہے، صرف اس کا ہم دین اور ہم مذہب ہے، یہ کہہ دے کہ یہ میرا نسبی بھائی ہے تو یہ تقیہ میں داخل ہو سکے گا، اور زید اس شخص کو صرف یہ کہہ دے کہ یہ میرا بھائی ہے اور اس کی مراد یہ ہو کہ یہ میرا دینی اور مذہبی بھائی ہے (اور یہ سچ بات ہے) تو یہ توریہ ہے، گو اس سے سننے والا نسبی بھائی اپنی غلط فہمی سے سمجھ جائے۔

③ توریہ اہلِ سنت کے یہاں بھی جائز ہے، جہاں اس کا موقع ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (۲۳/ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ)

کیا جدہ میں حضرت حوا علیہا السلام کی قبر موجود ہے؟

سوال جدہ میں جو قبر حضرت حوا علیہا السلام کی معروف و مشہور ہے، وہ ازروئے اخبار و آثار یا تواریخ معتبرہ سے صحیح یا نہیں؟

جواب اخبار اور آثار و تواریخ معتبرہ سے اس کی صحت ثابت نہیں ہے۔

کیا انگریزی زبان سیکھنا درست ہے؟

سوال اگر کوئی شخص اپنی اولاد یا بھائی کو قرآن مجید مع ترجمہ و قدرے صرف و نحو و عقائد و حدیث پڑھا کر علم انگریزی

پڑھوائے و نیز انگریزی کے ساتھ علم دینی بھی پڑھاتا جائے، آیا یہ انگریزی پڑھوانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب کوئی زبان فی نفسہ مذموم نہیں ہے۔ ہاں ناجائز بات بولنا خواہ کسی زبان میں ہو، البتہ مذموم ہے۔ زبانوں کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ﴾ [الروم، رکوع ۳] یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے آسمان اور زمین کا بنانا اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک امت میں یقیناً رسول بھیجا ہے اور جب کبھی کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا ہے تو اسی قوم کی زبان میں بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا﴾ [سورۂ نحل، رکوع ۵] ''یعنی بے شبہہ ہے اور بالیقین ہم نے ایک امت میں ایک رسول بھیجا ہے۔'' نیز فرماتا ہے: ﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾ [سورۂ إبراهيم، رکوع ۱] ''یعنی ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر اسی قوم کی زبان میں۔''

ان آیات سے بخوبی ثابت ہے کہ انگریزوں کی طرف بھی بالیقین کوئی رسول بھیجا گیا ہے اور جو رسول بھیجا گیا ہے، انھیں کی زبان میں بھیجا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی زبان انگریزی ہو یا اور کوئی، فی نفسہٖ مذموم نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا فی نفسہٖ کسی زبان کا سیکھنا یا سکھانا ممنوع نہیں ہے، بلکہ اگر کسی زبان کے سیکھنے یا سکھانے سے کوئی نیک غرض متعلق ہو تو اس کا سیکھنا یا سکھانا موجبِ اجر و ثواب ہے۔

"عن زيد بن ثابت أن النبيﷺ أمره أن يتعلم كتاب اليهود، حتى كتبت للنبيﷺ كتبه، وأقرأته كتبهم إذا كتبوا إليه" [1] (رواه البخاري)

یعنی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو حکم کیا کہ یہودیوں کا لکھنا سیکھ لیں، انھوں نے یہودیوں کا لکھنا سیکھ لیا، یہاں تک کہ نبی ﷺ کے خطوط یہودیوں کے پاس لکھ بھیجتے اور یہودیوں کے خطوط جو نبی ﷺ کے پاس آتے تو ان کو پڑھ کر نبی ﷺ کو سنا دیتے۔ (بخاری شریف، مطبوعہ احمدی: ۲/ ۱۰۶۸)

كتبه: محمد عبد الله. صح الجواب، والله أعلم بالصواب. كتبه: أبو الفياض محمد عبد القادر اعظم گڑھی مئوی.

دینار اور درہم کی مقدار:

سوال ایک عربی دینار سکہ رائج الوقت کے حساب سے کتنے ہوئے اور عربی ایک درہم سکہ رواجی سے کتنے آنہ بھر ہوئے؟

جواب عربی دینار ایک مثقال یعنی ۴ ماشہ سونے کا ہوتا ہے اور عربی درہم سکہ رائج الوقت کا ایک تہائی ہوتا ہے، یعنی تین درہم عربی اس وقت کے ایک روپیہ کے برابر ہوتا ہے۔ والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

[1] صحیح البخاري مع فتح الباري (۱۳/ ۱۸۶) امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث تعلیقاً ذکر کی ہے، البتہ امام ابو داود (۳۶۴۵) اور امام ترمذی (۲۷۱۵) نے اسے موصولاً روایت کیا ہے۔

حدیثِ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان:

سوال زاد المعاد میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مطلقہ ثلاثہ کے سکنی اور نان و نفقہ کے متعلق جو بحث کی ہے، اس میں مطعن ثانی کے جواب میں جو یہ عبارت ہے: "وقد أنكر الإمام أحمد هذا عن قول عمر، وجعل يتبسم، ويقول: أين في كتاب الله إيجاب السكنىٰ والنفقة للمطلقة ثلاثا... الخ"[1] اس عبارت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استدلال کا انکار مذکور ہے یا آپ سے ثبوتِ روایت کا انکار ہے؟

جواب اس عبارت میں محلِ انکار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال ہے۔ یہ نہیں کہ روایت، جس کے متعلق مصنف علامہ بحث کر رہے ہیں، اس کا ثبوت حضرت عمر سے نہیں۔ اس کی وجوہات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ اس عبارت کے آگے یہ عبارت ہے: "وأنكرته قبله الفقيهة الفاضلة فاطمة". ظاہر ہے کہ "هذا" کا مشار الیہ اور "أنكرته" میں ضمیر مفعول کا مرجع ایک ہی ہے اور بادنیٰ تامل معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کا انکار نہیں کر سکتی، کیوں کہ وہ صحابیہ ہے اور صاحبہ قصہ ہے اور اسی کے ساتھ اس امر میں نزاع ہوا، بلکہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استدلال کا انکار کرتی ہیں۔ پس "هذا" کا مشار الیہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال ہے۔

۲۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے مطاعن حدیثِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چار قسمیں کر کے ہر ایک کے جواب کے متعلق علیحدہ فصل قائم کی ہے۔ یہ عبارت زیرِ بحث دوسری قسم یعنی مخالفتِ قرآن میں ذکر کی ہے اور چوتھی قسم میں روایتِ مرفوع اور زیادت "سنة نبينا" کے متعلق ہے۔ پس اس قسم کے لحاظ سے عبارت زیرِ بحث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استدلالِ قرآنی کا ذکر ہے نہ کہ زیادت "سنة نبينا" کا بیان، بلکہ اس کے لیے علیحدہ چوتھی قسم میں بحث کی ہے۔

ابراہیم سیالکوٹی

الجواب صحيح. مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ایسی صاف عبارت کے مطلب میں بھی اختلاف ہوتا ہے، خصوصاً ایسے علما کا جنھوں نے تعلیم و تعلم و دیگر علمی امور میں اپنی عمریں صَرف کر دیں۔ محمد عبداللہ (غازی پوری)

أصاب من جاب. عبدالمنان وزیر آبادی — عبدالجبار عمر پوری، کان اللہ، مقیم دہلی کشن گنج

صح الجواب. شبلی نعمانی لکھنؤ

خاکسار کے نزدیک جواب صحیح معلوم ہوتا ہے۔ والله أعلم بالصواب. عبدالاحد خانپوری، عفی عنہ.

هذا هو الصواب. شیر علی (مدرس اعلیٰ ندوہ)

يظهر جليا أن إنكار أحمد إنما يتعلق بالمخالفة بين الكتاب والسنة، كما زعمها أمير المؤمنين، وقد أنكرت تلك المخالفة قبل أحمدَ فاطمةُ. أما استدلال عمر فلم يسبق له في

[1] زاد المعاد (٥/ ٤٧٧)

الفصل ذكر حتى يشار إليه بهذا، نعم إنكار المخالفة يراد به إنكار استدلال عمر، و هذا ما قلنا إنما هو بحيث اللفظ وما يدل عليه سياق العبارة، أما إنكار الرواية فلا دلالة عليه وليس إليه سبيل. السيد سليمان (المعلم في دار العلوم لكهنئو)

هذا هو الشبيه بالصواب. سيد علي الزينبي (المعلم في دار العلوم لكهنئو)

هذا الجواب حق، والله أعلم بالصواب. أبو العماد محمد شبلي (مدرس في دار العلوم ندوة العلماء) محمد أبو القاسم بنارسي.[1]



[1] ہفت روزہ ''اہلحدیث'' امرتسر (۲۷/ذوالحجہ ۱۳۲۸ھ)

كتاب الطهارة

دھوپ میں رکھے ہوئے پانی کا حکم:

سوال دھوپ میں رکھا ہوا پانی وضو اور غسل میں استعمال کرنا چاہیے؟

جواب وضو اور غسل میں اس کا استعمال بلا کراہیت جائز ہے، چنانچہ میزان شعرانی میں ہے:

"ومن ذلك قول الأئمة الثلاثة بعدم كراهة استعمال الماء المشمس في الطهارة مع الأصح من مذهب الشافعي من كراهية استعماله، فالأول مخفف، والثاني مشدد، فرجع إلى مرتبتي الميزان، و وجه الأول عدم صحة دليل فيه، فلو أنه كان يضر الأمة لبينه لهم رسول اللهﷺ، ولو في حديث واحد، أما والأثر في ذلك عن عمرؓ فضعيف جدا فبقي الأمر فيه علىٰ الإباحة"[1]

[اس سلسلے میں ائمہ ثلاثہ کا مذہب یہ ہے کہ طہارت کے لیے ماے مشمس (دھوپ میں گرم ہونے والا پانی) کا استعمال مکروہ نہیں ہے، جب کہ صحیح قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ ایسے پانی کے استعمال کی کراہیت کے قائل ہیں۔ پہلے قول میں آسانی ہے، جب کہ دوسرے قول میں شدت پائی جاتی ہے۔ پہلے قول کی بنیاد یہ ہے کہ اس پانی کے استعمال میں کراہت کی کوئی صحیح دلیل ثابت نہیں ہے تو یہ دونوں ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھے جائیں گے۔ اگر ایسا پانی نقصان دہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کی وضاحت فرما دیتے، چاہے کسی ایک حدیث ہی میں سہی۔ اور اس کے متعلق میں جو عمر رضی اللہ عنہ سے اثر مروی ہے، وہ انتہائی ضعیف ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ ایسا پانی استعمال کرنا مباح اور جائز ہے]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بحکم رسول اللہ ﷺ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پانی کو تابِ آفتاب میں گرم ہونے کو رکھا، واسطے غسل آنحضرت ﷺ کے۔ واللہ أعلم. کتبہ: محمد علی اطہر، غفر اللہ له ولوالديه.

اس بارے میں کہ دھوپ میں رکھا ہوا پانی وضو اور غسل میں استعمال کرنا چاہیے یا نہیں؟ کوئی صحیح حدیث معلوم نہیں ہوتی، ہاں اگر طبی طور پر اس پانی کا استعمال مضر ثابت ہو تو اس کا استعمال ناجائز ہوگا، ورنہ جائز۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبداللہ (٢٦/ ذی الحجة ١٣٣٢ھ)

---

[1] الميزان للشعراني (١/ ٣٣١)

کپڑے کو منی سے پاک کرنے کا طریقہ:

سوال منی کپڑے میں لگ کر خشک ہوگئی ہو اور وہ منی کسی دوسری نجاست کے ساتھ مخلوط نہ تھی، تو اگر اُس منی کو کپڑے سے کھرچ دیں تو وہ کپڑا پاک ہو جائے گا؟ اس مسئلے کا جواب حنفی مذہب کی رو سے معتبر کتابوں سے مرحمت ہو اور اس سوال کا جواب حدیث کی رو سے کیا ہے؟

جواب صورتِ مذکورہ سوال میں حنفی مذہب کی رو سے وہ کپڑا پاک ہو جائے گا، اسی طرح حنفی مذہب کی تمام کتب معتبرہ میں مرقوم ہے، چنانچہ چند کتب معتبرہ مذہب حنفی کی عبارات ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

① "فإذا جف -أي المني- علی الثوب أجزأه الفرك، لقوله عليه السلام لعائشة: «فاغسليه إن كان رطبا، وافركيه إن كان يابساً»[1] انتهیٰ" (هداية مطبوعة مطبع مصطفائي، ص: ٥٦)

[پس اگر کپڑے پر منی خشک ہو جائے تو اس کو کھرچنا ہی کافی ہے، کیوں کہ نبیِ کریم ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا: اگر وہ (منی) تر ہے تو اسے دھو دو اور اگر وہ خشک ہے تو اسے کھرچ دو]

② "وإن جف علی الثوب أجزأ فيه الفرك استحسانا كذا في العناية انتهی"
(فتاویٰ عالمگيري مطبوعة مطبع أحمدي، ص: ١٦)

[اگر وہ کپڑے پر خشک ہو جائے تو استحساناً اسے کھرچنا ہی کافی ہے]

③ "ويطهر مني -أي محله- يابس بفرك -ولا يضر بقاء أثره- إن طهر رأس حشفة- كأن كان مستنجيا بماء" انتهی. والله تعالیٰ أعلم (در مختار مطبوعة مطبع هاشمي، ص: ٣٧)

[منی والی جگہ خشک ہونے کی صورت میں کھرچنے سے پاک ہو جاتی ہے اور اس کے نشان کا باقی رہنا نقصان دہ نہیں ہے، اگر عضو تناسل کا اگلا حصہ پاک ہے، جیسے اس نے پانی کے ساتھ استنجا کیا ہو]

اس سوال کا جواب حدیث سے بھی وہی ہے، چنانچہ ایک حدیث تو خود عبارتِ ہدایہ میں، جو اوپر مذکور ہوئی، منقول ہے، نیز مشکوۃ میں ہے:

"عن الأسود وهمام عن عائشة قالت: كنت أفرك المني من ثوب رسول الله ﷺ رواه مسلم"[2] والله تعالیٰ أعلم

[اسود اور ہمام رحمہ اللہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: میں نبیِ کریم ﷺ کے کپڑے سے منی کو کھرچ دیا کرتی تھی]

کتبہ: محمد عبد اللہ (۲/ رمضان ۲۷ھ)

---

① امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هذا الحديث لا يعرف، وإنما المنقول أنها هي كانت تفعل ذلك من غير أن يكون أمرها" (التحقيق في أحاديث الخلاف: ١/ ١٠٧) نیز حافظ زیلعی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو "غریب" یعنی ضعیف قرار دیا ہے۔ (نصب الراية: ١/ ١٨٠) حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وهذا لا شيئ، لأنه بلا سند" (تنقيح التحقيق للذهبي: ١/ ٣٦) نیز دیکھیں: الدراية لابن حجر (١/ ٩١)

② دیکھیں: صحیح مسلم (۲۸۸) مشکاۃ المصابیح (۱/ ۱۰۵)

لڑکے اور لڑکی کے پیشاب سے کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ:

سوال زید کہتا ہے کہ اگر لڑکا چھ مہینے کا ہو اور وہ کسی کپڑے پر پیشاب کر دے تو وہ کپڑا پاک ہے، جیسا کہ اس حدیث سے ثابت ہے: عن أبي السمح ﷺ قال قال رسول اللهﷺ: «يغسل من بول الجارية ويرش من بول الغلام» (أخرجه أبو داود والنسائي والحاكم)[1] [ابو سمح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے گا اور لڑکے کے پیشاب پر چھڑکاؤ کیا جائے گا] جب کہ عمرو یہ کہتا ہے کہ کیا لڑکا ہو یا لڑکی، اگر وہ کسی کپڑے پر پیشاب کر دے تو وہ ناپاک ہے اور کوئی دلیل قوی نہیں دیتا ہے۔

جواب حدیث مذکور بالا سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ لڑکی کا پیشاب دھو ڈالا جائے اور لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑک دیا جائے یعنی دونوں کا پیشاب ناپاک ہے، لیکن جس کپڑے میں پیشاب لگ جائے، اس کے تطہیر، یعنی پاک کرنے کا طریقہ مختلف ہے۔ لڑکی کے پیشاب میں دھونا ضروری ہے اور لڑکے کے پیشاب میں صرف پانی چھڑک دینا کافی ہے۔ اس حدیث سے اُن لوگوں کا قول رد ہو جاتا ہے، جو کہتے ہیں کہ دونوں میں دھونا ضروری ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

اگر کنویں میں کتا گر جائے؟

سوال ایک کنویں میں بہت سا پانی ہے اور اس میں ایک کتے کا بچہ گر پڑا اور زندہ نکال لیا گیا۔ اب دریافت طلب یہ بات ہے کہ پانی کنویں کا ناپاک ہے یا پاک؟ بعض جہلا کہتے ہیں کہ جب تک کل پانی نہ نکالا جائے، تب تک پاک نہیں ہوسکتا۔ آیا وہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں یا غلط؟

جواب جب کتے کا بچہ کنویں سے نکال لیا گیا اور کنویں میں پانی بہت سا ہے تو اگر پانی دو قلہ یا دو قلے سے زیادہ ہے تو اس کنویں کا پانی پاک ہے۔ "حجة الله البالغة" (۱/ ۱۴۷ مصری) میں ہے:

«قوله صلى الله عليه: «إذا كان الماء قلتين لم يحمل خبثاً»[2] (إلى) وإنما جعل القلتين حدا فاصلًا بين الكثير والقليل، لأمر ضروري، لا بد منه، وليس تحكما ولا جزافا، وكذا سائر المقادير الشرعية (إلى قوله) وقد أطال القوم في فروع موت الحيوان في البئر والعشر في العشر والماء الجاري، وليس في كل ذلك حديث عن النبيﷺ ألبتة، وأما الآثار المنقولة عن الصحابة والتابعين كأثر ابن الزبير في الزنجي، وعليؓ في الفأرة، والنخعي والشعبي في نحو السنور، فليست مما يشهد له

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٤) المستدرك (١/ ٢٧١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٢) نیز دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ٦٠)

المحدثون بالصحة، ولا مما اتفق عليه جمهور أهل القرون الأولىٰ، وعلىٰ تقدير صحتها يمكن أن يكون ذلك تطييبا للقلوب، وتنظيفا للماء، لا من جهة الوجوب الشرعي، كما ذكر في كتب المالكية، ودون نفي هذا الاحتمال خرط الفتاد، وبالجملة فليس في هذا الباب شيئ يعتد به، ويجب العمل عليه، وحديث القلتين أثبت من ذلك كله بغير شبهة، ومن المحال أن يكون الله تعالىٰ شرع في المسائل [لعباده شيئا زيادة] علىٰ ما لا ينفكون عنه من الارتفاقات، وهما مما يكثر وقوعه، وتعم به البلوىٰ، ثم لا ينص عليه النبيﷺ نصا جليا، ولا يستفيض في الصحابة ومن بعدهم، ولا حديث واحد فيه" والله تعالىٰ أعلم"[1]

[نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: جب پانی دو قلے ہو تو وہ گندگی نہیں اٹھاتا۔ آبِ کثیر اور آبِ قلیل کے درمیان قلتین کو ایک ضروری امر کی وجہ سے حد فاصل ٹھہرایا ہے، کسی زبردستی یا اٹکل کے سبب یہ حد بندی نہیں کی اور تمام مقادیر شرعیہ کا یہی حال ہے کہ کسی کے اندر بھی زبردستی اور اٹکل کا دخل نہیں ہے۔ پھر لوگوں نے کنویں کے اندر جاندار کے مر جانے، دہ در دہ اور بہنے والے پانی کے متعلق بہت زیادہ جزئی مسائل نکال لیے، حالاں کہ نبی کریم ﷺ سے ان سب مسائل کے متعلق قطعاً احادیث مروی نہیں ہیں، البتہ جو آثار صحابہ کرام سے، مثلاً: ابن زبیر سے زنگی کے متعلق، علی رضی اللہ عنہ سے چوہیا کے بارے میں اور نخعی اور شعبی سے بلی جیسے جانور کے متعلق مروی ہیں، ان کے متعلق محدثین نے صحت کی گواہی دی ہے نہ قرونِ اولیٰ کے جمہور کا ان پر اتفاق ہے۔ اگر وہ آثار صحیح بھی ہوں تو ممکن ہے کہ وجوبِ شرعی کے طور پر نہیں، بلکہ لوگوں کے دل مطمئن کرنے اور پانی کی نظافت کے لیے ہوں، جیسا کہ کتبِ مالکیہ میں مذکور ہے۔ اگر یہ احتمال صحیح نہیں ہے تو اس میں سخت دقت ہے۔ المختصر اس باب میں کوئی قابلِ اعتماد اور واجب العمل شے نہیں ہے اور حدیثِ قلتین بلاشبہہ ان سب سے زیادہ ثابت ہے۔ نیز یہ امر محال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسائل میں اپنے بندوں کے لیے ان تدابیر کے اوپر جو ان کے اوپر لازم ہیں، کچھ بڑھایا ہو اور باوجود ان چیزوں کے کثرتِ وقوع اور عمومِ بلوی کے نبی کریم ﷺ نے اس کے متعلق کوئی واضح حکم نہ دیا ہو اور صحابہ کرام میں وہ معروف نہ ہوا ہو اور اس بارے میں ایک بھی حدیث نہ ہو] كتبه: محمد عبد الله (۸/شعبان ۱۳۳۲ھ)

کیا حقے کا پانی پاک ہے؟

سوال حقے کا پانی پاک ہے یا ناپاک؟

جواب حقے کا پانی بے شک نجس ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ جاری پانی میں اگر نشے کی چیز یا مردار مل کر اس کے اوصاف

[1] حجة الله البالغة (ص: ۳۸۰، ۳۹۱)

کوتغیر کر دے تو وہ نجس ہوجاتا ہے، كذا في فتاویٰ عالمگیري: ”وإذا ألقي في الماء الجاري شيئ نجس كالجيفة والخمر، لا ينجس، ما لم يتغير لونه أو طعمه أو ريحه“[1] [اگر چلتے پانی میں مردار اور شراب جیسی کوئی ناپاک شے پھینک دی جائے تو وہ (پانی) ناپاک نہیں ہوتا، جب تک اس کا رنگ یا ذائقہ یا بو نہ بدل جائے]

پس یہ دونوں بات تمباکو میں موجود ہیں: نشہ اور مردار۔ نشہ یہ کہ اگر غیر عادی شخص خوب کڑا تمباکو کھائے یا پیے فوراً چکر کھا کر گر پڑے گا۔ مردار یہ کہ کھیت میں سیکڑوں حرام جانور مرتے ہیں اور اس کا کچھ احتیاط نہیں کیا جاتا ہے، خصوصاً مکھی و چیونٹی وغیرہ گر کر مر جاتے ہیں اور تمباکو میں کوٹے جاتے ہیں، یہ سب چیزیں مل کر پانی کے اوصاف کو تبدیل کرتے ہیں کہ اگر حلال کھانے میں پڑے تو اس کو بدبودار کر کے حرام کر دے۔ كذا في عالمگیری: ”والطعام إذا تغيروا [واشتد] تنجس“[2] [کھانا جب زیادہ بدل جائے تو وہ ناپاک ہوجاتا ہے]

كتبه: تصدق حسين. عفي عنه

حقے کے پانی کے ناپاک ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ استدلال کہ پانی میں اگر مردار یا نشے کی چیز مل کر اس کے اوصاف کو تغیر کر دے تو وہ پانی نجس ہوجاتا ہے اور تمباکو میں دونوں باتیں موجود ہیں، یہ اس صورت میں صحیح ہوگا کہ جب مستدل یہ چند امور ثابت کر لے:

اولاً: ہر مری ہوئی اور نشے والی چیز نجس ہے۔

ثانیاً: نجس چیز کا دھواں بھی نجس ہوتا ہے۔

ثالثاً: اس دھوئیں کے ملاقی ہونے سے وہ پانی بھی ناپاک ہوجاتا ہے، ودونه خرط القتاد. [اور اس میں سخت دشواری ہے]

حالانکہ مستدل نے ان باتوں میں سے کسی کو ثابت نہیں کیا۔ بالفرض اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ہر مری ہوئی اور نشے والی چیز نجس ہے تو اس سے بھی غاية ما في الباب صرف تمباکو کی نجاست ثابت ہوگی، نہ اس کے دھوئیں کی اور ظاہر ہے کہ پانی کے اندر تمباکو کا دھواں جاتا ہے، نہ کہ نفس تمباکو۔ پس اس سے تمباکو کی نجاست کیونکر ثابت ہوگی؟ اور اگر نجس چیز کے دھوئیں کے ملنے سے چیز نجس ہوجاتی ہے تو نجاست سے احتراز عسیر ہوجائے گا، کیونکہ ایسے دھوئیں سے احتراز متعسر ہے۔ مانا کہ خود اوپلے وغیرہ سے کچھ نہ پکائے، لیکن دوسروں کو کیونکر روک سکتا ہے اور جب دوسروں کو روک نہیں سکتا تو ایسے دھوئیں سے آپ کیونکر بچ سکتا ہے؟ الحاصل اس دعوے پر کہ ”حقے کا پانی نجس ہے۔“ مستدل نے جو دلیل دی ہے، اس سے اس دعوے کا ثبوت نہیں ہوتا۔ والله أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبدالله. الجواب صحيح. أبو الفياض محمد عبدالقادر أعظم گڑھی مئوی.

---

[1] فتاویٰ عالمگیری (الفتاویٰ الهندية: ١/ ١٧)

[2] الفتاویٰ الهندية (٥/ ٣٣٩)

کثرتِ احتلام کی حالت میں غسل کا حکم:

سوال اگر کسی شخص کو کسی بیماری کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے روز یا ایک روز یا دو روز کے بعد حاجتِ غسل ہو، یعنی احتلام ہو تو وہ کیا کرے؟ روز غسل کرے یا ناف کے نیچے دھو کر کپڑا بدل ڈالے؟ فقط المستفتی: محمد حسن پسر محمد علی، ساکن اموا، ضلع مظفر پور.

جواب ہر روز غسل کرے۔ ہاں اگر معذور ہو کہ مثلاً پانی نہ پائے یا بیماری کی وجہ سے غسل مضر ہو تو ایسی حالت میں بجائے غسل کے تیمّم کر لے اور بدن میں جو آلائش لگی ہے، اگر اس کو دھو سکتا ہو تو ضرور دھو ڈالے۔

قال اللہ تعالی: ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ [سورة مائدة، رکوع:۲]

[اور اگر جنبی ہو تو غسل کر لو اور اگر تم بیمار ہو یا کسی سفر پر یا تم میں سے کوئی قضاے حاجت سے آیا ہو یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو، پھر کوئی پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو، پس اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو] واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۵/ شوال ۱۳۲۶ھ) الجواب صحیح. کتبہ: أبو یوسف محمد عبد المنان.

مریض کے لیے غسلِ جنابت کا حکم:

سوال اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ غسل نہیں کر سکتا، دس روز خواہ ایک مہینے تک اور اس درمیان میں حاجتِ غسل ہوئی تو بغیر غسل کیے ہوئے تیمّم کر کے نماز فرض اور سنت اور قرآن مجید پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب قرآن شریف میں ہے کہ اگر تم بیمار ہو تو تیمّم کرو۔[1] حدیث شریف میں ہے کہ بیمار کے لیے تیمّم وضو اور غسل کا قائم مقام ہے،[2] جب تک بیماری رہے، اس میں مدت کی کچھ قید نہیں ہے۔ بیماری کی حالت میں جتنی بار حاجتِ غسل ہوتی جائے یا آدمی اپنی بی بی سے صحبت کرے تو بے تکلف غسل کے بدلے تیمّم کر ڈالا کرے اور نماز فرض، سنت، نفل، قرآن مجید کی تلاوت وغیرہ سب کچھ بلاخوف کیا کرے، کیونکہ یہی شرع شریف کا حکم ہے، پھر جب حرج جاتا رہے تو غسل کر ڈالے۔ بیماری سے وہ حالت مراد ہے، جس میں پانی ضرر کرے، وہ کوئی بیماری ہو، اس سے بحث نہیں۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: أبو محمد إبراهيم (مہر مدرسہ)

بواسیر اور جریان کا مریض نماز کیسے پڑھے؟

سوال ایک شخص کو ریح البواسیر کا عارضہ ہے۔ کبھی دبر سے خون بھی خارج ہو جاتا ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا، اسی

---

[1] سورة المائدة [آیت:٦]

[2] دیکھیں: سنن أبي داود (١/ ١٣٨)

لاعلمی کی حالت میں نماز پڑھ لیتا ہے اور شخص مذکورہ کو جریان کی بھی شکایت ہو جایا کرتی ہے اور اس کا علم بھی اس کو نہیں ہوتا اور اسی لاعلمی کی حالت میں نماز پڑھ لیتا ہے۔ بعد کو کپڑے پر خون کا دھبہ یا سفید دھبہ دکھائی دیتا ہے اور کبھی کبھی بعض لوگ اسے نماز پڑھانے کے لیے بھی کھڑا کر دیتے ہیں، ایسی صورت میں وہ شخص نماز پڑھے یا چھوڑ دے اور وہ شخص امامت کر سکتا ہے یا نہیں اور اس کو ہر نماز کے وقت کپڑا بدلنا یا کپڑا دھونا ضروری ہے یا نہیں؟ حدیث سے اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ایسی صورت میں شخص مذکور ہرگز نماز نہ چھوڑے، اس عذر سے نماز چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ ہاں ہر نماز کے لیے وضو تازہ کر لیا کرے اور اس کو ہر نماز کے وقت کپڑا بدلنا یا دھونا ضروری نہیں ہے۔ اگر بدل سکتا یا دھو سکتا ہے تو بہتر ہے کہ بدل ڈالے یا دھو ڈالے، ورنہ اسی طرح نماز پڑھے:

قال الله تعالىٰ: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ٢٨٦] [اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق] وقال تعالىٰ: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: ١٦] [سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو] اور وہ شخص امامت کر سکتا ہے، اس کی امامت کا ناجائز ہونا کسی آیت یا صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔ والله تعالىٰ أعلم.

عورت کو ایک ماہ میں دو بار خون آئے تو وہ کیا کرے؟

سوال ایک عورت کو ایام (حیض) ایک ماہ میں صرف ایک بار آخر دہے میں آیا کرتے تھے، اب چند روز سے دہے ثانی میں بھی خون آنے لگا، یعنی اب ایک ماہ میں دو بار خون آنے لگا۔ ایسی صورت میں عورت مذکورہ (آخر دہے اور ثانی دہے دونوں میں) نماز چھوڑ دے یا کیا کرے؟ اس کے بارے میں بھی حدیث سے کیا حکم ہے؟

جواب خونِ حیض اور خونِ استحاضہ میں فرق ہے۔ عورتیں اس فرق کو بیشتر خوب جانتی ہیں۔ صحیح بخاری میں ایک ماہر ذی علم (محمد بن سیرین) کا قول مذکور ہے کہ جب ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ عورت حیض گزر جانے کے پانچ دن بعد خون دیکھے تو کیا کرے؟ فرمایا: "النساء أعلم بذلك"[1] یعنی عورتیں اس کو خوب جانتی ہیں۔

نیز یہ بھی جاننا چاہیے کہ ایک ماہ میں دو حیض، بلکہ تین حیض بھی آ سکتے ہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح رحمہ اللہ کا فیصلہ مذکور ہے کہ ایک عورت اور اس کے خاوند میں تکرار تھی۔ طلاق پر ایک ماہ کی مدت گزری تھی۔ خاوند چاہتا تھا رجعت کرنا اور عورت کہتی تھی کہ میری عدت گزر گئی اور ایک ہی ماہ میں مجھ کو تین حیض آ چکے، اس پر دونوں صاحبوں نے فرمایا: "إن جاءت ببينة من بطانة أهلها ممن يرضىٰ دينه، أنها حاضت في شهر ثلاثا، صدقت"[2] یعنی اگر یہ عورت اپنے گھر کی دیندار معتبر راز دار عورتوں کو گواہی میں پیش کرے کہ اس

[1] صحيح البخاري (١/ ١٢٣)

[2] صحيح البخاري (١/ ١٢٣) صحیح بخاری میں یہ دونوں اثر تعلیقاً مروی ہیں، البتہ امام دارمی (١/ ٢٣٣) نے اسے موصولاً بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ورجاله ثقات" (فتح الباري: ١/ ٤٢٥) نیز دیکھیں: تغلیق التعلیق (٢/ ١٧٩)

عورت کو ایک مہینے میں تین بار حیض آیا تو اس کی تصدیق کر لی جائے گی۔

پس صورت مسئولہ میں اگر دہے ثانی کا خون بھی حیض کا خون ہے تو عورت مذکورہ دونوں میں نماز چھوڑ دے، ورنہ صرف آخر دہے میں نماز چھوڑ دے عادت کے موافق اور دہے ثانی میں نماز پڑھے، لیکن یہ ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرلیا کرے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللّٰہ

وضو میں پاؤں دھونا ہی ضروری ہے:

سوال ﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ [المائدۃ: ٦]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک (دھولو)]

صاحب الوحی علیہ السلام نے پیر کا دھونا ارشاد فرمایا ہے، جیسا کہ قاعدہ نحو سے مفہوم ہوتا ہے یا پیر کا مسح کرنا؟ نیز کیا کوئی حدیث صحیح صحاح اہلِ سنت و جماعت سے بجائے پیر دھونے کے مسح کرنے کے متعلق ثابت ہوئی ہے یا نہیں؟

جواب حضرت صاحب الوحی ﷺ نے پیر کا دھونا ارشاد فرمایا ہے اور خود بھی برابر پیر دھویا ہے۔ احادیثِ صحیحہ اس باب میں بکثرت وارد ہیں، بلکہ تواتر کی حد کو پہنچ گئی ہیں اور کسی حدیث صحیح صحاحِ اہلِ سنت و جماعت سے بجائے پیر دھونے کے، مسح کرنا ثابت نہیں ہوا ہے۔

صحیح بخاری مع فتح الباری (۱/۱۱۳۳) چھاپہ دہلی میں ہے:

باب غسل الرجلين، ولا يمسح على القدمين. حدثنا موسىٰ بن إسماعيل قال[1] [حدثنا أبو عوانة عن أبي بشر عن يوسف بن ماهك عن عبد اللّٰه بن عمرو قال: تخلف النبيﷺ عنا في سفرة سافرناها، فأدركنا، وقد أرهقنا العصر، فجعلنا نتوضأ، ونمسح على أرجلنا فنادىٰ بأعلىٰ صوته: ويل للأعقاب من النار][2]

[پاؤں کو دھونے اور قدموں پر مسح نہ کرنے کا بیان۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں نبیِ کریم ﷺ ہم سے پیچھے رہ گئے تو ہمیں اس وقت ملے، جب نماز کا وقت تھوڑا ہی رہ گیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے تو ہم اپنے پاؤں کو تھوڑا تھوڑا مسح کرنے کی طرح دھو رہے تھے۔ پس آپ ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا: ایڑھیوں کے لیے جہنم سے ہلاکت ہے، یعنی پاؤں کو اچھی طرح دھویا کرو]



[1] اصل مسودے میں اس کے بعد بیاض ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٢)

كتاب الصلاة

مساجد کے احکام و مسائل

حسبِ ضرورت نئی مسجد تعمیر کرنا:

سوال ہمارے مکان سے پاؤ کوس کے فاصلے پر ایک جمعہ کی مسجد ہے۔ وہاں کے لوگ اُس مسجد کی حفاظت و مرمت نہیں کرتے ہیں اور اس مسجد کے نزدیک ہی ایک آدمی کا مکان ہے۔ ہمارے یہاں زیادہ لوگ ہیں اور برسات کے ایام میں وہاں جانے میں محض تکلیف ہوتی ہے، یعنی راہ قریب پاؤ کوس کے ہے اور اثنا راہ میں کبھی سینے کبھی کمر تک پانی ہوتا ہے، اس واسطے ہمارے یہاں کے لوگوں نے اپنی بستی میں ایک مسجد بنائی ہے تو اس اطراف کے ایک دوسرے گاؤں میں ایک حاجی مجیر الدین صاحب ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس مسجد کا بنانا جائز نہیں ہے، بلکہ اور لوگ بھی کہتے ہیں، تو اس مسجد کا بنانا جائز و درست ہوسکتا ہے یا نہیں اور نمازِ جمعہ درست ہوسکتی ہے یا نہیں؟ جواب اس کا حدیث و دلیل سے دیجیے، تاکہ جھگڑا طے ہو جائے۔

جواب جس ضرورت سے دوسری مسجد بنائی گئی ہے، اُس ضرورت سے اُس مسجد کا بنانا جائز ہے اور جب ضرورت مذکورہ سے اس مسجد کا بنانا جائز ہے تو جمعہ کی نماز بھی اس مسجد میں جائز ہے۔ صحیح بخاری مع فتح الباری (۱/ ۲۵۸) چھاپہ دہلی میں ہے:

”إن عتبان بن مالك أتیٰ رسول اللهﷺ فقال: يا رسول اللهﷺ قد أنكرت بصري، وأنا أصلي لقومي، فإذا كانت الأمطار سال الوادي بيني وبينهم، لم أستطع أن آتي مسجدهم، فأصلي بهم، ووددت يا رسول اللهﷺ إنك تأتيني فتصلي في بيتي فأتخذه مصلى، قال: فقال له رسول اللهﷺ: سأفعل إن شاء الله تعالى“ الحديث.[1]

[عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں دیکھ نہیں سکتا اور میں اپنی قوم کو نماز پڑھاتا ہوں، لیکن جب بارشیں ہوتی ہیں تو میرے اور ان کے درمیان والی وادی پانی سے بھر جاتی ہے، جس کی وجہ سے میں ان کی مسجد میں آنے کی طاقت نہیں رکھتا کہ انھیں نماز پڑھا سکوں۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے پاس آئیں اور میرے گھر میں نماز پڑھیں، تاکہ میں اس کو نماز گاہ بنا لوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عن قریب میں ایسا کروں گا۔ ان شاء اللہ]

(نیز صفحہ: ۴۸۸) میں ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٣)

”قال ابن عباس لمؤذنه في يوم مطير: إذا قلت: أشهد أن محمداً رسول اللهﷺ، فلا تقل: حي علىٰ الصلاة، قل: صلوا في بيوتكم. فكأن الناس استنكروا، فقال: فعله من هو خير مني، إن الجمعة عزمة، وإني كرهت أن أحرجكم فتمشون في الطين والدحض“[1] والله أعلم بالصواب.

[سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بارش والے دن اپنے موذن سے کہا: جب تم (اذان میں) ”أشهد أن محمدا رسول الله“ کہو تو پھر ”حي علىٰ الصلاة“ نہ کہو، بلکہ کہو: ”صلوا في بيوتكم“ (اپنے گھروں میں نماز پڑھو) لیکن لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا: یہ کام اس ہستی (رسول اللہ ﷺ) نے کیا ہے، جو مجھ سے بہت بہتر تھی۔ بے شک جمعہ لازم ہے اور یقیناً میں نے ناپسند کیا کہ تم کو باہر نکالوں، پھر تم مٹی اور کیچڑ میں چل کر آؤ]

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح عندي، والله أعلم بالصواب. أبو محمد إبراهيم.صح الجواب، والله أعلم بالصواب. كتبه: أبو الفياض محمد بن عبدالقادر الأعظم گڑهی المؤی، مدرسه أحمديه آره. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبدالرحمن المباركفوري.

توسیع کے لیے مسجد گرا کر دوسری جگہ پر مسجد تعمیر کرنا:

سوال ایک مسجد خام و چھوٹی سلف سے موجود تھی، جس کی دیواروں کو ایک رئیس نے، جو وہاں کا متولی اور نگہبان تھا، بقصد تعمیر پختہ و وسیع توڑ ڈالا۔ اب ظاہر ہوا کہ جانب جنوب و شمال کچھ قبریں اس کی دیوار سے اس طرح لاحق ہیں کہ اگر صحن وسیع کیا جائے گا مطابق وسعت مسجد کے تو وہ قبریں وسطِ صحن میں پڑ جائیں گی اور اس کے پچھّم طرف ہنود کے مکان ہیں کہ وہ ہرگز نہیں دے سکتے۔ اگر دوسری جگہ مسجد بنائی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب جب کوئی زمین ایک بار مسجد قرار پا چکی تو اب وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہوگئی، اس کا مسجد ہونا باطل نہیں ہوسکتا۔ ایسی حالت میں دوسری جگہ مسجد تو بنانا ناجائز نہیں ہے، لیکن اول مسجد کی جگہ چھوڑ دینا اور اس کے مسجد ہونے سے دست بردار ہوجانا یا اس کی جگہ کوئی اور چیز بنوانا، جس سے اس جگہ کے احترام میں فرق آئے اور جُنب اور حائض وغیرہما اس میں جانے کے مجاز ہو جائیں، یہ امر بالضرور ناجائز ہے۔ مذہبِ احناف میں یہی مفتی بہ ہے۔ فتاویٰ عالمگیری (۲/ ۵۴۷ مطبوعہ بندر ہوگلی) میں ہے:

”ولو كان مسجد في محلة، ضاق علىٰ أهله، ولا يسعهم أن يزيدوا فيه فسألهم بعض الجيران أن يجعلوا ذلك المسجد له، ليدخله في داره، ويعطيهم مكانهم عوضا ما هو خير له، فيسع فيه أهل المحلة، قال محمد: لا يسعهم ذلك، كذا في الذخيرة“ اھ

[اگر ایک محلے میں مسجد ہو، جو وہاں کے رہنے والوں کے لیے تنگ ہوگئی ہے اور وہ اس میں اضافہ کرنے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٩٩)

کی استطاعت بھی نہیں رکھتے تو ان سے ایک ہمسایہ کہے کہ وہ یہ مسجد اسے دے دیں، تاکہ اس (جگہ) کو اپنے گھر میں شامل کر لے اور وہ اس کے بدلے میں انھیں اس سے بہتر جگہ دے دے، جو اہلِ محلّہ کے لیے کافی ہو، امام محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے لیے اس عمل کی گنجایش نہیں ہے]

(صفحہ: ۵۴۸) میں ہے: "في وقف الخصاف: إذا جعل أرضه مسجداً و بناه، وأشهد أن له إبطاله وبيعه، فهو شرط باطل، ويكون مسجداً"[1] اھ [جب ایک شخص اپنی زمین مسجد کو دے دے اور اس کو تعمیر کرے اور گواہ بنائے کہ وہ اس کو ختم بھی کر سکتا اور بیچ بھی سکتا ہے تو یہ شرط باطل ہے اور وہ مسجد ہی رہے گی] نیز اسی صفحہ میں ہے:

"وإذا خرب المسجد، واستغنیٰ أهله، و صار بحيث لا يصلى فيه، عاد ملكا لواقفه أو لورثته، حتى جاز لهم أن يبيعوه أو يبنوه دارا، وقيل: هو مسجد أبداً، وهو الأصح، كذا في خزانة المفتين. في فتاویٰ الحجة: لو صار أحد المسجدين قديما، وتداعیٰ إلى الخراب فأراد أهل السكة بيع القديم، وصرفه في المسجد الجديد فإنه لا يجوز... الخ"[2]

[جب مسجد ویران ہو جائے اور وہاں رہنے والے اس سے بے نیاز ہو جائیں کہ وہاں نماز بھی نہیں پڑھی جاتی تو وہ اس کو وقف کرنے والے یا اس کے ورثا کی دوبارہ ملکیت بن جائے گی، حتیٰ کہ ان کے لیے اسے بیچنا یا اسے گھر بنانا جائز ہوگا، لیکن ایک قول کے مطابق وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہی رہے گی اور یہی زیادہ صحیح ہے، جیسا کہ "خزانة المفتين" میں ہے۔ فتاویٰ الحجہ میں ہے کہ اگر دو مسجدوں میں ایک بہت پرانی ہو جائے اور ویرانی کا شکار ہو جائے تو محلے والے چاہیں کہ پرانی کو بیچ کر اس (کی آمدنی) کو نئی مسجد میں صَرف کر دیں تو یہ جائز نہیں ہے]

ایک مسجد کو گرا کر دوسری جگہ پر مسجد تعمیر کرنا

سوال ایک مسجد واقع بڑھی ٹولہ قریب اسٹیشن ریلوے مظفر پور ایک مدت دراز سے قائم ہے۔ اب سرکار چاہتی ہے کہ برضامندی اہلِ اسلام مسجد مذکور کو توڑ کر سڑک ریلوے درست کرے اور معاوضہ میں اس کے جیسی مسجد مسلمانان جس قدر خرچ سے جہاں کہیں تعمیر کرانا چاہیں گے، سرکار بنوا دے گی اور بصورت نہ راضی ہونے مسلمانوں کے وہ مسجد حسبِ دفعہ ایکٹ ۱۰ار۱۸۷۰ء بضرورت سرکار توڑ دی جائے گی۔ پس ایسی مجبوری میں شریعت سے جو حکم ہو، صاف صاف بحوالہ کتب وصفحہ و سطر وغیرہ کے تحریر فرمائیے۔ بینوا تؤجروا. فقط

المستفتي: مولوی محمد عبدالجلیل محمدی مظفر پوری

---

[1] الفتاویٰ الهندية (۲/ ۴۵۷)

[2] الفتاویٰ الهندية (۲/ ۴۵۸)

جواب ازروئے قانونِ وقف مذہبِ اسلام مسجد ملک خدا کی ہے، کسی شخص کی جائداد نہیں ہے۔ ہر مسلمان اس میں خدا کی عبادت بجا لانے کا یکساں استحقاق رکھتا ہے، نہ اس کو کوئی توڑنے کی اجازت دے سکتا ہے نہ اس کا معاوضہ لینے کا کوئی مجاز ہے۔ "من بنیٰ مسجداً لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقة، ويأذن بالصلاة فيه، أما الإفراز فلأنه لا يخلص لله تعالىٰ إلا به، كذا في الهداية" (فتاویٰ عالمگیریہ چھاپہ کلکتہ: ۲/ ۵٤٥، سطر: ۱٥) [جس نے مسجد بنائی تو اس وقت تک اس کی ملکیت ختم نہیں ہوگی، جب تک وہ ایک طریقے سے اس کو اپنی ملکیت سے الگ نہ کر دے اور نماز کی اجازت دے۔ ملکیت سے الگ کرنا اس لیے ضروری ہے کہ صرف اسی کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص ہو سکتا ہے]

"في وقف الخصاف: إذا جعل أرضه مسجداً و بناه وأشهد أن له إبطاله وبيعه فهو شرط باطل، ويكون مسجداً، كما لو بنىٰ مسجدا لأهل محلة، وقال: جعلت هذا المسجد لأهل هذه المحلة خاصة، كان لغير أهل تلك المحلة أن يصلي فيه، هكذا في الذخيرة" (فتاویٰ عالمگیریہ، طبع کلکتہ: ۲/ ۵٤۷، سطر: ۱۹)

[اگر وہ اپنی زمین کو مسجد کے لیے دے اور اسے تعمیر کرے اور گواہی دے کہ وہ اس کو ختم کر سکتا اور بیچ سکتا ہے تو یہ شرط باطل ہے اور وہ مسجد ہی رہے گی، جیسا کہ اگر وہ ایک محلے والوں کے لیے مسجد بنائے اور کہے کہ میں نے یہ مسجد صرف اس محلے والوں کے لیے بنائی ہے تو اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس میں نماز پڑھ سکتے ہیں]

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: أصاب عمر بخيبر أرضا، فأتى النبي ﷺ فقال: أصبت أرضا، لم أصب مالا قط أنفس منه، فكيف تأمرني به؟ قال: «إن شئت حبست أصلها، وتصدقت بها» فتصدق عمر أنه لا يباع أصلها، ولا يوهب، ولا يورث في الفقراء والقربىٰ والرقاب وفي سبيل الله والضيف وابن السبيل، لا جناح علىٰ من وليها أن يأكل منها بالمعروف أو يطعم صديقا غير متمول فيه. (بخاري شريف، طبع مصر: ۲/ ۱٤، سطر: ۱٤)[1] والله تعالىٰ أعلم

[سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں زمین ملی تو وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: مجھے ایک زمین ملی ہے کہ اس سے عمدہ مال مجھے اب تک کبھی نہیں ملا۔ پس آپ ﷺ اس کے متعلق مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: اگر تم چاہو تو اس کی اصل روک لو اور اس (کی آمدنی) صدقہ کر دو۔ چناں چہ عمر رضی اللہ عنہ نے اسے صدقہ کر دیا کہ اس کی اصل فروخت اور ہبہ نہ کی جائے اور نہ وراثت ہی میں تقسیم ہو۔ وہ فقرا، قرابت داروں، غلام آزاد کرانے، راہِ خدا میں، مہمانوں اور مسافروں میں تقسیم کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲٦۱۳)

جائے۔ اس کے نگران پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ خود اس میں سے اچھے طریقے سے کھائے یا اپنے کسی دوست کو کھلائے، لیکن مال جمع کرنے والا نہ ہو]

كتبه: محمد عبدالله. أصاب من أجاب، والله أعلم بالصواب. أبو محمد إبراهيم ٦/ شعبان ١٣٠٨هـ مطابق: ١٧/ مارچ ١٨٩١ء۔ الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب.

شور وغل کی وجہ سے مسجد گرا کر دوسری جگہ پر مسجد تعمیر کرنا:

سوال اس موضع میں ایک مسجد قدیم ہے اور ہمیشہ سے اس مسجد میں نمازِ تراویح اور جمعہ ہوتا رہا ہے۔ اب ایک دوسرا شخص اس مسجد کو توڑ کر دوسری جگہ بنانا چاہتا ہے بلا کسی وجہ کے اور یہ حیلہ کرتا ہے کہ اس مسجد قدیم کے ہمسایہ ہندو لوگ رہتے ہیں اور وقت بے وقت ڈھول وغیرہ بجاتے ہیں، اس واسطے اس مسجد کو توڑ کر اس کا سب ملبہ اٹھا لے جا کر دوسری جگہ مسجد بنائی جائے اور موضع مذکور کا زمیندار مسلمان ہے اور کسی شخص زمیندار یا دوسرے کسی آدمی کی رائے نہیں ہے کہ بلا کسی وجہ کے مسجد قدیم کو توڑا جائے۔ عنداللہ جواب بالصواب سے مطلع فرمایا جاوے کہ اللہ اجر عظیم دے۔

عبدالرحیم خان، ساکن موضع بیمبنی، ڈاکخانہ کاتبواڑہ، ضلع سیوتی چھپارہ

جواب جو جگہ اللہ تعالیٰ کے لیے مسجد قرار دے دی جائے وہ جگہ ہمیشہ کے لیے مسجد اور واجب الاحترام ہوگئی، نہ اس میں جنبی اور حائض ونفسا کا جانا جائز ہے اور نہ اس میں پائخانہ پیشاب کرنا یا اس کو اور کسی قسم کی نجاست یا گندگی سے آلودہ کرنا جائز ہے، بلکہ اس جگہ کو ہر قسم کی نجاستوں اور گندگیوں سے پاک رکھنا واجب ہے اور جب مسجد کا یہ حکم ہے جو مذکور ہوا تو اس کو توڑ کر دوسری جگہ مسجد بنانا ہرگز جائز نہیں ہے، ورنہ پہلی جگہ کا بے حرمت کر دینا لازم آئے گا، جو کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر اس مسجد قدیم کو نہ توڑیں اور دوسری جگہ ضرورت کی وجہ سے مسجد بنا لیں تو کچھ مضائقہ نہیں، بلکہ بہتر ہے۔ والله تعالىٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (٢٤/ رجب ١٣٣٢هـ)

ہیجڑے اور کسبی عورت کے مال سے تعمیر شدہ مسجد میں نماز پڑھنا:

سوال ہیجڑا اور کسبی جو مال کسبِ حرام سے پیدا کرتے ہیں، اگر اس مال سے مسجد بنا دیں تو اس مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس مسجد میں نماز جائز ہے، ہاں بنانے والے کو ایسی مسجد بنانے کا کچھ ثواب نہیں۔ «إن الله طيب لا يقبل إلا طيبا»[1] (صحيح بخاري وغيره) [یقیناً اللہ تعالیٰ پاکیزہ ہے اور پاکیزہ ہی کو قبول کرتا ہے] مشکوۃ شریف (ص: ٦٢ و ٦٣ چھاپہ دہلی فاروقی) میں ہے: عن أبي سعيد رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «الأرض كلها مسجد إلا المقبرة والحمام»[2] (رواه أبو داود والترمذي والدارمي) [ابو سعید (خدری) رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧) سنن الدارمي (١/ ٣٧٥)

فرمایا: ”زمین ساری کی ساری مسجد ہے، سوائے حمام اور مقبرہ کے]

و عن ابن عمر قال: «نهى رسول اللهﷺ أن يصلىٰ في سبع مواطن: في المزبلة والمجزرة والمقبرة وقارعة الطريق وفي الحمام وفي معاطن الإبل و فوق ظهر بيت الله»[1]

(رواه الترمذي و ابن ماجه)

[سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات جگہوں میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا: کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ، مذبح (جانور ذبح کرنے کی جگہ) میں، قبرستان میں، عام راستے میں، غسل خانے میں، اونٹوں کے باڑے میں اور بیت اللہ کی چھت پر]

ایک ہندو کے مال سے تعمیر شدہ مسجد کا حکم:

سوال ایسی مسجد جس کو ایک مسلمان نے ہندو کے روپے سے اس طرح کہہ کر بنوائی ہے کہ اگر تم فلاں مقدمہ جیتو تو میری بستی میں مسجد بنوا دیجیو، چنانچہ بحسبِ اتفاق وہ مقدمہ سرسبز ہوا اور ہندو نے روپے دیے اور مسلمان نے مسجد بنوائی، حکم مسجد رکھتی ہے یا نہیں اور اس میں ثواب نماز پڑھنے کا ہوگا یا نہیں؟ اس مسجد کو توڑوا کر سب مسلمان بھائی حلال مال سے پھر بنوا سکتے ہیں یا نہیں؟ نفسِ زمین اس کی بطورِ موقوف جائز ہے۔ اگر بمعاملۂ شر وفساد اس کو توڑوا کر بنوا نہ سکیں تو دوسری مسجد دوسری جگہ اس بستی میں بننے سے مصداق مسجد ضرار تو نہ ہوگی؟

جواب مسجد مذکور حکمِ مسجد رکھتی ہے اور اس میں ثواب نماز پڑھنے کا ہوگا اور اس مسجد کا توڑنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ مسجد کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ جس کے خرچ سے بنے، وہ مسلمان بھی ہو۔ خود کعبہ کو دیکھیے کہ کافروں نے اس کو زمانہ جاہلیت میں بنایا تھا اور حضرت ﷺ نے اس کو قائم رکھا اور اسی کی طرف منہ کر کے برابر نماز پڑھتے رہے اور فتح مکہ کے بعد بھی اس کو نہ توڑا۔ ہاں توڑنے کو ضرور فرمایا تھا، لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ کافروں کا بنوایا ہوا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس قاعدے پر اس کو بننا چاہیے تھا، اس قاعدے پر نہیں بنایا گیا تھا۔[2] غرض کہ مسجد کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا بانی یا جس کے خرچ سے بنے، وہ مسلمان بھی ہو۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ جب تک وہ شخص مومن نہ ہوگا، خود اس کو مسجد کے بنانے اور بنوانے کا کچھ ثواب نہ ہوگا۔

لقوله تعالىٰ: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ﴾ [سورۂ إبراهيم، ركوع: ٣]

[ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں، جس پر

---

1. سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٦) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حديث ابن عمر إسناده ليس بذاك القوي، وقد تكلم في زيد بن جبيرة من قبل حفظه“ نیز دیکھیں: تمام المنة للألباني (ص: ٢٩٩)

2. صحيح البخاري، رقم الحديث [illegible] صحيح مسلم، رقم الحديث [illegible]

آندھی والے دن میں ہوا بہت سخت چلی۔ وہ اس میں سے کسی چیز پر قدرت نہ پائیں گے]

وقوله تعالىٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا﴾ [سورۂ نور، رکوع: ۵] واللّٰہ أعلم بالصواب

[اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان کے اعمال کسی چٹیل میدان میں ایک سراب کی طرح ہیں، جسے پیاسا پانی خیال کرتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا] کتبہ: محمد عبد اللّٰہ (مہر مدرسہ)

مساجد میں محراب بنانا:

سوال مساجد میں محراب کا بنانا کیسا ہے؟ جس مسجد میں محراب بنے ہوئے ہیں، ان کے اندر امام کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں اور محراب مسجد میں داخل ہے یا خارج از مسجد؟ بینوا تؤجروا!

جواب مساجد میں محراب بنانا شرعاً کوئی ثواب کا کام نہیں ہے۔ جن مساجد میں محراب بنے ہوئے ہیں، ان محرابوں میں امام کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا درست ہے، لیکن اگر اس میں اہلِ کتاب کے ساتھ مشابہت ہو یا مقتدیوں پر امام کا حال مشتبہ ہوتا ہو تو ایسی حالت میں کراہت سے خالی نہیں ہے اور محراب اگر مسجد کی حد کے اندر ہے تو اس کے خارج از مسجد ہونے کی کیا صورت ہے اور اگر مسجد کی حد سے باہر ہے تو اس کے خارج ہونے میں کیا شک ہے۔ واللّٰہ أعلم بالصواب

کسی جگہ پر مسجد کے احکام کب جاری ہوتے ہیں؟

سوال دو شخصوں نے مل کر ایک مکان یا زمین بالاشتراک بارادہ بنانے مسجد کے خرید کیا اور دستاویز میں یہ مضمون درج ہوا:

> ''مشتریان سوائے تعمیرِ مسجد یا دکان و مکان جو صرف متعلق مسجد ہوگا، دوسری چیز تعمیر نہ کریں۔ اگر سوائے تعمیرِ مسجد و متعلقات اس کے دوسرے مصرف میں لائیں تو بائع بہر حال مستحق فسخ کرانے بیع کے ہے، مشتریان کو کچھ عذر نہ ہوگا۔''

چنانچہ حسبِ شرطِ بیع دونوں مشتریان نے تعمیرِ مسجد شروع کیا و باجازتِ مشتریان نماز بھی پنجگانہ باذان و جماعت ہونے لگی و منجملہ خریداران کے ایک شخص چند روز کے بعد مر گیا۔ اب شخص خریدار حی القائم مسجد کو تعمیر کر رہا ہے دیوار مسجد باندازہ قد آدم تیار ہوگئی ہے، وہ جگہ ازروے حکم شرع شریف موقوفہ سمجھی جائے گی اور اس پر احکام مسجد کے جاری ہوں گے یا نہیں؟ یا جب تک مسجد بہر صورت تیار نہ ہو جائے اور خریدار تمام مشتہر کر کے باضابطہ وقف نامہ بھی مرتب نہ کرے، وقف نہ سمجھی جائے گی؟ اس کا جواب مدلل دیجیے۔

جواب وہ جگہ جس کا سوال میں ذکر ہے، ازروے شرع شریف موقوفہ سمجھی جائے گی اور اس پر احکام مسجد کے جاری ہوں گے اور اس کے موقوفہ سمجھے جانے اور اس پر احکام مسجد کے جاری ہونے میں اس کا بہر صورت مسجد تیار ہو جانا و خریدار کا تمام مشتہر کر کے باضابطہ وقف نامہ مرتب کرنا شرط نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری (ص: ۵۴۶)

مطبوعہ ہوگلی ۱۲۵۸ھ میں مرقوم ہے:

"ذكر الصدر الشهيد رحمه الله في الواقعة في باب العين من كتاب الهبة والصدقة: رجل له ساحة، لا بناء فيها، أمر قوماً أن يصلوا فيها بجماعة، فهذا علٰى ثلاثة أوجه: أحدها: أما إن أمرهم بالصلاة فيها أبداً نصا بأن قال: صلوا فيها أبدا، أو أمرهم بالصلاة مطلقاً، و نوىٰ الأبد ففي هذين الوجهين، صارت الساحة مسجداً، لو مات لا يورث عنه، وأما إن وقت الأمر باليوم أو الشهر أو السنة، ففي هذا الوجه لا يصير الساحة مسجداً، لو مات يورث عنه، كذا في الذخيرة، وهكذا في فتاوىٰ قاضي خان"[1]

[ایک شخص کا میدان ہے، جس میں کوئی عمارت نہیں ہے، اس نے لوگوں کو کہا کہ وہ اس میں باجماعت نماز ادا کر لیں۔ یہ تین طرح سے ہوگا: پہلا: یا تو وہ لوگوں کو ہمیشہ کے لیے نماز پڑھنے کا کہے، مثلاً: صراحت سے کہے کہ تم اس میں ہمیشہ نماز پڑھا کرو یا انھیں مطلقاً نماز پڑھنے کا کہہ دے اور ہمیشہ کی نیت کرے تو ان دونوں صورتوں میں وہ میدان مسجد بن جائے گا۔ اگر وہ فوت ہوگیا تو وہ جگہ وراثت میں تقسیم نہیں ہوگی۔ لیکن اگر وہ اپنی بات کے ساتھ دن یا مہینے یا سال کی تحدید کرتا ہے تو اس صورت میں وہ میدان مسجد نہیں ہوگا۔ اگر وہ فوت ہوجائے تو وہ جگہ وراثت میں تقسیم ہوگی]

عبارت منقولہ بالا سے ظاہر ہے کہ کسی زمین کے مسجد ہوجانے کے لیے اس پر بنا کا ہونا کچھ ضروری نہیں۔ محض ساری زمین بلا بنا کے مسجد ہو جاتی ہے اور اس پر احکام مسجد کے جاری ہوتے ہیں، جبکہ صاحبِ زمین نے اس میں لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دے دی، یعنی صرف اس قدر کہہ دے کہ اس میں ہمیشہ نماز پڑھا کرو یا ہمیشہ کا لفظ بھی نہ کہے، صرف اس قدر کہے کہ اس میں نماز پڑھا کرو اور ہمیشہ کی نیت رہے، ان دونوں صورتوں میں زمین مذکور مسجد ہوجائے گی اور احکام مسجد کے اس پر جاری ہوں گے۔ واللّٰہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللّٰہ

باہمی رنجش کی وجہ سے نئی مسجد بنانا:

سوال آپس کی رنجش وضد کی وجہ سے کسی مسجد کو چھوڑ کر اور دوسروں سے چھوڑوا کر کسی دوسرے مکان میں نماز پڑھنا اور جماعت و جمعہ وغیرہ قائم کرنا اور اس میں عشرہ محرم میں بڑی تیاری کے ساتھ تعزیہ داری کی مجلس کرنا یا کوئی دوسری مسجد بنا کر (اور سابق مسجد خود چھوڑ کر اور دوسروں سے چھوڑوا کر) جماعت و جمعہ قائم کرنا درست ہے یا نہیں اور کرنے والا و بنانے والا اس کا کیسا ہے؟ صاف صاف خدا و رسول ﷺ کے حکم کے مطابق لکھ بھیجیں، خدا اس کا اجر دے گا۔

جواب کسی مسجد کو خود چھوڑ کر اور دوسروں سے چھوڑوا کر کسی دوسرے مکان میں یا دوسری مسجد بنا کر نماز پڑھنا و جماعت و جمعہ قائم کرنا، اگر اس وجہ سے ہے کہ سابق مسجد میں خدا کی عبادت بطریق مشروع و مسنون ادا کرنے سے روکا

---

[1] فتاویٰ عالمگیری (الفتاویٰ الهندية: ۲/ ٤٥٥) نیز دیکھیں: فتاویٰ قاضی خان (۳/ ۲۹۱)

جاتا ہے تو یہ چھوڑنا اور چھوڑانا اور دوسری مسجد بنانا جائز ہے، لیکن اگر اس وجہ سے ہے کہ یہ سابق مسجد میں خلافِ شرع کام کرنا چاہتا ہے اور اس سے لوگ روکتے ہیں یا دنیاوی رنجش وضد کی وجہ سے دوسری مسجد بناتا ہے تو ان دونوں صورتوں میں اس کا بنانا جائز نہیں ہے۔ ایسی مسجد، مسجد ضرار ہے، کیونکہ بلا وجہ شرعی جماعت مسلمان میں تفریق کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ سورہ توبہ، رکوع (۱۲) میں فرماتا ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ . . .﴾ [التوبة: ۱۰۷]

[اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی نقصان پہنچانے اور کفر کرنے (کے لیے) اور ایمان والوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے (کے لیے) اور ایسے لوگوں کے لیے گھات کی جگہ بنانے کے لیے جنھوں نے اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی]

باقی تعزیہ داری کی مجلس کرنی، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، گھر میں ہو یا مسجد میں، محض ناجائز ہے، اس کا ثبوت نہ قرآن مجید سے ہے اور نہ حدیث شریف سے۔ یہ جاہلوں کی ایجاد ہے۔ اللہ کے بندوں کو قرآن مجید اور حدیث پر عمل کرنا چاہیے، نہ کہ جاہلوں کی ایجاد کی ہوئی باتوں پر جن کا ثبوت شرع شریف سے نہیں ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

كتبه: أبو الفياض محمد عبد القادر، عفي عنه. الجواب صحيح. أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المباركفوري.

اختلاف کی صورت میں الگ مسجد بنانے کا حکم:

سوال ایک پرانی مسجد میں محمدی اور حنفی دونوں فریق مدت دراز سے ایک ساتھ مل کر نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن اب بعض ان میں سے جو حنفی ہیں، باشتعال پیر اپنے کے (کہ محمدی لوگ لا مذہب ہیں اور لا مذہبوں کے پیچھے نماز درست نہیں، ایک نئی مسجد بنانی چاہیے کہ جس میں محمدیوں کی جماعت کم و کمزور ہو جائے اور ہماری حنفی جماعت رفتہ رفتہ ترقی پائے اس ارادے سے) ایک نئی مسجد بنائی ہے اور بانی و متولی اس نئی مسجد کا ایک متمول شخص ہے، جو محمدی جماعت کو توڑنے کے لیے کمزور محمدیوں کو ورغلا رہا ہے اور جن محمدیوں سے اس کی لین دین ہے اور جو لوگ اس کی رعیت ہیں، ان پر اپنی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے تنبیہ اور سختی کر رہا ہے، ان صورتوں میں اس نئی مسجد میں نماز پڑھنی شرعاً جائز ہے یا نہیں اور اس مسجد کا کیا حکم ہے اور اس صفت کے مفرقینِ جماعت اور اس مسجد کے مصلیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سلام مصافحہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب جب ایک مسجد خوش نیتی سے بن چکی ہو، جس میں جماعت قائم ہو اور مسلمانان اس میں خدائے تعالیٰ کی عبادت میں مل جل کر مشغول رہے ہوں، اس کے بعد پھر کوئی دوسری مسجد اس غرض سے بنائی جائے کہ مسلمانوں کو اس سے ضرر پہنچایا

جائے یا اس میں کفر کے کام کیے جائیں یا مسلمانوں کی جماعت متفرق کی جائے، یا جو لوگ اللہ و رسول ﷺ سے لڑ رہے ہوں، ان کے لیے وہ گھات بنے تو اس مسجد میں نماز پڑھنی جائز نہیں ہے اور نہ ایسی مسجد شرعاً مسجد کا حکم رکھتی ہے۔

سورۃ توبہ رکوع (۱۳) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ﴾ [التوبة: ۱۰۷، ۱۰۸] والله أعلم بالصواب

[اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی نقصان پہنچانے اور کفر کرنے (کے لیے) اور ایمان والوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے (کے لیے) اور ایسے لوگوں کے لیے گھات کی جگہ بنانے کے لیے جنھوں نے اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور یقیناً وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے بھلائی کے سوا ارادہ نہیں کیا اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ اس میں کبھی کھڑے نہ ہونا۔ یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوے پر رکھی گئی زیادہ حق دار ہے کہ تو اس میں کھڑا ہو]

كتبه: محمد عبدالله. إنه لحق. أبو العلى محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفا الله عنه.

صح الجواب، والله أعلم بالصواب، كتبه أبو الفياض محمد بن عبد القادر الأعظم گڑھی المؤی.

سوال مسلمان پرہیزگاروں کو فاسق و بدعتیوں سے مواکلت و مشاربت وغیرہ ہر بات میں جدا رہنا شرعاً لازم ہے یا نہیں؟ درصورت اول چونکہ فاسق بدعتیوں کے پیچھے نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہیں، اس غرض سے ان مسلمان پرہیزگاروں کو دوسری مسجد بنا کر نماز جمعہ وغیرہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور یہ مسجد حکم سے مسجد ضرار کے خارج ہے یا نہیں؟

جواب مسلمان پرہیزگاروں کو فاسق و بدعتیوں سے مواکلت و مشاربت و دیگر امور میں جدا رہنا شرعاً لازم ہے، جس صورت میں کہ امور مذکورہ میں شریک ہونے سے ان کے فسق و فجور و بدعات میں شرکت یا رضا مندی لازم آتی ہو۔ فاسق اور بدعتیوں کو امام بنانا ناجائز ہے، لیکن اگر وہ امام بن گئے ہوں تو ان کے پیچھے نماز پڑھ لینا چاہیے، تفریقِ جماعت نہیں کرنا چاہیے اور نہ اس غرض سے دوسری مسجد بنانا چاہیے، ورنہ یہ دوسری مسجد، مسجد ضرار کے حکم میں ہو جائے گی، کیونکہ اس مسجد پر یہ صادق آجائے گا کہ تفریق بین المومنین کی غرض سے بنائی گئی ہے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ﴾ [الأنعام: ٦٨]

[اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ

کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں]

وقال تعالیٰ: ﴿قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ [النساء: ١٤٠]

[اور بلاشبہہ اس نے تم پر کتاب میں نازل فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کو سنو کہ ان کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ بے شک تم بھی اس وقت ان جیسے ہو]

وقال تعالیٰ: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ [المائدۃ: ٢] [اور نیکی اور تقوے پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو] وقال تعالیٰ: ﴿وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ [البقرۃ: ٤٣] [اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو] صحیح بخاری "باب إمامة المفتون والمبتدع" (٣/ ٣٨٨) میں ہے:

"وقال الحسن: صل، وعليه بدعته. قال أبو عبد الله: وقال لنا محمد بن يوسف: حدثنا الأوزاعي قال: حدثنا الزهري عن حميد بن عبد الرحمن عن عبيد الله بن عدي بن الخيار أنه دخل على عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) وهو محصور، فقال: إنك إمام عامة، ونزل بك ما ترىٰ، ويصلي لنا إمام فتنة، ونتحرج؟ فقال: الصلاة أحسن ما يعمل الناس، فإذا أحسن الناس فأحسن معهم، وإذا أساؤا فاجتنب إساءتهم، وقال الزبيدي: قال الزهري: لا نرى أن يصلىٰ خلف المخنث إلا من ضرورة لا بد منها"[1] والله تعالىٰ أعلم

[حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ تم (اس کی اقتدا میں) نماز پڑھو، اس کی بدعت اس کے ذمے ہے۔ ابو عبداللہ نے کہا کہ ہمیں محمد بن یوسف نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اوزاعی نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں زہری نے بیان کیا، وہ حمید بن عبدالرحمٰن سے اور وہ عبیداللہ بن عدی بن خیار سے بیان کرتے ہیں کہ وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس اس وقت گئے، جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے، انھوں نے کہا کہ آپ تو لوگوں کے امام ہیں اور آپ اس صورتِ حال میں گرے ہوئے ہیں، جو آپ کے سامنے ہے، ہمیں امامِ فتنہ نماز پڑھاتا ہے، ہم اس میں حرج محسوس کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ نماز وہ سب سے احسن کام ہے، جس پر لوگ عمل کرتے ہیں، لہٰذا جب لوگ اچھا کام کریں تو تم بھی ان کے ساتھ اچھائی کرو اور جب وہ برا کام کریں تو ان کی برائی سے اجتناب کرو۔ زبیدی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم مخنث کی اقتدا میں نماز ادا کرنا جائز نہیں سمجھتے، الا یہ کہ کوئی ایسی ضرورت ہو جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٣)

کتبہ: محمد عبداللہ (۲۳ربیع الاول ۱۳۳۱ھ الجواب صحیح. ابو یوسف محمد عبد المنان غازی پوری مدرس مدرسہ ریاض العلوم دہلی (۲۳ربیع الاول) أصاب من أجاب. محمد بن عبداللہ مئوی اعظمی مقیم دہلی (۲۳ربیع الاول) ابو القاسم محمد لطف الرحمٰن. من یرد اللہ به خیرا یفقهه في الدین. محمد عبد العزیز بن مولوی عبد السلام مبارک پوری۔

مسجدِ ضرار کا اطلاق کس مسجد پر ہوتا ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین ایسی مسجد کے بارے میں جس میں متولی نام نہادی پسر بانی مسجد کا کبھی قول صریحی اپنی ملکیت کا ہو اور کبھی اس قول کے تعاقب پر قول صریحی سے انکار پر اُس سے افعال اور حرکات ایسے سرزد ہوتے ہیں، جو ملکیت پر اس کی سراسر دال ہیں، نماز پڑھنے کا ثواب مسجد کا ملے گا یا گھر کا؟ من جملہ افعال کے ایک فعل مزاحمت اصلاحِ مسجد ہے اور وہ اصلاح باتفاق تمامی نمازیان مسلمانان کے کی جاتی ہے اور اصلاح یہ ہے کہ ایک دروازہ جانب شمال متصل شارع عام دیوار میں صحن مسجد کے کھول کر قائم کیا جائے اور دیوار اسی جانب اور کچھ مغرب کی ایک حد مناسب تک پست کر دیں، ان دونوں امروں کے ہونے سے من جملہ اور فوائد کے یہ بہت بڑا فائدہ ہوگا کہ نمازِ عشاء کی مسجد میں، جو بوجہ خوفناک ہونے مسجد کے دید اور شنید سے صورت اور آواز مہیب متصل قبر نو احداث کے، متروک ہے، ہوا کرے گی اور یہ خوف تب ہی پیدا ہوا ہے، جب متولی اور وارثان بانی مسجد نے بزور خلاف رائے مسلمانوں کے اپنے باپ کو صحن مسجد میں دفن کیا ہے۔ یہ فعل بھی خالی از دلالت بر ملک نہیں۔ پس اگر بلحاظ اس مزاحمتِ اصلاح اور ملاحظہ دیگر امور شور و فساد کے جو اکثر باقدام متولی و برادران اس کے ہوا کرتا ہے، دوسری مسجد اتفاق سے تمامی نمازیان مسلمانان کے بنائی جائے تو اُس مسجد پر اطلاق مسجد ضرار کا ہوگا یا نہیں؟

جواب مسجد ضرار کا اطلاق اس مسجد پر ہوگا، جو مسلمانوں کو ضرر پہنچانے اور کفر کو قوت دینے اور مسلمانوں میں تفریقِ جماعت کرنے اور اللہ و رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں کی گھات بنانے کے لیے بنائی جائے، نہ کہ اس غرض سے جو سوال میں مذکور ہے، یعنی جو غرض سوال میں مذکور ہے، اس غرض سے جو دوسری مسجد بنائی جائے تو اس مسجد پر مسجدِ ضرار کا اطلاق نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ کُفْرًا وَّ تَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ﴾ [سورہ براءت، رکوع: ۱۳] [اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی نقصان پہنچانے اور کفر کرنے (کے لیے) اور ایمان والوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے (کے لیے) اور ایسے لوگوں کے لیے گھات کی جگہ بنانے کے لیے جنھوں نے اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی]

لیکن مسجد سابق بدستور مسجد رہے گی، اس میں کسی کے دعوے ملکیت یا بے جا مزاحمت سے اس کا مسجد اور وقف ہونا باطل نہیں ہوسکتا۔ ہاں دعوائے ملکیت یا بے جا مزاحمت کرنے والا البتہ بڑا گنہگار ہوگا۔ واللہ أعلم بالصواب

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

قبرستان کے ساتھ خالی جگہ پر مسجد تعمیر کرنا:

سوال عام قبرستانوں میں مسجد بنانے اور نیچے جو نقشہ قبرستان کا ہے، اس خالی جگہ مسجد بنانی حدیث و شرع کی کتابوں میں جائز ہے یا نہیں؟ السائل: میر اسماعیل بخاری۔ چھاؤنی بنگلور، قاضی محلہ (۵/ رجب المرجب ۱۳۱۱ھ)

جواب حدیث شریف میں اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ قبروں کو مسجد بنانا یا قبروں پر مسجد بنانا جائز نہیں ہے۔[1] اسی طرح قبر کی طرف نماز پڑھنا، یعنی نمازی کے آگے قبر ہو اور نمازی اور قبر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، یہ بھی جائز نہیں ہے۔[2] اسی طرح قبرستان میں نماز پڑھنا بھی ناجائز ہے۔[3] نقشہ قبرستان مندرجہ استفتا میں جو خالی جگہ ہے، جس میں قبر نہیں ہے، اس جگہ مسجد بنانے کی ناجوازی حدیث شریف میں ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ جب وہ جگہ قبر سے خالی ہے اور قبروں سے علیحدہ واقع ہوئی ہے تو اس جگہ مسجد بنانے پر نہ یہ صادق آیا کہ قبر کو مسجد بنایا اور نہ یہ صادق آیا کہ قبر پر مسجد بنائی اور نہ اس جگہ مسجد بنا کر اس میں نماز پڑھنے پر یہ صادق آیا کہ قبر کی طرف نماز پڑھی اور نہ یہ صادق آیا کہ قبرستان میں نماز پڑھی، کیونکہ وہ جگہ قبرستان سے علیحدہ واقع ہوئی ہے، بہر کیف اس جگہ مسجد بنانے کی ناجوازی حدیث شریف سے ثابت نہیں ہوتی۔ الفاظ حدیث کے یہ ہیں:

عن عائشة أن رسول اللهﷺ قال: «لعن الله اليهود والنصارىٰ، اتخذوا قبور أنبياءهم مساجد» (متفق عليه)[4]

[عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے، انھوں نے اپنے انبیا علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا]

وعن جندب قال: سمعت النبيﷺ يقول: «ألا وإن من كان قبلكم كانوا يتخذون قبور أنبياءهم وصالحيهم مساجد، ألا فلا تتخذوا القبور مساجد، إني أنهاكم عن ذلك» (رواه مسلم)[5]

[جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "سن لو! تم سے پہلے لوگ اپنے انبیا علیہم السلام اور اپنے صالح افراد کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا کرتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، بے شک میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٢) نیز دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ٣٢٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٤٨)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

"عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: لعن رسول الله ﷺ زائرات القبور، والمتخذين عليها المساجد والسرج" (رواه أبو داود والترمذي والنسائي، مشكوة شريف، باب المساجد و مواضع الصلاة)[1]

[سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں اور ان پر چراغاں کرنے والوں پر لعنت فرمائی]

وعن أبي مرثد الغنوي قال قال رسول الله ﷺ: «لا تجلسوا علىٰ القبور، ولا تصلوا إليها» (مسلم شريف: ١/ ٤١٢)[2]

[ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قبروں پر (مجاور بن کر) بیٹھو نہ ان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو]

«وعن ابن عمر رضي الله عنهما قال: نهىٰ رسول الله ﷺ أن يصلىٰ في سبعة مواطن: في المزبلة، والمجزرة، والمقبرة... الحديث» (مشكوة شريف، باب مذكور، ص: ٧١)[3]

[سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات جگہوں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، ذبح خانہ، قبرستان... پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا]

فتح القدیر (۱/ ۱۷۸) میں ہے:

"يكره أن يكون قبلة المسجد إلى حمام أو مخرج أو قبر، فإن كان بينه وبين هذه حائل حائط لا يكره"[4]

[مسجد کے قبلے کا غسل خانے یا گزرگاہ یا قبر کی طرف ہونا مکروہ ہے، لیکن اگر ان کے درمیان ایک دیوار حائل ہو تو پھر مکروہ نہیں]

شامی (۱/ ۹۴۵) مطبوعہ مصر میں ہے:

"تكره الصلاة عليه (أي علىٰ القبر) لورود النهي عن ذلك"[5] انتهى

[قبر پر نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیوں کہ اس کے متعلق ممانعت مروی ہے]

نیز شامی (۱/۳۹۴) میں ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٥) مشكاة المصابيح (١/ ١٦٣) اس کی سند میں ابو صالح باذام راوی ضعیف ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٢)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٦) اس کی سند میں ''زید بن جبیرہ'' راوی متروک اور سخت ضعیف ہے۔

[4] فتح القدير (١/ ٤١٨)

[5] رد المحتار (٢/ ٢٦٥)

"ولا بأس بالصلاة فيها (أي في المقبرة) إذا كان فيها موضع أعد للصلاة، و ليس فيه قبر، ولا نجاسة"[1] والله أعلم بالصواب.

[قبرستان میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر اس میں نماز کے لیے کوئی ایسی جگہ تیار کی گئی ہو، جس میں قبر اور نجاست نہ ہو]

كتبه: محمد عبد الله قد صح الجواب بلا ارتياب، وأنا عبدالله الباري أبو عثمان علي الفلواري، غفرله ربه وهو حسبه. الجواب صحيح. محمد لطيف حسين عفا الله عنه. الجواب صحيح. محمد ضمير الحق عفي عنه (مہر مدرسہ)

قبرستان کے ایک طرف تعمیر شدہ مسجد میں نماز پڑھنا:

سوال ایک قبرستان کے احاطہ کے اندر ایک مسجد ہے اور اس مسجد کے بائیں جانب بہت سی قبریں ہیں اور اس کے مشرق کے جانب بھی بہت قبریں ہیں۔ فقط اس کے دائیں جانب اور قبلے کی جانب قبریں نہیں ہیں، سو اس مسجد میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں اور آنحضرت ﷺ سے گورستان کے احاطہ کے اندر نماز پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟

جواب مسجد مندرجہ سوال میں جو احاطہ قبرستان کے اندر ہے، لیکن نفسِ قبرستان سے علیحدہ جانب جنوب و شمال میں واقع ہے، نماز پڑھنی درست ہے، اس لیے کہ قبر اور قبرستان میں نماز پڑھنے کے بارے میں صرف دو ہی صورتیں ناجوازی کی حدیث شریف سے ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ قبر کی طرف نماز پڑھیں، یعنی اس طرح نماز پڑھیں کہ قبر نمازی کے آگے ہو اور نمازی اور قبر کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ نفسِ قبرستان میں نماز پڑھیں۔ انھیں دو صورتوں میں نماز پڑھنی ناجائز ہے، ان کے سوا اور کسی صورت میں حدیث شریف سے اس بارے میں نماز پڑھنی ناجائز ثابت نہیں ہے۔

مسجد مندرجہ استفتا میں ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت پائی نہیں جاتی ہے، کیونکہ اس مسجد میں نماز پڑھنے پر نہ یہ صادق آتا ہے کہ قبر کی طرف یا قبر پر نماز پڑھی گئی اور نہ یہ صادق آتا ہے کہ عین قبرستان میں نماز پڑھی گئی، کیونکہ سوال سے ظاہر ہے کہ وہ مسجد نفسِ قبرستان سے علیحدہ واقع ہے۔ الفاظ حدیث شریف کے یہ ہیں:

عن أبي مرثد الغنوي رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «لا تجلسوا علىٰ القبور ولا تصلوا إليها» (مسلم شريف: ۱/ ۴۱۲)[2]

[ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قبروں پر بیٹھو نہ ان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو]

"وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: نهى رسول الله ﷺ أن يصلىٰ في سبعة مواطن: في المزبلة

---

[1] رد المحتار (۱/ ۴۱۰)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۷۲)

والمجزرة والمقبرة..." الحديث. (مشكوة شريف، باب المساجد و مواضع الصلاة)[1]

[ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات جگہوں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، ذبح خانہ اور قبرستان... میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا]

یہ بھی واضح رہے کہ کسی امر کے شرعاً ثابت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا کرنا بھی آنحضرت ﷺ سے ثابت ہوجائے۔ آنحضرت ﷺ کی حدیث کچھ فعل ہی میں منحصر نہیں ہے۔ آپ کا قول، فعل، تقریر؛ یہ سب حدیث میں داخل ہیں۔ پس اگر آنحضرت ﷺ سے قبرستان میں نماز پڑھنا فعلاً ثابت نہ ہو اور قولاً ثابت ہو تو اس قدر شرعاً اس کا جواز ثابت ہونے کے لیے کافی ہے، جیسے آنحضرت ﷺ سے ہندوستان میں کہیں نماز پڑھنا ثابت نہیں ہے اور قولاً ثابت ہے تو اس قدر ہندوستان میں نماز پڑھنے کا جواز ثابت ہوجانے کے لیے کافی ہے، لیکن آنحضرت ﷺ سے قبرستان میں نماز، فعلاً ثابت ہے نہ قولاً، بلکہ قولاً ممانعت ثابت ہے۔ كما تقدم.

پرانی قبروں کی جگہ پر مسجد تعمیر کرنا:

سوال ایک کچی مسجد کو توڑ کر پختہ مسجد بنانے کا ارادہ کر کے نیو کھودوانا شروع کیا۔ مسجد کے پچھم جانب نیو سے دو ہاتھ اور بڑھ کر اور تر جانب چھ ہاتھ مسجد سابق سے بڑھ کر نیو کھودوانا شروع کیا۔ ایک گز نیچے کے اندر ہڈی آدمی کی نکلی۔ یہ نہیں کوئی کہہ سکتا کہ یہ ہڈی مسلمان کی ہے یا مشرک کی یا ہندو کی اور یہ بھی پوری شہادت کوئی بزرگان نہیں دے سکتے کہ ہم نے سنا ہے، کسی بزرگوں کی زبانی کہ یہاں قبرستان ہے۔ لیکن وہاں کے دیکھنے سے غالباً معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان کسی زمانے کا ہے، ہندو یا مسلمان یا مشرک وغیرہ کسی کا ہو۔ اگر اس نیو میں ہڈی نکل گئی تو اُس سے ہٹ کر یا سابق مسجد کی نیو پر مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ہم نے مسجد کو توڑ دیا اور اُس زمین پر مسجد بنانا جائز نہ ہو تو ہم پر از روئے خدا و رسول کے حکم کے کیا ہے؟ صاف جواب ہماری سمجھ کے مطابق تحریر فرمائیے گا۔

سائل: صاحب علی خان وعباس خان۔ از موضع بارہ، ضلع غازیپور، ڈاکخانہ گہمر

جواب سوال سے معلوم ہوا کہ اس جگہ کے دیکھنے سے غالباً معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ کسی زمانے کا قبرستان ہے۔ مجھ کو جہاں تک معلوم ہے، وہ یہی ہے کہ اہلِ ہند کے قبرستان نہیں ہوا کرتے۔ وہ لوگ اپنے مُردوں کو جلا کر دریا میں بہا دیا کرتے ہیں، پس اگر یہ امر صحیح ہے تو ایسی حالت میں غالب یہی ہے کہ وہ جگہ کسی زمانے میں مسلمانوں کا قبرستان رہی ہے اور قبر پر مسجد بنانا جائز نہیں ہے۔

پس اگر سابق مسجد کی زمین میں قبر ہونے کا ثبوت نہ ہو تو سابق مسجد کی نیو پر مسجد بنانا جائز ہے، بلکہ ضرور ہے، کیونکہ جو زمین ایک دفعہ مسجد ہوچکی، وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہوگئی، پھر اُس کا احترام اور اس کی صفائی ہمیشہ کے لیے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٦) اس کی سند میں "زید بن جبیرہ" راوی متروک اور سخت ضعیف ہے۔

واجب اور اس کی بے حرمتی اور اس کو نجاسات سے آلودہ کرنا حرام ہوگیا۔ ہاں اگر سابق مسجد کی زمین کے اندر بھی قبر کے ہونے کا ثبوت ہوجائے تو اس صورت میں وہ جگہ چھوڑ دی جائے اور دوسری جگہ مسجد بنائی جائے اور اس صورت میں سابق مسجد بھی جو بحالت لاعلمی اُس زمین پر بنائی گئی تھی، درحقیقت مسجد نہ تھی اور نہ اس کی زمین جس پر وہ بنائی گئی تھی، مسجد کی طرح قابلِ احترام ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

تا امکان خوب تحقیقات کر لی جائے۔ اگر تحقیقات سے معلوم ہوجائے کہ وہاں پر کسی مسلمان کی قبر ہے تو وہاں پر مسجد نہ بنائی جائے، ورنہ ہڈیاں وہاں سے ہٹا کر مسجد بنائی جائے۔ اصل اس مسئلے میں یہ ہے کہ قبر پر مسجد بنانا جائز نہیں ہے، ہاں اگر قبر کو اوکھیڑ کر اس کی ہڈیاں وہاں سے ہٹا دی جائیں تو وہاں پر مسجد بنانا جائز ہے، کیونکہ اب وہ قبر نہیں رہی، لیکن مسلمان کی قبر کے ساتھ ایسا کرنا اس کی توہین ہے اور مسلمان کی توہین جائز نہیں ہے، اسی لیے اوپر لکھا گیا کہ اگر وہاں پر مسلمان کی قبر ہو تو مسجد نہ بنائی جائے، ورنہ ہڈیاں ہٹا کر بنائی جائے۔ مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی بھی اسی طرح بنی ہے کہ پہلے وہاں پر مشرکین کی قبریں تھیں، ان کو کھود کر اور ہڈیاں وہاں سے ہٹا کر وہ مسجد مقدس بنائی گئی۔

صحیح بخاری میں ہے:

"باب هل ينبش قبور مشركي الجاهلية ويتخذ مكانها مساجد لقول النبيﷺ: «لعن الله اليهود اتخذوا قبور أنبياء هم مساجد» اھ"

[کیا مشرکینِ جاہلیت کی قبروں کو اکھاڑا جائے اور ان کی جگہ مسجد بنا لی جائے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: یہود پر اللہ کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا]

فتح الباری (۱/ ۲۶۰) میں ہے:

"وجه التعليل أن الوعيد علىٰ ذلك يتناول من اتخذ أمكنة قبورهم مساجد بأن تنبش وترمىٰ عظامهم فهذا يختص بالأنبياء ويلتحق بهم أتباعهم، وأما الكفرة فإنه لا حرج في نبش قبورهم، إذ لا حرج في إهانتهم" اھ واللہ تعالیٰ أعلم

[یہ وعید بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ وعید اس کے حق میں ہے، جو نبیوں کی قبروں کو اکھاڑ کر اور ان کی ہڈیوں کو نکال کر انھیں سجدہ گاہیں بنا لے۔ یہ انبیا کے ساتھ خاص ہے اور ان کے پیروکاروں کا بھی یہی حکم ہے، لیکن کفار کی قبروں کو اکھاڑنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، کیوں کہ ان کی اہانت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے]

کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۲/ شوال ۱۳۳۱ھ)

قبریں گرا کر جگہ کو مسجد میں شامل کرنا:

سوال ① ما قولكم أيها العلماء الكرام. رحمكم الله تعالىٰ. في مسجد، ضاق علىٰ أهل محلة، وفي جانب شرق القبور في

المسجد كي يوسع المسجد، هل هو جائز أم لا؟

② و مسجد المدينة المنورة هل بني على قبور المشركين أم لا؟

③ وأين قبر إسماعيل عليه السلام هل هو تحت الميزاب متصل الحطيم أم لا؟ وهل يصلي الناس علىٰ قبره؟

④ وهل يجوز نبش القبور لغرض شرعي أم لا؟ بينوا بالدليل تؤجروا بالأجر الجزيل.

[سوال ①: اے علمائے کرام! ایسی مسجد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، جو محلے والوں کے لیے تنگ ہوگئی ہے اور مسجد کی مشرقی جانب اس کے صحن سے متصل ہی چار پرانی قبریں ہیں، پس مسجد کے ہمسائے چاہتے ہیں کہ قبروں کو مسجد میں داخل کر دیں، تا کہ مسجد وسیع ہو جائے؟ کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

سوال ②: کیا مدینہ منورہ کی مسجد (مسجد نبوی) مشرکوں کی قبروں پر بنائی گئی تھی یا نہیں؟

سوال ③: اسماعیل علیہ السلام کی قبر کہاں ہیں؟ کیا وہ حطیم سے متصل پرنالے کے نیچے ہے یا نہیں؟ کیا لوگ ان کی قبر پر نماز پڑھتے ہیں؟

سوال ④: کیا کسی دینی ضرورت کے پیشِ نظر قبروں کو اکھاڑنا جائز ہے یا نہیں؟ دلیل کے ساتھ بیان کریں اور اللہ تعالیٰ سے اجر جزیل کے حق دار بنیں]

جواب ① هو جائز، إن كانت القبور المذكورة قبور المشركين، لكن بعد نبش تلك القبور ورمي عظامهم منها، وغير جائز إن كانت القبور المذكورة قبور المسلمين، ففي صحيح البخاري: باب هل ينبش قبور مشركي الجاهلية ويتخذ مكانها مساجد؟ لقول النبي ﷺ: «لعن الله اليهود اتخذوا قبور أنبياءهم مساجد»[1] وفي فتح الباري: وجه التعليل إن الوعيد علىٰ ذلك يتناول من اتخذ قبور أنبياءهم مساجد بأن تنبش وترمىٰ عظامهم، فهذا يختص بالأنبياء، يلتحق بهم أتباعهم، وأما الكفرة فإنه لا حرج في نبش قبورهم إذ لا حرج في إهانتهم. انتهى[2] والله تعالىٰ أعلم

② نعم مسجد المدينة المنورة قد بني على قبور المشركين، لكن بعد نبشها ورمي عظامهم منها، ففي صحيح البخاري مع فتح الباري: قال أنس: فكان فيه (أي في الحائط الذي بني في مكانه المسجد) ما أقول لكم، قبور المشركين، وفيه خرب، وفيه نخل، فأمر النبي ﷺ بقبور المشركين فنبشت، ثم بالخرب فسويت، وبالنخل فقطع، فصفوا النخل قبلة المسجد، وجعلوا عضادتيه

---

[1] صحيح البخاري (١/ ١٦٥)

[2] فتح الباري (١/ ٥٢٤)

الحجارة. في الحديث جواز الصلاة في مقابر المشركين بعد نبشها، وإخراج ما فيها، وجاز بناء المسجد في أماكنها.[1] والله تعالىٰ أعلم

③ قد روي أن قبر إسماعيل علیہ السلام وقبر أمه هاجر كليهما في الحجر، بل روي أن ما بين المقام إلى الركن إلى بئر زمزم إلى الحجر قبر سبعة وسبعين نبيا، بل روي أنه قد مات بمكة نوح وهود وصالح وشعيب، وقبورهم بين زمزم والحجر، ذكر ذلك كله العلامة السيوطي في الدر المنثور،[2] لكن لم يصح شيء من ذلك.[3] والله تعالىٰ أعلم

④ نعم، يجوز ذلك، إذا كانت قبور المشركين، كما فصل في جواب السؤال الأول. والله تعالىٰ أعلم

[① اگر مذکورہ بالا قبریں مشرکوں کی ہیں تو ان قبروں کو اکھاڑنے اور ان سے مشرکوں کی ہڈیاں نکالنے کے بعد وہاں مسجد بنانا جائز ہے، لیکن اگر وہ مسلمانوں کی قبریں ہیں تو پھر یہ عمل ناجائز ہے۔ چناں چہ صحیح بخاری میں باب ہے کہ کیا مشرکینِ جاہلیت کی قبور کو اکھاڑنا اور ان کی جگہ مسجد بنانا درست ہے؟ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ یہود ونصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ فتح الباری میں ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وعید ان کو شامل ہے جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا کہ ان کو اکھاڑ کر اور ان کی ہڈیوں کو نکال کر انھیں پھینک دیا۔ یہ انبیا کے ساتھ خاص ہے اور ان کے پیرو کاروں کی قبروں کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن کفار کی قبروں کو اکھاڑنے میں کوئی گناہ نہیں، کیوں کہ ان کی اہانت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

② ہاں، مسجد نبوی مشرکین کی قبور پر بنائی گئی تھی، لیکن ان کو اکھاڑ کر وہاں سے ان کی ہڈیاں نکال دی گئی تھیں۔ چناں چہ صحیح بخاری میں ہے کہ انس رضی اللہ عنہ نے کہا: پس اس میں (جس باغ والی جگہ پر مسجد بنائی گئی تھی) وہ کچھ تھا، جو میں تمھیں بتانے لگا ہوں: مشرکین کی قبریں، کھنڈر اور کھجوروں کے درخت۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی قبروں کے متعلق حکم دیا تو انھیں اکھیڑ دیا گیا، کھنڈر برابر کر دیے گئے، کھجوریں کاٹ دی گئیں اور ان کے تنوں کو قبلہ رخ قطار سے رکھ دیا گیا اور دروازے کے دونوں کنارے پتھروں سے چنے گئے۔ اس حدیث سے مشرکین کی قبریں اُکھاڑنے اور ان کی ہڈیاں نکالنے کے بعد وہاں نماز پڑھنا اور اس مقام پر مسجد بنانا جائز معلوم ہوتا ہے۔

③ مروی ہے کہ اسماعیل اور ان کی والدہ ہاجرہ دونوں کی قبر حطیم میں ہے، بلکہ یہ بھی مروی ہے کہ مقامِ

[1] فتح الباري (١/ ٥٢٦)

[2] الدر المنثور (١/ ٣١٩) هذا قول عبد الله بن ضمرة السلولي وهو من التابعين.

[3] انظر: ضعيف الجامع برقم الحديث (١٩٩٥)

ابراہیم، حجرِ اسود، چاہِ زمزم اور حطیم کے درمیان ستتر (۷۷) نبیوں کی قبریں ہیں۔ مزید برآں مروی ہے کہ مکے میں نوح، ہود، صالح اور شعیب فوت ہوئے اور ان کی قبریں زمزم اور حطیم کے درمیان ہیں۔ یہ تمام روایات سیوطی نے درمنثور میں ذکر کی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔

④ ہاں، جائز ہے، اگر وہ مشرکین کی قبریں ہیں، جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے سوال کے جواب میں گزر چکی ہے]

(کتبہ: ۱۲/ شوال ۱۳۳۱ھ)

عہد و پیمان توڑ کر نئی مسجد میں جمعہ کا آغاز کرنا:

سوال ایک بلدہ میں ایک قدیم جامع مسجد ہے۔ جمیع مسلمین اس مسجد قدیم میں پنج گانہ نماز اور جمعہ ہمیشہ سے پڑھتے چلے آتے ہیں، بالاتفاق و مجمع علیہ۔ ایک شخص نے ایک مسجد جدید تیار کی اور اس نے اقرار صحیح و وعدہ واثق بھی کیا کہ اس مسجد جدید میں پنج گانہ نماز کے سوا جمعہ نہ پڑھا جائے۔ اقرار اور وعدہ لینے کی وجہ یہ ہوئی کہ مسجد جامع قدیم میں ہمیشہ جمعہ پڑھا جاتا ہے، اس میں ایسا نہ ہو کہ خلل اتفاق مجمع علیہ کا ہو، اُسی قرار بموجب نئی مسجد میں چھ (۶) سال تک لوگ پنج گانہ نماز فقط پڑھتے رہے۔ اب چند روز سے خلافِ اقرار صحیح و خلاف وعدہ واثق کے جمعہ پڑھنا شروع کیا ہے، تو دریں صورت بلدہ میں بہت سے مسلمان اس امر سے ناخوش ہیں کہ ایسا اقرار و وعدہ توڑ دیا، سو اس میں فتنہ عظیم و فساد برملا ہو رہا ہے۔ اس میں دو ٹکڑیاں ہوگئی ہیں، ایک ٹکڑی چھوٹی، ایک ٹکڑی بڑی کہ "اتبعوا السواد الأعظم" کا خلاف ہے۔ بینوا توجروا.

جواب درصورت صدقِ صورت مسؤلہ جبکہ بانی مسجد نے تمام مسلمین کے روبرو اس امر کا معاہدہ کیا کہ مسجد جدید میں بلاحکم اہلِ شہر و بدون اجازت سب صاحبوں کے جمعہ قائم نہ کیا جائے گا اور اہلِ شہر مسجد جدید میں جمعہ قائم کرنے پر راضی نہیں ہیں تو بانی مسجد پر لازم ہے کہ مسجد جدید میں جمعہ کی نماز قائم نہ کرے، بلکہ اس کو اُٹھا دے۔ تعمیلِ معاہدہ و ایفائے وعدہ واجب ہے، چنانچہ اس کی سخت تاکید قرآن مجید و حدیث شریف میں وارد ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (سورۂ مائدہ رکوع: ۱) [اے لوگو جو ایمان لائے ہو! عہد پورے کرو] ﴿وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (سورۂ بني إسرائيل، رکوع: ٤) [اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کا سوال ہوگا] حدیث شریف میں آیا ہے:

عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہﷺ: «أربع من كن فيه كان منافقا خالصاً، ومن كانت فيه خصلة منهن، كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها: إذا اؤتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر» (متفق عليه)[1]

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص میں چار خصلتیں ہوں، وہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨)

خالص (پکا) منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے، حتی کہ وہ اسے ترک کر دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو عہد شکنی کرے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے]

وعن عبد الله بن عامر قال: دعتني أمي يوما، ورسول اللهﷺ قاعد في بيتنا، فقالت: ها تعال أعطيك، فقال لها رسول اللهﷺ: «ما أردت أن تعطيه؟» قالت: أردت أن أعطيه تمرا، فقال لها رسول اللهﷺ: «أما إنك لو لم تعطيه شيئاً، كتبت عليك كذبة»

(رواه أبو داود، و البيهقي في شعب الإيمان، كذا في المشكوة، في باب الوعد)[1]

[عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، ایک روز میری والدہ نے مجھے بلایا، جب کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے، میری والدہ نے فرمایا: سنو! آؤ میں تمھیں کچھ دوں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں فرمایا: تم نے اسے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟ انھوں نے عرض کی: میں نے اسے ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سن لو! اگر تم اسے کوئی چیز نہ دیتیں تو تمھارے ذمے ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا]

اگر بانی مسجد اس معاہدے کی تعمیل نہ کرے تو ضرور عاصی ہوگا اور جو لوگ اس کام میں اس کا ساتھ دیں گے، وہ بھی مبتلائے عصیان ہوں گے۔

فقط.. كتبه: أبو الفياض محمد عبد القادر الأعظم گڑھی المؤی، وارد حال مدرسه أحمديه آره. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الرحمن المباركفوري الأعظم گڑھي. صح الجواب بلا ارتياب، والله أعلم بالصواب. حرره راجي رحمة الله: أبو الهدىٰ سلامت الله المباركفوري، عفا عنه الباري

مسجد کو ایک گروہ کے لیے خاص کرنا:

سوال ایک مقلد نے مسجد بنائی اور مسجد کی پیشانی پر ایک پتھر نصب کیا اور اس پر مسجد حنفیاں لکھا تھا، تاکہ اس کے طریقے کے لوگوں کا استحقاق ثابت ہو اور اہلِ حدیث کا استحقاق باطل ہو۔ آیا موافق فقہ حنفی ایسا پتھر لگانا جائز و درست ہے یا نہیں؟

جواب موافق فقہ حنفی ایسا پتھر (جس سے مسجد کو کسی خاص گروہ کے لیے مخصوص کر دینا مقصود ہے) لگانا جائز و درست نہیں ہے۔ جب کوئی جگہ مسجد ہو جاتی ہے تو وہ جگہ بانی کی ملک سے نکل کر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتی ہے اور اس میں عامہ مسلمین کو جو خدا تعالیٰ کے بندے ہیں، نماز خوانی و دیگر عبادات کا، جو مساجد میں ادا کی جا سکتی ہیں، یکساں و برابر حق حاصل ہو جاتا ہے اور کسی شخص کو (بانی ہو یا غیر بانی) اس بات کا کچھ بھی حق باقی نہیں رہتا کہ اُس حق حاصلہ میں کسی طرح کا مانع اور مزاحم ہو یا اس مسجد کو کسی خاص شخص یا گروہ کے لیے مخصوص اور دوسرے کو اس سے محروم کرے،

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٩١) شعب الإيمان (٤/٢٠٦) مشكاة المصابيح (٣/٧٤) السلسلة الصحيحة (٧٤٨)

حتی کہ اگر کوئی شخص مسجد بنا کر صاف طور سے بھی کہہ دے کہ میں نے یہ مسجد صرف فلاں محلّہ والوں کے لیے بنائی ہے، نہ کہ دوسروں کے لیے اور اس میں وہی لوگ نماز پڑھیں نہ کہ دوسرے لوگ، تو یہ شرط اُس کی باطل ہے اور باوجود اس شرط کے بھی دوسرے لوگ اُس مسجد میں ویسا ہی نماز پڑھنے کا حق رکھتے ہیں، جیسا کہ اُس محلّہ والے۔ اس میں دونوں یکساں و برابر ہیں اور سبب وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوا کہ جب کوئی جگہ مسجد بن جائے تو اُس میں عامہ مسلمین کو نماز خوانی و دیگر عبادات مذکورہ بالا کا یکساں و برابر حق حاصل ہوجاتا ہے اور اس میں کسی منع اور مزاحمت کا حق باقی نہیں رہتا۔

ہدایہ مع کفایہ (۲/ ۹۰۷) چھاپہ کلکتہ میں ہے: ''لأن المسجد لا یکون لأحد فیه حق المنع'' اھ [کیوں کہ مسجد سے روکنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے] کفایہ شرح ہدایہ (۲/ ۹۰۷) چھاپہ کلکتہ میں ہے: ''لأن للعامة حق إقامة الصلاة في المسجد'' [کیوں کہ عام لوگوں کو مسجد میں نماز قائم کرنے کا حق حاصل ہے] فتاویٰ عالمگیری (۲/ ۲۴۸) مطبوعہ مطبع طبی بندر ہوگلی میں ہے:

''في وقف الخصاف: لو بنی مسجداً لأهل محلة، وقال: جعلت هذا المسجد لأهل هذه المحلة خاصة، کان لغیر أهل تلك المحلة أن یصلي فیه، کذا في الذخیرة''

[أحکام الوقف للخصاف میں ہے کہ اگر ایک محلے والوں کے لیے مسجد بنائے اور کہے: میں نے یہ مسجد صرف اس محلے والوں کے لیے بنائی ہے تو دوسرے محلے والے بھی اس میں نماز پڑھنے کا حق رکھتے ہیں]

کتبہ: محمد عبد اللّٰہ

مسجد کے متنازع صحن کا حکم:

سوال ایک مسجد قدیم کہنہ بوسیدہ قناطی موقوعہ محلّہ بلوا گھاٹ من محلات چنار گڑھ تھی، اندر حدودِ ارض مسجد مذکور پورب جانب ایک حجرہ خام بنوا کر شیخ اکبر عرف حاجی بنیس نے بود و باش اختیار کر کے ہر طرح سے آباد کیا اور اشخاص اہلِ اسلام سنت و جماعت نمازِ پنج گانہ ادا کرنے لگے۔ بعد کئی سال بوجہ بارش وطغیانی دریا حجرہ وغیرہ و دیوار احاطہ مسجد گر گیا، چونکہ حاجی موصوف آدمی صد سالہ عابد پابند صوم و صلاۃ بہمہ صفت متقی پرہیزگار تھے، کمر ہمت بستہ کارِ خیرِ دارین سمجھ کر از سرِ نو چھت و حجرہ و چہار دیواری وغیرہ برجائے قدیم اندر حدودِ ارض مسجد مسلمانوں سے چندہ تحصیل کر کے پختہ عرصہ چار برس کا تیار کرایا۔

چار برس تک کوئی شخص مزاحم نہ ہوا، چونکہ مسجد کی جانب دکھن کسی قدر زمین ایک شخص سنت جماعت کی ہے، جو بہت بڑے متدین اور سادات سے ہیں اور اپنی حکومت کے زمانے میں بہت ہی ذہانت سے کام کرتے رہے، یہاں تک کہ سود کی ڈگری بھی کرنا روا نہیں رکھتے تھے، انھوں نے اپنی بیٹی کا عقد ایک شخص خلافِ مذہب، جس کا بیان کافی کتاب الروضہ کے صفحہ (۱۶) میں مرقوم ہے، کر دیا، اس کی تاثیرِ صحبت سے اس قدر اثر ہوا کہ لوگوں کی

اراضیات بھی، یعنی کھیت بھوگ بندھک لکھا ہے۔

ما ورا اس کے ان کے داماد صاحب نے بوجہ تعصب و نکالنے بغض قلبی سینوں سے کیا، شگوفہ کہ زمین حجرہ وصحن مسجد ہمارے خسر کی ہے، لوگوں سے کہنے لگا کہ حاجی پر جوٹ سالانہ اسٹامپ لکھ دے اور سال بسال ادا کیا کرے، ورنہ زمین صحن و زمین حجرہ گروا کر لے لوں گا، حتی کہ حاجی سے نوبت گفت وشنود کی آئی۔ حاجی نے کہا کہ خدا خانہ ہے، میرا گھر نہیں ہے، دوسرے نہ تمھاری زمین و نہ خسر کی تمھاری زمین کہتے کیا ہو۔ بالفرض اگر زمین آپ کی تھی تو وقت بننے کے دو روپیہ چندہ اور پتھر وغیرہ سے مدد دیا تو گویا ان کی رضا مندی سے حجرہ اور چہار دیواری وغیرہ بنوائی گئی، پھر اب دعویٰ آپ کا لغو ہے، اس بات پر ان کے خسر صاحب جو اپنے کو سنت جماعت کہتے ہیں، اپنے داماد کی تائید و حمایت کر کے صحن مسجد و حجرہ گرا کر زمین لینے کا دعویٰ عدالت دیوانی میں کر دیا ہے، باوجود اس کے کہ ان کی بیٹی کا انتقال بھی عرصہ پانچ چھ برس کا ہوا ہوگیا، مگر وہ اس کو اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں اور ہر ایک امر میں اس کا کہنا مقدم اور نیک جانتے ہیں۔ ایسی حالت میں شہر کے مسلمانوں کو چندہ دینا و مدد کرنا حجرہ وصحن بچانے کے واسطے واجب ہے یا نہیں اور وہ شخص شرع شریف کے بموجب ظالم ٹھہرے گا یا نہیں اور نکاح ان کی لڑکی مومنہ صالحہ کا ساتھ فاسق و قاسط کے موافق فتاویٰ مذہبِ اہل سنت و جماعت کے شرعاً درست ہوا یا نہیں؟

جواب جب صحن متنازع فیہ اندر حدود اراضی مسجد واقع ہے تو وہ بھی شمولِ مسجد داخل وقف ہے، جس میں کسی شخص کو ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے اور جملہ مسلمانان کا حق اس میں یکساں اور برابر ہے۔ حجرہ بھی جب مسلمانوں کے چندہ و رضا مندی سے اندر حدود اراضی مسجد کے تعمیر ہوا ہے تو حجرے میں بھی ان تمام مسلمانوں کا حق ثابت ہے تو اب بلا رضا مندی جو شخص صحن مسجد مذکور کی نسبت ملکیت کا دعویٰ کرے یا حجرہ مذکورہ کو بلا رضا مندی ان تمام مسلمانوں کے گرائے یا گرانے کی کوشش کرے، وہ شخص شرع شریف کی رو سے بے شبہہ ظالم ہے، اس شخص کے مقابلے میں صحن و حجرہ کے بچانے کے واسطے مسلمانوں کو چندہ دینا اور مدد کرنا واجب ہے۔

فتاویٰ عالمگیری (۲/ ۵۵۰ چھاپہ ہوگلی) میں لکھا ہے:

”رجل أعطیٰ درهما في عمارة المسجد أو نفقة المسجد أو لمصالح المسجد صح، لأنه وإن كان لا يمكن تصحيحه تمليكا بالهبة للمسجد فإثبات الملك للمسجد علیٰ هذا الوجه صحيح، فيتم بالقبض، كذا في الواقعات الحسامية“ اھ

[ایک شخص نے مسجد کی تعمیر یا مسجد کے اخراجات یا مسجد کی ضرورت اور فائدے کے لیے ایک درہم دیا تو وہ درست ہے، کیوں کہ اگرچہ مسجد کو ہبہ کر کے اس کی ملکیت قرار دینا درست نہیں، لیکن اس طریقے سے مسجد کی ملکیت ثابت کرنا درست ہے، چناں چہ وہ قبضے میں لے کر پوری ہو جاتی ہے]

نیز صفحہ (۵۵۰) میں لکھا ہے:

"الفناء تبع المسجد فيكون حكمه حكم المسجد، كذا في محيط السرخسي" اھ
والله أعلم بالصواب.
[صحن مسجد کے تابع ہے، چناں چہ اس کا حکم بھی مسجد ہی کا حکم ہے]
كتبه: محمد عبد الله. صح الجواب، والله أعلم بالصواب. كتبه: أبو الفياض محمد عبدالقادر الأعظم گڑھي المؤي. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الرحمن المباركفوري.

مسجد کی تولیت کا حق دار:

سوال ایک بستی میں مسجد اندازاً پچاس برس سے بنی ہوئی تھی اور سیٹل منٹ، یعنی پیمایش سرکاری میں متولی مسجد کوئی لکھا ہوا نہیں ہے۔ بہر حال ایک شخص اندازہ تیرہ بیگہہ زمین لاخراج زبانی وقف کر گیا تھا، یعنی اپنے وارثوں کو کہہ گیا تھا کہ تم لوگ فصل آباد کر کے نصف حق آبادی زراعت لے لینا اور نصف فقیر اور مسکین کو تقسیم کر دینا، اس کو عرصہ پینتیس برس کا ہوا۔ سیٹل منٹ کے وقت جس کو عرصہ بائیس برس ہوا، اس زمین کو کاشت کار نے مسجد کا نام بتا دیا، وہی لکھ گیا، ایک شخص جو اس مسجد کا تعمیر کرنے والا بھی نہیں، مگر اب مالدار ہے اور بزور مسجد کا متولی بنا ہوا ہے اور فی الحال وہی امام مسجد ہے، جھوٹ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ زمین واقف ہمارے دادا کو ہبہ کر گیا ہے۔ مسجد کے مصارف کے واسطے اب امام مسجد بس ہم کو ہونا چاہیے اور حال اس زمین کا یہ ہے کہ وقف ہی کے وقت سے چونکہ واقف کے وارث سوائے اس کے ایک نابالغ لڑکے کے اور ایک زوجہ کے کوئی نہ تھا اور وہ لڑکا بھی بعد چند روز کے انتقال کر گیا، کل مال کی وارث زوجہ لڑکے کی ماں ہوئی، اسی کی اجازت سے زمین آباد ہوتی رہی۔ نصف واقف کی زوجہ لیتی اور نصف پیداوار فقیر مسکین کو تقسیم ہو جاتا۔ غرض کہ اس زمین پر دخل قبضہ واقف کی زوجہ کو رہا، اس صورت میں ازروئے شرع اس زمین کا متولی امام مسجد ہے یا واقف کی زوجہ کہ جیسے پہلے سے آج تک زمین آباد کر کے نصف لیتی تھی اور نصف فقرا اور مساکین میں تقسیم کر دیتی تھی اور کبھی کہیں کی مسجد کی خبر آئی، اس میں بھی دے دیا کرتی تھی، یہی عورت متولی رہی، غرض کہ ان دو میں سے کون متولی ہوسکتا ہے؟

جواب ہر گاہ امام مسجد کا دعویٰ جھوٹ ہے تو جس طرح عورت متولی چلی آتی ہے، اُسی طرح اب بھی متولی رہے گی۔
والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

زبردستی مسجد کی تولیت اور امامت پر قابض ہونے والے کا حکم:

سوال اگر کوئی مسجد چندے سے تعمیر ہوئی ہو اور برابر چندے سے حوائج مصارفِ مسجد چلتے ہوں اور اب کوئی شخص بزور اس مسجد کا متولی ہو جائے تو وہ شخص کیسا ہے اور قابلِ امامت ہے یا نہیں اور جماعت کے لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں انکار کریں تو وہ خارج امامت ہوسکتا ہے یا نہیں اور بزور متولی ہو جانے سے وہ مسجد حکمِ مسجد سے خارج ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب وہ شخص بزور متولی بن جانے میں ناحق پر ہے اور خود اس شخص کو بلا رضا مندی جماعت کے لوگوں کا امام بننا جائز نہیں ہے، لیکن اگر جماعت کے لوگ اُس کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے تو ان کی نماز ہوجائے گی اور وہ مسجد ہو خواہ دوسری مسجد، کسی شخص کے کسی ناحق فعل کرنے کے سبب سے حکمِ مسجد سے خارج نہیں ہوسکتی، بلکہ خود وہ شخص اپنے اس فعل ناحق کرنے کے سبب سے گنہگار ہوگا۔ واللہ أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

قدیم مسجد کے فرش پر غسل خانہ اور جوتے اتارنے کی جگہ بنانا:

سوال اس قصبے میں ایک مسجد چھوٹی سی تھی۔ عرصہ پچیس سال کا ہوتا ہے کہ مصلیوں کی کثرت کی وجہ سے مسجد بڑھانی پڑی اور پچھم کی طرف مسجد بڑھا دی گئی۔ مسجد مذکور کے سابق فرش کو دیگر ضروری کاموں کے لیے تجویز کیا گیا اور اس پر غسل خانہ اور وضو کرنے کی اور جوتا نکالنے کی جگہ بنا دی گئی۔ اب بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قدیم فرش جس پر غسل خانہ اور وضو کرنے کی جگہ ہے، وہ مسجد ہے اور اس پر یہ سب کام کرنا ناجائز ہے۔ لہٰذا سوال ہے کہ فرش قدیم پر یہ سب کام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب مدلل ہونا چاہیے۔

نوٹ: جگہ بہت تنگ ہے، وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ قدیم فرش کو اگر داخل فرش جدید کر دیا گیا تو وضو وغیرہ کے لیے کوئی اور جگہ ہو۔

جواب بعض لوگوں کا جو یہ خیال ہے کہ ''قدیم فرش جس پر غسل خانہ اور وضو کرنے کی جگہ ہے، وہ مسجد ہے اور اس پر یہ سب کام کرنا ناجائز ہے'' بالکل صحیح خیال ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ جو جگہ مسجد ہوگئی، وہ ہمیشہ کے لیے مسجد اور واجب الاحترام ہوگئی اور اس کی مسجدیت کو باطل اور اس کو بے حرمت کرنے کا کسی کو کسی وقت بھی اختیار نہیں رہا۔ ورنہ یہ جائز ہوگا کہ آج جو مسجد ہے، کل اس کو کوئی استنجا خانہ یا پائخانہ بنائے اور یہ بھی جائز ہوگا کہ حائض اور جنب اس میں داخل ہوں اور یہ بھی جائز ہوگا کہ جس مسجد سے جس نمازی کو جب چاہے نماز خوانی سے روک دے اور یہ فعل ظلم قرار نہ پائے، حالانکہ یہ سارے امور ناجائز ہیں۔ مسجد واجب الاحترام ہے اور فعل مذکور (نمازی کو مسجد میں نماز خوانی سے روک دینا) نصاً سخت ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ [البقرة: ١١٤]

[اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت ہے: ''أمر رسول الله ﷺ ببناء المسجد في الدور، وأن تنظف و تطيب''[1] (رواه أحمد و أبو داود والترمذي وصحح إرساله) [رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں مسجدیں بنانے، انھیں صاف ستھرا رکھنے اور خوشبودار بنانے کا حکم دیا ہے] نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً

[1] مسند أحمد (٦/ ٢٧٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٥٨) نیز دیکھیں: الثمر المستطاب للألباني (ص: ٤٤٧)

مروی ہے: «البصاق في المسجد خطيئة، وكفارتها دفنها» (متفق عليه)[1] [مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کر دینا ہے] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «عرضت عليَّ أجورُ أمتي حتى القذاة يخرجها الرجل من المسجد» (رواه أبو داود والترمذي واستغربه، و صححه ابن خزيمة)[2] [میرے اوپر میری امت کے اجر وثواب پیش کیے گئے، حتی کہ وہ تنکا بھی جو آدمی مسجد سے نکال دیتا ہے] واللّٰه تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبداللہ (۹/ شعبان ۱۳۳۵ھ)

مسجد کے اخراجات کے لیے اس کی جگہ میں دکانیں تعمیر کرنا:

سوال ایک مسجد پختہ اب سڑک شہر میں واقع ہے۔ بالکل غیر آباد اور بوسیدہ حالت میں ہوگئی ہے، اس کے چراغ بتی اور نیز مرمت وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس کے بقا اور استحکام کا خیال کرتے ہوئے اگر لب سڑک دکان تعمیر کر دی جائیں اور اوپر مسجد کا حصہ کر دیا جائے، تاکہ دکان کی آمدنی سے مسجد کے اخراجات مرمت، صفائی، چراغ بتی اور پانی وغیرہ کے لیے ایک مستقل صورت پیدا ہوجائے۔ اس کی چھت وغیرہ بالکل مسمار ہوگئی ہے، باہر کی دیوار کھڑی ہے، اندر تمام گھاس جم گئی ہے، بالکل خراب وخستہ حالت میں ہے۔ اگر شرعاً اجازت ہو تو نیچے کا حصہ دکان میں شامل کر دیا جائے اور اوپر کا حصہ مسجد میں کر دیا جائے، یعنی اوپر مسجد اور اس کے نیچے دکان تعمیر کرا دی جائے تو ایسی صورت میں شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

فقط شیخ محمد شبلی، شیخ علی حسن، شیخ محمد حمید اللہ، شیخ محمد جنید، عبد المجید، شیخ محمد امانت اللہ۔ ساکنان محلہ آصف گنج شہر اعظم، بقلم عبد المجید (مورخہ ۱۱/ اگست ۳۴ء)

جواب صورت مسئولہ میں مسجد مذکور کی زمین پر یا اس کے کسی حصے پر دکان تعمیر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ جب کوئی زمین ایک بار مسجد قرار پا چکی تو اب وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہوگئی، اس کا مسجد ہونا کبھی باطل نہیں ہوسکتا اور اس جگہ کا ادب و احترام ہمیشہ کے لیے واجب ہے، نہ اُس میں جنب اور حائض ونفساء کا داخل ہونا جائز ہے اور نہ اس زمین پر یا اس کے کسی حصے پر دُکان تعمیر کرنا جائز ہے۔ اگرچہ یہ دکان اس غرض سے تعمیر کرائی جائے کہ اس کی آمدنی سے اس دکان کے اوپر مسجد بنائی جائے اور اس مسجد کے اخراجات مرمت، صفائی، چراغ بتی اور پانی وغیرہ کے لیے مستقل صورت پیدا ہوجائے، فقہائے حنفیہ کے نزدیک بھی یہی اصح ہے اور یہی مفتی بہ ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"وإذا خرب المسجد واستغنیٰ أهله و صار بحيث لا يصلیٰ فيه، عاد ملكا لواقفه أو لورثته حتى جاز لهم أن يبيعوه أو يبنوه دارا، وقيل: هو مسجد أبداً، وهو الأصح،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٥٢) یہ حدیث سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٦) اس کی سند میں انقطاع ہے، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے، البتہ صحیح مسلم (٥٥٣) میں ایک حدیث بایں الفاظ مروی ہے: «عرضت علي أعمال أمتي حسنها وسيئها، فوجدت في محاسن أعمالها الأذى يماط عن الطريق، ووجدت في مساوئ أعمالها النخاعة في المسجد لا تدفن»

كذا في خزانة المفتين"①

[جب مسجد ویران ہوجائے اور وہاں رہنے والے اس سے بے نیاز ہوجائیں کہ وہاں نماز بھی نہیں پڑھی جاتی تو وہ اس کو وقف کرنے والے یا اس کے ورثا کی دوبارہ ملکیت بن جائے گی، حتی کہ ان کے لیے اسے بیچنا یا اسے گھر بنانا جائز ہوگا، لیکن ایک قول کے مطابق وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہی رہے گی اور یہی زیادہ صحیح ہے، جیسا کہ "خزانة المفتين" میں ہے]

درمختار میں ہے:

"(ولو خرب ما حوله، واستغنىٰ عنه، يبقى مسجدا عند الإمام والثاني) أبدا إلىٰ قيام الساعة (وبه يفتىٰ) حاوى القدسي" انتهى②

[اگر اس (مسجد) کے اردگرد ویران ہوجائے اور اس سے مستغنی ہو جائیں تو وہ امام اور دوم کے نزدیک ہمیشہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی اور اسی پر فتویٰ ہے]

"رد المحتار" (٣/ ٥١٣) میں ہے:

"(قوله: ولو خرب ما حوله) أي ولو مع بقائه عامرا، وكذا لو خرب، وليس له ما يعمر به، وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد آخر، (قوله: عند الإمام والثاني) فلا يعود ميراثا، ولا يجوز نقله، ونقل ماله إلى مسجد آخر، سواء كانوا يصلون فيه أو لا، وهو الفتوى حاوى القدسي، وأكثر المشائخ عليه، مجتبى، وهو الأوجه" فتح اها بحر" والله تعالىٰ أعلم

[اس کے قول "اگر اس کے اردگرد کا علاقہ ویران ہوجائے" کا مطلب ہے کہ اگرچہ وہ (مسجد) اس ویرانی کے باوجود آباد رہے۔ اسی طرح اگر وہ ویران ہوجائے اور مسجد کو آباد کرنے کی کوئی صورت بھی نہ ہو اور کسی دوسری مسجد کے بننے کی وجہ سے لوگ اس سے بے پروا ہوجائیں۔ اس کا قول "امام اور دوم کے نزدیک" چناں چہ وہ دوبارہ میراث بنے گی نہ اس کو نقل کرنا ہی جائز ہے اور نہ اس کے مال کو کسی دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا درست ہے، خواہ وہ اس میں نماز پڑھیں یا نہیں اور یہی فتویٰ ہے۔ اسی پر اکثر مشائخ ہیں۔ اور یہی زیادہ قوی ہے]

أملاه: محمد عبد الرحمن، عفا الله تعالىٰ عنه.

ایک مسجد کی اشیا کو فروخت کر کے دوسری مسجد پر خرچ کرنا:

سوال ہمارے یہاں کی مسجد سفالہ پوش ہے، ارادہ ہے کہ اس کے کل سامان کو فروخت کر کے مسجد کو پختہ پلاسٹر کر دیا جائے یا دوسری مسجد پر اس کا سامان دے دیا جائے کہ وہ مسجد تیار ہوجائے۔ دونوں صورتوں میں کون سی جائز ہے اور

① فتاویٰ عالمگیری (٢/ ٤٥٨)

② الدر المختار (٣٥٨/٣)

اس سے زیادہ اَنسب صورت جو ہو، تحریر فرمایا جائے۔

جواب صورت مسئولہ میں مسجد مذکور کے سامان کا فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے اور عند الحنفیہ بقول مفتی بہ اس سامان کو دوسری مسجد پر دینا بھی جائز نہیں ہے، پس صورت مسئولہ میں مسجد مذکور کے سامان کو اسی مسجد پر بغیر فروخت کے صَرف کرنا چاہیے اور اگر بروقت مسجد مذکور پر اس سامان کے صَرف کرنے کی ضرورت نہ ہو تو اس کو محفوظ رکھنا چاہیے اور جب کبھی ضرورت پیش آئے تو اس وقت اس پر صَرف کرنا چاہیے۔ اگر اس سامان کے ضائع وتلف ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بقول بعض فقہائے حنفیہ اس سامان کا دوسری مسجد پر دے دینا جائز ہے اور ان بعض فقہائے حنفیہ کے اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے، جس میں اضاعتِ مال کی ممانعت آئی ہے۔[1] هذا ما عندي، والله تعالىٰ أعلم، وعلمه أتم. أملاہ: محمد عبدالرحمن، عفا الله تعالىٰ عنه

اذان کے مسائل

اذان میں کلمہ تکبیر کیسے ادا کریں؟

سوال اذان میں لفظ "الله أكبر الله أكبر" دونوں کو ایک ساتھ ہی کہنا چاہیے یا ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کہنا چاہیے؟

جواب اس بارے میں کوئی تصریح کسی حدیث میں میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ ہاں "عون المعبود علىٰ سنن أبي داود" (۱/ ۱۸۹) میں ہے:

"الله أكبر الله أكبر. كلمة واحدة، ولهذا شرع جمع كل تكبيرتين في الأذان بنفس واحد كما ذكره النووي" انتهىٰ

[اللہ اکبر اللہ اکبر ایک ہی کلمہ ہے، اس لیے اذان میں دونوں تکبیروں کو ایک ہی سانس میں جمع کرنا مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے]

امام نووی رحمہ اللہ کی عبارت شرح صحیح مسلم (۱/۱۶۴) میں یہ ہے:

"فإن قيل: قد قلتم: إن المختار الذي عليه الجمهور أن الإقامة إحدى عشرة كلمة، منها الله أكبر الله أكبر أولا وآخرا، وهذا تثنية؟ فالجواب أن هذا وإن كان صورة تثنية، فهو بالنسبة إلى الأذان إفراد، ولهذا قال أصحابنا: يستحب للمؤذن أن يقول كل تكبيرتين بنفس واحد، يقول في أول الأذان: الله أكبر الله أكبر بنفس واحد، ثم يقول: الله أكبر الله أكبر بنفس آخر"[2] اهـ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٣)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٤/ ٧٩)

[پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ تمھارا کہنا تو یہ ہے کہ جمہور کا مختار مذہب یہ ہے کہ اقامت کے گیارہ کلمات ہیں اور ان میں "الله أكبر الله أكبر" اقامت کے شروع میں بھی ہے اور اس کے آخر میں بھی ہے اور یہ تو تثنیہ (جوڑا) ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ کلمات بظاہر تثنیہ ہیں، لیکن اذان کی نسبت یہ مفرد ہی ہیں۔ اس لیے ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ موذن کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ دونوں تکبیریں ایک سانس کے ساتھ کہے، چناں چہ وہ اذان کے شروع میں "الله أكبر الله أكبر" ایک سانس سے کہے اور پھر "الله أكبر الله أكبر" دوسرے سانس کے ساتھ کہے]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری (۲/ ۲۳۶) میں لکھتے ہیں:

"وقد استشكل عدم استثناء التكبير في الإقامة، وأجاب بعض الشافعية بأن التثنية في تكبير الإقامة بالنسبة إلى الأذان إفراد. قال النووي: ولهذا يستحب أن يقول المؤذن كل تكبيرتين بنفس واحد. قلت: وهذا إنما يتأتٰى في أول الأذان، لا في التكبير الذي في آخره، وعلىٰ ما قال النووي ينبغي للمؤذن أن يفرد كل تكبيرة من اللتين في آخره بنفس"[1] اھ واللّٰه تعالىٰ أعلم

[اقامت میں تکبیر کے عدمِ استثنا پر اشکال وارد ہوا تو بعض شوافع نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اقامت میں تکبیر کا تثنیہ اذان کی نسبتِ افراد ہی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا کہ اسی لیے مستحب یہ ہے کہ موذن دونوں تکبیروں کو ایک سانس کے ساتھ کہے۔ میں (ابن حجر رحمہ اللہ) کہتا ہوں کہ یہ عمل اذان کے شروع والی تکبیر میں ہوگا نہ کہ اس تکبیر میں جو اذان کے آخر میں ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق موذن کے لیے لائق یہ ہے کہ وہ اذان کے آخر والی دو تکبیروں میں سے ہر تکبیر کو ایک سانس کے ساتھ الگ الگ کہے]

کتبہ: محمد عبداللّٰه (۱۵/ ذی القعدۃ ۱۳۳۰ھ)

اذان میں انگوٹھے چومنے کا حکم:

سوال [اذان میں انگوٹھے چومنا] درست ہے یا نہیں؟ بعض علما اس کو مستحب کہتے ہیں اور باعثِ اجر وثواب جانتے ہیں، چنانچہ علماے حرمین شریفین اسی طرح اس وقت فتویٰ دیتے ہیں۔

جواب اذان میں انگوٹھے چومنا نہ کسی آیت سے ثابت ہے اور نہ کسی صحیح حدیث سے۔ ومن ادعٰی فعليه البيان.

[جو اس کا دعویٰ کرتا ہے، اس کے ذمے دلیل بیان کرنا ہے]

اذان کی جگہ اور جمعہ کے دن موذنوں کی تعداد:

سوال ① اذان پنج گانہ مسجد میں کس جگہ ہونی چاہیے؟

[1] فتح الباري (۲/ ۸۳)

② اذان ثانی جو بروز جمعہ وقت بیٹھنے خطیب کے منبر پر پکاری جاتی ہے، یہ اذان کس جگہ ہونی چاہیے؟ آیا مسجد کے اندر خطیب و منبر کے قریب، جیسا کہ رائج ہے یا مسجد کے باہر اونچی جگہ پر؟

③ جمعہ کی دونوں اذانوں کے لیے کتنے موذن ہوں؟ اس لیے کہ ہدایہ وغیرہا میں "مؤذنون" بصیغہ جمع آیا ہے؟

جواب ① و ② اذان پنج گانہ و ہر دو اذانِ جمعہ سنت موکدہ ہیں، بلکہ بعضوں نے اس پر اطلاق واجب کا کیا ہے۔ یہ اذانیں بلند جگہ، یعنی مسجد کے چھت یا منارہ پر ہونا چاہیے، چنانچہ "شرعة الإسلام" میں ہے: "ومن سنته أن يؤذن في أرفع مكان، فإنه أمد لصوته"

یعنی اذان میں سنت یہ ہے کہ اونچی جگہ پر اذان پکارے، اس لیے کہ اس سے اس کی آواز دور تک جاتی ہے۔ درمختار (۱/ ۳۵۵) میں لکھا ہے:

"هو لغة: الإعلام، وشرعا: إعلام مخصوص، لم يقل بدخول الوقت، ليعم الفائتة، وبين يدي الخطيب علىٰ وجه مخصوص بألفاظ كذلك أي مخصوصة" انتهى

[اذان کا لغوی معنی اطلاع دینا ہے اور اس کا شرعی معنی مخصوص (کلماتِ اذان کے ساتھ) اطلاع دینا ہے۔ اس کو دخولِ وقت کے ساتھ خاص نہیں کیا، تا کہ یہ فوت شدہ نماز کی اذان اور خطیب کے منبر پر بیٹھنے کے بعد اس کے سامنے کھڑے ہو کر مخصوص طریقے اور الفاظ کے ساتھ کہی جانے والی اذان کو بھی شامل ہو جائے]

طحطاوی اور شامی میں ہے: "(قوله: ليعم الفائتة الخ) أي ليعم الأذان أذان الفائتة والأذان بين يدي الخطيب"[1] انتهى. یعنی اذان شامل ہے اذانِ فائتہ [فوت شدہ نماز] کو اور اس اذان کو جو خطیب کے صعودِ منبر کے بعد کہی جاتی ہے۔ پھر درمختار میں لکھا ہے: "وهو سنة للرجال في مكان عال"[2] اھ [یہ (اذان) مردوں کا کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر کہنا سنت ہے] شامی میں ہے: "(قوله: في مكان عال) في القنية: ويسن الأذان في موضع عال، والإقامة علىٰ الأرض"[3] انتهى. اور اسی (۱/ ۳۶۰) میں دوسری جگہ لکھا ہے:

"ولم تكن في زمنه ﷺ مئذنة. بحر. قلت: وفي شرح الشيخ إسماعيل عن الأوائل للسيوطي أن أول من رقي منارة مصر للأذان شرحبيل بن عامر المرادي، وبنىٰ مسلمة المنائر للأذان بأمر معاوية، ولم تكن قبل ذلك، وقال ابن سعد بالسند إلى أم زيد بن ثابت: كان بيتي أطول بيت حول المسجد، فكان بلال يؤذن فوقه من أول ما أذن إلى أن بنى رسول الله ﷺ مسجده، فكان يؤذن بعد على ظهر المسجد، وقد رفع له شيء فوق ظهره" اهـ

---

[1] حاشية رد المحتار (۱/ ۴۱۳)

[2] الدر المختار (۱/ ۳۸۴)

[3] رد المحتار (۱/ ۳۸۴)

یعنی اونچی جگہ پر اذان کہنا سنت ہے اور زمین پر اقامت کہنا اور جس روز سے اذان مسنون ہوئی، حضرت بلال رضی اللہ عنہ ام زید بن ثابت کے مکان کے اوپر اذان پکارتے رہے، یہاں تک کہ مسجد نبوی قائم ہوگئی تو مسجد کی چھت پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان پکارتے تھے اور اس کے لیے مسجد کی چھت پر اونچی جگہ بنا دی گئی۔

طحطاوی میں ہے:

"قال عبد اللّٰه: فمضيت بعد الانتباه إلى رسول اللّٰه ﷺ فأخبرته بذلك فقال: رؤيا حق، ألقه علىٰ بلال، فإنه أندىٰ منك صوتاً، فألقيتها عليه، فقام علىٰ أعلى سطح في المدينة فجعل يؤذن"[1] انتهى

یعنی جس روز حکم اذان کا نازل ہوا، اسی روز حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ کی بڑی اونچی چھت پر کھڑے ہوکر اذان دینا شروع کیا۔

نیز اسی میں ہے:

"(قوله: في مكان عال) كالمنارة، و أول من أحدثها مسلمة بن مخلد الصحابي، كما في سيرة الحلبي، وكان أميراً علىٰ مصر من طرف معاوية اهـ أبو السعود" انتهى

[بلند جگہ سے مراد منارہ وغیرہ ہے۔ سیرت حلبی میں ہے کہ سب سے پہلے مسلمہ بن مخلد صحابی نے اذان کے لیے منارہ بنایا۔ موصوف معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مصر کے امیر تھے]

درمختار (۱/ ۳۵۷) میں ہے: "مؤكدة هي كالواجب في لحوق الاثم للفرائض الخمس" انتهى

یعنی اذان سنت موکدہ ہے، یہ سنت مثل واجب کے ہے لحوق اثم میں واسطے فرائض پنج گانہ کے اور اسی میں جمعہ بھی داخل ہے۔ چنانچہ طحطاوی میں ہے: "دخلت الجمعة. حلبي" شامی میں ہے: "دخلت الجمعة. بحر"[2] یعنی جس طرح اذان پنج گانہ کے لیے سنت موکدہ ہے یا واجب، اسی طرح نمازِ جمعہ کے لیے ہے اور جیسے ان کی اذان اونچی جگہ اور مسجد کی چھت پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ پکارتے تھے، ویسے ہی جمعہ کی اذان ثانی مسجد کی چھت پر مرفوع مخصوص جگہ پکارتے تھے، اسی لیے صحیح بخاری و مسلم و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ میں "مئذنة" مخصوص واسطے اذان ثانی کے مروی نہیں ہے اور نہ "يؤذن علىٰ الأرض داخل المسجد" مروی ہے، البتہ ابو داود میں "علىٰ باب المسجد" مروی ہے،[3] "علىٰ" یا تو استعلاء حقیقی کے لیے یہاں پر ہے: "أي علىٰ سطح باب المسجد" یا واسطے استعلاء مجازی کے ہے، نہ ظرفیت کے اور مراد پیش دروازہ مسجد ہے، جیسے کہ محاورہ اُردو میں بولتے ہیں: فلاں کے دروازے پر جماؤ ہے۔ ابو داود کی روایت میں "بين يدي رسول اللّٰه ﷺ" ہے اور بخاری و ترمذی و ابن ماجہ و نسائی و شافعی کی روایت میں یہ نہیں ہے۔

---

① نیز دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٠٦)

② رد المحتار (٣/ ١٨٤)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٨٨) اس کی سند ضعیف ہے، کیوں کہ اس کی سند میں محمد بن اسحاق راوی مدلس ہے۔

حالانکہ ان جملہ محدثین نے سائب بن یزید سے اس حدیث کو روایت کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں، یعنی "بين يدي رسول اللهﷺ" اور "على باب المسجد" ان کے نزدیک پایہ ثبوت و درجہ صحت کو نہیں پہنچا، بدیں وجہ ترک کیا اور ان دونوں میں توافق اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جس وقت مقامِ بیان خطبہ و باب مسجد میں محاذات ہو اور بابِ مسجد کی زمین پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان پکارتے ہوں، حالانکہ فقہاے حنفیہ مقامِ بلند پر اذان پکارنے اور زمین پر اقامت کہنے کو سنت فرماتے ہیں، اس سے نکلتا ہے کہ زمین پر اذان پکارنا خلافِ سنت ہے اور بدعت ہے۔

امام ابو عبداللہ بن حاج کے قول سے بھی ثبوت بدعت ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب مدخل میں کہا ہے:

"السنة في أذان الجمعة إذا صعد الإمام علىٰ المنبر أن يكون المؤذن علىٰ المنارة، كذلك كان علىٰ عهد النبيﷺ وأبي بكر و عمر و صدرا من خلافة عثمان، وكان المؤذنون ثلاثة، يؤذنون واحدا بعد واحد، ثم زاد عثمان أذانا آخر بالزوراء، وهو موضع بالسوق، وأبقىٰ الأذان الذي كان علىٰ عهد النبيﷺ علىٰ المنار، والخطيب علىٰ المنبر إذ ذاك، ثم إنه لما تولى هشام بن عبد الملك أخذ الأذان الذي فعله عثمان بالزوراء، وجعله علىٰ المنار، وكان المؤذن واحدا، يؤذن عند الزوال، ثم نقل الأذان الذي كان علىٰ المنار عند صعود الإمام علىٰ المنبر بين يديه، وكانوا يؤذنون ثلاثة، فجعلهم يؤذنون جماعة، ويستريحون، فقد بان أن فعل ذلك في المسجد بين يدي الخطيب بدعة، وأن أذانهم جماعة بدعة أخرى، فتمسك بعض الناس بهاتين البدعتين، وهما مما أحدثه هشام بن عبد الملك"[1] اهـ

یعنی جمعہ کی اذان میں جس وقت امام منبر پر چڑھے، سنت یہ ہے کہ اذان منارہ پر ہو۔ اسی طرح زمانہ نبی ﷺ اور زمانہ خلافتِ شیخین و ابتداے خلافتِ عثمان میں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ منارے سے مراد وہ جگہ مرتفع ہے جو مسجد نبوی کی چھت پر واسطے اذان بلال رضی اللہ عنہ کے تیار کر دی گئی تھی، اس لیے کہ زمانہ رسالت و خلافتِ خلفا میں منارہ نہ بنا تھا اور تین موذن تھے کہ ایک کے بعد دوسرا اذان کہتا تھا اور اس کے بعد تیسرا اذان پکارتا تھا۔ میں گمان کرتا ہوں کہ شاید خلافتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تین موذن ہوں، کیونکہ زمانہ رسالت میں ایک موذن تھا۔ ابن ماجہ میں ہے:

"ما كان لرسول اللهﷺ إلا مؤذن واحد، إذا خرج أذن، وإذا نزل أقام، و أبوبكر و عمر رضي الله عنهما كذلك ... الخ"[2]

[رسول اللہ ﷺ کا تو ایک ہی موذن تھا، جب آپ ﷺ (خطبہ دینے کے لیے گھر سے) باہر تشریف لاتے (اور منبر پر تشریف رکھتے) تو وہ اذان کہتا اور جب (خطبے سے فارغ ہو کر منبر سے) نیچے اترتے

[1] المدخل لابن الحاج المالكي (٢/ ٢٠٨)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٣٥)

تو وہ اقامت کہہ دیتا۔ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا معمول بھی یہی تھا]

نسائی میں ہے:

”كان بلال يؤذن إذا جلس رسول الله ﷺ علىٰ المنبر يوم الجمعة فإذا نزل أقام ثم كان كذلك في زمن أبي بكر و عمر رضی اللہ عنہما“[1] الخ

[رسول اللہ ﷺ جب جمعے کے دن منبر پر تشریف فرما ہوتے تو بلال رضی اللہ عنہ اذان کہتے اور جب آپ ﷺ (خطبے سے فارغ ہو کر منبر سے) اترتے تو وہ اقامت کہہ دیتے۔ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی یہی معمول رہا]

زمانہ شیخین میں بھی یہی تھا کہ وقتِ جلوس امام علی المنبر ایک موذن اذان پکارتا تھا۔ لفظ ”كذلك“ اس پر دال ہے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دوسری اذان زوراء پر بڑھائی۔ زوراء ایک جگہ کا نام ہے بازارِ مدینہ میں اور بعض نے کہا ہے کہ زَوراء ایک گھر کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ایک مکانِ مرتفع کا نام ہے مثل منارہ کے تھا اور بعض نے کہا کہ زَوراء ایک بڑے پتھر کا نام ہے، جو مسجد کے دروازے پر تھا، شاید ابو داود کی حدیث میں ”علىٰ باب المسجد“ سے یہی مراد ہو، واللہ أعلم.

باقی رہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اذان کو جو زمانہ نبی ﷺ میں منارہ پر ہوتی تھی اور خطیب منبر پر ہوتا تھا، پھر جب ہشام بن عبدالملک والی ہوا تو اس نے اس اذان جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دروازے پر مقرر فرمایا تھا، منارے پر مقرر کیا اور اس کے لیے ایک موذن تھا جو زوال کے وقت اذان کہتا تھا (شیخ دہلوی رحمہ اللہ مدارج النبوہ میں فرماتے ہیں کہ بعض محققین نے کہا ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے اس اذان کو مسجد میں نقل کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پہلے مسجد کے اندر کوئی اذان نہ ہوتی تھی، ہشام نے اس کو نکالا ہے) اور جو اذان منارے پر ہوتی تھی وقت چڑھنے خطیب کے منبر پر اور اس کے لیے تین موذن تھے، اس نے اس اذان کو مسجد کے اندر نقل کیا کہ امام کے سامنے ہو اور بجائے تین موذن کے ایک جماعت کو مقرر کیا کہ ٹھہر ٹھہر کر اذان پکاریں، پس تحقیق ظاہر ہو گیا کہ ہشام کا یہ فعل مسجد میں خطیب کے سامنے ایک بدعت ہے اور ایک جماعت کا اذان دینا دوسری بدعت ہے، پس بعض آدمیوں نے ان دونوں بدعتوں کے ساتھ تمسک پکڑا ہے اور یہ دونوں بدعتیں ہشام بن عبدالملک کی نکالی ہوئی ہیں۔ انتہی

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”من السنة الماضية أن يؤذن المؤذن علىٰ المنار، فإن تعذر فعلىٰ سطح المسجد، فإن تعذر فعلىٰ بابه“[2] اهـ

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٩٤)

[2] المدخل لابن الحاج المالكي (٢/ ٢٤١)

یعنی اگلی سنت یہ ہے کہ موذن منارے پر اذان کہے۔ اگر یہ دشوار ہو تو مسجد کی چھت پر، اگر یہ دشوار ہو تو مسجد کے دروازے پر۔

جملہ اخیرہ مطابق حدیث ابو داود کے ہے۔ الحاصل مسجد کے اندر خطیب کے سامنے اذان پکارنا بدعتِ ہشامی ہے، اس کو ترک کر کے مردہ سنت کو زندہ کرنا چاہیے، تاکہ ثواب احیاے سنت پائیں اور قولہ تعالیٰ: ﴿لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ پر عمل کر کے لوگوں کی ملامت کا ڈر نہ رکھیں، فقط واللہ أعلم۔ جواب نمبر ③ کا جواب نمبر ② میں آ چکا ہے حدیث ابن ماجہ ونسائی میں۔ واللہ أعلم. کتبہ: محمد علی اطہر، غفر اللہ ولوالدیه.

جواب نمبر ① و ② اذان پنج گانہ اونچی جگہ پر ہونی چاہیے، اسی طرح اذان ثانی جو بروز جمعہ خطیب کے منبر پر بیٹھنے کے وقت دی جاتی ہے، بلند جگہ ہونی چاہیے، نہ خطیب ومنبر کے قریب، جیسا کہ عبارت شرعۃ الاسلام و درمختار و طحطاوی و شامی و مدخل ابن امیر الحاج منقولہ مجیب علام میں مصرح ہے۔ صحیح بخاری (٦/ ٢٥٦) میں ہے:

”عن عائشة أن بلالا يؤذن بليل، فقال رسول اللهﷺ: «كلوا واشربوا حتى يؤذن ابن أم مكتوم، فإنه لا يؤذن حتى يطلع الفجر» قال القاسم: ولم يكن بين أذانهما إلا أن يرقىٰ ذا، وينزل ذا“[1]

[عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ (طلوعِ فجر سے پہلے) رات کو اذان دیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تک ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان نہ دیں تم (سحری) کھاتے پیتے رہو۔ وہ (ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ) طلوعِ فجر کے بعد ہی اذان کہتے تھے۔ (راویِ حدیث) قاسم رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ دونوں کی اذان میں اتنا ہی وقفہ ہوتا تھا کہ ایک (اذان دینے کے لیے بلند جگہ پر) چڑھتا تھا اور دوسرا (وہاں سے اذان دے کر) نیچے اترتا تھا]

فتح الباری (٢/ ٨٦) مصری میں ہے:

”وفي هذا تقييد لما أطلق في الروايات الأخرى من قوله: «إن بلالا يؤذن بليل» ولا يقال إنه مرسل، لأن القاسم تابعي، فلم يدرك القصة المذكورة لأنه ثبت عند النسائي من رواية حفص بن غياث، و عند الطحاوي من رواية يحيىٰ بن القطان، كلاهما عن عبد الله بن عمر، عن القاسم عن عائشة فذكر الحديث، قالت: لم يكن بينهما إلا أن ينزل ذا ويصعد ذا، وعلى هذا فمعنىٰ قوله في رواية البخاري: قال القاسم، أي في روايته عن عائشة رضی اللہ عنہا...، وثبتت الزيادة أيضا في حديث أنيسة الذي تقدمت الإشارة إليه“

[دوسری روایات میں آپ ﷺ کا یہ قول مطلق بیان ہوا ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان کہتے ہیں، جب کہ اس روایت میں اس اطلاق کی تقیید ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ روایت مرسل ہے، کیوں کہ اس کے راوی قاسم تابعی ہیں اور وہ اس قصے کے عینی شاہد نہیں ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سنن النسائی میں

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٨١٩)

حفص بن غیاث سے اور طحاوی میں یحییٰ بن قطان کے واسطے سے ثابت ہے۔ یہ دونوں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے، وہ قاسم سے اور قاسم رحمہ اللہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے یہ روایت بیان کی، جس کے الفاظ یہ ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ان (دو موذنوں) کے درمیان اتنا ہی وقفہ ہوتا کہ ایک اذان کہہ کر بلند جگہ سے نیچے اترتا اور دوسرا اس پر چڑھ جاتا۔ اس بنیاد پر صحیح بخاری کی روایت میں ان کے قول کا معنی یہ ہوگا کہ قاسم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنی روایت میں کہا نیز یہ زیادتی انیسہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں بھی ثابت ہے، جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے]

اور بھی فتح الباری (۳/ ۳۴۶) میں ہے:

"روایة عروة عن امرأة من بني النجار قالت: کان بلال یجلس علیٰ بیتي، وھو أعلیٰ بیت في المدینة"

[عروہ بنو نجار کی ایک عورت سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا: بلال رضی اللہ عنہ (اذان کے انتظار میں) میرے گھر کی چھت پر تشریف فرما ہوتے تھے اور وہ گھر مدینے کے گھروں میں سے سب سے اونچا گھر تھا]

اذان اول جو اذان ثانی مذکورہ بالا کے قبل رائج ہے، یہ اذان عہدِ نبوت علی صاحبہا الصلوات التسلیمات و نیز عہدِ خلافت راشدہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما میں نہ تھی، جو اَب اذان ثانی کہلاتی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

"عن السائب بن یزید قال: کان النداء یوم الجمعة أوله إذا جلس الإمام علیٰ المنبر علیٰ عھد النبي ﷺ وأبي بکر و عمر رضی اللہ عنہما"[1]

[سائب بن یزید سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی، جب امام منبر پر تشریف فرما ہوتا۔ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی یہی معمول رہا]

جواب نمبر (۳)، جواب نمبر (۲) سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جو اذان اول کہلاتی ہے، یعنی خطیب کے منبر پر بیٹھنے کے قبل کہی جاتی ہے، اس کا وجود عہدِ رسالت علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات اور عہدِ شیخین رضی اللہ عنہما میں تھا ہی نہیں۔ باقی رہی وہ اذان جو اَب اذانِ ثانی کہلاتی ہے، اس کے لیے موذن کی تعداد بقدر ضرورت ہونی چاہیے۔ اگر ایک موذن سے زیادہ کی ضرورت نہ ہو تو ایک ہی موذن ہونا چاہیے اور اگر آدمی زیادہ ہوں اور ایک موذن کافی نہ ہو تو دو موذن ہوں اور دو موذن بھی کافی نہ ہوں تو تین موذن ہوں۔ علی ہذا القیاس، جس قدر آدمی بڑھتے جائیں اس قدر موذن اور اذانیں بڑھا دی جائیں، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ان کے عہد میں لوگوں کی کثرت ہوئی تو ایک اور اذان بڑھا دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بجائے ایک اذان کے کئی اذانیں کر دیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اذان کی دو اذانیں کر دیں، چنانچہ صحیح بخاری میں سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۸۷۰)

”فلما كان عثمان وكثر الناس، زاد النداء الثالث علىٰ الزوراء“[1]

[جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا اور لوگ بہت زیادہ ہوگئے تو انھوں نے تیسری اذان کا اضافہ کر دیا جو ”زوراء“ مقام پر کھڑے ہو کر کہی جاتی تھی]

نیز صحیح بخاری (۲۸/۳۶۴) کی ”کتاب المحاربین“ میں ”باب رجم الحبلىٰ من الزنا إذا أحصنت“ میں ہے:

”فجلس عمر علىٰ المنبر فلما سكت المؤذنون، قام فأثنى علىٰ الله بما هو أهله، ثم قال: أما بعد... الخ“[2]

[عمر رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوتے، جب موذن اذان کہہ کر خاموش ہوگئے تو وہ کھڑے ہوتے، اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان اس کی ثنا بیان کی اور پھر کہا: أما بعد....]

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اور ترجیع اذان:

سوال ① جس وقت حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے استہزاے اذان کیا تھا، اس وقت ابو محذورہ اسلام لائے تھے یا قبل استہزا کے؟

② فی الواقع حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو کراہیت تھی یا محض افترا ہے؟

③ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ کسی کتاب میں تحریر ہو تو ارقام فرما دیں۔

④ استہزا کی کوئی تاویل ہے یا علت کفر ہے؟ جیسا کہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم نے لکھا ہے۔

⑤ جمہور ترجیعِ اذان کے قائل ہیں یا نہیں؟ کسی کتاب شروحِ حدیث میں لکھا ہو تو تحریر فرما دیں۔

جواب ① ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے جس وقت اذان کا استہزا کیا تھا، اسلام نہیں لائے تھے۔

② جس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، ظن غالب یہی ہے کہ اسلام کی جانب سے ان کو کراہت قلبی رہی ہوگی۔

③ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ مفصل کسی کتاب میں مرقوم ہے، لیکن مجمل طور پر تو اسی حدیثِ اذان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو استہزاے اذان کی آواز سن کر بلوا بھیجا اور ان میں سے ہر ایک سے اذان کہلوائی۔ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی آواز آپ کو خوش معلوم ہوئی، تب آپ نے ان کے کل ساتھیوں کو رخصت فرما دی اور ان کو رکھ چھوڑا اور اپنے سامنے بیٹھا کر ان کے سر اور منہ اور سینے پر ناف تک اپنا دست مبارک پھیرا اور تین بار ان کو برکت کی دعا دی اور فرمایا: تم جاؤ اور بیت الحرام کے پاس اذان کہو، انھوں نے عرض کی کہ مجھ کو سنتِ اذان تعلیم فرما دیجیے، تب آپ نے خود بہ نفس نفیس سنتِ اذان سکھا دی اور اس کام کو اور کسی کے سپرد نہیں فرمایا۔ آپ نے جو سنتِ اذان تعلیم فرمائی، اس میں ہے کہ ترجیع بھی خود آپ ہی نے تعلیم فرمائی۔ تعلیمِ اذان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست پر ان کو مکہ معظمہ کا موذن مقرر فرمایا، جو اب تک یہ عہدہ ان کے خاندان میں چلا آیا۔

① مصدر سابق.

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٤٢)

④ ظاہر تو یہی ہے کہ استہزا کی علت کفر ہے، کیونکہ جس وقت استہزا کیا تھا، اس وقت تک وہ اسلام نہیں لائے تھے، لیکن جس وقت آپ نے ان کو ترجیع سکھائی تھی، اس وقت اسلام کے نور سے ان کا دل منور ہو چکا تھا، پس اُس وقت کی نسبت یہ کہنا کہ ''یہ تکرار برفع صوت (ترجیع) واسطے رفع کراہت قلبی ابو محذورہ کے اور واسطے رفع کفر ابو محذورہ کے تھا نہ یہ کہ تکرار کو سنتِ اذان فرمایا ہے، مگر ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اس کو نہ سمجھے۔'' صحت سے بہت دور معلوم ہوتا ہے اور نسائی میں بھی کہیں اس کا کچھ ذکر نہیں ہے، بلکہ علامہ زیلعی حنفی نے ''نصب الرایۃ'' میں اس کی کافی تردید فرما دی ہے۔ ''نصب الرایۃ'' (۱/ ۱۳۱) کی عبارت یہ ہے:

''ویردها لفظ أبي داود: "قلت: یا رسول اللّٰہ علمني سنة الأذان، وفیه: ثم تقول: أشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰه، أشهد أن محمدا رسول اللّٰه، تخفض بها صوتك، ثم ترفع صوتك بها، فجعله من سنة الأذان، وهو كذلك في صحیح ابن حبان و مسند أحمد'' اهـ

[ابو داود کے یہ الفاظ ان کا رد کرتے ہیں (ابو محذورہ کا بیان ہے) کہ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اذان کا طریقہ سکھا دیجیے۔ اس حدیث میں یہ ہے کہ پھر تم کہو ''أشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰه، أشهد أن محمداً رسول اللّٰه'' (پہلی دفعہ) تو یہ کہتے ہوئے آواز کو پست رکھ، پھر (دوسری مرتبہ) ان کو بلند آواز کے ساتھ کہہ، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (ترجیع شہادتین) کو اذان کے طریقے میں (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا) شامل کیا ہے۔ صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں بھی اسی طرح بیان ہوا ہے]

⑤ ہاں جمہور ترجیعِ اذان کے قائل ہیں۔ ''نیل الأوطار'' (۱/ ۳۳۷) میں ہے:

''وذهب الشافعي ومالك وأحمد وجمهور العلماء، كما قال النووي، إلیٰ أن الترجیع في الأذان ثابت لحدیث أبي محذورة... إلی قوله: ویرجحه أیضاً عمل أهل مكة والمدینة به'' اهـ واللّٰه تعالیٰ أعلم

[امام نووی رحمہ اللہ کی طرح امام شافعی، مالک، احمد اور جمہور علما رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے اذان میں ترجیع ثابت ہے...حتی کہ اہلِ مکہ اور اہلِ مدینہ کا ترجیع والی اذان کہنا بھی اس کو راجح قرار دیتا ہے]

کتبہ: محمد عبداللّٰہ (۱۳/ ربیع الآخر ۱۳۳۱ھ)

نماز کے مسائل

اذان اور نماز کے چند مسائل:

سوال ایک بستی میں ایک جماعت محمدیوں کی رہتی ہے، ان میں چند باتیں نئی دیکھنے میں آئیں۔ آیا سب موافق حدیث نبوی کے ہیں یا کوئی نیا طریقہ ہے؟ اگر موافق حدیث کے یہ افعال ہیں تو کس فعل کی کون سی حدیث ہے اور وہ

حدیث کس کتاب میں کس جگہ پر ہے؟ اس سے مطلع فرمائیے اور وہ افعال یہ ہیں:

① ایک تو اذان میں "اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر" ایک ایک بار جدا جدا دیر دیر کے بعد پکارتے ہیں اور "أشھد أن لا إلٰہ إلا اللّٰہ، وأشھد أن محمداً رسول اللّٰہ" کو پہلے موذن چپکے چپکے کہتا ہے، بعد اس کے بلند آواز سے۔

② تکبیر میں سوا "قد قامت الصلاۃ" کے سب کو ایک ایک بار کہتے ہیں۔

③ وقت تکبیر اور نیت باندھنے کے جیب یا کان سے مسواک نکال کر دو چار بار منہ میں پھیرتے ہیں اور بدستور جلدی سے نماز پڑھتے ہیں۔

④ رکعاتِ اولین میں بعد فاتحہ کے کسی سورت کو ختم کرتے ہیں، اس کے بعد سورت اخلاص بھی ضرورت پڑھتے ہیں، خواہ جماعت میں امام ہو خواہ منفرد۔

⑤ جب امام "سمع اللّٰہ لمن حمدہ" کہتا ہے تو کل جماعت "ربنا ولک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ" بآواز بلند کہتے ہیں۔

⑥ جب صفیں باندھتے ہیں تو ایک مصلی [نمازی] کے پیر کی خنصر دوسرے مصلی [نمازی] کی خنصر سے ملی رہتی ہے، بلکہ ایک کی داہنی خنصر دوسرے کی بائیں خنصر پر چڑھی رہتی ہے اور یہ انتظام ہر رکعت میں رہتا ہے۔

⑦ درمیان دونوں سجدوں کے جو جلسہ ہے، اس میں "اللھم اغفرلي..." پوری دعا کو سب جماعت بالجہر پڑھتے ہیں۔ ان سب کی سند از راہِ کریم الخلقی مرحمت فرمائی جائے۔ بینوا تؤجروا۔

جواب جواب ① "أشھد أن لا إلٰہ إلا اللّٰہ، أشھد أن محمد رسول اللّٰہ" کو پہلے چپکے چپکے کہنا، پھر بلند آواز سے کہنا حدیث سے ثابت ہے اور وہ حدیث حسبِ ذیل ہے، جو مشکوۃ شریف (ص: ۶۳ مطبوعہ مجتبائی دہلی) میں ہے:

وعنہ قال: قلت: یا رسول اللّٰہﷺ علمني سنۃ الأذان، قال: فمسح مقدم رأسہ، قال: تقول: «اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر، ترفع بھا صوتک، ثم تقول: أشھد أن لا إلٰہ إلا اللّٰہ، أشھد أن لا إلٰہ إلا اللّٰہ، أشھد أن محمدا رسول اللّٰہ، أشھد أن محمدا رسول اللّٰہ، تخفض بھا صوتک، ثم ترفع صوتک بالشھادۃ: أشھد أن لا إلٰہ إلا اللّٰہ، أشھد أن لا إلٰہ إلا اللّٰہ، أشھد أن محمداً رسول اللّٰہ، أشھد أن محمداً رسول اللّٰہ، حي علیٰ الصلاۃ، حي علیٰ الصلاۃ، حي علیٰ الفلاح، حي علیٰ الفلاح، فإن کان صلاۃ الصبح، قلت: الصلاۃ خیر من النوم، الصلاۃ خیر من النوم، اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر، لا إلٰہ إلا اللّٰہ» (رواہ أبو داود)[1]

[ابو محذورہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کی: اللہ کے رسول! مجھے اذان کا طریقہ سکھا دیں۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۵۰۰) مسند أحمد (۳/ ۴۰۸) مشکاۃ المصابیح (۱/ ۱۴۳)

آپ ﷺ نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا: ''کہو: اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ اپنی آواز بلند کرو۔ پھر کہو: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ کلمات کہتے ہوئے آواز پست رکھو، پھر یہ کہتے ہوئے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اپنی آواز بلند کرو۔ پھر کہو: نماز کی طرف آؤ، نماز کی طرف آؤ، کامیابی کی طرف آؤ، کامیابی کی طرف آؤ۔ اگر نمازِ فجر ہو تو کہو: نماز نیند سے بہتر ہے، نماز نیند سے بہتر ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں]

جواب ② تکبیر میں سوائے ''قد قامت الصلاة'' کے سب کو ایک ایک بار کہنا حدیث سے ثابت ہے اور وہ حدیث حسبِ ذیل ہے، جو مشکوۃ شریف (ص:۶۳ مطبوعہ مجتبائی دہلی) میں ہے:

''عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: كان الأذان على عهد رسول الله ﷺ مرتين مرتين، والإقامة مرة مرة، غير أنه يقول: قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة'' (رواه أبو داود والنسائي والدارمي)[1]

[ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اذان کے کلمات دو دو مرتبہ اور اقامت کے کلمات ''قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة'' کے سوا ایک ایک مرتبہ تھے]

جواب ③ مسواک کرنا تکبیر اور نیت باندھنے کے وقت بھی حدیث سے ثابت ہے۔ مشکوۃ شریف (ص: ۴۵ مطبوعہ مجتبائی دہلی) میں ہے:

عن أبي سلمة زيد بن خالد الجهني قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: «لولا أن أشق على أمتي، لأمرتهم بالسواك عند كل صلاة، ولأخرت صلاة العشاء إلى ثلث الليل» قال: وكان زيد بن خالد يشهد الصلاة في المسجد، وسواكه على أذنه، موضع القلم من أذن الكاتب، ولا يقوم إلى الصلاة إلا استن، ثم رده إلى موضعه. (رواه الترمذي و أبو داود إلا أنه لم يذكر: «ولأخرت صلاة العشاء إلى ثلث الليل» وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح)[2]

[ابوسلمہ رحمہ اللہ زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں انھیں ہر نماز کے وقت مسواک

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥١٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٢٨) مسند أحمد (٢/ ٨٥) سنن الدارمي (١/ ٢٩٠) مشكاة المصابيح (١/ ١٤٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣) مسند أحمد (٤/ ١١٦)

کرنے کا حکم دیتا اور نمازِ عشا کو تہائی رات تک موخر کرتا۔" زید بن خالد مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آتے تو کاتب کے قلم کی طرح ان کی مسواک ان کے کان پر ہوتی تھی اور وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو مسواک کرتے اور پھر اسے اس کی جگہ (کان) پر رکھ دیتے]

جواب ④ نماز میں بعد فاتحہ کے پہلے سورت اخلاص پڑھنا، بعد اس کے کسی سورت کو ضم کرنا حدیث سے ثابت ہے۔ بخاری شریف پارہ سوم (ص: ۴۲۲ مطبوعہ انصاری دہلی) میں ہے:

وقال عبيد الله عن ثابت عن أنس: كان رجل من الأنصار، يؤمهم في مسجد قباء، وكان كلما افتتح سورة، يقرأ بها لهم في الصلاة مما يقرأ به، افتتح بقل هو الله أحد، حتى يفرغ منها، ثم يقرأ بسورة أخرى معها، وكان يصنع ذلك في كل ركعة، فكلمه أصحابه، وقالوا: إنك تفتتح بهذه السورة، ثم لا ترى إنها تجزئك حتى تقرأ بأخرى فإما أن تقرأ بها، وإما أن تدعها وتقرأ بأخرى، فقال: ما أنا بتاركها، إن أحببتم أن أؤمكم بذلك فعلت، وإن كرهتم تركتكم، وكانوا يرون أنه من أفضلهم، وكرهوا أن يؤمهم غيرهم، فلما أتاهم النبيﷺ أخبروه الخبر، فقال: «يا فلان! ما يمنعك أن تفعل ما يأمر به أصحابك وما يحملك على لزوم هذه السورة في كل ركعة؟» فقال: إني أحبها! قال: «حبك إياها أدخلك الجنة»[1]

[اور عبیداللہ عمری نے ثابت رضی اللہ عنہ سے انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انصار میں سے ایک شخص (کلثوم بن ہدم) قبا کی مسجد میں لوگوں کی امامت کیا کرتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی سورت (سورۂ فاتحہ کے بعد) شروع کرتا تو پہلے "قل هو الله أحد" پڑھ لیتا۔ پھر کوئی دوسری سورت پڑھتا۔ ہر رکعت میں اس کا یہی عمل تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اس سلسلے میں اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ تم پہلے یہ سورت پڑھتے ہو اور صرف اسی کو کافی خیال نہیں کرتے، بلکہ دوسری سورت بھی (اس کے ساتھ) ضرور پڑھتے ہو یا تو تمھیں صرف اسی کو پڑھنا چاہیے، ورنہ اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ اور بجائے اس کے کوئی دوسری سورت پڑھنی چاہیے۔ اس شخص نے کہا کہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا، اب اگر تمھیں پسند ہے کہ میں نماز پڑھاؤں تو برابر پڑھاتا رہوں گا۔ ورنہ میں نماز پڑھانا چھوڑ دوں گا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ان سب سے افضل ہیں۔ اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے علاوہ کوئی اور شخص نماز پڑھائے۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو ان لوگوں نے آپ ﷺ کو واقعے کی خبر دی۔ آپ ﷺ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ اے فلاں!

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٠١) یہ حدیث صحیح بخاری میں معلق ہے، لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے امام بخاری ہی سے موصولاً روایت کیا ہے۔ نیز دیکھیں: فتح الباري (٢/ ٢٥٧) تغليق التعليق (٢/ ٣١٤)

تمھارے ساتھی جس طرح کہتے ہیں، اس پر عمل کرنے سے تم کو کون سی رکاوٹ ہے اور ہر رکعت میں اس سورت کو ضروری قرار دے لینے کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضور! میں اس سورت سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سورت کی محبت تمھیں جنت میں لے جائے گی۔ (آپ ﷺ نے ان کے اس فعل پر سکوت فرمایا، بلکہ تحسین فرمائی۔ ایسی احادیث کو تقریری کہا گیا ہے)]

جواب ⑤ یہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔ بخاری شریف پارہ سوم (ص: ۴۳۶ مطبوعہ انصاری دہلی) میں ہے:

حدثنا عبيد الله بن مسلمة عن مالك عن نعيم بن عبدالله المجمر عن علي بن يحيىٰ بن خلاد الزرقي عن أبيه عن رفاعة بن رافع قال: كنا يوما نصلي وراء النبيﷺ فلما رفع رأسه من الركعة قال: «سمع الله لمن حمده» قال رجل وراءه: ربنا ولك الحمد، حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه. فلما انصرف قال: «من المتكلم؟» قال: أنا. قال: «رأيت بضعة وثلاثين ملكا يبتدرونها، أيهم يكتبها أول»[1]

[ہم سے عبداللہ بن مسلمہ نے امام مالک سے بیان کیا، انھوں نے نعیم بن عبداللہ مجمر سے بیان کیا، انھوں نے علی بن یحییٰ خلاد سے، انھوں نے اپنے باپ سے، انھوں نے رفاعہ بن رافع زرقی سے، انھوں نے کہا: ہم نبی اکرم ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھ رہے تھے، جب آپ ﷺ رکوع سے سر اُٹھاتے تو "سمع الله لمن حمده" کہتے، ایک شخص نے پیچھے سے کہا: "ربنا ولك الحمد، حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه" آپ ﷺ نے نماز سے فارغ ہو کر دریافت فرمایا کہ کس نے یہ کلمات کہے ہیں؟ اس نے شخص نے جواب دیا کہ میں نے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا کہ ان کلمات کے لکھنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے تھے]

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس نے بآواز بلند "ربنا ولك والحمد... الخ" کہا تھا، جس کو رسول اللہ ﷺ نے اور لوگوں نے بھی سنا اور اس سے حضرت ﷺ نے منع نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے تیس اور کئی فرشتوں کو دیکھا کہ جلدی کر رہے ہیں کہ ہم پہلے لکھیں۔

جواب ⑥ جماعت میں ایک مصلی [نمازی] کے پیر کی خنصر دوسرے مصلی [نمازی] کے خنصر سے اس لیے ملی رہتی ہے کہ حدیث میں صف کے ٹھیک رکھنے اور درمیان میں کشادگی نہ رکھنے کے بارے میں بہت تاکید آئی ہے، اس لیے قدم کو قدم سے خوب ملا کر رکھنا چاہیے، تاکہ صف ٹھیک ہو اور کشادگی باقی نہ رہی اور جب قدم سے قدم ملے گا تو خنصر سے خنصر ضرور ملے گی۔

بخاری شریف پارہ سوم (ص: ۴۰۰ مطبوعہ انصاری دہلی) میں ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٦)

حدثنا عمرو بن خالد قال: حدثنا زهير عن حميد عن أنس عن النبيﷺ قال: «أقيموا صفوفكم فإني أراكم من وراء ظهري» وكان أحدنا يلزق منكبه بمنكب صاحبه و قدمه بقدمه.[1]

[ہم سے عمرو بن خالد نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہم سے زہیر بن معاویہ نے حمید سے بیان کیا، انھوں نے انس رضی اللہ عنہ سے، انھوں نے نبی کریم ﷺ سے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "صفیں برابر کر لو، میں تمھیں اپنے پیچھے سے بھی دیکھتا رہتا ہوں۔" اور ہم میں سے ہر شخص یہ کرتا کہ (صف میں) اپنا کندھا اپنے ساتھی کے کندھے سے، اپنا قدم اُس کے قدم سے ملا دیتا تھا]

مشکوۃ شریف (ص:۹۹ مطبع مجتبائی دہلی) میں ہے:

عن ابن عمر قال قال رسول اللهﷺ: «أقيموا الصفوف، وحاذوا بين المناكب، وسدوا الخلل، ولينوا بأيدي إخوانكم، ولا تذروا فرجات للشيطان، ومن وصل صفا وصله الله، ومن قطعه قطعه الله»

(رواه أبو داود، وروى النسائي منه قوله: «ومن وصل صفا...» إلى آخره)[2] والله أعلم

[سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اپنی صفیں قائم کرو، کندھے برابر رکھو، شگاف بند کرو، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کے لیے نرم ہو جاؤ، شیطان کے لیے شگاف (خالی جگہ) نہ چھوڑو اور جو شخص صف ملائے گا، اللہ (اپنی رحمت کے ساتھ) اسے ملائے گا اور جو اسے قطع کرے گا، اللہ اسے (اپنی رحمت سے) قطع کر دے گا]

كتبه: محمود البكونوي. تجاوز الله عن ذنبه الجلي والخفي. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله.

نماز میں اعوذ باللہ بالجہر پڑھنا:

سوال بعض بعض آدمی بسم اللہ کے ساتھ اعوذ باللہ جہر سے مغرب، عشا اور فجر کی نماز میں پڑھتے ہیں، ایسا بھی حدیث شریف میں وارد ہے؟

جواب اعوذ باللہ کے جہر سے پڑھنے کی تصریح میں نے حدیث شریف میں نہیں دیکھی ہے۔

رفع الیدین اور آمین بالجہر:[3]

سوال ① رفع یدین کرنا وقت جانے رکوع کے اور وقت اٹھانے سر کے رکوع سے درست ہے یا نہیں؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٢٠)

[3] فتاویٰ مولانا ابوالمکارم (ص:۵)

② آمین بآواز بلند کہنا درست ہے یا نہیں؟

جواب ① ماہرینِ شریعتِ غرا پر مخفی و محتجب نہ ہے کہ رفع یدین کا کرنا وقت جانے رکوع اور وقت اُٹھانے سر کے رکوع سے صحیح حدیثوں سے ثابت ہے اور اسی کے قائل ہیں جمہور محدثین۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

”عن ابن عمر قال: رأيت النبيﷺ افتتح التكبير في الصلاة فرفع يديه حين يكبر حتى يجعلهما حذو منكبيه، وإذا كبر للركوع، فعل مثله، وإذا قال: سمع الله لمن حمده، فعل مثله، وقال: ربنا ولك الحمد، ولا يفعل ذلك حين يسجد، ولا حين يرفع رأسه من السجود“[1]

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی مکرم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ نماز شروع کرتے تو ”اللہ اکبر“ کہتے اور ”اللہ اکبر“ کہتے ہوئے ہاتھ اُٹھاتے، حتیٰ کہ ان کو اپنے کندھوں کے برابر لے جاتے۔ جب رکوع کرنے کے لیے ”اللہ اکبر“ کہتے تو پھر ایسے ہی کرتے اور جب ”سمع اللہ لمن حمدہ“ کہتے تو پھر ایسے ہی کرتے اور کہتے: ”ربنا ولك الحمد ...“ اور سجدہ کرتے وقت اور سجدے سے سر اُٹھاتے وقت یہ (رفع الدین) نہیں کرتے تھے]

اور روایت کیا اس حدیث کو مسلم و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و ابو داود و دارمی و مالک نے اور ترمذی بعد نقلِ حدیث کے کہتا ہے:

”حديث ابن عمرﷺ حديث حسن صحيح، وبهذا يقول بعضّ أهل العلم من أصحاب النبيﷺ منهم: ابن عمر و جابر بن عبد الله و أبو هريرة و أنس و ابن عباس و عبد الله بن الزبير وغيرهم، ومن التابعين: الحسن البصري وعطاء و طاؤس و مجاهد و نافع و سالم بن عبدالله و سعيد بن جبير وغيرهم، وبه يقول عبد الله بن المبارك و الشافعي وأحمد وإسحاق“ انتهى كلامه

[ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث حسن صحیح ہے۔ نبی مکرم ﷺ کے اصحاب میں سے اہلِ علم کا یہی قول ہے، جن میں سے ابن عمر، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، انس، ابن عباس اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے حسن بصری، عطاء، طاؤس، مجاہد، نافع، سالم بن عبداللہ اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔ عبداللہ بن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی یہی موقف رکھتے ہیں]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٧٨٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٥٨) سنن الدارمي (١/ ٣٤٢)

امام نووی رحمہ اللہ شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:

"اجتمعت الأمة على استحباب رفع اليدين عند تكبيرة الإحرام، و اختلفوا في ما سواها، فقال الشافعي وأحمد وجمهور العلماء من الصحابة فمن بعدهم: يستحب رفعهما أيضاً عند الركوع وعند الرفع منه، وهو رواية عن مالك، وللشافعي قول أنه يستحب رفعهما في موضع رابع، وهو إذا قام من التشهد الأول، وهذا القول هو الصواب، فقد صح فيه حديث ابن عمر عن النبي ﷺ أنه كان يفعله، رواه البخاري وصح أيضاً من حديث أبي حميد الساعدي، رواه أبو داود و الترمذي بأسانيد صحيحة"[1] انتهى كلامه

[تکبیر تحریمہ کے وقت رفع الیدین کے مستحب ہونے پر اُمت کا اجماع ہے اور اس کے علاوہ میں اختلاف ہے۔ امام شافعی، احمد رحمہ اللہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد والوں سے جمہور علما کا کہنا ہے کہ رکوع کرتے وقت، رکوع سے سر اُٹھاتے وقت ان کا اُٹھانا مستحب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح کی ایک روایت مروی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ ایک چوتھی جگہ پر بھی رفع الیدین مستحب ہے اور وہ پہلے تشہد سے کھڑے ہونے کے وقت ہے اور یہی قول درست بھی ہے۔ اس بارے میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ نیز یہ ابو حمید ساعدی کی حدیث سے بھی صحیح ثابت ہے۔ امام ابو داود اور ترمذی رحمہ اللہ نے اسے صحیح سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے]

اور اعتراض کرنا احناف کا اس حدیث پر، بایں طور کہ راوی اس حدیث کے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں اور مجاہد نے کہا ہے کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھا تو رفع یدین نہیں کیا مگر اول مرتبہ، جیسا کہ روایت کیا طحاوی نے، پس موافق اصول کے حدیث مرجوح ہوئی اور قابل عمل کے نہ رہی، اس واسطے کہ اصولِ فقہ میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ جو راوی کسی حدیث کو روایت کرے اور فعل اس کا اس کے خلاف پایا جائے تو وہ روایت مرجوح ہوتی ہے۔ یہ محض باطل ہے اور جواب اس کا کئی طرح سے دیا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ صاحبِ مسلم الثبوت نے اس قاعدے کو باطل کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ صرف نہ کرنے سے راوی کی حدیث منسوخ نہیں ہوتی، جب تک راوی خود نہ بیان کرے کہ یہ حدیث منسوخ ہے اور علامہ معین الدین "دراسات اللبیب" میں فرماتے ہیں:

"دلالة ترك الراوي مرويته على نسخه ممنوع من وجوه، الأول لا نسلم جواز النسخ إلا بدليل مثله من الشارع ﷺ لما تقدم، وترك الراوي من غير إظهار دليل عن النبي ﷺ لا يكفي مؤنته" انتهى كلامه

[1] شرح صحيح مسلم (٤/ ٩٥)

[راوی کے اپنی مروی پر عمل کے ترک کرنے کی اس کے منسوخ ہونے پر دلالت چند وجوہ سے ممنوع ہے۔ پہلی یہ کہ ہم شارع علیہ السلام کی طرف سے اس جیسی دلیل کے بغیر نسخ کے جواز کو تسلیم نہیں کرتے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ راوی کا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی دلیل کے اظہار کے بغیر عمل کو ترک کرنا اس کے لیے کافی نہیں ہے]

تیسرے یہ کہ خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا رفع یدین کرنا ثابت ہے، چناں چہ بخاری شریف میں ہے:

"عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما كان إذا دخل في الصلاة كبر و رفع يديه، وإذا ركع رفع يديه، وإذا قال: سمع الله لمن حمده رفع يديه، وإذا قام من الركعتين رفع يديه ورفع ذلك ابن عمر إلى النبي صلی اللہ علیہ وسلم"[1]

[نافع رحمہ اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ نماز کا آغاز کرتے تو "اللہ اکبر" کہتے اور اپنے ہاتھوں کو اُٹھاتے، پھر جب رکوع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو اُٹھاتے اور جب "سمع اللہ لمن حمدہ" کہتے تو پھر اپنے ہاتھوں کو اُٹھاتے اور جب دو رکعتوں سے کھڑے ہوتے تو اپنے ہاتھوں کو اُٹھاتے۔ چناں چہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس روایت کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع بیان کیا]

بلکہ روایت کیا امام بخاری نے "جزء رفع الدين" میں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جس شخص کو دیکھتے کہ رفع یدین نہیں کرتا، اس کو کنکری مارتے تھے:

"عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما كان إذا رأى رجلا لا يرفع يديه إذا ركع وإذا رفع، رماه بالحصى"[2] انتهى كلامه

[نافع رحمہ اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جب وہ کسی آدمی کو دیکھتے کہ وہ رکوع جاتے اور اُٹھتے وقت رفع یدین نہیں کرتا تو اس کو کنکری مارتے تھے]

چوتھے یہ کہ ہوسکتا ہے کہ مجاہد بھول گئے ہوں، جیسا کہ امام بخاری "جزء رفع اليدين" میں فرماتے ہیں:

"ويروىٰ عن أبي بكر بن عياش عن حصين عن مجاهد أنه لم ير ابن عمر رضی اللہ عنہما رفع يديه إلا في أول التكبير، روى عنه أهل العلم أنه لم يحفظ من أهل العلم إلا أن يكون ابن عمر سها كما يسهو الرجل في الصلاة في الشيئ بعد الشيئ كما أن عمر نسي القراءة و كما أن أصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ربما يسهون في الصلاة فيسلمون في الركعتين وفي الثلاث، ألا ترى أن ابن عمر رضی اللہ عنہ كان يرمي من لا يرفع يديه بالحصى

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦)

[2] جزء رفع اليدين (ص: ٣٧)

فكيف يترك ابن عمر رضي الله عنهما شيئاً يأمر به غيره وقد رأى النبي ﷺ فعله؟"[1] انتهى

[ابوبکر بن عیاش سے روایت کی جاتی ہے، وہ حصین سے بیان کرتے ہیں، وہ مجاہد سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پہلی تکبیر کے سوا میں رفع یدین کرتے نہیں دیکھا۔ اہلِ علم نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ (مجاہد) اہلِ علم سے اس کو یاد نہیں رکھ سکے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ایسے ہی بھول گئے، جس طرح آدمی نماز میں ایک چیز کے بعد دوسری چیز کو بھول جاتا ہے، جس طرح محمد ﷺ کے اصحاب بعض اوقات نماز میں بھول جاتے تھے اور (چار رکعتی نماز میں) دو رکعت کے بعد اور تین رکعت کے بعد سلام پھیر دیتے تھے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما رفع یدین نہ کرنے والے کو کنکریاں مارا کرتے تھے، لہٰذا ابن عمر رضی اللہ عنہما وہ کام خود کیسے چھوڑ سکتے ہیں، جس کا وہ دوسروں کو حکم دیتے ہیں اور انھوں نے نبی مکرم ﷺ کو وہ فعل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟]

پانچویں یہ کہ نہ کرنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک بار مخالف مدعا نہیں، بلکہ مفید ہے، اس واسطے کہ رفع یدین کا کرنا سنت ہے اور سنت کے یہی معنی ہیں کہ کبھی کیا جائے اور کبھی نہ کیا جائے۔

چھٹا یہ کہ ہوسکتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ترک کیا ہو بسبب عدمِ انضباط مواضع اس کی کے۔ علامہ معین الدین "دراسات اللبیب" میں فرماتے ہیں:

"قد يترك الراوي مرويته لتردده في كيفية العمل به حتى لا يقع على خلاف السنة فيجوز ترك ابن عمر الرفعات لعدم انضباط مواضعها"

[کبھی راوی اپنی مروی کو عمل کی کیفیت میں تردد کی بنا پر ترک کر دیتا ہے، تاکہ وہ خلافِ سنت واقع نہ ہو۔ لہٰذا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا رفع یدین کو ترک کرنا عدمِ انضباط مواضع کے سبب جائز ہے]

اور روایت کیا نسائی نے مالک بن الحویرث سے:

"عن مالك بن الحويرث أنه رأى النبي ﷺ يرفع يديه وإذا ركع وإذا رفع رأسه من الركوع حتى يحاذي بهما فروع أذنيه"[2]

[مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم ﷺ کو رکوع جاتے وقت اور رکوع سے اپنا سر اُٹھاتے وقت رفع یدین کرتے ہوئے دیکھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ ان کو اپنے کانوں کی لَو کے برابر تک لے جاتے]

اور مسلم نے ابو قلابہ سے روایت کیا ہے:

"أنه رأى مالك بن الحويرث إذا صلىٰ كبر، ثم رفع يديه، وإذا أراد أن يركع رفع يديه،

---

[1] جزء رفع اليدين (ص: ٣٨)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٥٦)

وإذا رفع رأسه من الركوع رفع يديه، وحدث أن رسول الله ﷺ كان يفعل هكذا"[1]

[انھوں نے مالک بن حویرث کو دیکھا کہ جب وہ نماز شروع کرتے وقت ''اللہ اکبر'' کہتے تو اپنے ہاتھوں کو اُٹھاتے۔ پھر جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے تو اپنے ہاتھوں کو اُٹھاتے اور جب رکوع سے اپنا سر اُٹھاتے تو اپنے ہاتھوں کو اُٹھاتے۔ انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسا کیا کرتے تھے]

اور روایت کیا حدیث رفع یدین کو چودہ صحابہ نے، جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ اپنی کتاب "الأم" میں فرماتے ہیں:

"يروي ذلك عنه ﷺ أربعة عشر رجلا من الصحابة، ويروىٰ عن أصحابه ﷺ من غير وجه"[2] انتهى كلامه

[چودہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کئی واسطوں سے یہ بیان کیا جاتا ہے]

اور امام بخاری بھی "جزء رفع اليدين" میں فرماتے ہیں کہ روایت کیا اس حدیث کو سترہ صحابہ نے:

"وكذلك يروى عن سبعة عشر نفسا من أصحاب النبي ﷺ أنه كانوا يرفعون أيديهم عند الركوع، منهم أبو قتادة وأبو أسيد الساعدي و محمد بن مسلمة و سهل بن سعد الساعدي و عبد الله بن عمر بن الخطاب و عبدالله بن عباس و عبدالله بن عمرو بن العاص وأنس بن مالك وأبو هريرة و عبد الله بن الزبير بن العوام القرشي و وائل بن حجر الحضرمي و مالك بن الحويرث و أبو موسىٰ الأشعري و أبو حميد الساعدي الأنصاري وعمر بن الخطاب وعلي بن أبي طالب و أم الدرداء ﷺ"[3] انتهى كلامه

[اس طرح نبی مکرم ﷺ کے سترہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے کہ وہ رکوع (جانے اور اُٹھنے) کے وقت رفع یدین کرتے تھے، جن میں ابو قتادہ، ابو اُسید ساعدی، محمد بن مسلمہ، سہل بن سعد ساعدی، عبداللہ بن عمر بن خطاب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن عاص، انس بن مالک، ابوہریرہ، عبداللہ بن زبیر بن عوام قرشی، وائل بن حجر حضرمی، مالک بن حویرث، ابوموسیٰ اشعری، ابوحمید ساعدی، عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب اور ام درداء رضی اللہ عنہم شامل ہیں]

اور دعویٰ کیا ہے مجد الدین فیروز آبادی اور عراقی نے کہ حدیث رفع الیدین کی متواتر المعنی ہے، روایت کیا اس کو پچاس صحابہ نے اور اسی طرح جلال الدین السیوطی نے دعویٰ تواتر کا کیا ہے اپنی کتاب "الأزهار المتناثرة في أخبار المتواترة" میں۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۹۱)

[2] کتاب الأم (۷/ ۴۳۰)

[3] جزء رفع

"دراسات اللبيب" میں علامہ معین الدین فرماتے ہیں:

"وردت في الرفع أربعمائة خبر بين مرفوع و أثر علىٰ ما قاله مجد الدين الفيروز آبادي في السفر فالحديث متواتر معنى، رواه خمسون من الصحابة، فيهم العشرة المبشرة رضی اللہ عنہم علىٰ ما قاله العراقي في شرح التقريب، وعده السيوطي من جملة الأحاديث المتواترة في كتابه المسمى بـ "الأزهار المتناثرة في الأخبار المتواترة" ونسبه إلىٰ رواية ثلاثة وعشرين من الصحابة، فقال: حديث رفع اليدين في الإحرام و الركوع والاعتدال أخرجه الشيخان عن ابن عمر و مالك بن الحويرث و مسلم يعني في إفراده عن وائل بن حجر والأربع يعني أصحاب السنن الأربعة عن علي وأبو داود يعني في إفراده عن سهل بن سعد و ابن الزبير و ابن عباس و محمد بن مسلمة و أبي أسيد وأبي حميد وأبي قتادة وأبي هريرة وابن ماجه يعني في إفراده عن أنس و عن جابر ابن عبد الله و عمر الليثي وأحمد عن الحكم بن عمير والأعرابي والبيهقي عن أبي بكر الصديق والبراء والدارقطني عن عمر بن الخطاب وأبي موسىٰ الأشعري و الطبراني عن علقمة بن عامر و معاذ بن جبل" انتهى كلامه

[رفع یدین کے بارے میں چار سو مرفوع احادیث و آثار مروی ہیں، جیسا کہ مجد الدین فیروز آبادی نے "سفر السعادة" میں کہا ہے۔ پس یہ حدیث متواتر المعنی ہے، جس کو پچاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے، جن میں عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، جیسا کہ عراقی نے شرح التقریب میں کہا ہے۔ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کو اپنی کتاب "الأزهار المتناثرة في الأخبار المتواترة" میں متواتر احادیث کے ضمن میں شمار کیا ہے اور اسے تئیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایت کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ تکبیر تحریمہ، رکوع جاتے اور اُٹھتے وقت رفع یدین کی حدیث کو امام بخاری و مسلم نے ابن عمر اور مالک بن حویرث رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اسے وائل بن حجر سے بیان کیا ہے۔ اصحابِ سنن اربعہ نے علی رضی اللہ عنہ سے اور ابوداود نے سہل بن سعد، ابن زبیر، ابن عباس، محمد بن مسلمہ، ابو اسید، ابوحمید، ابوقتادہ اور ابوہریرہ سے بیان کیا ہے۔ ابن ماجہ رحمہ اللہ نے انس، جابر بن عبداللہ اور عمر لیثی سے روایت کی ہے۔ احمد نے حکم بن عمیر سے۔ اعرابی اور بیہقی نے ابوبکر صدیق اور براء سے بیان کیا ہے۔ دارقطنی نے عمر بن خطاب اور ابوموسیٰ اشعری سے بیان کیا ہے۔ طبرانی نے علقمہ بن عامر اور معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے]

وفات آنحضرت ﷺ کی رفع الیدین پر ہوئی ہے، جیسا کہ علامہ معین الدین "دراسات اللبيب" میں فرماتے ہیں:

"ثم استمر بهﷺ حتى فارق الدنيا، وهو زيادة البيهقي علىٰ الحديث المتفق عليه عن الزهري عن سالم عن ابن عمر: فما زالت تلك صلاته حتى لقي الله تعالىٰ، قال ابن المديني في حديث الزهري عن سالم عن أبيه: هذا الحديث عندى حجة على الخلق، وكل من سمعه فعليه أن يعمل به لأنه ليس في إسناده شيئ، حكاه الحافظ في تخريج أحاديث الرافعي، ولكونه لم ينسخ بعد حجيته وتواتره وروايته عن جم غفير من الصحابة كانْ معمولًا في الصحابة بعد النبيﷺ" انتهى كلامه

[پھر آپ ﷺ وفات تک اس (رفع الیدین) پر عمل کرتے رہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے متفق علیہ حدیث پر زہری، سالم اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی وہ زیادتی بھی بیان کی ہے، جس میں ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ یہ نماز پڑھتے رہے، حتی کہ اللہ تعالیٰ کو جا ملے۔ ابن مدینی نے زہری، سالم اور وہ اپنے باپ سے مروی حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ یہ حدیث میرے نزدیک لوگوں پر حجت ہے، لہٰذا جو بھی اس کو سنے اس پر یہ واجب ہے کہ وہ اس پر عمل کرے، کیوں کہ اس کی اسناد میں کوئی ضعف نہیں ہے، اس کو حافظ نے رافعی کی احادیث کی تخریج میں حکایت کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث اپنی حجت، تواتر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک جمِ غفیر سے اس روایت کے بعد منسوخ نہیں ہوتی اور یہ حدیث ان صحابہ کے ہاں نبی مکرم ﷺ کی وفات کے بعد معمول بہ تھی]

ناظرین پر پوشیدہ نہ رہے کہ یہاں سے بھی معلوم ہوا ہے کہ رفع یدین کا کرنا سنتِ موکدہ ہے، کیوں کہ تعریف سنتِ موکدہ کی یعنی "ما واظب عليه النبيﷺ مع الترك أحيانا" [جس پر نبی مکرم ﷺ نے ہمیشگی کی ہو اور بعض اوقات اسے ترک بھی کیا ہو] صادق آتی ہے۔ كما لا يخفى۔ بلکہ نہ کرنا رفع الیدین کا آنحضرت ﷺ کا ایک بار بھی صحیح روایتوں سے ثابت نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ امام بخاری جزء رفع الیدین میں فرماتے ہیں:

"ولم يثبت عند أهل النظر ممن أدركنا من أهل الحجاز وأهل العراق منهم عبد الله بن الزبير و علي بن عبدالله بن جعفر و يحيىٰ بن معين و أحمد بن حنبل و إسحاق بن راهويه، هؤلاء أهل العلم من بين أهل زمانهم، فلم يثبت عند أحد منهم علمنا في ترك رفع الأيدي عن النبيﷺ ولا أحد من أصحاب النبيﷺ أنه لم يرفع يديه"[1] انتهى كلامه

[اہلِ حجاز اور اہلِ عراق کے جن اہلِ نظر سے ہماری ملاقات ہوئی ہے، ان سے یہ ثابت نہیں ہے، جن میں عبد اللہ بن زبیر، علی بن عبد اللہ بن جعفر، یحیٰ بن معین، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ شامل ہیں۔ یہ لوگ اپنے دور کے لوگوں کے درمیان اہلِ علم تھے۔ ان میں سے کسی ایک کے ہاں بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ

[1] جزء رفع اليدين (ص: ١١)

نبی مکرم ﷺ نے رفع یدین ترک کیا ہو اور نہ نبی مکرم ﷺ کے اصحاب میں سے کسی صحابی سے یہ ثابت ہے کہ اس نے رفع یدین نہ کیا ہو]

بلکہ روایت کیا امام بخاری نے جزء رفع الیدین میں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جس شخص کو دیکھتے کہ نماز میں رفع یدین نہیں کرتا ہے، اس کو کنکری سے مارتے تھے اور یہ روایت نافع سے اوپر گزر چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ رفع یدین کو ایک امر موکد سمجھتے تھے، جس کو ہم لوگ تعبیر ساتھ سنت موکدہ کے کرتے ہیں۔ فثبت المطلوب بلا كلفة.

باقی رہی حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی جو روایت کیا ہے ترمذی اور ابو داود نے علقمہ سے:

"قال: قال لنا ابن مسعود: ألا أصلي بكم صلاة رسول الله ﷺ فصلى ولم يرفع يديه إلا مرة واحدة مع تكبيرة الافتتاح"[1]

[(علقمہ نے) کہا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں تمھیں رسول اللہ ﷺ کی نماز نہ پڑھ کر دکھاؤں؟ چناں چہ انھوں نے نماز پڑھی اور اپنے ہاتھ تکبیرِ تحریمہ کے ساتھ صرف ایک ہی بار اُٹھائے]

اور یہی دلیل احناف کرام کی ہے، سو یہ حدیث صحیح نہیں ہے، چناں چہ خود ابو داود کہتا ہے:

"هذا حديث مختصر من حديث طويل، ليس هو بصحيح على ذلك اللفظ"

[یہ حدیث ایک لمبی حدیث سے مختصر ہے اور ان الفاظ میں صحیح نہیں ہے]

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تخریج رافعی میں فرماتے ہیں:

"وقال ابن المبارك: لم يثبت عندي، وضعفه أحمد و شيخه يحيىٰ بن آدم و البخاري وأبو داود و أبو حاتم والدارقطني والدارمي والحميدي الكبير والبيهقي"[2]

[ابن المبارک نے کہا ہے کہ میرے ہاں یہ ثابت نہیں ہے۔ امام احمد اور ان کے شیخ یحییٰ بن آدم، بخاری، ابو داود، ابو حاتم، دارقطنی، دارمی، حمیدی کبیر اور بیہقی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے]

نیز ابن حبان فرماتے ہیں:

"هذا أحسن خبر روي لأهل الكوفة، وهو في الحقيقة أضعف شيئاً يعول عليه، لأن له علة تبطله"[3] هكذا في الدراسات

[یہ سب سے زیادہ بہتر حدیث ہے، جو اہلِ کوفہ کے لیے روایت کی گئی ہے، مگر فی الحقیقت یہ وہ کمزور ترین چیز ہے، جس پر اعتماد کیا جاتا ہے، کیوں کہ اس میں ایک ایسی علت پائی جاتی ہے، جو اس کو باطل قرار دیتی ہے]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧)

[2] التلخيص الحبير (١/ ٢٢٢)

[3] جزء رفع اليدين (ص: ٩)

امام نووی رحمہ اللہ نے محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور امام بخاری "جزء رفع اليدين" میں فرماتے ہیں:

"ويروى عن سفيان عن عاصم بن كليب عن عبد الرحمن بن الأسود عن علقمة قال: قال ابن مسعود ألا أصلي بكم صلاة رسول الله ﷺ فصلى ولم يرفع يديه إلا مرة، وقال أحمد بن حنبل عن يحيىٰ بن آدم: قال: نظرت في كتاب عبد الله بن إدريس عن عاصم بن كليب ليس فيه "ثم لم يعد"، فهذا أصح لأن الكتاب أحفظ عند أهل العلم لأن الرجل يحدث بشيئ، ثم يرجع إلى الكتاب فيكون كما في الكتاب"[1] انتهى كلامه

[سفیان سے روایت کیا جاتا ہے، وہ عاصم بن کلیب سے روایت کرتا ہے، وہ عبدالرحمٰن بن اسود سے، وہ علقمہ سے روایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں تمھیں رسول اللہ ﷺ کی نماز نہ پڑھ کر دکھاؤں؟ چناں چہ انھوں نے نماز پڑھی اور اپنے ہاتھ (تکبیر تحریمہ کے ساتھ) صرف ایک دفعہ ہی اُٹھائے۔ امام احمد بن حنبل نے یحییٰ بن آدم سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا ہے: میں نے عبداللہ بن ادریس کی کتاب میں دیکھا، وہ عاصم بن کلیب سے روایت کرتے ہیں، جس میں "ثم لم يعد" کے الفاظ نہیں تھے۔ پس یہ روایت زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اہلِ علم کے نزدیک کتاب زیادہ محفوظ ہوتی ہے، اس لیے کہ آدمی بعض اوقات کوئی چیز بیان کرتا ہے، پھر وہ کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ چیز کتاب میں موجود ہوتی ہے]

اور دلیل پکڑنا احناف کرام کا ساتھ حدیثِ براء بن عازب کے جو روایت کیا ہے ابو داود نے اور وہ حدیث یہ ہے:

"عن البراء بن عازب قال: إن رسول الله ﷺ إذا افتتح في الصلاة رفع يديه إلى قريب من أذنيه ثم لا يعود"[2]

[براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تو اپنے کانوں کے قریب تک ہاتھ اُٹھاتے، پھر دوبارہ ایسا نہ کرتے]

جائز نہیں کئی وجہ سے۔ ایک تو یہ کہ حدیث ضعیف ہے، ضعیف کہا اس کو ابن مدینی نے اور احمد بن حنبل نے اور مردود کہا اس کو دارقطنی نے اور دوسرے یہ کہ لفظ "لا يعود" کا سوائے راوی شریک کے کسی نے نہیں ذکر کیا اور شریک کو ترمذی نے کئی جگہ اپنی جامع میں ضعیف کہا ہے۔ ایک مقام پر کہتا ہے کہ شریک کثیر الغلط ہے۔ عینی حنفی رحمہ اللہ شرح صحیح بخاری میں فرماتا ہے:

"قال الخطابي: لم يقل أحد في هذا: ثم لا يعود غير شريك، وقال أبو عمر: تفرد به يزيد، رواه عن الحفاظ فلم يذكر واحد منهم قوله: ثم لا يعود، وقال البزار: لا

---

[1] جزء رفع اليدين (ص: ٩)

[2] سنن أبي داود (٧٤٩)

يصح حديث يزيد في رفع اليدين "ثم لا يعود" وقال عباس الدوري عن يحيىٰ بن معين: ليس هو بصحيح الإسناد"[1] انتهى ما قاله العيني.

[امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شریک کے علاوہ کسی نے "ثم لا يعود" کے الفاظ ذکر نہیں کیے ہیں۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ یزید اس کے ذکر میں متفرد ہے، جن حفاظ سے روایت کی ہے، ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ قول "ثم لا يعود" ذکر نہیں کیا۔ امام بزار رحمہ اللہ نے کہا ہے: رفع الیدین کے بارے میں "ثم لا يعود" والی یزید کی روایت درست نہیں ہے۔ عباس نے کہا ہے کہ یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت صحیح الاسناد نہیں ہے]

امام ابن حبان اپنی کتاب "الضعفاء" میں فرماتے ہیں:

"يزيد بن أبي زياد كان صدوقا إلا أنه لما كبر تغير فكان يلقن فيتلقن فسماع من سمع منه قبل دخوله الكوفة في أول عمره سماع صحيح، وسماع من سمع منه آخر قدومه الكوفة ليس بصحيح"[2] انتهى ما في كتاب الضعفاء لابن حبان.

[یزید بن ابی زیاد صدوق راوی تھا، مگر جب وہ بوڑھا ہوگیا تو اس کا حافظہ متغیر ہوگیا۔ پس اس کو تلقین کی جاتی تو وہ تلقین کو قبول کر لیتا، چناں چہ جس نے اس کی اول عمر میں اس کے کوفے میں جانے سے پہلے اس سے سماع کیا تو اس کا سماع درست شمار ہوگا اور جس نے اس کے کوفے میں داخل ہونے کے بعد اس سے سماع کیا تو اس کا سماع صحیح نہیں ہے]

تیسرے یہ کہ ابو داود نے بعد نقل اس حدیث کے یہ فرمایا ہے کہ اس حدیث کو اور لوگوں نے بھی روایت کیا ہے، مگر "لا يعود" کا نہیں ذکر کیا:

"قال أبو داود: روى هذا الحديث هشيم و خالد و ابن إدريس عن يزيد، ولم يذكروا: ثم لا يعود"[3]

[امام ابو داود رحمہ اللہ نے کہا ہے: ہشیم اور خالد اور ابن ادریس نے اس حدیث کو یزید سے روایت کیا ہے، لیکن انھوں نے "ثم لا يعود" کے الفاظ ذکر نہیں کیے ہیں]

پس یہ حدیث بالکل پایۂ اعتبار سے ساقط ہے دو وجہ سے: ایک تو یہ کہ دو راوی اس حدیث میں ضعیف ہیں۔ دوسرا یزید بن ابی زیاد، جیسا کہ اوپر کی عبارت سے معلوم ہوا۔ جب کوفہ میں تشریف لے گئے تو لفظ "لا يعود" کا بڑھا دیا، جیسا کہ آیندہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ فلينتظر . ابو داود نے حدیثِ براء کو دوسری سند سے، یعنی

---

[1] عمدة القاري (٥/ ٢٧٣)

[2] كتاب الضعفاء (٣/ ١٠٠)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٥٠)

بروایت محمد بن ابی لیلیٰ کے بھی لایا ہے اور وہ حدیث مع اسناد کے نقل کی جاتی ہے:

"حدثنا حسين بن عبد الرحمن أنا وكيع عن ابن أبي ليلىٰ عن أخيه عيسىٰ عن الحكم عن عبد الرحمن بن أبي ليلىٰ عن البراء بن عازب، قال: رأيت رسول اللهﷺ رفع يديه حين افتتح الصلاة، ثم لم يرفعهما حتى انصرف"[1]

[ہم کو حسین بن عبد الرحمٰن نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہم کو وکیع نے ابن ابی لیلیٰ سے، انھوں نے اپنے بھائی عیسیٰ سے، انھوں نے حکم سے، انھوں نے عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے، انھوں نے براء بن عازب سے روایت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے نماز شروع کرتے وقت اپنے ہاتھوں کو اُٹھایا، پھر نماز سے فارغ ہونے تک ان کو دوبارہ نہیں اُٹھایا]

یہ حدیث بھی لائقِ احتجاج نہیں، کیوں کہ منقطع ہے، اس لیے کہ درمیان میں یزید بن ابی زیاد کا واسطہ چھوٹا ہے، جیسا کہ امام بخاری کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے:

"وإنما روى ابن أبي ليلىٰ من حفظه فأما من حدث عن ابن أبي ليلىٰ من كتابه فإنما حدث عن ابن أبي ليلىٰ عن يزيد فرجع الجديث إلى تلقين يزيد والمحفوظ ما روى الثوري وشعبة و ابن عيينة قديماً"[2] انتهى ما في جزء رفع اليدين.

[ابن ابی لیلیٰ نے اپنے حفظ سے اس روایت کو بیان کیا ہے، لیکن جس نے ابن ابی لیلیٰ سے اس کی کتاب سے بیان کیا تو اس نے اس کو ابن ابی لیلیٰ سے یزید سے بیان کیا ہے، پس یہ حدیث یزید کی تلقین کی طرف لوٹتی ہے، جب کہ محفوظ روایت وہ ہے، جو ثوری شعبہ اور ابن عیینہ نے پہلے بیان کی ہے]

اور وہ روایت محفوظ یہ ہے:

"حدثنا الحميدي ثنا سفيان عن يزيد بن أبي زياد و ههنا عن ابن أبي ليلىٰ عن البراء أن النبيﷺ كان يرفع يديه إذا كبر، قال سفيان: لما كبر الشيخ لقنوه: ثم لم يعد، فقال: ثم لم يعد، قال البخاري: وكذلك روى الحفاظ من سمع من يزيد بن أبي زياد قديماً، منهم الثوري وشعبة وزهير، ليس فيه: ثم لم يعد"[3] انتهى ما في جزء رفع اليدين للبخاري.

[ہمیں حمیدی نے، ہمیں سفیان نے یزید بن ابی زیاد سے بیان کیا اور یہاں ابن ابی لیلیٰ سے، انھوں نے براء سے کہ بلاشبہہ نبی مکرم ﷺ تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ سفیان نے کہا کہ جب

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٥٢)

[2] جزء رفع اليدين (ص: ١٠)

[3] جزء رفع اليدين (ص: ٩، ١٠)

شیخ (یزید بن ابی زیاد) بوڑھے ہوگئے تو انھوں نے ان کو "ثم لم یعد" کے الفاظ کی تلقین کی تو انھوں نے "ثم لم یعد" کے الفاظ بیان کیے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے: یزید بن ابی زیاد سے پہلے پہل سننے والے حفاظ نے یونہی بیان کیا ہے، جن میں ثوری، شعبہ اور زہیر شامل ہیں، چنانچہ ان کی بیان کردہ روایت میں "ثم لم یعد" کے الفاظ نہیں ہیں]

اور تخریج ہدایہ میں ہے:"وقال عبد الله بن أحمد: كان أبي ينكر حديث الحكم وعيسىٰ، ويقول: إنما هو حديث يزيد"[1] [عبداللہ بن احمد نے کہا ہے: میرے والد حکم اور عیسیٰ کی روایت کردہ حدیث کا انکار کرتے تھے اور فرماتے: وہ تو یزید کی بیان کردہ حدیث ہے] پس ان عبارات سے صاف ظاہر و باہر ہوا کہ یہ حدیث منقطع ہے، اس لیے کہ یزید بن ابی زیاد کا واسطہ چھوٹ گیا ہے اور بہ سبب اسی انقطاع کے ابو داود نے کہا: "هذا حديث ليس بصحيح" [یہ حدیث صحیح نہیں ہے] مختصر العلل میں ہے:

"قال عبد اللّٰه: سألت أبي (أحمد بن حنبل) عن حديث البراء في الرفع يعني الذي يرويه يزيد بن أبي زياد، فقال: لم يكن يزيد بن أبي زياد بحافظ، وقد رواه وكيع سمعه من ابن أبي ليلىٰ عن الحكم وعيسىٰ عن عبد الرحمن بن أبي ليلىٰ، وكان أبي يقول: إنما هو حديث بن أبي زياد و ابن أبي لبلىٰ سيئ الحفظ، و حدثني قال: نظرت في كتاب ابن أبي ليلىٰ إذا هو يرويه عن يزيد بن أبي زيادة، وقال أبي: كان سفيان بن عيينة يقول: سمعناه عن يزيد هكذا، ثم قدمت الكوفة، فإذا هو يقول: ثم لا يعود"[2] انتهى ما في المختصر.

[عبداللہ نے کہا: میں نے اپنے باپ (احمد بن حنبل) سے رفع یدین کے بارے میں براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے متعلق دریافت کیا، یعنی وہ جس کو یزید بن ابی زیاد بیان کرتے ہیں تو انھوں نے کہا: یزید بن ابی زیادہ حافظ نہیں تھے۔ اس کو وکیع نے روایت کیا ہے۔ انھوں نے اس کو ابن ابی لیلیٰ سے سنا ہے، انھوں نے حکم اور عیسیٰ سے اور انھوں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے۔ میرا والد کہا کرتا تھا: یہ ابن ابی زیاد سے مروی حدیث ہے۔ رہا ابن ابی لیلیٰ تو وہ سیئ الحفظ ہے۔ انھوں نے مجھے بیان کرتے ہوئے کہا: میں نے ابن ابی لیلیٰ کی کتاب دیکھی تو اس میں تھا کہ وہ اس کو یزید بن ابی زیاد سے بیان کرتے ہیں۔ نیز میرے والد نے کہا: سفیان بن عیینہ کہا کرتے تھے: ہم نے اس کو یزید سے اسی طرح ("ثم لا یعود" کی زیادتی کے بغیر) سنا۔ پھر جب میں کوفے میں آیا تو وہ "ثم لا یعود" کے الفاظ بیان کر رہے تھے]

اور دلیل پکڑنا احناف کا قول عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما سے جو نہایہ میں مسطور ہے اور وہ یہ ہے:

---

[1] نصب الراية (١/ ٤٠٤)

[2] كتاب العلل و معرفة الرجال (١/ ٣٦٨)

"إن عبد الله بن الزبير رأى رجلا يصلي في المسجد الحرام، ويرفع يديه عند الركوع وعند رفع الرأس منه فقال: لا تفعل، إنه أمر فعله رسول اللهﷺ في أول الإسلام ثم تركه ونسخ"[1]

[عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو مسجد حرام میں یوں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ وہ رکوع جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اُٹھاتے ہوئے رفع یدین کر رہا تھا تو انھوں (ابن زبیر) نے کہا: ایسا مت کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے شروع اسلام میں یہ کام کیا، پھر اسے ترک کر دیا اور یہ منسوخ ہوگیا]

جائز نہیں دو وجہ سے: ایک تو یہ کہ یہ روایت نزدیک محدثین کے ثابت نہیں اور نہ کسی حدیث کی کتاب میں بسند صحیح منقول ہے۔ دوسرے یہ کہ فعل عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کا اس کے خلاف پایا گیا ہے، چناں چہ امام بخاری نے "جزء رفع اليدين" میں عطا سے روایت کیا ہے:

"عن عطاء قال رأيت جابر بن عبد الله وأبا سعيد الخدري و ابن عباس و ابن زبير يرفعون أيديهم حين يفتتحون الصلاة وإذا ركعوا وإذا رفعوا رؤوسهم من الركوع"[2] انتهى

[عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ وہ نماز شروع کرتے وقت، رکوع جاتے وقت اور رکوع سے سر اُٹھاتے وقت اپنے ہاتھ اُٹھاتے تھے]

امام ابو داود نے بطریق میمون المکی کے روایت کیا ہے کہ انھوں نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ رفع یدین کرتے تھے۔[3] ابن الجوزی کتاب التحقیق میں فرماتا ہے:

"وزعمت الحنفية أن أحاديث الرفع منسوخة بحديثين: أحدهما عن ابن عباس قال: كان رسول اللهﷺ يرفع يديه كلما ركع، وكلما رفع، ثم صار إلى افتتاح الصلاة، وترك ما سوى ذلك، والثاني رواه عن ابن الزبير أنه رأى رجلا يرفع يديه من الركوع فقال: مه! فإن هذا الشيئ فعله رسول اللهﷺ ثم تركه، قال: وهذان الحديثان لا يعرفان أصلا، وإنما المحفوظ عن ابن عباس وابن الزبير خلاف ذلك، فأخرجه أبو داود عن ميمون المكي أنه رأى ابن الزبير وصلى بهم يشير بكفيه حين يقوم و حين يركع وحين يسجد، قال: قد ثبت إلى ابن عباس فأحسن بذلك، فقال: إن أحببت أن تنظر إلى صلاة رسول اللهﷺ فاقتد بصلاة عبد الله بن الزبير، ولو صح

[1] التحقيق لابن الجوزي (١/ ٣٣٢)

[2] جزء رفع اليدين (ص: ٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٣٩)

ذلك لم يصح دعوى النسخ، لأن من شرط الناسخ أن يكون أقوى من المنسوخ"[1]
انتهى ما في التحقيق لابن الجوزي.

[حنفیہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ رفع یدین کی احادیث دو حدیثوں کے ساتھ منسوخ ہیں، چناں چہ انھوں نے ان میں سے ایک حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکوع جاتے اور اُٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے، پھر آپ ﷺ نے اس کو شروع نماز میں رکھا اور باقی کو چھوڑ دیا۔ دوسری روایت کو انھوں نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا، جو رکوع سے اُٹھتے وقت رفع یدین کرتا تھا تو انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے پہلے پہل ایسا کیا، پھر اس کو ترک کر دیا۔ یہ دونوں حدیثیں بالکل معروف نہیں ہیں، جب کہ ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے اس کے برخلاف روایات محفوظ ہیں۔ چناں چہ ابو داود نے میمون المکی سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو اس وقت دیکھا، جب وہ ان کو نماز پڑھا رہے تھے، وہ اپنی ہتھیلیوں سے نماز کے لیے کھڑے ہوتے، رکوع جاتے اور سجدہ کرتے وقت اشارہ کرتے تھے (یعنی رفع یدین کرتے تھے) کہا: میمون نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تحقیق کی تو انھوں نے اس کو مستحسن قرار دیا اور فرمایا: اگر تو رسول اللہ ﷺ کی نماز دیکھنا چاہتا ہے تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی نماز کی اقتدا کر۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو نسخ والا دعویٰ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ناسخ کی شرط یہ ہے کہ وہ منسوخ سے زیادہ قوی ہو]

اور دلیل پکڑنا ساتھ حدیث: «لا ترفعوا الأيدي إلا في سبع مواطن: تكبيرة الافتتاح وتكبيرة القنوت وتكبيرة العيدين» الحديث. کے۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے، باطل ہے۔ حافظ ابن حجر "تخریج ہدایہ" میں فرماتے ہیں:

"لم أجده هكذا بصيغة الحصر، ولا بذكر القنوت، ولا بتكبيرة العيدين، وإنما أخرج البزار و البيهقي من طريق ابن أبي ليلىٰ عن نافع عن ابن عمر، وعن الحكم عن مقسم عن ابن عباس مرفوعاً و موقوفاً: لا ترفعوا الأيدي إلا في سبع مواطن في افتتاح الصلاة واستقبال القبلة وعلىٰ الصفا والمروة وبعرفات وبجمع وفي المقامين وعند الجمرتين، وفي رواية موقفين بدل المقامين، وذكره البخاري في رفع اليدين بالمفرد تعليقاً قال: وقال وكيع عن ابن أبي ليلىٰ فذكر بلفظ لا ترفعوا الأيدي إلا في سبع مواطن افتتاح الصلاة وفي استقبال القبلة فذكر الباقي مثله ثم قال: قال شعبة: لم يسمع الحكم من مقسم إلا أربعة أحاديث، ليس فيها هذا الحديث، وليس هذا من

[1] التحقيق في أحاديث الخلاف (١/ ٣٣٢)

المحفوظ عن النبيﷺ. انتهى

"وقد أخرجه الرافعي من رواية ابن جريج عن المقسم فذكر نحوه، وهكذا أخرجه الطبراني من طريق محمد بن عمران بن أبي ليلىٰ عن أبيه أبي ليلىٰ به، وأخرج ابن أبي شيبة عن ابن فضيل عن عطاء بن السائب عن سعيد بن جبير عن ابن عباس موقوفاً، وأخرج الطبراني من رواية ورقاء عن عطاء مرفوعاً بلفظ: السجود على سبعة الأعضاء فذكره ثم قال: وترفع الأيدي إذا رأيت البيت وعلىٰ الصفا والمروة وبعرفة وعند رمي الجمار وإذا قمت إلى الصلاة"[1] انتهى ما في الدراية تخريج الهداية.

[مجھے یہ روایت اس طرح حصر کے صیغے کے ساتھ ملی ہے اور نہ قنوت کے ذکر کے ساتھ اور نہ ہی تکبیراتِ عیدین کے ساتھ، وہ تو صرف امام بزار اور بیہقی رحمہ اللہ نے ابن ابی لیلیٰ کے طریق سے بیان کی ہے، انھوں نے نافع سے، انھوں نے ابن عمرو سے، انھوں نے حکم سے، انھوں نے مقسم سے، انھوں نے ابن عباس سے مرفوعاً اور موقوفاً بیان کیا ہے کہ صرف سات جگہوں میں ہاتھ اُٹھاؤ: نماز کے شروع میں، استقبالِ قبلہ کے وقت، صفا و مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، دو مقاموں میں اور دو جمروں کے پاس اور ایک روایت میں "مقامین" کے بدلے "موقفین" کے الفاظ ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے جزء رفع الیدین میں اسے مفرد کے صیغے سے تعلیقاً ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے: وکیع نے ابن ابی لیلیٰ سے بیان کیا ہے اور ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: صرف سات جگہوں میں ہاتھ اُٹھاؤ: نماز کے شروع میں اور استقبالِ قبلہ کے وقت اور پھر باقی کی جگہیں اسی طرح بیان کی ہیں اور پھر کہا ہے: شعبہ کا کہنا ہے کہ حکم نے مقسم سے صرف چار احادیث سنی ہیں، جن میں یہ حدیث نہیں ہے اور نہ یہ حدیث نبی مکرم ﷺ سے محفوظ ہے۔ انتہی.

امام رافعی نے اس کو ابن جریج کی روایت سے مقسم سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ اسی طرح امام طبرانی رحمہ اللہ نے اسے محمد بن عمران بن ابی لیلیٰ عن ابیہ عن ابن ابی لیلیٰ کے طریق سے بیان کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اس کو عن ابن فضیل عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس کے طریق سے موقوفاً بیان کیا ہے۔ طبرانی نے اسے ورقا کی روایت سے عطا سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً بیان کیا ہے کہ سجدہ سات اعضا پر ہوتا ہے۔ پھر ان کو ذکر فرمایا اور پھر کہا: تو ہاتھوں کو اُٹھائے گا، جب تو بیت اللہ کو دیکھے، صفا و مروہ پر، عرفہ میں، رمیِ جمار کے وقت اور جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو]

الغرض یہ حدیث بجمیع طرق منقطع ہے یا موقوف ہے، خواہ طریق عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عن الحکم عن المقسم عن ابن عباس سے مروی ہو، خواہ کسی اور سلسلہ اور اسناد سے، اس لیے کہ سماع حکم راویِ حدیث مذکور کا مقسم سے ثابت نہیں، جیسا کہ عبارت تخریج ہدایہ میں شعبہ سے نقل کیا گیا ہے اور حدیث منقطع اور موقوف پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں

[1] الدراية لابن حجر (١/ ١٤٨)

اور قطع نظر حدیث موقوف اور منقطع ہونے سے حنفیوں کے نزدیک رفع الایدی آٹھ یا نو جگہ پائی گئی۔ اگر حدیث مذکور صحیح ہوتی تو خلاف اس کا کیوں کرتے؟ چناں چہ طحطاوی میں لکھا ہے:

قوله: كما ورد "أي في حديث الطبراني من طريق ابن عباس عن النبيﷺ قال: لا ترفعوا الأيدي إلا في سبع مواطن حين يفتتح الصلاة وحين يدخل المسجد الحرام فينظر البيت وحين يقوم علىٰ الصفا وحين يقوم علىٰ المروة وحين يقف مع الناس عشية عرفة وبجمع والمقامين حين يرمي الجمرة كذا في إمداد الفتاح، ولم يذكر في حديث رفع القنوت والعيد والاستيلام فالدليل المذكور لم يتم، ولها أدلة أخرىٰ" انتهى ما في الطحطاوي.

[اس کا قول جیسے وارد ہوا ہے، یعنی طبرانی کی حدیث میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے، وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صرف سات جگہوں میں ہاتھوں کو اُٹھاؤ: جب وہ نماز شروع کرے، جب وہ مسجد حرام میں داخل ہو اور بیت اللہ پر نظر پڑے، جب وہ صفا پر کھڑا ہو، جب وہ مروہ پر کھڑا ہو، جب وہ لوگوں کے ساتھ عرفہ کی شام وقوف کرے، مزدلفہ میں اور رمیِ جمار کے وقت دو مقاموں میں۔ امداد الفتاح میں ایسے ہی ہے۔ اس حدیث میں قنوت، عید اور استیلام کے وقت رفع یدین کا ذکر نہیں ہوا۔ مذکورہ دلیل مکمل نہیں ہے، اس کے دیگر دلائل ہیں]

دیکھیے اگر صفا اور مروہ بالفرض ایک ہی مانا جائے تو بھی نو سے نہیں۔ پس حجت پکڑنا احناف کرام کا ساتھ اس حدیث کے باطل ہوا۔ كما لا يخفى على من له أدنىٰ فطانة في العلم. اور دلیل پکڑنا ساتھ حدیث جابر بن سمرہ کے، جو روایت کیا ہے امام مسلم نے اور وہ حدیث یہ ہے:

عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ قال: خرج علينا رسول اللهﷺ فقال: «ما لي أراكم رافعي أيديكم كأنها أذناب خيل شمس اسكنوا في الصلاة»[1] الحديث

[جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: مجھے کیا ہے کہ میں تمھیں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ اُٹھاتے ہو، جیسے سرکش گھوڑوں کی دُمیں ہیں۔ نماز میں سکون اختیار کرو]

باطل ہے، اس واسطے کہ یہ رفع یدین وہ نہیں ہے، جو اوپر مذکور ہوا، بلکہ یہ رفع یدین وہ ہے کہ جب لوگ سلام دائیں اور بائیں کرتے تھے تو ہاتھوں سے اشارہ کرتے تھے اور چوں کہ یہ فعل منافی خشوع و خضوع تھا، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، چنانچہ دوسری روایت میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی یہ آیا ہے:

"قال: كنا إذا صلينا مع رسول اللهﷺ قلنا: السلام عليكم ورحمة الله والسلام عليكم

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣٠)

ورحمة الله، وأشار بيده إلى الجانبين، فقال رسول اللهﷺ: علام تؤمنون بأيديكم كأنها أذناب خيل شمس؟ إنما يكفي أحدكم أن يضع يده على فخذه، ثم يسلم على أخيه من على يمينه وشماله"[1]

[فرمایا: جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے تو ہم کہتے تھے:"السلام عليكم ورحمة الله، السلام عليكم ورحمة الله" اور دونوں جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے ہاتھوں سے یوں اشارہ کرتے ہو، گویا وہ سرکش گھوڑوں کی دُمیں ہیں، تمھارے ہر ایک کو یہی کافی ہے کہ وہ اپنا ہاتھ اپنی ران پر رکھے، پھر دائیں اور بائیں اپنے بھائیوں کو سلام کہے]

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں اس حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

"والمراد بالرفع المنهي عنه ههنا رفعهم أيديهم عند السلام مشيرين إلى السلام من الجانبين، كما صرح به في الرواية الثانية"[2] انتهى كلامه

[اس حدیث میں جو ہاتھ اُٹھانے سے منع کیا گیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سلام پھیرتے وقت اپنے ہاتھ اُٹھاتے تھے اور سلام کے ساتھ (دائیں اور بائیں) دونوں جانب اشارہ کرتے تھے، جیسا کہ دوسری روایت میں اس کی صراحت کی گئی ہے]

چونکہ یہ رفع یدین ما سوا ہے رفع یدین اول کے، اس لیے اس کو باب التشہد میں ذکر کیا۔ اگر مان بھی لیا جائے تو لازم آئے گا خصم پر باطل اور منہی ہونا رفع یدین وقت تکبیر تحریمہ اور عیدین کا۔ امام بخاری ''جزء رفع الیدین'' میں فرماتے ہیں:

"فأما احتجاج بعض من لا يعلم بحديث وكيع عن الأعمش عن المسيب بن رافع عن تميم بن طرفة عن جابر بن سمرةؓ قال: دخل علينا النبيﷺ ونحن رافعو أيدينا في الصلاة، فقال: ما لي أراكم رافعي أيديكم كأنها أذناب خيل شمس؟ اسكنوا في الصلاة، فإنما كان هذا في التشهد لا في القيام، كان يسلم بعضهم على بعض، فنهى النبيﷺ عن رفع الأيدي في التشهد، ولا يحتج بهذا من له حظ من العلم، هذا معروف مشهور لا اختلاف فيه، ولو كان كما ذهب إليه لكان رفع الأيدي في أول التكبيرة وأيضاً بتكبيرات صلاة العيد منهي عنها، لأنه لم يستثن رفعا دون رفع"[3] انتهى كلامه

[وکیع کی اعمش سے، ان کی مسیّب بن رافع سے، ان کی تمیم بن طرفہ سے اور ان کی جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣١)

[2] شرح صحيح مسلم (٤/ ١٥٣)

[3] جزء رفع اليدين (ص: ١...)

مروی حدیث، جس میں وہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم نماز میں (سلام پھیرتے وقت) اپنے ہاتھوں کو اُٹھائے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے کیا ہے کہ میں تمھیں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ اُٹھاتے ہو، جیسے سرکش گھوڑوں کی دُمیں ہوتی ہیں، نماز میں سکون اختیار کرو۔'' سے بعض نہ جاننے والوں نے احتجاج کیا ہے (مگر ان کا یہ احتجاج درست نہیں ہے) اس لیے کہ ان کا یوں ہاتھ اُٹھانا تشہد میں تھا نہ کہ قیام میں۔ وہ ایک دوسرے کو سلام کہتے تھے تو نبی مکرم ﷺ نے تشہد میں ہاتھ اُٹھانے سے منع کر دیا، جس کو علم کا تھوڑا سا بھی حصہ ملا ہے، وہ اس سے (ترکِ رفع پر) احتجاج نہیں کرتا ہے۔ چناں چہ یہ بات معروف و مشہور ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اگر مذکورہ حدیث کا یہی مطلب ہوتا تو پھر تکبیر تحریمہ کے وقت نیز عیدین کی تکبیرات میں بھی ہاتھوں کو اُٹھانا منع ہوتا، کیوں کہ مذکورہ روایت کسی رفع یدین کو مستثنیٰ نہیں کرتی]

پس دعویٰ کرنا احناف کرام کا کہ حدیث رفع یدین کی منسوخ ہے، دعویٰ بلا دلیل ہے۔ کما عرفت منا سابقاً، اور فقہائے محققین نے بھی اس کے ثبوت اور سنت ہونے کا اقرار کیا ہے۔ دیکھو مولانا عبد العلی حنفی لکھنوی ارکانِ اربعہ میں فرماتے ہیں: ''إن ترك فهو حسن، وإن فعل فلا بأس به'' انتہیٰ کلامہ. [اگر وہ چھوڑ دے تو اچھا ہے اور اگر کرے تو کوئی حرج نہیں ہے] شیخ عبد الحق محدث دہلوی شرح سفر السعادۃ میں فرماتے ہیں: ''پس چارہ نیست لکن اکثر فقہاء و محدثین اثبات آں میکنند'' انتہی [پس کوئی چارہ نہیں ہے، لیکن اکثر فقہاء و محدثین اس کا اثبات کرتے ہیں] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ''حجة الله البالغة'' میں فرماتے ہیں:

''والذي يرفع أحب إلي ممن لا يرفع، لأن أحاديث الرفع أكثر وأثبت''① انتهى كلامه.

[جو رفع یدین کرتا ہے، وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے، جو رفع یدین نہیں کرتا، کیوں کہ رفع یدین کی احادیث زیادہ ہیں اور زیادہ ثابت شدہ ہیں]

حاصل ان عبارات کا یہ ہے کہ رفع یدین کا کرنا سنت ہے اور یہی مذہب ہے تمام محدثین قدیماً و حدیثاً کا، جیسا کہ اوپر گزرا اور جو شخص باوجود اس تحقیق کے از راہِ حمیت مذہبی کے منکر ہو تو وہ داخل ہے، تحت اس آیتِ کریمہ کے:

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ [النساء: ١١٥]

[اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے، ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے، جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے]

① حجة الله البالغة (٢/ ١٠)

اور جو شخص طعن کرے حدیثِ رفع یدین پر، وہ بلاشبہہ بدعتی ہے، اس لیے کہ روایت کیا اس حدیث کو بخاری و مسلم نے اور جو شخص کہ ان دونوں کتابوں کی حدیثوں پر طعن کرے وہ بدعتی ہے، چناں چہ شاہ ولی اللہ صاحب "حجة الله البالغة" میں فرماتے ہیں:

"أما الصحيحان فقد اتفق المحدثون على أن جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع، وأنهما متواتران إلى مصنفيهما وأنه كل من هون أمرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المؤمنين"[1] انتهى كلامه

[جہاں تک بخاری و مسلم کا تعلق ہے تو محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ اس کی تمام متصل و مرفوع احادیث قطعی طور پر صحیح ہیں اور یہ دونوں کتابیں اپنے اپنے مصنف تک متواتر ہیں، جس شخص نے ان دونوں کی توہین سمجھی، وہ مبتدع ہے اور مومنوں کے سوا غیروں کی راہ کا متبع ہے]

امام بخاری "جزء رفع الیدین" میں فرماتے ہیں:

"من زعم أن رفع الأيدي بدعة، فقد طعن في أصحاب النبيﷺ والسلف ومن بعدهم وأهل الحجاز وأهل المدينة وأهل مكة وعدة من أهل العراق وأهل الشام وأهل اليمن وعلماء أهل خراسان منهم ابن المبارك حتى شيوخنا عيسىٰ بن موسىٰ أبو أحمد وكعب بن سعيد و الحسن بن جعفر و محمد بن سلام" انتهى كلامه

[جس شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ رفع یدین کرنا بدعت ہے تو یقیناً اس نے نبی مکرم ﷺ کے اصحاب، سلف صالحین، ان کے بعد کے لوگوں، اہلِ حجاز، اہلِ مدینہ، اہلِ مکہ، کئی ایک اہلِ عراق، اہلِ شام، اہلِ یمن اور علماے اہلِ خراسان، جن میں ابن مبارک حتی کہ ہمارے شیوخ عیسیٰ بن موسیٰ، ابو احمد، کعب بن سعید، حسن بن جعفر اور محمد بن سلام رحمہم اللہ شامل ہیں، ان پر طعن کیا]

آیندہ توفیق فہم من اللہ ہے اور وہی مرشد و ہادی حقیقی ہے۔ ﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾ والله أعلم بالصواب.

جواب سوالِ دوم:

آمین بآواز بلند کہنا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے، دلیل جمہور کی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے، جو روایت کی ہے ابو داود رحمہ اللہ نے:

"عن أبي هريرة رضي الله عنه كانﷺ إذا تلا غير المغضوب عليهم ولا الضآلين، قال: آمين،

[1] حجة الله البالغة (ص: ٢٨١)

حتى يسمع من يليه من الصف الأول"[1] هكذا في المحلى شرح الموطأ لمولانا سلام الله الحنفي من أولاد الشيخ عبد الحق محدث دهلوي.

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِم وَلَا الضَّالِيْنَ﴾ پڑھتے تو آمین کہتے، حتی کہ صفِ اول کے لوگ، جو آپ کے قریب ہوتے، آپ کی آواز سن لیتے]

امام ابو داود رحمہ اللہ نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

"عن وائل بن حجر قال: كان رسول الله ﷺ إذا قرأ غير المغضوب عليهم قال: آمين، ورفع بها صوته"[2]

[وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِم وَلَا الضَّالِيْنَ﴾ پڑھتے تو آمین کہتے اور اس کے ساتھ آواز بلند کرتے]

اور بلوغ المرام میں ہے:

"عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا فرغ من قراءة أم القرآن رفع صوته، وقال: آمين، رواه الدارقطني، و حسنه، والحاكم وصححه"[3] انتهى ما في بلوغ المرام لابن حجر العسقلاني.

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُم القرآن (سورۃ الفاتحہ) کی قراءت سے فارغ ہوتے تو بلند آواز کے ساتھ آمین کہتے۔ اسے امام دارقطنی نے بیان کیا اور اسے حسن کہا۔ نیز حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا ہے]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے عطا سے روایت کیا ہے:

"قال: أدركت مئتين من أصحاب النبي ﷺ في هذا المسجد، إذا قال الإمام: ولا الضالين، سمعت لهم رجة بآمين"[4]

[میں نے اس مسجد میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا ہے کہ جب امام ﴿وَلَا الضَّالِيْنَ﴾ کہتا تو میں نے سنا کہ ان کے آمین کہنے سے گونج پیدا ہوجاتی]

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٣٤) اس کی سند میں بشر بن رافع اور ابن عم ابی ہریرہ ضعیف ہیں۔
2. سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٣٢)
3. سنن الدارقطني (١/ ٣٣٥) المستدرك (١/ ٢٢٣) بلوغ المرام، رقم الحديث (٢٨١)
4. سنن البيهقي (٢/ ٥٩)

"عن عائشة عن النبيﷺ قال: ما حسدتكم اليهود على شيئ ما حسدتكم على السلام والتأمين"[1]

[سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: یہودی تم سے کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے، جتنا سلام اور آمین کہنے پر تم سے حسد کرتے ہیں]

اور حدیث وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو روایت کیا ترمذی نے بھی اور کہا ترمذی نے:

"حديث وائل بن حجر رضي الله عنه حديث حسن، وبه يقول غير واحد من أهل العلم من أصحاب النبيﷺ والتابعين ومن بعدهم، يرون أن يرفع الرجل صوته بآمين، ولا يخفيها، وبه يقول الشافعي وأحمد وإسحاق"[2]

[وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث، حسن ہے۔ نبی مکرم ﷺ کے اصحاب، تابعین اور اتباع التابعین میں سے کئی اہلِ علم اس کے قائل ہیں۔ ان سب کا یہ موقف تھا کہ آدمی آمین کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے اور اسے پست نہ کرے۔ امام شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں]

اور حدیث «خفض بها صوته» کی جو روایت کیا ہے ترمذی نے، خطا کیا ہے شعبہ نے کئی بات میں، چنانچہ ترمذی خود کہتا ہے:

"سمعت محمداً يقول: حديث سفيان أصح من حديث شعبة في هذا، وأخطأ شعبة في مواضع من هذا الحديث فقال: عن حجر أبي العنبس، وإنما هو حجر بن العنبس، ويكنى أبا سكن، وزاد فيه علقمة بن وائل، وليس فيه عن علقمة بن وائل، و إنما هو عن حجر بن عنبس، عن وائل بن حجر، وقال: وخفض بها صوته، وإنما هو مد بها صوته"[3] انتهى

[میں نے امام محمد (بن اسماعیل البخاری) کو یہ کہتے ہوئے سنا: اس سلسلے میں سفیان کی حدیث شعبہ کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ شعبہ نے اس حدیث میں کئی جگہ غلطی کی ہے: چناں چہ اس نے کہا ہے: "عن حجر أبي العنبس" جب کہ اصل میں یہ "حجر بن العنبس" ہے اور اس کی کنیت ابوسکن ہے۔ اس نے اس کی سند میں علقمہ بن وائل کا اضافہ کر دیا ہے، حالاں کہ اس میں علقمہ بن وائل نہیں ہے۔ یہ تو حجر بن عنبس سے مروی ہے، جو وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں۔ نیز اس نے اس حدیث میں یہ لفظ بیان کیے ہیں: "خفض بها صوته" (انھوں نے اس (آمین) کے ساتھ آواز کو پست کیا) جب کہ

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٥٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨)

اصل الفاظ یہ ہیں: "مد بها صوته" (انھوں نے اس کے ساتھ آواز کو بلند کیا)]

اور یہ بھی معلوم رہے کہ علقمہ کا سماع وائل سے ثابت نہیں ہے، پس یہ حدیث منقطع ہوئی اور حدیث منقطع قابلِ احتجاج نہیں۔ حافظ ابنِ حجر "تهذيب التهذيب" میں فرماتے ہیں:

"علقمة بن وائل بن حجر الحضرمي الكندي الكوفي، روى عن أبيه والمغيرة بن شعبة وطارق بن سويد على خلاف فيه، وعنه أخوه عبد الجبار و ابن أخيه سعيد بن عبد الجبار و عبد الملك بن عمير و عمرو بن مرة وسماك بن حرب وإسماعيل بن سالم و جامع بن مطر و سلمة بن كهيل و موسىٰ بن عمير العنبري و قيس بن سليم العنبري و أبو عمرو العابدي، ذكره ابن حبان في الثقات، قلت: ذكره ابن سعد في الطبقة الثالثة من أهل الكوفة، وقال: كان ثقة قليل الحديث، وحكى العسكري عن ابن معين أنه قال: علقمة بن وائل عن أبيه مرسل"[1] انتهى ما في تهذيب التهذيب.

[علقمہ بن وائل بن حجر حضرمی کندی نے اپنے والد اور مغیرہ بن شعبہ اور طارق بن سوید سے (اس میں اختلاف ہے) روایت کی ہے اور ان سے ان کے بھائی عبد الجبار اور ان کے بھتیجے سعید بن عبد الجبار، عبد الملک بن عمیر، عمرو بن مرہ، سماک بن حرب، اسماعیل بن سالم، جامع بن مطر، سلمہ بن کہیل، موسیٰ بن عمیر عنبری، قیس بن سلیم عنبری اور ابو عمرو عابدی نے روایت کی ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ میں کہتا ہوں: ابن سعد نے انھیں اہلِ کوفہ سے تیسرے طبقے میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: وہ ثقہ اور قلیل الحدیث تھے۔ عسکری نے ابن معین سے یہ حکایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا ہے: "علقمة بن وائل عن أبيه" مرسل ہے]

امام نووی "تهذيب الأسماء" میں فرماتے ہیں:

"علقمة بن وائل المذكور في المهذب في أول باب الإقطاع من كتاب إحياء الموات هو علقمة بن وائل بن حجر الحضرمي الكوفي أبوه صحابي وهو تابعي، روى عن أبيه والمغيرة بن شعبة وطارق بن سويد، روى عنه سماك بن حرب و عبد الملك بن عمير وغيرهم، وهو ثقة بالاتفاق، قال يحيىٰ بن معين: وروايته ورواية أخيه عبد الجبار عن أبيهما مرسلة لم يدركاه"[2] انتهى

[علقمہ بن وائل جو "المهذب" کی کتاب "إحياء الموات" کے "باب الإقطاع" کے شروع میں مذکور ہے، وہ علقمہ بن وائل بن حجر حضرمی کوفی ہے۔ ان کا والد صحابی اور وہ خود تابعی ہے۔ انھوں نے اپنے والد،

[1] تهذيب التهذيب (٧/ ٢٤٧)

[2] تهذيب الأسماء واللغات (١/ ٤٨١)

مغیرہ بن شعبہ اور طارق بن سوید سے روایت کی ہے، جب کہ ان سے سماک بن حرب اور عبد الملک بن عمیر وغیرہ نے روایت کی ہے، وہ بالاتفاق ثقہ ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے: ان کی روایت اور اس کے بھائی عبد الجبار کی اپنے باپ سے روایت مرسل ہے، کیوں کہ انھوں نے اس کو نہیں پایا ہے]

اور ابن الہمام بھی عدمِ سماع کا قائل ہے۔ كذا في فتح القدير[1]۔ اور حدیث «أخفى بها صوته» کی، جو روایت کیا ہے حاکم نے، سو ضعیف کہا ہے اس کو مولانا بحر العلوم نے ارکانِ اربعہ میں:

"أما جهر التأمين للإمام والمأموم فلما روى مسلم عن أبي هريرة قال: قال رسول اللهﷺ «إذا أمن الإمام فأمنوا، فإنه من وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه » وأما إسرار التابعين فهو مذهبنا، ولم يرو فيه إلا ما روى الحاكم عن علقمة بن وائل عن أبيه أنهﷺ إذا بلغ ولا الضالين قال: آمين وأخفى بها صوته، وهو ضعيف، وقد بين في فتح القدير وجه ضعفه لكن الأمر فيه سهل، فإن السنة التأمين، أما الجهر والإخفاء فندب" انتهى كلامه.

[امام اور مقتدی کا جہری آواز کے ساتھ آمین کہنے کی دلیل وہ ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیوں کہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق (ساتھ) ہوگئی، اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔" رہا تابعین کا مخفی آواز میں آمین کہنا، جو ہمارا مذہب ہے، تو اس بارے میں صرف وہی روایت مروی ہے، جس کو امام حاکم رحمہ اللہ نے علقمہ بن وائل عن ابیہ سے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ جب ﴿وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ تک پہنچے تو آمین کہا اور اس کے ساتھ آواز کو پست کیا۔ یہ روایت ضعیف ہے۔ چناں چہ "فتح القدیر" میں اس کی وجۂ ضعف بیان کی گئی ہے، لیکن اس کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت آسان ہے اور وہ یہ ہے کہ آمین کہنا سنت ہے۔ رہا اس کو جہری یا مخفی کہنا تو وہ مندوب ہے]

مولانا محمد اسماعیل شہید "تنوير العينين" میں فرماتے ہیں:

"والتحقيق أن الجهر بالتأمين أولىٰ من خفضه" انتهى كلامه

حاصل یہ ہے کہ آہستہ آمین کہنے کے باب میں کوئی حدیث صحیح ثابت نہیں ہوئی، جیسا کہ معلوم ہوا۔ واللّٰہ أعلم بالصواب وإليه المرجع والمآب.

حرره الراجي رحمة ربه القوي أبو المكارم محمد على صانه الله من شر كل غبي وغوي.

ابو المکارم محمد علی (۱۲۹۹ھ) خادمِ شریعتِ رسول الثقلین محمد تلطف حسین (۱۲۹۲ھ)

---

[1] فتح القدير (۱/ ۲۹۵)

محمد نذیر حسین (۱۲۸۱ھ)	زشرف سید کونین شد شریف حسین (۱۲۹۳ھ)
سید احمد حسن (۱۲۸۹ھ)	محمد بن محمد عبداللہ (۱۲۹۸ھ)
محمد عبدالحمید (۱۲۹۳ھ)	المعتصم بحبل اللہ الاحد ابوالبرکات حافظ محمد (۱۲۹۲ھ)
محمد عبدالغفار (۱۲۸۸ھ)	محمد عبدالعزیز (۱۲۸۸ھ)
شہاب الدین (۱۲۸۸ھ)	محمد عبداللہ (۱۲۹۱ھ)

نماز میں سورت فاتحہ کی فرضیت[1]:

سوال کیا فرماتے ہیں علماے دین اس مسئلے میں کہ سورت فاتحہ کا پڑھنا حدیثوں سے ثابت ہے یا نہیں اور بدون پڑھے ہوئے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

جواب سورت فاتحہ کا پڑھنا امام کے پیچھے احادیثِ صحیحہ و اخبارِ مرفوعہ سے ثابت ہے اور بدون پڑھے ہوئے نماز نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: «لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب»[2]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ہوتی نماز اس شخص کی، جو سورت فاتحہ نہ پڑھے۔

لفظ ''مَنْ'' کا عام ہے، جو امام اور مقتدی دونوں کو شامل ہے، اسی واسطے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں باب باندھا ہے:

"باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلوات كلها في الحضر والسفر وما يجهر فيها وما يخافت"

یعنی باب واجب ہونے قراءت کا امام اور مقتدی کے ہر نمازوں میں بیچ گھر کے اور سفر کے اور اُن نمازوں میں جن میں پکار کر پڑھی جاتی ہے قراءت اور جن میں آہستہ پڑھی جاتی ہے قراءت۔

نیز صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: «من صلىٰ صلاة لم يقرأ فيها بأم القرآن فهي خداج ثلاثا غير تمام»[3]

یعنی روایت ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے کوئی ایسی نماز پڑھی کہ اس میں سورت فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے۔''

---

[1] فتاویٰ مولانا ابوالمکارم مئوی (ص:۱)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٥)

صحیح مسلم میں ابو السائب رحمہ اللہ سے یوں مروی ہے:

عن أبي السائب أنه قال: قلت لأبي هريرة: إني أكون أحيانا وراء الإمام؟ قال: "اقرأ بها في نفسك يا فارسي"[1]

[ابو السائب سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو عرض کی: بعض اوقات میں امام کے پیچھے ہوتا ہوں تو انھوں نے جواب دیا: اے فارسی! اس کو اپنے دل میں پڑھو]

سنن ترمذی اور ابوداود میں نے یوں روایت کی ہے:

عن عبادة بن الصامت قال: كنا خلف النبي ﷺ في صلاة الفجر فثقلت عليه القراءة فلما فرغ، قال: «لعلكم تقرؤون خلف إمامكم؟» قلنا: نعم يا رسول الله! قال: «لا تفعلوا إلا بفاتحة الكتاب فإنه لا صلاة لمن لم يقرأ بها»[2] (رواه الترمذي و أبو داود)

''عبادہ بن صامت نے کہا کہ تھے ہم پیچھے نبی ﷺ کے نمازِ فجر میں، پس پڑھا حضرت نے قرآن، پس بھاری ہوا اُن پر پڑھنا، پس جب پڑھ چکے نماز، فرمایا: ''شاید کہ تم پڑھتے ہو پیچھے امام اپنے کے؟'' کہا ہم نے: ہاں، اے رسول خدا کے! فرمایا: ''نہ کیا کرو تم، یعنی نہ پڑھا کرو کچھ مگر سورت فاتحہ۔ پس تحقیق نہیں ہوتی نماز اس شخص کی جو نہ پڑھے سورت فاتحہ۔''

وقال الترمذي: حديث عبادة حديث حسن وروى هذا الحديث الزهري عن محمود بن الربيع عن عبادة بن الصامت عن النبي ﷺ قال: لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب، هذا أصح والعمل علىٰ هذا الحديث في القراءة خلف الإمام عند أكثر أهل العلم من أصحاب النبي ﷺ والتابعين وهو قول مالك بن أنس رضي الله عنه وابن المبارك والشافعي و أحمد و إسحاق يرون القراء ة خلف الإمام.

[امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث، حدیث حسن ہے۔ اس حدیث کو زہری نے محمود بن ربیع سے، انھوں نے عبادہ بن صامت سے، انھوں نے نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے (نماز میں) سورت فاتحہ نہ پڑھی، اس کی کوئی نماز نہیں۔'' یہ زیادہ صحیح روایت ہے اور نبی کریم ﷺ کے اصحاب اور تابعین میں سے اکثر اہلِ علم کے نزدیک امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں اسی حدیث پر عمل ہے۔ نیز امام مالک بن انس، عبداللہ بن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے، وہ سب کے سب امام کے پیچھے قراءت کے قائل ہیں]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٥) كتاب القراء ة للبيهقي (٤١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢)

اور حدیث عبادہ کو روایت کیا ہے ابن حبان، دارقطنی اور بیہقی نے بھی اور صحیح کہا ہے، جیسا کہ محلی شرح موطا میں ہے:

"وحديث عبادة هذا رواه الدارقطني أيضاً و ابن حبان والبيهقي، قال الترمذي: حسن، وقال الدارقطني: رجاله ثقات وإسناده حسن وقال الخطابي: إسناده جيد، لا مطعن فيه، وقال الحاكم: إسناده مستقيم، وقال البيهقي: صحيح" انتهى

[عبادہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو امام دارقطنی، ابن حبان اور بیہقی رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کے رجال ثقہ اور اس کی اسناد حسن ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کی اسناد جید ہے، اس میں کوئی طعن نہیں ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کی اسناد مستقیم ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ صحیح ہے]

اور روایت کیا اس حدیث کو بخاری نے بھی "جزء القراءة"[1] میں اور صحیح کہا اس محمد بن اسحاق کو، جو راوی اس حدیث کا ہے، توثیق اس کی بخوبی بیان کی ہے اور ابن الہمام نے بھی "فتح القدیر" میں محمد بن اسحاق کی توثیق کی ہے اور عبارت اس کی یہ ہے:

"هذا إن صح الحديث بتوثيق ابن إسحاق، وهو الحق، وما نقل عن كلام مالك فيه لا يثبت، ولو صح لم يقبل أهل العلم، وقد قال شعبة فيه: هو أمير المؤمنين في الحديث، وروى عنه مثل الثوري وابن إدريس و حماد بن زيد و يزيد بن زريع وابن علية و عبد الوارث و ابن المبارك، واحتمله أحمد و ابن معين وعامة أهل الحديث، غفر الله لهم، وقد أطال البخاري في توثيقه في كتاب القراءة خلف الإمام، وذكرها ابن حبان في الثقات وأن مالكا رجع عن الكلام في ابن إسحاق واصطلح معه وبعث إليه هدية"[2] انتهى

[یہ تب ہے، جب ابن اسحاق کے ثقہ ہونے کے ساتھ حدیث صحیح ہو اور یہی حق ہے۔ رہا اس (ابن اسحاق) کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا کلام تو وہ ثابت نہیں ہے اور اگر وہ ثابت بھی ہو تو اہلِ علم نے اس کو قبول نہیں کیا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ شعبہ رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں کہا ہے: وہ امیر المومنین فی الحدیث ہے۔ ان سے ثوری، ابن ادریس، حماد بن زید، یزید بن زریع، ابن علیۃ، عبد الوارث اور ابن المبارک رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ امام احمد، ابن معین اور عام اہل الحدیث نے ان کی روایت کو قبول کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب القراءۃ خلف الامام میں ان کی توثیق پر طویل کلام کیا ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقات میں ان کا شمار کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے ابن اسحاق کے بارے میں کلام سے رجوع کر لیا تھا

[1] جزء القراءة للبخاري، رقم الحديث (١٥٨)

[2] فتح القدير (١/ ٢٢٨)

اور اس سے صلح کر کے اس کی طرف ہدیہ روانہ کیا تھا]

ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے: "ثقة ثقة لا شبهة عندنا، وعند محققي المحدثين"[1] [(ابن اسحاق) ثقہ ہے، ثقہ ہے۔ ہمارے نزدیک اور محقق محدثین کے نزدیک اس کے ثقہ ہونے میں کوئی شبہہ نہیں] اور ضعیف کہنا حدیث «لا صلاة» کو جو بخاری نے روایت کیا ہے اور وہ اوپر مذکور ہو چکی ہے، کمال نادانی ہے، اس واسطے کے تمام علما قدیماً و حدیثاً کا اس پر اتفاق ہے کہ احادیث صحیحین کی سب صحیح ہیں، چناں چہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "حجة الله البالغة" کے صفحہ (۱۳۹) میں فرماتے ہیں:

"أما الصحيحان فقد اتفق المحدثون علىٰ أن جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع، وأنهما متواتران إلى مصنفيهما، وأنه كل من يهون أمرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المؤمنين" انتهی

یعنی لیکن صحیحین پس بے شک اتفاق کیا ہے محدثین نے اس بات پر کہ تمام حدیثیں متصل، مرفوع ان دونوں میں صحیح ہیں یقیناً اور وہ دونوں متواتر ہیں اپنے مصنف تک اور جو شخص اہانت کرے حکم ان دونوں کا پس وہ مبتدع ہے، متبع ہے خلاف راہ مسلمانوں کی۔

اور حمل کرنا حدیث «لا صلاة» کو اوپر نفی کمال کے جائز نہیں، اس واسطے کہ اصل نفی میں نفی ذات کی معتبر ہے اور نفی ذات کی نہ ہو سکے تو رجوع کیا جاتا ہے طرف اقرب مجاز کے اور اقرب مجاز نفی ذات کی نفی صحت ہے نہ کہ نفی کمال اور حدیث «لا صلاة» میں نفی ذات کی مراد ہے، اس واسطے کہ کوئی قرینہ یہاں نہیں پایا جاتا کہ مراد نفی سے نفی کمال ہے، بلکہ روایت میں ابن حبان اور دارقطنی کے یوں آیا ہے:

«لا تجزئ صلاة إلا بقراءة فاتحة الكتاب»[2] قال الدارقطني: صحيح و صححه ابن القطان.

یعنی نہیں کافی ہوتی نماز جس میں سورت فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ پس یہ حدیث مفسر ہے ساتھ حدیث «لا صلاة» کے، پس معلوم ہوا کہ مراد یہاں نفی سے نفی ذات کی ہے، اس واسطے کہ جو نماز کفایت نہ کرے، وہ نماز ہی نہیں اور اسی کے موید ہے قول حضرت عمر بن الخطاب و جابر بن عبد اللہ و عمران بن حصین و غیرہم رضی اللہ عنہم کا کہ خود اُن حضرات نے تفسیر «لا صلاة» کی یوں بیان کی ہے:

"قالوا: لا تجزئ صلاة إلا بقراءة فاتحة الكتاب" كذا في الترمذي.[3]

یعنی کہا ان لوگوں نے کہ نہیں کفایت کرتی نماز مگر ساتھ قراءتِ فاتحہ کے۔ پس جب حدیث دوسری اس کی مفسر آ چکی اور خود صحابہ کرام سے تفسیر آ چکی تو اسے نفی کمال سمجھنا محض جہالت اور نادانی ہے اور نفی کمال کی سمجھنا بدلیل

[1] فتح القدير (١/ ٤٢٤)

[2] سنن الدارقطني (١/ ٣٢١) صحيح ابن حبان (٥/ ٩١)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٤)

قولہ تعالیٰ: ﴿فَاقْرَؤُا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ کی صحیح نہیں ہے۔ اس واسطے کہ پڑھنا سورت فاتحہ کا ہر رکعت میں خواہ امام ہو، خواہ مقتدی، فرض ہے بدلیل حدیث مذکور اور دوسری احادیثِ صحیحہ کے جو اِس باب میں وارد ہیں۔ پس وہ احادیث آیت: ﴿مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ کی مبین ہوئیں۔ نیز دلیل پکڑنا ساتھ حدیث اعرابی کے:«ثم اقرأ ما تيسر معك من القرآن»[1] کے بھی صحیح نہیں اور جواب اس کا وہی جواب ہے، جو آیت کا دیا گیا، بلکہ ایک روایت میں ابو داود کی اس طرح آیا ہے:«ثم اقرأ بأم القرآن»[2] پس یہ آیت مجمل ہے اور حدیث اس کی مبین ہے۔ کما لا یخفی علی من له أدنی فطانة في العلم.

حاصل یہ ہے کہ پڑھنا سورت فاتحہ کا پیچھے امام کے فرض ہے اور یہی مذہب جمہور محدثین اور خلفاے ثلاثہ یعنی عمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کا ہے، جیسا کہ معالم التنزیل میں موجود ہے اور عبارت اس کی یہ ہے:

"وذهب جماعة إلى إيجابها سواء جهر الإمام أو أسر، وروي ذلك عن عمر و عثمان و علي رضی اللہ عنہم"[3] انتهى

[ایک جماعت اس کے وجوب کی طرف گئی ہے، خواہ امام جہری قراءت کرے یا مخفی اور یہی موقف عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے]

قال الله تعالیٰ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ وقال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: «عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين»[4] الحديث

[اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہہ یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمیشہ سے ایک اچھا نمونہ ہے۔" اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میری اور خلفاے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو]

اور تمسک پکڑنا ساتھ حدیث:«من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة»[5] [جو امام کی اقتدا میں ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے] کے اوپر عدمِ جواز قراءۃ خلف الامام کے باطل ہے دو وجہ سے: ایک تو یہ کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور راوی اس کا جابر جعفی ہے اور وہ عند المحدثین ضعیف ہے، بلکہ کہا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہ نہیں دیکھا، میں نے کسی کو جھوٹا زیادہ اس سے، جیسا کہ محلی میں ہے:

"وروى ابن ماجه أيضاً من طريق حسن بن الصالح عن جابر الجعفي عن أبي الزبير عن جابر مرفوعاً:«من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة» وضعفه الدارقطني والبيهقي،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٥٩)

[3] معالم التنزيل للبغوي (٣/ ٣٢٠)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦)

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٥٠)

فإن الجعفي ساقط الحديث، حتى قال أبو حنيفة: ما رأيت أحداً أكذب منه" انتهى

[ابن ماجہ نے بھی حسن بن صالح کے واسطے سے روایت کیا ہے، اس نے جابر جعفی سے، اس نے ابو زبیر رضی اللہ عنہ سے، انھوں نے جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو امام کی اقتدا میں ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے، چناں چہ امام دارقطنی اور بیہقی نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ پس بلاشبہہ جعفی ساقط الحدیث ہے، حتی کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: میں نے اس (جعفی) سے زیادہ جھوٹا کوئی راوی نہیں دیکھا ہے]

اور کہا ابن الجوزی نے "العلل المتناهية" میں:

"حديث: من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة. روى عنه شعبة وجماعة عن موسىٰ بن أبي شداد، وكلهم أرسلوه، وإنما هو قول ابن عمر و هذا أشبه بالصواب"[1] انتهى

[حدیث: «من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة» اس سے شعبہ نے روایت کیا ہے اور ایک جماعت نے موسیٰ بن ابی شداد سے روایت کیا ہے اور ان سب نے اس کو مرسل بیان کیا ہے۔ یہ تو صرف ابن عمر کا قول ہے اور یہی بات زیادہ صحیح ہے]

دوسری یہ کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ حدیث صحیح ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ حدیث محمول ہے اوپر ما سوا سورت فاتحہ کے، جیسا کہ کہا امام بخاری نے "جزء القراءة" میں:

"حديث من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة، لم يثبت لأنه إما مرسل وإما ضعيف، ولو ثبت لكانت مستثناة"[2]

[حدیث: «من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة» ثابت نہیں ہے، کیوں کہ یا تو یہ مرسل ہے یا ضعیف ہے۔ اگر بالفرض یہ ثابت بھی ہو تو سورۃ الفاتحہ اس سے مستثنیٰ ہوگی]

نیز محلی میں ہے:

"حديث: من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة، رواه سفيانان وشعبة وجماعة عن موسىٰ بن أبي شداد مرسلًا، و صحح البيهقي والدارقطني أنه مرسل، وحمل البيهقي هذا الحديث على ماعدا الفاتحة" انتهى

وقال كمال المحققين بعد إثبات الحديث أنه يعارض حديث عبادة، ويقدم لتقدم المنع علىٰ الإطلاق، ولقوة السند فإن حديث جابر أصح خصوصاً لتعاضده بمذاهب الصحابة" كذا في المحلىٰ.

قال المولوي سلام الله في رد قول ابن الهمام: حديث من كان له إمام فإن قراءة الإمام

[1] العلل المتناهية (١/ ٤٢٨)

[2] جزء القراءة للبخاري (ص: ٢٠)

له قراءة ليس بنص في المنع، كما لا يخفى، وحديث لا تفعلوا إلا بأم القرآن هو للإيجاب لا للإطلاق المبحث فللمخالف أن يقول: يقدم حديث عبادة لتقدم الإيجاب علىٰ الإباحة، وحديث جابر وإن صح لكن كونه أصح من حديث عبادة محل تردد" انتهى

وقال قاضي القضاة إبراهيم بن أبي بكر الحنفي في البرهان شرح مواهب الرحمن بعد نقل قول ابن الهمام على منع قراءة خلف الإمام بحديث من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة: ممنوع ومدفوع إلا أن دعوى تضمنه رد القراءة خلف الإمام معارضة بما روي إلى أخيره غير تامة لأنها في حيز المنع، وعلى فرض تسليمها يقال إنما نهاه عنها بجهر القراءة بدليل سماعه لقراءته، ولقوله عليه السلام: مالي أنازع القرآن؟ لا يثبت المعارضة مع إمكان التوفيق فيحمل النهي عنها علىٰ الجهر لاستلزامه المنازعة المذكورة في الحديث، والأمر بها علىٰ السر بدليل قول أبي هريرة في حديث قسمة الصلاة: اقرأ بها في نفسك يا فارسي. فلا يتم بهذا القدر المنع عن القراءة خلف الإمام. انتهى كلامه.

[حدیث:«من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة» کو دونوں سفیانوں، شعبہ اور ایک جماعت نے موسیٰ بن ابی شداد سے مرسل بیان کیا ہے۔ امام بیہقی اور دارقطنی رحمہ اللہ نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو سورت فاتحہ کے علاوہ پر محمول کیا ہے۔ انتہیٰ.

کمال المحققین نے اس حدیث کا اثبات کرنے کے بعد کہا ہے: وہ عبادہ کی حدیث کے معارض ہے، اس کو مطلق طور پر منع کے مقدم ہونے اور قوتِ سند کی وجہ سے مقدم رکھا جاتا ہے، کیوں کہ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ خاص پور پر مذاہبِ صحابہ کے ساتھ قوی ہونے کی بنا پر۔ كذا في المحلىٰ.

مولوی سلام اللہ نے ابن الہمام کے قول کے رد میں کہا ہے: حدیث:«من كان له إمام فإن قراءة الإمام له قراءة» منع کے بارے میں نص نہیں ہے، جیسا کہ یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے اور حدیث: «لا تفعلوا إلا بأم القرآن» یہ ایجاب کے لیے ہے نہ کہ اطلاق کے لیے۔ مخالف یہ کہہ سکتا ہے: عبادہ کی حدیث کو مقدم کیا جائے گا، کیوں کہ ایجاب اباحت پر مقدم ہوتا ہے، جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث اگرچہ صحیح ہے، لیکن اس کا عبادہ کی حدیث سے زیادہ صحیح ہونا محل تردد ہے۔ انتہیٰ

قاضی القضاۃ ابراہیم بن ابی بکر حنفی نے ''برہان شرح مواہب الرحمٰن'' میں ابن الہمام کا قول نقل کرنے کے بعد کہ حدیث:«من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة» کے ساتھ تو امام کے پیچھے قراءت ممنوع ہے، کہا ہے کہ یہ ممنوع اور مدفوع ہے، مگر امام کے پیچھے قراءت کے رد کو متضمن ہونے کا دعویٰ اس کے

ساتھ معارض ہے، جو اس روایت کے آخر میں بیان ہوا ہے کہ وہ نامکمل ہے، کیوں کہ وہ منع کے ضمن میں ہے۔ بالفرض اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کہا جائے گا کہ آپ ﷺ نے جہر قراءت کی وجہ سے اس سے منع کیا، دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس کی قراءت سنی، نیز آپ ﷺ کے اس قول کی وجہ سے: «مالي أنا زع القرآن» معارضہ ثابت نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ تطبیق ممکن ہے۔ لہٰذا اس سے نہی کو جہر پر محمول کیا جائے گا، کیوں کہ وہ حدیث میں مذکور منازعہ کو مستلزم ہے اور جہاں اس کے پڑھنے کا حکم دیا ہے تو وہ مخفی پڑھنے کا حکم ہے، جس کی دلیل ابوہریرہ سے مروی نماز کی تقسیم والی حدیث میں ان کا یہ قول ہے کہ اے فارسی! اس کو دل میں پڑھو۔ پس اتنی سی بات سے امام کے پیچھے قراءت سے ممانعت ثابت نہیں ہوتی ہے]

والله أعلم بالصواب، وإليه الرجع والمآب. حرره أبو المكارم محمد علی صانه الله عن شر كل غبي و غوي.

ابو المکارم محمد علی (۱۲۹۹ھ)	سید محمد نذیر حسین (۱۲۸۱ھ)	محمد عبد الحمید (۱۲۹۳ھ)
سید احمد حسین (۱۲۸۹ھ)	خادم شریعت رسول الثقلین محمد حسین (۱۲۹۲ھ)	
محمد عبد العزیز (۱۲۸۸ھ)	المعتصم بحبل الله الاحد ابو البرکات الحافظ محمد (۱۲۹۲ھ)	
ز شرف سید کونین شد شریف حسین (۱۲۹۳ھ)	محمد بن محمد عبد اللہ (۱۲۹۸ھ)	
محمد حبیب ابو الخیرات اللہ (۱۲۹۸ھ)	محمد عبد اللہ (۱۲۹۱ھ)	
محمد اسحاق (۱۲۹۲ھ)	شہاب الدین (۱۲۸۸ھ)	محمد عبد الغفار (۱۲۸۸ھ)

نماز میں ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کے بعد "رَبِّ اغْفِرْ لِيْ آمِيْنَ" کہنا:

سوال ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کے بعد نماز میں "رَبِّ اغْفِرْ لِيْ آمِيْنَ" کہنا مسنون ہے یا نہیں؟

جواب حصن حصین میں طبرانی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہتے تو "رَبِّ اغْفِرْ لِيْ آمِيْنَ" کہتے، اور لفظ حدیث کا یہ ہے:

«وحين قال ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ قال رب اغفر لي آمين»[1]

[جب آپ ﷺ ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھتے تو کہتے: "رب اغفرلي آمين" اے میرے رب مجھے بخش دے اور قبول فرما]

طبرانی کی اس حدیث کی سند معلوم نہیں اور طبرانی بھی یہاں موجود نہیں کہ اس میں سند دیکھی جائے، لیکن حصن حصین کے دیباچے میں صاحبِ حصن حصین نے لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو صحیح حدیثوں سے نکالا ہے اور

[1] المعجم الكبير للطبراني (۲۲/ ۴۲) سنن البيهقي (۲/ ۵۸) اس کی سند میں "أحمد بن عبد الجبار العطاردي" ضعیف ہے۔

دوسری جگہ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں امید رکھتا ہوں کہ جو کچھ حدیثیں اس کتاب میں ہیں، سب صحیح ہوں۔[1]
صاحبِ حصن حصین کے ان اقوال سے مظنون یہی ہے کہ یہ حدیث بھی صحیح ہو، اگر ایسا ہے تو بعد ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کے "رَبِّ اغْفِرْ لِيْ آمِيْنَ" کہنا مسنون ہوگا۔

نماز میں ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ﴾ کا جواب دینا:

سوال 1 ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ﴾ کے سننے والے کو جواب دینے کا ثبوت کسی حدیث صحیح سے ہے یا نہیں؟

2 "بلى وأنا على ذلك من الشاهدين" کلام ہے یا نہیں؟ اگر کلام ہے تو اس سے نماز میں کچھ فتور ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب 1 ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ﴾ کے سننے والے کو جواب دینے کا ثبوت کسی حدیث سے باوجود تلاش کثیر مجھے اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ ہاں پڑھنے والے کو جواب دینے کا ثبوت البتہ حدیث سے ہے، جیسا کہ جواب سوال میں مندرج ہے۔

2 "بلىٰ وأنا على ذلك من الشاهدين" کے کلام ہونے میں تو کچھ شبہہ نہیں ہے، لیکن نماز میں جو کلام ممنوع ہے، وہ وہی کلام ہے جو کسی آدمی یا دیگر کسی مخلوق سے کیا جائے، نہ کہ ہر کلام اور جواب مذکور اس قبیل سے نہیں ہے، تو اس کی ناجوازی اس وجہ سے نہیں ہو سکتی ہے کہ یہ کلام ہے اور کلام نماز میں ممنوع ہے، لیکن نماز ایک ایسی چیز ہے، جس میں آدمی خود مختار نہیں ہے کہ جو چاہے، اس میں گھٹاوے یا بڑھاوے، بلکہ اس میں پابندی قانون شرع شریف کی لازم ہے۔

صحیح بخاری ابوب الاذان میں مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«صلوا كما رأيتموني أصلي»[2] یعنی نماز اس طرح پر پڑھو، جس طرح پر مجھ کو پڑھتے دیکھتے ہو۔

تو نماز حسبِ تعلیم حضرت رسول کریم ﷺ پڑھنی چاہیے نہ کہ جس طرح اپنا جی چاہے، تو جس سننے والے شخص کو "أليس الله بأحكم الحاكمين" کے جواب دینے کا ثبوت کسی شرعی دلیل سے نہ پہنچا ہو تو اس کے تا پہنچنے ثبوت کے جواب دینا ملتوی کرنا چاہیے۔ والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبدالله (مہر مدرسہ)

نماز میں قراءت سے متعلق دو حدیثیں:

سوال (1) وہ حدیث صحیح بخاری میں کہاں پر ہے، جس میں ہے کہ ایک امام ہر رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾

[1] علامہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ سے کتاب "حصن حصین" میں مندرجہ احادیث کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ اس میں ہر طرح کی احادیث مذکور ہیں، لہٰذا اس میں مذکورہ روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس سلسلے میں بنیادی کتب اور اہلِ علم کے کلام کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ (فتاویٰ نور على الدرب، ص: ۳۸۸) نیز امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی اس کتاب کی شرح "تحفة الذاكرين بعدة الحصن الحصين" میں انھیں خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ دیکھیں: تحفة الذاكرين (ص: ۲)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٢)

پڑھا کرتا تھا، پھر کوئی اور سورت بھی پڑھتا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو بحال رکھا؟

(۲) وہ حدیث صحیح بخاری میں کہاں ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعے کے دن صبح کی نماز میں ﴿الٓمّٓ تَنْزِيْلُ﴾ السجدۃ اور ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ پڑھتے تھے؟

جواب (۱) وہ حدیث صحیح بخاری (پارہ:۳، ص:۱۰۳ چھاپہ میرٹھ) "باب الجمع بين السورتين في ركعة... الخ" میں ہے۔[1]

(۲) وہ حدیث صحیح بخاری (پارہ:۴، ص:۱۲۲ چھاپہ مذکور) "باب ما يقرأ في صلوة الفجر يوم الجمعة"[2] میں ہے۔ حدیث مع سند یہ ہے:

"حدثنا أبو نعيم قال: حدثنا سفيان عن سعد بن إبراهيم عن عبد الرحمن هو ابن هرمز الأعرج عن أبي هريرة قال: كان النبيﷺ يقرأ في الفجر يوم الجمعة ﴿الٓمّٓ تَنْزِيْلُ﴾ و ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ والله تعالىٰ أعلم"

[ہمیں ابو نعیم نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں سفیان نے بیان کیا، وہ سعد بن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں، وہ عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج سے روایت کرتے ہیں، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ جمعے کے دن فجر کی نماز میں (پہلی رکعت میں) سورت ﴿الٓمّٓ تَنْزِيْلُ﴾ اور (دوسری رکعت میں) ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ کی تلاوت کرتے تھے]

نمازِ تہجد میں قراءت سے متعلق ایک حدیث:

سوال ایک حدیث میں آیا ہے کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک رات نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے سورۂ بقرہ شروع کی۔ میں نے کہا کہ آپ ﷺ سو (۱۰۰) آیتوں پر رکوع کریں گے۔ آپ ﷺ آگے بڑھ گئے۔ تب میں نے کہا کہ آپ ﷺ دو سو (۲۰۰) آیتوں پر رکوع کریں گے۔ آپ ﷺ آگے بڑھ گئے، تب میں نے کہا کہ آپ ﷺ پوری سورت پڑھیں گے، ایک رکعت میں، آپ ﷺ آگے بڑھ گئے، سورۂ نساء شروع کی، اس کو پڑھا، پھر سورۂ آل عمران شروع کی، اس کو پڑھا اور یہ سب قراءت آپ کی آہستہ ٹھہر ٹھہر کر تھی۔ جب کوئی آیت اللہ کی پاکی کی آتی تو آپ ﷺ تسبیح کہتے اور جب کوئی سوال کی آتی تو آپ اللہ سے سوال کرتے اور جب کوئی آیت پناہ مانگنے کی آتی تو اللہ سے پناہ مانگتے، پھر آپ ﷺ نے رکوع کیا تو "سبحان ربي العظيم" کہا کہ رکوع بھی قیام کے برابر تھا، پھر سر اٹھایا "سمع الله لمن حمده" کہا اور یہ قیام رکوع کے قریب قریب تھا، پھر سجدہ کیا "سبحان ربي الأعلىٰ" کہنے لگے تو سجدہ رکوع کے قریب قریب تھا۔ (نسائي)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷٤۱)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۵۱)

دوسری حدیثوں میں اتنا اور زیادہ ہے کہ قعود اور انصراف، یعنی بعد نماز کے بیٹھنا یہ بھی اسی قیام کے برابر تھا تو اس میں دریافت طلب یہ امر ہے کہ جب قیام ایسا ہو کہ جس میں سوا پانچ پارے نہایت اطمینان کے ساتھ پڑھے جائیں، جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے تو کم از کم دو گھنٹے یا اور بھی کم رکھا جائے تو ڈیڑھ گھنٹے سے کم نہیں ہوتا اور پھر دوسرے ارکان جو اتنی اتنی دیر میں وہ بھی ادا کیے جاویں تو فی رکن ڈیڑھ گھنٹے کے حساب سے قیام اور رکوع اور قیام بعد الرکوع، جلسہ بین السجدتین اور دوسرا سجدہ اور قعود اور انصراف یہ سب آٹھ ہوتے ہیں، تو فی ڈیڑھ گھنٹے کے حساب سے ۱۲ گھنٹے ہوئے، پس جبکہ بموجب آیت قرآن پاک ﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ﴾ [المزمل: ۲۰] کے نمازِ لیل کا وقت تہائی رات گزر جانے پر شروع ہوتا ہے تو بس دو تہائی رات جو زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے ہوتی ہے، اس میں بارہ گھنٹے کی ایک رکعت کو کوئی کیونکر ادا کر سکتا ہے اور پھر یہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے ایک شب میں صرف ایک ہی رکعت پڑھی ہو، کم از کم دو، زیادہ سے زیادہ تیرہ ہیں، تو جبکہ ایسی نماز پڑھی ہو جس میں ازروئے حساب بارہ گھنٹے ہوتے ہیں اور پھر اور بھی رکعت پڑھی ہوں تو یہ امر کس طرح ممکن ہے؟

المستفتي: سید جواد علی رضوی، محلّہ پٹھان، علی گڑھ

جواب آپ نے جو حساب لگایا ہے اور اس کی بنا پر جو یہ لکھا ہے کہ دو تہائی رات جو زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹہ ہوتی ہے، اس میں اس بارہ گھنٹے کی ایک رکعت کوئی کیونکر ادا کر سکتا ہے اور پھر کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے ایک شب میں صرف ایک ہی رکعت پڑھی ہو، کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ تیرہ ہیں، تو جب کبھی ایسی نماز پڑھی ہو کہ ازروئے حساب بارہ گھنٹہ ہوتے ہیں اور پھر اور رکعت بھی پڑھی ہوں تو یہ امر کیونکر ممکن ہے؟'' اس میں کچھ شک نہیں کہ جیسا کہ عادۃ اللہ جاری ہے، اس کے مطابق ایسا ہی ہوا کرتا ہے، جیسا کہ آپ نے حساب لگایا ہے اور لکھا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس بات پر مجبور نہیں کہ اپنی عادتِ جاریہ کے خلاف کوئی کام نہ کر سکے، بلکہ بسا اوقات بہت سے کام اپنی عادتِ جاریہ کے خلاف بھی کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم ﷺ اور حضرت حوا علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی عادتِ جاریہ کے خلاف مرد اور عورت کے اکٹھا ہوئے بغیر پیدا کر دیا، اسی طرح عادۃ اللہ یوں جاری ہے کہ مرد عورت جو بوڑھے نہ ہوئے ہوں، ان سے اولاد پیدا ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم اور حضرت سارہ اور حضرت زکریا کو اور ان کی بی بی کو بڑھاپے میں اولاد دے دی، اسی طرح عادۃ اللہ یوں جاری ہے کہ جب کوئی چیز مسافت بعیدہ سے منگائی جاتی ہے تو اس کے لیے اسی کے مطابق ایک مدت درکار ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ملکہ سبا کے تخت کو حضرت سلیمان کے پاس مسافت بعیدہ سے چشم زدن سے بھی پہلے ہی پہنچوا دیا، اسی طرح اور بے شمار واقعاتِ صحیحہ ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ داود علیہ السلام پر زبور پڑھ ڈالنا آسان کر دیا گیا تھا،

چنانچہ حکم دیتے کہ سواری کسی جائے اور زبور پڑھنا شروع کر دیتے، پھر قبل اس کے کہ سواری کسی جائے، پوری زبور ختم کر دیتے۔ (مشکوۃ شریف، ص: ۵۰۰)[1]

فتح الباری جلد تین طبع دہلی میں اس حدیث کی شرح میں ہے: "وفي الحديث أن البركة قد تقع في الزمن اليسير حتى يقع فيه العمل الكثير"[2] [اس حدیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ کبھی برکت تھوڑے سے وقت میں نازل ہوتی ہے، تاکہ اس میں زیادہ عمل کیا جائے] مرقاۃ شرح مشکوۃ (۵/۳۴۴) میں ہے:

"قد دل الحديث علىٰ أن الله تعالىٰ يطول الزمان لمن يشاء من عباده، كما يطوي المكان لهم" والله تعالىٰ أعلم

[یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے زمان کو طویل کر دیتا ہے، جس طرح ان کے لیے مکان کو سکیڑ دیتا ہے] کتبہ: محمد عبداللّٰہ (١٤/ ذیقعدہ ١٣٢٩ھ)

کیا نماز میں دیکھ کر قرآن پڑھنا مفسدِ نماز ہے؟

سوال نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھنا مفسدِ نماز ہے یا نہیں؟

جواب نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھنا مفسدِ نماز نہیں ہے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف سے اسی قدر ثابت ہے کہ نماز میں قرآن پڑھو۔ زبانی پڑھو یا دیکھ کر پڑھو، اس کی کوئی قید نہیں۔ سورت مزمل رکوع (۲) میں ہے: ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ [المزمل: ۲۰] [تو قرآن میں سے جو میسر ہو پڑھو] مشکوۃ شریف (ص: ٦٧ چھاپہ انصاری دہلی) میں ہے: «ثم اقرأ بما تيسر معك من القرآن» (متفق عليه) [پس قرآن سے پڑھو، جو تمھیں بہ آسانی یاد ہو]

پس جس طرح نماز میں زبانی قرآن پڑھنے سے نماز صحیح ہوتی ہے، اسی طرح دیکھ کر پڑھنے سے صحیح ہوگی اور مطلق کی تقیید رائے اور قیاس سے جائز نہیں ہے۔ اصول میں یہ مسلّمہ مسئلے ہے: "المطلق يجري على إطلاقه"[3] [مطلق اپنے اطلاق پر باقی رہتا ہے] اسی اصولی مسئلے پر بہت سے فقہی مسائل کی بنا ہے، ازاں جملہ ایک یہ مسئلہ ہے کہ جب مظاہر [ظِہار کرنے والا شخص] کفارۂ ظِہار میں اثنائے اطعام اپنی زوجہ سے، جس سے ظِہار کیا تھا، جماع کر لے تو اس پر استینافِ اِطعام واجب نہیں ہے، کیوں کہ قرآن مجید میں کفارہ ظِہار میں اِطعام کا لفظ مطلق ہے، پس قیاساً علی الصوم اس میں قیدِ عدمِ جماع کی لگانی، جائز نہیں۔

اصول شاشی (ص: ۹ چھاپہ مجتبائی دہلی) میں ہے:

"قال أبو حنيفة: المظاهر إذا جامع امرأته في خلال الإطعام لا يستأنف الإطعام، لأن

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣٥)

[2] فتح الباري (٦/ ٤٥٥)

[3] أصول الشاشي (ص: ٣٣)

الكتاب مطلق في حق الإطعام، فلا يزاد عليه شرط عدم المسيس، بالقياس على الصوم، بل المطلق يجري على إطلاقه والمقيد على تقييده"[1]

[امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ظِہار کرنے والا جب کفارۂ ظِہار کا کھانا کھلانے کے دوران میں اپنی بیوی سے جماع کر لے تو اس پر نئے سرے سے کھانا کھلانا واجب نہیں ہے، کیوں کہ کتاب اللہ میں مطلق کھانا کھلانے کا حکم آیا ہے، لہٰذا روزے پر قیاس کر کے (جس میں روزے مکمل کیے بغیر جماع نہ کرنے کی شرط ہے) اس پر عورت سے جماع نہ کرنے کی شرط کا اضافہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ مطلق اپنے اطلاق پر باقی رہے گا اور مقید اپنی تقیید پر]

امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ یعنی ان کے نزدیک بھی نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھنا مفسدِ نماز اور مکروہ نہیں اور صاحبین (امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ) کے نزدیک بھی مفسدِ نماز نہیں، اگر اہلِ کتاب کے ساتھ تشبیہ نہ ہو اور بلا تشبیہ اہلِ کتاب ان کے نزدیک بھی مکروہ نہیں۔

درمختار مع ردالمختار (۱/ ۴۶۰ چھاپہ مصر) میں ہے:

"وجوزه الشافعي بلا كراهة، وهما بها للتشبيه بأهل الكتاب أي إن قصده فإن التشبه بهم لا يكره في كل شيء، بل في المذموم، وفيما يقصد به التشبه" اهـ

یعنی امام شافعی رحمہ اللہ نے نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھنا بلا کراہت جائز رکھا ہے اور امام ابو یوسف و امام محمد نے بکراہت جائز رکھا ہے، کیونکہ اس میں اہلِ کتاب کے ساتھ تشبہ ہے، لیکن یہ کراہت اس وقت ہے کہ جب اہلِ کتاب کے ساتھ تشبہ کا قصد ہو، ورنہ کراہت نہیں ہے، کیونکہ تشبہ اہلِ کتاب کے ساتھ ہر بات میں مکروہ نہیں، بلکہ اسی بات میں مکروہ ہے جو مذموم ہے اور جس میں اہلِ کتاب کے ساتھ تشبہ کا قصد ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور بہتیرے تابعین کے نزدیک بھی بلا کراہت جائز ہے۔ صحیح بخاری مع فتح الباری (۱/ ۳۸۶ چھاپہ دہلی) میں ہے:

"وكانت عائشة يؤمها عبدها ذكوان من المصحف" اهـ

یعنی حضرت عائشہ کے غلام ذکوان ان کی امامت کرتے تھے تو قرآن دیکھ کر پڑھتے تھے۔

اس اثر معلق کو ابو داود اور ابن ابی شیبہ اور امام شافعی اور عبدالرزاق نے ابن ابی ملیکہ سے موصولاً روایت کیا ہے اور امام شافعی اور عبدالرزاق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نماز میں جس میں ذکوان امامت کرتے تھے، صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نہیں تھیں، بلکہ بہت سے صحابہ اور تابعین شریک رہتے تھے۔ فتح الباری میں ہے:

"وصله [ابن] أبي داود في كتاب المصاحف من طريق أيوب عن ابن أبي مليكة أن عائشة رضي الله عنها كان يؤمها غلامها ذكوان في المصحف، ووصله ابن أبي شيبة قال: حدثنا

[1] أصولي الشاشي (ص: ٣٣)

وكيع عن هشام بن عروة عن أبي بكر بن أبي مليكة عن عائشة أنها أعتقت غلاما لها عن دبر، فكان يؤمها في رمضان في المصحف، ووصله الشافعي و عبد الرزاق من طريق أخرى، عن ابن أبي مليكة أنه كان يأتي عائشة بأعلى الوادي، هو وأبوه و عبيد بن عمر والمسور بن مخرمة وناس كثير فيؤمهم أبو عمرو مولىٰ عائشة، وهو يومئذ غلام لم يعتق، و أبو عمرو المذكور هو ذكوان"[1] اھ

[(ابن) ابی داود نے کتاب المصاحف میں اسے ایوب کے واسطے سے موصول بیان کیا ہے، وہ ابن ابی ملیکہ سے روایت کرتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا غلام ذکوان مصحف سے پڑھ کر ان کی امامت کراتا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے بھی اسے موصول بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں وکیع نے ہشام بن عروہ سے بیان کیا ہے، انھوں نے ابوبکر بن ابی ملیکہ سے روایت کیا اور انھوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ ان کا ایک غلام رمضان میں مصحف سے ان کی امامت کرواتا تھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور عبدالرزاق رحمہ اللہ نے ابن ابی ملیکہ سے ایک اور سند کے ساتھ اسے موصول بیان کیا ہے کہ وہ خود، اس کا والد، عبید بن عمر، مسور بن مخرمہ اور بہت سے لوگ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے تھے تو عائشہ رضی اللہ عنہا کا غلام ابو عمرو ان کی امامت کرواتا تھا، جو اس وقت آزاد نہیں ہوا تھا۔ یہ ابو عمرو ذکوان ہی ہے]

صاحبین کا استدلال بھی اسی اثر سے ہے۔ نہایہ شرح ہدایہ میں ہے:

"واحتجا بما روي من حديث ذكوان أنه كان يؤم عائشة في رمضان وكان يقرأ من المصحف" اھ

[دونوں (صاحبین) نے اس روایت سے دلیل لی ہے، جو ذکوان کے بارے میں مروی ہے کہ وہ رمضان میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی امامت کرایا کرتا تھا اور وہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھتا تھا]

ایک دلیل صاحبین کی یہ بھی ہے کہ قرآن پڑھنا ایک عبادت ہے اور قرآن کا دیکھنا ایک دوسری عبادت ہے تو قرآن دیکھ کر پڑھنا ایک عبادت کو دوسری عبارت کے ساتھ ملا دینا ہے۔ ہدایہ میں ہے: "وقالا: هي تامة لأنه عبادة انضافت إلى عبادة"[2] اھ [(امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک امام جب مصحف سے دیکھ کر پڑھے تو اس کی نماز فاسد ہوجاتی ہے جبکہ) صاحبین نے کہا ہے کہ اس کی نماز مکمل ہوجاتی ہے، کیوں کہ یہ (مصحف میں دیکھنا) ایک عبادت ہے جو دوسری عبادت (قرآن پڑھنا) کے ساتھ مل گئی ہے] عنایہ میں ہے:

"قوله: انضافت إلىٰ عبادة أي ضمت إلىٰ عبادة، وهي النظر في المصحف، لقول

---

[1] فتح الباري (٢/ ١٨٥) نیز دیکھیں: تغليق التعليق (٢/ ٢٩١)

[2] الهداية (١/ ٦٢)

النبيﷺ: «أعطوا أعينكم من العبادة حظها» قيل: وما حظها من العبادة؟ قال: «النظر في المصحف»[1] " اھ[2]

[اس کے قول "انضافت إلى عبادة" کا مطلب ہے کہ وہ ایک دوسری عبادت کے ساتھ مل گئی ہے اور وہ ہے مصحف میں دیکھنا، کیوں کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے: ''اپنی آنکھوں کو عبادت میں سے ان کا حصہ عطا کرو۔'' پوچھا گیا کہ عبادت میں سے ان کا حصہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''(ان کا حصہ) مصحف میں دیکھنا ہے۔'']

جو لوگ نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھنے کو مفسدِ نماز کہتے ہیں، ایک دلیل ان کی یہ ہے کہ جب کوئی شخص نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھے گا تو ضرور اس کو قرآن ہاتھ میں لیے رہنا اور اس میں دیکھنا اور ورقوں کو الٹنا پڑے گا اور یہ مجموع عمل کثیر ہے اور عملِ کثیر مفسدِ نماز ہے۔ اس دلیل کا جواب کئی وجہوں سے ہے:

اول یہ کہ کلام اس میں ہے کہ نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھنا مفسدِ نماز ہے یا نہیں؟ اس میں قرآن کا ہاتھ میں لیے رہنا اور اس کے اوراق کا الٹنا کیا لازم ہے؟ جائز ہے کہ قرآن کسی چیز پر کھلا ہوا رکھا ہو اور نمازی اس کو دیکھ کر پڑھے، اس میں نہ قرآن کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے ورقوں کے الٹنے کی اور ممکن ہے کہ کھلا ہوا قرآن ہاتھ میں لیے رہے اور صرف اسی قدر پڑھے، جس قدر سامنے کھلا ہوا ہے اور اس صورت میں اوراق الٹنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قرآن دیکھ کر پڑھنے میں ضرور یہ تینوں کام کرنے پڑیں گے، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ یہ تینوں کام تابڑ توڑ کرنے پڑیں؟ جائز ہے کہ قرآن ہاتھ میں لیے رہے اور دیکھنے میں اس کے ورق الٹنے میں فصل پڑے۔ اگر یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ یہ تینوں کام تابڑ توڑ کرنے پڑیں گے، لیکن یہ بات کہ ان تینوں کام کا مجموعہ عملِ کثیر ہے، ممنوع ہے، اس لیے کہ عملِ کثیر میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ درمختار میں لکھا ہے کہ اس میں پانچ قول ہیں: منجملہ ان کے ایک یہ قول ہے کہ عملِ کثیر وہ عمل ہے، جس کو دور سے دیکھنے والا بلا تردد جانے کہ اس کام کے کرنے والے نماز میں نہیں ہیں۔ درمختار میں اسی قول کو "أصح" لکھا ہے۔[3]

دوسرا قول یہ ہے کہ جو کام عادتاً دونوں ہاتھ سے کیا جائے، وہ عملِ کثیر ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ تین حرکتیں جو تابڑ توڑ ہوں، وہ عملِ کثیر ہیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ جس فعل کو فاعل بالقصد کرے، اس طرح پر کہ اس کے لیے مجلس علیحدہ کرے، وہ عملِ کثیر ہے۔ پانچواں یہ کہ نمازی کی رائے کی طرف مفوض ہے، یعنی جس عمل کو نمازی کثیر جانے، وہ

---

[1] یہ حدیث موضوع ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٥٨٦)

[2] العناية (٢/ ١٤٥)

[3] الدر المختار (١/ ٦٢٤)

عملِ کثیر ہے۔ ''در مختار مع رد المحتار'' (۱/ ۴۶۰ چھاپہ مصر) میں ہے:

''وفيه أقوال خمسة، أصحها: ما لا يشك بسببه الناظر من بعيد في فاعله أنه ليس فيها، وإن شك أنه فيها أم لا، فقليل'' اھ

[اس میں پانچ اقوال ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ فاعل کا وہ عمل جس کے سبب دور سے دیکھنے والے کو یہ شک نہ ہو کہ وہ اس (نماز) کا حصہ نہیں ہے۔ اگر اسے یہ شک گزرے کہ آیا یہ عمل نماز کا حصہ ہے یا نہیں تو وہ عمل، عملِ قلیل شمار ہوگا]

''رد المحتار'' میں ہے:

''القول الثاني: ما يعمل عادة باليدين كثير، وإن عمل بواحدة كالتعمم وشد السراويل. الثالث: الحركات الثلاث المتواترة كثير. الرابع: ما يكون مقصودا للفاعل، بأن يفرد له مجلسا علىٰ حدة. الخامس: التفويض إلى رأي المصلي فإن استكثره فكثير''[1] اھ

[دوسرا قول یہ ہے کہ وہ عمل جو عادتاً دونوں ہاتھوں کے ساتھ ہوتا ہے، وہ عملِ کثیر ہے، اگرچہ وہ یہ عمل ایک ہاتھ کے ساتھ کرے، جیسے پگڑی اور شلوار باندھنا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ پے در پے تین حرکتیں کرنا عملِ کثیر ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ عملِ کثیر وہ ہے جو فاعل کا مقصودی عمل ہو اور وہ اس کے لیے علاحدہ مجلس قائم کرے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ اس معاملے کو نمازی کی رائے کے سپرد کیا جائے، چنانچہ وہ جس عمل کو کثیر جانے، وہ عملِ کثیر ہوگا]

ان اقوال میں سے کسی قول پر کوئی دلیل کافی نہیں ہے۔ یہ سب اقوال رائے پر مبنی ہیں، جس سے نصوصِ کتاب و سنت کی تقیید جائز نہیں ہے۔ گو اِن میں سے بعض کو بعض پر ترجیح بھی رائے ہی سے ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر اس مجموعہ کا عملِ کثیر ہونا مان بھی لیا جائے تو بھی اس کا مفسدِ نماز ہونا مسلم نہیں ہے، کیونکہ عملِ کثیر مطلقاً مفسدِ نماز نہیں ہے، بلکہ وہی عملِ کثیر مفسدِ نماز ہے، جو نماز کی اصلاح کے لیے نہ ہو اور جو عملِ کثیر نماز کی اصلاح کے لیے ہو، وہ مفسدِ نماز نہیں ہے، مثلاً کسی کو نماز میں حدث ہوجائے اور وہ وضو کرنے کے لیے جائے اور پھر وضو کر کے پلٹے تو یہ مجموعہ عمل مفسدِ نماز نہیں ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ نماز کے سدھارنے کے لیے ہے۔ درمختار (ص: ۶۴۰) میں ہے: ''ويفسدها كل عمل كثير ليس من أعمالها ولا لإصلاحها'' [ہر وہ عملِ کثیر، جو نماز کے اعمال سے ہو نہ اس کی اصلاح کی غرض سے، نماز کو فاسد کر دے گا]

دوسری دلیل [مانعین کی] یہ ہے کہ قرآن دیکھ کر پڑھنا دوسرے سے قرآن سیکھ کر پڑھنا ہے اور یہ مفسدِ نماز ہے۔ ہدایہ (۱/ ۵۲) میں ہے: ''ولأنه تلقن في المصحف فصار كما إذا تلقن من غيره'' اھ [اور اس

[1] رد المحتار (۱/ ٦٢٥)

لیے (بھی یہ عملِ کثیر ہے) کہ اس نے مصحف سے (قرآن) سیکھا ہے، لہٰذا وہ اس شخص کے مشابہ ہو گیا، جس نے کسی دوسرے سے (قرآن) سیکھا]

اس دلیل کا جواب بھی کئی طرح سے ہے: اول یہ کہ نماز میں قرآن دوسرے سے سیکھ کر پڑھنے کے مفسدِ نماز ہونے پر کیا دلیل ہے؟ اگر ایسا ہو تو امام کا اپنے مقتدی سے لقمہ لینا بھی مفسدِ نماز ہوگا، کیونکہ یہ بھی دوسرے سے قرآن سیکھ کر پڑھنا ہے، حالانکہ حسبِ قولِ صحیح امام کا مقتدی سے لقمہ لینا مفسدِ نماز نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ قرآن دیکھ کر بیچ بیچ دوسرے سے سیکھ کر پڑھنا نہیں ہے، بلکہ من بعض الوجوہ اس کے مشابہ ہے، جیسا کہ کافِ تشبیہ دلیل میں موجود ہے، لیکن یہ کلیہ نہیں ہے کہ جب ایک چیز پر الگ حکم لگا ہو تو اس کے مشابہ پر بھی ضرور وہی حکم لگایا جائے، یہ جب ہے کہ دونوں چیزیں علتِ حکم میں متشارک ہوں اور یہ امر ما نحن فیہ میں ممنوع ہے۔

كتبه: محمد عبد اللّٰه

هو الموفق: حافظ ابن حزم ''محلی'' (۴/ ۴۶) میں فرماتے ہیں:

''ولا تجوز القراءة في مصحف، ولا في غيره لمصل، إماما كان أو غيره، فإن تعمد ذلك بطلت صلاته، وكذلك عد الآي لأن تأمل الكتاب عمل لم يأت نص بإباحته في الصلاة، وقد روينا هذا عن جماعة من السلف، منهم سعيد بن المسيب، و الحسن البصري، والشعبي، وأبو عبد الرحمن السلمي، وقد قال بإبطال صلاة من أم بالناس في المصحف أبوحنيفة والشافعي، وقد أباح ذلك قوم منهم، والمرجوع عند التنازع إليه هو القرآن والسنة، وقد قال رسول اللّٰه ﷺ: «إن في الصلاة لشغلا» فصح أنها شاغلة عن كل عمل لم يأت فيه نص بإباحته'' انتهى

[نمازی کے لیے مصحف وغیرہ سے دیکھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ امام ہو یا غیر امام، پھر اگر وہ عمداً ایسا کرے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ آیات کو شمار کرنے کا بھی یہی حکم ہے، کیوں کہ کتاب پر تامل کرنا ایک ایسا عمل ہے، جس کے نماز میں مباح ہونے کی کوئی نص وارد نہیں ہوئی ہے۔ یہ موقف سلف کی ایک جماعت سے مروی ہم تک پہنچا ہے، جن میں سعید بن میسّب، حسن بصری، شعبی اور ابو عبد الرحمٰن السلمی شامل ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اس شخص کی نماز باطل ہونے کا فتویٰ دیا ہے، جو مصحف سے دیکھ کر لوگوں کی امامت کرائے۔ جب کہ سلف کی ایک جماعت نے اسے جائز و مباح بھی قرار دیا ہے۔ بہر حال تنازع کی صورت میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: ''یقیناً نماز میں ایک طرح کی مشغولیت ہوتی ہے۔'' پس صحیح یہ ہے کہ نماز ہر اس عمل سے مشغول کرنے والی ہے، جس کے مباح ہونے کی کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو]

حرفِ ''ض'' کا تلفظ:

سوال زید کہتا ہے یہ حرف ''ض'' مشابہ بالظاء ہے، بالدال نہیں ہے، جیسے مولانا عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ کی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں اور ''محاسن العمل'' میں مولانا مفتی عنایت احمد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حرف مشابہ بالظاء ہے، بالدال نہیں ہے۔ ایسا ہی تفسیر بیضاوی کے حاشیہ پر ہے اور شیخ جمل حنفی مکی کے فتویٰ میں ہے کہ ''ض'' کو ''ظا'' پڑھنا اکثر لغت اہلِ عرب کا ہے اور ''حاشیہ منیہ جهد المقل'' میں ہے کہ ''ض'' کو ''ظ'' پڑھنا تعجب نہیں، اس واسطے کے ان میں مشابہت ثابت ہے اور فرق کرنا مشکل ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ ''ض'' اور ''ظ'' میں فرق کرنا مشکل ہے اور احیاء العلوم میں اور کیمیائے سعادت میں امام غزالی صاحب فرماتے ہیں کہ ''ض'' اور ''ظ'' میں فرق کرنا چاہیے، اگر نہ ہو سکے، تب بھی درست ہے۔ عبارت رعایا تصنیف امام محمد مکی میں ہے کہ یہ تینوں حرف ض، ظ، ذ سننے میں یکساں ہیں۔ تفسیر اتقان سورہ قیامہ میں ہے کہ یہ دو لفظ جدا جدا ہیں اور بولنے میں یکساں ہیں:

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ۝ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ [القيامة: ٢٢، ٢٣]

[اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے]

عبارت فتویٰ شیخ احمد دحلان مکی سے ظاہر ہے کہ یہ حرف مشابہ بالظاء ہے، بالدال نہیں ہے۔ رسالہ ''خلاصة التقریر'' جس پر مہر مولوی بشیر الدین صاحب قنوجی اور مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی اور سید امیر حسن اور مفتی سعد اللہ صاحب اور دوسرے علماء کی اس پر مہریں ہیں کہ یہ حرف ض مشابہ بالظاء ہے، بالدال نہیں ہے۔ فتاویٰ قاضی خان اور خانیہ اور خلاصہ اور نہر الفائق اور فتاویٰ عالمگیری وغیرہ میں اکثر علما نے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ حرف ض اور ظ میں فرق کرنا مشکل ہے، کیونکہ ان میں مشابہت زیادہ ہے۔

یہ بیان زید کا صحیح ہے یا غلط؟ عمرو کہتا ہے کہ یہ حرف ض مشابہ بالدال ہے، بالظا نہیں ہے، کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قرآن شریف کو پڑھو عرب کے لہجے میں، پھر بموجب حدیث شریف کے حرمین شریفین میں دواد پڑھتے ہیں، مشابہ بالدال۔ یہ بیان دونوں میں کس کا صحیح اور غلط ہے؟ خوب علیحدہ علیحدہ تفصیل سے بیان فرمائیں، اللہ آپ کو اجر عظیم دے گا۔ مکرر یہ کہ سوائے آپ کے اور بھی علما کی مہر بھی ہونا چاہیے۔

کتبہ: محمد حسن و محمد وزیر از قصبہ رصبا، ضلع بریلی۔

جواب ان دونوں بیانوں میں سے زید ہی کا بیان (حرف ضاد مشابہ بالظا ہے، مشابہ بالدال نہیں ہے) صحیح ہے۔ زید کے اس بیان کی تصدیق سے کتب تجوید وغیرہ بھری پڑی ہیں، جن میں سے بعض کے نام خود سوال میں درج ہیں اور

عمرو کا بیان کہ حرف مذکور مشابہ بالدال ہے، بالظا نہیں ہے، بے ثبوت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

كتبه: محمد عبدالله. صح الجواب، والله أعلم بالصواب. كتبه: أبوالفياض محمد عبد القادر الأعظم گڑھی المئوی.

هو الموفق: یہاں پر مسئلہ قراءتِ ضاد کے متعلق علامہ شیخ حسین عرب صاحب محدث کا فتویٰ ان کے مجموعہ فتاویٰ "نور العین" سے نقل کر کے اس کا ترجمہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ علم کو محدث موصوف کی تحقیق پر بھی اطلاع ہوجائے اور اس مسئلے پر غور کرنے کا کافی موقع ملے۔ آپ کا وہ فتویٰ یہ ہے:

"بسم الله الرحمن الرحيم. الحمد لله رب العالمين، الفاتح لما أغلق، والأول الخالق، والصلاة والسلام على نبيه محمد أفضل الخلائق، وعلىٰ آله نخبة النخبة من الخلائق، وعلىٰ أصحابه القاهرين بعدلهم كل منافق، الدامغين بسيوفهم وبيانهم كل مشاقق، وبعد: فقد وقع السؤال في تحقيق التلفظ بحرف الضاد، هل هي مشابهة لصوت الدال المفخمة أو تقرأ مشابهة للظاء المشالة. ما الصحيح في ذلك؟ أفيدونا جزيتم خيرا.

جواب ومن الله أستمد التوفيق، لاصابة الصواب. قال العلامة المُناوي (بضم الميم) في شرح القاموس ما لفظه: الضاد حرف هجاء للعرب، قالوا: والضاد حرف مستطيل، ومخرجه من طرف اللسان إلى ما يلي الأضراس من الجانب الأيسر أكثر من الأيمن، والعامة تجعلها ظاءا فتخرجها من طرف اللسان وبين الثنايا، وهي لغة، حكاها الفراء، لكنها نادرة غير فصيحة.[1] انتهى

وقال العلامة السيد محمد مرتضى في تاج العروس عند قول مجد الدين صاحب القاموس في خطبته: مفحما باللسان الضادي أي العربي لأن الضاد من الحروف الخاصة بلغة العرب.[2] انتهى

وفيه في "ظوى": الظاء حرف لثوي، مخرجه من أصول الأسنان، جوار مخرج الذال، يمد، ويقصر، ويؤنث، ويذكر... إلى أن قال: وقال الخليل: هو حرف عربي خاص بلسان العرب، لا يشركهم فيه غيرهم من سائر الأمم. قال شيخنا: وصرح بمثله أبو حيان، و شيخه ابن أبي الأحوص، وغير واحد، فلا يعتد بمن قال: إنما الخاص الضاد. قلت وكأنه تعريض

① انظر: المصباح المنير للفيومي (٢/ ٣٦٥)

② تاج العروس من جواهر القاموس (١/ ٥٣)

علیٰ البدر القرافي حيث قال إنما المختص بهم الضاد.[1]

وقال في باب الضاد المعجمة: وهي حرف من الحروف المجهورة، وهي ستة عشر حرفا... والجيم والشين والضاد في حيز واحد، و هذه الحروف الثلاثة هي الحروف الشجرية، وقال ابن عصفور في المقرب: وتبدل الضاد أيضاً من الصاد المهملة، قال: مص الرمانة ومضها، قال: والصاد أكثر. قال شيخنا: وهو علامة إصالته وفرعية الضاد المعجمة عنه. قال: و ذكر ابن مالك في التسهيل أنها تبدل من اللام أيضاً. حكى الجوهري: جضد أى جلد. قلت: وقال الكسائي: العرب تبدل من الصاد ضادا، فتقول: ما لك في هذا الأمر مناض أي مناص.[2] انتهى

وقال العلامة الجزري في منظومته في علم التجويد:

والضاد من حافته إذ وليا الأضراس من أيسر أو يمناها[3]

قال ابن الناظم في شرحها: أي والضاد حرف من حافة اللسان، وما يليه من الأضراس، ومن الأيسر أيسر وأكثر استعمالًا، ومن اليمنیٰ أصعب، وأقل استعمالا، وكان عمر بن الخطاب رضي الله عنه يخرجها من الجانبين، والضمير في "حافته" إلى اللسان، وفي "يمناها" إلى الأضراس.

وقال ابن الجزري أيضاً في التمهيد: اعلم أن هذا الحرف ليس من الحروف حرف يعسر علیٰ اللسان غيره، فإن ألسنة الناس فيه مختلفة، وقل من يحسنه، فمنهم من يخرجه ظاء معجمة لأنه يشارك الظاء في صفاتها كلها إلا الاستطالة، فلولا الاستطالة واختلاف المخرجين لكانت ظاءا، وهم أكثر الشاميين، وبعض أهل المشرق، وهذا لا يجوز في كلام الله تعالیٰ لمخالفته المعنى الذي أراده الله تعالیٰ، إذ لو قلنا في الضالين: الظالين، لكان معناه الدائمين، وهذا خلاف ما أراد الله تعالیٰ، وهو مبطل للصلاة لأن الضلال بالضاد هو ضد الهدى، كقوله تعالیٰ: ﴿ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ ولا الضالين، ونحوه، والظلول بالظاء هو الصيرورة، كقوله تعالیٰ: ﴿ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا﴾ و شبهه، فمثل الذي يجعل الضاد ظاءا في هذا، وشبهه كالذي يبدل السين صادا، في نحو قوله تعالیٰ: ﴿وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ ويبدل الصاد سينا في قوله تعالیٰ: ﴿وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا﴾ فالأول من السر، والثاني من الإصرار.

---

[1] تاج العروس (٣٨/ ٥٢٩)

[2] تاج العروس (١٩/ ٩٨)

[3] المقدمة الجزرية (ص: ٢)

وقد حكى ابن جني في كتاب التنبيه وغيره أن من العرب من يجعل الضاد ظاءا مطلقا في جميع كلامهم، وهذا غريب وفيه توسيع للعامة ومنهم من لا يوصلها إلى مخرجها، بل يخرجها دونه ممزوجة بالظاء المهملة، لا يقدرون على غير ذلك، وهم أكثر المصريين وبعض أهل المغرب، ومنهم من يجعلها دالا مفخمة، ومنهم من يخرجها لاما مفخمة وهم الزيالع ومن ضاهاهم، لأن اللام مشاركة لها في المخرج، لا في الصفات، فهي بعكس الظاء، لأن الظاء شارك الضاد في الصفات، لا في المخرج، ولذلك أشار الإمام السخاوي في نونيته فقال ؎

والضاد عال مستطيل مطبق — جهر يكل لديه كل لسان
حاشا لسان بالفصاحة قيم — درب لأحكام الحروف معاني
كم رامه قوم فما أبدوا سوى — لام مفخمة بلا عرفان
ميزه بالإيضاح عن ظاء وفي — أضللن أو في غيض مشتبهان[1]

واعلم أن هذا الحرف خاصة إذا لم يقدر الشخص على إخراجه من مخرجه بطبعه لا يقدر عليه بكلفة ولا بتعليم فإذا أتى بعد الضاد ظاءا معجمة وجب الاعتناء ببيان إحدٰهما عن الأخرى لتقارب التشابه نحو انقض ظهرك، ويعض الظالم وبعض الظالمين، وإذا سكنت، وأتى بعدها حرف الطباق، وجب التحفظ بلفظ الضاد، لئلا يسبق اللسان إلى ما هو أخف عليه، وهو الإدغام نحو قوله تعالىٰ: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ﴾ ثم اضطره، واضطررتم، وإذا أتى بعدها حرف من حروف المعجم فلا بد من المحافظة على بيانها وإلا بادر اللسان إلى ما هو أخف منها نحو أعرضتم، وأفضتم، وقبضت قبضة، واخفض جناحك، وقيضنا، ويحضن، وفرضنا، وليضربن، وخضرا، ونضرا، ولولا فضل الله، وأرض الله، وملأ الأرض ذهبا، وبعض ذنوبهم، وإذا تكررت الضاد فلا بد من بيان كل واحدة منهما، لأن بيانها عند مثلها آكد من بيانها عند مقاربها، ولذلك قال المكي رحمه الله: إذا تكررت يجب لوجوب التكرر في حرف قوى مطبق مستعل مستطيل، وذلك نحو قوله: يغضضن من أبصارهن، واغضض من صوتك.[2] انتهى مع بعض زيادة.

و لعسر النطق بهذه الكلمات وأمثالها نبه السخاوي في نونيته على وحوب المحافظة على بيانها، فقال ؎

وأبنه عند التاء نحو أفضتم — والطاء نحو اضطر غير جبان
والجيم نحو اخفض جناحك مثله — والنون نحو يحضن قسه وعان

---

1. عمدة المفيد للسخاوي (٣١۔ ٣٤)
2. التمهيد في علم التجويد (ص: ١١٥)

والراء نحو ليضربن ولام فضل اللّٰه بين حيث يلتقيان

وبيان بعض ذنوبهم واغضض وانقض ظهرك اعرفه تكن ذا شان[1]

وقال العلامة علي القاري في شرح الجزرية: المعنى أن مخرج الضاد من طرف اللسان مستطيلة إلى ما يلي الأضراس من الجانب الأيسر، وهو الأيسر والأكثر، ومن الأيمن وهو اليسير العسير و المعسر، أو من الجانبين، وهو من مختصات عمر رضي الله عنه.

وقال الإمام الجزري أيضاً في باب الضادات: ؎

والضاد باستطالة ومخرج ميز من الظاء وكلها تجي[2]

قال العلامة على القاري في شرحه أي ميز الضاد بصفة استطالتها، وبإخراجها من مخرجها، فإن مخرج الضاد من حافة اللسان والظاء من طرف اللسان، والاستطالة هي الامتداد من أول حافة اللسان إلى آخرها، كما قاله الجعبرى، وقد انفرد الضاد بالاستطالة حتىٰ يتصل بمخرج اللام لما فيه من قوة الجهر والإطباق والاستعلاء، وليس في الحروف ما يعسر على اللسان مثله، وألسنة الناس فيه مختلفة، فمنهم من يخرجه ظاءا ومنهم من يخرجه دالا مهملة أو معجمة، ومنهم من يخرجه طاءا مهملة كالمصريين، ومنهم من يشمه ذالا، ومنهم من يشوبها بالظاء المعجمة، لكن لما كان تمييزه من الظاء مشكلا بالنسبة إلى غيره، أمر الناظم بتمييزه عنه نطقا.[3] انتهى

وقال العلامة العيني في شرح البخاري في سورة إذا الشمس كورت: قال النسفي في تفسيره: وإتقان الفصل بين الضاد والظاء واجب، ومعرفة مخرجهما كما لا بد منه للقاري فإن أكثر العجم لا يميزون بين الحرفين.[4] انتهى كلام العلامة العيني بلفظه

فظهر مما نقلناه من كلام أئمة اللغة والقراءات أن صوت الضاد ليست مشابهة بصوت الظاء، لأن الظاء من الحروف الضعيفة، والضعيفة من الحروف المتهجنة كما في الشافية وغيرها. قال في الشافية:

والفصيح ثمانية، الهمزة ما بين الهمزة، والألف وما بينها، وبين الياء وما بينها، وبين الواو والنون الخفيفة، وألف الإمالة والصاد كالزاي والشين كالجيم، وأما الصاد كالسين،

---

[1] عمدة المفيد (٣٦ـ ٣٩)

[2] المقدمة الجزرية (٥٢)

[3] المنح الفكرية شرح المقدمة الجزرية للملا علي القاري (ص: ٣٨)

[4] عمدة القاري (١٩/ ٢٨١)

والطاء كالتاء، والفاء كالباء والكاف كالجيم، والضاد الضعيفة، قال السيرافي إنها لغة قوم، ليس في لغتهم ضاد، فإذا احتاجوا إلى التكلم بها في العربية، اعتاصت عليهم، فربما أخرجوها ظاءا معجمة لإخراجهم إياها من طرف اللسان وأطراف الثنايا، وربما تكلفوا إخراجها من مخرج الضاد فلم يتأت لهم فخرجت بين الضاد والظاء.[1] انتهى

وهذه هي التي أشار إليها المناوي في شرح القاموس بقوله: وهي لغة، حكاها الفراء، لكنها نادرة غير فصيحة، وقال الإمام جار الله الزمخشري صاحب الكشاف في كتابه المفصل وهو إمام اللغة: والبواقي حروف مستهجنة، وهي الكاف كالجيم، والجيم كالشين، والضاد الضعيفة، وهي تقرب من الظاء والدال والصاد كالسين، والطاء كالظاء، والباء كالفاء... الخ[2]

وقال الإمام محمد طاهر في الكافية شرح الشافية: والضاد الضعيفة بين الضاد والظاء.[3] انتهیٰ

وقال الإمام الجاربردي في شرح الشافية على طريق التفريع. فكان بينهما انتهى.[4] يعنى أن الضاد الضعيفة هي التي تكون بين الضاد والظاء. وقال الحافظ ابن كثير في تفسيره: مسألة: والصحيح من مذهب العلماء أنه يغتفر الإخلال بتحرير ما بين الضاد والظاء لقرب مخرجيهما، وذلك أن الضاد مخرجها من أول حافة اللسان، وما يليها من الأضراس، ومخرج الظاء من طرف اللسان وأطراف الثنايا العليا، ولأن كلا من الحرفين من الحروف المجهورة، ومن الحروف الرخوة، ومن الحروف المطبقة، فلهذا كله اغتفر استعمال أحدهما مكان الآخر، لمن لا يميز ذلك، وأما حديث: «أنا أفصح من نطق بالضاد» فلا أصل له.[5] انتهى.

وقال الإمام النووي في المنهاج: ولو أبدل ضادا بظاء لم تصح قراءته في الأصح.[6] قال الشيخ الجلال المحلي في شرحه لتلك الكلمة: لتغيير النظم.[7] قال محشيه الشيخ عميرة البرلسی" قوله: لم تصح قراءته. هذا إذا لم يتعمد، وإلا فالوجه البطلان لتغيير المعنى.[8] انتهى

قال ابن حجر المكي في تحفة المحتاج شرح المنهاج: إذ ضل بمعنى غاب، وظل

---

1. الشافية لابن رجب (ص: ١٢٣)
2. المفصل في صنعة الإعراب للزمخشري (ص: ٥٤٦)
3. كفاية المفرطين في شرح الشافية لمحمد طاهر الفتني (ص: ٢٤٠)
4. شرح الشافية للعلامة الجاربردي (١/ ٣٣٩)
5. تفسير ابن كثير (١/ ٥٢)
6. المنهاج للنووي (ص: ٢٧)
7. كنز الراغبين شرح منهاج الطالبين للمحلي (ص: ٥٣)
8. حاشية عميرة على شرح المحلي (ص: ٥٣)

يفعل كذا بمعنى فعله نهارا، ولا نظير لعسر التمييز وقرب المخرج، لأن الكلام كما تقرر فيمن يمكنه النطق بها، ومن ثم صرحوا بأن الخلاف في قادر لم يتعمل وعاجز أمكنه التعلم، فترك إما عاجز عنه فتجزئه مطلقا، وقادر عليه متعمد له فلا تجزئه مطلقا.[1] انتهى

وقال في الدر المختار: وما يشق تمييزه كالضاد والظاء فأكثرهم لم يفسدها.[2] انتهى

قال الشامي في رد المحتار: قال في الخانية والخلاصة: الأصل فيما إذا ذكر حرفا مكان حرف، وغير المعنى إن أمكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد وإن يمكن إلا بمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين، والصاد مع السين المهملتين، والطاء مع التاء، قال أكثرهم لا تفسد. انتهى وفي خزانة الأكمل: قال القاضي أبو عاصم: إن تعمد ذلك تفسد، وإن جرىٰ على لسانه أو لا يعرف التمييز لا تفسد وهو المختار. انتهى[3] وفي التتارخانية: عن الحاوي حكي عن الصفار أنه كان يقول: الخطأ إذا دخل في الحروف لا يفسد.[4] انتهى

وفيها: وإذا لم يكن بين الحرفين اتحاد المخرج ولا قربة إلا أن فيه بلوى العامة كالذال مع الصاد أو الزاي المحض مكان الذال، والظاء مكان الضاد، لا تفسد عند بعض المشائخ. قلت: فينبغي على هذا عدم الفساد في إبدال الثاء سينا، والقاف همزة، كما هو لغة عوام زماننا، فإنهم لا يميزون بينهما، ويصعب عليهم جدا، كالذال مع الزاي ولا سيما على قول القاضي أبي عاصم وقول الصفار، وهذا كله قول المتأخرين، وقد علمت أنه أوسع، وأن قول المتقدمين أحوط. قال في شرح المنية: وهو الذي صححه المحققون، وفرعوا عليه، فاعمل بما تختار، والاحتياط أولى، سيما في أمر الصلاة التي هي أول ما يحاسب العبد عليها.[5] انتهى كلام المحقق الشامي.

وقال العلامة علي القاري في شرح الفقه الأكبر ما لفظه: وفي المحيط: سئل الإمام الفضلي عمن يقرأ الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة أو يقرأ أصحاب الجنة مكان أصحاب النار أو على العكس، فقال: لا تجوز إمامته، ولو تعمد يكفر. قلت: أما كون تعمده كفرا فلا كلام فيه، إذا لم يكن فيه لغتان ففي "ضنين" الخلاف. سامي.[6] انتهى بلفظه

---

[1] تحفة المحتاج للهيتمي (٢/ ٣٧)

[2] الدر المختار (١/ ٦٣٣)

[3] رد المحتار (١/ ٦٣٣)

[4] المصدر السابق.

[5] المصدر السابق.

[6] منح الروض الأزهر في شرح الفقه الأكبر للملا علي القاري (ص ٤٥٧)

فتحرر من هذه النقول صريحاً أن الضاد ليس مشابها صوت الظاء، وإن صوت الضاد المشابه صوت الظاء، من الحروف الضعيفة والمستهجنة، وهي غير فصيحة فليست من كلام الرب جل جلاله، لأن كلام الرب عزوجل في أعلیٰ درجات الفصاحة والبلاغة، وتأمل تصريح الفقهاء ببطلان صلاة المتعمد القادر على التعلم، وتمييز الضاد من الظاء، فإن ذلك صريح في الفرق بينهما، وإنه لا نظر لقرب المخرج مع القدرة على التعلم، وإخراج الضاد من مخرجه الأصلي الذي سبق بيانه موضحا من كلام أئمة اللغة والقراءات وغيرهما.

وقد غلط في هذه المسألة كثير من علماء الهند فأفتوا وصنفوا، بل وعلموا بأن مخرج الضاد من طرف اللسان وأطراف الثنايا عكس ما نقلناه من الفرق بين مخرج الحرفين، واغتروا بقول بعضهم لقرب مخرجهما، وهذا باطل، وقد علمت مما سبق بيانه أنه لا نظر لقرب المخرج مع القدرة على التمييز وإنه إنما يغتفر ذلك للعاجز عن التمييز والتعلم لا مطلقا. والله سبحانه وتعالیٰ أعلم

والحمد لله رب العالمين، وحسبنا الله ونعم الوكيل، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم، وصلى الله تعالیٰ على خير خلقه محمد وآله وأصحابه وأزواجه وذريته أجمعين والتابعين لهم بإحسان إلى يوم الدين.[1] آمين

کیا نماز میں "ربنا لك الحمد" بلند آواز سے کہنا چاہیے؟

سوال "ربنا لك الحمد" نماز میں بآواز بلند کہنا چاہیے یا نہیں؟

جواب بخاری شریف کی اس روایت سے بآواز بلند کہنا ثابت ہوتا ہے:

عن رفاعة بن رافع الزرقي قال: كنا يوما نصلي وراء النبيﷺ، فلما رفع رأسه من الركعة، قال: «سمع الله لمن حمده» قال رجل وراءه: ربنا لك الحمد، حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه، فلما انصرف، قال: «من المتكلم؟» قال: أنا، قال: «رأيت بضعة وثلاثين ملكا يبتدرونها، أيهم يكتبها أول»[2]

"رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا کہ ہم لوگ ایک دن نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، آپ نے جب رکوع سے سر مبارک اٹھایا، فرمایا: "سمع الله لمن حمده" آپ کے پیچھے ایک شخص نے کہا: "ربنا لك الحمد، حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه" پھر جب آپ نماز سے فارغ ہوئے،

[1] نور العين من فتاوى الشيخ حسين (ص: ۱۲۰۔۱۲۶)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٦)

فرمایا: کس نے یہ کلمات کہے؟ اس شخص نے کہا: میں نے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیس اور چند فرشتوں کو میں نے دیکھا، جھپٹے تھے ان کلموں کی طرف کہ کون ان کو پہلے لکھے گا۔"

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اس صحابی نے یہ کلمات بآواز بلند کہے تھے، جسے آپ ﷺ نے سنا اور انکار نہ فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ بآواز کہنا درست ہے، ورنہ آپ ضرور منع فرماتے۔ والله أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عصمت الله۔ عفا الله عنه الأعظم گڑھی البختاورگنجی، مدرس مدرسه أحمديه آره. الجواب صحيح. محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفي عنه. صح الجواب والله أعلم بالصواب، حرره راجي رحمت الله أبو الهدىٰ محمد سلامت الله المباركفوري الأعظم گڑھی.

قراءت خلف الامام سے متعلق چند سوالات:

سوال ① ابو خالد احمر سلیمان بن حیان جس کو تقریب میں "صدوق يخطئ" لکھا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے "جزء القراءة" (ص: ٥٧) میں فرمایا:

أبو خالد الأحمر عن ابن عجلان عن زيد عن أبي صالح عن أبي هريرة عن النبي ﷺ «إنما جعل الإمام ليؤتم به» زاد فيه: «وإذا قرأ فأنصتوا»

[ابو خالد الاحمد ابن عجلان سے، وہ زید سے، وہ ابو صالح سے، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ امام تو اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔ اس میں یہ لفظ زائد ہیں کہ جب وہ پڑھے تو تم خاموشی اختیار کرو]

اس ابو خالد سے امام بخاری رحمہ اللہ و مسلم رحمہ اللہ نے اپنی دونوں صحیح میں کہیں روایت کی ہے یا نہیں؟

② تفسیر ابن کثیر میں یہ عبارت ہے یا نہیں:

"قال علي بن أبي طلحة عن ابن عباس رضي الله عنهما قوله: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ﴾ يعني في الصلاة المفروضة"

[علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا کہ یہ آیت ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ﴾ فرض نماز کے متعلق ہے]

اول تو میرے خیال میں یہ عبارت ہی غلط ہے۔ یعنی علی نے ابن عباس سے کہا۔ یعنی قول کا صلہ عن کے ساتھ۔ یہ میرا خیال درست ہے یا نہیں؟

دوم: تقریب میں ہے:

"علي بن أبي طلحة سالم مولىٰ بني العباس، سكن حمص، أرسل عن ابن عباس، ولم يره"

[علی بن ابی طلحہ سالم مولی بنی العباس، حمص کا باسی، اس نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو دیکھا نہیں اور یہ ان سے مرسل روایت بیان کرتا ہے]

اگر یہی علی ہے تو ابن عباس کو کیا تعلیم کی ہوگی، جن کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں سمجھ کی تین بار دعا کی ہے۔ اگر اور کوئی علی بن ابی طلحہ ہو تو تفسیر موصوف کو دیکھ کر مع اُس کے حوالے کے اطلاع فرما دیں؟

③ حدیث «وإذا قرأ فأنصتوا» کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہیں صحیح کہا ہے؟ اگر کہیں پتا مل جائے تو اس سے بھی اطلاع فرما دیں۔

④ موطا امام محمد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے پتھر بھرنا الحمد پڑھنے والے کے منہ میں اور علقمہ سے آگ بھرنا مروی ہے یا نہیں؟ موطا کو ملاحظہ فرما کر تحریر فرما دیں۔

⑤ مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ میں ابراہیم سے کوئی ایسی روایت ہے کہ الحمد پڑھنے والا فاسق ہے؟

⑥ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت "صلی رسول اللّٰه علیه وآله وسلم الصبح، فثقلت علیه القراءة... الخ" [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قراءت بھاری ہوگئی] میں محمد بن اسحاق راوی کے بارے میں ذہبی نے میزان الاعتدال میں سلیمان تیمی سے کذاب ہونا اور امام مالک سے دجال ہونا نقل کیا ہو تو تحریر فرما دیں۔

جواب ① ابو خالد احمر سلیمان بن حیان سے امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ دونوں نے صحیحین میں روایت کی ہے، بلکہ کل اصحابِ ستہ نے ان سے روایت کی ہے۔ تقریب وخلاصہ ومیزان الاعتدال ان تینوں کتابوں میں ابو خالد ہذا کے نام کے اوپر علامت "ع" مرقوم ہے،[1] جس کا یہ مطلب ہے کہ یہ رجالِ کتب ستہ سے ہیں۔ "میزان الاعتدال" (١/ ٣٦٨) میں ابو خالد ہذا کی نسبت لکھا ہے: "قلت: الرجل من رجال الکتب الستة اھ" [میں کہتا ہوں کہ یہ کتبِ ستہ کے رجال میں سے ہے] لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سے بلا متابعت روایت نہیں کی ہے، بخلاف دیگر اصحابِ صحاح ستہ کے اور صرف ایک جگہ تعلیقاً بھی روایت کی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ مقدمہ فتح الباری (ص: ۴۲۷ چھاپہ دہلی) میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قلت: له عند البخاري نحو ثلاثة أحادیث من روایته عن حمید و هشام بن عروة و عبید اللّٰه بن عبد اللّٰه بن عمر، کلها مما توبع علیه، وعلق له عن الأعمش حدیثاً واحداً في الصیام، وروىٰ له الباقون" اھ

[میں کہتا ہوں کہ صحیح بخاری میں اس سے تقریباً تین احادیث حمید، ہشام بن عروہ اور عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر سے مروی ہیں۔ اس کی تمام روایات پر اس کی متابعت کی گئی ہے۔ (امام بخاری رحمہ اللہ) نے کتاب الصیام میں اعمش کے واسطے سے اس کی ایک حدیث معلق بیان کی ہے۔ اور دیگر (محدثین)

[1] میزان الاعتدال (٢/ ٢٠٠) تقریب التهذیب (ص: ٢٥٠) خلاصة تذهیب تهذیب الکمال للخزرجي (ص: ١٥١)

نے بھی اس سے روایت بیان کی ہے]

② تفسیر ابن کثیر (۴/ ۲۸۳) میں عبارت اس طرح ہے:

"قال علي بن أبي طلحة عن ابن عباس في الآية قوله: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾ يعني في الصلاة المفروضة، وكذا روي عن عبدالله بن المغفل"

[علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیتِ قرآنی: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾ کے بارے میں ان کا قول: "یعنی فرض نماز میں" روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن مغفل سے بھی اسی طرح روایت کیا گیا ہے]

اس عبارت میں عربیت کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ ایسی عبارت محدثین کے کلام میں بہت آتی ہے۔ اس عبارت میں تضمین ہے، یعنی "قَالَ" بمعنی "رَوىٰ" ہے، یعنی "روىٰ علي بن أبي طلحة عن ابن عباس الخ" یا عن صلہ ہے "راويا" محذوف کا جو "قال" کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی "قال علي بن أبي طلحة راويا عن ابن عباس الخ" اس عبارت کا یہ ترجمہ نہیں ہے کہ علی بن ابی طلحہ نے ابنِ عباس سے کہا، تاکہ علی کا معلم ابن عباس ہونا لازم آئے۔

اس اثر کا جواب یہ ہے کہ اس کی سند متصل نہیں ہے۔ علی بن ابی طلحہ، جو ابنِ عباس سے راوی ہیں، ان کو ابنِ عباس سے سماع اور لقا نہیں ہے۔ انھوں نے تفسیر ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مرسلاً روایت کی ہے۔ ثبت العرش ثم انقش!

تقریب میں ہے: "أرسل عن ابن عباس ولم يره"[1] خلاصہ میں ہے: "عن ابن عباس مرسلًا"[2] میزان الاعتدال (۲/ ۲۰۴) میں ہے: "أخذ تفسير ابن عباس عن مجاهد، فلم يذكر مجاهدا بل أرسله عن ابن عباس" [اس نے مجاہد رحمہ اللہ کے واسطے سے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر اخذ کی، پس اس نے مجاہد رحمہ اللہ کا واسطہ چھوڑ کر اس کو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرسل بیان کر دیا] نیز اس میں ہے: "قال دحيم: لم يسمع علي بن أبي طلحة التفسير من ابن عباس" [دحیم نے کہا کہ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر نہیں سنی] لیکن "الإتقان في علوم القرآن" کے "النوع الثمانون في طبقات المفسرين" میں ہے:

"قال قوم: لم يسمع ابن أبي طلحة من ابن عباس التفسير، وإنما أخذه عن مجاهد أو سعيد بن جبير، قال ابن حجر: بعد أن عرفت الواسطة وهي ثقة، فلا ضير في ذلك"[3] اهـ والله أعلم بالصواب

[ایک جماعت نے کہا کہ ابن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر نہیں سنی۔ اس نے تو صرف مجاہد رحمہ اللہ یا سعید بن جبیر سے تفسیر اخذ کی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا کہ جب ابن ابی طلحہ رحمہ اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما

---

① تقريب التهذيب (ص: ٤٠٢)

② الخلاصة للخزرجي (ص: ٢٧٥)

③ الإتقان في علوم القرآن للسيوطي (٢/ ٤٩٦)

کے درمیان موجود واسطے کا علم ہوگیا کہ وہ ثقہ ہے تو پھر ابن ابی طلحہ رحمہ اللہ کے یہ واسطہ چھوڑ کر بیان کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے]

③ مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی کی کتاب "إمام الکلام" (ص: ۱۱۳ مطبوعہ علوی لکھنو) میں ابن عبدالبر کی استذکار سے منقول ہے کہ حدیث «وإذا قرأ فأنصتوا» کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ اُس کی عبارت یہ ہے:

"وقد صحح هذا اللفظ أحمد بن حنبل، قال أبو بكر الأثرم: قلت لأحمد بن حنبل: من يقول عن النبي ﷺ من وجه صحيح: «إذا قرأ الإمام فأنصتوا» قال: حديث ابن عجلان الذي يرويه أبو خالد الأحمر، والحديث الذي رواه جرير عن التيمي، وقد زعموا أن المعتمر أيضاً رواه، قلت: نعم، قد رواه، قال: فأي شيء تريد؟ فقد صحح أحمد هذين الحديثين"[1] اھ

[احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان الفاظ کو صحیح قرار دیا ہے۔ ابوبکر الاثرم کا کہنا ہے کہ میں نے احمد بن حنبل کو کہا کہ نبی اکرم ﷺ سے اس روایت: «إذا قرأ الإمام فأنصتوا» کو صحیح سند کے ساتھ کون بیان کرتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ابن عجلان کی وہ حدیث جسے ابو خالد الاحمر روایت کرتا ہے اور وہ حدیث جسے جریر نے تیمی سے روایت کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ معتمر نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ میں نے کہا: ہاں! معتمر نے اسے روایت کیا ہے۔ اس نے کہا کہ پھر تو اور کیا چاہتا ہے؟ کہ یقیناً احمد نے ان دو حدیثوں کو صحیح کہا ہے]

④ موطا امام محمد (ص: ۹۸ چھاپہ مصطفائی) میں یہ ہے:

"قال محمد: أخبرنا بكير بن عامر حدثنا إبراهيم النخعي عن علقمة بن قيس قال: لأن أعض على جمرة، أحب إلي من أن أقرأ خلف الإمام"[2] اھ

[محمد رحمہ اللہ نے کہا کہ ہمیں بکیر بن عامر نے خبر دی، انھوں نے کہا کہ ہمیں ابراہیم نخعی نے بیان کیا، وہ علقمہ بن قیس سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں انگارے کو منہ میں رکھ کر چباؤں، مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں امام کے پیچھے قراءت کروں]

نیز اس میں ہے:

"قال محمد: أخبرنا داود بن قيس الفراء المدني، أخبرني بعض ولد سعد بن أبي وقاص

---

[1] دیکھیں: الاستذکار (۱/ ٤٦٦) نیز دیکھیں: توضیح الکلام (۲/ ۲٤۹)

[2] اس اثر کو نقل کرنے والے "محمد بن الحسن الشيباني" ضعیف ہیں۔ دیکھیں: لسان المیزان (۵/ ۱۲۱) اسی طرح "بکیر بن عامر" بھی ضعیف ہے اور ابراہیم نخعی کی علقمہ بن قیس سے روایت کے متعلق امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں: "أصحابنا ينكرون أن يكون إبراهيم سمع من علقمة" (المراسيل لابن أبي حاتم: ۹) نیز دیکھیں: توضیح الکلام (۲/ ۷۵۳)

أنه ذكر له أن سعدا قال: وددت أن الذي يقرأ خلف الإمام في فيه جمرة"[1]

[امام محمد رحمہ اللہ نے کہا کہ ہمیں داود بن قیس فراء مدنی نے خبر دی، انھوں نے کہا کہ مجھے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹوں میں سے کسی نے خبر دی، انھوں نے یہ بیان کیا کہ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے یہ بات پسند ہے کہ بلاشبہہ وہ شخص جو امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے، اس کے منہ میں آگ کا انگارہ ہو]

"قال محمد: أخبرنا [داود بن قيس الفراء أخبرنا] محمد بن عجلان أن عمر بن الخطاب قال: ليت في فم الذي يقرأ خلف الإمام حجرا"[2] اھ

[امام محمد رحمہ اللہ نے کہا کہ ہمیں داود بن قیس الفراء نے خبر دی، انھوں نے کہا کہ ہمیں محمد بن عجلان نے خبر دی کہ بلاشبہہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کاش اس شخص کے منہ میں پتھر ہو جو امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے]

مولوی عبدالحی صاحب مرحوم نے حاشیہ موطا میں علقمہ رحمہ اللہ کے قول کی نسبت یہ لکھا ہے:

"هذا تشديد بليغ على القراءة خلف الإمام، ولا بد أن يحمل على القراءة المشوشة لقراءة الإمام، والقراءة المفوتة لاستماعها، وإلا فهو مردود و مخالف لأقوال جمع من الصحابة والأخبار المرفوعة من تجويز الفاتحة خلف الإمام"[3] اھ

[امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں یہ تشدید بلیغ ہے۔ چناں چہ لازم ہے کہ اس کو اس قراءت پر محمول کیا جائے جو امام کے لیے قراءت کی تشویش کا باعث بنے اور وہ قراءت جو امام کی قراءت سے توجہ کو ہٹائے، ورنہ یہ تشدید مردود ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے اقوال کی مخالف ہے، نیز یہ ان مرفوع اخبار و احادیث کے بھی خلاف ہے، جو امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ کی قراءت کو جائز قرار دیتی ہیں]

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے اثر کی نسبت یہ لکھا ہے: "قال ابن عبد البر في الاستذكار: هذا حديث منقطع لا يصح" [ابن عبد البر نے "الاستذکار" میں کہا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے صحیح نہیں ہے] عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کی نسبت یہ لکھا ہے:

"يخالفه ما أخرجه الطحاوي عن يزيد بن شريك أنه قال: سألت عمر بن الخطاب عن القراء ة خلف الإمام، فقال لي: اقرأ، فقلت: وإن كنت خلفك؟ فقال: وإن كنت خلفي، فقلت: وإن قرأت؟ قال: وإن قرأت"[4] اھ

---

[1] موطأ الإمام محمد (١/ ٢٠٤) یہ اثر بھی ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: توضیح الکلام (٢/ ٧٣٨)

[2] موطأ الإمام محمد (١/ ٢٠٤) یہ اثر بھی منکر ہے، جس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

[3] التعليق الممجد على موطأ الإمام محمد (١/ ٢٠٠)

[4] التعليق الممجد على موطأ الإمام محمد (١/ ٢٠٤)

[وہ روایت اس کے مخالف ہے جسے امام طحاوی رحمہ اللہ نے یزید بن شریک سے روایت کیا ہے کہ بلاشبہہ انھوں نے کہا کہ میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ پڑھو۔ میں نے پوچھا: اگرچہ میں آپ کے پیچھے ہوں؟ تو انھوں نے کہا کہ اگرچہ تو میرے پیچھے ہو۔ میں نے پھر پوچھا کہ اگرچہ آپ قراءت کر رہے ہوں؟ انھوں نے کہا کہ اگرچہ میں قراءت کر رہا ہوں]

⑤ مصنف ابو بکر بن ابی شیبہ یہاں نہیں ہے، لیکن موطا امام محمد میں ابراہیم کا یہ قول منقول ہے: "إن أول من قرأ خلف الإمام رجل اتهم"[1] اھ [یقیناً سب سے پہلے جس شخص نے امام کے پیچھے قراءت کی، وہ ایک تہمت زدہ شخص تھا] مولوی عبدالحی صاحب مرحوم نے اس قول کے متعلق دو حاشیے لکھے ہیں، ایک یہ ہے: "قوله: رجل اتهم. قال القاري بصيغة المجهول أي نسب إلى بدعة أو سمعة" اھ [ان کا یہ قول "وہ آدمی تہمت زدہ تھا" علامہ قاری نے کہا ہے کہ یہ مجہول کے صیغے کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس آدمی کو بدعت یا ریا کاری کی طرف منسوب کیا گیا تھا] دوسرا یہ ہے: "يشير إلى أن القراء ة خلف الإمام بدعة محدثة، وفيه ما فيه"[2] اھ [یہ قول اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا نئی ایجاد کردہ بدعت ہے لیکن یہ محل نظر ہے]

⑥ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے میزان الاعتدال میں محمد بن اسحاق کے بارے میں سلیمان تیمی سے کذاب ہونا اور امام مالک سے دجال ہونا نقل کیا ہے۔ میزان الاعتدال (۲/۳۴۴) میں ہے:

"قال سليمان التيمي: كذاب" اھ [سلیمان تیمی نے کہا کہ وہ کذاب ہے] نیز اسی میں ہے:

"قال يحيىٰ بن آدم: ثنا ابن إدريس قال: كنت عند مالك، فقيل له: إن ابن إسحاق يقول: اعرضوا علي علم مالك فإني بيطاره؟ فقال مالك انظروا إلى دجال من الدجاجلة" اھ

[یحییٰ بن آدم نے کہا کہ ہمیں ابن ادریس نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ میں امام مالک رحمہ اللہ کے پاس تھا تو انھیں کہا گیا کہ ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ مالک کا علم مجھ پر پیش کرو، میں اس کا معالج (تفتیش کنندہ) ہوں تو امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ دجالوں میں سے ایک دجال کو دیکھو]

واضح رہے کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے میزان میں محمد بن اسحاق کا مفصل اور مبسوط ترجمہ لکھا ہے اور جروح اور تعدیلات جو کچھ ان کی نسبت واقع ہوئے ہیں، ان کو نقل کر کے کل جروح کا جواب دیا ہے اور آخر میں اپنی رائے ان کی نسبت یوں ظاہر کی ہے:

"فالذي يظهر لي أن ابن إسحاق حسن الحديث، صالح الحال، صدوق، وما انفرد به

---

① موطأ الإمام محمد (۱/ ۲۰۱) نیز دیکھیں: مصنف ابن أبي شيبة (۱/ ۳۳۱، ۷/ ۲۵۸) اس اثر پر نقد وتبصرے کے لیے دیکھیں: توضيح الكلام (۲/ ۷٦٥)

② التعليق الممجد (۱/ ۲۰۱)

ففيه نكارة فإن في حفظه شيئا، وقد احتج به أئمة، فالله أعلم، وقد استشهد مسلم بخمسة أحاديث لابن إسحاق ذكرها في صحيحه"[1] اھ

[پس مجھے جو بات سمجھ میں آئی ہے، وہ یہ کہ بلاشبہہ ابن اسحاق حسن الحدیث، صالح الحال اور صدوق ہے، جس روایت میں وہ منفرد ہو، اس میں نکارت ہوتی ہے، کیونکہ اس کے حافظے میں کچھ کمی ہے، ائمہ نے اس سے احتجاج کیا ہے۔ واللہ أعلم۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے پانچ احادیث سے استشہاد کرتے ہوئے اپنی صحیح میں ان کو درج کیا ہے]

مولوی عبدالحی صاحب مرحوم نے "إمام الكلام" میں صفحہ (۱۹۲) سے (۲۰۱) تک علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب کاشف اور حافظ ابن سید الناس کی کتاب "عيون الأثر" اور حافظ منذری کی کتاب "الترغيب والترهيب" سے محمد بن اسحاق کا مفصل اور مبسوط ترجمہ نقل کیا ہے، جس میں تمام جروح کے اجوبہ شافیہ مذکور ہیں۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے "فتح القدير" میں متعدد مواضع میں محمد بن اسحاق کی توثیق ثابت کی ہے۔[2] واللہ أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله

آمین بالجہر کی شرعی حیثیت:

سوال آمین بالجہر کہنا کیسا ہے اور بالجہر کہنے سے سامعین کی نماز میں نقصان آتا ہے یا نہیں؟

جواب جہری نماز میں سورت فاتحہ کے اختتام پر آمین بالجہر کہنا احادیثِ شریفہ سے ثابت ہے۔ حدیث کی معتبر کتابوں میں یہ احادیث درج ہیں، اس وقت صرف ایک دو حدیث ترمذی شریف سے لکھی جاتی ہے، اگر اور ضرورت ہو تو مطلع فرمایئے۔ ترمذی شریف (۱/۳۴ چھاپہ دہلی) میں ہے:

"حدثنا بندار نا يحيىٰ بن سعيد و عبد الرحمن بن مهدي قالا: نا سفيان عن سلمة بن كهيل عن حجر بن عنبس عن وائل بن حجر قال: سمعت النبي ﷺ قرأ غير المغضوب عليهم ولا الضالين، وقال: آمين، ومد بها صوته.

قال أبو عيسىٰ: حديث وائل بن حجر حديث حسن، وبه يقول غير واحد من أهل العلم من أصحاب النبي ﷺ والتابعين ومن بعدهم، يرون أن يرفع الرجل صوته بالتأمين ولا يخفيها، وبه يقول الشافعي و أحمد و إسحاق، قال أبو عيسىٰ: وسألت أبا زرعة عن هذا الحديث، فقال: حديث سفيان في هذا أصح، قال: روى العلاء بن صالح الأسدي عن سلمة بن كهيل نحو رواية سفيان.

---

① ميزان الاعتدال (۳/ ٤٧٥)

② فتح القدير (۳/ ۱۰۵، ۲۰۶، ۲۵۰)

قال أبو عيسىٰ: ثنا أبو بكر محمد بن أبان نا عبد الله بن نمير عن العلاء بن صالح الأسدي عن سلمة بن كهيل عن حجر بن عنبس عن وائل بن حجر عن النبيﷺ نحو حديث سفيان عن سلمة بن كهيل" [1] انتهى

مذکورہ بالا روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ وائل بن حجر صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود اپنے کان سے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ نے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھا تو آمین کہا اور لفظ "آمین" کے ساتھ اپنی آواز کھینچی۔ یعنی آواز کھینچ کر آمین کہا۔

اہلِ حدیث و امام شافعی و امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ و دیگر اکابرِ دین انھیں احادیثِ شریفہ کی پیروی سے جہری نماز میں سورۂ فاتحہ کے اختتام پر آمین جہر سے کہتے ہیں اور جب آمین بالجہر کہنا احادیثِ شریفہ سے ثابت ہے تو آمین بالجہر کہنے سے سامعین کی نماز میں نقصان کیونکر آ سکتا ہے؟ یہ بات کسی امام سے بھی منقول نہیں ہے، نہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اور نہ کسی امام سے ائمہ دین میں اور نہ کسی معتبر کتاب میں یہ بات لکھی ہے۔ بعض لوگ جو مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کی کوشش کرنا نہیں چاہتے، ایسی بے اصل باتیں کہہ کر بجائے اتفاق کے نزاع و اختلاف پھیلا دیتے ہیں، جس پر اس کے برے برے نتیجے مترتب ہو جاتے ہیں اور جب ان سے پوچھیے کہ یہ مسئلہ کس معتبر کتاب میں لکھا ہے یا کس امام نے بتایا ہے تو کچھ نشان و پتا نہیں دیتے اور نہ دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ اتفاق و اتحاد کے حصول میں کوشش کریں۔ واللہ أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

مدرکِ رکوع کی رکعت کا حکم:

سوال رکوع میں ملنے سے رکعت ہوتی ہے یا نہیں اور امام رکوع کی حالت میں ہو اور مقتدی الحمد پڑھ کر مل جائے، اس صورت میں رکعت ہوگی یا نہیں یا کیا حکم ہے؟

جواب رکوع میں ملنے سے رکعت نہیں ہوتی، بوجہ فوت ہو جانے قراءتِ فاتحہ کے جو ہر رکعت میں فرض ہے اور جو نماز کی ایسی رکنِ اعظم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نماز ہی فرما دیا ہے۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال: قال رسول اللهﷺ: «لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب» [2] (متفق عليه)

[(راوی) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے (نماز میں) سورۃ الفاتحہ نہ پڑھی، اس کی کوئی نماز نہیں ہے]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)

قال: إني سمعت رسول اللهﷺ يقول: «قال الله تعالىٰ: قسمت الصلاة بيني وبين عبدي نصفين»[1] الحديث (رواه مسلم، مشكوة، ص: ٧٠)

[(راوی) کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز (سورۃ الفاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا]

سوال بعد نماز فرائض پنج گانہ کے خود رسول اللہ ﷺ سے دعا میں ہاتھ کا اُٹھانا اور بعد ختم دعا کے منہ پر پھیرنا ثابت ہے یا نہیں؟

جواب بلوغ المرام کے ''باب الذکر و الدعاء'' میں ہے:

عن سلمان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللهﷺ: «إن ربكم حيي كريم، يستحي من عبده، إذا رفع يديه إليه أن يردهما صفرا» أخرجه الأربعة إلا النسائي، وصححه الحاكم[2]

''سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک تمھارا رب بڑا ہی حیا دار اور با کرم ہے کہ جب بندہ اپنے ہاتھوں کو اس کی طرف اٹھاتا ہے تو اس کو شرم آتی ہے کہ بندے کے ہاتھوں کو خالی پھیرے۔'' اس حدیث کو ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ نے روایت کیا اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عموماً دعا میں ہاتھوں کو اٹھانا مندوب و مستحب ہے۔ سنن ابی داود (ص: ٢١٠) میں ہے: ''عن ابن عباس قال: المسئلة أن ترفع يديك حذو منكبيك''[3] (الحديث) ''ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مسئلہ، یعنی خدائے تعالیٰ سے اپنی حاجتوں کو مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں تک اٹھائے۔'' حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے کتاب ''فض الوعاء في أحاديث رفع اليدين في الدعاء'' (ص: ٣) میں فرمایا: ''رجاله رجال الصحيح إلا العباس، ولا بأس به'' اھ ''اس حدیث کے سب راوی، سوائے عباس بن عبداللہ کے، صحیح کے راوی ہیں اور عباس بن عبداللہ بھی ''لا بأس به'' ہے۔'' یعنی وہ بھی مقبول راوی ہے۔

اس حدیث سے بھی وہی امر ثابت ہوتا ہے، جو پہلی حدیث سے ثابت ہوا تھا کہ عموماً دعا میں ہاتھوں کا اٹھانا منجملہ مندوبات و مستحبات ہے اور بلوغ المرام کے باب مذکور میں ہے:

''عن عمر رضی اللہ عنہ قال: كان رسول اللهﷺ إذا مد يديه في الدعاء، لم يرد هما حتى يمسح بهما وجهه، أخرجه الترمذي، وله شواهد، منها عند أبي داود من حديث ابن عباس وغيرها، و مجموعها يقتضي أنه حديث حسن''[4] اھ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٥٦) سنن ابن ماجه (٣٨٦٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٨٩)

[4] اس حدیث کی تخریج و تضعیف کے لیے دیکھیں: (ص: ٢١٩)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھوں کو دعا میں اٹھاتے تو جب تک ہاتھوں کو اپنے منہ کو نہیں مل لیتے تھے، ہاتھوں کو نہیں لوٹاتے تھے۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کے شواہد بہت ہیں، جن میں سے ایک ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، جس کو ابو داود نے روایت کیا ہے اور اس کے سوا اور بھی شواہد ہیں، جن کا مجموعہ اس بات کو مقتضی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور حدیث حسن ہے۔''

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عموماً جب دعا میں ہاتھ اٹھائے تو یہ مسنون ہے کہ ہاتھوں سے منہ کو مل بھی لے۔ پہلی حدیث سے تو عام دعا کا یہ حکم ثابت ہو چکا کہ اس میں ہاتھوں کو اٹھانا مندوب ہے اور اِس حدیث سے عام دعا کا یہ حکم ثابت ہوا کہ جب اس میں ہاتھوں کو اٹھائے تو ہاتھوں سے منہ کو مل لینا بھی مسنون ہے۔ اب جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز کے بعد کی دعا بالخصوص اس عام حکم دعا سے مستثنیٰ ہے تو اس دعوے کی دلیل مدعی کے ذمہ ہے، کیونکہ من ادعی فعلیه البیان.

پس اگر مدعی مذکور اپنے اس دعوے کو دلیل سے ثابت کرے گا، فعلی الرأس والعین، ورنہ اس کا یہ دعویٰ دیوار پر مارا جائے گا۔ اب ایک اور حدیث سن لیجیے، جس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ نماز کے اندر دعا میں ہاتھوں کا اٹھانا مسنون نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ نماز کے بعد کی دعا میں ہاتھوں کا اٹھانا مسنون ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم کبیر میں محمد بن یحییٰ اسلمی سے روایت کیا ہے اور حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے کتاب ''فض الوعاء في أحادیث رفع الیدین في الدعاء'' میں طبرانی سے بدیں الفاظ نقل کیا ہے:

''قال: رأیت عبد اللّٰه بن الزبیر ورأی رجلا رافعا یدیه یدعو قبل أن یفرغ من صلاته، فلما فرغ منها قال: إن رسول اللّٰه ﷺ لم یکن یرفع یدیه حتی یفرغ من صلاته''[1]

''محمد بن یحییٰ اسلمی نے کہا کہ عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کر رہا ہے۔ میں نے عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو اس سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا نہیں کرتے تھے، جب تک کہ نماز سے فارغ نہیں ہو لیتے۔''

اس کے بعد حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے کہا: ''رجاله ثقات'' یعنی اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں۔ واللّٰه أعلم بالصواب.

سوال بعد ہر صلاۃِ مکتوبہ کے امام کا ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا اور مقتدیوں کو آمین آمین کہنا اور اس کو ہر نماز کے بعد لازم کر لینا کیسا ہے؟ مشکوۃ المصابیح ''باب الذکر بعد الصلاۃ'' کی حدیث: ''عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: کان رسول اللّٰه ﷺ إذا سلم لم یقعد إلا مقدار ما یقول: اللهم أنت السلام ...'' الخ[2] (رواہ مسلم) [عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرنے کے بعد صرف اتنی دیر بیٹھتے، جتنی دیر میں یہ پڑھ لیں: ''اللهم أنت السلام... الخ'']

---

[1] المعجم الکبیر للطبراني (۱/ ۲۱۱/ ۳) یہ حدیث ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۲۵٤٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۹۲) مشکاۃ المصابیح (۱/ ۲۱۰)

تو ہر نماز کے بعد (سوائے فجر وعصر کے، کیونکہ دوسری روایتوں میں ان دونوں نمازوں کے پیچھے ذکر و دعا کرنے کا طلوع وغروبِ آفتاب تک ثبوت ملتا ہے) مناجات بہیئت مذکورہ کا التزام ومواظبت خلافِ سنت نبویہ معلوم ہوتا ہے؟

جواب ہر صلاۃ مکتوبہ کے بعد ہر شخص کو، خواہ امام ہو یا مقتدی یا منفرد، دعا مانگنا بلاشبہہ سنت سے ثابت ہے، لیکن ہر صلاۃِ مکتوبہ کے بعد امام اور مقتدیوں کا اس طریقے سے دعا مانگنے کو لازم کر لینا جو طریقہ سوال میں مذکور ہے، اس کا ثبوت سنت سے نہیں ملتا۔ لہٰذا التزام مذکور کو توڑ دینا مناسب ہے اور اس حکم میں کل صلوات مکتوبہ یکساں ہیں، ان میں سے فجر وعصر کے استثنا کی کوئی وجہ نہیں ہے، گو دوسری روایتوں سے ان دونوں نمازوں کے بعد ذکر و دعا کرنے کا طلوع وغروبِ آفتاب تک ثبوت ملتا ہو، لیکن ان سے بطریق مذکورہ سوال ان دونوں نمازوں کے بعد مانگنے کا ثبوت نہیں ملتا اور حدیث مندرجہ سوال کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سلام کے بعد باستثنائے مقدار "اللهم أنت السلام" کہنے کے اُس ہیئت پر نہیں بیٹھے رہتے تھے، جس ہیئت پر قبل سلام بیٹھے ہوتے، بلکہ دائیں یا بائیں طرف پھر کر مقتدیوں کے روبرو بیٹھ جاتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری کی حدیثِ ذیل سے یہ امر بخوبی واضح ہے:

قال البخاري في صحيحه: "باب يستقبل الإمام الناس إذا سلم. حدثنا موسىٰ بن إسماعيل قال: حدثنا جرير بن حازم قال: حدثنا أبو رجاء عن سمرة بن جندب قال: كان النبي ﷺ إذا صلىٰ صلاة أقبل علينا بوجهه..."[1] الخ، والله تعالىٰ أعلم

[امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں فرمایا ہے: اس بارے میں باب کہ جب امام سلام پھیر چکے تو وہ لوگوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے۔ ہمیں موسیٰ بن اسماعیل نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں جریر بن حازم نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں ابو رجا نے بیان کیا، انھوں نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ مکرم ﷺ جب نماز پوری کر لیتے تو (سلام پھیر کر) ہماری طرف منہ پھیر لیتے...]

ایک مقتدی اکیلا صف میں نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

سوال ایک مقتدی اکیلا صف میں نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور نہیں درست تو اگلی صف کے کنارے سے کسی مقتدی کو پیچھے لے لے یا بیچ میں سے یا جہاں سے چاہے اور اگلی صف میں جو ایک آدمی کی جگہ خالی ہوئی ہے، وہ خالی ہی رہے یا اس کے بائیں یا دائیں کے مقتدی سرک سرک کر اس کو بھر دیں؟

جواب ایک مقتدی تنہا صف میں نماز نہیں پڑھ سکتا:

عن علي بن شيبان أن رسول الله ﷺ رأى رجلا يصلي خلف الصف فوقف حتى انصرف الرجل، فقال له: «استقبل صلاتك، فلا صلاة لمنفرد خلف الصف» (رواه أحمد و ابن ماجه)[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۰۹)

[2] مسند أحمد (۲۳/٤)

[علی بن شیبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو صف کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ٹھہر گئے، حتی کہ وہ فارغ ہوگیا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا: دوبارہ نماز پڑھو، کیوں کہ صف کے پیچھے اکیلے شخص کی نماز نہیں ہوتی]

"وعن وابصة بن معبد أن رسول الله ﷺ رأى رجلا يصلي خلف الصف وحده فأمره أن يعيد صلاته" (رواه الخمسة إلا النسائي)①

[وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صف کے پیچھے ایک شخص کو تنہا نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا]

وفي رواية: سئل رسول الله ﷺ عن رجل صلىٰ خلف الصفوف وحده، فقال: «يعيد الصلاة» (رواه أحمد، نيل: ٣/ ٦١)②

[ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص کے متعلق پوچھا گیا، جس نے صفوں کے پیچھے اکیلے نماز پڑھی ہے تو فرمایا: وہ نماز کو دوبارہ پڑھے]

اگر صف میں جگہ نہ ہو تو بیچ صف میں سے ایک مقتدی کو کھینچ لے اور اس خالی جگہ کو کسی طرف کے مقتدی سرک سرک کر بھر دیں۔ داہنے یا بائیں کی قید حدیثوں سے معلوم نہیں ہوتی۔

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: «وسطوا الإمام، وسدوا الخلل» (رواه أبو داود)③

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام کو درمیان میں رکھو اور صفوں کے درمیان خلا کو پُر کرو]

حرره أبو الطيب محمد شمس الحق العظيم آبادي، عفي عنه.

اکیلا مقتدی کہاں کھڑا ہو؟

سوال ایک امام ہے اور ایک مقتدی ہے تو امام اور مقتدی پاؤں سے پاؤں اور مونڈھوں سے مونڈھے ملا کر کھڑے ہوں یا مقتدی کچھ پیچھے کھڑا ہوئے؟

جواب اکیلا مقتدی امام کے برابر کھڑا ہو، نہ پیچھے نہ آگے، کیونکہ اس کو امام کے داہنے کی طرف کھڑے ہونے کا حکم ہے اور اگر وہ پیچھے یا آگے کھڑا ہوگا تو حکم مذکور پر پورا عمل نہ ہوگا۔

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٨٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٠٣) مسند أحمد (٤/ ٢٢٨)

② مسند أحمد (٤/ ٢٢٨)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٨١) اس کی سند ضعیف ہے، کیوں کہ اس کی سند میں یحییٰ بن بشیر اور ان کی والدہ مجہول ہیں۔ دیکھیں: تمام المنة للألباني (ص: ٢٨٤)

نمازی کے کس قدر آگے سے گزرنا منع ہے؟

سوال نمازی کے کس قدر آگے سے گزرنا منع ہے؟

جواب نمازی کی نماز کی جو حد ہے، یعنی جہاں سترہ قائم کرنے کا حکم ہے، اس کے آگے سے گزر سکتا ہے، اس کے اندر گزرنا منع ہے۔ صحیحین میں ہے:

"عن أبي جحيفة: رأيت بلالا أخذ عنزة فركزها، وخرج رسول الله ﷺ في حلة حمراء مشمرا، صلى إلى العنزة بالناس ركعتين، ورأيت الناس والدواب يمرون بين يدي العنزة" (متفق عليه)[1]

[میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انھوں نے چھوٹا نیزہ لے کر گاڑ دیا، پھر رسول اللہ ﷺ سرخ جوڑا زیب تن کیے ہوئے تیزی سے تشریف لائے، آپ نے چھوٹے نیزے کی طرف رخ کر کے لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائیں اور میں نے لوگوں اور چوپاؤں کو نیزے کے آگے سے گزرتے ہوئے دیکھا]

سترہ قائم کرنے کی جگہ سجدہ گاہ کے آگے ہے، جو قریب ڈھائی تین ہاتھ کے ہے۔

"عن نافع أن عبد الله كان إذا دخل الكعبة مشىٰ قبل وجهه حين يدخل، وجعل الباب قبل ظهره، فمشىٰ حتى يكون بينه وبين الجدار الذي قبل وجهه قريبا من ثلاثة أذرع صلىٰ، يتوخىٰ المكان الذي أخبره به بلال أن النبي ﷺ صلىٰ فيه" (بخاري بعد باب الصلاة بين السواري في غير جماعة)[2]

[نافع بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کعبے کے اندر داخل ہوتے تو سامنے کی طرف چلتے اور دروازہ اپنی پیٹھ کی طرف چھوڑ دیتے، پھر اس طرح چلتے اور جب سامنے کی دیوار تقریباً تین ہاتھ رہ جاتی تو نماز پڑھتے تھے، اس طرح آپ اس جگہ نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے، جس کے متعلق بلال رضی اللہ عنہ نے انھیں بتایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے وہیں نماز پڑھی تھی]

"وعن سهل بن سعد قال: كان بين مصلىٰ رسول الله ﷺ وبين الجدار ممر الشاة" (بخاري، باب قدر كم ينبغي أن يكون بين المصلي والسترة)[3]

[سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی جائے نماز اور دیوار کے درمیان ایک بکری کے گزرنے کے برابر جگہ ہوتی تھی]

قال الحافظ في الفتح (٢/ ٢٨٦): "قال ابن بطال: هذا أقل ما يكون بين المصلي

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٠٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٠٨)

والسترة، يعني قدر ممر الشاة، وقيل: أقل ذلك ثلاثة أذرع، لحديث بلال أن النبيﷺ صلى في الكعبة، وبينه وبين الجدار ثلاثة أذرع، كما سيأتي قريباً بعد خمسة أبواب، وجمع الداودي بأن أقله ممر الشاة، وأكثره ثلاثة أذرع، وجمع بعضهم بأن الأول في حال القيام والقعود، والثاني في حال الركوع والسجود" انتهىٰ ما في الفتح.

وقال في نيل الأوطار: "والظاهر أن الأمر بالعكس (يعني أن ثلاثة أذرع في حالة القيام وقدر ممر الشاة في حال الركوع والسجود) وقال ابن الصلاح: قدروا ممر الشاة بثلاثة أذرع، قال الحافظ: ولا يخفىٰ ما فيه، وقال البغوي: استحب أهل العلم الدنو من السترة، بحيث يكون بينه وبينها قدر إمكان السجود، وكذلك بين الصفوف"[1]

وقد ورد الأمر بالدنو منها، وفيه بيان الحكمة في ذلك، وهو ما رواه أبو داود وغيره من حديث سهل بن أبي حثمة مرفوعاً: «إذا صلى أحدكم إلى سترة فليدن منها، لا يقطع الشيطان عليه صلاته» انتهى (فتح الباري: ٢/ ٢٨٦)

[حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں: ابن بطال نے کہا ہے کہ یہ وہ کم از کم جگہ ہے، جو نمازی اور سترے کے درمیان ہونی چاہیے، یعنی بکری کے گزرنے کے برابر، ایک قول کے مطابق اس کی کم از کم مقدار تین ہاتھ ہے، کیوں کہ بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کعبے میں نماز پڑھی تو آپ ﷺ کے درمیان اور دیوار کے درمیان تین ہاتھ کے برابر فاصلہ تھا، جیسا کہ پانچ ابواب کے بعد آ رہا ہے۔

امام داودی نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ اس کی کم از کم مقدار بکری گزرنے کے برابر اور زیادہ سے زیادہ تین ہاتھ ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس طرح بھی دونوں حدیثوں میں تطبیق دی ہے کہ پہلی کیفیت قیام اور قعدے کے وقت ہے اور دوسری رکوع و سجود کے وقت ہے۔ لیکن نیل الاوطار میں امام شوکانی نے کہا ہے کہ حدیث سے اس کے برعکس ظاہر ہوتا ہے (یعنی تین ہاتھ رکوع و سجود کے وقت اور بکری کے گزرنے کے برابر قیام و قعدے کے وقت ہے) حافظ ابن الصلاح نے کہا ہے کہ علما نے بکری گزرنے کی مقدار تین ہاتھ بتائی ہے، لیکن حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کی کمزوری عیاں ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ اہلِ علم نے سترے کے اس قدر قریب ہونا مستحب قرار دیا ہے کہ نمازی اور سترے کے درمیان اتنی جگہ ہو کہ بہ آسانی سجدہ کرنا ممکن ہو اور اتنا ہی فاصلہ صفوں کے درمیان ہونا چاہیے۔

سترے کے قریب ہونے کا حکم بھی حدیث میں مروی ہے، جس میں اس کی حکمت بھی بیان ہوئی ہے۔ چناں چہ امام ابو داود وغیرہ سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی ایک

[1] نيل الأوطار (٣/ ٣)

نماز پڑھے تو سترے کے قریب ہو جائے، کہیں شیطان اس پر اس کی نماز کو قطع نہ کر دے]

اور یہ حکم ہے کہ اگر کوئی نمازی اور اس کے سترے کے درمیان سے گزرے تو نمازی اس کو جس طرح ہو سکے، روکے:

عن أبي سعيد قال: سمعت النبيﷺ يقول: «إذا صلى أحدكم إلى شيء يستره من الناس فأراد أحد أن يجتاز بين يديه فليدفعه، فإن أبىٰ فليقاتله فإنما هو شيطان» (1)

(بخاري، باب يرد المصلي من مر بين يديه)

[ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کسی ایسی چیز کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے جو اسے لوگوں سے چھپا رہی ہو (یعنی کسی چیز کو سترہ بنا کر نماز پڑھے) اور پھر بھی کوئی شخص اس کے آگے سے گزرنا چاہے تو وہ اسے روکے، لیکن اگر وہ باز نہ آئے تو پھر وہ اس سے لڑے، کیوں کہ وہ شیطان ہے]

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ نمازی کی نماز کی جگہ کی حد اس کے کھڑے ہونے کی جگہ سے سجدہ گاہ تک ہے، اس درمیان سے گزرنا منع ہے اور اس کے آگے سے درست ہے، اسی مدعا کی موید صحیحین کی یہ روایت بھی ہے:

"عن ابن عباس قال: أقبلت راكبا على أتان، وأنا يومئذ قد ناهزت الاحتلام، و رسول اللهﷺ يصلي بالناس بمنىً إلى غير جدار فمررت بين يدي بعض الصف فنزلت، وأرسلت الأتان ترتع، ودخلت في الصف فلم ينكر ذلك عليَّ أحد" (متفق عليه) (2)

[ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: میں ایک دن گدھی پر سوار ہو کر آیا، میں ان دنوں قریب البلوغ تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت کسی دیوار کی اوٹ لیے بغیر منیٰ میں نماز پڑھا رہے تھے، پس میں ایک صف کے آگے سے گزرا، پھر میں گدھی سے اترا اور اسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود صف میں شامل ہو گیا اور کسی نے بھی مجھ پر اعتراض نہ کیا]

مسجد کے دروں میں نماز پڑھنا:

سوال مسجد کے دروں میں نماز جماعت کی پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب مسجد کے درّوں میں نماز جماعت پڑھنا جائز نہیں ہے۔ عبد الحمید بن محمود کہتے ہیں کہ ایک امیر کے پیچھے ہم لوگوں نے نماز پڑھی، تنگی جگہ کی وجہ سے میں نے دو ستون کے درمیان نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسولِ خدا ﷺ کے زمانے میں ہم لوگ اس سے بچتے تھے۔

"عن عبد الحميد بن محمود قال: صلينا خلف أمير من الأمراء فاضطرنا الناس، فصلينا

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٠٥)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٠٤)

بین الساریتین، فلما صلینا قال أنس بن مالك: کنا نتقي هذا علیٰ عهد رسول اللّٰه ﷺ"[1]

[عبدالحمید بن محمود بیان کرتے ہیں کہ ہم نے امرا میں سے ایک امیر کے پیچھے نماز پڑھی۔ لوگوں نے ہمیں مجبور کر دیا، تو ہم نے دوستونوں کے درمیان نماز ادا کی۔ پھر جب ہم نماز پڑھ چکے تو انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مسعود میں اس سے بچا کرتے تھے]

اگرچہ اس حدیث کے راوی عبدالحمید بن محمود پر بعضوں نے جرح بھی کی ہے،[2] مگر حاکم نے اس کی تصحیح اور تخریج ان لفظوں کے ساتھ کی ہے:

"کنا ننهیٰ عن الصلاة بین السواري ونطرد عنها"[3] (نیل الأوطار: ۳/ ۶۱، ۶۹)

[ہمیں دوستونوں کے درمیان صف بنانے سے منع کیا جاتا تھا اور ہم کو اس سے سختی کے ساتھ روکا جاتا تھا]

نماز باجماعت میں بارش کے وقت نمازی کیا کریں؟

سوال صحنِ مسجد میں جماعت قائم ہونے کے تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہوگئی:

① پس مصلین کو بحالہ بھیگتے ہوئے نماز ادا کرنا چاہیے؟

② یا امام ومقتدی کو بڑھ کر اندر مسجد داخل ہو کر نماز ادا کرنا چاہیے؟

③ یا نیتوں کو توڑ کر پھر سے جماعت قائم کی جائے؟

جواب ① صورت مسئول عنہا میں مصلیانِ مسجد بھیگتے ہوئے نماز پوری ادا کریں، اگر بھیگنے میں ان کو خوف ضرر نہ ہو۔

② آگے بڑھ کر اندر داخل ہو کر نماز پوری کریں، اگر بھیگنے سے خوف ضرر ہو، بشرطیکہ آگے بڑھ کر اندر مسجد داخل ہونے میں استقبالِ قبلہ فوت نہ ہو اور بشرطیکہ اگر صحن مسجد سے داخل مسجد تک ایک صف کے قدر سے زیادہ مسافت یکبارگی اس مسافت کو طے نہ کریں، بلکہ بقدر ایک صف کے آگے بڑھیں، پھر کچھ ٹھہر جائیں، پھر کسی قدر آگے بڑھیں، پھر ٹھہر جائیں۔

③ اگر ان دونوں شرطوں میں سے کوئی شرط بھی فوت ہو جائے تو پھر سے جماعت قائم کریں۔ یہ جواب فقہ کے موافق ہے۔ حدیث کا جواب چنداں اس کے خلاف نہیں ہے۔ حدیث کے تفصیلی جواب کی کارڈ میں گنجایش نہیں ہے۔ فتاوی عالمگیری (۱/ ۶۵ مطبوعہ مصطفائی) میں ہے:

---

① سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۲۹) مسند أحمد (۳/ ۱۳۱)

② ان کو نسائی، ابن حبان، ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ثقہ اور امام دارقطنی نے "یحتج به" کہا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "قال عبد الحق في الأحکام: لا یحتج به، فرد علیه ابن القطان وقال: لم أر أحدا ذکره في الضعفاء" (تهذیب التهذیب: ۶/ ۱۱۰)

③ یہ سیدنا قرہ بن ایاس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ ہیں۔ دراصل امام حاکم رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے: "کلا الإسنادین صحیحان" (المستدرك: ۱/ ۳۳۹) نیز اس حدیث کو امام ابن خزیمہ و ابن حبان نے صحیح اور علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔

"المشي في الصلاة إذا كان مستقبل القبلة لا يفسد، إذا لم يكن متلاحقا... إلى قوله: وإذا استدبر القبلة فسدت، كذا في الظهيرية، و لو مشىٰ في صلاته مقدار صف واحد لم تفسد صلاته، ولو كان مقدار صفين إن مشىٰ دفعة واحدة فسدت صلاته، وإن مشى إلى صف، ووقف، ثم إلى صف، لا تفسد، كذا في فتاوىٰ قاضي خان" اھ

[دورانِ نماز قبلے کی طرف چلنا نماز کو خراب نہیں کرتا، بشرطیکہ ایسا مسلسل نہ ہو...اگر وہ قبلے کی مخالف سمت چلے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ ظہیریہ میں ایسے ہی ہے۔ اگر وہ اپنی نماز میں ایک صف کی مقدار میں چلے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اگر وہ یک مشت دوصفوں کی مقدار میں چلے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اگر وہ ایک صف کی مقدار میں چل کر ٹھہر جائے اور پھر ایک صف کی مقدار میں چلے تو اس کی نماز خراب نہیں ہوگی۔ فتاویٰ قاضی خان میں بھی ایسے ہی بیان ہوا ہے]

"رد المحتار" (۱/ ۴۲۱ مطبوعہ مصر) میں ہے:

"في الحلية عن الذخيرة أنه روي أن أبا برزةﷺ صلىٰ ركعتين، آخذاً بقياد فرسه، ثم انسل من يده، فمضىٰ الفرس علىٰ القبلة، فتبعه حتى أخذ بقياده، ثم رجع ناكصا على عقبيه، حتى صلى الركعتين الباقيتين. قال محمد في السير الكبير: وبهذا نأخذ، ثم ليس في هذا الحديث فصل بين المشي القليل والكثير جهة القبلة، فمن المشائخ من أخذ بظاهره، ولم يقل بالفساد، قل أو كثر... إلى قوله: والحديث خص حالة العذر فيعمل بالقياس في غيرها"

[مروی ہے کہ ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے گھوڑے کی لگام کو تھام کر دو رکعتیں پڑھائیں، پھر ان کے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی اور گھوڑا قبلے کی جانب بھاگ گیا۔ ابو برزہ رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے گئے اور اس کی لگام کو پکڑ لیا، پھر اپنی ایڑھیوں کے بل واپس آئے اور باقی کی دو رکعتیں پڑھائیں۔ امام محمد رحمہ اللہ نے "السير الكبير" میں فرمایا کہ ہم اسی سے دلیل پکڑیں گے۔ پھر یہ کہ اس حدیث میں قبلے کی جانب کم یا زیادہ چلنے میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ مشائخ میں سے بعض نے اس حدیث کے ظاہر سے دلیل لیتے ہوئے فرمایا ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوگی، خواہ وہ تھوڑی مقدار میں چلے یا زیادہ مقدار میں ... مذکورہ حدیث عذر کی حالت کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا اس کے علاوہ دیگر حالات میں قیاس پر عمل کیا جائے گا]

صفحہ (۴۲۲) میں ہے:

"وإن كان بعذر، فإن كان للطهارة عند سبق الحدث أو في صلاة الخوف لم يفسدها، ولم يكره قل أو كثر، استدبر أو لا" اھ

[اگر ایسا کرنا کسی عذر کے ساتھ ہو، پس اگر وہ سابقہ حدث سے طہارت حاصل کرنے کے لیے ہو یا نمازِ خوف میں ہو تو یہ نماز کو فاسد نہیں کرے گا اور ایسا کرنا مکروہ بھی نہیں ہے، خواہ یہ چلنا کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں، وہ پیچھے کی طرف چلے یا نہ]

جاننا چاہیے کہ اگر نمبر ② میں کوئی ایسا عذر پیش آ جائے کہ دونوں شرطوں کی رعایت دشوار ہو تو ایسے عذر کی حالت میں دونوں شرطیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۲/ رجب ۱۳۳۲ھ)

تکرارِ نماز با جماعت کا حکم:

سوال ① زید ایک مسجد کا امام مقرر کیا ہوا ہے، اس نے جماعت کو نماز پڑھائی، اس کے بعد بکر نے اسی زید کے مصلیٰ پر جا کر امامت کی اور اس نے بھی چار پانچ اشخاص کے ساتھ نماز پڑھی، تو بکر نے یہ کام جائز کیا یا ناجائز؟

② کوئی امام مقرر بھی نہ ہو، تاہم کوئی شخص اس کے مصلے پر، جس پر فرض نماز ہو چکی ہو، اسی وقت اس مصلے پر دوسرا شخص نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا بالکتاب والسنة.

جواب جس مسجد میں ایک بار جماعت ہو چکی ہو، اسی مسجد میں دوبارہ جماعت سے نماز پڑھنا، اس کا ناجائز ہونا کسی صحیح حدیث میں میری نظر سے نہیں گزرا ہے، خواہ اس مسجد کا امام مقرر ہو یا نہ ہو اور امام مقرر پہلی جماعت کرا چکا ہو یا دوسرے شخص نے پہلی جماعت کرائی ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (٤/ ربیع الثاني ۱۳۳۱ھ)

بلا عذر مسجد کو چھوڑ کر گھر میں نماز پڑھنے کا حکم:

سوال ایسی مسجد کہ قرب و جوار میں جہاں پنج گانہ اذان نماز و جمعہ ادا کیے جاتے ہوں اور کوئی شخص علیحدہ اپنے مکان میں نماز ادا کیا کرے، اذان کی آواز بھی سنتا ہو، تارک السنة النبویّة ہے یا نہیں؟ ایسے شخص کی نماز مطابق احادیث صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟ کوئی عذر شرعی بھی نہیں۔

جواب بلا عذر ایسی مسجد کی جماعت چھوڑ کر علیحدہ نماز پڑھنا ہرگز جائز نہیں ہے اور نہ ایسی نماز قبول ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ سعادت مہد میں کھلے ہوئے منافق کے سوا اور کوئی بلا عذر ایسی جماعت سے علیحدہ نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ ایسا مریض جو بغیر دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک دیے ہوئے اپنے آپ کو مسجد حاضر نہیں کر سکتا ہے، وہ بھی غیر حاضر نہیں رہتا تھا، بلکہ دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک دے کر ضرور حاضر ہوتا تھا اور مسجد کے پڑوسی نابینا جن کا کوئی دستگیر نہیں ہوتا، ان کا بھی یہ عذر نابینائی مسموع نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کو بھی حاضر ہونے کا حکم ہوتا تھا اور خود حضرت رسول اللہ ﷺ اپنے مرض الموت میں اس وقت تک شریکِ جماعت ہوا کیے، جب تک کہ دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک دے کر حاضر مسجد ہو سکتے تھے اور ایسی جماعت میں حاضری کی ایسی سخت تاکید تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر حاضر ہونے والوں کو مع ان کے گھروں کے پھونک دینے کا قصد ظاہر فرمایا تھا۔ الحاصل بلا عذر ایسی جماعت چھوڑ کر

علیحدہ نماز پڑھنا طریقہ اسلامی کے سراسر خلاف اور موجبِ ضلالت ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ [البقرۃ: ٤٣] [اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو]

نماز پنج گانہ میں قنوت اور دعا کے الفاظ:

سوال ① قنوت نمازِ پنج گانہ میں پڑھنے کی سند تحریر فرمائیے۔

② تخصیص بھی کسی دعا کی ہے یا نہیں؟

جواب ① عن أبي هريرة قال: لأقربن صلاة النبيﷺ، فكان أبو هريرة يقنت في الركعة الآخرة من صلاة الظهر، وصلاة العشاء، وصلاة الصبح، بعد ما يقول سمع الله لمن حمده، فيدعو للمؤمنين ويلعن الكفار.[1] وعن أنس قال: كان القنوت في الفجر والمغرب.[2] (صحيح بخاري)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں تمھیں نبی مکرم ﷺ جیسی نماز پڑھاؤں گا، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ظہر، عشا اور صبح کی نمازوں کی آخری رکعت میں "سمع الله لمن حمده" کہنے کے بعد قنوت کرتے، مسلمانوں کے حق میں دعا کرتے اور کافروں پر لعنت فرماتے اور انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قنوت فجر اور مغرب میں تھی]

"وظاهر سياق حديث الباب أن جميعه مرفوع، ولعل هذا هو السر في تعقيب المصنف له بحديث أنس، إشارة إلى أن القنوت في النازلة لا يختص بصلاة معينة" اھ

(فتح الباري: ٤/ ٤٣٦، مطبوعہ دهلی)

[باب میں مذکور حدیث کے سیاق کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری حدیث مرفوع ہے۔ شاید مصنف کے اس حدیث کے متصل بعد انس رضی اللہ عنہ کی حدیث لانے میں یہی راز ہے، یہ اشارہ کرتے ہوئے کہ قنوتِ نازلہ کسی متعین نماز کے ساتھ خاص نہیں ہے]

«وعن أبي هريرة أن رسول اللهﷺ كان إذا أراد أن يدعو على أحد أو يدعو لأحد، قنت بعد الركوع فربما قال: إذا قال سمع الله لمن حمده، ربنا لك الحمد، اللّٰهم أنج الوليد بن الوليد، وسلمة بن هشام، وعياش بن أبي ربيعة، اللهم اشدد وطأتك على مضر، واجعلها سنين كسني يوسف، يجهر بذلك... الخ» (متفق عليه. مشكوة شريف مطبوعه أنصارى، ص: ١٠٥)[3]

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کے خلاف بد دعا یا کسی کے حق میں دعا کرنے کا ارادہ فرماتے تو رکوع کے بعد قنوت (میں ایسا) کرتے۔ راوی نے کبھی یوں بھی کہا کہ جب آپ ﷺ

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٦)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٥)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٥)

"سمع الله لمن حمده، ربنا لك الحمد" کہہ چکتے تو فرماتے: اے اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات دے۔ قبیلہ مضر پر اپنی سزا سخت کر دے اور ان پر ایسا قحط مسلط کر دے، جیسا کہ قومِ یوسف پر آیا تھا۔ آپ ﷺ بلند آواز سے یہ دعا کیا کرتے تھے]

"وعن ابن عباس قال: قنت رسول اللهﷺ شهرا متتابعاً في الظهر والعصر والمغرب والعشاء وصلاة الصبح، إذا قال سمع الله لمن حمده من الركعة الآخرة، يدعو على أحياء من بني سليم على رعل وذكوان وعصية، ويؤمن من خلفه" (رواه أبو داود)[1]

[ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بیان منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینا متواتر ظہر، عصر، مغرب، عشا اور فجر کی نمازوں میں قنوت پڑھی۔ ہر نماز کی آخری رکعت میں "سمع الله لمن حمده" کہنے کے بعد بنوسلیم میں سے رعل، ذکوان اور عصیہ کے قبائل پر بد دعا کرتے تھے اور آپ ﷺ کے پیچھے والے آمین کہتے تھے]

"وفي صحيح ابن خزيمة عن أنس أن النبيﷺ كان لا يقنت إلا إذا دعا لقوم أو دعا علىٰ قوم" (فتح الباري، ص: ٥٤٠)[2]

[صحیح ابن خزیمہ میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بلاشبہہ نبی مکرم ﷺ اسی وقت قنوت پڑھتے، جب کسی قوم کے لیے دعا یا کسی قوم کے خلاف بد دعا کرنا ہوتی]

"وروى الخطيب في كتاب القنوت من حديث محمد بن عبد الله الأنصاري ثنا سعيد بن أبي عروبة عن قتادة عن أنس أن النبيﷺ كان لا يقنت إلا إذا دعا لقوم أو دعا عليهم، وهذا سند صحيح، قاله صاحب تنقيح التحقيق" (فتح القدير: ١/ ١٨٦)[3] والله أعلم بالصواب

[خطیب نے کتاب القنوت میں محمد بن عبداللہ انصاری کی حدیث روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعید بن ابی عروبہ نے بیان کیا، وہ قتادہ سے اور قتادہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اسی وقت قنوت پڑھتے، جب کسی قوم کے حق میں دعا یا ان کے خلاف بد دعا کرنا مقصود ہوتا۔ اس کی سند صحیح ہے، جیسا کہ صاحبِ "تنقيح التحقيق" نے کہا ہے]

(۲) قنوتِ نوازل میں اس امر کی تخصیص ہے کہ اس میں مومنین کی فتح و نصرت اور کفار کی، جو مزاحمین مسلمین ہوں، ہزیمت و شکست کی دعا ہو، جیسا کہ حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ و حدیثِ انس رضی اللہ عنہ سے جو سوال نمبر ① کے جواب میں منقول ہوئیں، ظاہر ہے۔ اگر اس مضمون کی دعا کے خاص الفاظ حضرت رسالت ﷺ سے مل جائیں تو ازیں چہ بہتر،

① سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٤٣)

② صحيح ابن خزيمة (١/ ٣١٤)

③ تنقيح التحقيق للذهبي (١/ ٢١٩)

کیونکہ جو خیر و برکت ان میں مرجو ہے، وہ دوسرے الفاظ میں مرجو نہیں ہے، ورنہ جو دعا متضمن مضمون مذکورہ بالا پڑھی جائے، کافی ہے، کیونکہ اس باب میں تخصیص کسی دعا کی بلفظ اس طرح پر کہ انھیں الفاظ سے پڑھی جائے، نہ دوسرے الفاظ سے، کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ اس مضمون کی ماثور دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے:

عن عبداللّٰه بن أبي أوفىٰ قال: دعا رسول اللّٰهﷺ یوم الأحزاب علىٰ المشرکین، فقال: «اللّٰھم منزل الکتاب سریع الحساب، اللّٰھم اھزم الأحزاب، اللّٰھم اھزمھم وزلزلھم» [1] (متفق علیه، مشکوة شریف، ص: ۲۰۵)

[عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے دن مشرکین کے خلاف دعا فرمائی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! اے کتاب نازل کرنے والے! اے جلد حساب لینے والے! اے اللہ! جماعتوں کو شکست دے دے۔ اے اللہ! انھیں شکست دے اور انھیں لڑکھڑا دے]

وفي روایة: «اللّٰھم منزل الکتاب ومجري السحاب، وھازم الأحزاب، اھزمھم وانصرنا علیھم» [2] (نزل الأبرار، ص: ۳۲٤)

[ایک روایت میں یہ الفاظ ہے: اے اللہ! اے کتاب نازل کرنے والے! اے بادل کو چلانے والے! اے جماعتوں کو شکست دینے والے! ان کو شکست دے اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما]

دوسری دعا یہ ہے:

«اللّٰھم إني أسألك [النعیم یوم العیلة و] الأمن یوم الخوف، اللّٰھم إني عائذ بك من شر ما أعطیتنا، ومن شر ما منعتنا، اللّٰھم حبب إلینا الإیمان، وزینه في قلوبنا، وکره إلینا الکفر والفسوق والعصیان، واجعلنا من الراشدین، اللّٰھم توفنا مسلمین، وألحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین، اللّٰھم قاتل الکفرة الذین یکذبون رسلك، ویصدون عن سبیلك، واجعل علیھم رجزك وعذابك، إله الحق آمین» (أخرجه النسائي، وھذا لفظه، وابن حبان، وصححه الحاکم في المستدرك، وقال: صحیح علی شرط الشیخین) [3] واللّٰه أعلم بالصواب

[اے اللہ! میں تجھ سے (تنگی کے دن نعمت اور) جنگ کے دن امن کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں، اس کے شر سے جو تو نے ہمیں دیا اور جو تو نے ہم سے روک لیا۔ اے اللہ! ہمارے لیے ایمان کو محبوب بنا دے اور اسے ہمارے دلوں میں مزین کر دے اور کفر، گناہ اور نافرمانی کو ہمارے لیے ناپسندیدہ بنا دے اور ہمیں ہدایت والے بنا دے۔ اے اللہ! ہمیں مسلمان ہونے کی حالت میں فوت

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۷۷۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷٤۲)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۸۰٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷٤۲)

[3] مسند أحمد (۳/ ٤۲٤) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ۱۵٦) الأدب المفرد (ص: ۲٤۳) المستدرك للحاکم (۳/ ۲٦)

کر اور ہمیں رسوائی کے بغیر اور فتنہ زدہ بنائے بغیر نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔ اے اللہ! ان کافروں کو، جو تیرے رسولوں کو جھٹلاتے اور تیری راہ سے روکتے ہیں، ہلاک کر اور ان پر اپنا غصہ اور عذاب نازل فرما۔ اے الٰہ الحق! ہماری دعا قبول فرما۔ اسے نسائی نے روایت کیا اور یہ الفاظ اسی کے ہیں۔ نیز ابن حبان نے اسے روایت کیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی مستدرک میں اسے صحیح کہا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ روایت شیخین کے شرط پر صحیح ہے]

کتبہ: محمد عبداللّٰہ (مہر مدرسہ)

فوت شدہ نماز کی قضا:

سوال اگر عصر کی نماز ایک شخص بھول گیا اور سورج ڈوبتے وقت اس کو یاد آئی، اب پہلے کون سی نماز پڑھے: عصر کی یا مغرب کی؟ ایسا ہی صبح کی نماز نہیں پڑھی، سو گیا اور سورج نکلتے وقت اٹھا، اب پڑھے یا نہیں؟

جواب جو شخص عصر کی نماز بھول گیا اور سورج ڈوبتے وقت یاد آ گئی، اسی وقت پڑھ لے، اسی طرح جو شخص سو گیا اور فجر کی نماز نہیں پڑھی اور سورج نکلتے وقت اٹھا، وہ بھی اسی وقت پڑھ لے۔

عن أنس بن مالك أن النبيﷺ قال: «من نسي صلاة فليصلها إذا ذكرها، لا كفارة لها إلا ذلك»[1] (متفق عليه)

[انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کوئی نماز پڑھنا بھول جائے یا وہ اس وقت سو جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب یاد آئے اسے پڑھ لے۔ اس کے سوا اس کا کوئی اور کفارہ نہیں]

ولمسلم: «إذا رقد أحدكم عن الصلاة أو غفل عنها، فليصلها إذا ذكرها فإن الله عز و جل يقول: أقم الصلاة لذكري» (منتقى مطبوعه، دهلى، ص:٤١)[2]

والله أعلم بالصواب

[صحیح مسلم میں (فرمانِ رسول ﷺ) ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز سے سو یا رہ جائے یا اس سے غافل ہو جائے تو جب اسے یاد آئے اسے پڑھ لے۔ یقیناً اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: میری یاد کے لیے نماز قائم کرو]

کتبہ: محمد عبداللّٰہ

نماز میں بھول چوک اور سجدۂ سہو:

سوال ① امام نے ظہر کی نماز فرض میں چار رکعت کی نیت کر کے تحریمہ باندھا اور سہواً امام نے پانچ رکعت پڑھا اور آخر میں سجدہ سہو کیا تو نماز جائز ہوئی یا فاسد ہوئی؟

② امام عصر کی نماز فرض میں تشہد اول بھول کر سیدھا کھڑا ہو گیا، تب یاد آیا کہ قعدہ اولیٰ بھول گئے، پھر بیٹھ گیا اور

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

تشہد ادا کیا اور دو رکعت پورا کیا، پھر سجدہ سہو کر کے تمام کیا۔ آیا نماز صحیح ہوئی یا فاسد؟ جواب قرآن مجید یا صحیح حدیثوں سے تحریر فرمائیں۔

جواب ① نماز جائز ہوئی۔ صحیح بخاری مع فتح الباری (١/ ٦٣٦ چھاپہ دہلی) میں ہے:

"باب إذا صلى خمسا. حدثنا أبو الوليد قال: حدثنا شعبة عن الحكم عن إبراهيم عن علقمة عن عبد الله أن رسول الله ﷺ صلىٰ الظهر خمسا، فقيل له: أزيد في الصلاة؟ فقال: «وما ذاك؟» قال: صليت خمسا، فسجد سجدتين بعد ما سلم"[1] والله أعلم بالصواب

[باب: جب وہ پانچ رکعتیں پڑھ جائے ہمیں ابو الولید نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے حکم سے، انھوں نے ابراہیم سے، انھوں نے علقمہ سے اور انھوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھا دیں تو آپ ﷺ سے کہا گیا: کیا نماز میں اضافہ کر دیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ آپ نے پانچ رکعتیں پڑھائی ہیں۔ تب آپ ﷺ نے دو سجدے کیے، جب کہ آپ ﷺ سلام پھیر چکے تھے]

② حدیث شریف میں یہ تو آیا ہے کہ جب مصلی قعدہ اولیٰ بھول کر سیدھا کھڑا ہو جائے تو پھر نہ بیٹھے۔ حدیث مذکور یہ ہے:

"عن ابن بحينة أن النبي ﷺ صلىٰ فقام في الركعتين فسبحوا به، فمضىٰ، فلما فرغ من الصلاة سجد سجدتين، ثم سلم"[2] (رواه النسائي)

[ابن بحینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک دفعہ نماز پڑھی تو دو رکعتوں کے بعد (بھول کر) کھڑے ہوگئے۔ لوگوں نے "سبحان اللہ" کہا، مگر آپ ﷺ نے نماز جاری رکھی۔ پھر جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے دو سجدے کیے، پھر سلام پھیرا]

وعن زياد بن علاقة صلىٰ بنا المغيرة بن شعبة، فلما صلىٰ ركعتين، قام ولم يجلس، فسبح من خلفه، فأشار إليهم أن قوموا، فلما فرغ من صلاته سلم، ثم سجد سجدتين، وسلم، وقال: هكذا صنع بنا رسول الله ﷺ"[3] (رواه أحمد والترمذي وصححه)

[زیاد بن علاقہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ہمیں نماز پڑھائی، جب انھوں نے دو رکعتیں پڑھا لیں تو اس کے بعد وہ کھڑے ہوگئے (تشہد کے لیے) نہیں بیٹھے۔ پیچھے سے لوگوں نے "سبحان اللہ" کہا تو انھوں نے لوگوں کی طرف اشارہ کیا کہ کھڑے ہو جاؤ، پھر جب وہ اپنی نماز سے فارغ

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٦٨)

② سنن النسائي، رقم الحديث (١١٧٨)

③ مسند أحمد (٤/ ٢٤٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٣٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٥)

ہوئے تو انھوں نے سلام پھیرا پھر دو سجدے کیے اور سلام پھیرا۔ اس کے بعد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے ساتھ یہی کیا تھا]

وعن المغيرة بن شعبة قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا قام أحدكم من الركعتين فلم يستتم قائماً فليجلس، وإن استتم قائما فلا يجلس، وسجد سجدتي السهو»[1]

(رواه أحمد و أبو داود و ابن ماجه، منتقى الأخبار)

[مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی دو رکعتوں میں کھڑا ہو جائے۔ اگر تو وہ ابھی سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو تو وہ بیٹھ جائے اور اگر وہ سیدھا کھڑا ہو چکا ہو تو پھر نہ بیٹھے، بلکہ سہو کے دو سجدے کرے]

اور یہ کسی حدیث میں صاف اور صریح طور سے نہیں آیا ہے کہ اگر سیدھا کھڑا ہو کر بیٹھ جائے تو نماز فاسد ہو جائے گی یا نہیں فاسد ہوگی۔ اسی وجہ سے اس مسئلے میں علماء میں اختلاف پڑ گیا ہے۔ حنفی مذہب میں اس مسئلے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ نماز فاسد ہو جائے گی۔ دوسرا یہ کہ نہیں فاسد ہوگی۔ درمختار میں ہے:

”فلو عاد إلى القعود بعد ذلك (أي بعد ما استقام قائما، رد المحتار، ص: ٥٤٩) تفسد صلاته، وصححه الزيلعي، وقيل: لا تفسد، وهو الأشبه كما حققه الكمال، و هو الحق. بحر“[2] اهـ

[پھر اگر وہ بیٹھ جائے، (یعنی سیدھا کھڑے ہونے کے بعد۔ رد المختار، ص: ۵۴۹) تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ زیلعی نے اس موقف کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی اور یہی زیادہ صحیح بات ہے، جیسا کہ علامہ کمال نے اس کی تحقیق کی ہے اور یہی حق ہے]

شافعی مذہب میں اگر عمداً پھر بیٹھ جائے گا تو نماز باطل ہو جائے گی اور جمہور کے نزدیک باطل نہیں ہوگی۔ فتح الباری (۱/ ۶۳۶ چھاپہ دہلی) میں ہے:

”من سها عن التشهد الأول حتى قام إلى الركعة، ثم ذكره لا يرجع، فقد سبحوا به ﷺ فلم يرجع، فلو تعمد المصلي الرجوع بعد تلبسه بالركن، بطلت صلاته عند الشافعي، خلافا للجمهور“ اهـ

[جو شخص پہلا تشہد بھول جائے اور (تیسری) رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے تو پھر اسے (حالتِ قیام میں) یاد آ جائے تو اب وہ نہ بیٹھے۔ ایسی حالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے ”سبحان اللہ“

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٥٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٣٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٠٨)

[2] الدر المختار (٢/ ٨٤)

کہا، مگر آپ ﷺ (تشہد میں) نہ بیٹھے۔ پھر اگر وہ رکن میں لگ جانے کے بعد (تشہد کی طرف) پلٹنے کا قصد کرے گا تو جمہور کے برخلاف امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی نماز باطل ہو جائے گی]

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ "حجة الله البالغة" (ص: ٢١١) میں تحریر فرماتے ہیں: "فإن رجع لا أحكم ببطلان صلاته" اھ یعنی اگر پھر بیٹھ جائے تو میں بطلانِ نماز کا حکم نہیں دوں گا۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ "نيل الأوطار" (٢/ ٣٧١) میں فرماتے ہیں:

"فإن عاد عالما بالتحريم، بطلت لظاهر النهي، ولأنه زاد قعودا، وهذا إذا تعمد العود، فإن عاد ناسيا لم يبطل صلاته" اھ

یعنی اگر پھر بیٹھ جائے اور یہ جانتا ہو کہ پھر بیٹھ جانا حرام ہے تو نماز باطل ہو جائے گی ظاہر نہی کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ اس نے ایک قعود زیادہ کر دیا اور نماز کا بطلان اس صورت میں اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ عمداً بیٹھ جائے اور اگر بھول کر بیٹھ جائے تو نماز باطل نہیں ہوگی۔

یہی قول اَقرب اِلی الصواب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ سے قولاً وفعلاً ثابت ہو چکا کہ سیدھا کھڑا ہو جانے کے بعد پھر نہ بیٹھے اور اس صورت میں پھر بیٹھنے سے جس کی صریح نہی آ چکی تو جو شخص بعد علم اس نہی کے عمداً پھر اس کام کو کرے، یعنی عمداً پھر بیٹھ جائے تو بلاشبہہ اس پر یہ بات صادق آئے گی کہ اس نے ایسا کام کیا، جس کا حکم اس کو منجانب شارع نہ تھا، یعنی اس نے خلافِ قانونِ شرع یہ کام کیا اور صحیحین میں ہے:

«من عمل عملًا ليس عليه أمرنا فهو رد»[1]

یعنی جو شخص ایسا کام کرے، جس کا حکم اس کو منجانب شارع نہ ہو، یعنی وہ کام خلاف قانون شرع ہو، وہ کام مردود ہے، یعنی شرعاً نا مقبول و نامعتبر و باطل ہے اور جب وہ کام شرعاً نا مقبول و نامعتبر و باطل ہوا تو اس کے فاسد ہونے میں کیا شبہہ رہا اور اس کام کے خلافِ قانونِ شرع ہونے سے اس نماز پر بھی، جس میں یہ کام کیا گیا، یہ صادق آیا کہ وہ نماز خلاف قانون شرع پڑھی گئی تو بحکم حدیثِ صحیحین مذکورہ بالا وہ نماز ہی شرعاً نا مقبول و نامعتبر و فاسد ہوگئی، لیکن جو شخص اس کام کو بلا علم نہی مذکورہ بالا کے یا بھول کر کرے، اس کی نماز فاسد ہونے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہے۔ والله أعلم بالصواب

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الرحمن المباركفوري. صح الجواب. أبو الفياض محمد عبد القادر الأعظم گڑھی المئوی. صح الجواب. والله أعلم بالصواب. حرره را جي رحمة الله، أبو الهدی محمد سلامت الله المباركفوري، عفا عنه الباري.

سجدۂ تلاوت:

سوال ① سجدۂ تلاوت بے وضو درست ہے یا نہیں؟

① صحيح البخاري معلقاً، رقم الحديث (٦٩١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

② بعد نمازِ عصر و بعد نمازِ صبح، قبل طلوعِ آفتاب، سجدہ تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ① سجدۂ تلاوت کے بے وضو ناجائز ہونے کی کوئی دلیل کسی آیت یا صحیح حدیث سے نہیں ہے۔ ومن ادعی فعلیه البیان.

② بعد نمازِ عصر اور بعد نمازِ صبح قبل طلوعِ آفتاب سجدہ تلاوت جائز ہے۔ ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا:

سوال جماعت فرض میں نماز کے بعد مناجات کے واسطے ہاتھ اٹھانا چاہیے یا نہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: تمھارا رب حیادار کریم ہے، جب اس کا بندہ اس کی طرف اپنے ہاتھوں کو اٹھاتا ہے، تو اس کو شرم آتی ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی پھیر دے۔[1] دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے ہاتھوں کو دعا میں اٹھاتے تو بغیر منہ پر ملے، ان کو نہ چھوڑتے۔[2]

ان دونوں حدیثوں سے علی العموم ہر دعا میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہوتا ہے، خواہ بعد نماز فرض کے ہو یا کسی دوسرے وقت میں، اور دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانے کے بارے میں بہت حدیثیں آئی ہیں۔ صرف بخاری اور مسلم میں بہ قول نووی رحمہ اللہ تیس حدیث کے قریب موجود ہیں۔[3] جلال الدین سیوطی کا اس بارے میں ایک مستقل رسالہ ہے اور اس میں قریب چالیس حدیث کے جمع کیا ہے۔[4] حافظ منذری نے بھی اس بارے میں ایک جزو جمع کیا ہے۔[5]

الغرض دعا میں ہاتھ اُٹھانا عموماً وخصوصاً قولاً وفعلاً ہر طرح سے رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ پس بعد نماز فرض کے بھی جماعت کے ساتھ یا بغیر جماعت دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانا، ان دونوں حدیثوں سے اور نیز ان احادیث سے جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں، ثابت ہوتا ہے۔ ہاں اگر کسی حدیث میں بعد نمازِ فرض دعا کرنے وقت ہاتھ اٹھانے کی ممانعت آئی ہوتو البتہ اس وقت ہاتھ اٹھانا، ان احادیث سے جن سے عموماً ہر دعا میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہوتا ہے، مخصوص ہو جاتا، مگر واضح ہو کہ ممانعت میں کوئی حدیث، صحیح ہو خواہ ضعیف، مرفوع ہو خواہ موقوف، نہیں آئی ہے، بلکہ بعض روایت سے گو وہ ضعیف ہے، ہر نماز کے بعد فرض ہو یا نفل، جماعت کے ساتھ ہو یا بغیر جماعت، دعا کرنے میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہوتا ہے۔

---

① سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۴۸۸) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۵۵۶) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۳۸۶۵)

② سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۳۸۶) امام ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حدیث في مسح الوجه بالیدین عند الدعاء قد روي عن عمر و ابن عباس..." پھر دونوں حدیثیں ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "هذان حدیثان لا یصحان" (العلل المتناهیة: ۲/ ۸۴۰) نیز دیکھیں: ضعیف الجامع، رقم الحدیث (۴۴۱۲)

③ شرح صحیح مسلم (۶/ ۱۹۰)

④ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں "فض الوعاء في أحادیث رفع الیدین في الدعاء" کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔

⑤ دیکھیں: فتح الباري (۲/ ۵۰۷)

انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو بندہ اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا کر ہر نماز کے بعد کہے گا: "اللهم إلٰهي وإله إبراهيم..." [اے اللہ! اے میرے اور ابراہیم کے الٰہ!] تو ہرگز اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں کو نامراد نہ پھیرے گا۔''[1]

اس حدیث کی تائید ابن ابی شیبہ کی یہ حدیث جو اسود عامری کے باپ سے مروی ہے، کرتی ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ فجر پڑھی، جب حضرت نے سلام پھیرا تو مڑ کر بیٹھے اور اپنے ہاتھوں کو اٹھایا اور دعا کی۔[2] الحدیث

عن سلمان رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «إن ربك حيي كريم، يستحي من عبده، إذا رفع إليه يديه أن يردهما صفرا»[3] (أخرجه الأربعة إلا النسائي وصححه الحاكم)

[سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہہ تمھارا پروردگار بہت حیادار اور سخی ہے، وہ اس بات سے شرماتا ہے کہ بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھائے اور وہ انھیں خالی پھیر دے]

''وعن عمر رضي الله عنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا مد يديه في الدعاء، لم يردهما حتى يمسح بهما وجهه'' (أخرجه الترمذي،[4] وله شواهد، منها حديث ابن عباس عند أبي داود،[5] و مجموعها يقتضي أنه حديث حسن. بلوغ المرام، ص: ١٥٠، مطبوعه بھوپال)

[عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو انھیں چہرے پر پھیر کر نیچے گرایا کرتے تھے]

---

[1] عمل اليوم والليلة لابن السني (١٣٧) اس کی سند میں "عبد العزيز بن عبد الرحمن البالسي" راوی متروک ہے۔ دیکھیں: لسان الميزان (٤/ ٣٤) امام ابن عدی فرماتے ہیں: "وعبد العزيز هذا يروي عن خصيف أحاديث بواطيل" (الكامل: ٥/ ٢٨٩)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (٣١١٠) اس حدیث میں مڑ کر بیٹھنے کے بعد ہاتھوں کو اٹھانے اور دعا کرنے کے الفاظ نہیں ہیں۔ واللہ أعلم۔ مولانا مبارکپوری رحمہ اللہ ہی "تحفة الأحوذي" میں فرماتے ہیں: "الحديث رواه ابن أبي شيبة في مصنفه، كذا ذكر بعض الأعلام هذا الحديث بغير سند، وعزاه إلى المصنف، ولم أقف على سنده فالله تعالىٰ أعلم كيف هو صحيح أو ضعيف؟" (تحفة الأحوذي: ٢/ ١٧١) یہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں بایں سند "حدثنا هشيم قال: أنا يعلىٰ بن عطاء عن جابر بن يزيد الأسود العامري عن أبيه..." موجود ہے، لیکن اس میں دعا کرنے اور ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں۔

[3] اس حدیث کا ذکر گذشتہ صفحے میں گزر چکا ہے۔

[4] اس حدیث کی تخریج اور تضعیف گذشتہ صفحے میں گزر چکی ہے۔

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٨٥) امام ابو داود یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "روي هذا الحديث من غير وجه عن محمد بن كعب، كلها واهية، وهذا الطريق أمثلها، وهو ضعيف أيضا" نیز امام ابو حاتم فرماتے ہیں: "هذا حديث منكر" (العلل: ٢/ ٣٥١) نیز دیکھیں: سنن البيهقي (٢/ ٢١٢) نصب الراية (٣/ ٥٧)

عن أنس عن النبيﷺ أنه قال: «ما من عبد بسط كفيه في دبر كل صلاة ثم يقول: اللهم إلٰهي وإلٰه إبراهيم وإسحاق ويعقوب وإلٰه جبريل وميكائيل وإسرافيل! أسألك أن تستجيب دعوتي، فإني مضطر، و تعصمني في ديني فإني مبتلى، وتنالني برحمتك فإني مذنب، وتنفي عني الفقر فإني متمسكن، إلا كان حقا على الله عز و جل أن لا يرد يديه خائبتين»[1]

[انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا کر ہر نماز کے بعد کہے گا: ''اے اللہ! اے میرے الٰہ! اے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کے الٰہ! اے جبریل، میکائیل اور اسرافیل کے الٰہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میری دعا کو قبول فرما لے، یقیناً میں لاچار ہوں۔ میرے دین کے بارے میں مجھے بچا لے، بے شک میں (مصیبت وغیرہ میں) مبتلا ہوں۔ میں گناہ گار ہوں، مجھے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے۔ میں مسکین اور بے چارہ ہوں، مجھ سے فقر و فاقے کو دور کر دے۔'' تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہوگا کہ وہ اس کے ہاتھوں کو خالی اور نامراد نہ لوٹائے]

عن أسود العامري عن أبيه قال: «صليت مع رسول اللهﷺ الفجر، فلما سلم، انحرف، و رفع يديه، ودعا»[2] (الحديث)

[اسود عامری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی، جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو پیچھے کو مڑے، اپنے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی]

تسبیحِ مروج کی شرعی حیثیت:

سوال تسبیح مروجہ پر تسبیح و تہلیل پڑھنا کیسا ہے؟ یہ صورت خاص تسبیح پڑھنے کی زمانہ خیر القرون میں مروج تھی یا نہیں؟ اس کے منع یا جواز میں کوئی حدیث صحیح رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے یا نہیں؟

جواب تسبیح مروجہ پر تسبیح و تہلیل پڑھنا جائز ہے، لیکن خلاف اولیٰ ہے۔ یہ صورت خاص تسبیح پڑھنے کی زمانہ خیر القرون میں مروج معلوم نہیں ہوئی اور نہ اس صورت خاص کے منع یا جواز میں کوئی حدیث صحیح رسول اللہ ﷺ سے مروی دیکھی گئی۔ اس کا جواز اس وجہ سے ہے کہ تسبیح و تہلیل کھجور کی گٹھلیوں یا سنگریزوں پر پڑھنے کی تقریر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور تسبیح مروجہ کھجور کی گٹھلیوں اور سنگریزوں کے ہم معنی ہے، اور خلافِ اولیٰ اس وجہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھجور کی گٹھلیوں یا سنگریزوں پر تسبیح و تہلیل پڑھنے کو خلافِ اولیٰ فرمایا ہے، تو تسبیحِ مروجہ پر بھی جو انھیں کے ہم معنی ہے، تسبیح و تہلیل پڑھنا خلافِ اولیٰ ہوگا۔

عن سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ أنه دخل مع رسول اللهﷺ على امرأة، وبين يديها نوى

---

[1] اس کی تخریج گذشتہ صفحے میں ملاحظہ کریں۔

[2] اس کی تخریج گذشتہ صفحے میں ملاحظہ کریں۔

أو حصى تسبح به، فقال: «أخبرك بما هو أيسر عليك من هذا أو أفضل؟ سبحان الله عدد ما خلق في السماء، وسبحان الله عدد ما خلق في الأرض، وسبحان الله عدد ما بين ذلك، و سبحان الله عدد ما هو خالق، والله أكبر مثل ذلك، والحمد مثل ذلك، ولا إله إلا الله مثل ذلك، ولا حول ولا قوة إلا بالله مثل ذلك»[1] (رواه أبو داود والترمذي)

[سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک عورت کے پاس آئے، جب کہ اس عورت کے سامنے گٹھلیاں تھیں یا کنکریاں، وہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں وہ چیز نہ بتاؤں جو تمھارے لیے اس سے آسان تر یا افضل ہو؟ (تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) «سبحان الله عدد ما خلق في السماء ... الخ» اللہ کی تسبیح ہے، اس مخلوق کی تعداد برابر جو اس نے آسمان میں پیدا کی۔ اللہ کی تسبیح ہے، اس مخلوق کی تعداد برابر جو اس نے زمین میں پیدا کی۔ اللہ کی تسبیح ہے اس مخلوق کی تعداد برابر جو اس نے ان دونوں کے مابین پیدا کی۔ اللہ کی تسبیح ہے، اس مخلوق کی تعداد میں جو وہ پیدا کرے گا۔ الله أكبر اسی کے مثل، الحمد لله اسی کے مثل، لا الٰه الا الله اسی کے مثل اور لا حول ولا قوة الا بالله اسی کے مثل]

وعن صفية قالت: دخل علي رسول اللهﷺ وبين يدي أربعة آلاف نواة أسبح بها، فقال: «لقد سبحت بهذا، ألا أعلمك بأكثر مما سبحت به؟» فقالت: علمني، فقال: «قولي سبحان الله عدد خلقه»[2] (رواه الترمذي)

[صفیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے، جب کہ میرے سامنے چار ہزار گٹھلیاں تھیں، جن کے ساتھ میں تسبیح پڑھ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان (گٹھلیوں) پر تسبیح پڑھ رہی ہے، کیا میں تمھیں (ایسے کلمات) نہ سکھا دوں، جن سے تو زیادہ (اجر وثواب) پائے، ان (کلمات) کی نسبت جن کے ساتھ تو تسبیح پڑھ رہی ہے۔'' انھوں نے کہا: ہاں، مجھے سکھا دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہہ ''سبحان الله عدد خلقه'' (اللہ کی تسبیح ہے، اس کی مخلوق کی تعداد برابر)]

''الحديثان يدلان علىٰ جواز عد التسبيح بالنوىٰ والحصىٰ، وكذا بالسبحة، لعدم الفارق لتقريرهﷺ للمرأتين علىٰ ذلك، وعدم إنكاره، والإرشاد إلىٰ ما هو الأفضل لا ينافي الجواز '' (نيل الأوطار: ٢/ ٢١١)

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٦٨) اس کی سند میں ایک راوی ''خزیمہ'' مجہول ہے۔ دیکھیں: تقريب التهذيب (ص: ١٩٣) السلسلة الضعيفة (١/ ١٨٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٥٤) اس کی سند میں ''هاشم بن سعيد الكوفي'' ضعیف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١/ ١٨٩)

[مذکورہ بالا دونوں حدیثیں گٹھلیوں، سنگریزوں اور اسی طرح سبحہ (مروجہ تسبیح) پر تسبیح شمار کرنے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں، کیوں کہ یہ (مروجہ تسبیح) ان (گٹھلیوں اور سنگریزوں) سے الگ نہیں ہے اور اس جواز کی دلیل نبی مکرم ﷺ کی مذکورہ حدیثوں میں دو عورتوں کے لیے تقریر ہے۔ نیز یہ کہ آپ ﷺ نے اس کا انکار نہیں کیا۔ افضل چیز کی طرف راہنمائی کرنا اس (مفضول) کے جواز کے منافی نہیں ہے] والله أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله

امامت کے مسائل

اگر امام کسی گناہ کا ارتکاب کر لے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین محمدی و مفتیان شرع احمدی ہر دونوں مسئلہ مندرجہ ذیل میں:

مسئلہ اول یہ کہ اگر زید نے عمرو کو دیکھا کہ وہ اپنا ایک ہاتھ ایک اجنبی عورت کے کندھے پر اور ایک اپنا ہاتھ اس کے پستان پر رکھا ہوا کھڑا ہے تو پس جو فعل شنیع مذکور عمرو سے واقع ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے، آیا وہ زنا مجازی صغریٰ ہے یا زنا حقیقی کبریٰ؟ بر تقدیر اول اگر زید نے اپنے رؤیت پر چار گواہ نہ لا سکے تو زید قاذف ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مسئلہ ثانی یہ کہ بعد علم ارتکابِ زنا مجازی صغریٰ کے عمرو کو امام بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ فقط حسبتاً للہ ہر ایک مسئلہ مرقومہ بالا کا جواب مدلل بادلۂ قویہ قرآن و صحیح حدیث اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کے تحریر فرمایئے۔

جواب جہاں تک میں نے سمجھا ہے، یہ ہے کہ اس قسم کا فعل داعی زنا میں داخل ہے، جو از قسم صغائر ذنوب ہیں، جو نماز پڑھ لینے سے بھی معاف ہو جاتے ہیں اور اس زنا میں داخل نہیں ہے جو کبائر ذنوب سے ہے، جس کے ارتکاب سے اس کے مرتکب پر حد زنا جاری کی جاتی ہے اور جس کی رویت پر چار گواہ نہ لانے سے قاذف پر حد قذف جاری کی جاتی ہے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ﴾ [النجم: ٣٢]

[وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں، مگر صغیرہ گناہ]

قال الحافظ ابن كثير رحمه الله: أي لا يتعاطون المحرمات الكبائر، وإن وقع منهم بعض الصغائر، فإنه يغفر لهم، ويستر عليهم، كما قال في الآية الأخرى: ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ [النساء: ٣١] وقال ههنا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ وهذا استثناء منقطع، لأن اللمم من صغائر الذنوب ومحقرات الأعمال.

[حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی وہ محرماتِ کبائر میں منہمک نہیں ہوتے، اگرچہ ان سے صغائر کا

ارتکاب ہوجاتا ہے، تو بلاشبہہ وہ ان کو بخش دیتا ہے اور ان پر پردہ ڈال دیتا ہے، جیسا کہ اس نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: ''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے اور تمھیں باعزت داخلے کی جگہ میں داخل کریں گے۔'' اور یہاں فرمایا: ''وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں مگر صغیرہ گناہ۔'' یہ مستثنیٰ منقطع ہے، کیوں کہ ''اللمم'' صغیرہ گناہوں اور حقیر اعمال کو کہتے ہیں]

قال الإمام أحمد: حدثنا عبد الرزاق أخبرنا معمر عن ابن طاؤس عن أبيه عن ابن عباس قال: ما رأيت شيئا أشبه باللمم مما قال أبو هريرة عن النبيﷺ قال: «إن الله تعالیٰ كتب على ابن آدم حظه من الزنا، أدرك ذلك لا محالة، فزنا العين النظر، وزنا اللسان النطق، والنفس تتمنىٰ وتشتهي، والفرج يصدق ذلك أو يكذبه»[1] أخرجاه في الصحيحين من حديث عبد الرزاق به.

[امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ہمیں عبدالرزاق نے بیان کیا، انھوں نے کہا: ہمیں معمر نے خبر دی، وہ ابن طاؤس سے روایت کرتے ہیں، وہ اپنے والد سے، انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے لمم کے اس سے زیادہ مشابہ کوئی چیز نہیں دیکھی جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم ﷺ سے بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر زنا سے اس کا حصہ لکھ دیا ہے، جسے وہ پا کر رہے گا، فرماتے آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، زبان کا زنا بولنا ہے، دل تمنا اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔'' اسے بخاری و مسلم نے عبدالرزاق سے اپنی اپنی صحیح میں نقل کیا ہے]

وقال ابن جرير: حدثنا محمد بن عبد الأعلیٰ أخبرنا ابن ثور حدثنا معمر عن الأعمش عن أبي الضحیٰ أن ابن مسعود قال: زنا العينين النظر، وزنا الشفتين التقبيل، وزنا اليدين البطش، وزنا الرجلين المشي، ويصدق ذلك الفرج أو يكذبه، فإن تقدم بفرجه كان زانيا و إلا فهو اللمم.[2] وكذا قال مسروق والشعبي.

[ابن جریر نے کہا ہے: ہمیں محمد بن عبد الاعلیٰ نے بیان کیا، کہا ہمیں ابن ثور نے خبر دی، کہا ہمیں معمر نے بیان کیا، انھوں نے اعمش سے، انھوں نے ابو الضحی سے روایت کیا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، ہونٹوں کا زنا بوسہ لینا ہے۔ ہاتھوں کا زنا چھونا ہے، پاؤں کا زنا چلنا ہے، شرم گاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب کرتی ہے۔ پس اگر اس نے شرم گاہ (شہوت) کے ساتھ پیش رفت کی تو وہ زانی شمار ہوگا، ورنہ یہ ''لمم'' ہوگا۔ مسروق اور شعبی نے بھی ایسے ہی کہا ہے]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٧)

(2) تفسير الطبري (١١/ ٢٥٢)

وقال عبد الرحمن بن نافع الذي يقال له ابن لبابة الطائفي: قال: سألت أبا هريرة عن قول الله ﴿إِلَّا اللَّمَمَ﴾ قال: القبلة والغمزة والنظرة والمباشرة فإذا مس الختان الختان فقد وجب الغسل وهو الزنا.[1] اهـ

[عبدالرحمٰن بن نافع نے، جن کو ابن لبابہ طائفی کہا جاتا ہے، کہا: میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ''مگر صغیرہ گناہ'' سے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا: اس سے مراد بوسہ و کنار کرنا، ہاتھ پھیرنا، دیکھنا اور جسم سے جسم ملانا (معانقہ وغیرہ کرنا) ہے۔ پھر جب شرم گاہ شرم گاہ سے مل جائے تو پھر غسل واجب ہو جاتا ہے اور یہی زنا ہے]

وقال الله تعالىٰ: ﴿وَ أَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [هود: ١١٤]

[اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں]

قال الحافظ ابن كثير رحمه الله: قوله: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ يقول: إن فعل الخيرات يكفر الذنوب السالفة كما في الحديث الذي رواه أهل السنن عن علي رضي الله عنه عن أبي بكر الصديق رضي الله عنه أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: ما من مسلم يذنب ذنبا فيتوضأ و يصلي ركعتين إلا غفر له.[2] وفي الصحيحين عن عثمان رضي الله عنه أنه توضأ لهم وضوء رسول الله ﷺ وقال: هكذا رأيت رسول الله ﷺ يتوضأ، وقال: من توضأ وضوئي هذا، ثم صلىٰ ركعتين، لا يحدث فيهما نفسه، غفر له ما تقدم من ذنبه[3]، وروى أحمد عن عثمان رضي الله عنه أنه دعا بماء فتوضأ، ثم قال: رأيت رسول الله ﷺ يتوضأ وضوئي هذا، ثم قال: من توضأ وضوئي هذا، وقام فصلى الظهر غفر له ما كان بينه وبين صلاة الصبح، ثم صلى العصر غفر له ما كان بينه وبين صلاة الظهر، ثم صلىٰ المغرب غفرله ما كان بينه وبين صلاة العصر، ثم صلىٰ العشاء غفرله ما كان بينه وبين صلاة المغرب، ثم لعله يبيت فيتمرغ ليلته ثم إن قام فتوضأ وصلى الصبح غفرله ما بينها وبين صلاة العشاء، وهي الحسنات يذهبن السيئات.[4]

---

① تفسير ابن كثير (٤/ ٣٢٦)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢١) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٩٥)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦)

④ مسند أحمد (١/ ٧١)

[حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: اس کا یہ فرمان: ''بلاشبہہ نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔'' اس میں وہ یہ کہتا ہے کہ بے شک نیک کام گذشتہ گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں، جس طرح حدیث میں ہے، جسے اہلِ سنن نے روایت کیا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو بھی مسلمان کوئی گناہ کر لیتا ہے، پھر وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتا ہے تو اسے بخش دیا جاتا ہے اور بخاری و مسلم میں عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا وضو کیا اور فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی وضو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''جو کوئی میرے اس وضو کی طرح وضو کرے، پھر دو رکعت نماز پڑھے ایسے کہ اِدھر اُدھر کے خیالات میں مشغول نہ ہو تو اللہ اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیتا ہے۔'' امام احمد رحمہ اللہ نے عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے پانی منگوایا اور وضو کیا، پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا تھا اور پھر فرمایا تھا: جو کوئی میرے اس وضو کی طرح وضو کرے، پھر وہ کھڑا ہو اور ظہر کی نماز ادا کرے تو اس نماز اور فجر کی نماز کے درمیان کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ عصر کی نماز پڑھے تو اسے اس نماز اور ظہر کی نماز کے درمیان ہونے والے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ مغرب کی نماز پڑھے تو اسے اس نماز اور عصر کی نماز کے درمیان ہونے والے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ عشا کی نماز پڑھے تو اس نماز اور مغرب کی نماز کے درمیان ہونے والے اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ پھر شاید وہ لوٹ پوٹ ہو کر رات گزارے۔ پھر اٹھ کھڑا ہو، وضو کرے اور صبح کی نماز ادا کرے، اسے اس کے اور عشا کی نماز کے درمیان ہونے والے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ یہی وہ نیکیاں ہیں جو گناہوں کو مٹا دیتی ہیں]

وفي الصحيح أن رسول اللهﷺ قال: أرأيتمْ لو أن علىٰ باب أحدكم نهراً، يغتسل فيه كل يوم خمس مرات هل يبقى من درنه شيئ؟ قالوا: لا يا رسول الله قال: كذلك الصلوات الخمس يمحوالله بهن الذنوب والخطايا.[1]

[صحیح میں ہے کہ بلاشبہہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے بتاؤ اگر تم میں سے کسی شخص کے گھر کے سامنے نہر ہو اور وہ ہر روز اس میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو کیا اس کے جسم پر کوئی میل باقی رہ جائے گی؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: نہیں، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ نمازیں بھی ایسے ہی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے گناہ اور خطائیں مٹا دیتا ہے]

وفي صحيح مسلم أن رسول اللهﷺ كان يقول: الصلوات الخمس، والجمعة إلى الجمعة، ورمضان إلى رمضان، مكفرات لما بينهن إذا اجتنب الكبائر.[2]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٦٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٣)

[صحیح مسلم میں ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ کہا کرتے تھے: "جب کبیرہ گناہوں سے بچا جائے تو پانچ نمازیں، جمعہ دوسرے جمعے تک اور رمضان دوسرے رمضان تک ہونے والے (صغیرہ) گناہوں کا کفارہ ہیں]

وروى البخاري عن ابن مسعود رضي الله عنه أن رجلا أصاب من امرأة قبلة فأتىٰ النبي ﷺ فأخبره فأنزل الله ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ الآية. فقال يا رسول الله (ﷺ) ألي هذا؟ قال: لجميع أمتي كلهم ورواه مسلم.[1]

[امام بخاری رحمہ اللہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے کسی عورت کا بوسہ لے لیا، پھر اس نے آ کر نبی مکرم ﷺ کو خبر دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "دن کے دونوں کناروں اور رات کی گھڑیوں میں نماز پڑھو..." تو اس شخص نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا یہ میرے لیے خاص ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میری ساری امت کے لیے ہے]

وفي لفظ: إني وجدت امرأة في بستان ففعلت بها كل شيئ غير أني لم أجامعها، قبلتها ولزمتها فافعل بي ما شئت، فلم يقل رسول الله ﷺ شيئاً فذهب الرجل فقال عمر: لقد ستر الله عليه لو ستر نفسه فأتبعه رسول الله ﷺ بصره فقال: ردوه علي فردوه، فقرأ عليه: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ الآية. فقال معاذ: أ له وحده؟ قال: بل للناس كافة.[2]

[ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اس شخص نے کہا: میں نے باغ میں ایک عورت کو پایا، میں نے اس کے ساتھ سب کچھ کیا، صرف اس سے جماع نہیں کیا۔ میں نے اس کا بوسہ لیا اور اس سے چمٹ گیا۔ پس آپ میرے ساتھ جو چاہیں کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ شخص چلا گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تھی، کاش وہ بھی اپنی پردہ پوشی کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے پیچھے اپنی نگاہ لگائی۔ پھر کہا: اسے میرے پاس واپس لاؤ، لوگ اس کو واپس لے آئے تو آپ ﷺ نے پڑھا: "دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کرو۔" معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا یہ صرف اسی کے لیے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تمام لوگوں کے لیے ہے۔"

وروى ابن جرير من حديث أبي أمامة أن رجلا أتىٰ النبي ﷺ فقال: يا رسول الله أقم في حد الله، مرة أو مرتين فأعرض عنه، ثم أقيمت الصلاة فلما فرغ، قال: أين الرجل؟ قال: أنا ذا. قال: أتممت الوضوء وصليت معنا؟ قال: نعم قال: فأنت من خطيئتك كما ولدتك أمك فلا تعد، وأنزل الله ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ الآية. انتهىٰ ملتقطاً.[3]

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٣)
2. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٣)
3. تفسير ابن جرير (٧/ ١٢٤) وانظر تفسير ابن كثير (٢/ ٦٠٦)

[ابن جریر نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے نبی مکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھ پر اللہ کی حد نافذ کریں۔ اس نے ایک یا دو مرتبہ ایسے کہا تو آپ ﷺ نے اس سے اعراض کیا۔ پھر نماز ادا کی گئی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا: وہ آدمی کہاں ہے؟ اس نے عرض کی: میں حاضر ہوں۔ آپ ﷺ نے کہا: کیا تو نے مکمل وضو کر کے ہمارے ساتھ نماز ادا کی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس دن کی طرح اپنے گناہ سے پاک ہوگیا، جس دن تیری ماں نے تجھے جنم دیا تھا۔ لہٰذا دوبارہ ایسا نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''دن کے کناروں میں اور رات کی گھڑیوں میں نماز پڑھو...'']

جب آیات و احادیث و آثار مذکورہ بالا سے ظاہر ہوا کہ اس قسم کا فعل صغائر ذنوب سے ہے تو اگر ایسے فعل کا مرتکب اس فعل پر مصر نہ ہو تو اس کو امام بنا سکتے ہیں، ورنہ نہیں، کیونکہ اصرار سے صغیرہ گناہ بھی کبیرہ ہو جاتا اور اس کا مرتکب فاسق ہو جاتا ہے اور فاسق کو امام نہیں بنا سکتے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبداللہ ۲/ جمادی الآخرہ ۱۳۲٦ھ

الجواب صحیح والرأي نجیح محمد علي عفیٰ اللہ عنہ

ابو نعمان محمد عبدالرحمن الأعظمي المئوي مهر مدرسہ أحمدیہ

غفر اللہ لہ ولوالدیہ محمد عباس علي عفي عنہ

امامت کے لیے پگڑی کا حکم:

جواب امامت صغریٰ بلا عمامہ جائز ہے یا مکروہ؟

جواب کپڑے کے اعتبار سے امام و مقتدی میں کوئی فرق حدیث سے ثابت نہیں۔ پس بدون عمامہ کے امامت جائز غیر مکروہ ہے۔ صحیح بخاری مع فتح الباری (ص: ۲۳٦) میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا مسئلہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں؟[1] (آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے واسطے متعدد کپڑے ہونا ضرور نہیں، ایک کپڑا کافی ہے) پس اس سے معلوم ہوا کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے، عمامہ درست نہیں۔ دوسری روایت کتاب مذکور (ص: ۲۳۳) میں ہے کہ حضرت جابر صحابی رضی اللہ عنہ ایک لنگی باندھ کر نماز پڑھتے تھے اور دوسرے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ ایک ہی کپڑے سے نماز پڑھتے ہیں تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تمھارے جیسے احمق کو دکھانے کو میں نے کیا۔ بھلا آنحضرت ﷺ کے زمانے میں لوگوں میں کوئی ایسا تھا کہ جس کے پاس دو کپڑے ہوتے؟[2] واللہ أعلم بالصواب.

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۵۸)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۴۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۱۸)

هو الموفق: امامت بغیر عمامہ بلا کراہت جائز ہے۔ کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کہ امامت بغیر عمامہ مکروہ ہے۔ محمد عبدالرحمن مبارکپوری

امام کی عدم موجودگی میں موذن کا امام بننا:

سوال موذن کا امام ہونا وقت عدم موجودگی پیش امام کے، جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس بارے میں کہ موذن کا امام ہونا وقت عدمِ موجودگی پیش امام کے جائز نہیں ہے؟ کوئی آیت یا معتبر حدیث اب تک میری نظر سے نہیں گزری ہے، ہاں علامہ زیلعی نے "نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية" میں دو حدیثیں اس بارے میں نقل کی ہیں کہ امام، موذن نہیں ہوسکتا، لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی لائقِ احتجاج نہیں ہے، اس لیے کہ ایک حدیث میں ایک راوی ''سلام الطّویل'' ہے اور دوسرا ''زید العمی'' ہے اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔ سلام الطویل تو متروک ہی ہے اور دوسری حدیث میں ایک راوی ''معلیٰ بن ہلال'' ہے، جو کاذب اور واضعِ حدیث ہونے میں شہرہ آفاق ہے۔[1] واللہ تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله

ایک ہی شخص کا دو بار نماز پڑھانا:

سوال ایک شخص دو مقام پر ایک وقت کی نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب صحیح حدیثوں سے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ کر اپنی قوم میں جا کر اسی وقت کی نماز پڑھانا ثابت ہے اور بعض روایتوں میں یہ بھی مصرح ہے کہ معاذ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فرض پڑھتے تھے اور اپنی قوم میں نفل:

"عن جابر أن معاذا كان يصلي مع النبي ﷺ عشاء الآخرة، ثم يرجع إلى قومه فيصلي بهم تلك الصلاة"[2] (متفق عليه)

[جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ معاذ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشا کی نماز ادا کرتے، پھر اپنی قوم کی طرف لوٹتے اور انھیں وہ (عشا کی) نماز پڑھاتے]

و رواه الشافعي والدارقطني وزادا: "هي له تطوع، ولهم مكتوبة العشاء"[3]

(نيل الأوطار، مطبوعہ مصر: ٣/ ٤٥)

[دوسری نماز معاذ رضی اللہ عنہ کے لیے نفل اور لوگوں کے لیے فرض ہوتی تھی]

اس سے مفترض کی اقتدا متنفل کے ساتھ جائز ثابت ہوئی۔ اب اگر ایک شخص ایک ہی وقت کی نماز دو جگہ پڑھائے تو پہلی نماز کی صحت میں تو کچھ شک ہی نہیں۔ باقی رہی دوسری نماز غاية ما في الباب یہی ہے کہ امام کی دوسری

---

[1] نصب الراية (١/ ٢٣٥) نیز دیکھیں: سنن البيهقي (١/ ٤٣٣) العلل المتناهية (١/ ٣٩٧) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٧١٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٦٥)

[3] مسند الشافعي (٢٣٧) مصنف عبد الرزاق (٢/ ٨) سنن الدارقطني (١/ ٢٧٤)

نماز نفل ٹھہرائی جائے اور مفترض کی اقتدا متنفل کے ساتھ جائز ثابت ہوچکی ہے تو ایک شخص کی امامت بھی دو جگہ ایک ہی وقت کی نماز میں جائز ہوگی۔

اندھے کے پیچھے نماز کا حکم:

سوال اندھوں کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو کسی قسم کی کراہت تو نہیں واقع ہوتی؟

جواب اندھے کے پیچھے نماز بلا کراہت جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «صلوا خلف کل بر و فاجر» کما في الهداية.[1] [ہر نیک اور فاجر کے پیچھے نماز ادا کرلو۔ جیسا کہ ہدایہ میں ہے]

"وفي فتح القدير (١/ ١٢٦): وهذا الحديث يرتقي إلى درجة الحسن عند المحققين وهو الصواب"[2] انتهى

[فتح القدیر میں ہے کہ یہ حدیث محققین کے نزدیک حسن کے درجے کو پہنچ جاتی ہے اور یہی بات درست ہے]

وفي المشكاة (ص: ٩٢) في باب الإمامة: عن أبي مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «يؤم القوم أقرأهم لكتاب الله تعالىٰ»[3] الحديث.

[مشکات میں امامت کے باب میں ہے: ابو مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قوم کی امامت وہ کرائے جو لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھنے والا ہو]

وعن أبي سعيد رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا كانوا ثلاثة، فليؤمهم أحدهم، وأحقهم بالإمامة أقرأهم»[4] (رواه مسلم)

[ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تین آدمی ہوں تو ان میں سے ایک ان کی امامت کرائے۔ ان میں سے امامت کا سب سے زیادہ حق دار وہ ہے، جو ان میں (قرآن مجید کو) سب سے زیادہ پڑھنے والا ہو]

وعن أنس أن النبي ﷺ استخلف ابن أم مكتوم علىٰ المدينة مرتين يصلي بهم،

---

① یہ حدیث ضعیف ہے، اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

② علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اس حدیث کی مفصل تخریج کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "فقد تبين من هذا التجريح والتتبع لطرق الحديث أنها كلها واهية جدا، كما قال الحافظ في التلخيص (ص: ١٢٥) ولذلك فالحديث يبقىٰ على ضعفه مع كثرة طرقه، لأن هذه الكثرة الشديدة الضعف في مفرداتها لا تعطي الحديث قوة في مجموعها، كما هو مقرر في علم الحديث، فالحديث مثل صالح لهذه القاعدة التي قلما يراعيها من المشتغلين بهذا العلم الشريف" (إرواء الغليل: ٢/ ٣١٠)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٣)

④ صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٢)

وهو أعمى.[1] (روه أبو داود، وأخرجه أيضاً ابن حبان في صحيحه، و أبو يعلى والطبراني عن عائشة، وأخرجه أيضاً الطبراني بإسناد حسن عن ابن عباس)

[انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو دو مرتبہ مدینے میں اپنا جانشین بنایا، چنانچہ یہی لوگوں کی امامت کراتے تھے اور یہ نابینا تھے]

وعن محمود بن الربيع أن عتبان بن مالك كان يؤم قومه، وهو أعمى، وأنه قال: يا رسول اللهﷺ! إنها تكون الظلمة والسيل، وأنا رجل ضرير البصر، فصل يا رسول الله في بيتي مكانا أتخذه مصلى، فجاءه رسول اللهﷺ فقال: «أين تحب أن أصلي؟» فأشار إلى مكان في البيت، فصلىٰ فيه رسول اللهﷺ.[2]

(رواه البخاري والنسائي، نيل الأوطار طبع مصر: ٣/ ٣٩)

[محمود بن ربیع رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی قوم کی امامت کراتے تھے اور وہ نابینے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے گزارش کی کہ کبھی اندھیرا، بارش یا بارشی پانی ہوتا ہے اور میں نابینا شخص ہوں (ایسی حالت میں مسجد نہیں آ سکتا) لہٰذا آپ میرے گھر میں ایک جگہ نماز ادا فرمائیں، جسے میں اپنی نماز کے لیے مقرر کر لوں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: تم کہاں چاہتے ہو کہ میں نماز پڑھوں؟ تو انھوں نے گھر میں ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں اللہ کے رسول ﷺ نے نماز پڑھی]

كتبه: أضعف عباد الرحمن: محمد سليمان، غفرله المنان

ولد الزنا کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال ولد الزنا کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بينوا تؤجروا.

جواب ولد الزنا کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کے بارے میں کوئی آیت یا حدیث وارد نہیں ہے، بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ امامت کے قابل «أقرأهم لكتاب الله»[3] [لوگوں میں سب سے زیادہ قرآنِ کریم کو پڑھنے والا] ہے تو اگر ولد الزنا میں اس بات کی صلاحیت ہے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے، اس کے ولد الزنا ہونے سے اس کے حق میں کوئی خرابی نہیں آتی۔ بخاری شریف (پارہ سوم، ص: ۳۸۶ و ۳۸۷ مطبوعہ انصاری) میں ہے: "باب إمامة العبد والمولىٰ وولد البغي، لقول النبيﷺ: يؤمهم أقرأهم لكتاب الله" انتهى ملخصاً [عبد، مولی اور ولدِ زنا کی امامت کا باب، کیوں کہ نبیِ مکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ ان کی امامت وہ کرائے جو لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٩٥، ٢٩٣١) صحيح ابن حبان (٥/ ٥٠٦) المعجم الكبير للطبراني (١١/ ١٨٣) مسند أبي يعلىٰ (٧/ ٤٣٤) نیز دیکھیں: إرواء الغليل (٢/ ٣١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٧٨٨)

[3] فتح الباري (٢/ ١٨٦)

پڑھنے والا ہو] فتح الباری (ص: ۳۸۷ مطبوعہ انصاری دہلی) میں ہے: "قوله: وولد البغي أي الزانية" انتهى
[ان کے قول "ولد البغي" کا مطلب ہے زانیہ عورت کا بیٹا] نیز فتح الباری میں ہے:

"قوله: لقول النبيﷺ: «يؤمهم أقرأهم لكتاب الله» أي فكل من اتصف بذلك جازت إمامته، من عبد، وصبي، وغيرهما، وهذا طرف من حديث أبي مسعود... وقد أخرجه مسلم وأصحاب السنن بلفظ: «يؤم القوم أقرأهم لكتاب الله» الحديث"[1]

[ان کا یہ قول کہ نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے "ان کی امامت وہ کروائے جو لوگوں میں زیادہ قرآن پڑھنے والا ہو۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی اس وصف کے ساتھ متصف ہوگا، اس کی امامت جائز ہے، خواہ وہ غلام ہو یا بچہ یا ان کے سوا کوئی دوسرا۔ یہ ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جسے امام مسلم اور اصحابِ سنن نے یوں روایت کیا ہے کہ قوم کی امامت وہ کروائے جو لوگوں میں زیادہ قرآن پڑھنے والا ہو]

وعبارة مسلم هكذا: "حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة و أبو سعيد الأشج، كلاهما عن أبي خالد، قال أبوبكر: حدثنا أبو خالد الأحمر عن الأعمش عن إسماعيل بن رجاء عن أوس بن ضمعج عن أبي مسعود الأنصاري قال: قال رسول اللهﷺ: «يؤم القوم أقرأهم لكتاب الله، فإن كانوا في القراءة سواء، فأعلمهم بالسنة، فإن كانوا في السنة سواء، فأقدمهم هجرة، فإن كانوا في الهجرة سواء فأقدمهم سلما، ولا يؤمن الرجل الرجلَ في سلطانه، ولا يقعد في بيته علىٰ تكرمته إلا بإذنه» قال الأشج في روايته مكان سلما: سنا" والله أعلم

[صحیح مسلم میں اس حدیث کی عبارت اس طرح ہے: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ اور ابوسعید الاشج نے بیان کیا، ان دونوں نے ابو خالد سے روایت کیا، ابوبکر نے کہا کہ ہمیں ابو خالد الاحمر نے اعمش سے روایت کیا، انھوں نے اسماعیل بن رجاء سے، انھوں نے اوس بن ضمعج سے، انھوں نے ابو مسعود انصاری سے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قوم کی امامت وہ کروائے جو لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والا ہو، پھر اگر وہ قرآن پڑھنے میں برابر ہوں تو وہ امامت کروائے جو لوگوں میں زیادہ سنت کا علم رکھنے والا ہو، پھر اگر وہ علمِ سنت میں برابر ہوں تو وہ جو ہجرت میں مقدم ہو، پھر اگر وہ ہجرت میں برابر ہوں تو وہ جو اسلام قبول کرنے میں مقدم ہو۔ کوئی آدمی دوسرے کی حکومت (سربراہی) کی جگہ میں امامت نہ کرائے اور نہ اس کے گھر میں اس کی خاص مسند ہی پر بیٹھے (جو اس کی عزت کی جگہ ہو) الا یہ کہ وہ اجازت دے۔ الاشج نے اپنی روایت میں "سلما" [اسلام] کی جگہ "سنا" [عمر] کا لفظ ذکر کیا ہے]

كتبه: محمود. عفا الله عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

[1] فتح الباري (۱۸٦/٦)

کیا ولد الحرام سردار اور امام بن سکتا ہے؟

سوال ایک شخص نے یکے بعد دیگرے ایامِ جاہلیت میں دو بہن کو شادی کر کے اپنی زوجیت میں رکھا۔ عورت ثانی کی طرف سے جو لڑکا پیدا ہوا، فنِ دنیاوی میں بہت ہوشیار، بوجہ مصلحت کے سردار اعلیٰ نے ہمراہ امام جماعت کے چودھری سردار اس کو بھی مقرر کیا، بوجہ معین شریعت محمدیہ اور بندوبست امورِ دینیہ کے اب اختلاف ہے درمیان مسلمانوں کے اس بات پر کہ لڑکا حرامی جب محرومِ میراث ہے تو سرداری اس کی نادرست اور نماز اس کے پیچھے ناجائز اور عبادت اس کی فاسد۔ لہٰذا نزدیک محدثین عرض ہے کہ مطابق حکم اللہ و رسول کے جواب تحریر فرمائیں۔

جواب جس شخص میں سرداری کی شرطیں پائی جائیں، اس کی سرداری درست ہے اور حرامی ہونا ایسی سرداری کا مانع نہیں ہے، جس کی نسبت سوال ہے۔ ہاں امام اعظم (یعنی امام عامہ مسلمین) ہونے کو البتہ مانع ہے، کیونکہ اس امامت میں قرشی ہونا شرط ہے اور حرامی شخص قرشی ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ شرع شریف میں نسب آبا سے معتبر ہے، نہ کہ امہات سے، تو اگر زانی شخص قرشی بھی ہو، تب بھی حرامی لڑکا قرشی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ زانی شخص شرعاً ولد الزنا کا باپ نہیں ہے کہ اس کے قرشی ہونے سے ولد الزنا بھی قرشی ہو جائے۔ بلوغ المرام "باب القضاء" میں ہے:

عن بريدة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «القضاة ثلاثة، اثنان في النار، وواحد في الجنة، رجل عرف الحق فقضیٰ به فهو في الجنة، ورجل عرف الحق فلم يقض به، وجار في الحكم فهو في النار، ورجل لم يعرف الحق فقضى للناس على جهل فهو في النار»[1]

(رواه الأربعة، و صححه الحاكم)

بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حاکم تین طرح کے ہیں، دو دوزخی ایک جنتی، جس حاکم نے حق والے کا حق دریافت کیا اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی کیا، وہ حاکم جنتی ہے اور جس حاکم نے حق والے کا حق تو دریافت کر لیا، لیکن فیصلہ اس کے مطابق نہیں کیا، بلکہ جان بوجھ کر حق کے خلاف فیصلہ کیا، وہ حاکم دوزخی ہے اور جس حاکم نے حق والے کا حق تک بھی دریافت نہیں کیا اور یوں ہی بے سمجھے بوجھے فیصلہ سنا دیا، وہ حاکم بھی دوزخی ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حاکم ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ ذی علم اور سمجھ دار اور دیانت دار اور انصاف ور ہو۔ اگر ذی علم اور سمجھدار نہ ہوگا، تو حق و ناحق میں فرق نہ کر سکے گا اور اگر دیانت دار اور انصاف ور نہ ہوگا تو ٹھیک ٹھیک حق بحق فیصلہ نہ کرے گا۔ صحیح بخاری "كتاب الأحكام، باب متى يستوجب الرجل القضاء" میں ہے:

"قال مزاحم بن زفر: قال لنا عمر بن عبد العزيز: خمس إذا أخطأ القاضي منهن

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٧٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣١٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ٤٦١) المستدرك (٤/ ٩٠) بلوغ المرام (١٣٩٧)

خصلة كانت فيه وصمة أن يكون فهما حليما عفيفا صليبا عالما سؤولا عن العلم"[1]

"مزاحم بن زفر نے کہا کہ ہم سے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا: پانچ خصلتیں ہیں کہ جن میں سے ایک سے بھی جب حاکم چوک جاتا ہے، یعنی ان میں سے کسی ایک خصلت کا بھی فاقد ہوتا ہے تو اس میں عیب ونقصان رہتا ہے: سمجھدار ہو، متحمل اور بردبار ہو، حرام سے بچنے والا ہو، مضبوط ارادے کا ہو، دوسرے کے حق میں سخت ہو، حق پر اڑ جانے والا ہو، کسی کے ساتھ رعایت کرنے والا نہ ہو۔ ذی علم ہو اور جو بات نہ جانتا ہو، اس کو ذی علموں سے پوچھ کر دریافت کرتا ہو۔"

جس شخص میں نماز کی امامت کی شرطیں پائی جائیں، اس کی امامت درست اور اس کے پیچھے نماز جائز ہے اور حرامی ہونا مانع امامتِ نماز بھی نہیں ہے۔ مشکوۃ شریف "باب الإمامة" فصل اول میں ہے:

عن أبي مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «يؤم القوم أقرأهم لكتاب الله تعالىٰ، فإن كانوا في القراءة سواء فأعلمهم بالسنة، فإن كانوا في السنة سواء فأقدمهم هجرة، فإن كانوا في الهجرة سواء فأقدمهم سنا»[2] الحديث (رواه مسلم)

"ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قوم کی امامت وہ شخص کرے جو ان میں اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن مجید سب سے زیادہ پڑھا ہوا ہو۔ اگر قرآن مجید پڑھنے میں سب برابر ہوں تو وہ شخص ان کی امامت کرے جو ان میں حدیث زیادہ جانتا ہو۔ اگر حدیث دانی میں بھی سب برابر ہوں، تو وہ شخص امامت کرے جس نے ان میں ہجرت پہلے کی ہو، اگر ہجرت میں سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو ان میں سن میں بڑا ہو۔"

اسی فصل میں ہے:

"عن أبي سعيد قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا كانوا ثلاثة فليؤمهم أحدهم وأحقهم بالإمامة أقرأهم»[3] (رواه مسلم)

"ابو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تین شخص ہوں تو ان میں سے ایک شخص امام ہو جائے تو جو ان میں قرآن مجید زیادہ پڑھنے والا ہو، وہی شخص زیادہ مستحق امامت کا ہے۔"

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ سب سے اول امامت کا مستحق وہ شخص ہے، جو قرآن مجید زیادہ پڑھنے والا ہو، وہ شخص کیسا ہی ہو، حرامی ہو یا حلالی۔ حرامی یا حلالی ہونے کی کچھ قید نہیں ہے۔ پس جو شخص قرآن مجید زیادہ پڑھنے والا ہو، وہ شخص امامت کا زیادہ مستحق ہے۔ اسی طرح اگر اس میں سب برابر ہوں تو جو حدیث دان زیادہ ہو، وہی امامت کا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٤٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٢)

مستحق ہے، خواہ وہ کوئی ہو۔ اسی طرح اگر اس میں بھی برابر ہوں تو جو ہجرت میں پہلے ہو۔ اگر اس میں سب برابر ہوں، تو جو سن میں بڑا ہو۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری (۱/ ۳۸۷ چھاپہ دہلی) میں ہے: "وإلی صحة إمامة ولد الزنا ذهب الجمهور" اھ ''جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ولد الزنا کی امامت درست ہے۔'' یہ کہنا کہ حرامی کی عبادت فاسد ہے، محض بے وجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سورت بقرہ میں فرماتا ہے:

﴿ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة: ۸۱، ۸۲]

''جس شخص نے بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو گھیر لیا، پس وہ لوگ دوزخ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بدکاروں بے ایمانوں کے لیے دوزخ ہے اور ایمانداروں، نیکو کاروں کے لیے جنت ہے، اس میں کوئی قید حلالی یا حرامی کی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس مضمون کی آیتیں بہت سی ہیں۔ کہیں کی آیت میں ایسی قید نہیں ہے، جس سے حلالی اور حرامی میں عبادت کے صحیح اور فاسد ہونے میں فرق سمجھا جاتا ہو، علاوہ اس کے اس میں حرامی کا قصور ہی کیا ہے؟ قصور تو زانی اور زانیہ کا ہے اور شرع شریف میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ایک کے قصور پر دوسرا پکڑا جائے۔

قرآن مجید میں متعدد جگہوں میں فرمایا گیا ہے: ﴿ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الأنعام: ١٦٤] یعنی کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور جو ولد الزنا کے بارے میں یہ حدیث نقل کی جاتی ہے کہ «لا يدخل الجنة ولد زنی»[1] یعنی ولد الزنا جنت میں نہیں جائے گا۔ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس حدیث کا ایک راوی جابان نامی ہے۔ اولاً تو وہ مجہول ہے۔ ثانیاً وہ روایت کرتا ہے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے اس کو سماع نہیں ہے۔ ثالثاً اس کو نبیطہ سے سالم روایت کرتا ہے اور سالم کو نہ جابان سے سماع ہے نہ نبیطہ سے تو یہ حدیث کئی طرح سے منقطع ہے۔ حافظ ذہبی میزان الاعتدال (۱/۱۵۲) میں رقمطراز ہیں:

"جابان عن عبدالله بن عمرو لا يدرىٰ من هو، وقال أبو حاتم: ليس بحجة، وقال البخاري: قال لي الجعفي: نا وهيب سمع شعبة عن منصور عن سالم عن نبيطة عن جابان عن عبدالله بن عمرو مرفوعاً: لا يدخل الجنة ولد زنى. تابعه غندر، ولم يذكر جرير والثوري فيه نبيطة، وقال لي عبدان عن أبيه عن شعبة عن زيد عن سالم عن عبدالله بن عمرو قوله، قال البخاري: ولم يصح، ولا يعرف لجابان سماع من عبدالله ولا لسالم من جابان" اھ

[جابان راوی، جو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کرتا ہے، اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے۔

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٠٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ١٧٥) سنن الدارمي (٢/ ١٥٣) صحيح ابن حبان (٨/ ١٧٥)

ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ حجت نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے: مجھے جعفی نے کہا: ہمیں وہیب نے بیان کیا ہے، اس نے شعبہ سے سنا، اس نے منصور سے روایت کیا، اس نے سالم سے، اس نے نبیطہ سے، اس نے جابان سے، اس نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بیان کیا کہ ولد الزنا جنت میں نہیں جائے گا۔ غندر نے اس کی متابعت کی ہے، لیکن جریر اور ثوری نے اس کی سند میں نبیطہ کا ذکر نہیں کیا اور عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مجھے اپنے باپ سے روایت بیان کی، انھوں نے شعبہ سے روایت کیا، انھوں نے زید سے، انھوں نے سالم سے، انھوں نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ان کا قول روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے اور جابان کا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اور سالم کا جابان سے سماع معلوم نہیں ہے]

تفسیر ابنِ کثیر (۳/ ۴۰۵ چھاپہ مصر) میں ہے: "قال البخاري: لا يعرف لجابان سماع من عبدالله بن عمرو، ولا لسالم من جابان ولا نبيطة" اھ [امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جابان کا عبداللہ بن عمر سے اور سالم کا جابان اور نبیطہ سے سماع ثابت نہیں ہے] "سفر السعادة" (ص: ۱۱۸ چھاپہ مصر) میں ہے: "باب ولد الزنا، والمشهور من ذلك ولد الزنا لا يدخل الجنة، لم يثبت، بل هو باطل" اھ ''ولد الزنا کے باب میں، جس میں سے یہ مشہور ہے کہ ولد الزنا جنت میں نہیں جائے گا، کچھ ثابت نہیں ہے، بلکہ اس باب میں جو کچھ مروی ہے، سب باطل ہے۔"

حرامی مطلقاً محروم المیراث بھی نہیں ہے، اپنی ماں سے ضرور میراث پا سکتا ہے، گو زانی سے اس وجہ سے کہ شارع نے اس کو باپ نہیں قرار دیا ہے، میراث نہیں پاتا تو حرامی کو مطلقاً محروم المیراث کہنا بھی غلط ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

زبردستی امامت کروانے والے کا حکم:

سوال جماعت کے سردار نے کسی کو خطیب مسجد کا مقرر کیا تھا۔ اب دوسرا ایک شخص زبردستی بے حکم سردار کے امام بن کر اس مسجد میں نماز پڑھاتا ہے، اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس دوسرے شخص کے پیچھے نماز تو جائز ہے، لیکن خود اس شخص کی نماز اس زبردستی امامت کرنے سے عند اللہ مقبول نہیں ہے، بلکہ وہ شخص اس زبردستی بے حکم سردار کے امامت کرنے سے گنہگار اور اللہ پاک کا نافرمان ہے۔

عن عبدالله بن عمرو أن رسول الله ﷺ كان يقول: «ثلاثة لا يقبل الله منهم صلاة، من تقدم قوما، وهم له كارهون» الحديث (رواه أبو داود وابن ماجه)[1]

[عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی نماز قبول

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۹۳) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۵۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۹۷۰) اس کی سند ضعیف ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لكن الحديث قد صح بمجموع رواية جمع من الصحابة بألفاظ متقاربة" (السلسلة الصحيحة ۳۲۴/۵)

نہیں فرماتا: ایک وہ آدمی جو قوم کا امام بن جائے، حالانکہ وہ اسے ناپسند کرتے ہوں]

قال: قال رسول اللهﷺ: «ثلاثة لا يجاوز صلاتهم آذانهم: العبد الآبق حتى يرجع، و امرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وإمام قوم وهم له كارهون»[1]

[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین قسم کے آدمیوں کی نماز ان کے کانوں سے آگے نہیں جاتی: مفرور غلام حتی کہ وہ واپس آجائے، وہ عورت جو اس حال میں رات بسر کرے کہ اس کا خاوند اس پر ناراض ہو اور لوگوں کا امام، جب کہ وہ اسے ناپسند کرتے ہوں]

وعن أبي مسعود عقبة بن عمرو رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللهﷺ: «لا يؤمن الرجل الرجل في سلطانه»[2] (رواه أحمد و مسلم، و رواه سعيد بن منصور)

[ابو مسعود عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی آدمی کسی آدمی کی سربراہی کی جگہ امامت نہ کرائے]

وفيه: «لا يؤم الرجل الرجل في سلطانه إلا بإذنه»

[اور اسی میں ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کی ریاست میں اس کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرائے]

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبيﷺ قال: «لا يحل لرجل يؤمن بالله واليوم الآخر أن يؤم قوما إلا بإذنهم» الحديث[3] (المنتقى مطبوعه مطبع فاروقى دهلى، ص: ۹۰ و ۹۲)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ نبیِ کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے حلال نہیں کہ بغیر اجازت کے کسی قوم کی امامت کرائے]

والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبدالله (مهر مدرسه)

مسجد کی امامت سے کسی کو زبردستی معزول کرنا:

سوال ایک پرہیز گار دیندار حافظ عالم جو بہت دنوں سے ایک مسجد کا امام تھا اور برابر بڑی عرق ریزی سے مسجد کی خدمت کرتا تھا، اپنے کام میں ہر طرح چوکنا رہا، ذرا بھی نہ چوکا اور لوگ اس سے بہت خوش رہتے تھے۔ اب ایک آدمی مسجد بنانے والے کے خاندان کا متولی بنا ہے، وہ دنیوی لاگ ڈانٹ سے پہلے پیش امام کا جانی دشمن ہو کر اس کو نکالنا چاہتا ہے تو اس کو اس کے موقوف کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں اس نئے متولی کو پرانے امام کے نکالنے کا ذرا بھی اختیار نہیں، کیونکہ وظیفہ خوار کو اس وقت

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳٦۰) اس حدیث کو امام ترمذی اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٣) مسند أحمد (٤/ ١٢١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۹۱)

موقوف کرنے کا حق ہے کہ وہ کام میں پہلو تہی کرے یا اس کام کے لائق نہیں اور اس پرانے امام میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ شامی (۴/ ۴۲۱ چھاپہ مصر) میں ہے:

"واستفيد من عدم صحة عزل الناظر بلاحجة، عدمها لصاحب وظيفة بغير حجة وعدم أهلية" والله أعلم بالصواب

[نگران کو بلا دلیل معزول کرنے کے صحیح نہ ہونے سے اس بات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ وظیفہ خوار کو بلا دلیل اور اس کے نااہل ثابت ہوئے بغیر معزول کرنا بھی درست نہیں ہے] کتبہ: محمد عبداللہ

سوال ایک مولوی صاحب نے وعظ میں بیان کیا کہ اسلام میں کفو یعنی ذات پات کا کچھ خیال نہیں۔ یہ جو شیخ، سید، مغل، پٹھان، جولاہا، چاشا، خوشباش مشہور ہیں، ان سب کا کچھ اعتبار نہیں۔ اگر دین دار و پرہیز گار ہوں، آپس میں بیاہ شادی دے سکتے ہیں۔ اگر سید نماز نہ پڑھے تو اس کی سیدی کیا کام آئے گی؟ اس پر جولاہا لوگوں نے گرفت کیا کہ ہم لوگوں کو جولاہا کیوں کہا؟ مومن کیوں نہیں کہا؟ جولاہا بول کر گالی گلوچ اور طعن و تشنیع کیوں کیا؟ صرف اسی بات پر اُن مولوی صاحب کو اندازاً برس روز سے بند، یعنی خارج از جماعت اور حقوق ستہ سے اور امامت سے باز رکھا ہے۔

اب دریافت یہ ہے کہ مولوی صاحب نے جس حیثیت سے کہا ہے، اس سے گالی گلوچ اور طعن و تشنیع صادق آتی ہے یا نہیں؟ اگر آتی ہے تو خارج از جماعت اور حقوق ستہ اور امامت سے معزول کرنے کے قابل ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں تو وہ لوگ گنہگار ہیں یا نہیں؟ جو سردار لوگ ایسی حرکتیں کریں اور باز نہ آئیں تو وہ لوگ سرداری کے قابل ہیں یا نہیں؟ عالم کی بے عزتی سے توبہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟

جواب صورت مسئولہ میں عبارتِ سوال کے پڑھنے سے جو امر ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ مولوی صاحب نے جس حیثیت سے یہ لفظ استعمال کیا ہے، اس پر کسی طرح گالی گلوچ اور طعن و تشنیع صادق نہیں آتی۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی خاص شخص یا خاص جماعت کے حق میں یہ لفظ یا کوئی اور لفظ، جس کو وہ خاص شخص یا خاص جماعت اپنے حق میں ناپسند کرتی اور اس سے چڑھتی ہو، استعمال کرے تو ایسے لفظ کا استعمال کرنے والے کو توبہ کرنا اور اس خاص شخص یا خاص جماعت سے معافی مانگنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ [الحجرات: ۱۱] یعنی آپس میں کوئی کسی کو ایسے نام سے نہ پکارے جو اس کو برا لگتا ہو، یعنی وہ اس سے چڑھتا ہو۔

الحاصل مولوی صاحب نے جس حیثیت سے یہ لفظ استعمال کیا ہے، اس سے گالی گلوچ اور طعن اور تشنیع اصلاً مفہوم نہیں ہوتی، ایسی حالت میں ان لوگوں کو جنھوں نے مولوی صاحب کو بوجہ استعمال اس لفظ کے بند کیا ہے، لازم ہے کہ اس کام سے باز آئیں اور مولوی صاحب کو جماعت میں داخل کر کے اُن کے ساتھ اسلامی برتاؤ کریں، ضد اور تعصب چھوڑ دیں اور «كونوا عباد الله إخوانا»[1] [اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ] کے مصداق بن جائیں۔

واللہ تعالیٰ أعلم کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۰/ ربیع الأول ۱۳۳۵ھ)

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۷۱۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۵۹)

کیا مقتدی سے لقمہ لینا مفسدِ نماز ہے؟

سوال مصلی کا غیر مصلی سے لقمہ لینا مفسدِ نماز ہے یا نہیں؟

جواب مصلی کا غیر مصلی سے لقمہ لینا مفسدِ نماز نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے مفسدِ نماز ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور جو کہے کہ مفسدِ نماز ہے تو اس کا ثبوت اس کے ذمے ہے۔ جو لوگ اس کو مفسدِ نماز کہتے ہیں، وہ اس کا ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ مصلی کے غیر مصلی سے لقمہ لینا، دوسرے سے قرآن سیکھ کر پڑھنا ہے اور دوسرے سے قرآن سیکھ کر پڑھنا کلام الناس میں داخل ہے اور کلام الناس مفسدِ نماز ہے تو مصلی کا غیر مصلی سے لقمہ لینا بھی مفسدِ نماز ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ دلیل صحیح مان لی جائے تو امام کا اپنے مقتدی سے بھی لقمہ لینا مفسدِ نماز ہوگا، کیونکہ یہ بھی دوسرے سے قرآن سیکھ کر پڑھنا ہے، حالانکہ حسبِ قول صحیح امام کا اپنے مقتدی سے لقمہ لینا مفسدِ نماز نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام کا اپنے مقتدی سے لقمہ لینا اگرچہ دوسرے سے قرآن سیکھ کر پڑھنا ہے اور مقتضائے دلیل تو یہی تھا کہ یہ بھی کلام الناس اور مفسدِ نماز ہوتا، لیکن چونکہ مقتدی اپنی نماز کی اصلاح کی طرف مضطر ہے، لہٰذا اس کا یہ فعل یعنی اپنے امام کو لقمہ دینا مفسدِ نماز نہیں ہوا۔ ہدایہ (۱/ ۵۶ چھاپہ علوی) میں ہے:

"وإن فتح علیٰ إمامه لم يكن كلاما [فاسدا] استحسانا، لأنه مضطر إلى إصلاح صلاته، فكان هذا من أعمال صلاته معنى" اھ

[اگر وہ اپنے امام کو لقمہ دے تو استحساناً یہ کلام فاسد نہ ہوگا، کیوں کہ وہ اپنی نماز کی اصلاح کرنے میں لاچار و مجبور ہے، تو یہ معنوی طور پر اس کی نماز کے اعمال میں سے شمار ہوگا]

تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ گو مقتدی کا یہ فعل بوجہ مذکور اعمالِ نماز سے معدود ہوا، کلام الناس اور مفسدِ نماز نہ ہوا، لیکن یہاں مقتدی کے فعل میں کلام نہیں ہے، جو لقمہ دینے والا ہے، بلکہ امام کے فعل میں کلام ہے، جو لقمہ لینے والا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امام لقمہ لینے والے نے، دوسرے سے یعنی اپنے مقتدی سے قرآن سیکھ کر پڑھا، پس اگر دوسرے سے قرآن سیکھ کر پڑھنا کلام الناس میں داخل اور مفسدِ نماز ہے تو امام کا مقتدی سے بھی لقمہ لینا کلام الناس میں داخل اور مفسدِ نماز ہوگا۔ وإذ ليس فليس.

دوسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح مقتدی اپنی نماز کی اصلاح کی طرف مضطر ہے، اسی طرح امام، بلکہ منفرد بھی، پس جس طرح مقتدی کا فعلِ مذکور کلام الناس اور مفسدِ نماز نہیں ہوا، اسی طرح امام اور منفرد کا فعل بھی کلام الناس نہیں ہوا اور وہ اعمالِ نماز سے معدود ہونا چاہیے اور مفسد نماز نہیں ہونا چاہیے، ورنہ وجہ فرق بیان کرنا چاہیے۔

دوسرا ثبوت یہ دیتے ہیں کہ غیر مصلی کا مصلی کو لقمہ دینا اور مصلی کا غیر مصلی سے لقمہ لے لینا، یہ تعلیم و تعلم ہے اور تعلیم و تعلم دونوں میں سے ہر ایک مفسدِ نماز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنی عمرو بن عوف میں صلح کرانے کے لیے تشریف لے گئے تھے، اتنے میں نماز کا وقت آ گیا۔ آپ تشریف نہیں لائے۔ بلال رضی اللہ عنہ نے بحکم

آپ ﷺ کے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت کے لیے کھڑا کر دیا۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز شروع کر چکے تو آپ تشریف لائے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا، آپ نے ان کو اشارہ فرمایا: «أن امكث مكانك»[1] یعنی اپنی جگہ پر رہو، پیچھے نہ ہٹو۔ (دیکھو: صحیح بخاری مع فتح الباری، چھاپہ دہلی: ۱/ ۳۷۸) یہ آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس وقت فرمایا تھا کہ ابھی آپ نماز میں شامل نہیں ہوئے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز شروع کر چکے تھے۔

اس حدیث سے مصلی کا غیر مصلی سے تعلیم پانا ثابت ہوا۔ ورنہ رسول اللہ ﷺ کبھی ایسا نہ کرتے۔ اور سنیے! ہدایہ میں ہے کہ، امام جو مسافر ہو، جب سلام پھیرے تو اس کو مستحب ہے کہ مقتدیوں سے یوں کہے کہ: "أتموا صلاتكم فإنا قوم سفر"[2] یعنی تم لوگ اپنی نماز کو پوری کر لیتے جاؤ، اس لیے کہ ہم مسافر ہیں۔ یوں کہنا اس واسطے مستحب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مکے کے لوگوں کو نماز پڑھائی تھی اور آپ مسافر تھے تو ان کو آپ نے فرمایا تھا۔[3]

امام زیلعی "نصب الراية تخريج أحاديث هداية" (ص: ۳۰۹) میں اس حدیث کی نسبت فرماتے ہیں:

"أخرجه أبو داود و الترمذي، وقال الترمذي: حديث حسن صحيح، و رواه الطبراني في معجمه، وابن أبي شيبة في مصنفه، وإسحاق بن راهويه وأبو داود الطيالسي والبزار في مسانيدهم، ولفظ الطيالسي: قال: ما سافرت مع رسول الله ﷺ سفرا قط إلا صلىٰ ركعتين... إلى قوله: ثم حججت مع أبي بكر، واعتمرت فصلىٰ ركعتين، ثم قال: أتموا صلاتكم فإنا قوم سفر" اهـ

[اسے ابو داود اور ترمذی نے روایت کیا ہے، ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اسے طبرانی نے اپنی معجم میں اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں بھی روایت کیا ہے۔ نیز اسحاق بن راہویہ، ابو داود طیالسی اور بزار نے اپنی اپنی مسند میں اسے بیان کیا ہے۔ ابو داود طیالسی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ راوی نے کہا: میں نے جب بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کیا تو آپ ﷺ نے دو ہی رکعتیں پڑھائیں... پھر میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج اور عمرہ کیا تو انھوں نے دو رکعتیں پڑھانے کے بعد کہا کہ تم اپنی نماز مکمل کر لو، بلاشبہہ ہم تو مسافر ہیں]

اس حدیث کی تخریج کے بعد فرماتے ہیں:

"أثر عمر، رواه مالك في الموطأ، عن الزهري عن سالم بن عبد الله عن أبيه أن عمر بن الخطاب كان إذا قدم مكة صلىٰ بهم ركعتين ثم يقول: يا أهل مكة أتموا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٢١)

[2] الهداية (١/ ٨١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٢٩) اس کی سند میں "علي بن زيد بن جدعان" ضعیف ہے۔

صلاتكم فإنا قوم سفر"

[عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کو امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں زہری سے، انھوں نے سالم بن عبداللہ سے اور انھوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ جب مکے میں تشریف لاتے تو ان کو دو رکعت نماز پڑھا کر فرماتے: اے مکہ والو! تم اپنی نماز مکمل کر لو، ہم تو مسافر لوگ ہیں]

کتبہ: محمد عبداللہ

نمازِ تراویح کے مسائل

نمازِ تراویح کی رکعات:

سوال ① ایک شخص نے نمازِ تراویح پڑھائی، چھ رکعت پڑھ کر تین وتر پڑھ لیے۔ کیا درست ہے یا نہیں؟ اس کے صواب یا ناصواب ہونے میں حدیث و آثار سے کیا مروی ہے؟

② یہ نمازِ تراویح نمازِ تہجد ہے یا نہیں یا ایسی نماز ہے کہ رات کی نماز کہی جا سکے؟ اس کا حکم رات کی نماز کا سا، یعنی دو رکعت یا چار رکعت یا چھ رکعت پڑھ لینا درست ہے یا نہیں؟

③ جس طرح نمازِ وتر کے واسطے یہ حکم ہے کہ آخر رات میں پڑھی جائے، اگر کسی سے نہ ہو سکے تو اول رات میں پڑھ لے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا نمازِ تراویح اس طرح پڑھے کہ نماز تہجد کی ہو بوجہ رمضان کے اور لوگوں کو مشقت و تکلیف میں نہ پڑنے اور ثواب سے نہ محروم رہنے کے لیے آپ نے اول رات میں اجازت فرمائی ہوں، جس طرح وتر کے لیے اول رات میں پڑھنے کی اجازت فرمائی؟ جواب قرآن و حدیث و آثار یا ائمہ محدثین سے ہو۔

جواب ان سوالوں کا جواب رسالہ "ركعات التراويح" سے حاصل کیجیے، جو تیسری بار دہلی میں چھپا ہے۔[1]

بیس رکعت تراویح کا ثبوت[2]:

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ قیامِ رمضان یعنی تراویح کسی حدیث صحیح مرفوع متصل الاسناد سے بیس رکعت کا پڑھنا آنحضرت ﷺ سے یا خلفائے اربعہ سے ثابت ہے یا نہیں اور برتقدیرِ عدمِ ثبوت پڑھنا بیس رکعت کا افضل ہے یا گیارہ رکعت کا؟

جواب ماہرینِ شریعت غرا پر مخفی نہ رہے کہ پڑھنا بیس رکعت کا آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں، اس واسطے کہ صحیح حدیثوں سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے تیرہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا ہے، بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں یا غیر رمضان میں زیادہ گیارہ رکعت (سے) نہیں پڑھتے تھے[3]۔ لیکن یہ روایت

---

① یہ رسالہ حضرت حافظ صاحب غازی پوری کے دیگر رسائل کے ساتھ عن قریب طبع ہوگا۔ ان شاء اللہ

② فتاویٰ مولانا ابو المکارم مئوی (ص: ۲۶)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٣٨)

محمول ہے اوپر عادتِ غالبہ آنحضرت کے۔ اس لیے کہ رات کی نماز پڑھنے میں آنحضرت ﷺ سے مختلف طور سے پایا گیا ہے۔ کبھی تیرہ، کبھی گیارہ، کبھی نو، کبھی سات، جیسا کہ مزاولانِ کتبِ صحاح ستہ پر مخفی نہیں ہے اور وہ جو روایت کیا ہے ابن ابی شیبہ وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ حضرت ﷺ رمضان میں بیس رکعت پڑھتے تھے، سو اس کا جواب دوطرح سے دیا جاتا ہے:

① اول تو یہ حدیث ضعیف ہے، چناں چہ اس امر کا اقرار ابن الہمام نے بھی ''فتح القدیر'' میں کیا ہے:

''وأما ما روى ابن أبي شيبة والطبراني، وعنه البيهقي، من حديث ابن عباس أنه ﷺ يصلي في رمضان عشرين ركعة سوى الوتر فضعيف بأبي شيبة إبراهيم بن عثمان جد الإمام أبي بكر بن أبي شيبة متفق على ضعفه مع مخالفته للصحيح''[1] انتهى ما في فتح القدير.

[لیکن وہ روایت جس کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور جو امام بیہقی کے ہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ رمضان میں وتر کے علاوہ بیس رکعت (تراویح) پڑھتے تھے تو یہ روایت امام ابوبکر بن ابی شیبہ کے دادے ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے ضعیف ہے۔ چناں چہ اس کے ضعف پر اتفاق ہے۔ نیز اس میں صحیح کی مخالفت کا عیب بھی پایا جاتا ہے]

② دوسرے یہ کہ یہ روایت ہی مخالف اس حدیث کی ہے، جس کو ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وهو هذا:

''عن جابر أنه ﷺ صلّى بهم في رمضان ثمان ركعات والوتر''[2] كذا في تخريج الهداية للحافظ ابن حجر العسقلاني.

[جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو رمضان میں آٹھ رکعتیں اور وتر پڑھایا]

علی ہذا القیاس بیس رکعت کا پڑھنا خلفائے اربعہ سے بھی ثابت نہیں ہوا۔ ہاں بعض روایت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ بیس رکعت پڑھتے تھے، جیسا کہ روایت سائب بن یزید سے جو امام بیہقی نے کتاب المعرفہ میں روایت کیا ہے،[3] معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس سے پڑھنا بیس رکعت کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نہیں ثابت ہوتا، ہاں رضائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ثابت ہوتی ہے اور یہ روایت مخالف ہے اس کے، جو امام مالک نے موطا میں سائب بن یزید سے روایت کیا ہے کہ فرماتے ہیں سائب بن یزید کہ حکم کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب

---

① فتح القدير (١/ ٤٦٧)

② صحيح ابن خزيمة (٢/ ١٣٨) صحيح ابن حبان (٦/ ١٦٩)

③ معرفة السنن والآثار (٤/ ٤٢)

اور تمیم داری کو کہ نمازِ تراویح کی پڑھائیں وہ دونوں لوگوں کو گیارہ رکعت،[1] پس مطابقت دونوں روایتوں میں یوں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ مختلف تھے، کبھی بیس رکعت پڑھتے تھے اور کبھی گیارہ۔ باقی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جمع کرنا گیارہ رکعت ہی پر ثابت (ہے)۔ پس اگر کوئی کبھی بیس رکعت پڑھ لے تو اس پر انکار نہیں پہنچتا۔ ہاں گیارہ کا پڑھنا بہ نسبت بیس کے اولیٰ اور افضل ہے، اس واسطے کہ یہی ہے نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفا کی، پس اتباع ساتھ سنتِ رسول اللہ اور سنتِ خلفا کے نیک (ٹھیک) ہے۔

قال الله تعالیٰ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب: ٢١]

[اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلاشبہہ یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں ہمیشہ سے اچھا نمونہ ہے]

وقال النبي: «عليكم بسنتي وسنة الخلفاءِ الراشدين المهديين»[2] الحديث.

[نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفاے راشدین کے طریقے کو اختیار کرو]

الغرض بیس رکعت کا پڑھنا جائز ہے، بشرطیکہ التزام نہ کرے، اس لیے کہ مباح شَے کے التزام کرنے سے وہ شَے بدعت ہوجاتی ہے۔ پس اِس زمانے میں جو لوگوں نے بیس ہی کا التزام کرلیا ہے بدعت ہوگا۔

"قال عبد الله رضي الله عنه: لا يجعل أحدكم للشيطان نصيباً من صلاته يرى حقا عليه ألا ينصرف إلا عن يمينه، ولقد رأيت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم كثيراً ينصرف عن يساره[3] رواه مسلم و ابن ماجه، وقال الطيبي: فيه إن من أصر على أمر مندوب وجعل عرفا ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال فكيف على من أصر على بدعة أو منكر"[4] كذا في حاشية ابن ماجه.

[عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے۔ (وہ اس طرح) کہ صرف دائیں طرف سے گھومنا (اللہ کا حق اور اپنا) فرض سمجھ لے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر بائیں طرف سے گھومتے دیکھا ہے۔ اس کو امام مسلم اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کے بارے میں طیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یقیناً جس نے مندوب امر پر اصرار کیا اور اس کو عرف بنا دیا اور رخصت پر عمل نہ کیا تو شیطان نے اسے گمراہ کر دیا تو اس وقت کیا حال ہوگا، جب وہ کسی بدعت اور منکر کام پر اصرار کرے؟]

والله أعلم بالصواب. حرره: أبو المكارم محمد علي عفي عنه. محمد عبدالله (١٢٩١هـ)

---

[1] موطأ الإمام مالك (١/ ١١٥) معرفة السنن والآثار (٤/ ٤٢)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٣٠)

[4] حاشیہ سنن ابن ماجہ (ص: ٦٦)

کیا بیس رکعت تراویح خلفائے راشدین کی سنت ہے؟

سوال تراویح کی نماز بیس رکعتیں پڑھنی افضل ہے یا نہیں؟ بعض علما نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیس رکعتیں پڑھیں، پس یہ خلفائے راشدین کی سنت ہے؟

جواب نمازِ تراویح کی رکعات کی تعداد کہ بیس ہیں، نہ کسی آیت یا حدیث صحیح سے بسند صحیح ثابت ہے، نہ خلفائے راشدین سے کہ ان حضرات نے بیس رکعتیں پڑھیں یا بیس رکعتوں کے پڑھنے کا حکم دیا۔ ومن ادعی فعلیه البیان.

واللّٰه تعالیٰ أعلم. کتبه: محمد عبد اللّٰه (شعبان ۱۳۲۹ھ)

نمازِ تراویح کا حکم اور رکعات کی تعداد:

سوال ① نمازِ تراویح سنت موکدہ ہے یا غیر موکدہ؟ یا نفل ہے یا مستحب ہے؟

② بیس رکعتوں کی حدیثیں صحیح مرفوع آئی ہیں اور آٹھ رکعتوں کی حدیثیں صحیح مرفوع آئی ہیں؟ بحوالہ کتب معتبرہ و نقل عبارات کے جواب سے مشرف فرمائیں۔ بینوا تؤجروا.

جواب ① تراویح کا لفظ کسی آیت یا حدیث میں نہیں آیا ہے۔ ہاں قیامِ رمضان کا لفظ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔ اس نماز (قیامِ رمضان) کو جب سے لوگوں نے جماعت کے ساتھ ایک خاص طور پر پڑھنا شروع کیا، تب سے اس کا نام تراویح رکھ دیا، جیسا کہ فتح الباری وغیرہ میں مذکور ہے۔[1] قیامِ رمضان کے بارے میں حدیث وارد ہوئی ہے:

«من قام رمضان إیماناً و احتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه»[2] (مشکوۃ، ص: ۱٦٥)

یعنی جو شخص ایماندار اور طالبِ ثواب ہو کر رمضان کا قیام کرے گا، اُس کے اگلے گناہ جو کر چکا ہے، بخش دیے جائیں گے۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے اور ایک یہ حدیث بھی وارد ہوئی ہے:

«جعل اللّٰه صیامه فریضة وقیام لیله تطوعا»[3] (مشکوۃ، ص: ۱٦٥)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ماہِ صیام میں روزے کو فرض کیا ہے اور اس کی رات کے قیام کو تطوع بنایا ہے۔

یہ حدیث بیہقی نے روایت کی ہے، اس کی سند کا حال معلوم نہیں ہے کہ صحیح ہے یا نہیں؟ بہر کیف اس بارے میں کہ نمازِ تراویح سنت موکدہ ہے یا غیر موکدہ؟ کوئی صریح صحیح حدیث میری نظر سے نہیں گزری ہے، لہٰذا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا جو اوپر مذکور ہوا۔ واللّٰه تعالیٰ أعلم.

① فتح الباري (٤/ ٢٥٠)

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٥٩)

③ صحیح ابن [illegible]

(۲) اس نمبر کے متعلق ایک رسالہ ہے، جس کا نام "ركعات التراويح" ہے۔[1] اس رسالے میں جواب نمبر۶ مفصل ملے گا، لہٰذا ایک جلد رسالہ مذکورہ ارسالِ خدمت ہے۔ کتبہ (۴ر ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ)

نمازِ جمعہ کے مسائل

کیا خطبہ جمعہ اور نمازِ جمعہ الگ الگ شخص پڑھا سکتا ہے؟

سوال اگر جمعہ کی نماز ایک شخص پڑھائے اور خطبہ دوسرا شخص تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں اور خطبہ جمعہ فرض ہے یا سنت؟

جواب جمعہ کی نماز ایک شخص پڑھائے اور خطبہ دوسرا شخص، عہدِ نبوت ۔على صاحبها الصلوات والتسليمات۔ میں ایسا واقعہ پایا نہیں جاتا اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خطیب و امام کا نمازِ جمعہ میں اتحاد شرط ہے، پس ایسی صورت میں اگر بضرورت ایسا کرتا ہے تو عدمِ جواز کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ہے اور خطبہ جمعہ کا ترک کبھی رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، تو کبھی اس کو ترک کرنا نہ چاہیے، خواہ اس کا نام فرض رکھا جائے یا اور کچھ رکھا جائے، لیکن ترک نہ کیا جائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

«صلو كما رأيتموني أصلي»[2] (رواه البخاري عن مالك بن الحويرث رضی اللہ عنہ)

[تم ویسے نماز پڑھو، جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے]

کیا جمعہ میں اتحادِ خطیب و امام شرط ہے؟

سوال نابالغ لڑکا خطبہ پڑھاتا ہے اور دوسرا شخص جمعہ کی نماز پڑھاتا ہے تو یہ قرآن و حدیث سے جائز ہے نہیں؟ یا یہ کہ دوسرا شخص خطبہ پڑھائے اور کوئی دوسرا نماز پڑھائے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس باب میں جہاں تک معمول عہدِ نبوت ۔على صاحبها الصلوات والتسليمات۔ میں پایا گیا ہے، یہی ہے کہ ایک ہی شخص خطبہ پڑھے اور نماز پڑھائے اور یہ امر کہ خطبہ پڑھنے والا اور شخص ہو اور نماز پڑھانے والا اور شخص، اس کا وجود اس عہد میں کتابوں سے ثابت نہیں ہوتا، پس بلاضرورت اس معمول کی تبدیلی مستحسن نہیں ہے۔ ہاں اس کی دلیل بھی نظر سے نہیں گزری کہ اس باب میں اتحادِ خطیب و امام شرط ہے اور درصورتِ اختلاف خطیب و امام نماز صحیح نہیں ہے، لیکن اگر کسی ضرورت سے ایسا کریں تو اس کے جواز میں کوئی تردد نہیں ہے۔ والله أعلم بالصواب.

كتبه أبو الصمصام محمد عبدالرحمن عفا الله عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبدالله

مسجد میں آنے سے روکنا اور کفار کا مسجد میں داخل ہونا:

سوال ایک شخص مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے جاتا تھا۔ بعض آدمیوں نے اس کو منع کیا کہ تم اس مسجد میں نماز پڑھنے

[1] یہ رسالہ حضرت حافظ صاحب غازی پوری کے دیگر رسائل کے ساتھ عن قریب طبع ہوگا۔ ان شاء اللہ

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥)

مت آوَ۔ جو لوگ خانہ خدا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت سے منع کرتے ہیں، ان کا حکم اللہ جل شانہ کے نزدیک کیا ہے؟

نمازِ جمعہ کے ادا ہونے میں فقہ کی کتابوں میں سات شرطیں لکھتے ہیں، ان میں سے ایک شرط اِذنِ عام ہے، جیسا کہ اور شرط کے نہ پائے جانے سے جمعہ کی نماز نہیں ہوتی، مثلاً جماعت اور ظہر کا وقت شرط ہے۔ جماعت اور ظہر کا وقت نہ پائے جانے سے جمعہ درست نہیں ہوگا، اسی طرح اِذنِ عام کے نہ پائے جانے سے جمعہ درست ہوگا یا نہیں اور کافروں کو مسجد میں آنے دینا درست ہے یا نہیں؟ مدلل بحوالہ کتب بیان فرمائیں۔

جواب جو شخص خانہ خدا میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور عبادت سے منع کرے، وہ بہت بڑا ظالم ہے اور دنیا میں اُن لوگوں کے واسطے رسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

اللہ جل شانہ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ [البقرة: ١١٤]

''اور کون ہے بہت ظالم اس شخص سے جو منع کرتا ہے مسجدوں سے اللہ کی، یہ کہ ذکر کیا جائے بیچ ان کے نام اس کا اور سعی کرتا ہے بیچ ویران کرنے ان کے کہ یہ لوگ نہیں لائق تھا واسطے ان کے یہ کہ داخل ہوں ان میں مگر ڈرتے ہوئے، واسطے ان کے بیچ دنیا رسوائی اور واسطے ان کے بیچ آخرت کے عذاب ہے بڑا۔''

علامہ ابوسعود بن محمد العمادی حنفی اپنی تفسیر ابوسعود میں اس آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

''وهذا الحكم عام لكل من فعل ذلك في أي مسجد كان، وإن كان سبب النزول فعل طائفة معينة في مسجد مخصوص'' انتهى[1]

یہ کلمہ عام ہے۔ جو شخص جس مسجد سے منع کرے، وہ اس آیت کی وعید شدید میں داخل ہوگا۔ تفسیر مظہری میں ہے:

''إنما أورد لفظ الجمع، وإن كان المنع واقعا على مسجد واحد، لأن الحكم عام، وإن كان المورد خاصا'' انتهى[2]

[اگرچہ یہ ممانعت ایک مسجد سے ہوئی تھی، لیکن اس کے لیے جمع کا لفظ استعمال کیا ہے، کیوں کہ اس کا حکم عام ہے، اگرچہ اس کا سبب خاص ہے]

تفسیر جلالین میں ہے:

''وسعىٰ في خرابها بالهدم والتعطيل، نزلت إخبارا عن الروم الذين خربوا بيت المقدس، أو في المشركين لما صدوا النبيﷺ عام الحديبية عن البيت'' انتهى[3]

---

[1] تفسير أبي السعود (١/ ١٤٩)

[2] تفسير المظهري (١/ ١١١)

[3] تفسير الجلالين (ص: ٢٢)

[یعنی اسے گرا کر اور ویران کر کے خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ آیت رومیوں کے متعلق آگاہ کرنے کے لیے نازل ہوئی، جنھوں نے بیت المقدس کو ویران کر دیا تھا یا مشرکینِ مکہ کے متعلق، جنھوں نے نبیِ کریم ﷺ کو حدیبیہ والے سال بیت اللہ جانے سے روک دیا تھا]

امام حافظ الدین عبد اللہ بن احمد النسفی (متوفی ۷۰۱ھ) اپنی تفسیر "مدارك التنزيل" میں اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

"وهو حكم عام لجنس مساجد الله، وأن مانعها من ذكر الله مفرط في الظلم، والسبب فيه طرح النصارىٰ في بيت المقدس الأذى، ومنعهم الناس أن يصلوا فيه أو منع المشركين رسول الله ﷺ أن يدخل المسجد الحرام عام الحديبية، وإنما قيل مساجد الله، وكان المنع علىٰ مسجد واحد، وهو بيت المقدس أو المسجد الحرام، لأن الحكم ورد عاما، وإن كان السبب خاصا"[1] انتهى

[یہ حکم ہر مسجد کو شامل ہے اور یقیناً مساجد میں اللہ کے ذکر سے روکنے والا حددرجہ ظالم ہے۔ اس کا سبب نصاریٰ کا بیت المقدس میں گندگی پھینکنا اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے سے روکنا ہے یا مشرکین کا رسول اللہ ﷺ کو حدیبیہ والے سال مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنا ہے۔ آیت میں جمع کا لفظ "مساجد اللہ" (اللہ کی مسجدیں) بولا گیا ہے، حالاں کہ یہ ممانعت ایک مسجد بیت المقدس یا مسجد حرام سے ہوئی تھی، کیوں کہ یہ حکم عام ہے، اگرچہ اس کا سبب خاص ہے]

خاتم المحدثین والمفسرین مولانا شاہ عبدالعزیز۔ محدث دہلوی۔ قدس سرہ تفسیر "فتح العزیز" میں فرماتے ہیں: ﴿اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْداً اِذَا صَلّٰی﴾

"کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جو منع کرتا ہے اور روکتا ہے بندے کو جب چاہتا ہے کہ نماز پڑھے۔"

"حق بندے کا یہی ہے کہ اپنے پروردگار کی عبادت ہاتھ اور پاؤں سے اور دل اور زبان سے بجا لائے اور ایسی عبادت جو ان سب باتوں کو جامع ہو، سوائے نماز کے نہیں ہے اور حق خدا کا یہ ہے کہ معبود ہو ہر عبادت میں، پھر اس منع کرنے والے نے بندے کا حق بھی تلف کیا اور خدا کا حق بھی تلف کیا تو اس کی سرکشی اور نافرمانی خدا سے اور اس کے بندوں سے بھی ثابت ہوئی ہے اور یہ شخص ابو جہل تھا۔ کئی مرتبہ اس نے آنحضرت ﷺ کو مسجدِ حرام میں نماز پڑھنے سے منع کیا تھا، بلکہ یہ کہا تھا کہ اگر میں تجھ کو دیکھوں گا کہ اپنے متھے کو زمین پر رکھا ہے تو تیری گردن کاٹ ڈالوں گا۔ ہر چند یہ آیت اس لعین کے حق میں نازل ہوئی، لیکن اب بھی جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے روکے اور منع کرے، وہ بھی اسی وعید اور برائی میں شامل ہے۔" انتہی

[1] تفسير النسفي (١/ ١١٨)

بے شک جس مسجد میں اِذن عام نہ ہو اور جمعہ کی نماز پڑھنے سے کسی کو روک دیا جائے، وہاں جمعہ مطابق مذہب حنفی کے درست نہیں، جیسا کہ اور شروط مثل وقتِ ظہر اور جماعت وغیرہ کے نہ پائے جانے سے جمعہ کی نماز درست نہیں ہوگی۔ اگر کسی نے ظہر کے وقت سے پہلے یا بغیر جماعت کے جمعہ کی نماز پڑھی تو کسی طرح درست نہیں ہوگی، اسی طرح اِذن عام نہ پائے جانے سے بھی درست نہیں۔ درمختار میں ہے: "ويشترط لصحة الجمعة سبعة أشياء... السابع: الإذن العام"[1] انتهى "جمعہ کے صحیح ہونے کے واسطے سات چیزیں شرط ہیں، ساتویں شرط اذن عام ہے۔" "رد المحتار" حاشیہ درمختار میں ہے:

"قوله: الإذن العام أي أن يأذن للناس إذنا عاما بأن لا يمنع أحدا ممن يصح منه الجمعة عن دخول الموضع الذي تصلىٰ فيه"[2] انتهى

لوگوں کے واسطے عام اذن دے، بایں طور کہ کسی کو منع نہیں کرے کہ جس سے جمعہ صحیح ہو داخل ہو اس جگہ سے کہ جہاں نماز پڑھی جائے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ومنها الإذن العام، وهو أن تفتح أبواب الجامع فيؤذن للناس كافة، حتى أن جماعة لو اجتمعوا في الجامع، وأغلقوا أبواب المسجد على أنفسهم، وجمعوا، لم يجز، وكذلك السلطان إذا أراد أن يجمع بحشمه في داره، فإن فتح باب الدار، وأذن إذنا عاما، جازت صلاته، شهدها العامة أو لم يشهدوها، كذا في المحيط"[3]

"انھی شرطوں میں سے اذن عام ہے، وہ یہ ہے کہ جامع مسجد کے دروازے کو کھول دے اور سب لوگوں کو اذن عام دے، یہاں تک کہ اگر ایک جماعت جمع ہو جائے اور مسجد کے دروازے کو بند کر لیں اور جمعہ کی نماز پڑھیں تو نماز صحیح نہیں ہوگی، اسی طرح جب بادشاہ ارادہ کرے کہ لشکر کے ساتھ اپنے گھر میں جمعہ کی نماز پڑھے، پس اگر گھر کا دروازہ کھول دیا اور سب لوگوں کو اذن عام دیا تو نماز جائز ہوگی، لوگ حاضر ہوں یا نہ حاضر ہوں، ایسے ہی محیط میں ہے۔"

"شرح مواهب الرحمن لأدلة مذهب النعمان" میں ہے:

"منها الإذن العام وهو أن يفتح أبواب الجامع، ويؤذن للناس، حتى لو اجتمعوا جماعة في الجامع، وأغلقوا الأبواب، وجمعوا لم يجز، وكذا السلطان إذا أراد أن يصلي بحشمه في قصره، فإن فتح بابه، وأذن الناس إذنا عاما، جازت صلاته،

---

[1] الدر المختار (۲/ ۱۳۷، ۱۵۱)
[2] رد المحتار (۲/ ۱٦٤)
[3] فتاویٰ عالم گیری (۱/ ۱٤۸)

شهدتها العامة أو لا، وإن لم يفتح بابه و لم يأذن لهم بالدخول لا يجزئه" انتهى

[جمعے کی شروط میں سے اِذنِ عام (عام اجازت) ہے، یعنی جامع مسجد کے دروازوں کو کھول دے اور لوگوں کو آنے کی اجازت دے، حتی کہ اگر ایک جماعت اکٹھی ہو کر جامع مسجد میں دروازے بند کر کے جمعہ پڑھ لے تو ایسا جمعہ جائز نہیں ہے، اسی طرح بادشاہ اگر اپنے محل میں اپنے لوگوں کو لے کر نماز پڑھے تو اگر وہ دروازے کھول کر لوگوں کو آنے کی عام اجازت دے دے تو اس کی نماز صحیح ہے، عام لوگ آئیں یا نہ آئیں، لیکن اگر اپنا دروازہ نہیں کھولتا اور لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا تو اس کا جمعہ نہیں ہوگا]

کافروں کو مسجد میں آنے کی اجازت دینا حنفی مذہب میں درست ہے، جیسا کہ خاتم المفسرین مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر "فتح العزیز" میں فرماتے ہیں:

"وامام اعظم رحمہ اللہ میگویند کہ در آمدن کافر در ہمہ مساجد درست است زیرا کہ در زمان سعادت نشان آنحضرت ﷺ مہمان را گو کافر بودند در مسجد فرو کش میکنانیدند چنانچہ وفد ثقیف را ودگر وفود را و نیز بتواتر معلوم ست کہ برائے ملاقات آنحضرت علیہ السلام یہودیان و نصاریٰ ومشرکی بے طلب اذن و پروانگی در مسجد می آمدند و می نشستند وثمامہ بن اثال حنفی را آنحضرت علیہ السلام در حالت کفر بستونے از ستونہائے مسجد بستہ گزاشتہ بودند و ناسخ ایں عمل مستمر آنحضرت علیہ السلام ہم وارد نشدہ" انتہی

[امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کافر کا ہر مسجد میں آنا درست ہے، کیوں کہ آنحضرت ﷺ کے دورِ سعادت نشان میں مہمان کو، اگرچہ وہ کافر ہی ہوتا ہے، مسجد میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ چناں چہ وفدِ ثقیف اور دیگر وفود مسجد ہی میں فروکش ہوتے تھے۔ نیز تواتر کے ساتھ یہ معلوم ہے کہ یہودی، نصرانی اور مشرکین آنحضرت ﷺ کی ملاقات کے لیے اذن و اجازت طلب کیے بغیر مسجد میں آتے اور بیٹھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ثمامہ بن اثال حنفی کو حالتِ کفر میں مسجد (نبوی) کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی اس متواتر سنت اور طریقے کو منسوخ کرنے والی کوئی چیز بھی وارد نہیں ہوئی ہے]

ہدایہ میں مرقوم ہے کہ قبیلہ ثقیف کے جو سفیر آئے تھے اور وہ کفار تھے، ان کو بھی نبی ﷺ نے اپنی مسجد میں اتارا تھا۔[1]

تفسیر ابو السعود اور تفسیر مظہری و دیگر کتب معتبرہ میں مرقوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کو بھی اپنی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، جو مسلمان بھی نہ تھے، بلکہ عیسائی مذہب رکھتے تھے اور وہ لوگ مع افسر، جس کا نام عبدالمسیح تھا، ساٹھ آدمی تھے۔ یہ سب لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس مدینہ طیبہ میں مقامِ نجران سے سفیر آئے تھے، آپ کی مسجد میں داخل ہوئے، وہیں ان کی نماز کا وقت آ گیا تو نماز پڑھنے کو کھڑے ہو گئے۔ بعض اشخاص حاضرین ان کے مزاحم ہوئے، آنحضرت ﷺ نے خود ان کو نماز پڑھنے کی اجازت دی اور ان بے جا مزاحمت کرنے

[1] البناية في شرح الهداية (١/ ٣٧٦) نیز دیکھیں: نصب الراية (٤/ ٣٣٥) اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

والوں کو ان کی اس بے جا مزاحمت سے روکا۔ انھوں نے حسبِ اجازت خاص آنحضرت ﷺ کی اس مقدس مسجد میں اپنے طریقے کے مطابق روبمشرق، یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔[1]

عجیب امر ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ تو غیر مذہب والوں کو بھی اپنی مقدس مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیں اور اب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو مسجد میں آنے اور نماز پڑھنے سے روکتا ہے اور منع کرتا ہے اور پھر دعویٰ کرتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں؟ یہ تعصب اور نفسانیت ہے۔ اللہ جل شانہ سب مسلمانوں کو نیکی کی توفیق دے اور نفسانیت اور تعصب اور ضد سے بچائے۔

والله أعلم بالصواب. حرره العاجز، ابوظفر محمد عمر، عفا عنه. قد صح الجواب، والله أعلم بالصواب. حرره أبو الطيب محمد شمس الحق العظيم آبادی. الجواب صحيح والمجيب نجيح. ابو عبدالله مولا بخش خان بهازی. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبدالله. أصاب من أجاب، والله يوفقني إلى الصواب ويهدي كل مانع إلى ترك الخراب. ألطاف حسين. عفا عنه رب المشرقين والمغربين الفاضل پوری. (مہر مدرسہ)

مسجد میں دوبارہ جمعہ پڑھنا:

سوال ایک مسجد کچہری میں ہے، اس مسجد کو جامع مسجد نہیں خیال کیا جاتا۔ اگر لوگ جمع ہوجاتے ہیں تو جمعہ ہوجاتا ہے، ورنہ نہیں، یا جامع مسجد ہی ہے۔ اب ایسا واقعہ پیش آیا کہ حنفی لوگوں کا جمعہ پہلے ہو چکا تھا، عرصہ کے بعد دس گیارہ اہلِ حدیث آگئے، اب وہ بے قرار ہوئے کہ آج جمعہ کا روز ہے، جمعہ پڑھنا چاہیے، سو انھوں نے اسی مسجد میں خطبہ وغیرہ پڑھ کر جمعہ پڑھ لیا۔ کیا یہ درست ہے یا نہیں اور ہم لوگوں کا جمعہ ہوا ہے یا نہیں؟ جواب قرآن و حدیث و صحابہ کے آثار سے ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو کسی ائمہ محدثین کا استنباط ہو۔ بينوا تؤجروا.

جواب صورت مسئول عنہا میں شرائط معتبرہ صحت نماز جمعہ میں سے کوئی شرط فوت نہیں ہوئی، لہٰذا نمازِ جمعہ مندرجہ سوال کی عدمِ صحت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ومن ادعى خلاف ذلك فعليه البيان. ہاں عمداً ایسا نہ کریں، بلکہ ایک شہر یا ایک بستی کے تمام نمازی ایک ہی جگہ بیک جماعت نمازِ جمعہ پڑھا کریں، کیونکہ عہدِ رسالت (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) سے لے کر تیسری صدی تک اسی طرح نمازِ جمعہ پڑھی جاتی تھی اور ایک ہی شہر یا ایک ہی بستی میں متعدد مقامات میں نمازِ جمعہ پڑھنے کا معمول نہ تھا۔ "التلخيص الحبير" (ص: ۳۳) ملاحظہ ہو۔[2] جیسا کہ بعد کو ہوگیا اور اب تک جاری ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله

---

[1] تفسير أبي السعود (٢/ ٣) تفسير المظهري (٢/ ٢)

[2] التلخيص الحبير (٢/ ٥٣)

بستی میں باہر میدان میں جمعہ ادا کرنا:

سوال ایک ہندوؤں کی بستی میں رہتا ہوں۔ یہاں کوئی مسجد نہیں ہے اور نہ ہندوؤں کی شورش سے ابھی بننے کی امید ہے، مگر نمازِ پنج گانہ میں ایک خاص جماعت کے ساتھ پڑھتا ہوں، مگر اذان بآواز بلند کہنے سے ہندو مانع ہوتے ہیں۔ ایسی مجبوری کی حالت میں اگر جمعہ قائم کرنا چاہوں تو آہستہ سے اذان کہہ کر جمعہ پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ کیونکہ نہیں قائم کرنے کی حالت میں بہتیرے لڑکے اور سیانے کی نمازِ جمعہ فوت ہوجاتی ہے، چونکہ جہاں پر جمعہ ہوتا ہے، وہ جگہ دور ہے، یا تو آرہ جانا ہوگا، جو چار کوس ہے اور یا کاری ساتھ جانا ہوگا، جو ایک کوس پر ہے، علاوہ اس کے موسم برسات میں راستہ بند ہوجاتا ہے اور بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم کیا کریں؟ جواب سے شاد فرمائیے۔ باہم بستی سے باہر جاکر میدان میں اذان دے کر نمازِ جمعہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب جس بستی کی یہ حالت ہے کہ وہ اس جگہ سے جہاں پر جمعہ ہوتا ہے، اس قدر دور ہے کہ وہاں جانے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس وجہ سے بہتیرے لڑکوں اور سیانوں کی نمازِ جمعہ فوت ہوجاتی ہے اور موسم برسات میں راستہ بند ہوجاتا ہے، اُس بستی میں جمعہ قائم کرسکتے ہیں اور اذان صرف اُس وقت دے، جب خطبہ شروع کرنا ہو، ایسی آواز سے کہ حاضرین سن لیں (تاکہ وہ لوگ بات چیت وغیرہ موقوف کرکے خطبہ سننے میں مشغول ہوجائیں) کہنا کافی ہے۔ نیز یہ صورت بھی جائز ہے کہ اُس بستی سے باہر نکل کر میدان میں نمازِ جمعہ پڑھیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم

كتبه: محمد عبد الله (٢٤/ ربيع الآخر ١٣٣٢هـ)

سوال بحضورِ اقدس دامت برکاتہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ فتویٰ مرسلہ حضور کا پہنچا، جس سے اجازت قیامِ جمعہ کی ثابت ہوئی، مگر یہ بات مخل رہ گئی کہ آج کل جو موسم برسات نہیں ہے اور وہ دقتیں جو موسم برسات میں پیش آتی ہیں، آج کل وہ دقتیں پیش نہیں آتی ہیں، مگر محض ایک کوس کا فاصلہ ہونے کی وجہ سے بہتیرے لڑکے اور سیانے نمازِ جمعہ نہیں ادا کر سکتے۔ لہٰذا آج کل ہم بستی مذکور میں اذانِ خفیہ سے جمعہ قائم کرسکتے ہیں یا نہیں یا موسم برسات ہی کی اجازت ہے؟

جواب جو لڑکے اس جگہ، جہاں نمازِ جمعہ ہوتی ہے، جاسکیں، جاکر ادا کریں اور جو نہ جاسکیں نہ جائیں۔ لڑکوں پر نمازِ جمعہ فرض نہیں ہے اور سیانے اگر معذور (بیمار) ہیں تو ان پر بھی نمازِ جمعہ فرض نہیں ہے اور اگر معذور نہیں ہیں تو ان کو اس جگہ جاکر نمازِ جمعہ ادا کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں لوگ اس سے بھی زیادہ دور سے نمازِ جمعہ کے لیے آیا کرتے تھے۔ مشکوۃ شریف (ص: ۱۲۳) میں ہے:

عن طارق بن شهاب قال: قال رسول الله ﷺ: «الجمعة حق واجب علىٰ كل مسلم في الجماعة إلا علىٰ أربعة: عبد مملوك أو امرأة أو صبي أو مريض»[1] (رواه أبو داود)

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٦٧)

[طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر مسلمان پر باجماعت جمعہ ادا کرنا فرض ہے، سوائے چار کے: مملوک غلام، عورت، بچہ اور بیمار]

صحیح بخاری (۱/۱۰۳ طبع مصری) میں ہے:

"عن عائشة زوج النبيﷺ قالت: كان الناس ينتابون يوم الجمعة من منازلهم والعوالي فيأتون في الغبار"[1] الحديث، والله تعالىٰ أعلم

[ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ لوگ اپنے ڈیروں اور بالائے مدینہ (عوالی) سے جمعے کے لیے آیا کرتے تھے، چنانچہ وہ گرد وغبار میں چلتے ہوئے آتے] کتبہ: محمد عبداللہ (۳۰/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ)

خطبہ جمعہ میں وعظ ونصیحت واجب ہے یا نہیں؟

سوال خطبہ جمعہ میں وعظ ونصیحت واجب ہے یا نہیں؟

جواب خطبہ میں وعظ ونصیحت واجب ہے، اس لیے کہ اصل مقصود خطبے سے وعظ ونصیحت ہے، نیز وعظ ونصیحت روحِ خطبہ ہے اور حمد وصلاۃ آدابِ خطبہ سے ہے، نہ کہ اصل خطبہ سے، لفظِ حدیث "ويذكر الناس" جو درباب خطبہ مروی ہے، وجوبِ مذکور کی ایک کافی دلیل ہے۔

"دليل الطالب" (ا/ ٣٧٤ و ٣٢٥) تصنیف نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی عبارت مندرجہ قابلِ ملاحظہ ہے:

"اعلم أن الخطبة المشروعة هي ما كان يعتاده صلى الله عليه وسلم من ترغيب الناس وترهيبهم، فهذا في الحقيقة هو روح الخطبة الذي لأجله شرعت، وأما اشتراط الحمد لله، والصلاة على رسول اللهﷺ أو قراءة شيئ من القرآن فجميعه خارج عن معظم المقصود من شرعية الخطبة، وانفاق مثل ذلك في خطبتهﷺ لا يدل على أنه مقصود متحتم وشرط لازم، ولا يشك منصف أن معظم المقصود هو الوعظ دون ما يقع قبله من الحمد والصلاة عليهﷺ، وقد كان عرف العرب المستمر أن أحدهم إذا أراد أن يقوم مقاما ويقول مقالا، شرع بالثناء على الله وعلىٰ رسوله، وما أحسن هذا وأولاه، ولكن ليس هو المقصود بل المقصود ما بعده، ولو قال قائل: إن من قام في محفل من المحافل خطيبا ليس له باعث علىٰ ذلك إلا أن يصدر منه الحمد والصلاة لما كان هذا مقبولا، بل كل طبع سليم يمجه ويرده، وإذا تقرر هذا عرضت أن الوعظ في خطبة الجمعة هو الذي يساق إليه الحديث، فإذا فعله الخطيب فقد فعل الأمر المشروع إلا أنه إذا قدم الثناء على الله وعلىٰ رسوله

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٤٧)

واستطرد في وعظه القوارع القرآنية كان أتم وأحسن، وأما قصر الوجوب بل الشرطية علىٰ الحمد والصلاة، وجعل الوعظ من الأمور المندوبة فقط، فمن قلب الكلام وإخراجه عن الأسلوب الذي تقبله الأعلام"

[آگاہ رہو! مشروع خطبہ وہ ہے جو آپ ﷺ حسبِ معمول ارشاد فرماتے، جس میں آپ ﷺ ترغیب وترہیب کرتے۔ پس فی الحقیقت خطبے کی روح یہی ہے، جس کے لیے اسے مشروع قرار دیا گیا ہے۔ رہا خطبے میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنا، رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنا یا قرآن مجید کے کچھ حصے کی تلاوت کرنا تو یہ سب چیزیں شریعتِ خطبہ کے معظم مقصود سے خارج ہیں۔ اس طرح کی چیزوں کا آپ ﷺ کے خطبے میں پایا جانا، اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ خطبے کا حتمی مقصود اور شرط لازم ہیں۔ انصاف پسند شخص کسی شک میں مبتلا نہیں ہوتا کہ خطبے کا سب سے بڑا مقصود وعظ ونصیحت ہے نہ کہ وہ حمد وصلات جو خطبے کی ابتدا میں ہوتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ معروف طریقہ تھا کہ ان میں سے جب کوئی کسی جگہ کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہتا تو وہ اپنی گفتگو کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد اور رسول اللہ ﷺ پر درود کے ساتھ کرتا، یہ طریقہ کس قدر احسن اور اولیٰ ہے، لیکن اگر کوئی کہنے والا کہے کہ محفلوں میں سے کسی محفل میں جو شخص خطیب بن کر کھڑا ہوا، اس کو اس پر ابھارنے والی صرف یہ چیز ہے کہ وہ حمد وصلات بیان کرے تو اس کی یہ بات مقبول نہیں ہوگی، بلکہ ہر طبعِ سلیم ناگوار جانتے ہوئے اس کا رد کرے گی، جب یہ ثابت ہو چکا تو تمھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ خطبۂ جمعہ میں وعظ ہی وہ چیز ہے، جس کی خاطر کام کو لایا جاتا ہے، لہٰذا جب خطیب یہ کام کرے گا تو وہ مشروع کام کا کرنے والا شمار ہوگا۔ ہاں جب وہ اپنے خطبے کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے گا، رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھے گا اور کچھ قرآنی آیات کی تلاوت کرے گا تو اس کا خطبہ مکمل اور احسن ہوگا۔ وجوب پر اکتفا کرنا، بلکہ حمد وصلات کی شرطیت کا قائل ہونا اور وعظ کو صرف امورِ مندوبہ میں سے قرار دینا، کلام کو الٹ پلٹ کرنے اور اسے اس اسلوب سے نکالنے کے مترادف ہے، جس کو نمایاں اور سرکردہ لوگ قبول کرتے ہیں]

اسی طرح کتاب زاد المعاد تصنیف حافظ ابن قیم رحمہ اللہ جلد (۱) میں خصائصِ یوم جمعہ میں سے خصیصہ (۳۳) مع فصل جو اس کے بعد ہے، قابلِ دید ہے۔[1] واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبداللہ (۲۰/ صفر ۱۳۳۳ھ)

خطبہ جمعہ میں اردو یا فارسی میں وعظ ونصیحت کرنا:

سوال (۱) خطبہ شرع شریف میں کس کو کہتے ہیں؟

[1] زاد المعاد (۱/ ۴۰۷)

② خطبہ سے کیا مقصود ہے؟

③ خطبہ میں وعظ و تذکیر فارسی یا اردو میں شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

④ ائمہ مجتہدین مشہورین میں سے کسی سے اس امر کا جواز منقول ہے یا نہیں؟

⑤ کتاب "بدور الأهلة" مولفہ نواب صدیق حسن خاں صاحب کے صفحہ (۴۳) میں جو یہ عبارت "رسم مستمر اسلام از زمن نبوت تا ایندم خواندن خطبہ است بعبارت عربی گو در بلاد عجم باش و ہر چند دلیلے مانع از غیر ایں لسان مبین مباش"[1] واقع ہے، اس عبارت سے اس امر پر "کہ خطبہ میں وعظ و تذکیر فارسی یا اردو میں ممنوع ہے" استدلال صحیح ہے یا نہیں؟

ذیل کی حدیث سے جو دو سندوں سے مروی ہے، امر مذکورہ پر استدلال صحیح ہے یا نہیں؟ حدیث مذکور پہلی سند سے یہ ہے:

روى السلفي من حديث سعيد بن علاء البرذعي حدثنا إسحاق بن إبراهيم البلخي حدثنا عمر بن هارون البلخي حدثنا أسامة بن زيد عن نافع عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «من يحسن أن يتكلم بالعربية فلا يتكلم بالعجمية، فإنه يورث النفاق» اھ

[سلفی نے سعید بن علاء البرذعی کی حدیث سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا کہ ہمیں اسحاق بن ابراہیم بلخی نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں عمر بن ہارون بلخی نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں اسامہ بن زید نے بیان کیا، انھوں نے نافع سے روایت کیا، انھوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص عربی زبان میں اچھی گفتگو کر سکتا ہو، وہ عجمی زبان میں گفتگو نہ کرے، بلاشبہہ ایسا کرنا نفاق پیدا کرتا ہے]

حدیث مذکور دوسری سند سے یہ ہے:

روى السلفي أيضاً بإسناد آخر معروف إلى أبي سهل محمود بن عمر العكبري حدثنا محمد بن الحسن بن محمد المقرئ حدثنا محمد بن خليل ببلخ حدثنا إسحاق بن إبراهيم الجريري حدثنا عمر بن هارون عن أسامة بن زيد عن نافع عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ: «من كان يحسن أن يتكلم بالعربية فلا يتكلم بالفارسية، فإنه يورث النفاق»

[سلفی ہی نے ایک دوسری معروف سند کے ساتھ ابو سہل محمود بن عمر العکبری تک روایت کیا ہے، انھوں نے کہا کہ ہمیں محمد بن حسن بن محمد المقری نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں محمد بن خلیل نے بلخ میں

---

[1] زمانہ نبوت سے اب تک اسلامی طریقہ خطبہ عربی عبارت میں پڑھنا ہے، خواہ عجمی ملک میں ہو۔ اگر چہ عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں خطبہ...

بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں اسحاق بن ابراہیم الجریری نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں عمر بن ہارون نے بیان کیا، انھوں نے اسامہ بن زید سے روایت کیا، انھوں نے نافع سے اور نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص عربی زبان میں اچھی گفتگو کر لیتا ہو تو وہ فارسی میں گفتگو نہ کرے، یقیناً ایسا کرنا نفاق پیدا کرتا ہے]

جواب ① خطبہ شرع شریف میں اس کلام کا نام ہے جو ذکر اللہ اور تشہد (شہادتین) اور درود اور وعظ پر مشتمل ہو۔ مشکوۃ شریف (ص: ۱۱۵ مطبوعہ انصاری دہلی) کے حاشیہ میں ہے: "الخطبة في الشرع عبارة عن كلام، يشتمل علىٰ الذكر والتشهد والصلاة والوعظ" اھ [شرع میں خطبے سے مراد ایسا کلام ہے جو ذکر، تشہد (شہادتین) درود اور وعظ پر مشتمل ہو] اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ "أشعة اللمعات شرح مشكوة" میں فرماتے ہیں: "خطبہ در عرفِ شرع عبارت است از کلام مشتمل بر ذکر و تشہد و صلاۃ و وعظ" اھ [عرفِ شرع میں خطبہ اس کلام کا نام ہے جو ذکر، تشہد (شہادتین) درود اور وعظ پر مشتمل ہو]

② خطبہ سے بالذات صرف وعظ و تذکیر مقصود ہے وبس۔ سورت جمعہ میں ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ اھ [الجمعة: ٩]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو]

اس آیت شریفہ میں ذکر اللہ سے وعظ و تذکیر مراد ہے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إذا كان يوم الجمعة وقفت الملائكة علىٰ باب المسجد يكتبون الأول فالأول، ومثل المهجر كمثل الذي يهدي بدنة، ثم كالذي يهدي بقرة، ثم كبشا، ثم دجاجة، ثم بيضة، فإذا خرج الإمام طووا صحفهم، ويستمعون الذكر»[1] (رواه البخاري)

[جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنے والوں کو ترتیب وار لکھتے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے آنے والا اس شخص کی طرح (اجر و ثواب پاتا) ہے، جو اونٹ کی قربانی کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس شخص کی طرح جو گائے کی قربانی کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد والا بھیڑ کی قربانی کرنے والے کی طرح۔ پھر مرغی اور پھر اس کے بعد آنے والا ایسے ہے جیسے کوئی انڈہ صدقہ کرے۔ جب امام (منبر پر) آجاتا ہے تو وہ اپنے رجسٹر بند کر دیتے ہیں اور غور سے خطبہ سنتے ہیں]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری (۱/ ۴۸۰ چھاپہ دہلی) میں فرماتے ہیں: "والمراد به (أي بالذكر) ما في

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٠)

الخطبة من المواعظ وغيرها" اھ [ذکر سے مراد وہ وعظ و نصیحت ہے جو خطبے میں ہوتے ہیں] صحیح بخاری میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

قال: جاء رجل والنبيﷺ يخطب الناس يوم الجمعة، فقال: «أصليت يا فلان؟» فقال: لا، قال: «قم فاركع»[1]

[بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی اس وقت آیا، جب نبی اکرم ﷺ جمعے کے دن لوگوں کو خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو آپ ﷺ نے اسے پوچھا: اے فلاں! کیا تو نے نماز ادا کی؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اٹھو اور نماز ادا کرو]

فتح الباری (۱/ ۵۰۱) میں ہے:

"وفي هذا الحديث من الفوائد أن للخطيب أن يأمر في خطبته وينهىٰ ويبين الأحكام المحتاج إليها"

[اس حدیث میں چند فوائد ہیں: خطیب اپنے خطبے میں امر و نہی کرے اور وہ احکام بیان کرے جن کی ضرورت ہے]

صحیح مسلم (۱/ ۲۸۳) میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"قال: كانت للنبيﷺ خطبتان، يجلس بينهما، يقرأ القرآن ويذكر الناس"[2]

[بیان کرتے ہیں کہ نبیِ مکرم ﷺ دو خطبے ارشاد فرماتے تھے۔ آپ ﷺ ان کے درمیان بیٹھتے تھے۔ آپ ﷺ قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے تھے]

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"فيه دليل للشافعي في أنه يشترط في الخطبة الوعظ والقراءة، قال الشافعي: لا تصح الخطبتان إلا بحمد الله تعالىٰ والصلاة على رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم فيهما والوعظ"[3] اھ

[اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کی یہ دلیل ہے کہ خطبۂ جمعہ میں وعظ و نصیحت اور تلاوتِ قرآن کرنا شرط ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: دونوں خطبے اس وقت ہی درست ہوتے ہیں، جب ان میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جائے، رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھا جائے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کی جائے]

شوکانی رحمہ اللہ نیل الاوطار (۳/ ۱۴۵) میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۸۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۸۷۵)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۸٦۲)

[3] شرح صحيح مسلم (٦/ ۱۵۰)

"استدل به علىٰ مشروعية القراءة والوعظ في الخطبة، وقد ذهب الشافعي إلى وجوب الوعظ وقراءة آية"[1] اھ

[اس سے خطبے میں قراءتِ قرآن اور وعظ ونصیحت کی مشروعیت پر استدلال کیا گیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تو اس بات کی طرف گئے ہیں کہ خطبے میں وعظ کرنا اور آیت کی تلاوت کرنا واجب ہے]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ "أشعة اللمعات" میں اس حدیث کے ترجمے میں فرماتے ہیں:

''بود مرآنحضرت را دو خطبہ کہ می نشست میان ہر دو خطبہ می خواند قرآن را در خطبہا و پند می داد مردان را ویادمی داد آخرت را واحوال آنجہان را از ثواب وعقاب'' اھ

[آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے دیا کرتے تھے، ان دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے، دونوں خطبوں میں قرآنِ مجید کی تلاوت فرماتے تھے، لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے، آخرت کی یاد دلاتے تھے اور آخرت کے ثواب وعذاب کے احوال ذکر فرماتے تھے]

سنن ابی داود (۱/ ۱۵۹ مطبوعہ نولکشور) میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"كان رسول الله ﷺ لا يطيل الموعظة يوم الجمعة، إنما هن كلمات يسيرات"[2]

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز لمبا وعظ نہ فرمایا کرتے تھے، بلکہ چند مختصر سے کلمات ہوا کرتے تھے]

شوکانی رحمہ اللہ نیل الاوطار (۳/ ۱۴۵) میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"فيه أن الوعظ في الخطبة مشروع"[3] اھ

[اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ خطبۂ جمعہ میں وعظ کرنا مشروع ہے]

صحیح مسلم (۱/ ۲۸۶) میں ام ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

"قالت: ما أخذت ﴿قٓ ۚ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ﴾ إلا عن لسان رسول الله ﷺ، يقرأها كل يوم جمعة علىٰ المنبر إذا خطب الناس"[4]

[ام ہشام رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے سورت ق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن سن کر یاد کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعے کو جب منبر پر لوگوں سے خطاب فرماتے تو اسے پڑھا کرتے تھے]

---

① نيل الأوطار (٣/ ٣٢٧)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٠٧)

③ نيل الأوطار (٣/ ٣٢٧)

④ صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٣)

امام نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"قال العلماء: سبب اختيار ق أنها مشتملة علىٰ البعث والموت والمواعظ الشديدة والزواجر الأكيدة"[1] اهـ

[علما رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ خطبۂ جمعہ میں سورت ق کی تلاوت کو اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ سورت موت، اس کے بعد اٹھائے جانے، مواعظِ شدیدہ اور زواجرِ اکیدہ پر مشتمل ہے]

مشکوۃ شریف صفحہ (۱۱۰) میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مذکور ہے:

"قال: كان النبي ﷺ يخرج يوم الفطر والأضحىٰ إلى المصلىٰ، فأول شيء يبدأ به الصلاة، ثم ينصرف فيقوم مقابل الناس و الناس جلوس علىٰ صفوفهم فيعظهم ويوصيهم ويأمرهم"[2] الحديث (متفق عليه)

[(راوی) بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف نکلتے تھے۔ آپ ﷺ سب سے پہلے نماز پڑھاتے۔ پھر آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے، درآنحالیکہ لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوتے تو آپ ﷺ ان کو وعظ فرماتے، ان کو وصیت کرتے اور ان کو (نیکی وغیرہ کا) حکم دیتے]

صفحہ (۱۱۸) میں جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث اس طرح مذکور ہے:

"قال: شهدت الصلاة مع النبي ﷺ في يوم عيد فبدأ بالصلاة قبل الخطبة بغير أذان ولا إقامة، فلما قضى الصلاة، قام متكئا علىٰ بلال، فحمد الله وأثنىٰ عليه، ووعظ الناس، وذكرهم، وحثهم على طاعته، ومضىٰ إلى النساء، ومعه بلال، فأمرهن بتقوى الله، ووعظهن وذكرهن"[3] (رواه النسائي)

[(راوی) بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عید کے روز نمازِ عید میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے بغیر اذان اور اقامت کے خطبے سے پہلے نمازِ عید پڑھائی۔ جب آپ ﷺ نے نماز پوری فرمائی تو بلال رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے (اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی) اطاعت کی تلقین فرمائی۔ پھر آپ ﷺ ایک طرف سے ہو کر عورتوں کی طرف گئے۔ بلال رضی اللہ عنہ بدستور آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے ان (عورتوں) کو

---

① شرح صحيح مسلم (٦/ ١٦١)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٩١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٩)

③ سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٧٥)

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا اور انھیں وعظ و نصیحت فرمائی]

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ "زاد المعاد" (۱/ ۱۲۱ چھاپہ نظامی) میں فرماتے ہیں: "وكان (ﷺ) يعلم أصحابه في خطبته قواعد الإسلام وشرائعه" اھ [آپ ﷺ اپنے خطبے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسلام کے قواعد و شرائع کی تعلیم دیتے تھے] جلد (۱) صفحہ (۱۱۱) میں خصائصِ جمعہ کے بیان میں فرماتے ہیں:

"الثانية والعشرون: أن فيه الخطبة التي يقصد بها الثناء على الله، وتمجيده، والشهادة له بالوحدانية، ولرسوله ﷺ بالرسالة، وتذكير العباد بأيامه، وتحذيرهم من بأسه ونقمته، ووصيتهم بما يقربهم إليه وإلى جنانه، ونهيهم عما يقربهم إلى سخطه، وناره، فهذا هو مقصود الخطبة والاجتماع لها" اھ

[اکیسویں خصوصیت: خطبے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ثنا بیان کرنا، اس کی بزرگی بیان کرنا، اس کی وحدانیت کی گواہی دینا، اس کے رسول ﷺ کی رسالت کی گواہی دینا، اس کے بندوں کو اس کے ایام کے ساتھ نصیحت کرنا، ان کو اللہ تعالیٰ کی سزا اور عذاب سے ڈرانا، ان کو ایسی وصیت کرنا، جو ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کی جنتوں کے قریب کر دے، ان کو ایسے عمل سے منع کرنا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور جہنم کی آگ کے قریب کر دے، چناں چہ یہی چیزیں خطبے کا مقصود ہیں اور اس پر اجماع ہے]

فتح القدیر شرح ہدایہ (۱/ ۲۶ چھاپہ نولکشور) میں ہے:

"يحمد في الأولىٰ، ويتشهد، ويصلي عليه صلى الله عليه وسلم، ويعظ الناس"

[(خطیب) پہلے خطبے میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے، تشہد (شہادتین) پڑھے، آپ ﷺ پر درود پڑھے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے]

صفحہ (۲۶۱) میں ہے: "قوله: لحصول المقصود، وهو الذكر والموعظة" [اس کے قول "مقصود کے حصول کے لیے" سے مقصود وعظ و نصیحت ہے] "رد المحتار" (۱/ ۵۴۴ چھاپہ دہلی) میں ہے:

"قوله: ويبدأ أي قبل الخطبة الأولىٰ بالتعوذ سرا، ثم بحمد الله تعالىٰ والثناء عليه، والشهادتين، والصلاة علىٰ النبي ﷺ والعظة والتذكير والقراءة" اھ

[اس کا یہ قول کہ وہ ابتدا کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ (خطیب) پہلے خطبے سے پہلے سری طور پر تعوذ پڑھے، پھر اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرے، پھر شہادتین ("أشهد أن لا إلٰه إلا الله، وأشهد أن محمداً رسول الله") پڑھے، نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے، وعظ و نصیحت کرے اور (قرآن مجید کی) قراءت کرے]

جامع الرموز شرح مختصر الوقایہ (۱/ ۱۱۸ چھاپہ محمدی دہلی) میں ہے:

"فيبدأ بالتعوذ سرا، ثم يحمد الله، ثم يأتي بالشهادتين، ثم يصلي عليه ﷺ ثم يعظ الناس" اھ

[پس وہ سری طور پر تعوذ پڑھنے کے ساتھ خطبے کا آغاز کرے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرے، پھر شہادتین پڑھے، پھر آپ ﷺ پر درود پڑھے، پھر لوگوں کو وعظ کرے]

"برجندی شرح مختصر الوقاية" (۱/ ۲۰۱ چھاپہ نولکشور) میں ہے:

"ويخطب خطبتين، يحمد في الأولىٰ، ويتشهد ويصلي علىٰ النبي ﷺ ويعظ الناس" اھ

[وہ (خطیب) دو خطبے دے۔ پہلے خطبے میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور کلمہ شہادت ("أشهد أن لا إلٰه إلا الله، وأشهد أن محمداً رسول الله") پڑھے، نبیِ مکرم ﷺ پر درود پڑھے اور لوگوں کو وعظ کرے]

اسی صفحے میں ہے:

"وفي شرح الطحاوي رحمه الله السنة في الخطبة أن يحمد الله، ويثني عليه، ويعظ الناس" اھ

[شرح طحاوی میں ہے: خطبے میں سنت یہ ہے کہ (خطیب) اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرے، لوگوں کو وعظ کرے، (قرآن مجید کی) قراءت کرے اور نبی مکرم ﷺ پر درود بھیجے]

فتاویٰ قاضی خان (۱/ ۸۸ چھاپہ نولکشور) میں ہے:

"قال بعضهم: ما دام الخطيب في حمد الله تعالىٰ والثناء عليه والوعظ للناس فعليهم الاستماع والإنصات" اھ

[ان (فقہا) میں سے بعض کا کہنا ہے کہ جب تک خطیب اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا رہے اور لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتا رہے تو لوگوں پر خاموشی کے ساتھ اسے سننا واجب ہے]

فتاویٰ سراجیہ بر حاشیہ فتاویٰ قاضی خان (۳/۱۰۳ چھاپہ نولکشور) میں ہے: "لو خطب بالفارسية يجوز" اھ [اگر وہ (خطیب) فارسی میں خطبہ دے تو جائز ہے] "سفر السعادة" اور اس کی شرح (ص: ۲۶۷ مطبوعہ کلکتہ) میں ہے:

"و در خطبہ قواعدِ اسلام را بیان فرمودے و مہماتِ دین را تعلیم کردے و بذکر موت و تزہید در دنیا و ترغیب در آخرت تذکیر نمودے" اھ

[(خطیب) خطبہ (جمعہ) میں قواعدِ اسلام کو بیان کرے، دین کی اہم باتوں کی تعلیم دے اور موت کا ذکر کر کے، دنیا کی بے رغبتی پیدا کر کے اور آخرت کی ترغیب دے کر لوگوں کو نصیحت فرمائے]

صفحہ (۲۶۰) میں خصائصِ جمعہ کے بیان میں ہے:

"خاصیت سی و دوم اختصاص ایں روز است بہ اجتماع مومنان برائے وعظ و تذکیر یعنی بطریق وجوب" اھ

[بتیسویں خصوصیت: اس روزِ (جمعہ) کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس دن مومنوں کو اکٹھا کیا جائے اور بطریقِ وجوب ان کو وعظ و نصیحت کی جائے]

نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ "دلیل الطالب" (ص: ۳۷۴ و ۳۷۵) میں فرماتے ہیں:

"اعلم أن الخطبة المشروعة هي ما كان يعتاده ﷺ من ترغيب الناس وترهيبهم، فهذا في الحقيقة هو روح الخطبة الذي لأجله شرعت، وأما اشتراط الحمد والصلاة على رسول الله ﷺ أو قراء ة شيء من القرآن فجميعه خارج عن معظم المقصود من شرعية الخطبة، واتفاق مثل ذلك في خطبته ﷺ لا يدل على أنه مقصود متحتم، وشرط لازم، ولا يشك منصف أن معظم المقصود هو الوعظ دون ما يقع فيها من الحمد والصلاة عليه ﷺ، وقد كان عرف العرب المستمر أن أحدهم إذا أراد أن يقوم مقاما، ويقول مقالا، شرع بالثناء علىٰ الله و على رسوله ﷺ، وما أحسن هذا و أولاه، ولكن ليس هو المقصود، بل المقصود ما بعده، وإذا تقرر هذا عرفت أن الوعظ في خطبة الجمعة هو الذي يساق إليه الحديث، فإذا فعله الخطيب فقد فعل الأمر المشروع إلا أنه إذا قدم الثناء علىٰ الله وعلىٰ رسوله ﷺ أو استطرد في وعظه القوارع القرآنية كان أتم وأحسن" اهـ

[آ گاہ رہو! مشروع خطبہ وہ ہے جو آپ ﷺ حسبِ معمول ارشاد فرماتے، جس میں آپ ﷺ ترغیب و ترہیب کرتے۔ پس فی الحقیقت خطبے کی روح یہی ہے، جس کے لیے اسے مشروع قرار دیا گیا ہے۔ رہا خطبے میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنا، رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنا یا قرآن مجید کے کچھ حصے کی تلاوت کرنا تو یہ سب چیزیں شرعیتِ خطبہ کے معظم مقصود سے خارج ہیں۔ اس طرح کی چیزوں کا آپ ﷺ کے خطبے میں پایا جانا، اس باتِ پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ خطبے کا حتمی مقصود اور شرطِ لازم ہے۔ انصاف پسند شخص کسی شک میں مبتلا نہیں ہوتا کہ خطبے کا سب سے بڑا مقصود وعظ و نصیحت ہے نہ کہ وہ حمد و صلات جو خطبے کی ابتدا میں ہوتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ معروف طریقہ تھا کہ ان میں سے جب کوئی کسی جگہ کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہتا تو وہ اپنی گفتگو کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد اور رسول اللہ ﷺ پر درود کے ساتھ کرتا، یہ طریقہ کس قدر احسن اور اولیٰ ہے، لیکن اگر کوئی کہنے والا کہے کہ کسی محفل میں جو شخص خطیب بن کر کھڑا ہوا، اس کو اس پر اُبھارنے والی صرف یہ چیز ہے کہ وہ حمد و صلات بیان کرے تو اس کی یہ بات مقبول نہیں ہوگی، بلکہ ہر طبعِ سلیم ناگوار جانتے ہوئے اس کا رد کرے گی۔ جب یہ ثابت ہو چکا تو تمھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ خطبہ جمعہ میں وعظ ہی وہ چیز ہے، جس کے لیے بات کو لایا جاتا ہے، لہٰذا جب خطیب یہ

کام کرے گا تو وہ مشروع کام کا کرنے والا شمار ہوگا۔ ہاں جب وہ اپنے خطبے کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے گا، رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھے گا اور کچھ قرآنی آیات کی تلاوت کرے گا تو اس کا خطبہ مکمل اور احسن ہوگا]

"بدور الأهلة" (ص: ۷۲) میں فرماتے ہیں: ''وخطبہ مجرد موعظت است کہ بدان عباد اللہ را انذار کنند'' اھ [خطبہ (جمعہ) تو محض وعظ ونصیحت کا نام ہے، جس کے ذریعے سے اللہ کے بندوں کو خبردار کیا جائے] نیز اسی صفحہ میں ہے:

''وخطبہ نبوی مشتمل برحمد وصلاۃ مے بود وایں اشتمال استفتاح خطبہ مقصود ومقدمہ از مقدماتش باشد ومقصود بالذات وعظ وتذکیر است نہ حمد وصلاۃ۔ حاصل آنکہ روح خطبہ موعظہ حسنہ است از قرآن باشد یا غیر آن''

[نبی مکرم ﷺ کا خطبہ حمد وصلات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ حمد وصلات مقصودِ خطبہ کا آغاز اور اس کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہے۔ خطبے کا مقصود بالذات وعظ ونصیحت ہے نہ کہ حمد وصلات۔ الحاصل خطبے کی روح ایک اچھا اور عمدہ وعظ ہے، خواہ وہ قرآن سے ہو یا غیرِ قرآن سے]

"النهج المقبول من شرائع الرسول" (ص: ۲۸) میں ہے: ''خطبہ مجرد وعظ است'' اھ [خطبہ تو صرف وعظ کا نام ہے] "عرف الجادي من جنان هدي الهادي" (ص: ۴۳) میں ہے: ''ومعظم مقصودِ خطبہ وعظ است بہ ترغیب وترہیب'' [خطبے کا سب سے بڑا مقصود ترغیب وترہیب کے ساتھ وعظ ونصیحت ہے]

③ خطبہ میں وعظ وتذکیر فارسی یا اردو زبان میں شرعاً جائز ہے اور اردو یا فارسی کی کچھ خصوصیت نہیں، ہر زبان میں، جس میں سامعین سمجھ سکیں، جائز ہے، کیونکہ جب خطبے سے اصلی مقصود اور خطبے کی روح صرف وعظ وتذکیر ہے کہ سوال نمبر ① کے جواب سے معلوم ہو چکا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی کلام پر وعظ وتذکیر کا اطلاق اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے، جبکہ وہ کلام اسی زبان میں ہو، جس کو سامعین سمجھ سکیں اور اگر وہ کلام غیر زبان میں ہو، جس کو سامعین نہ سمجھ سکیں تو اس پر وعظ وتذکیر کے معنی ہرگز ہرگز صادق نہ آئیں گے اور اس صورت میں وہ چیز جو روحِ خطبہ ہے، بالضرور فوت ہوجائے گی اور وہ خطبہ مثل قالب بے جان کے ہو جائے گا، جس پر اطلاق خطبہ حقیقتاً ہرگز صحیح نہ ہو سکے گا۔

④ ائمہ مجتہدین مشہورین میں سے ایک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں، جن کا یہ مذہب ہے کہ خطبہ عربی زبان میں شرط نہیں ہے، بلکہ باوجود قدرت کے بھی خطبہ غیر عربی زبان میں، کوئی زبان ہو، جائز ہے۔ "رد المحتار" (ص: ۵۴۳) میں ہے:

"لم يقيد الخطبة بكونها عربية اكتفاء بما قدمه في باب صفة الصلاة من أنها غير شرط، ولو مع القدرة علىٰ العربية عنده" اھ

[انھوں نے یہ قید نہیں لگائی کہ خطبہ (جمعہ) عربی زبان ہی میں ہو۔ اس پر اکتفا کرتے ہوئے جو انھوں نے "باب صفة الصلاة" میں ذکر کیا ہے کہ خطبے کا عربی میں ہونا شرط نہیں ہے، اگرچہ وہ (خطیب) عربی

زبان میں خطبہ دینے کی قدرت رکھتا ہو]

⑤ "بدرو الأهلة" کی عبارت منقولہ استفتا سے استدلال اس امر پر کہ خطبے میں وعظ و تذکیر فارسی یا اُردو میں ممنوع ہے، صحیح نہیں، اس لیے کہ عبارت مذکورہ میں جو ایک نہایت ہی عام دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے قطع نظر کہ اس دعویٰ کا کیا ثبوت ہے اور ایسے عام دعوے کا احاطہ عملی کیونکر حاصل ہوا اور اس سے قطع نظر کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا منقولہ بالا فتوی اس دعوے کے عموم کا ناقض ہے، خود اسی عبارت منقولہ میں یہ بھی موجود ہے کہ "ہر چند دلیلے مانع از غیر ایں لسان مبین مباش" بھلا جب کوئی دلیل غیر عربی زبان میں خطبہ پڑھنے سے موجود نہ ہو تو غیر عربی زبان میں خطبہ پڑھنا ممنوع کیونکر ثابت ہوگا؟ کیونکہ ممنوعیت (یعنی حرمت یا کراہت) حکم شرعی ہے اور یہ جب حکم شرعی ہے اور اس کے حکم شرعی ہونے سے کسی طرح انکار نہیں ہوسکتا اور ہر حکم شرعی کے ثبوت کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل شرعی ضرور ہونی چاہیے تو اس ممنوعیت کے ثبوت کے لیے بھی کوئی دلیل شرعی کیوں ضروری نہ ہوگی اور جب کوئی دلیل موجود نہ ہو تو ممنوعیت کے ثبوت کی کیا صورت ہے؟

خطبے میں وعظ و تذکیر فارسی یا اردو میں ناجائز ہونے پر حدیث مذکور سے استدلال بوجوہ صحیح نہیں ہے:

اولاً: (اس امر کے تسلیم کے بعد کہ سلفی نے حدیث مذکور کو ان دو سندوں سے روایت کیا ہے) حدیث مذکور کی پہلی سند میں ایک راوی "عمر بن ہارون بلخی" ہے، جو ثقہ نہیں ہے۔ ائمہ حدیث نے اس پر متعدد وجوہ سے سخت جرحیں کی ہیں۔ عبدالرحمن بن مہدی اور امام احمد بن حنبل اور نسائی نے اس کو متروک الحدیث اور یحییٰ نے کذاب خبیث اور ابو داود نے غیر ثقہ اور علی اور دارقطنی نے نہایت ضعیف اور صالح جزرہ نے کذاب اور ابو علی نیشاپوری نے متروک کہا ہے اور ابن حبان نے یہ کہا ہے کہ وہ ثقات سے معضلات روایت کیا کرتا ہے۔

علامہ ذہبی "میزان الاعتدال" (۲/ ۲۴۵) میں فرماتے ہیں:

"قال ابن مهدي وأحمد والنسائي: متروك الحديث، وقال يحيىٰ: كذاب خبيث، وقال أبو داود: غير ثقة، وقال علي والدارقطني: ضعيف جدا، وقال صالح جزرة: كذاب، وقال أبو علي النيسابوري: متروك، وقال ابن حبان: يروي عن الثقات المعضلات"[1] اهـ

[ابن مہدی، احمد اور نسائی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ یحییٰ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ کذاب اور خبیث ہے۔ ابو داود رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ غیر ثقہ ہے۔ علی اور دارقطنی رحمہما اللہ نے کہا کہ وہ بہت زیادہ ضعیف ہے۔ صالح جزرہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ کذاب ہے۔ ابو علی نیسابوری رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ متروک ہے اور ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ ثقہ راویوں سے معضل روایات بیان کرتا ہے]

---

[1] اس حدیث کو امام حاکم نے "المستدرك" (٤/ ٨٧) میں بیان کیا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں: "عمر بن هارون كذبه ابن معين، وتركه الجماعة" حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وسنده واه" (فتح الباري: ٦/ ١٨٤) نیز دیکھیں: اللآلئ المصنوعة (٢/ ٢٣٨) تنزيه الشريعة (٢/ ٢٥٧) الفوائد المجموعة (ص: ٢٢) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٢٣)

ثانیاً: حدیث مذکور کی دوسری سند میں ایک راوی "محمد بن الحسن بن محمد المقرئ" ہے، جو حدیث کی روایت میں جھوٹ بھی بولا کرتا تھا۔

علامہ ذہبی "میزان الاعتدال" (۲/ ۳٦۷) میں فرماتے ہیں:

"محمد بن الحسن بن محمد بن زياد الموصلي ثم البغدادي، أبو بكر النقاش، المقرئ المفسر، قال طلحة بن محمد الشاهد: كان النقاش يكذب في الحديث، والغالب عليه القصص، وقال البرقاني: كل حديث النقاش منكر، وقال أبو القاسم اللالكائي: تفسير النقاش إشقاء الصدور ليس بشفاء الصدور"

[محمد بن الحسن بن محمد الموصلی ثم البغدادی ابوبکر النقاش المقری المفسر کے بارے میں طلحہ بن زیاد الشاہد نے کہا کہ نقاش حدیث میں جھوٹ بھی بولا کرتا تھا، اس کا غالب شغل قصہ گوئی تھا۔ برقانی رحمہ اللہ نے کہا کہ نقاش کی ہر حدیث منکر ہے۔ ابوالقاسم اللالکائی رحمہ اللہ نے کہا کہ نقاش کی تفسیر دلوں کی بدبختی کا باعث ہے نہ کہ ان کی شفا کا]

ثالثاً: حدیث مذکور کی دوسری سند میں ایک اور راوی "محمد بن خلیل بلخی" ہے، جو حدیثیں خود بنایا کرتا تھا۔ علامہ ذہبی "میزان الاعتدال" (۲/ ۳۷۵) میں فرماتے ہیں:

"محمد بن خليل الذهلي البلخي، قال ابن حبان: يضع الحديث"[1]

[محمد بن خلیل ذہلی بلخی کے بارے میں ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ خود حدیثیں بنایا کرتا تھا]

رابعاً: حدیث مذکور صحیح حدیث کی مخالف ہے۔ حدیث مذکور میں ہے: "فإنه يورث النفاق" یعنی فارسی بولی موروثِ نفاق ہوتی ہے اور صحیح بخاری میں سورۂ جمعہ کی تفسیر میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آیتِ کریمہ ﴿وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ [الجمعة: ۳] نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا کہ اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہوتا تو بھی اہلِ فارس میں سے کتنے لوگ اس کو ضرور پا لیتے۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ اگر فارسی بولی موروثِ نفاق ہوتی تو اہلِ فارس ایسی مدح کے مستحق نہ ہوتے۔

صحیح بخاری کی حدیث مذکور یہ ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: كنا جلوسا عند النبي صلی اللہ علیہ وسلم فأنزلت عليه سورة الجمعة: ﴿وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ قال: قلت: من هم يا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم؟! فلم يراجعه حتى سأل ثلاثا، وفينا سلمان الفارسي، وضع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يده على سلمان، ثم قال: «لو كان الإيمان عند الثريا لناله رجل أو رجال من هؤلاء» وفي رواية أخرى: «لناله رجال من هؤلاء»[2]

---

[1] اصل کتاب میں حدیث کی سند میں مذکور راوی کا نام "أحمد بن الخليل" ہے اور اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔

[2] صحيح البخاري، رقم (٤٦١٥) صحيح مسلم، رقم (٢٥٤٦)

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۃ الجمعہ نازل ہوئی (جس میں یہ آیت بھی تھی): ﴿وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ راوی کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ سلمان رضی اللہ عنہ کے کندھے پر رکھا اور فرمایا: ''اگر ایمان ثریا (کہکشاں) کے پاس بھی ہوتا تو پھر بھی ان لوگوں (اہلِ فارس) کا کوئی آدمی یا کتنے لوگ اس کو ضرور پا لیتے۔'' ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ان لوگوں (اہلِ فارس) میں سے کتنے لوگ اسے ضرور پا لیتے]

خامساً: امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک باب ہی اس لفظ سے منعقد فرمایا ہے:

''باب من تكلم بالفارسية والرطانة، وقوله تعالىٰ ﴿وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ﴾ وقال: ﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾[1] اهـ

اس کے بعد تین حدیثیں اس باب میں ذکر کی ہیں، جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض بعض اوقات دوسری دوسری زبانوں کے بعض بعض الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری (۳/۱۳۴ چھاپہ دہلی) میں اس مقام کی شرح میں فرماتے ہیں:

''أشار المصنف إلىٰ ضعف ما ورد من الأحاديث الواردة في كراهة الكلام بالفارسية كحديث: كلام أهل النار بالفارسية، وكحديث: من تكلم بالفارسية زادت في خبثه ونقصت من مروءته. أخرجه الحاكم في مستدركه، وسنده واه، وأخرج فيه أيضاً عن عمر رفعه: من أحسن العربية فلا يتكلمن بالفارسية، فإنه يورث النفاق. الحديث، وسنده واه أيضاً''

[فارسی زبان میں کلام کرنے کی کراہت اور ناپسندیدگی کے بارے میں وارد ہونے والی احادیث کے ضعف کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے، جیسے یہ حدیث: ''جہنمیوں کا (آپس میں) کلام فارسی زبان میں ہوگا'' اور یہ حدیث: ''جو شخص فارسی میں کلام کرے گا تو یہ (فارسی کلام) اس کی خباثت میں اضافہ اور اس کی مروءت میں کمی واقع کر دے گی۔'' اس کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے، جبکہ اس کی سند سخت ضعیف ہے، انھوں نے اس کے بارے میں عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ جس شخص کو اچھی عربی بولنی آتی ہو تو وہ فارسی میں کبھی کلام نہ کرے، کیوں کہ یہ مورثِ نفاق ہے...الحدیث. اس کی سند بھی سخت ضعیف ہے]

سادساً: حدیث مذکور کا مضمون صرف اس قدر ہے کہ جس کو اچھی عربی بولنی آتی ہو، اس کو فارسی یا اور کسی زبان میں

---

[1] صحيح البخاري (۳/ ۱۱۱۷)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۰۵، ۲۹۰٦، ۲۹۰۷)

بولنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ عربی کے سوا دوسری ساری بولیاں مورثِ نفاق ہوتی ہیں تو اگر بالفرض حدیث مذکور صالح احتجاج بھی ہو تو بھی اس سے اسی قدر ثابت ہوگا کہ جس کو اچھی عربی بولنی آتی ہو وہ دوسری کوئی بولی نہ بولے، نہ یہ کہ جو شخص عربی اصلاً بول ہی نہ سکتا ہو یا بول تو سکتا ہو، لیکن اچھی عربی نہ بول سکتا ہو، وہ بھی عربی کے سوا دوسری کوئی بولی نہ بولے اور ہر ذی عقل اتنا سمجھ سکتا ہے کہ اچھی عربی بولنے والے سے بھی اس حکم کی تعمیل جب ہی ہوسکتی ہے کہ اس کے مخاطبین، جن سے وہ عربی بولے، اس کی عربی بولی سمجھ بھی سکتے ہوں۔ ورنہ ان سے عربی بولنا محض عبث ہی نہیں، بلکہ سراسر بے عقلی ہے۔ ﴿ءَ اَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ﴾ [حم السجدة: ٤٤]

الغرض حدیث مذکور سے بفرضِ صحتِ احتجاج اسی قدر ثابت ہوگا کہ جب کوئی متکلم اچھی عربی بول سکتا ہو اور اس کے مخاطبین بھی اس کی عربی سمجھ سکتے ہوں تو اس کو عربی کے سوا اور کسی زبان میں بولنا ناجائز ہوگا، لیکن یہ امر متنازع فیہ نہیں ہے۔ متنازع فیہ امر یہ ہے کہ جب خطیب عربی بول ہی نہ سکتا ہو یا بول سکتا ہو، لیکن اچھی عربی نہ بول سکتا ہو یا اچھی عربی بھی بول سکتا ہو، لیکن اس کے سامعین اس کی عربی سمجھ نہ سکتے ہوں تو کیا ایسی حالت میں بھی اس کو عربی ہی میں خطبہ پڑھنا ضروری ہوگا اور دوسری کسی زبان میں جس کو سامعین سمجھ سکتے ہوں، خطبہ پڑھنا ممنوع اور ناجائز ہوگا؟ بس یہی امر متنازع فیہ ہے اور حدیث مذکور اس امر سے بالکل ساکت ہے۔

الحاصل حدیث مذکور سے (بفرض صلاحیتِ احتجاج) جس امر کی ممنوعیت اور ناجوازی ثابت ہوتی ہے، اس سے یہاں بحث نہیں ہے اور جس امر سے یہاں بحث ہے، حدیث مذکور سے اس کی ناجوازی ثابت نہیں ہوتی۔

کیا خطبہ جمعہ میں وعظ کرنا بدعت ہے؟

سوال ما قولكم أيها العلماء الكرام في أن الوعظ في الخطبة يوم الجمعة هل يجوز أم لا؟ وهل قول من قال: إن الوعظ في الخطبة يوم الجمعة بدعة محضة مخالف للسنة النبوية، وليس هو مما ذكر جوازه في كتب الفقه. صحيح أم لا؟

[علمائے کرام کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے کہ جمعے کے دن خطبے میں وعظ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا کسی شخص کا یہ کہنا کہ جمعے کے دن خطبے میں وعظ کرنا محض بدعت، سنت نبویہ کے مخالف اور فقہ کی کتابوں میں اس کے جواز کا کوئی ذکر نہیں ہے، درست ہے یا نہیں؟]

جواب الحمد لله وكفىٰ، وسلام على عباده الذين اصطفىٰ، أما بعد: فقد سألت- رحمك الله- عن الوعظ في الخطبة هل يجوز أم لا؟ وهل قول من قال: إن الوعظ في الخطبة يوم الجمعة بدعة محضة مخالف للسنة النبوية، وليس هو مما ذكر جوازه في كتب الفقه، صحيح أم لا؟

فاعلم أن الوعظ في الخطبة يوم الجمعة ليس ببدعة أصلا، بل هو جائز مشروع، ثابت بالسنة النبوية، فلنبين ما يدل على ذلك، ولنذكر أولا شيئا من الأحاديث

النبوية ونبذا من عبارات الكتب الفقهية.

أما الأحاديث فكثيرة منها: ما رواه البخاري عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه قال: جاء رجل، و النبي ﷺ يخطب الناس يوم الجمعة، فقال: «أصليت يا فلان؟» فقال: لا، قال: «قم، فاركع» وفي رواية عنه له: «قم فصل ركعتين»[1] انتهى.

وفي رواية عنه لمسلم قال: جاء سليك الغطفاني يوم الجمعة، ورسول الله ﷺ يخطب فجلس، فقال: «يا سليك قم فاركع ركعتين، وتجوز فيهما» ثم قال: «إذا جاء أحدكم يوم الجمعة والإمام يخطب فليركع ركعتين، وليتجوز فيهما»[2] انتهى

قال الحافظ في فتح الباري: في هذا الحديث من الفوائد أن للخطيب أن يأمر في خطبته وينهىٰ، ويبين الأحكام المحتاج إليها، ولا يقطع ذلك التوالي المشترط فيها، بل لقائل أن يقول: كل ذلك يعد من الخطبة.[3] انتهى

ومنها ما رواه مسلم عن جابر بن سمرة قال: كانت للنبي ﷺ خطبتان، يجلس بينهما، يقرأ القرآن ويذكر الناس.[4] انتهى

قال النووي رحمه الله: فيه دليل للشافعي في أنه يشترط في الخطبة الوعظ والقراءة قال الشافعي: لا يصح الخطبتان إلا بحمد الله تعالىٰ والصلاة على رسول الله ﷺ فيهما والوعظ.[5] انتهى

وقال الشوكاني في نيل الأوطار: استدل به على مشروعية القراءة والوعظ في الخطبة.[6]

ومنها ما رواه مسلم أيضاً عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه قال: كان رسول الله ﷺ إذا خطب احمرت عيناه، وعلا صوته، واشتد غضبه، حتىٰ كأنه منذر جيش، يقول: صبحكم ومساكم، ويقول: بعثت أنا والساعة كهاتين، ويقرب بين أصبعيه السبابة والوسطىٰ، ويقول: أما بعد فإن خير الحديث كتاب الله، وخير الهدي هدي محمد ﷺ وشر الأمور محدثاتها وكل بدعة ضلالة.[7]

وفي رواية عنه له: قال: كانت خطبة النبي ﷺ يوم الجمعه يحمد الله ويثني عليه بما هو أهله، ثم يقول: من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادي له، وخير الحديث كتاب الله...

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٥)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٥)
[3] فتح الباري (٦/ ١٦٤)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٢)
[5] شرح صحيح مسلم للنووي (٦/ ١٥٠)
[6] نيل الأوطار (٣/ ٣٢٧)
[7] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

ثم ساق الحديث بمثل الحديث الأول.[1]

ومنها ما رواه مسلم أيضاً عن أم هشام بنت حارثة بن النعمان قالت: ما أخذت ﴿ قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ إلا عن لسان رسول اللهﷺ يقرأها كل يوم الجمعة على المنبر إذا خطب الناس.[2]

قال النووي: قال العلماء: سبب اختيار ق أنها مشتملة على البعث والموت والمواعظ الشديدة والزواجر الأكيدة.[3] انتهى

ومنها ما رواه أبو داود عن جابر بن سمرةؓ عن النبيﷺ أنه كان لا يطيل الموعظة يوم الجمعة، إنما هن كلمات يسيرات.[4]

قال في نيل الأوطار: فيه أن الوعظ في الخطبة مشروع.[5] انتهى

وأما عبارات الكتب الفقهية فكثيرة أيضاً، منها عبارة فتاوىٰ قاضي خان: "قال بعضهم: ما دام الخطيب في حمد الله تعالىٰ، والثناء عليه، والوعظ للناس، فعليهم الاستماع والإنصات، فإذا أخذ في مدح الظلمة والثناء عليهم، فلا بأس بالكلام حينئذ"[6] انتهى

ومنها عبارة فتح القدير: "وعلى اشتراط نفس الخطبة إجماع، بخلاف ما قام الدليل على عدم اشتراطه، ككونها خطبتين، بينهما جلسة قدر ما يستقر كل عضو في موضعه، يحمد الله في الأولىٰ، ويتشهد ويصلي عليه، وعلىٰ آله الصلاة والسلام، ويعظ الناس... إلى أن قال: لأنه قام الدليل عند أبي حنيفةؒ على أنه من السنن أو الواجبات، لا شرط على ما سنذكره"[7] انتهى

ومنها عبارته أيضاً: "ومن الفقه والسنة تقصيرها (أي تقصير الخطبة) وتطويل الصلاة بعد اشتمالها على ما ذكرناه آنفا من الموعظة والتشهد والصلاة وكونها خطبتين"[8] انتهى

ومنها عبارة رد المحتار: "قوله: ويبدأ أي قبل الخطبة الأولىٰ، بالتعوذ سرا، ثم بحمد الله تعالىٰ والثناء عليه، والشهادتين والصلاة علىٰ النبيﷺ والعظة والتذكير والقراءة"[9] انتهى.

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٣)

[3] شرح صحيح مسلم (٦/ ١٦١)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٠٧)

[5] نيل الأوطار (٣/ ٣٢٧)

[6] فتاوىٰ قاضي خان (١/ ٨٩)

[7] فتح القدير (٢/ ٥٦)

[8] فتح القدير (٢/ ٥٧)

[9] رد المحتار (٢/ ١٤٩)

ومنها عبارة جامع الرموز شرح مختصر الوقاية... "فيبدأ بالتعوذ سرا، ثم يحمد الله، ثم يأتي بالشهادتين، ثم يصلي عليه صلى الله عليه وآله وسلم، ثم يعظ الناس ثم يقرأ"[1] انتهى

ومنها عبارة البرجندي شرح مختصر الوقاية: "ويخطب خطبتين يحمد في الأولىٰ ويتشهد، ويصلي علىٰ النبي ﷺ ويعظ الناس"

ومنها عبارة البرجندي أيضاً: "وفي شرح الطحاوي رحمه الله: السنة في الخطبة أن يحمد الله، ويثني عليه، ويعظ الناس، ويقرأ القرآن، ويصلي علىٰ النبي ﷺ"[2] انتهى

هذه كلها عبارات كتب الفقه للحنفية، ومنها عبارة زاد المعاد في هدي خير العباد للعلامة الحافظ ابن القيم الحنبلي في ذكر خصائص يوم الجمعة الثانية والعشرون: فيه أن الخطبة التي يقصد بها الثناء على الله، وتمجيده، والشهادة له بالوحدانية، ولرسوله ﷺ بالرسالة، وتذكير العباد بأيامه، وتحذيرهم من بأسه ونقمته، ووصيتهم بما يقربهم إليه، وإلىٰ جنانه، ونهيهم عما يقربهم من سخطه وناره، فهذا هو مقصود الخطبة والاجتماع لها.[3] انتهى

ومنها عبارة زاد المعاد أيضاً في فصل هديه ﷺ في خطبه: وكان يعلم أصحابه في خطبته قواعد الإسلام، وشرائعه، ويأمرهم وينهاهم في خطبته إذا عرض له أمر أو نهي، كما أمر الداخل، وهو يخطب أن يصلي ركعتين، ونهىٰ المتخطي رقاب الناس عن ذلك، وأمره بالجلوس، وكان يقطع خطبته للحاجة تعرض أو السؤال لأحد من أصحابه فيجيبه، ثم يعود إلىٰ خطبة فيتمها، وكان ربما نزل عن المنبر للحاجة، ثم يعود فيتمها، كما نزل لأخذ الحسن والحسين وأخذهما، ثم رقىٰ بهما المنبر، فأتم خطبته، وكان يدعو الرجل في خطبته: تعال اجلس يا فلان، صل فلان، وكان يأمرهم بمقتضىٰ الحال في خطبته، فإذا رأى منهم ذا فاقة وحاجة، أمرهم بالصدقة، ويحضهم عليها"[4] انتهى

ومنها عبارة الحافظ ابن حجر رحمه الله في فتح الباري التي مرت تحت الحديث الأول.

ومنها عبارتا الإمام النووي رحمه الله في شرح مسلم اللتان تقدمتا تحت الحديث الثاني والرابع، ومنها عبارتا الشوكاني رحمه الله في نيل الأوطار اللتان سبقتا تحت الحديث الثاني والخامس. والله تعالىٰ أعلم بالصواب.

---

[1] جامع الرموز (ص: ١٥)

[2] شرح مختصر الوقاية (١/ ١٠٢)

[3] زاد المعاد (١/ ٣٨٦)

[4] زاد المعاد (١/ ٤١١)

كتبه: محمد عبد الله. یہ جواب صحیح و درست ہے۔ عبدالغنی ۔عفا الله عنه۔ الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب۔ الجواب صحيح عندي، والله أعلم بالصواب. أبو محمد إبراهيم.

[الحمد لله وكفىٰ، وسلام على عباده الذين اصطفىٰ، أما بعد: تم نے، اللہ تم پر رحم فرمائے، یہ سوال کیا ہے کہ خطبہ جمعہ میں وعظ کہنا جائز ہے یا نہیں اور کیا کسی شخص کا یہ کہنا کہ جمعے کے دن خطبہ جمعہ میں وعظ کہنا بدعتِ محضہ ہے، سنتِ نبویہ کے مخالف ہے اور فقہ کی کتابوں میں اس کے جواز کا کوئی ذکر نہیں ہے، صحیح ہے یا نہیں؟ آگاہ رہو کہ جمعے کے دن خطبے میں وعظ کرنا بالکل بدعت نہیں ہے، بلکہ وہ جائز و مشروع ہے۔ سنتِ نبویہ کے واضح ثبوت کے ساتھ ثابت ہے اور کتبِ فقہ میں صراحتاً اس کا ذکر موجود ہے۔ لیجیے ہم کچھ احادیثِ نبویہ اور کتبِ فقہ کی چند عبارتیں بطورِ ثبوت کے پیش کیے دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں احادیث بہت زیادہ ہیں، جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

ایک حدیث تو وہ ہے، جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی آیا، درآنحالیکہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعے کے دن خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تم نے نماز پڑھی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اٹھو اور نماز پڑھو۔ جابر رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں یوں ہے جو امام بخاری نے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کہا کہ اٹھو اور دو رکعتیں ادا کرو۔

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے ایک روایت صحیح مسلم میں یوں مروی ہے، کہ سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ جمعے کے دن اس وقت تشریف لائے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، چناں چہ یہ بیٹھ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے سلیک! اٹھو اور دو رکعتیں پڑھو اور انھیں مختصر کرو۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص جمعے کے دن اس حال میں تشریف لائے کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ مختصر دو رکعتیں ادا کرے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں کہا ہے کہ اس حدیث میں چند فوائد ہیں۔ ایک یہ کہ خطیب کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے خطبے میں امر (بالمعروف) اور نہی (عن المنکر) کرے۔ دوسرا یہ کہ وہ ان احکام کو واضح کرے، جن کی ضرورت ہے اور یہ خطبے کے اس تسلسل کو منقطع نہیں کرتا، جو خطبے میں مشروع ہے، بلکہ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ خطبے ہی میں شمار ہوتا ہے۔

ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جو صحیح مسلم میں جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے دیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان بیٹھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل ہے کہ خطبے میں وعظ کہنا اور قراءت کرنا شرط ہے۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دونوں خطبے تب صحیح ہیں، جب ان میں اللہ تعالیٰ کی حمد

بیان کی جائے، رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھا جائے اور وعظ و نصیحت کیا جائے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں کہا ہے کہ مذکورہ حدیث سے خطبۂ جمعہ میں قراءتِ قرآن اور وعظ و نصیحت کی مشروعیت پر استدلال کیا گیا ہے۔

ایک حدیث وہ ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ ہی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور غصہ شدید ہو جاتا، حتی کہ یہ کیفیت ہو جاتی، گویا آپ ﷺ کسی حملہ آور لشکر سے آگاہ کرتے ہوئے فرما رہے ہوں: "وہ صبح یا شام تم پر حملہ آور ہونے والا ہے۔" نیز آپ ﷺ فرماتے: "مجھے (ایسے وقت میں) مبعوث کیا گیا ہے کہ میں اور قیامت اس طرح ہیں۔" آپ ﷺ درمیانی انگلی اور انگشتِ شہادت کو باہم ملاتے۔ آپ ﷺ فرماتے: "أما بعد" (حمد و ثنا اور صلاۃ و سلام کے بعد) سب سے بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ بدترین امور وہ ہیں جو نئے جاری کیے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

صحیح مسلم ہی میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے، کہ جمعے کے دن نبی کریم ﷺ کا خطبہ یوں ہوتا تھا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے لائق اور شایانِ شان اس کی حمد و ثنا بیان کرتے، پھر فرماتے: "جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ بہترین کلام اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔" پھر انھوں نے پہلی حدیث کی طرح حدیث کو بیان کیا ہے۔

ان میں سے ایک روایت صحیح مسلم ہی میں ہے، جو ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے سورت ق رسول اللہ ﷺ سے سن سن کر یاد کی، آپ ﷺ ہر جمعے کو جب منبر پر لوگوں سے خطاب فرماتے تو اسے پڑھا کرتے تھے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ خطبہ جمعہ میں سورت ق کی تلاوت کو اس لیے اختیار کیا گیا کہ یہ سورت موت، اس کے بعد اٹھائے جانے، مواعظِ شدیدہ اور زواجرا کیدہ پر مشتمل ہے۔

ایک حدیث وہ ہے، جسے امام ابو داود نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، وہ نبیِ کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ جمعے کے روز لمبا وعظ نہ فرمایا کرتے تھے، بلکہ چند مختصر سے کلمات ہوا کرتے تھے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں فرمایا ہے کہ اس (حدیث) سے ثابت ہوا کہ خطبۂ جمعہ میں وعظ کرنا مشروع ہے۔

رہی فقہی کتابوں کی عبارتیں تو وہ بھی بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک فتاویٰ قاضی خاں کی درجِ ذیل عبارت ہے:

''ان (فقہا) میں سے بعض کا قول ہے کہ جب تک خطیب اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتا رہے اور لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتا رہے تو ان (سامعین) پر واجب ہے کہ وہ خاموشی اختیار کریں اور توجہ سے سنیں۔ پھر جب وہ ظالم لوگوں کی مدح وثنا بیان کرنے لگے تو اس وقت ان کے کلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

ایک ''فتح القدير'' کی درجِ ذیل عبارت ہے:

''نفسِ خطبہ کے شرط ہونے پر اجماع ہے، برخلاف اس چیز کے جس کے عدمِ اشتراط پر دلیل قائم ہو، جیسے دو خطبے دینا، دونوں خطبوں کے درمیان اتنی دیر بیٹھنا کہ ہر عضو اپنی جگہ پر واپس پلٹ آئے۔ (خطیب) پہلے خطبے میں اللہ کی حمد بیان کرے گا، کلمہ شہادت (أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمدا رسول الله) پڑھے گا، آپ ﷺ پر درود پڑھے گا، آپ ﷺ کی آل کے لیے دعا کرے گا اور لوگوں کو وعظ کرے گا۔ پھر دوسرے خطبے میں ایسے ہی کرے گا، ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اس خطبے میں وعظ کے بجائے مومن مردوں اور عورتوں کے حق میں دعا کرے گا ..، کیوں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر دلیل قائم ہے کہ ایسا کام کرنا سنن یا واجبات میں سے ہے، شرط نہیں ہے، اس بنا پر جو عن قریب ہم ذکر کریں گے۔''

ان میں سے ''فتح القدير'' ہی کی ایک عبارت یہ بھی ہے:

''فقاہت اور سنت سے یہ ہے کہ خطبے کو چھوٹا کیا جائے اور نماز کو لمبا کیا جائے۔ خطبہ ان چیزوں پر مشتمل ہو، جن کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے اور وہ ہیں: وعظ کرنا، کلمہ شہادت پڑھنا، درود وسلام پڑھنا اور خطبے دینا۔''

ایک عبارت ''رد المحتار'' کی ہے:

''اس کا یہ قول کہ وہ ابتدا کرے، یعنی پہلے خطبے سے پہلے وہ سری طور پر تعوذ پڑھے، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے، شہادتین (أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمدا رسول الله) پڑھے، نبیِ مکرم ﷺ پر درود پڑھے، وعظ ونصیحت کرے اور (قرآنِ مجید کی) قراءت کرے۔''

''جامع الرموز شرح مختصر الوقاية'' کی درجِ ذیل عبارت ہے:

''پس وہ سری طور پر تعوذ پڑھنے کے ساتھ خطبے کا آغاز کرے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے، پھر شہادتین پڑھے، پھر آپ ﷺ پر درود پڑھے، پھر لوگوں کو وعظ کرے اور پھر قرآنِ مجید کی قراءت کرے۔''

ان میں سے ایک ''البرجندي شرح مختصر الوقاية'' کی درجِ ذیل عبارت ہے:

''وہ دو خطبے دے۔ پہلے خطبے میں اللہ کی حمد اور کلمۂ شہادت پڑھے، نبیِ مکرم ﷺ پر درود پڑھے اور لوگوں کو وعظ کرے۔''

''البرجندی'' ہی کی ایک عبارت درج ذیل ہے:

''شرح طحاوي میں ہے: خطبے میں سنت یہ ہے کہ (خطیب) اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرے، لوگوں کو وعظ کرے، قرآنِ مجید کی قراءت کرے اور نبیِ کریم ﷺ پر درود پڑھے۔''

مذکورہ بالا تمام عبارات فقہ حنفی کی کتب سے درج کی گئی ہیں۔

خطبہ جمعہ میں وعظ و نصیحت کرنے کے ثبوت میں ایک عبارت درج ذیل ہے، جو حافظ ابن القیم حنبلی رحمہ اللہ کی کتاب ''زاد المعاد في هدي خير العباد'' سے لی گئی ہے۔ جہاں پر اس کتاب میں جمعے کے دن کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے اکیسویں خصوصیت یہ ہے:

''خطبے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ثنا بیان کرنا، اس کی بزرگی بیان کرنا، اس کی وحدانیت کی گواہی دینا، اس کے رسول ﷺ کی رسالت کی گواہی دینا، اس کے بندوں کو اس کے ایام کے ساتھ نصیحت کرنا، ان کو اللہ تعالیٰ کی سزا اور عذاب سے ڈرانا، ان کو ایسی وصیت کرنا جو ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کی جنتوں کے قریب کر دے، ان کو ایسے عمل سے منع کرنا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور جہنم کی آگ کے قریب کر دے، چنانچہ یہی چیزیں خطبے کا مقصود ہیں اور اس پر اجماع ہے۔''

زاد المعاد ہی میں ایک عبارت درج ذیل ہے، چنانچہ خطبے کے مسنون طریقے کے بیان میں ہے:

''آپ ﷺ اپنے خطبے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قواعدِ اسلام اور شرائعِ اسلام کی تعلیم دیتے تھے۔ اپنے خطبے میں ان کو امر و نہی کرتے تھے، جب آپ ﷺ کے سامنے امر و نہی کا کوئی معاملہ پیش ہوتا، جیسے مسجد میں داخل ہونے والے صحابی کو آپ ﷺ نے دورانِ خطبہ میں حکم دیا کہ وہ دو رکعتیں ادا کرے۔ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنے والے کو اس کام سے منع کیا اور اسے وہیں بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ کسی حاجت کے پیشِ نظر یا اپنے اصحاب میں سے کسی کے سوال کرنے پر خطبے کو روک کر اس کا حل کرتے، سوال کا جواب دیتے، پھر دوبارہ خطبہ شروع کر کے اس کی تکمیل تک لے جاتے تھے۔ بعض اوقات آپ ﷺ کسی کام کے لیے منبر سے نیچے بھی اتر جاتے، پھر دوبارہ منبر پر چڑھ کر خطبہ مکمل فرماتے، جیسے ایک دفعہ آپ ﷺ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو پکڑنے کے لیے منبر سے اترے، ان دونوں کو اٹھایا اور انھیں لے کر منبر پر چڑھ گئے اور اپنا خطبہ مکمل کیا۔ آپ ﷺ اپنے خطبے میں کسی آدمی کو بلا لیتے اور فرماتے: اے فلاں! اِدھر آؤ۔ اے فلاں! بیٹھ جاؤ۔ اے فلاں! نماز ادا کرو۔ آپ ﷺ اپنے خطبے میں مقتضائے حال کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم فرماتے، چنانچہ جب آپ ﷺ کسی حاجت مند اور فاقہ زدہ آدمی کو دیکھ لیتے تو انھیں (اپنے اصحاب کو) صدقہ کرنے کا حکم دیتے اور انھیں اس پر برانگیخت کرتے۔''

ایک عبارت وہ ہے، جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتاب ''فتح الباري'' میں ہے اور وہ مذکورہ بالا احادیث میں سے پہلی حدیث کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ اور دو عبارتیں شرح صحیح مسلم للنووی رحمہ اللہ کی

دوسری اور چوتھی حدیث کے تحت ذکر ہو چکی ہیں۔ ان میں دو عبارتیں امام شوکانی رحمہ اللہ کی بھی ہیں، جو "نیل الأوطار" میں ہیں، چنانچہ وہ دوسری اور پانچویں حدیث کے ضمن میں گزر چکی ہیں، واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب]

نمازِ جمعہ کے بعد اردو میں وعظ کرنا:

سوال ہمارے ملک ہندوستان و پنجاب میں اکثر علما و محدثین وغیرہم کا یہ طریقہ ہے کہ بعد ادائے صلاۃ الجمعہ لوگوں کو مسجد میں بٹھا کر وعظ عام کرتے ہیں اور تا عصر اِتمامِ وعظ کر کے صلاۃ العصر ادا کرتے ہیں۔ جو شخص اِس وعظ میں شامل نہ ہو اور بعد ادائے صلاۃ الجمعہ چلا جائے تو اس کو زجر کرتے ہیں اور استماعِ وعظ پر اصرار فرماتے ہیں۔ کیا یہ طریقِ زمان میمنت توامان آنحضرت ﷺ میں یا زمانِ صحابہ رضی اللہ عنہم یا خیر القرون میں پایا گیا ہے یا نہیں؟ احادیثِ نبویہ سے تو اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ صرف خطبے میں تذکیرِ عام فرماتے تھے نہ کہ بعد ادائے صلاۃ الجمعہ اور خلفاے اربعہ سے بھی وعظ بعد صلاۃ الجمعہ ثابت نہیں ہو سکا اور صراحتاً نصِ قرآن مجید و فرقانِ حمید بھی اس طریق کے برخلاف حکم فرمایا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے: ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [الجمعة: ١٠]

عند وجودِ شرط جزا کا وجود واجب ہے، خاص کر ﴿فَانْتَشِرُوْا﴾ بصیغۂ امر مستلزمِ وجوب ہے، جیسا کہ ﴿اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ میں ﴿فَاسْعَوْا﴾ مثبتِ امر وجوب ہے۔ اسی طرح آیتِ وضو: ﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ﴾ میں ﴿فَاغْسِلُوْا﴾ حکم وجوبی ہے۔ اسی طرح کے نظائر اور بھی ہزارہا ہیں۔ پس بعد تعمقِ نظر فی الکتاب والسنۃ وعظ بعد صلاۃ الجمعہ بدعت معلوم ہوتا ہے، بلکہ بمقتضائے نصِ صریح واجب الترک ہے۔ حضرات محققین اپنے اپنے عندیہ سے جلد مسرور فرمائیں۔ ابو الحاج (ع۔ق ہمایونی)

ہفت روزہ "اہلِ حدیث" امرتسر (١٦/ جنوری، ٢٦/ اپریل ١٩١٢ء)

جواب اس مسئلے میں جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ میں قرآن مجید پڑھتے اور تذکیر فرماتے، یعنی وعظ کہتے۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے: "كانت للنبي ﷺ خطبتان يجلس بينهما، يقرأ القرآن ويذكر الناس"[1] الحديث.

میری نظر سے یہ کہیں نہیں گزرا کہ رسول اللہ ﷺ نمازِ جمعہ کے بعد وعظ کہتے اور لوگوں کو اس کے لیے ٹھہراتے تھے۔ صیغۂ امر آیتِ کریمہ ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا﴾ [الجمعة: ١٠] میں ویسا ہی ہے، جیسا کہ آیت کریمہ ﴿وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ [المائدة: ٢] میں ہے، یعنی اباحت کے لیے، وجوب کے لیے نہیں ہے۔ پس بعد نمازِ جمعہ ہر شخص کو مباح ہے کہ چلا جائے یا ٹھہرا رہے، نہ جانا ہی واجب نہ ٹھہر جانا ہی واجب اور نہ کوئی ان میں سے ممنوع۔ وعظ و تذکیر بعد نمازِ جمعہ کا وہی حکم ہے، جو اور وقتوں کا ہے تو جس طرح اور وقتوں میں وعظ و تذکیر جائز ہے، اسی طرح

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٢)

بعد نمازِ جمعہ بھی جائز ہے تو اگر کوئی شخص بعد نمازِ جمعہ محض جواز کے خیال سے وعظ کہے اور دوسرے لوگ وعظ سننے کے لیے ٹھہر جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن جو شخص اس وعظ میں شامل نہ ہو اور بعد نمازِ جمعہ چلا جائے، اس کو زجر کرنا البتہ بے وجہ اور ناجائز ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبداللہ، از دھلی

خطبہ میں وعظ اور شعر خوانی کا حکم:

سوال ① جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں وعظ کہنا درست ہے یا نہیں؟

② قبل جلسہ کے وعظ کہنا چاہیے یا بعد جلسہ کے؟

③ خطبہ میں شعر خوانی درست ہے یا نہ؟

جواب ① جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں وعظ کہنا درست ہے۔

② قبل جلسہ کرنے کے وعظ کہنا چاہیے۔

③ خطبہ میں شعر خوانی ثابت نہیں ہے۔

مسجد قدیم کو چھوڑ کر نو تعمیر شدہ مسجد میں جمعہ ادا کرنا:

سوال موضع پیپل چوڑیہ میں ایک مسجد ہے، جس میں نمازِ جمعہ برابر پڑھی جاتی ہے اور دیگر دیگر مواضع کے لوگ سب جو آس پاس میں ہیں، سب اسی مسجد مذکور میں برابر ہمیشہ سے پڑھ رہے ہیں اور سب مواضعات کے لوگ ایک ہی جماعت کے لوگ ہیں۔ آج عرصہ چھ یا سات ماہ سے ایک مسجد موضع ہرن کول، جو موضع پیپل چوڑیہ سے چار پانچ رسی کے فاصلے پر ہے، پنج وقتہ نماز کے لیے تعمیر ہوئی تھی، اب چار جمعہ سے اس بستی کے لوگوں نے وہیں نمازِ جمعہ پڑھنا شروع کیا ہے اور وہ تقریباً ۱۵ یا ۱۶ ہوں گے۔ اس حالت میں نمازِ جمعہ ان لوگوں کی اس بستی میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب ایسی حالت میں موضع ہرن کول کے لوگوں کو چاہیے کہ موضع پیپل چوڑیہ کی سابق جامع مسجد میں حسبِ دستورِ سابق نمازِ جمعہ ادا کریں اور تفریقِ جماعت نہ کریں۔ تفریقِ جماعت جائز نہیں ہے:

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران، پارہ ٤] واللّٰہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبداللہ (٦/ رمضان المبارك ١٣٢٦ھ)

سوال ایک جامع مسجد میں زمانہ قدیم سے تین گاؤں کے لوگ نمازِ جمعہ ادا کیا کرتے تھے۔ فی الحال واقعہ یوں ہے کہ جو گاؤں جامع مسجد سے تخمیناً ربع میل کے فاصلے پر واقع ہے، وہاں کے لوگ اپنی پنج وقتہ مسجد میں اقامتِ جمعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس وقتیہ مسجد میں جمعہ پڑھیں یا نہیں؟ بینوا تؤجروا.

جواب جس جامع مسجد میں زمانہ قدیم سے تینوں گاؤں کے لوگ نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے، اسی جامع مسجد میں اب بھی نمازِ جمعہ ادا کیا کریں اور بلا وجہ قوی تفریقِ جماعت نہ کریں۔ تفریقِ جماعتِ مومنین سخت گناہ ہے، یہاں تک کہ

اگر کوئی شخص اس تفریق کی نیت سے مسجد بنائے تو وہ مسجد شرعاً مسجد نہیں قرار پاتی۔ قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [سورة توبه، پاره ١١]

واللّٰه تعالىٰ أعلم — كتبه: محمد عبدالله (١٠/ ربيع الآخر ١٣٣١هـ)

خطبہ ونمازِ جمعہ کی امامت اور منظوم خطبہ پڑھنا:

سوال ایک شخص خطبہ پڑھے اور دوسرا شخص نماز پڑھائے تو ایسی صورت میں نماز درست ہوتی ہے یا نہیں اور خطبہ منظوم پڑھنا چاہیے یا نہیں؟

جواب اس بات کا شرط ہونا کہ جو خطبہ پڑھے وہی نماز پڑھاوے، ثابت نہیں ہے اور منظوم خطبہ پڑھنا بھی ثابت نہیں۔ واللّٰه أعلم.

کیا آگ لگنے کی صورت میں بدستور خطبہ ونماز جمعہ پڑھتے رہنا چاہیے؟

سوال جمعہ کے روز خطبہ کی حالت میں یہ معلوم ہو کہ بستی میں آگ لگ گئی، ایسی حالت میں خطبہ ونماز اختصار کے ساتھ ادا کر کے جانا چاہیے یا پہلے آگ بجھانے کے لیے جانا چاہیے؟

جواب ایسی ضرورت کی حالت میں پہلے آگ بجھانے کے لیے جانا چاہیے، اس لیے کہ آگ سانپ اور بچھو سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور جب سانپ اور بچھو کو عین حالتِ نماز میں مارنے کا حکم ہے تو خطبے کی حالت میں آگ بجھانے کے لیے بطریق اولیٰ جانا چاہیے۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «اقتلوا الأسودين في الصلاة، الحية والعقرب»[1] والله تعالىٰ أعلم (رواه أحمد و أبو داود والترمذي والنسائي معناه، مشكوة، ص: ٨٤)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نماز میں دو سیاہ جانوروں، یعنی بچھو اور سانپ کو قتل کر دو]

كتبه: محمد عبد الله (٧/ ذوالقعده ١٣٢٩هـ)

عیدین کے مسائل

نئی عید گاہ بنانے کا حکم:

سوال جدید عید گاہ بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی ہے تو اس کے بنانے والوں کے لیے کیا حکم ہے؟ ایک صاحب نے یہ کہا ہے کہ جدید عید گاہ شرعاً جائز ہے۔ اس کی رائے موافق کتاب وسنت ہے یا نہیں؟

جواب نہ یہ جدید عیدگاہ شرعاً جائز ہے نہ اس کے جواز کی رائے موافق کتاب وسنت ہے، اس لیے کہ عید گاہ میں

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٣٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٤٥)

مسلمانوں کا اجتماع شرعاً ایک امرضروری قرار پا چکا ہے، تاکہ مسلمانوں کی شوکت و کثرت ظاہر ہو، اس لیے حکم ہے کہ عید گاہ میں کل مسلمان، مرد ہوں یا عورت، حاضر ہوں، حتی کہ پردہ نشین اور حیض والی عورتیں بھی حاضر ہوں، گو حیض والی عورتیں نماز میں شامل نہ ہوں، مگر حاضر ضرور ہوں۔ الغرض عید گاہ میں عامہ مسلمین کا اجتماع شرعاً ایک امرضروری قرار پا چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ سعادت میں کل مسلمان ایک ہی عید گاہ میں حاضر ہوا کرتے تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں کے لڑکے بھی حاضر ہوا کرتے تھے اور تفریق (یعنی دو عید گاہ ہونے) کی صورت میں یہ امرضروری (مسلمانوں کا اجتماع) فوت ہوجاتا ہے، لہٰذا نہ یہ جدید عیدگاہ شرعاً جائز ہے نہ اس کے جواز کی رائے موافق کتاب وسنت ہے۔ ترمذی (۱/۹۲ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

عن أبي هريرة أن النبيﷺ قال: «الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون، والأضحىٰ يوم تضحون»[1] قال أبو عيسىٰ: هذا حديث حسن غريب، وفسر بعض أهل العلم هذا الحديث فقال: إنما معنىٰ هذا أن الصوم والفطر مع الجماعة وعظم الناس. اهـ

[سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''روزہ اس دن ہے جس دن تم (رمضان کا چاند دیکھ کر تمام لوگ) روزہ رکھتے ہو، عید الفطر اس دن ہے، جس دن تم (رمضان مکمل کر کے) روزہ چھوڑتے ہو اور عید الاضحیٰ اس دن ہے، جس دن تم قربانی کرتے ہو۔'' امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ روزہ رکھنے اور روزہ چھوڑنے کا عمل جماعت اور لوگوں کی بھاری اکثریت کے ساتھ مل کر ہونا چاہیے]

"حجة الله البالغة" (ص: ۲۲۲ مطبوعہ بریلی) میں ہے:

"وضم معه مقصدا آخر من مقاصد الشريعة، وهو أن كل ملة لا بد لها من عرصة يجتمع فيها أهلها، لتظهر شوكتهم، وتعلم كثرتهم، ولذلك استحب خروج الجميع حتى الصبيان والنساء ذوات الخدور، والحيض، ويعتزلن المصلىٰ، ويشهدن دعوة المسلمين" اهـ والله تعالىٰ بالصواب

[اس کے ساتھ شارع نے من جملہ مقاصدِ شرعیہ کے ایک اور مقصد کو بھی شامل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ملت کے لیے ایک دن ایسا ضرور ہونا چاہیے، جس میں اس ملت کے لوگ اپنے اظہارِ شوکت اور مجمع کی کثرت ظاہر کرنے کی غرض سے باہر نکل کر جمع ہوں۔ لہٰذا عید کے لیے سب کا جانا مستحب ہے۔ حتی کہ بچوں، عورتوں، پردہ نشین اور حائضہ عورتوں کا نکلنا بھی مستحب بنایا گیا ہے، لیکن حائضہ عورتیں عید گاہ سے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۸۹۷)

علاحدہ ہو کر ایک طرف بیٹھ جائیں اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہو جائیں]

كتبه: محمد عبدالله (٨/ رمضان المبارك ١٣٢٦هـ). الجواب صحيح. كتبه: أبو يوسف محمد عبدالمنان الغازيفوري.

ضد اور اختلاف کی بنا پر نئی عیدگاہ بنانے کا حکم:

سوال ایک عیدگاہ بمشورہ چند مواضع اہلِ حدیث و احناف کے بنائی گئی اور احناف نے وعدہ واثق کیا کہ ہم لوگ اسی مسجد میں عیدین کی نماز ادا کریں گے۔ جب عیدگاہ طیار ہوئی تو احناف نے نماز پڑھنے سے انکار کیا کہ ہم لوگوں کی نماز اہلِ حدیث کے پیچھے نہیں ہوگی تو اہلِ حدیث نے جواب دیا کہ ہمارے پیچھے نماز نہیں ہوگی تو آپ اپنے گروہ سے جس شخص کو امام قرار دیجیے، اس کے پیچھے ہم لوگ بھی نماز پڑھیں گے۔

الغرض صاحبان احناف نے انکار کیا اور اس کی ضد سے ایک عیدگاہ اپنی بستی سے باہر نکل کر آدھ میل کے فاصلے پر پہلی عیدگاہ سے بنانا شروع کیا، تو ایک عیدگاہ کے مقابلے میں دوسری عیدگاہ ضد سے بنانا جائز ہے یا نہیں اور جو شخص وعدہ کر کے اپنے اقرار سے لوٹ جائے تو اس کے حق میں شارع نے کیا حکم کیا ہے اور اہلِ حدیث کے پیچھے مقلدوں کی نماز ہوگی یا نہیں؟

جواب جو مسجد بلا عذر شرعی ضد اور نفسانیت سے طیار کرائی جائے تو ایسی مسجد کا بنانا جائز نہیں، بلکہ مفسرین نے اس کو مسجد ضرار میں داخل کیا ہے۔ تفسیر مدارک و کشاف وغیرہ میں ہے:

"قيل: كل مسجد بني مباهاة أو رياء أو سمعة أو لغرض سوى ابتغاء وجه الله فهو لاحق بمسجد الضرار" انتهى (نقلا عن فتاویٰ المولوي عبد الحی: ١/ ١٥٦)[1]

[کہا گیا ہے کہ ہر وہ مسجد جو فخر کرنے یا ریا کاری یا سنانے یا رضاے الٰہی کے سوا کسی دوسری غرض کے لیے بنائی جائے تو وہ مسجد ضرار کے حکم میں ہے]

وعدہ خلافی کو آنحضرت ﷺ نے علامتِ نفاق فرمایا ہے۔ مشکوۃ شریف (ص: ١٧) میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا اؤتمن خان»[2]

[منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وہ وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اسے امانت سونپی جائے تو خیانت کرے]

---

[1] الكشاف للزمخشري (٢/ ٣٠١) مدارك التنزيل للنسفي (٢/ ٢٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩)

ہر مسلمان کی نماز ہر مسلمان کے پیچھے بلاشبہہ جائز ہے، اس میں کسی کی خصوصیت نہیں ہے اور عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ واللہ أعلم.

حررہ راجي رحمة اللہ: أبو الھدی محمد سلامت اللہ، عفي عنه الجواب صحیح. کتبه: محمد عبد اللہ.

واضح ہو کہ یہ سوال متضمن تین امر کو ہے۔ پہلے امر کی نسبت یہ گزارش ہے کہ بلاوجہ شرعی جو لوگ باہمی ضد و شقاق کی وجہ سے دوسری مسجد (عیدگاہ) بنانا چاہیں اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالیں، وہ لوگ سورت توبہ کی آیت: ﴿وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ کُفْرًا وَّ تَفْرِیْقًاۢ بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ کو پیشِ نظر رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس آیت کے مصداق ہو جائیں اور وہ مسجد حکم میں مسجد ضرار کے ہو جائے، جس کی شان میں ﴿لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا﴾ وارد ہے۔ دوسرے امر کی نسبت گزارش ہے کہ تعمیلِ معاہدہ و ایفائے وعدہ واجب ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ [المائدۃ:۱]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! عہد پورے کرو]

وقال أیضاً: ﴿وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا﴾ [الإسراء:۳٤]

[اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کا سوال ہوگا]

پس جو شخص اس حکم کی مخالفت کرے، اس میں ایک شمہ نفاق کا ہے، جس سے بچنا واجب و لازم ہے۔

تیسرے امر کے جواب میں یہ گزارش ہے کہ اہلِ حدیث سچے اور خاصے مسلمان ہیں۔ ان کے پیچھے نماز جائز ہونے میں کیا کلام ہے؟ نماز تو ہر مسلمان کے پیچھے جائز و درست ہے، چہ جائیکہ ایسے لوگ؟ لقوله علیه السلام: «الصلاة واجبة علیکم، خلف کل مسلم، برا کان أو فاجرا» (أبو داود، کذا في المنتقی)[1]

[نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: نماز تم پر واجب ہے، ہر مسلمان کے پیچھے، خواہ وہ نیک ہو یا فاجر]

شرح عقائد نسفی (جس میں اہلِ سنت و جماعت کے عقائد کا بیان ہے)[2] میں ہے:

«صلوا خلف کل بر وفاجر»[3] [ہر نیک اور برے شخص کے پیچھے نماز پڑھو]

اس کے حاشیہ میں ہے: "خلافا للشیعة" یعنی ہر ایک نیک و بد مسلمان کے پیچھے نماز پڑھو، بخلاف رافضیوں کے کہ وہ برے شخص کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، بلکہ امام کا مجتہد یا معصوم ہونا شرط بتاتے ہیں، پس اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ سنت کے یہاں یہ قید نہیں ہے۔ واللہ أعلم. کتبه: أبو الفیاض محمد عبدالقادر، عفي عنه.

---

① یہ حدیث ضعیف ہے، اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

② شرح عقائد نسفی میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کے عقائد کا بیان ہے، لیکن غلط فہمی کی بنا پر عموماً اس کتاب میں مندرجہ تمام عقائد کو اہلِ سنت کے عقائد سمجھ لیا جاتا ہے۔ فلیتنبه!

③ شرح العقائد النسفیة (ص:۱٦٠)

سوال جماعت کے لوگ مع امام و سردارانِ جماعت آپس میں اتفاق کے ساتھ ایک عید گاہ مقرر کر کے بہت روز سے نمازِ عیدین بجماعت ادا کرتے رہے۔ اسی اثناء میں عید گاہ کے متصل رہنے والے، یعنی متولی اور جو جو شخص عید گاہ کی نگرانی و حفاظت برابر کرتے تھے، ان سے کوئی افعال شنیعہ سرزد ہوا، اس لیے عام مسلمانوں کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا کہ جس کے ساتھ شرعاً سلام و مصافحہ وغیرہ برتاؤ اسلام میں جائز نہیں، اگر وہاں ہم لوگ نمازِ عیدین پڑھنے کے لیے جائیں گے، اگر خاطراً اس کے ساتھ سلام وغیرہ کریں گے تو خداوند کریم کے نزدیک گنہگار ہوں گے، ورنہ خدانخواستہ کوئی فساد پیدا ہونے کی امید ہے۔ اس لیے ان لوگوں نے مع اپنے امام و سرداران سب کے مشورہ و اتفاق کے ساتھ دوسری جگہ پسند کر کے دین کی رونق و ترقی کے واسطے عیدگاہ مقرر کر کے نماز ادا کی ہے۔ آیا یہ ازروئے شرع شریف جائز ہے یا نہیں؟

جواب نمازِ عیدین میں تفریقِ جماعت نہ کریں، بلکہ سب لوگ ایک ساتھ مل کر پڑھیں۔ تفریقِ جماعت کی وجہ جو مندرجہ سوال ہے، وہ تفریقِ جماعت کی علت نہیں ہوسکتی۔ تفریقِ جماعت میں دین کی کونسی رونق و ترقی ہوسکتی ہے؟ ہاں جن لوگوں سے سلام و مصافحہ وغیرہ فی الواقع شرعاً ناجائز ہوں، ان سے سلام و مصافحہ وغیرہ ترک کر دیں، تاکہ اس سے ان لوگوں کو تنبیہ ہو۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ قال: «الصوم يوم تصومون، والفطر يوم تفطرون، والأضحى يوم تضحون»[1]

فسر بعض أهل العلم هذا الحديث فقال: "إنما معنى هذا الحديث أن الصوم والفطر مع الجماعة وعظم الناس" (ترمذي: ١/ ٨٨) والله تعالىٰ أعلم

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روزہ اس دن ہے جب تم روزہ رکھتے ہو، عید الفطر اس دن ہے، جس دن تم (رمضان مکمل کر کے) روزہ چھوڑتے ہو اور عید الاضحیٰ اس دن ہے، جس دن تم قربانی کرتے ہو۔ بعض اہلِ علم نے اس حدیث کا مفہوم یوں بیان کیا ہے: کہ روزہ رکھنا اور روزہ چھوڑنا جماعت کے ساتھ اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ ہونا چاہیے]

کتبہ: محمد عبد اللہ (١٨/ محرم ١٣٢٧ھ)

عیدین کی نماز کہاں افضل ہے؟

سوال عیدین کی نماز صحرا میں افضل ہے یا مسجد میں اور صحرا کی افضلیت صراحتاً بھی کسی حدیث میں آئی ہے یا نہیں اور صحرا کے کیا معنی ہے؟ بینوا تؤجروا!

جواب اس مسئلے میں کہ نمازِ عیدین مسجد میں افضل ہے یا صحرا میں؟ علماء کا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ مسجد میں افضل ہے۔ اگر مسجد میں گنجایش نہ ہو، تب صحرا میں پڑھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ بعض علما فرماتے ہیں کہ

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦٠)

صحرا ہی میں افضل ہے، اگرچہ مسجد میں گنجایش ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ فتح الباری (۱/ ۵۲۱ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

"قال الشافعي: فلو عمر بلد، وكان مسجد أهله يسعهم في الأعياد، لم أر أن يخرجوا منه، فإن كان لا يسعهم كرهت الصلاة فيه، ولا إعادة"

[امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر کوئی شہر آباد کیا جائے، اس شہر کے باسیوں کی مسجد عید کے لیے ان کو کافی ہوتو میں نہیں سمجھتا کہ وہ (عید پڑھنے کے لیے) اس مسجد سے باہر نکلیں۔ اگر اس مسجد میں ان کی عیدیں پڑھنے کی گنجایش نہ ہوتو پھر اس میں نمازِ عید پڑھنا مکروہ ہے، البتہ (اگر وہ پڑھ لیں تو) ان پر نماز کا اعادہ واجب نہ ہوگا]

فتاویٰ عالمگیری (۱/ ۲۱۰ مطبوعہ کلکتہ) میں ہے:

"الخروج إلى الجبانة في صلاة العيد سنة، وإن كان يسعهم المسجد الجامع، على هذا عامة المشائخ، وهو الصحيح، هكذا في المضمرات"

[نمازِ عید کے لیے صحرا کی طرف نکلنا سنت ہے، اگرچہ مسجد جامع میں ان کے نماز پڑھنے کی گنجایش موجود ہو۔ عام مشائخ کا یہی موقف ہے اور یہی موقف درست ہے]

حضرت رسول اللہ ﷺ کا مختلف مقامات میں نمازِ عیدین ادا کرنا پایا جاتا ہے۔ کبھی دار الشفا میں، کبھی محلہ دوس میں ابن ابی الجنوب کے مکان کے پاس اور کبھی حکیم بن عدا کے مکان کے صحن میں اور کبھی عبداللہ بن دُرّہ مزنی کے مکان کے پاس معاویہ اور کثیر بن صلت کے مکانوں کے درمیان میں اور کبھی حناطین کے پاس اور کبھی محمد بن عبداللہ بن کثیر کے فرودگاہ کے اندر اور سب سے آخر مصلیٰ میں جہاں آخر تک پڑھی۔ صحیحین میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"كان النبي ﷺ يخرج يوم الفطر والأضحى إلى المصلى"[1] (الحديث)

[نبی مکرم ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن (نمازِ عید کے لیے) عید گاہ کی طرف نکلتے تھے]

یعنی نبی ﷺ عیدین میں مصلیٰ کو تشریف لے جاتے۔ مصلیٰ کا حال آگے معلوم ہوگا۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔

خلاصۃ الوفاء مولفہ علامہ سمہودی مدنی رحمہ اللہ (ص: ۱۸۷ مطبوعہ مصر) میں ہے:

"ولابن شبة وابن زبالة عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: أول فطر وأضحى صلى فيه رسول الله ﷺ للناس بالمدينة بفناء دار حكيم بن العداء عند أصحاب المحامل"[2]

یعنی ابن شبہ اور ابن زبالہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ اول نمازِ عیدین جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٩)

[2] دیکھیں: أخبار المدينة لابن شبة النميري (١/ ١٣٤)

طیبہ میں پڑھائی، حکیم بن عدا کے مکان کے فنا میں پڑھائی، جہاں محمل والے رہتے تھے۔

اور فنائے مکان اس کشادہ جگہ کا نام ہے، جو مکان کے سامنے ہوتی ہے۔ قاموس میں ہے: "فناء الدار ككساء ما اتسع من أمامها"[1] [فناء کساء کی طرح ہے، فنائے مکان اس کشادہ جگہ کو کہتے ہیں، جو مکان کے سامنے ہوتی ہے] "منتهى الأرب" میں ہے: "فناء الدار" یعنی پیش گاہ فراخ سرائے۔ اس کے بعد "خلاصة الوفاء" میں ہے:

"في رواية للثاني: صلىٰ في ذلك المسجد، وهو خلف المجزرة التي بفناء دار العداء بن خالد" اهـ

یعنی ابن زبالہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مسجد میں نمازِ عید پڑھی جو اس مجزرہ کی پشت پر ہے، جو عداء بن خالد کے مکان کے فنا میں ہے۔

علامہ سمہودی فرماتے ہیں کہ عداء بن خالد کا مکان جو اوپر والی روایت میں مذکور ہوا، ایک ہی مقام ہے۔ حکیم بن عداء، عداء بن خالد کے بیٹے ہیں اور یہ مکان مصلی کے غربی جانب میں ہے۔ علامہ سمہودی کی عبارت یہ ہے:

"قلت: وهي دار ابنة حكيم بن العداء بن بكر بن هوازن، ومنزلهم مع مزينة غربي المصلىٰ" اهـ

[میں کہتا ہوں کہ وہ حکیم بن عداء بن بکر بن ہوازن کی بیٹی کا گھر ہے، ان کا یہ مکان مزینہ کے ساتھ عیدگاہ کی مغربی جانب میں ہے]

"مجزرة" اونٹوں کے مذبح کو کہتے ہیں۔ صراح اور منتہی الارب میں ہے: "مجزر جائے شترکشتن" [مجزرہ اونٹوں کے مذبح کو کہتے ہیں]

اس کے بعد علامہ سمہودی فرماتے ہیں کہ یہ مسجد جس میں رسول اللہ ﷺ نے عید کی یہ نماز پڑھی تھی، شاید وہی بڑی مسجد ہے، جو مسجدِ علی رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہے اور شاید یہ مسجد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اس وجہ سے منسوب ہے کہ انھوں نے بھی عید کی نماز اس مسجد میں اس وقت میں پڑھائی، جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محصور تھے، جیسا کہ ابن شبّہ نے روایت کی ہے۔ اس کے بعد علامہ سمہودی فرماتے ہیں کہ یہ امر مستبعد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک نئی جگہ نماز کی ایجاد کریں، جہاں رسول اللہ ﷺ نے نہ پڑھی ہو۔ علامہ سمہودی کی عبارت یہ ہے:

"فلعله المسجد الكبير المعروف بمسجد علي رضی اللہ عنہ شامي المصلىٰ مما يلي المغرب متصلًا بشامي الحديقة المعروفة بالعريضي، لأن سوق المدينة كان هناك، ولعل نسبته إلىٰ علي رضی اللہ عنہ لكونه صلىٰ به العيد الذي صلاه للناس، و عثمان رضی اللہ عنہ

[1] القاموس المحيط (ص: ١٠٧٤)

محصور، كما رواه ابن شبة، ويبعد أن يبتكر علي رضي الله عنه الصلاة بموضع لم يصل فيه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم"[1] اھ

[شاید یہ وہی بڑی مسجد ہے، جو مسجد علی شامی مصلی کے نام سے معروف ہے، جو مغرب کی جانب جو عریضی باغ کے نام سے مشہور ہے، کیوں کہ مدینے کا بازار وہیں پر تھا۔ شاید اس مسجد کا نام "مسجد علی" اس وجہ سے ہے کہ اس میں علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت لوگوں کو نمازِ عید پڑھائی، جب عثمان رضی اللہ عنہ (اپنے گھر میں) محصور تھے، جیسا کہ ابن شبہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن یہ بات بعید ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کسی ایسی جگہ نماز (عید) پڑھانے کا آغاز کریں، جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نہ پڑھائی ہو]

"خلاصة الوفاء" (ص: ۱۸۸) میں ہے کہ ابن زبالہ نے بسند خود روایت کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اول نماز عید حارۃ الدوس (یعنی دوس کے محلے) میں پڑھی، جو ابن ابی الجنوب کے مکان کے پاس ہے۔ پھر دوسری بار حکیم کے مکان کے فنا میں پڑھی (جس کا ذکر اوپر ہوا) پھر تیسری بار عبداللہ بن دُرہ مزنی کے مکان کے پاس پڑھی، جو معاویہ اور کثیر بن صلت کے مکانوں کے درمیان میں ہے۔ چوتھی بار ان پتھروں کے پاس پڑھی، جو حناطین کے پاس ہیں۔

علامہ سمہودی فرماتے ہیں کہ شاید یہ وہی مسجد ہے جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مسجد کہلاتی ہے اور شاید یہ نسبت اس وجہ سے ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں اس مسجد میں نمازِ عید پڑھی تھی۔ پھر پانچویں بار محمد بن عبداللہ بن کثیر بن صلت کے فرودگاہ کے اندر پڑھی۔ پھر چھٹی بار اُس جگہ پڑھی، جہاں اب لوگ پڑھتے ہیں، جو مسجد المصلیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن شبہ نے ابن باکیہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حارۃ الدوس سے پہلے دار الشفاء کے پاس نمازِ عید پڑھی تھی اور سب سے پیچھے مصلیٰ میں پڑھی، جہاں آخر تک پڑھتے رہے۔ علامہ سمہودی کی عبارت یہ ہے:

"ولابن زبالة عن إبراهيم بن [أبي] أمية عن شيخ من أهل السن والثقة قال: إن أول عيد صلاه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم صلاه في حارة الدوس عند بيت ابن أبي الجنوب، ثم الثاني بفناء دار حكيم عند دار جفرة داخلا في البيت الذي بفنائه المسجد، ثم الثالث عند دار عبد الله بن دُرة المزني داخلا بين الدارين دار معاوية و دار كثير بن الصلت، ثم الرابع عند أحجار كانت عند الحناطين بالمصلیٰ، ثم صلیٰ داخلا في منزل محمد بن عبدالله بن كثير بن الصلت، ثم صلیٰ حيث يصلي الناس اليوم. قلت: دار ابن أبي الجنوب كانت غربي وادي بطحان فالمصلیٰ الأول في هذه الرواية هناك، وأما الثاني فقد سبق الكلام فيه، وأما الثالث فهو بمعنى قول ابن شهاب كما لابن شبة أنه صلی اللہ علیہ وسلم صلیٰ في موضع آل درة، وهم حي من مزينة، ومنزل مزينة غربي

[1] خلاصة الوفاء (۲/ ۲۸۲)

المصلیٰ إلی عدوة بطحان الشرقية إلی قبلة المصلیٰ، ودار كثير بن الصلت قبلة مصلیٰ العيد،[1] كما قال ابن سعد، يعني الذي استقر عليه الأمر، وهو المسجد الآتي ذكره، و دار معاوية كانت في مقابلة دار كثير، إما من غربيها أو من شرقيها، والأول أقرب لما سيأتي في مروره ﷺ إلی قباء أنه كان يمر علیٰ المصلیٰ، ثم يسلك في موضع الزقاق بين الدارين المذكورتين، وأما الرابع وما بعده فالظاهر أنها مواضع بقرب مصلیٰ الناس اليوم سيما الرابع، ولعله المسجد الذي شمالي مسجد المصلى اليوم جانحا إلی المغرب بوسط الحديقة المعروفة بالعريضي المتصلة بقبة عبن الأزرق، ويعرف اليوم بمسجد أبي بكر الصديق رضی اللہ عنہ ولعله صلیٰ فيه في خلافته... وقوله: ثم صلیٰ حيث يصلي الناس اليوم أي بالمسجد المعروف اليوم بمسجد المصلیٰ وهو بمعنی ما رواه ابن شبة عن ابن باكية قال: صلی رسول الله ﷺ العيد عند دار الشفاء، ثم صلیٰ في حارة الدوس، ثم، صلیٰ في المصلیٰ فثبت يصلي فيه حتی توفاه الله تعالیٰ"[2] اھ

[ابن زبالہ ابراہیم بن [ابی] امیہ سے روایت کرتے ہیں، وہ ایک دراز عمر ثقہ شیخ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے پہلی نمازِ عید حارۃ الدوس میں ابن ابی الجنوب کے گھر کے پاس ادا کی۔ پھر دوسری بار حکیم کے گھر کے صحن میں پڑھی، جو دار جفرہ کے پاس ہے، گھر کے اندر وہ گھر جس کے صحن میں مسجد ہے۔ پھر تیسری بار عبداللہ بن درہ مزنی کے مکان کے قریب ادا کی، جو معاویہ اور کثیر بن صلت کے مکانوں کے درمیان ہے۔ پھر چوتھی بار ان پتھروں کے پاس پڑھی، جو عید گاہ میں حناطین کے پاس ہیں۔ پھر محمد بن عبداللہ بن کثیر بن الصلت کے مکان کے اندر ادا کی۔ پھر اس جگہ پڑھی جہاں لوگ اب پڑھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ابن ابی الجنوب کا مکان وادیِ بطحان کی مغربی جانب میں تھا۔ چنانچہ اس روایت کے مطابق پہلی عید گاہ وہاں تھی۔ دوسری عید گاہ سے متعلق کلام پہلے گزر چکا ہے۔ تیسری عید گاہ تو وہ ابن شہاب کے قول کے مطابق، جیسا کہ ابن شبہ کا بھی بیان ہے کہ آپ ﷺ نے آلِ درہ کے مکان کے پاس نمازِ عید پڑھی، وہ آلِ درہ جو مزینہ کا ایک قبیلہ ہے۔ مزینہ کا گھر عید گاہ کی مغربی جانب میں وادیِ بطحان کے مشرقی کنارے کی طرف مصلّی کے قبلے کی جانب تھا۔ کثیر بن صلت کا مکان عید گاہ کے سامنے ہے، یعنی جس پر عمل برقرار رہا اور یہ وہ مسجد ہے جس کا آگے ذکر آرہا ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کا گھر

---

[1] قال الحافظ في الفتح: "تعريفه بكونه عند دار كثير بن الصلت علیٰ سبيل التقريب للسامع وإلا فدار كثير بن الصلت محدثة بعد النبي ﷺ" [مباركپوري]

[2] خلاصة الوفا (٢/ ٢٨٤)

کثیر کے گھر کے سامنے تھا، یا اس کی مغربی جانب یا اس کی مشرقی جانب۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس دلیل کی بنا پر جو آگے آئے گی، جس میں آپ ﷺ کے قبا جانے کا ذکر ہے اور اس میں ہے کہ آپ ﷺ عیدگاہ کے پاس سے گزر فرماتے تھے۔ پھر مذکورہ بالا دو گھروں کے درمیان گلی کی جگہ پر چلتے تھے۔ رہی چوتھی عیدگاہ اور اس کے بعد والی عیدگاہیں تو ظاہر ہے کہ یہ وہ جگہیں ہیں، جو لوگوں کی آج کی عیدگاہ کے قریب ہیں اور بطورِ خاص چوتھی عیدگاہ، شاید یہ وہی مسجد ہے، جو عیدگاہ کی شمالی جانب میں ہے، آج یہ مغرب کی جانب مائل، معروف باغیچہ عریضی کے وسط میں قبۂ عین الازرق کے ساتھ متصل ہے۔ آج کل یہ مسجد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نام سے معروف ہے۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں یہاں نمازِ (عید) ادا کی تھی... اور اس کا قول کہ پھر وہاں پر نمازِ (عید) پڑھی، جہاں آج لوگ پڑھتے ہیں، یعنی اس مسجد میں جو آج مسجد المصلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ روایت اسی مفہوم میں ہے، جس کو ابن شبہ نے ابن باکیہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دار الشفاء کے پاس عید کی نماز ادا کی۔ پھر حارۃ الدوس میں پڑھی۔ پھر المصلیٰ میں پڑھی، پھر اس کے بعد اسی جگہ نمازِ عید ادا کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فوت کر لیا]

پھر (صفحہ: ۱۸۹) میں علامہ سمہودی فرماتے ہیں کہ مطری نے کہا کہ ان مسجدوں میں سے جن کو ابن زبالہ نے نمازِ عید کے لیے ذکر کیا ہے، اب صرف تین مسجدیں مشہور ہیں:

① مسجد المصلیٰ: جس میں رسول اللہ ﷺ نے سب سے پیچھے عید کی نماز پڑھی اور آخر تک اسی میں پڑھتے رہے۔ ② مسجدِ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ ③ مسجدِ حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

علامہ سمہودی کی عبارت یہ ہے:

”قال المطري: ولا يعرف من المساجد التي ذكر، يعني ابن زبالة، لصلاة العيد غير المسجد الذي يصلىٰ فيه اليوم، ومسجد شماليه وسط الحديقة المعروفة بالعريضي، يعرف بمسجد أبيَ بكرؓ، و مسجد كبير شمالي الحديقة متصل بها، يسمىٰ مسجد علي“[1] انتهى ملخصاً

[مطری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عید کی نماز کے لیے ابن زبالہ کی ذکر کردہ مساجد میں سے ان مساجد کے علاوہ معروف نہیں ہیں، جس میں آج نمازِ (عید) ادا کی جاتی ہے اور وہ شمالی مسجد جو معروف باغیچے عریضی کے وسط میں ہے، وہ مسجد ابی بکر کے نام سے معروف ہے اور ایک بڑی مسجد ہے، جو باغیچے کی شمالی جانب اس کے ساتھ متصل، جس کا نام مسجد علی ہے]

بخاری شریف میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے عید میں اس علم کے پاس تشریف لا کر عید کی

① خلاصة الوفاء (۲/۲۸۶)

نماز پڑھی، جو کثیر بن صلت کے مکان کے پاس ہے۔ بخاری شریف کی عبارت یہ ہے:

"قال: سمعت ابن عباس قيل له: أشهدت العيد مع النبيﷺ؟ قال: نعم، ولو لا مكاني من الصغر ما شهدته حتى أتى العلم الذي عند دار كثير بن الصلت"[1] اهـ

[(راوی کا) بیان ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس وقت سنا، جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نبیِ مکرم ﷺ کے ساتھ نمازِ عید میں موجود تھے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں! اگر میں چھوٹی عمر کا بچہ نہ ہوتا تو میں ایسے موقعے پر (عورتوں کی جانب) آپ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکتا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ اس نشان کے پاس آئے جو کثیر بن صلت کے گھر کے پاس ہے]

خلاصہ الوفا کے صفحہ (۱۸۸) اور فتح الباری (۱/ ۵۲۰) میں ابن سعد سے منقول ہے کہ کثیر بن صلت کا مکان مصلیٰ رسول اللہ ﷺ کے قبلے کی جانب تھا اور یہ بھی فتح الباری میں ہے کہ کثیر بن صلت کا مکان بطن وادی بطحان پر، جو وسطِ مدینہ میں ہے، مطل تھا۔ خلاصۃ الوفاء کی عبارت یہ ہے: "و دار كثير بن الصلت قبلة مصلىٰ العيد كما قال ابن سعد يعني الذي استقر عليه الأمر" اهـ [کثیر بن صلت کا مکان عیدگاہ کے قبلے کی جانب تھا، جیسا کہ ابن سعد نے کہا ہے، یعنی جس پر عمل برقرار رہا] فتح الباری کی عبارت یہ ہے:

"قال ابن سعد: كانت دار كثير بن الصلت قبلة المصلىٰ في العيدين، وهي تطل علىٰ بطن بطحان الوادي الذي في وسط المدينة" اهـ

[ابن سعد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کثیر بن صلت کا گھر مصلیٰ عیدین کے قبلے کی جانب ہے، جو بطن وادی بطحان پر، جو وسط مدینہ میں ہے، مطل تھا]

خلاصۃ الوفا میں ہے کہ عدا اور ابن درہ مزنی دونوں کے مکان مصلیٰ کے غربی جانب میں تھے اور ابن ابی الجنوب کا مکان وادیِ بطحان کے غربی جانب میں تھا۔ خلاصۃ الوفاء کی عبارت اوپر نقل ہوچکی اور اس باب میں صحرا کی افضلیت کی صراحت میں نے کسی حدیث میں نہیں پائی اور صحرا کے کئی معنی ہیں۔ قاموس میں ہے:

"اسم سبع محال بالكوفة، والأرض المستوية في غلظ ولين دون القف، والفضاء الواسع لا نبات به"[2] انتهى

[(صحرا) کوفہ میں سات مقامات کا نام ہے اور یہ اس زمین کو کہتے ہیں، جو سخت پتھروں کے سوا سختی اور نرمی میں برابر ہو اور وہ فراغ فضا اور کشادگی جو بے آب و گیا ہو]

"منتهى الأرب" میں ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۹۳۴)

[2] القاموس المحيط (ص: ۱۸۵)

''صحرا: نام ہفت جائے ست درکوفہ، و دشت ہموار، و کشادگی فراخ بے گیاہ'' [1] اھ
[صحرا کوفہ میں سات جگہوں کا نام ہے اور یہ ہموار زمین اور بے آب و گیاہ فراخ کشادگی کو کہتے ہیں]
نیز ''منتھیٰ الأرب'' میں ہے: ''دشت۔ بالفتح۔ بیابان'' [2] [دشت دال کی زبر کے ساتھ، بیاباں کو کہتے ہیں]
''غیاث اللغات'' میں ہے:
''بیابان بفتح از کشف، و بعضے محققین نوشتہ اند کہ بیابان بکسر اول باشد زیرا کہ در اصل بے آبان بود بمعنی بے آب شوندہ یعنی صحرائے بے آب چوں بالف ممدودہ آب در حقیقت دو الف است لفظ دیگر مرکب شود الف اول ساقط گردد چنانکہ سیماب و گلاب و الف و نون در آخر برائے فاعلیت است''
[کشف میں ہے کہ بیابان ب کی زبر کے ساتھ ہے۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ بیابان پہلے لفظ (بائے اول) کی زیر کے ساتھ ہے، کیوں کہ یہ لفظ اصل میں ''بے آبان'' تھا، جس کا معنی ہے، بے آب ہونا، یعنی صحرائے بے آب۔ لفظ آب میں الف ممدودہ کے ساتھ درحقیقت دو الف ہیں، جب اس کے ساتھ دوسرا لفظ مرکب ہوا تو پہلا الف ساقط ہوگیا، جیسے سیماب اور گلاب ہے۔ بیابان کے آخر میں ''ان'' فاعلیت کے لیے ہیں]

ان عبارات منقولہ کتب لغت سے ہویدا ہے کہ عرب کی زبان میں صحرا علاوہ ان سات جگہوں کے جو کوفہ میں ہیں، اس جگہ کو کہتے ہیں، جس میں پانی اور گھاس نہ ہو، یعنی صحرا کے مفہوم میں پانی اور گھاس کا نہ ہونا بھی معتبر ہے اور مصلیٰ شریف اور وہ جگہیں جن میں حضرت ﷺ نے عید کی نمازیں پڑھی تھیں، ان پر صحرا بمعنی مذکور کا صادق آنا مشکل ہے۔

بہرکیف کتب مذکورہ بالا سے اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ عید گاہ، یعنی جہاں عید کی نماز پڑھی جائے، ایسی کشادہ جگہ ہونی چاہیے، جس میں عید گاہ کے لیے جانے والوں کی گنجایش ہو جائے، خواہ صحرا ہو یا مسجد یا ان کے سوا اور کوئی جگہ ہو، اور رسول اللہ ﷺ کا مسجد نبوی میں نمازِ عیدین پڑھنا سب سے آخر میں مصلیٰ شریف میں پڑھنا اور پھر اسی میں پڑھتے رہ جانا، اس کی وجہ۔ واللہ اعلم۔ یہی معلوم ہوتی ہے کہ مسجد نبوی میں اس وقت اتنی گنجائش نہ تھی کہ سب لوگ اس میں آ سکیں اور دوسری جگہوں میں اس قدر گنجائش تھی، پھر جیسے جیسے حاضرین کی کثرت ہوتی گئی، جگہیں بدلتی گئیں۔ سب سے آخر میں مصلیٰ کی جگہ اس لیے تجویز ہوئی کہ وہ بہت کشادہ جگہ تھی اور اسی وجہ سے پھر اس کی تبدیلی کی ضرورت نہ ہوئی۔

اس کی تائید اس سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ مکہ معظّمہ میں نمازِ عید مسجد ہی میں ہوتی آئی ہے، کبھی صحرا میں ثابت نہیں ہے تو اگر نمازِ عید کے لیے صحرا ضروری یا افضل ہوتا تو ضرور حضرت رسول اللہ ﷺ اپنے عہد شریف میں بعد

---
[1] منتھی الأرب (۲/ ۲۲٤)
[2] منتھیٰ الأرب (۲/ ۲۹)

فتح مکہ کے مکہ والوں پر صحرا میں نمازِ عید پڑھنے کا حکم جاری فرماتے، جس طرح اور احکام آپ ﷺ نے وہاں جاری فرمائے، حالانکہ کہیں سے اس کا کچھ ثبوت معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ﷺ نے مکہ والوں پر ایسا حکم کبھی جاری فرمایا ہو۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱/ ۵۲۱) میں امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ مکہ معظمہ میں جو نمازِ عید مسجد میں ہوتی ہے، اس کا سبب بھی مسجد کی کشادگی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول کا مقتضا یہ ہے کہ مسجد یا صحرا میں نمازِ عید پڑھنے کی علت کا مدار تنگی اور کشادگی ہے۔ نفسِ صحرا کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے، یعنی اگر مسجد کشادہ ہے تو مسجد ہی میں پڑنی چاہیے اور مسجد تنگ ہے تو صحرا اور جو جگہ کشادہ ہو، اس میں پڑھنی چاہیے، کسی جگہ کی خصوصیت کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ فتح الباری کی عبارت یہ ہے:

"قال الشافعي في الأم: بلغنا أن رسول اللهﷺ كان يخرج في العيدين إلى المصلىٰ بالمدينة، وكذا من بعده إلا من عذر مطر ونحوه، وكذلك عامة أهل البلدان إلا أهل مكة، ثم أشار إلى أن سبب ذلك سعة المسجد و ضيق أطراف مكة، قال: فلو عمر بلد فكان مسجد أهله يسعهم في الأعياد لم أر أن يخرجوا منه، فإن كان لا يسعهم كرهت الصلاة فيه، ولا إعادة، ومقتضىٰ هذا أن العلة تدور علىٰ الضيق والسعة لا لذات الخروج إلى الصحراء، لأن المطلوب حصول الاجتماع فإذا حصل في المسجد مع أفضليته كان أولىٰ" اهـ[1]

[امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں فرمایا ہے کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ عیدین (کی نماز ادا کرنے) کے لیے مدینے کی عید گاہ کی طرف جایا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد والے لوگوں (خلفا وغیرہ) کا یہی معمول تھا۔ پھر انھوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ بلاشبہہ اس (اہلِ مکہ کا مسجد میں عید پڑھنے) کا سبب یہ ہے کہ مسجد حرام بہت وسیع ہے اور اطرافِ مکہ تنگ ہیں۔ نیز ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شہر آباد کیا جائے اور اہلِ شہر کی مسجد عیدین کی نماز پڑھنے کی ان کو گنجایش فراہم کرتی ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ شہر سے باہر نکلیں اور اگر اس مسجد میں اہلِ شہر کے نمازِ عید ادا کرنے کی گنجایش نہ ہو تو پھر شہر کے اندر مسجد میں نماز ادا کرنا مکروہ ہے، اگر پڑھ لی جائے تو اس کا اعادہ لازم نہیں آئے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول کا مقتضا یہ ہے کہ مسجد یا صحرا میں نمازِ عید ادا کرنے کی علت کا مدار تنگی اور کشادگی ہے، نفسِ صحرا کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے، کیوں کہ اس کا مطلوب اجتماع کا حصول ہے۔ اگر مسجد سے یہ مطلب حاصل ہوجائے تو یہ اولیٰ اور بہتر ہے اور پھر یہ کہ مسجد ویسے بھی دوسری جگہوں کے مقابلے میں افضل ہے]

[1] فتح الباري (٢/ ٤٥٠)

اور یہ خیال کہ جب سب سے آخر میں مصلیٰ کی تجویز ہوئی تو اور جگہیں منسوخ ہو گئیں، صحیح نہیں ہے۔

کتبہ: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

خطبہ عیدین کی تعداد:

سوال خطبہ عیدین کا مثل خطبتین جمعہ دو پڑھے جائیں یا صرف ایک خطبہ پڑھنا چاہیے؟

جواب خطبہ عیدین دو پڑھے جائیں۔ ابن ماجہ (ص: ۹۳) میں ہے:

"عن جابر رضی اللہ عنہ قال خرج رسول الله ﷺ يوم فطر أو أضحى فخطب قائما، ثم قعد قعدة، ثم قام" [1]

[جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے دن نکلے، آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا، پھر کچھ دیر کے لیے بیٹھ گئے، پھر کھڑے ہوئے]

اگرچہ اس حدیث کی اسناد میں اسماعیل بن مسلم ہے اور وہ ضعیف ہے، لیکن اولاً تو یہ حدیث بلا معارض ہے۔ ثانیاً اثرِ ذیل سے جو منتقی کے "باب خطبة العيد وأحكامها" میں مذکور ہے، یہ ضعف منجبر ہو جاتا ہے:

"عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة رضی اللہ عنہ قال: السنة أن يخطب الإمام في العيدين خطبتين يفصل بينهما بجلوس" [2] (رواه الشافعي)

[عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: سنت یہ ہے کہ امام عید کے دو خطبے دے اور ان دونوں کے درمیان کچھ دیر بیٹھ کر فاصلہ کرے]

ثالثاً قیاس علی الجمعۃ اور توارث قدیم اس کے موید ہیں۔ والله أعلم بالصواب.

کیا خطبے میں اردو میں وعظ و نصیحت کرنا درست ہے؟

سوال عیدین اور جمعہ کے خطبے میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کا ترجمہ بطور وعظ بغرض تفہیم مخاطبین جائز ہے یا نہیں؟

جواب عیدین اور جمعہ کے خطبے میں آیاتِ قرآنی و احادیثِ نبوی کا ترجمہ بطورِ وعظ بغرض تفہیم مخاطبین جائز ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ عیدین اور جمعے کے خطبوں میں وعظ و تذکیر فرمایا کرتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی کلام پر

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٨٩) اس کی سند میں "إسماعيل بن مسلم" اور "أبو بكر البكراوي" دو راوی ضعیف ہیں۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔

[2] مسند الشافعي (٣٤٢) اس اثر کے قائل "عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ" تابعی ہیں اور جب کوئی تابعی کسی مسئلے سے متعلق بات کو "السنة" کے لفظ سے بیان کرے تو وہ مرفوع کے حکم میں نہیں ہوتا، البتہ اگر کوئی صحابی کسی بات کو "السنة" کے لفظ کے ساتھ بیان کرے تو وہ حکماً مرفوع ہوتا ہے۔ (معرفة علوم الحديث، ص: ٦٢، فتح المغيث: ١/ ١١٩) سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی ایک اثر ان الفاظ "السنة أن يخطب في العيدين خطبتين فيفصل بينهما بجلوس" کے ساتھ مروی ہے، لیکن امام نووی رحمہ اللہ اس کے متعلق فرماتے ہیں: "ضعيف غير متصل" (نصب الراية: ٢/ ١٤٩)

وعظ وتذکیر کا اطلاق اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے، جبکہ وہ کلام مخاطبین کی زبان میں ہو، جس کو وہ سمجھ سکتے ہوں، ورنہ اس کلام کو وعظ وتذکیر کہنا صحیح نہ ہوگا۔ صحیح مسلم (۱/۱۸۳) میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

"قال: كانت للنبي ﷺ خطبتان، يجلس بينهما، يقرأ القرآن ويذكر الناس" [1]

[(راوی) بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ دو خطبے ارشاد کرتے تھے، ان دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے (ان خطبوں میں) قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے تھے]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"كان النبي ﷺ يخرج يوم الفطر والأضحى إلى المصلىٰ، فأول شيء يبدأ به الصلاة، ثم ينصرف فيقوم مقابل الناس، والناس جلوس على صفوفهم فيعظهم ويوصيهم ويأمرهم... الحديث" [2] (متفق عليه)

[نبی کریم ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف جاتے، سب سے پہلے نمازِ عید ادا کرتے، پھر نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف منہ کر کے ان کے سامنے کھڑے ہوجاتے، جب کہ لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوتے۔ پھر آپ ﷺ ان کو وعظ ونصیحت اور وصیت کرتے اور ان کو حکم دیتے...الحدیث]

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"قال: شهدت الصلاة مع النبي ﷺ في يوم عيد فبدأ بالصلاة قبل الخطبة بغير أذان ولا إقامة، فلما قضىٰ الصلاة، قام متكئا علىٰ بلال، فحمد الله وأثنىٰ عليه، ووعظ الناس، وذكرهم وحثهم على طاعته، ومضىٰ إلى النساء، ومعه بلال فأمرهن بتقوى الله ووعظهن وذكرهن" [3]

[(راوی) بیان کرتے ہیں کہ میں نبیِ مکرم ﷺ کے ساتھ عید کی نماز میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے بغیر اذان اور اقامت کے خطبے سے پہلے نمازِ عید پڑھائی۔ جب آپ ﷺ نے نماز پوری فرمائی تو بلال رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی، لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے ہوئے انھیں (اللہ اور رسول کی) اطاعت کی تلقین فرمائی، پھر آپ ﷺ ایک طرف سے ہو کر عورتوں کی طرف گئے، بلال رضی اللہ عنہ بدستور آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے ان (عورتوں) کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا اور انھیں وعظ ونصیحت فرمائی]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٩)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٧٥)

تکبیراتِ عیدین کی تعداد:

سوال عیدین کی نماز میں قراءت کے قبل دونوں رکعت میں کتنی تکبیریں ہیں؟ دوسری رکعت میں قبل قراءت کے تکبیر کہنی چاہیے یا بعد قراءت کے؟

جواب عیدین کی نماز میں تکبیریں دونوں رکعتوں میں قراءت سے پہلے ہیں۔[1]

جمعے کے روز اگر عید بھی ہو تو نمازِ جمعہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

سوال جمعہ کے روز اگر عید بھی ہو تو نمازِ جمعہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب شرع سے رخصت ہے۔ نمازِ جمعہ بھی اگر پڑھ لے تو بہتر ہے، ورنہ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

عن زيد بن أرقم رضي الله عنه، وسأله معاوية: هل شهدت مع رسول الله ﷺ عيدين اجتمعا؟ قال: نعم، صلى العيد أول النهار، ثم رخص في الجمعة، فقال: «من شاء أن يجمع فليجمع»[2] (رواه أحمد و أبو داود و ابن ماجه)

[زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے سوال کیا: کیا آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک دن میں دو عیدوں (جمعہ اور عید) میں حاضر ہوئے ہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے عید کی نماز ادا فرمائی، پھر جمعے کی رخصت دے دی۔ پھر فرمایا: جو جمعہ پڑھنا چاہے پڑھ لے]

و عن أبي هريرة رضي الله عنه عن رسول الله ﷺ أنه قال: «قد اجتمع في يومكم هذا عيدان فمن شاء أجزأه من الجمعة، وإنا مجمعون»[3]

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تمھارے اس دن میں دو عیدیں جمع ہوگئی ہیں تو جو شخص چاہے اس کے لیے یہ (نمازِ عید) جمعے کے بدلے کفایت کرے گی اور ہم جمعہ پڑھیں گے]

«وعن وهب بن كيسان رضي الله عنه قال اجتمع عيدان على عهد ابن الزبير فأخر الخروج حتى تعالى النهار ثم خرج فخطب، ثم نزل فصلى ولم يصل للناس يوم الجمعة فذكرت ذلك لابن عباس فقال: أصاب السنة»[4]

[وہب بن کیسان نے بیان کیا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دورِ (خلافت) میں جمعہ اور عید اکٹھے ہوگئے تو

---

[1] پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دوسری میں پانچ۔

[2] مسند أحمد (٤/ ٣٧٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣١٠)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣١١)

[4] سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٩٢)

انھوں نے عید کے لیے نکلنے میں دیر کر دی، حتی کہ دن (کافی) اونچا ہوگیا، پھر وہ نکلے اور خطبہ دیا، پھر اترے اور عید کی نماز پڑھائی اور اس دن لوگوں کو جمعہ نہیں پڑھایا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بات ذکر کی گئی تو انھوں نے فرمایا: انھوں نے سنت پر عمل کیا]

رواه النسائي، و أبو داود بنحوه، لكن من رواية عطاء، و لأبي داود أيضاً عن عطاء قال: اجتمع يوم الجمعة ويوم الفطر علىٰ عهد ابن الزبير فقال: عيدان اجتمعا في يوم واحد فجمعهما جميعا فصلاهما ركعتين بكرة، لم يزد عليهما حتى صلىٰ العصر »[1]

(منتقى الأخبار، مطبوعه فاروقی، ص: ١٠٤)

[نسائی اور ابو داود نے اسی طرح روایت کیا ہے، لیکن عطا کی روایت سے۔ ابو دادو میں بھی عطا کے واسطے سے ہے، انھوں نے بیان کیا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دورِ (خلافت) میں جمعے کا دن اور عید الفطر کا دن اکٹھے ہوگئے تو انھوں نے کہا کہ دو عیدیں (جمعہ اور عید) ایک ہی دن میں اکٹھی ہوگئی ہیں۔ پھر انھوں نے ان دونوں کو جمع کر دیا اور پہلے پہر دو رکعتیں پڑھائیں، اس پر کچھ اضافہ نہ کیا، حتی کہ عصر پڑھی]

كتبه: محمد سليمان۔ غفرله المنان. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبدالله. الجواب صحيح. كتبه: أبو محمد إبراهيم.

احناف کے پیچھے نمازِ عید پڑھنا:

سوال ① ایک شہر کی عید گاہ میں تمام شہر اور دیہات کے حنفی مسلمان نمازِ عید کے واسطے جمع ہوتے ہیں اور امام بھی حنفی ہے۔ یہ لوگ جماعتِ اہلِ حدیث کے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل ہو کر پڑھنے اور عید گاہ میں آنے سے منع نہیں کرتے اور روکتے بھی نہیں ہیں، بلکہ اپنے ساتھ شامل ہو کر نماز پڑھنے کی خوشی سے اجازت دیتے اور مسلمانوں کی جماعت بڑھانے کے واسطے ان کو بلاتے ہیں، تو اس صورت میں اہلِ حدیث کو جماعت حنفیہ کے ساتھ شامل ہو کر عید گاہ میں ان کے مقتدی بن کر نماز عید پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

② اگر جائز ہے تو اہلِ حدیث بارہ تکبیریں قبل قراءت کہنے کے قائل و عامل ہیں اور حنفیہ چھ کے بعد قراءت قبل الرکوع کے، تو اس صورت میں اہلِ حدیث اپنی تکبیریں کتنی اور کس جگہ کہیں؟

③ اگر یہ لوگ ان کے ہمراہ شامل ہو کر نماز نہ پڑھیں، بلکہ دس بیس پچاس آدمی علیحدہ ہو کر نمازِ عید ادا کریں تو ان پر کچھ شرعی الزام و وعید ہے یا نہیں؟

جواب ① اس صورت میں اہلِ حدیث کو جماعت حنفیہ کے ساتھ شامل ہو کر عید گاہ میں ان کے مقتدی بن کر نمازِ عید

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٧٢)

پڑھنی جائز بلکہ ضروری ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران، رکوع ۱۱]

یعنی اللہ کی رسّی (دینِ اسلام، یعنی اللہ کی فرمانبرداری) سب مل کر مضبوط پکڑے رہو اور الگ الگ نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«كونوا عباد الله إخوانا»[1] (رواه الشيخان عن أبي هريرة، مشكوة، ص: ٤١٩)

یعنی تم لوگ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بنے رہو۔

اس مضمون کی آیات اور احادیث بہت ہیں۔ ہاں اگر وہ لوگ اپنے ساتھ شامل ہو کر نماز پڑھنے سے جماعتِ اہل حدیث کو روکتے تو اس صورت میں جماعتِ اہلِ حدیث کو البتہ عذر کی جگہ تھی۔ لیکن جب وہ لوگ ان کو روکتے نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کی جماعت بڑھانے کے لیے بلاتے ہیں تو ضرور ان کو ان کے ساتھ شامل ہو کر نماز پڑھنی چاہیے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

۲ اہلِ حدیث تکبیریں جتنی اور جس جگہ کہتے ہیں، اتنی اور اس جگہ کہیں۔ بخاری شریف (۳/ ۳۱۱) میں ہے:

باب إذا لم يتم الإمام، واتم من خلفه. حدثنا الفضل بن سهل قال: حدثنا الحسن بن موسىٰ الأشيب قال: حدثنا عبد الرحمن بن عبدالله بن دينار عن زيد بن أسلم عن عطاء بن يسار عن أبي هريرة أن رسول اللهﷺ قال: «يصلون لكم فإن أصابوا فلكم، وإن أخطأوا فلكم وعليهم»[2]

[ہمیں فضل بن سہل نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں حسن بن موسیٰ اشیب نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں عبد الرحمٰن بن عبداللہ بن دینار نے بیان کیا، وہ زید بن اسلم سے روایت کرتے ہیں، وہ عطا بن یسار سے روایت کرتے ہیں، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ تمھیں نماز پڑھاتے ہیں، پھر اگر انھوں نے ٹھیک نماز پڑھائی تو تمھیں اس (نماز) کا ثواب ملے گا اور اگر انھوں نے غلطی کی تو بھی (تمھاری نماز کا) تم کو ثواب ملے گا اور (غلطی کا وبال) ان پر ہوگا]

فتح الباری (۱/ ۳۸۸ دہلی) میں ہے:

''زاد أحمد عن الحسن بن موسىٰ بهذا السند: «ولهم» وكذا أخرجه الإسماعيلي وأبو نعيم في مستخرجيهما من طرق عن الحسن بن موسى. وقد أخرج ابن حبان حديث أبي هريرة من وجه آخر، و لفظه: «يكون أقوام يصلون الصلاة، فإن أتموا فلكم ولهم» ورویٰ أبو داود من حديث عقبة بن عامر مرفوعا «من أم الناس فأصاب

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٢)

الوقت فله ولهم » وفي رواية أحمد في هذا الحديث: « فإن صلوا الصلاة لوقتها وأتموا الركوع والسجود فهي لكم ولهم » وقد روى الشافعي معنى هذا الحديث من طريق صفوان بن سليم عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة مرفوعاً بلفظ: «يأتي قوم فيصلون لكم فإن أتموا كان لهم ولكم، وإن نقصوا كان عليهم ولكم»

"قال ابن المنذر: هذا الحديث يرد على من زعم أن صلاة الإمام إذا فسدت فسدت صلاة من خلفه، وقال البغوي في شرح السنة: فيه دليل علىٰ أنه إذا صلىٰ بقوم محدثا أنه تصح صلاة المأمومين، وعليه الإعادة، واستدل به غيره علىٰ أعم من ذلك، وهو صحة الائتمام بمن يخل بشيء من الصلاة ركنا كان أو غيره، إذا أتم المأموم، ومنهم من استدل به على الجواز مطلقا بناء، علىٰ أن المراد بالخطأ ما يقابل العمد، قال: ومحل الخلاف في الأمور الاجتهادية كمن يصلي خلف من لا يرى قراءة البسملة، ولا أنها من أركان القراءة، ولا أنها آية من الفاتحة بل يرىٰ أن الفاتحة تجزئ بدونها، قال: فإن صلاة المأموم تصح إذا قرأ هو البسملة، لأن غاية حال الإمام في هذه الحالة أن يكون أخطأ، وقد دل الحديث على أن خطأ الإمام لا يؤثر في صحة صلاة المأموم إذا أصاب" [1] (انتهىٰ ملتقطا)

[امام احمد رحمہ اللہ نے حسن بن موسیٰ سے اسی سند کے ساتھ اس لفظ: «ولهم» کا اضافہ کیا ہے۔ ایسے ہی اسماعیلی اور ابو نعیم نے اپنی اپنی مستخرج میں اسے کئی سندوں سے حسن بن موسیٰ کے واسطے سے بیان کیا ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو دوسری سند سے بیان کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: "چند قومیں ایسی ہوں گی جو نماز پڑھائیں گی، پس اگر وہ پوری نماز پڑھائیں تو تمھیں (اس نماز کا) ثواب ملے گے اور ان کو بھی۔" ابو داود نے عقبہ بن عامر سے مرفوعاً روایت کیا ہے: "جس نے بروقت لوگوں کو امامت کرائی تو اسے بھی اور ان کو بھی ثواب ملے گا۔" مسند احمد کی روایت میں اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں: "پس اگر وہ بروقت نماز پڑھائیں اور رکوع و سجود مکمل کریں تو تم کو بھی اور ان کو بھی اس کا ثواب ملے گا۔" امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کے مفہوم میں صفوان بن سلیم کے واسطے سے روایت کیا ہے، صفوان، سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں اور سعید ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "ایک ایسی قوم آئے گی، جس کے امام تمھیں نماز پڑھائیں گے، پس اگر وہ مکمل نماز پڑھائیں تو ان کو بھی اور تمھیں بھی ثواب ملے گا اور اگر وہ نماز میں کسی طرح کی کمی کریں تو اس غلطی کا وبال ان پر ہوگا، تمھیں بہر حال ثواب ملے گا۔"

[1] فتح الباري (٢/ ١٨٨)

ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا: ''یہ حدیث اس شخص کے موقف کو رد کرتی ہے، جس کا یہ گمان ہے کہ جب امام کی نماز فاسد ہو جائے تو مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے۔'' امام بغوی رحمہ اللہ نے ''شرح السنۃ'' میں کہا: ''اس (حدیث) میں اس بات کی دلیل ہے کہ جب امام بغیر وضو کے لوگوں کو نماز پڑھا دے تو مقتدیوں کی نماز درست ہوگی۔ البتہ امام کو اپنی نماز دہرانا پڑے گی۔ امام بغوی رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر اہلِ علم نے اس حدیث کے ذریعے مذکورہ حالت سے بھی زیادہ عام چیز پر استدلال کیا ہے اور وہ ہے ایسے شخص کی اقتدا میں نماز ادا کرنا جو نماز کی کسی چیز میں خلل پیدا کرنے والا ہو، خواہ وہ چیز نماز کا رکن ہو یا غیرِ رکن، بشرطیکہ مقتدی اس کو مکمل کر لے۔

بعض اہلِ علم نے اس سے مطلق جواز پر استدلال کیا ہے اور وہ اس بنا پر کہ اس حدیث میں خطا سے مراد وہ چیز ہے، جو عمد کے مقابلے میں ہو۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ اختلاف کا محل اجتہادی امور ہیں، جیسے وہ شخص جو ایسے امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے، جو بسملہ کی قراءت کا قائل نہ ہو۔ وہ اسے قراءت کے ارکان میں سے جانتا ہو اور نہ اسے سورۃ الفاتحہ کی آیت مانتا ہو، بلکہ وہ اس بات کا قائل ہو کہ بسملہ کے بغیر بھی سورۃ الفاتحہ کی قراءت کفایت کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب مقتدی بسملہ پڑھ لے تو اس کی نماز درست ہو جائے گی، کیوں کہ اس صورتِ حال میں امام کی حالت زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس نے خطا کی ہے، جب کہ مذکورہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امام کی غلطی مقتدی کی نماز کی درستی میں اثر انداز نہیں ہوتی ہے، جب مقتدی نے وہ غلطی نہ کی ہو]

منتقی میں ہے:

''وقد صح عن عمر أنه صلیٰ بالناس وهو جنب، ولم يعلم فأعاد، ولم يعيدوا، وكذلك عثمان، وروي عن علي من قوله رضي الله عنه''[1]

[عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ لاعلمی میں انھوں نے جنابت کی حالت میں لوگوں کو نماز پڑھا دی۔ چناں چہ انھوں نے اپنی نماز دہرائی، جب کہ لوگوں نے نماز نہ دہرائی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ علی رضی اللہ عنہ سے بھی اس بارے میں ان کا قول روایت کیا گیا ہے]

''نیل الأوطار'' (۳/ ۵۲) میں ہے:

''منهم من استدل به علیٰ الجواز مطلقا، وهو الظاهر من الحديث، ويؤيده ما رواه المصنف عن الثلاثة الخلفاء رضي الله عنهم'' انتهى

[ان (اہلِ علم) میں سے بعض نے تو اس حدیث سے مطلق جواز کا استدلال کیا ہے اور حدیث کا ظاہر مفہوم

[1] نیل الأوطار شرح منتقیٰ الأخبار (۳/ ۲۱۴)

بھی یہی ہے۔ نیز مصنف نے جو تینوں خلفا سے روایت کیا ہے، وہ بھی اس موقف کی تائید کرتا ہے]

ان عباراتِ مذکورہ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر امام کی نماز میں کسی طرح کی کچھ کمی واقع ہو جائے اور مقتدی اس کمی کو پوری کر لے تو مقتدی کی نماز پوری ہو جائے گی۔ امام کی اس کمی سے مقتدی کی نماز میں کچھ خلل واقع نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ أعلم

۳ اگر اہلِ حدیث اس صورت میں ان کے ساتھ شامل ہو کر نماز نہ پڑھیں، بلکہ علیحدہ ہو کر نمازِ عید ادا کریں تو ان پر شرعی الزام اور وعید دونوں ہے۔ شرعی الزام تو مذکورہ بالا آیات اور احادیث کی مخالفت ہے اور وعید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ [آل عمران: ۱۰۵]

[اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے اور یہی لوگ ہیں، جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے]

اس مضمون کی اور بھی بہت آیتیں اور حدیثیں ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم

كتبه: محمد عبدالله (٤/ ذى القعدة ١٣٣٠هـ)

الجواب صحيح. كتبه: أبو يوسف محمد عبد المنان غازيپوري، مدرس مدرسه رياض العلوم دهلى (١٩/ ذى القعده ١٣٣٠هـ) الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد القدير. الجواب صحيح والمجيب نجيح. كتبه: محمد عبدالله المئوى. الجواب صحيح والمجيب مصيب. كتبه: السيد محمد عبدالحفيظ. الجواب صحيح لا ريب فيه. محمد إسماعيل. الجواب صحيح والرأي نجيح. حرره تلطف حسين. من يرد الله به خيرا يفقهه فى الدين. محمد عبدالعزيز خلف مولوى عبد السلام مباركپوري.

نمازِ عید میں امام کے پیچھے کھڑے ہونے کی کیفیت:

سوال مخفی نہ رہے کہ اس امر کا خیال و لحاظ ضروری ہے کہ مقلدین کے پیچھے نماز درست و صحیح ہے یا نہیں؟ اگر درست و صحیح ہے اور آدمی بیل گاڑی وغیرہ کی آمد و رفت کے لیے ایک سڑک جنوباً و شمالاً لانبی بنی ہوئی ہے اور اکثر اوقات اس سڑک پر آدمی و گاڑی وغیرہ کی آمد و رفت رہا کرتی ہے۔ ایک میدان میں عین اسی سڑک پر بہت بڑا سایہ دار ایک پیپل کا درخت ہے، جس کے سبب سے درخت کے قریب پہنچ کر سڑک دوشاخہ ہوگئی ہے اور درخت کو بیچ میں رکھ کر درخت کے متصل پورب اور پچھم دونوں جانب سے درخت کو طی کر کے پھر مل گئی ہے۔ اس درخت کے نیچے مصلیانِ اطراف و جوانب عیدین میں عیدین کی نماز پڑھا کرتے ہیں۔ از روئے شرع

شریف اس سڑک پر نماز جائز ہے یا نہیں؟ سائل: بین اللہ سرکار۔ موضع چک۔ ڈاکخانہ تانور ضلع راجشاہی

جواب اس صورت میں اس سڑک پر نماز با جماعت جائز ہے، بشرطیکہ صفیں، جو امام کے پیچھے ہیں، باہم ملی ہوئی ہوں، جیسا کہ صفوں کا دستور ہے اور بشرطیکہ امام کا حال دربارہ رکوع و سجود وغیرہ مقتدیوں پر مشتبہ نہ ہو۔ اس صورت میں اس سڑک پر نماز باجماعت ناجائز ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ناجائز کہے تو اُس سے وجہ ناجوازی دریافت کر کے اطلاع دیں کہ اس پر پھر غور کیا جائے۔[1] واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (۳/ ذي الحجہ ۱۳۳۱ھ)

نمازِ عیدین میں عورت کی امامت:

سوال چند عورتیں آپس میں امام و مقتدی بن کر عید کی نماز پڑھ سکتی ہیں یا نہیں اور یہ کن کن اماموں کے نزدیک جائز و ناجائز ہے؟ صراحت کے ساتھ مطلع فرمائیں۔

جواب پڑھ سکتی ہیں، جیسا کہ حاکم نے مستدرک میں اور عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں اور امام محمد نے کتاب الآثار میں روایت کی ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرض نمازوں میں اور تراویح میں عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں۔[2]

---

[1] مصنف عبد الرزاق (۳/ ۱٤۱) مصنف ابن أبي شیبة (۱/ ٤۳۰)

[2] مخفی نہ رہے کہ اس امر کا خیال و لحاظ ضروری ہے کہ مقلدین کے پیچھے نماز درست و صحیح ہے یا نہیں؟ اگر درست و صحیح ہے اور بایں ہمہ وہ اہل حدیث کی مزاحمت نہیں کرتے، بلکہ شامل ہونا چاہتے ہیں تو اس صورت میں اہلِ حدیث کو ان کے ہمراہ نماز عیدین قائم و ادا کرنا علیحدہ جماعت قائم کرنے سے اولیٰ و افضل ہے اور اس کے دلائل وہی ہیں، جو علامہ مفتی صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ پس واضح ہو کہ مقلدین میں دو قسم کے اشخاص پائے جاتے ہیں، ایک تو وہ کہ التزامِ شرک میں مبتلا ہیں، جیسے قبروں کا عرس کرنا اور رسولِ کریم ﷺ کی نسبت اعتقاد و علم غیب اور آپ کی روح مبارک کے متعلق یہ کہ وہ ایک وقت میں مقاماتِ مختلفہ میں دور و نزدیک حاضر ہو سکتی ہے اور امورِ منصوصہ متفق علیہا کی مخالفت، مثلاً کسی امر کی حرمتِ منصوصہ متفق علیہا ہے اور اس کو حلال قرار دینا، ایسے اشخاص مشرک ہیں، ان کے اعمال دنیاوی و دینی لحاظ سے سب ضائع و باطل ہیں، جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

﴿أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ الآیة.

ایسوں کے ساتھ جماعت قائم کرنا یا ان کے پیچھے نماز ادا کرنا ہرگز درست نہیں۔ دوسری قسم وہ لوگ ہیں، جو التزامِ شرک میں مبتلا نہیں اور امورِ شرکیہ مذکورہ بالا سے اسی طرح نفرت کرتے ہیں، جس طرح اہلحدیث۔ ہر چند وہ امور اجتہادیہ میں تقلید کو ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن اپنا اعتقاد اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن و حدیث سب اقوال پر مقدم ہیں۔ اگر ان کا عمل اس اعتقاد کے خلاف پایا گیا تو عملی حالت قابلِ ملامت ہوگی نہ کہ اعتقاد۔ ایسے اشخاص بہت کم ہیں، جن کی حالتِ عملی قابلِ ملامت نہ ہو اور افسوسناک۔ ایسے اشخاص کے پیچھے نماز درست ہے۔ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مسائل مختلف فیہا، جن میں بکثرت اختلاف پایا جاتا ہے، اس سے نہ افراد اہلِ حدیث خالی ہیں نہ دیگر اشخاص، لیکن اس اختلاف کا منشا اگر فہم و تحقیق کا مختلف اور جدا جدا ہونا ہے تو قابلِ ملامت نہیں ہوسکتا، کیوں کہ صحابہ و تابعین وغیرہم میں بھی ایسے اختلاف اور ایسی صورت پائی گئی اور اگر خدانخواستہ حیلہ سازی و ابلہ فریبی ہے تو قابلِ طعن و تشنیع ہے، کیوں کہ یہ منافقانہ و مفسدانہ کارروائی ہے اور اس کی شناخت یوں ہوسکتی ہے کہ جب کسی موقع پر ظاہر کیا جائے کہ فلاں فلاں مسائل مختلف فیہا میں ہر فریق اپنی تحقیق کے موافق اپنے دلائل پیش کرے اور دعویٰ پایۂ ثبوت کو ←

اسی طرح عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ نے اپنے اپنے مصنف میں اور امام شافعی نے اپنی مسند میں روایت کی ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی عورتوں کی امامت کرتی تھیں۔[1]

وأخرج أبو داود في سننه عن الوليد بن جميع عن عبد الرحمن بن خلاد عن أم ورقة أن رسول الله ﷺ يزورها في بيتها، وجعل لها مؤذنا يؤذن لها، وأمرها أن تؤم أهل دارها.[2] و رواه الحاكم في المستدرك، ولفظه: أمرها أن تؤم أهل دارها في الفرائض،[3] وقد احتج مسلم بالوليد بن جميع، وقال المنذري في مختصره: الوليد بن جميع فيه مقال، وقد احتج له مسلم، وقال ابن القطان في كتابه: الوليد بن جميع و عبد الرحمن بن خلاد لا يعرف حالهما، قلت: ذكرهما ابن حبان في الثقات، وروى عبد الرزاق في مصنفه عن ابن عباس قال: تؤم المرأة النساء تقوم وسطهن.[4]

[امام ابو داود رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں ولید بن جمیع سے بیان کیا ہے، انھوں نے عبد الرحمٰن بن خلاد سے روایت کیا ہے، انھوں نے ام ورقہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے ہاں اس کے گھر میں ملنے کے لیے آیا کرتے تھے اور اس کے لیے ایک موذن مقرر کر رکھا تھا، جو اس کے لیے اذان دیتا ہے اور آپ ﷺ نے اسے (ام ورقہ) حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے۔ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں اسے روایت کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: "آپ ﷺ نے اسے (ام ورقہ) حکم دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کی فرائض میں امامت کرایا کرے۔" امام مسلم رحمہ اللہ نے ولید بن جمیع سے حجت پکڑی ہے۔ علامہ منذری رحمہ اللہ نے اپنی مختصر میں فرمایا ہے: ولید بن جمیع پر کلام ہے، جب کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اس سے احتجاج کیا ہے۔ ابن القطان رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں کہا ہے: ولید بن جمیع اور عبد الرحمٰن بن خلاد کا حال معلوم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ عبدالرزاق رحمہ اللہ

← پہنچ جائے تو جو شخص حیلہ ساز وابلہ فریب ہوگا، وہ بالائی کارروائی اور حیلہ وحوالہ سے کام لے گا اور دعوے کو مدلل نہ کر سکے گا اور جو ایسا نہ ہوگا، وہ دلائل پیش کرے گا۔ پس اگر فہم وتحقیق سے اختلاف پیدا ہوا ہے تو ایسے اشخاص کے پیچھے نماز ادا کرنا صحیح و درست ہے اور حیلہ ساز وابلہ فریب کے پیچھے نماز ادا کرنا ان کی حیلہ سازی پر سہارا لگا کر امداد کرنا ہے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ [المائدة: ٢]

وقال رسول الله ﷺ: «من كثر سواد قوم فهو منهم» والله تعالىٰ أعلم

اس کی سند میں انقطاع ہے۔ دیکھیں: المطالب العالية (١٣٩/٨) العاجز: عبد الجبار عمر پوری، كان الله له.

(یہ فتویٰ الگ ورق پر منقول تھا، جس پر مولانا عبدالجبار صاحب کا جواب بھی مع دستخط ومہر درج تھا، اس سے یہاں نقل کر لیا گیا)

[1] مصنف عبد الرزاق (٣/ ١٤٠) مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٤٣٠) نیز دیکھیں: تمام المنة (ص: ١٥٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٩٢)

[3] المستدرك (١/ ٣٢٠)

[4] مصنف عبد الرزاق (٣/ ١٤٠)

نے اپنی مصنف میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ عورت عورتوں کی امامت کرائے اور وہ ان کے وسط میں کھڑی ہو، یعنی مرد امام کی طرح آگے بڑھ کر کھڑی نہ ہو]

یہ سب روایتیں "نصب الراية لأحاديث الهداية" (ص: ۱۱۱) سے نقل کی گئی ہیں۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں آپس میں امام ومقتدی بن کر فرض نماز بھی اور غیر فرض بھی پڑھ سکتی ہیں اور جب فرض اور غیر فرض دونوں قسم کی نمازیں اس طرح پڑھ سکتی ہیں تو عید کی نماز کیوں نہیں پڑھ سکتیں؟ عید کی نماز بطریق اولیٰ پڑھ سکتی ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے:

"باب إذا فاته العيد يصلي ركعتين، وكذلك النساء، ومن كان في البيوت والقرىٰ، لقول النبيﷺ: «هذا عيدنا أهل الإسلام»"[1]

[اس بارے میں باب کہ جب آدمی کی نمازِ عید رہ جائے تو وہ دو رکعتیں ادا کرے اور عورتیں بھی ایسا ہی کریں اور وہ لوگ بھی جو گھروں اور بستیوں میں ہوں۔ اس کی دلیل نبیِ مکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے: یہ ہماری اہلِ اسلام کی عید ہے۔]

فتح الباری (۵۳۳/۴) میں ہے:

"وأشكلت مطابقته للترجمة علىٰ جماعة، وأجاب ابن المنير بأن ذلك يؤخذ من قولهﷺ: «إنها أيام عيد» فأضاف نسبة العيد إلى اليوم فيستوي في إقامتها الفذ والجماعة والنساء والرجال، قال ابن رشيد: وتتمته أن يقال إنها أيام عيد أي لأهل الإسلام بدليل قوله في الحديث الآخر: عيدنا أهل الإسلام، ولهذا ذكره البخاري في صدر الباب، وأهل الإسلام شامل لجميعهم أفرادا وجمعا، قال ووجدت بخط أبي القاسم بن الورد: لما سوغ صلى الله عليه وسلم للنساء راحة العيد المباحة كان آكد أن يندبهن إلى صلاته في بيوتهن، فيلتئم قوله في الترجمة: وكذلك النساء، مع قوله في الحديث: دعهما فإنها أيام عيد" والله تعالىٰ أعلم

[(اہلِ علم کی) ایک جماعت کو مذکورہ بالا حدیث کی ترجمۃ الباب کے ساتھ مطابقت مشکل محسوس ہوئی، جس کا جواب ابن المنیر نے یہ دیا ہے کہ یہ مطابقت آپ ﷺ کے اس فرمان سے نکالی جائے گی: "بلاشبہ وہ ایامِ عید ہیں۔" چناں چہ آپ ﷺ نے عید کی نسبت یوم کی طرف کی ہے۔ پس اس کو قائم کرنے میں اکیلا آدمی اور لوگوں کی ایک جماعت، عورتیں اور مرد سب برابر ہیں۔ ابن رشید نے کہا ہے کہ اس کا تتمہ یہ ہے کہ کہا جائے کہ یقیناً وہ ایامِ عید ہیں، یعنی اہلِ اسلام کے لیے، اس دلیل کے ساتھ کہ

[1] صحيح البخاري (۱/ ۳۳٤)

دوسری حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''ہم اہلِ اسلام کی عید۔''اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے باب کے شروع میں ذکر فرمایا ہے۔ اہل الاسلام کا لفظ ان کے تمام افراد اور پوری جماعت کو شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ابو القاسم بن الورد کے ہاتھ سے لکھا ہوا پایا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے لیے مباح راحتِ عید کو جائز قرار دیا تو تاکیدی بات یہی ہے کہ آپ ﷺ ان کو ان کے گھروں میں نمازِ عید پڑھنے کا حکم دیتے۔ لہٰذا امام بخاری رحمہ اللہ کا ترجمۃ الباب میں یہ لفظ ''وكذلك النساء'' (اور اسی طرح عورتیں) حدیث کے ان الفاظ: «دعهما فإنها أيام عيد» (ان کو (جہادی ترانے پڑھتی ہوئی) چھوڑ دو، بلاشبہہ یہ ایامِ عید ہیں) کے مطابق ہوجاتا ہے]

كتبه: محمد عبد الله (۳/ محرم ۱۳۳۵ھ)

نمازِ عیدین و جمعے کے بعد معانقہ ومصافحہ کرنے کی شرعی حیثیت:

سوال بعد نمازِ عیدین کے اور بعد نمازِ جمعہ کے مصافحہ اور معانقہ کرنا حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ جواب مع دلیل تحریر فرمائیے۔

جواب مصافحہ عند الملاقات عموماً حدیث سے ثابت ہے اور معانقہ عند قدوم المسافر بھی حدیث سے ثابت ہے۔ اس بارے میں کوئی حدیث میری نظر سے نہیں گزری ہے کہ بالخصوص بعد نمازِ عیدین اور جمعہ کے مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہیے۔ ہاں اگر بعد نمازِ عیدین اور جمعہ کے کسی سے ملاقات ہو تو مصافحہ کرے، اسی طرح اگر مسافر بعد نمازِ عیدین اور جمعہ کے آجائے تو اس سے معانقہ کرے۔ والله أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله.إنه لحق. كتبه: أبو العلىٰ محمد عبدالرحمن المباركفوري ـعفا الله عنه.

قربانی اور عقیقہ کے مسائل

قربانی کا جانور کتنی عمر کا ہو؟

سوال عیدِ اضحیٰ میں بکرا دانت والا یا فقط برس والا جائز ہوسکتا ہے یا نہ؟

جواب اضحیہ میں بکرا دانتا ہونا ضرور ہے۔

کون سے عیب والے جانور کی قربانی ممنوع ہے؟

سوال جس جانور کے جسم میں لوہے کا داغ دیا ہوا ہے اور اس داغ پر رُواں جم گیا ہے تو اُس جانور کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

جواب ایسے جانور کی قربانی جائز ہے، کیونکہ یہ اُن جانوروں میں سے نہیں ہے، جن کی قربانی کی ممانعت حدیث میں

مذکور ہے اور وہ حدیث یہ ہے:

عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال: «لا يضحىٰ بالعرجاء، بيّن ظلعها، ولا بالعوراء، بيّن عورها، ولا بالمرضاء، بيّن مرضها، ولا بالعجفاء التي لا تنقي»[1]

[براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایسے لنگڑے جانور کی قربانی نہ کی جائے، جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو، نہ ایسے کانے جانور کی، جس کا کانا پن واضح ہو، نہ ایسے بیمار کی، جس کی بیماری واضح ہو اور نہ ایسے انتہائی کمزور جانور کی، جس کی ہڈی میں گودا نہ ہو]

وعن علي رضی اللہ عنہ قال: أمرنا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم أن نستشرف العين والأذن، وأن لا نضحي بمقابلة ولا مدابرة ولا شرقاء ولا خرقاء.[2] (ترمذي، ص: ۱۹۲)

[علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانوروں کی) آنکھیں اور کان غور سے دیکھ لیا کریں اور ہم کسی ایسے جانور کی قربانی نہ کریں، جس کا کان آگے یا پیچھے سے کٹا ہوا ہو یا اس کے کان میں سوراخ ہو یا وہ چیرا ہوا ہو]

ان دو حدیثوں سے صرف لنگڑا، کانا اور مریض اور بہت ہی لاغر اور کان کٹے اور کان پھٹے جانوروں کی قربانی سے ممانعت ہے۔ واللہ أعلم بالصواب۔ کتبہ: محمد شعیب آروی. الجواب صحیح. کتبہ: محمد عبد اللہ

سوال جس جانور کا کان کٹا یا سینگ ٹوٹی یا پاؤں ٹوٹا یا ایک آنکھ پھوٹی یا دونوں آنکھ پھوٹی یا دانت ٹوٹا یا ان سب عضو میں سے اکثر چیز میں نقصان ہو تو اس جانور کی قربانی کرنی جائز ہے یا نہیں اور خصی اور گائے کا سن کیا ہونا چاہیے؟

جواب دانت ٹوٹے ہوئے جانور کی قربانی درست ہے، کیونکہ اس کا منع کہیں سے ثابت نہیں ہے۔ باقی مندرجہ سوال جانوروں کی قربانی جائز نہیں ہے۔

''عن علي رضی اللہ عنہ قال: أمرنا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم أن نستشرف العين والأذن، ولا نضحي بمقابلة ولا مدابرة ولا شرقاء ولا خرقا''[3]

(رواه الترمذي و أبو داود والنسائي و ابن ماجه، و انتهت روايته إلى قوله: و الأذن)

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا: ہم کو حکم کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہم قربانی کے جانوروں کی آنکھ اور کان دیکھ لیا کریں اور ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان آگے سے یا پیچھے سے کٹا ہو یا وہ کن پھٹا ہو یا جس کے کان میں چھید کیا گیا ہو۔''

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۴۹۷)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۴۹۸)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۸۰۴) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۴۹۸) سنن النسائي، رقم الحديث (۴۳۷۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۱۴۳)

”وعنه قال: نهىٰ رسول الله ﷺ أن نضحي بأعضب القرن والأذن“[1] (رواه ابن ماجه)

”اور انھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے جانور کی قربانی سے منع فرمایا، جس کی سینگ ٹوٹی یا کان کٹا ہو۔“

وعن البراء بن عازب أن رسول الله ﷺ سئل ما ذا يتقىٰ من الضحايا؟ فأشار بيده فقال: «أربعا: العرجاء البين ظلعها، والعوراء البين عورها، والمريضة البين مرضها، والعجفاء التي لا تنقي»[2] (رواه مالك و أحمد والترمذي و أبو داود والنسائي وابن ماجه والدارمي)

”براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ قربانی میں کن کن جانوروں سے پرہیز کرنا چاہیے؟ آپ نے اپنے دست مبارک سے اشارہ کر کے فرمایا کہ چار قسم کے جانور سے: ایک لنگڑے جانور سے جس کا لنگڑا ہونا ظاہر ہو۔ دوسرے کانے جانور سے جس کا کانا ہونا کھلا ہو۔ تیسرے بیمار جانور سے جس کی بیماری کھلی ہوئی ہو۔ چوتھے ایسے جانور سے جس کی ہڈیوں میں گودا نہ باقی ہے۔“

خصی اور گائے دانتا ہونا چاہیے اور بھیڑی بھیڑا جوان بھی کافی ہے، اگرچہ دانتا نہ ہو۔

عن جابر قال قال رسول الله ﷺ: «لا تذبحوا إلا مسنة إلا أن يعسر عليكم، فتذبحوا جذعة من الضأن» (رواه مسلم[3]، نصب الراية: ٢/ ٢٧٧)

”جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہ قربانی کرو مگر دانتا، مگر جبکہ دانتا تم پر دشوار ہو تو جوان بھیڑی فربہ۔“

قربانی کا حکم:

سوال قربانی فرض ہے یا واجب یا سنت اور کون شخص پر قربانی فرض یا واجب یا سنت ہے اور اس میں نصاب کی قید ہے یا نہیں؟

جواب قربانی کرنی واجب ہے۔

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: «من كان له سعة، ولم يضح فلا يقربن مصلانا»[4] (أخرجه ابن ماجه، ص: ٢٣٢)

”ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو اتنی وسعت ہو کہ قربانی کر سکے اور نہ کرے، وہ ہماری عید گاہ کے گرد بھی نہ پھٹکے۔“

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٠٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٠٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٤٥) مسند أحمد (١/ ٨٣)

② موطأ الإمام مالك (٢/ ٤٨٢) مسند أحمد (٤/ ٣٠١) سنن الدارمي (٢/ ١٠٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٧٠)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦٣)

④ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢٣) ... (٦٤٩٠)

اس حدیث میں باوجود وسعت کے قربانی نہ کرنے والے پر سخت وعید وارد ہوئی ہے اور ایسی وعید غیر واجب پر نہیں ہوتی ہے۔ اسی حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قربانی اُسی شخص پر واجب ہے جو قربانی کرنے کی وسعت رکھتا ہو اور اس میں نصاب کی قید ثابت نہیں ہے۔

کیا ایک بکری سارے گھر والوں کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے؟

سوال ایک بکری ایک گھر والے کی طرف سے قربانی کرنی جائز ہے یا نہیں؟

جواب جائز ہے۔

"عن عمارة بن عبد الله قال: سمعت عطاء بن يسار قال: سألت أبا أيوب كيف كانت الضحايا علىٰ عهد رسول اللهﷺ؟ فقال: كان الرجل يضحي بالشاة عنه وعن أهل بيته"[1]

''عمارہ بن عبداللہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: میں نے عطا بن یسار سے سنا، انھوں نے کہا: میں نے ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ کے عہدِ سعادت مہد میں قربانیوں کا کیا دستور تھا؟ انھوں نے کہا: ہر شخص اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری قربانی کر دیا کرتا تھا۔''

قربانی کے گوشت اور چمڑے کا مصرف:

سوال قربانی کے گوشت میں سے بطریق صدقہ یا بطریق دیگر مشرک و کافر مثلاً چمار وغیرہ کو دینا جائز ہے یا نہیں اور اس کے چمڑے کو فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد میں تیل و چٹائی وغیرہ کے واسطے صرف کرنا جائز ہے یا نہیں اور خون قربانی کے جانور کا اکثر دیہات میں چمار وغیرہ لے جایا کرتے ہیں تو ان کو اس کا خون دینا جائز ہے یا نہیں ہے؟ فقط

جواب قربانی کے گوشت میں یہ قید نہیں ہے کہ مسلمان ہی کو دیا جائے، نہ کافر کو اور جب یہ قید نہیں ہے، تو کافر کو بھی بطریق ہبہ یا بطورِ صدقہ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے اور قربانی کے چمڑے کو فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد کے تیل چٹائی وغیرہ میں صرف کرنا غیر قربانی کرنے والے کو جائز ہے، یعنی اگر قربانی کرنے والا کسی کو وہ چمڑہ دے دے اور وہ شخص اس چمڑے کو فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد کے تیل چٹائی وغیرہ میں صرف کر دے تو جائز ہے اور قربانی کرنے والے کو جائز نہیں، کیونکہ اس کو اپنی قربانی کا چمڑہ فروخت کرنا منع ہے۔ ہدایہ میں ہے:

قال عليه السلام: «من باع جلد أضحيته فلا أضحية له»[2] انتهى

[جس نے اپنی قربانی کی کھال فروخت کی، اس کی قربانی نہیں ہوئی]

تخریجِ زیلعی میں ہے:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٤٧)

[2] الهداية (٤/ ٧٦)

"رواه الحاكم في المستدرك في سورة الحج من حديث زيد بن الحباب عن عبد الله بن عياش المصري عن الأعرج عن أبي هريرة مرفوعاً بلفظه سواء، وقال: حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه، و رواه البيهقي في سننه"[1] انتهى

[امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی مستدرک میں سورۃ الحج کی تفسیر میں زید بن حباب سے روایت کیا ہے، انھوں نے عبد اللہ بن عیاش المصری سے، انھوں نے اعرج سے، انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے الفاظ میں برابر مرفوعاً روایت کیا ہے۔ نیز امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے، مگر بخاری و مسلم نے اسے روایت نہیں کیا ہے، امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اسے اپنی سنن میں روایت کیا ہے]

"وفي حديث قتادة بن النعمان أن النبي ﷺ قال: «استمتعوا بجلودها، ولا تبيعوها» كذا في المنتقى، وفي النيل حديث قتادة، ذكره صاحب الفتح، ولم يتعقبه مع جري عادته بتعقب ما فيه ضعف، وقال في مجمع الزوائد: إنه مرسل صحيح الإسناد"[2] انتهى

[قتادہ بن النعمان رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں ہے کہ یقیناً نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا: ان (قربانیوں) کی کھالوں سے فائدہ اٹھاؤ اور ان کو مت فروخت کرو۔" منتقی میں بھی ایسے ہی ہے۔ نیل میں قتادہ سے مروی حدیث ہے، جسے صاحب الفتح نے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس پر تعاقب نہیں کیا، باوجود اس کے کہ ان کی عادت یہ ہے کہ وہ اس حدیث پر تعاقب کرتے ہیں، جس میں ضعف ہوتا ہے۔ (ہیثمی نے) مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند صحیح ہے]

خون قربانی کے جانور کا خواہ اور کسی دم مسفوح کا چمار خواہ اور کسی کو دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ دم مسفوح حرام ہے، تو اس کا دینا اعانت علی المعصیہ ہے اور اعانت علی المعصیہ سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ [سورۂ مائدہ، رکوع:۱]

[اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو]

كتبه: محمد عبدالله. الجواب صحيح عندي، والله أعلم. أبو محمد ابراهيم. الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب.

قربانی کی کھال کا مصرف:

سوال ① جو مدرسہ عند اللہ رفاہِ عام مسلمانان کے واسطے قائم ہو اور اس کے قیام کی کوئی صورت ظاہراً نہ ہو، جس سے وہ مدرسہ قائم رہے، بجز اس کے کہ قربانی کا چمڑا اگر مل جائے تو مدرسہ قائم رہے گا۔ ایسی صورت میں چمڑا مذکور کو

① نصب الراية (٤/ ٢٨٧)

② نيل الأوطار (٥/ ١٩١)

مدرسہ میں دینا جائز ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ بوجہ دیہات کے چند اشخاص کا قول ہے کہ اگر علمائے دین مدرسہ میں دینے کو فرما دیں تو ہم لوگوں کو عذر نہیں ہے، ضرور دیں گے۔

(۲) جو لوگ اپنی قوتِ بازو سے اچھی طرح اپنی اوقات بسری کرتے ہیں، ان لوگوں کو بہ نیت اس کے کہ ہم قربانی کے مال کو ذبح کرتے ہیں، یہ حق ہمارا ہے، ہم لیں گے، ان کو لینا جائز ہے یا نہیں؟ یا جو شخص صاحبِ قربانی یہ تصور کر کے چمڑا قربانی کا ان لوگوں کو دے کہ ذبح کرنے کی اُجرت میں دیتے ہیں یا یہ تصور کر کے کہ اگر نہیں دیں گے تو ہمارے ساتھ عداوت کریں گے، ایسی حالت میں اس کی قربانی درست ہوئی یا نہیں؟ یا جو لوگ قربانی کا چمڑا مدرسہ میں دینے سے انکار کریں یا منع کریں کہ مت دو ہم کو دو، وہ کون ہوں گے: گنہگار ہوں گے یا نہیں؟ ازروئے قرآن شریف و حدیث شریف کے جو ثابت ہو، ساتھ ثبوت کے ارشاد فرمایا جائے۔

جواب جس طرح قربانی کے گوشت کا قربانی کرنے والے کو خود بھی کھانا اور دوسرے لوگوں کو بھی (فقیر ہو یا غنی) کھلانا اور دینا جائز ہے، اُسی طرح قربانی کا چمڑا قربانی کرنے والے کو خود بھی اپنے تصرف میں اور دوسرے لوگوں کو بھی، جس کو چاہے، دے دینا جائز ہے اور جس طرح قربانی کے گوشت کا قربانی کرنے والے کو بیچنا یا کسی کو اُجرت میں دینا جائز نہیں ہے اور جس طرح قربانی کے گوشت کا طلبہ اور مدرسین کو دینا جائز ہے، اسی طرح قربانی کے چمڑا کا بھی ان لوگوں کو بھی دینا جائز ہے اور اگر قربانی کے گوشت یا چمڑے کو قربانی کرنے والا بیچے یا کسی کو اُجرت میں دے تو اس کی قربانی درست نہیں ہوئی۔

عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: أمرني رسول الله ﷺ أن أقوم على بدنه، وأن أتصدق بلحومها وجلودها وجلالها، وأن لا أعطي الجازر منها شيئا: وقال: «نحن نعطيه من عندنا»[1] (متفق عليه)

[علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ ﷺ کے اونٹوں کے پاس کھڑا ہو جاؤں (جب کہ وہ نحر کیے جا رہے تھے) اور ان کے گوشت، چمڑے اور جھول تقسیم کر دوں، قصاب کو ان میں سے کوئی چیز نہ دوں اور فرمایا: ہم اس (قصاب) کو (اس کی مزدوری) ہم اپنے پاس سے دیں گے]

وعن أبي سعيد أن قتادة بن النعمان أخبره أن النبي ﷺ قام فقال: «إني كنت أمرتكم أن لا تأكلوا لحوم الأضاحي فوق ثلاثة أيام ليسعكم، وإني أحله لكم فكلوا ما شئتم، ولا تبيعوا لحوم الهدي والأضاحي، وكلوا وتصدقوا واستمتعوا بجلودها، ولا تبيعوها، وإن أطعمتم من لحومها شيئاً فكلوا إلىٰ ما شئتم»[2] (رواه أحمد، المنتقى)

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣١٧)

(2) مسند أحمد (٤/ ١٥) منتقىٰ الأخبار مع شرحه نيل الأوطار (٥/ ١٩١)

[ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قتادہ بن نعمان نے ان کو خبر دی کہ یقیناً نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا: میں نے تم کو قربانیوں کے گوشت تین دن سے زیادہ کھانے سے منع کر رکھا تھا، تا کہ وہ تم تمام کو پہنچ جائیں، یقیناً اب میں ان کو تمھارے لیے (تین دن سے زیادہ کھانا) حلال کرتا ہوں، لہٰذا جب تک چاہو کھاؤ۔ ہدی اور اضاحی کا گوشت فروخت نہ کرو۔ کھاؤ، صدقہ کرو اور ان کے چمڑوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ ان (چمڑوں) کو نہ بیچو۔ اگر تم ان کے گوشت میں سے کچھ کھلا دو تو جتنی دیر تک چاہو ان کو کھاؤ]

قال عليه الصلاة والسلام: «من باع جلد أضحيته فلا أضحية له» رواه الحاكم في المستدرك في سورة الحج من حديث زيد بن الحباب عن عبد الله بن عياش المصري عن الأعرج عن أبي هريرة رضي الله عنه، وقال: حديث صحيح الإسناد، ولم يخرجاه، ورواه البيهقي في سننه. (نصب الراية لأحاديث الهداية: ٢/ ٢٧٩)

وقال الحافظ المنذري رحمه الله في كتاب الترغيب والترهيب: وقد جاء في غير ما حديث عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم النهي عن بيع جلد الأضحية.[1] والله تعالىٰ أعلم

[آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: جس نے اپنی قربانی کی کھال بیچی، اس کی قربانی نہیں ہوئی۔ اس کو حاکم نے مستدرک میں سورۃ الحج کی تفسیر زید بن الحباب کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے عبداللہ بن عیاش المصری سے روایت کیا ہے، انھوں نے اعرج سے روایت کیا، انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور فرمایا کہ اس کو بخاری و مسلم نے روایت نہیں کیا۔ نیز امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ (نصب الراية لأحاديث الهداية: ٢/ ٢٧٩)

حافظ منذری رحمہ اللہ نے کتاب "الترغيب والترهيب" میں کہا ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی ایک روایات مروی ہیں، جن میں قربانی کی کھال فروخت کرنے سے منع فرمایا گیا ہے]

كتبه: عبد الله (١٩/ ذي القعده ١٣٢٩هـ)

سوال اپنی قربانی کی کھال قربانی کرنے والے شخص کو بیع کرنی جائز ہے یا نہیں یا مساکین کو کھال ہی دے دینا چاہیے اور اگر مساکین اجازت دیں تو قربانی کرنے والے شخص کو بیع کرنی جائز ہے یا نہیں؟

جواب قربانی کرنے والے کو اپنی قربانی کی کھال بیع کرنی جائز نہیں ہے، خواہ کوئی اجازت دے یا نہیں، کیونکہ حدیث میں مطلقاً منع ہے۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه مرفوعاً: «من باع جلد أضحيته فلا أضحية له»[2]

(رواه الحاكم في المستدرك في تفسير سورة الحج، وقال: صحيح الإسناد، و رواه البيهقي في سننه، نصب الراية: ٢/ ٢٧٩)

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جس نے اپنی قربانی کی کھال بیچی، اُس کی قربانی نہیں۔"

---

(1) الترغيب والترهيب (٢/ ١٠١)

(2) المستدرك للحاكم (٢/ ٤٢٢) سنن البيهقي (٩/ ٢٩٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١١٨)

قربانی کی کھال مسجد پر خرچ کرنے کا حکم:

سوال چرمِ قربانی کی قیمت مسجد میں صَرف ہوسکتی ہے یا نہیں؟ خاص کر اس مسجد میں جس کی مرمت کی دوسری صورت نہ ہو؟

جواب قربانی کرنے والا اپنی قربانی کے چرم کی قیمت مسجد میں نہیں صَرف کر سکتا، اس لیے کہ قربانی کرنے والے کو اپنے چرمِ قربانی کا بیچنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر قربانی کرنے والا اپنا چرمِ قربانی کسی شخص کو دے دے اور چرم مذکور کا اسے مالک بنا دے اور وہ شخص بخوشی خاطر اپنے چرم مذکور کو بیچ کر اس کی قیمت مسجد میں صَرف کرے تو یہ صورت جائز ہے۔ ''نصب الرایۃ في تخریج أحادیث الهدایۃ'' (۲/ ۲۷۹) میں ہے:

''الحديث السادس عشر: قال ﷺ: «من باع جلد أضحيته فلا أضحية له» قلت: رواه الحاكم في المستدرك في تفسير سورة الحج من حديث زيد بن الحباب عن عبدالله بن عياش المصري عن الأعرج عن أبي هريرة مرفوعاً بلفظه سواء، وقال: حديث صحيح الإسناد، ولم يخرجاه. انتهى، ورواه البيهقي في سننه''[1]

[سولھویں حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنی قربانی کی کھال کو بیچے گا، اس کی قربانی (قبول) نہیں ہوگی۔'' میں کہتا ہوں کہ اسے امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں سورۃ الحج کی تفسیر میں زید بن حباب کی حدیث سے روایت کیا ہے، انھوں نے عبداللہ بن عیاش المصری سے روایت کیا ہے، انھوں نے اعرج سے روایت کیا ہے، انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بالکل انھی الفاظ میں مرفوعاً روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور بخاری و مسلم نے اسے روایت نہیں کیا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اسے اپنی سنن میں روایت کیا ہے]

وفي مسند الإمام أحمد رحمہ اللہ (٤/ ١٥) عن أبي سعيد الخدري أن قتادة بن النعمان أخبره أن النبي ﷺ قام فقال: «إني كنت أمرتكم أن لا تأكلوا [الأضاحي] فوق [ثلاثة] أيام ... » الحديث وفيه: «ولا تبيعوا لحوم الهدي والأضاحي، فكلوا وتصدقوا واستمتعوا بجلودها ولا تبيعوها»[2]

[مسند امام احمد رحمہ اللہ میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے ان کو خبر دی کہ یقیناً نبیِ مکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر فرمایا: ''میں نے تم کو حکم دیا تھا کہ تم [قربانیوں کے گوشت] (تین) دن سے زیادہ نہ کھاؤ...الحدیث۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں: ہدی اور اضاحی کے گوشت فروخت نہ کرو، لہٰذا تم کھاؤ، صدقہ کرو، ان کے چمڑوں سے فائدہ اٹھاؤ اور ان کو مت بیچو]

---

[1] المستدرك للحاكم (٢/ ٤٢٢) سنن البيهقي (٩/ ٢٩٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١١٨)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٥)

وفي الترغيب والترهيب للحافظ المنذري رحمه الله: "وقد جاء في غير ما حديث عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم النهي عن بيع جلد الأضحية"[1] انتهى. والله تعالىٰ أعلم

[حافظ منذری رحمہ اللہ کی ترغیب و ترہیب میں ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ایک احادیث میں قربانیوں کی کھالیں بیچنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے]

کتبہ: محمد عبد الله (٢٤/ ذیقعدہ ١٣٢٧ھ) الجواب صحيح. كتبه: أبو يوسف محمد عبدالمنان.

سوال قربانی کی کھال سے مسجد کی مرمت کرنا چاہیے یا نہیں؟

جواب قربانی کی کھال مسجد میں صَرف کرنا خود قربانی کرنے والے کو جائز نہیں ہے۔ ہاں کسی شخص کو دے کر اس کو اس کھال کا مالک بنا دے اور وہ اپنی خوشی سے اس کو بیچ کر اس کی قیمت سے مسجد کی مرمت کرے تو کر سکتا ہے۔

زیلعی (ص: ٣٧٩) میں ہے:

"روى الحاكم في المستدرك عن أبي هريرة قال عليه السلام: «من باع جلد أضحيته فلا أضحية له» وقال: حديث صحيح الإسناد، ولم يخرجاه، ورواه البيهقي في سننه"[2] اھ

[امام احاکم رحمہ اللہ نے ''مستدرک'' میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنی قربانی کی کھال فروخت کرے گا، اس کی قربانی (قبول) نہیں ہوگی۔'' امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے، اور بخاری و مسلم نے اسے روایت نہیں کیا ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اسے اپنی سنن میں روایت کیا ہے]

وقال الحافظ عبد العظيم المنذري في كتاب الترغيب والترهيب: وقد جاء في غير ما حديث عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم النهي عن بيع جلد الأضحية"[3] اھ والله أعلم

[حافظ عبد العظیم المنذری رحمہ اللہ نے کتاب ''الترغیب والترھیب'' میں کہا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کئی ایک احادیث میں قربانی کی کھال فروخت کرنے سے منع فرمایا گیا ہے]

کتبہ: محمد عبد الله (٢٤/ ذیقعدہ ١٣٣٠ھ)

قربانی کی کھال قصاب کو دینے کا حکم:

سوال قصاب سے اور قربانی کرنے والے شخص سے معاہدہ ہے کہ کھال کا نرخ گو کتنا ہی ہو، لیکن قصاب کو ایک نرخ معین پر دی جائے گی اور اس میں قصاب کی رعایت بھی ملحوظ ہے، یعنی قیمت کم معین کی گئی تو جائز ہے یا نہیں اور قربانی

[1] الترغيب والترهيب (٢/ ١٠١)

[2] نصب الراية للزيلعي (٤/ ٢٨٧)

[3] الترغيب والترهيب (٢/ ١٠١)

میں خلل واقع ہوا یا نہیں؟

جواب جواب نمبر ④ سے جواب نمبر ⑤ کا ظاہر ہے، کیونکہ اس میں بھی قربانی کرنے والے کا اپنی قربانی کی کھال کا بیچنا ہے، جو ناجائز ہے اور اس میں جو معاہدہ ہے وہ ناجائز ہے، مزید براں ایک اور امر بھی ناجائز ہے، وہ یہ کہ جس قدر قصاب کی رعایت ملحوظ ہوگی، اُس قدر قربانی کی کھال اُجرت میں محسوب ہوگی اور قربانی کی کھال کل ہو، خواہ بعض، قصاب کی اجرت پر دینا ناجائز ہے۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

قربانی کے گوشت کا حکم:

سوال ایک شخص زندہ ہے۔ وہ شخص باقی چھ حصے گائے میں مُردوں کی جانب سے قربانی کر کے تمام گوشت کو کھا سکتا ہے یا تیسرا حصہ مساکین کو تقسیم کر کے اور مُردوں کی جانب کا حصہ صدقہ ہوگا تو اپنے حصے کا گوشت قربانی کرنے والا شخص صاحبِ نصاب کھا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب قربانیٔ کے گوشت کے بارے میں یہ حکم ہے کہ «کلوا و أطعموا و ادخروا»[1] یعنی کھاؤ اور کھلاؤ اور دوسرے وقتوں کے لیے رکھ چھوڑو۔ ایک حدیث میں ہے:

«کلوا وادخروا و تصدقوا»[2] کھاؤ اور دوسرے وقتوں کے لیے رکھ چھوڑو اور صدقہ کرو۔

ایک حدیث میں ہے:

«کنت نهيتكم عن لحوم الأضاحي فوق ثلاث ليتسع ذو الطول على من لا طول له، فكلوا ما بدا لكم، وأطعموا، وادخروا»[3]

یعنی وسعت والے بے وسعت والے پر وسعت کریں، یعنی صدقہ کریں، اس کے بعد کھاؤ جتنا چاہو اور کھلاؤ اور دوسرے وقتوں کے لیے رکھ چھوڑو۔

یعنی قربانی کے گوشت میں ان سب مذکورہ بالا باتوں کا اختیار ہے۔ صورت مسئولہ میں اس کے سوا کوئی حکم میری نظر سے نہیں گزرا ہے، بلکہ ذیل کی حدیث سے یہی حکم اس صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ومن ادعى خلاف ذلك فعليه البيان. وہ حدیث یہ ہے:

عن علي بن الحسين عن أبي رافع أن رسول اللہ ﷺ كان إذا ضحىٰ اشترى كبشين سمينين أقرنين أملحين، فإذا صلىٰ وخطب الناس أتي بأحدهما، وهو قائم في مصلاه فذبحه بنفسه بالمدية، ثم يقول: «اللهم إن هذا عن أمتي جميعاً، ممن شهد لك بالتوحيد،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٤٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٧١)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥١٠)

وشهد لي بالبلاغ » ثم يؤتىٰ بالآخر فيذبحه بنفسه فيقول: «هذا عن محمد وآل محمد » فيطعمهما جميعا المساكين، ويأكل هو وأهله منهما. الحديث[1] والله تعالىٰ أعلم

[علی بن حسین ابو رافع سے روایت کرتے ہیں کہ بلاشبہہ ابو رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قربانی کرنے کا ارادہ کرتے تو دو موٹے تازے، سینگوں والے اور چتکبرے مینڈھے خریدتے۔ پھر جب آپ ﷺ نمازِ عید پڑھا کر لوگوں کو خطبہ دے لیتے، اس حال میں کہ آپ ﷺ اپنی عید گاہ میں کھڑے ہوتے، تو ان دونوں میں سے ایک لایا جاتا تو چھری کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے اسے ذبح کرتے۔ پھر فرماتے: ''اے اللہ! یہ میری امت کے ان تمام افراد کی طرف سے ہے، جنھوں نے تیری توحید کی گواہی دی ہے اور میرے ان تک (تیرا یہ پیغام) پہنچانے کی گواہی دی ہے۔'' پھر دوسرا مینڈھا لایا جاتا تو اسے بھی آپ ﷺ اپنے ہاتھوں سے ذبح کرتے اور پھر فرماتے: ''یہ محمد (ﷺ) اور آلِ محمد (ﷺ) کی طرف سے ہے۔'' پھر ان دونوں مینڈھوں کا گوشت مساکین، آپ ﷺ خود اور آپ ﷺ کے اہل و عیال سبھی لوگ کھاتے]

قربانی کا جانور فروخت کرنے کا حکم:

سوال کسی شخص نے بہ نیتِ قربانی عید الاضحیٰ ایک جانور جو عید الاضحیٰ میں قربانی ہوتا ہے، خریدا، بعد خریدنے کے کچھ نفع ملا تو فروخت کر دیا، پھر دوسرا جانور خرید کر عید الاضحیٰ میں قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب دوسرا جانور خرید کر عید الاضحیٰ میں قربانی کرنے سے تو قربانی ادا ہو جائے گی، لیکن سابق جانور کے فروخت کرنے میں جو نفع ملا ہے، اس کو بھی صدقہ کر دینا ہوگا۔

"عن حكيم بن حزام رضي الله عنه أن رسول الله ﷺ بعث معه بدينار ليشتري له به أضحية فاشترىٰ كبشا بدينار، وباعه بدينارين، فرجع فاشترى أضحية بدينار فجاء بها، وبالدينار الذي استفضل من الأخرى فتصدق رسول الله ﷺ بالدينار فدعا له أن يبارك له في تجارته"[2] (رواه الترمذي وأبو داود، مشكوة شريف، چھاپه أنصارى دهلى، ص: ٢٤٦)

[حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک دینار دے کر بھیجا کہ وہ آپ ﷺ کے لیے قربانی خرید لائیں، چناں چہ انھوں نے ایک دینار میں جانور خریدا اور پھر اسے دو دینار میں فروخت کر دیا اور پھر لوٹتے ہوئے ایک دینار میں سے دوسرا جانور خریدا، چناں چہ انھوں نے اس جانور

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٣٩١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٨٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٥٧) اس حدیث کی سند میں ایک راوی مجہول اور انقطاع ہے، جس کی وجہ سے حدیث ضعیف ہے۔

کے ساتھ وہ دینار بھی آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا، جو پہلے جانور سے بچ گیا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے وہ دینار صدقہ کر دیا اور ان (حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ) کے لیے تجارت میں برکت کی دعا فرمائی]

کیا ہرن کی قربانی کرنا درست ہے؟

سوال زید نے ایک ہرن بچپن سے پرورش کیا ہے، جس کی عادت بالکل اہلی جانوروں کی ہوگئی ہے، یعنی جس طرح اور جانور اپنے مکان وغیرہ جانتے ہیں، وہ پہچانتا ہے۔ اب زید اس کی قربانی کرنا چاہتا ہے، آیا بصداقتِ احادیث قربانی ہرن مذکور کی جائز ہے یا نہیں؟

جواب احادیث صحیحہ سے صرف تین چیزوں کی قربانی ثابت ہے: ① شتر ② گاؤ ③ بز۔[1] ان کے سوا اور کسی چیز کی (خواہ اہلی جانور ہو، خواہ صحرائی اور صحرائی بھی مانوس ہو یا غیر مانوس) قربانی ثابت نہیں ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

[فارسی میں ''بز'' گوسپند کے معنی میں ہے اور گوسپند بکری کو کہتے ہیں، گوسپند میش کے معنی میں بز کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ عربی زبان میں معز ضان کے مقابلے میں ہے، جیسا کہ قاموس اور صراح سے مستفاد ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ گوسفند کا اطلاق میش اور بز ہر دو پر ہوتا ہے]

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

اگر جانور خریدنے کے باوجود قربانی نہ کرے؟

سوال زید نے ایک جانور بارادہ قربانی خرید کیا اور کسی وجہ سے اس کی قربانی نہیں ہوئی اور ایامِ قربانی گزر گئے۔ اب اس جانور کی قربانی دوسرے سال یا قضا درمیان سال کے جائز ہوگی یا نہیں اور اگر دوسرے سال جائز ہو تو ادا ہوگی یا قضا اور اس جانور کو دوسرے مصرف میں مثل عقیقہ یا ولیمہ وغیرہ کے لانا درست ہے یا نہیں؟ اس کا جواب قرآن و حدیث صحیح سے ارقام فرمائیں۔

جواب اس صورت میں کہ اگر کوئی شخص بہ نیتِ اضحیہ جانور خریدے اور کسی وجہ سے قربانی نہ کرے اور ایامِ قربانی گزر جائیں تو اس جانور کو کیا کرے؟ کسی آیت یا حدیث سے اس کا صاف صاف پتا نہیں چلتا، لیکن اگر اس مسئلے کو مسئلہ ہَدْیِ عمرہ پر، جو حدیث صحیح میں وارد ہے، قیاس کریں تو اس سے یہ بات ثابت ہوگی کہ ایسے شخص کو درمیان سال کے اس جانور کی قربانی کرنی چاہیے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ۶ھ میں حضرت رسولِ خدا ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کے قصد سے احرام باندھے ہوئے مکہ معظّمہ کو روانہ ہوئے۔ مکہ والوں نے آگے بڑھ کر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ میں جانے اور

---

[1] ''بز'' در فارسی بمعنی گوسپند کہ آں را بکری گویند، گوسپند بمعنی میش مقابل بز، چنانکہ معز در عربی مقابل ضان است کما یستفاد من القاموس والصراح. وبعضے نوشتہ اند کہ اطلاق گوسفند بر میش و بز ہر دو آمدہ از سراج انتہی۔ غیاث اللغات [عبد السمیع]

عمرہ کرنے سے حدیبیہ کے مقام میں روک دیا، ہر چند اس طرف سے کہا گیا کہ ہم لوگ صرف عمرہ کرنے کو آئے ہیں، عمرہ کر کے چلے جائیں گے، لڑنے کو نہیں آئے ہیں۔ تب بھی مکہ والوں نے نہیں مانا اور اس سال عمرہ کرنے سے روک دیا۔ بہ مجبوری آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے عمرہ کا احرام اتارا اور ہدیِ عمرے، یعنی جانور جو عمرہ میں قربانی کرنے کے لیے ساتھ لائے تھے، ان کو ذبح کیا۔ حالانکہ ہدیِ عمرہ کے ذبح کرنے کی جگہ شرعاً مقرر ہے، وہ حرم ہے، نہ کہ حرم سے خارج اور یہ جگہ جہاں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے ذبح کیا تھا، حرم سے خارج ہے، جیسا کہ سورۃ الفتح (پارہ: ۲۶، رکوع: ۱۱) ﴿ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ﴾ [یہ وہی لوگ ہیں، جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی، اس حال میں کہ وہ اس سے روکے ہوئے تھے کہ اپنی جگہ تک پہنچیں] سے ظاہر ہے۔ نیز صحیح بخاری میں ہے:

"والحديبية خارج من الحرم"[1] اھ [حدیبیہ حرم سے خارج ہے] فتح الباری (۲/۱۹۳ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

"هو من كلام الشافعي في الأم، وعنه أن بعضها في الحل، وبعضها في الحرم، لكن إنما نحر رسول اللهﷺ في الحل، استدلالا بقوله تعالىٰ: ﴿وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ﴾ قال: ومحل الهدي عند أهل العلم الحرم، وقد أخبر الله تعالىٰ أنهم صدوهم عن ذلك" اھ

[یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا کلام ہے۔ ان سے مروی ہے کہ اس (حدیبیہ) کا کچھ حصہ حل میں اور کچھ حرم میں ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے حل میں نحر کیا، اس کی دلیل یہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ﴾ [الفتح: ۲۵] [اور تمھیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی، اس حال میں کہ وہ اس سے روکے ہوئے تھے کہ اپنی جگہ تک پہنچیں] امام صاحب نے کہا کہ اہلِ علم کے نزدیک ہدی کے ذبح کرنے کی جگہ حرم ہے اور اللہ تعالیٰ نے (مذکورہ بالا فرمان میں) یہ خبر دی ہے کہ انھوں نے ان (مسلمانوں) کو اس سے روکا]

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

"قال: خرجنا مع النبيﷺ معتمرين فحال كفار قريش دون البيت فنحر رسول اللهﷺ بدنه وحلق رأسه"[2]

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم نبیِ مکرم ﷺ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے نکلے تو کفارِ قریش بیت اللہ کے سامنے حائل ہوگئے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے (حدیبیہ ہی میں قربانی کا جانور) اپنا اونٹ نحر

[1] صحيح البخاري (٢/ ٦٤٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧[illegible])

کیا اور سر منڈوایا]

مسور بن مخرمہ وغیرہ کی حدیث میں ہے:

"فلما فرغ من قضية الكتاب قال رسول اللهﷺ: «قوموا فانحروا، ثم احلقوا» ... إلى قوله: فلما رأوا ذلك قاموا فنحروا"[1]

[جب عہد نامہ کی تحریر سے فراغت ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے (اپنے صحابہ سے) فرمایا: "اٹھو! قربانیاں کرو اور پھر اپنے سر مونڈلو" ... جب انھوں نے یہ (نبی اکرم ﷺ کو اپنا جانور نحر کرتے ہوئے) دیکھا تو وہ اٹھے اور انھوں نے قربانیاں کیں]

اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگر عمرے میں کوئی شخص بارادہ قربانی جانور خرید کرے اور حرم تک، جو اس کے ذبح کی جگہ شرعاً مقرر ہے، لے جانے سے روکا جائے تو اس کو جہاں روکا گیا ہے ذبح کر دینا چاہیے اور اس کے حق میں حرم کی تخصیص ساقط ہے، تو جس طرح ہدیِ عمرہ کے ذبح کی ایک خاص جگہ حرم مقرر ہے، اسی طرح ذبحِ اضحیہ کا ایک خاص وقت (بقرعید کا دن یا اس کے بعد تک کئی دن) مقرر ہے۔ فرق دونوں میں سے صرف جگہ اور وقت کا ہے تو جس طرح ہدی میں مجبوری کی حالت میں جگہ کی قید ساقط ہوجاتی ہے، اسی طرح اضحیہ میں بھی مجبوری کی حالت میں قیاساً علیہ وقت کی قید ساقط ہوسکتی ہے۔ اگر اس مسئلے کو نماز کے مسئلے پر قیاس کریں تو اس سے بھی وہی ثابت ہوگا، جو مسئلہ ہدیِ عمرہ پر قیاس کرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو اثنائے سال میں اس جانور کی قربانی کرنی چاہیے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ نمازِ پنجگانہ کے اوقات مقرر ہیں اور یہ بات سب لوگ جانتے ہیں۔ سورت نساء (رکوع: ۱۵) میں ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَوٰةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَٰبًا مَّوْقُوتًا﴾ [النساء: ۱۰۳]

[بے شک نماز ایمان والوں پر ہمیشہ سے ایسا فرض ہے جس کا وقت مقرر کیا ہوا ہے]

حالانکہ احزاب کی لڑائی ہی میں مجبوری سے ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نہیں پڑھ سکے۔ جب لڑائی سے فارغ ہوئے، تب عشا کے وقت چاروں نمازیں آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے اصحاب نے اکٹھی پڑھیں تو جس طرح نمازوں کا وقت شرع میں مقرر ہے، اسی طرح اضحیہ کا وقت بھی شرع میں مقرر ہے اور جس طرح مجبوری کی حالت میں نمازوں میں وقت کی قید ساقط ہوگئی، اسی طرح مجبوری کی حالت میں اضحیہ میں بھی قیاساً علیہ وقت کی قید ساقط ہوسکتی ہے۔ یعنی اگر بوجہ مجبوری وقتِ مقرر پر قربانی نہ ہوسکے تو جب مجبوری رفع ہوجائے، اس وقت قربانی کرے اور اس قربانی کو باصطلاحِ فقہا قضا کہیں گے، کیونکہ ادا و قضا میں باصطلاحِ فتہا یہی فرق ہے کہ جس کام کا جو وقت شرعاً مقرر ہے، اگر اس کو اس کے وقت پر کیا تو اس کا نام ادا ہے اور وقت مقرر کے گزر جانے پر کیا تو قضا ہے۔ واضح رہے کہ ان دونوں قیاسوں سے صرف اسی شخص کے حق میں وقت کی قید کا سقوط ثابت

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۸۱)

ہوگا، جس نے قربانی وقت مقرر پر بوجہ مجبوری نہیں کی، نہ اس شخص کے حق میں جس نے بلا عذر وقت مقرر پر قربانی نہیں کی۔ اس کے حق میں وقت کی قید کا سقوط ان قیاسوں سے ثابت نہیں ہوگا اور کوئی دوسری دلیل جس سے آخر الذکر شخص کی نسبت کوئی حکم ثابت ہو، اس وقت پیشِ نظر نہیں ہے۔ لعل الله يحدث بعد ذلك أمرا. والله تعالىٰ أعلم بالصواب

میت کی طرف سے قربانی کا حکم:

سوال مردہ کی طرف سے قربانی ہوسکتی ہے یا نہیں اور اس قربانی کا گوشت قربانی کرنے والا یا اس کے گھر والے کھا سکتے ہیں یا نہیں اور اونٹ اور گائے کی قربانی جس میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں، اس میں مردہ بھی شریک کیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب مجھے نہ اس کی کوئی دلیل معلوم ہے کہ مردہ کی طرف سے قربانی نہیں ہوسکتی اور نہ اس کی کہ اس قربانی کا گوشت قربانی کرنے والا یا اس کے گھر والے نہیں کھا سکتے اور نہ اس کی کہ اونٹ اور گائے کی قربانی میں مردہ شریک نہیں کیے جا سکتے، بلکہ منقولہ ذیل حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردہ کی طرف سے [قربانی] ہوسکتی ہے اور اس قربانی کا گوشت قربانی کرنے والا اور اس کے گھر والے اور مساکین سب کھا سکتے ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے:

عن أبي رافع أن رسول الله ﷺ كان إذا ضحىٰ اشترى كبشين سمينين أقرنين أملحين، فإذا صلىٰ وخطب الناس أتي بأحدهما، وهو قائم في مصلاه، ذبحه بنفسه بالمدية، ثم يقول: «اللهم إن هذا عن أمتي جميعا، ممن شهد لك بالتوحيد، وشهد لي بالبلاغ» ثم يؤتىٰ بالآخر فيذبحه بنفسه، ويقول: «هذا عن محمد وآل محمد» فيطعمهما جميعا المساكين، ويأكل هو وأهله منهما.[1] الحديث (المنتقىٰ، ص: ١٧٢) والله تعالىٰ أعلم

[ابو رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قربانی کرنے کا ارادہ کرتے تو دو موٹے تازے، سینگوں والے اور چتکبرے مینڈھے خریدتے۔ پھر جب آپ ﷺ نمازِ عید پڑھا کر لوگوں کو خطبہ دے لیتے، اس حال میں کہ آپ ﷺ اپنی عید گاہ میں کھڑے ہوتے، تو ان دونوں میں سے ایک لایا جاتا تو چھری کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے اسے ذبح کرتے۔ پھر فرماتے: "اے اللہ! یہ میری امت کے ان تمام افراد کی طرف سے ہے، جنھوں نے تیری توحید کی گواہی دی ہے اور میرے ان تک (تیرا یہ پیغام) پہنچانے کی گواہی دی ہے۔" پھر دوسرا مینڈھا لایا جاتا تو اسے بھی آپ ﷺ اپنے ہاتھوں سے ذبح کرتے اور پھر فرماتے: "یہ محمد (ﷺ) اور آلِ محمد (ﷺ) کی طرف سے ہے۔" پھر ان دونوں مینڈھوں کا گوشت مساکین، آپ ﷺ خود اور آپ ﷺ کے اہل و عیال سبھی لوگ کھاتے] كتبه: محمد عبدالله (٣/ ذى الحجه ٢٦هـ)

[1] مسند أحمد (٦/ ٣٩١)

کیا گائے میں میت کی طرف سے حصہ ڈالا جا سکتا ہے؟

سوال ایک گائے میں سات آدمی جو شریک ہوتے ہیں، ان ساتوں میں اگر بعض مُردہ بھی شریک کر لیے جائیں تو درست ہے یا نہیں اور اس مُردہ کے حصہ کا گوشت اس کے برادری والے کھا سکتے ہیں یا نہیں یا بالکل ہی خراب کر دیا جائے؟

جواب اُن ساتوں میں اگر معین مردے بھی شریک کر لیے جائیں تو جائز ہے، اس لیے کہ اس میں اس قدر ہونا چاہیے کہ جملہ شرکا کی نیت تقرب کی ہو اور مردہ شریک کر لینے میں تقرب کی نیت فوت نہیں ہوتی اور اُس مردہ کے حصے کے گوشت کا وہی حکم ہے جو قربانی کے گوشت کا حکم ہے، کیونکہ وہ بھی تو قربانی ہی کا گوشت ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ

عقیقہ میں گائے اور اونٹ ذبح کرنے کا حکم:

سوال اگر کوئی شخص عقیقہ میں گائے ذبح کرے تو اس میں مثل اضحیہ کے سات عقیقہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس بارے میں کوئی نص میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ ہاں قیاساً علی الاضحیہ جائز ہے، بشرطیکہ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع: «یعق عنه من الإبل والبقر والغنم»[1] [اس (بچے) کی طرف سے اونٹ، گائے اور بکری کے ساتھ عقیقہ کیا جائے] جو نیل الاوطار میں، طبرانی اور ابو شیخ کے حوالے سے منقول ہے، قابلِ احتجاج ہو، مگر چونکہ ایسی کوئی کتاب، جس میں اس حدیث کی اِسناد یا ائمہ حدیث میں سے جو متساہل نہ ہوں، ان کی تصحیح یا تحسین منقول ہو، میرے پاس موجود نہیں ہے، لہٰذا میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ عقیقہ کا قیاس اضحیہ پر صحیح ہے یا نہیں؟ نیل الاوطار (۴/ ۳۷۴) میں جو یہ عبارت منقول ہے: "ونص أحمد علیٰ أنها تشترط بدنة أو بقرة كاملة" [امام احمد رحمہ اللہ نے یہ صراحت کی ہے کہ اس (عقیقے) میں مکمل اونٹ اور گائے کی شرط لگائی جاتی ہے]

سو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اس قیاس کو صحیح نہیں جانا اور امام رافعی کے قول: "ویجوز اشتراك سبعة في الإبل والبقر كما في الأضحية" [اونٹ اور گائے میں قربانی کی طرح (عقیقے میں) سات حصے داروں کی شراکت جائز ہے] سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس قیاس کو صحیح سمجھا، مگر یہ نہیں بتایا کہ ان دونوں (عقیقہ اور اضحیہ) میں جامع کیا ہے کہ اس پر غور کیا جائے اور اگر جامع ان دونوں میں "تقرب بإراقة الدم" [خون

---

[1] المعجم الصغیر للطبراني (۱/ ۱۵۰) امام نور الدین ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني في الصغیر وفیه مسعدة بن الیسع، وهو كذاب" (مجمع الزوائد: ٤/ ٥٨) علامہ البانی رحمہ اللہ اس حدیث کو موضوع قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: فهو إسناد ساقط بمرة مسلسل من أوله إلیٰ آخره بالعلل، أقواها كذب مسعدة" (إرواء الغلیل: ٤/ ٣٩٤) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے عقیقے میں اونٹ ذبح کرنے کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: "معاذ الله! ولكن ما قال رسول الله ﷺ: شاتان مكافئتان" (إرواء الغلیل: ٤/ ٣٩٠)

بہا کر قرب الٰہی حاصل کرنا] قرار دیا جائے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، تو اس پر یہ شبہہ وارد ہوتا ہے کہ اس تقریر پر لازم ہوگا کہ ہر دم متقرب بہ میں احکامِ اضحیہ معتبر ہوں، حالانکہ ذبیحۃ العرس اور دیگر دماے ولائم میں کوئی بھی نہیں کہتا کہ احکامِ اضحیہ کا اعتبار لازم ہے۔

الحاصل احتیاط اسی میں ہے کہ ماثور عن الشارع پر اقتصار کیا جائے اور بلا ضرورت اس میں رائے اور قیاس کو دخل نہ دیا جائے۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبداللہ (۹/ ربیع الأول ۱۳۳۲ھ)

سوال عقیقہ میں گائے وشتر ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بقول جمہور جائز ہے تو ایک گائے اور ایک شتر سات عقیقہ کے لیے کافی ہے یا نہیں؟ بحوالہ کتاب وسنت تحریر فرما دیں۔

جواب مسئلہ اولیٰ ''عقیقہ میں گائے وشتر ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟'' کے متعلق کوئی آیت یا حدیثِ صحیح میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ ہاں انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث: «یعق عنه من الإبل والبقر والغنم» [اس (بچے) کی طرف سے اونٹ، گائے اور بکری کے ساتھ عقیقہ کیا جائے] جس سے عقیقہ میں گائے وشتر ذبح کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے، حافظ ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ کی کتاب ''معجم صغیر'' (ص: ۴۵ مطبوعہ دہلی) میں موجود ہے، مگر حدیث مذکور بوجوہِ ذیل صحیح نہیں ہے۔ حدیث مذکور کی پوری اسناد، جو معجم صغیر میں مذکور ہے، یہ ہے:

''ثنا إبراهيم بن أحمد بن مروان الواسطي ثنا عبد الملك بن معروف الخياط الواسطي ثنا مسعدة بن اليسع عن حريث بن السائب عن الحسن عن أنس بن مالك رضی اللہ عنہ''

[ہمیں ابراہیم بن احمد بن مروان الواسطی نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں عبدالملک بن معروف الخیاط الواسطی نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں مسعدہ بن الیسع نے بیان کیا، انھوں نے حریث بن السائب سے روایت کیا، انھوں نے حسن سے روایت کیا اور انھوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے]

حدیث مذکور کے عدمِ صحت کی وجہ اول: اس حدیث کی اسناد میں راوی ''ابراہیم بن مروان واسطی'' ہیں، ان کی نسبت ''میزان الاعتدال'' میں ہے: ''روی الحاکم عن الدارقطني قال: لیس بالقوي''[1] یعنی حاکم نے دارقطنی سے روایت کی ہے کہ یہ راوی قوی نہیں ہے اور صحتِ حدیث کے لیے اس کے کل راویوں کا قوی (عادل و ضابط) ہونا ضروری ہے، پس جب اس حدیث کا راوی قوی نہیں تو یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

وجہ دوم: اس حدیث کی اسناد میں راوی ''مسعدة بن الیسع'' ہیں، ان کی نسبت میزان الاعتدال میں ہے: ''هالك، کذبه أبو داود، وقال أحمد بن حنبل: خرقنا حدیثه منذ دهر''[2] یعنی راوی نمبر ۳ ہالک ہے، اس کو ابو داود نے جھوٹا کہا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہا ہے: ہم نے تو اس کی حدیث کو مدت ہوئی پھاڑ ڈالا

---

[1] میزان الاعتدال (۱/ ۱۷) سؤالات الحاکم للدارقطني (ص: ۱۰۱)

[2] میزان الإعتدال (۴/ ۹۸)

اور حدیث کی صحت کے لیے اس کے کل راویوں کا سچا ہونا ضرور ہے اور جب اس حدیث کا راوی نمبر ۳ جھوٹا ہے تو یہ حدیث صحیح نہیں۔

وجہ سوم: اس حدیث کی اسناد میں راوی حسن بصری رحمہ اللہ ہیں، ان کی نسبت "تقريب التهذيب" میں ہے: "كان يرسل كثيرا ويدلس"[1] یعنی حسن بصری رحمہ اللہ ارسال بہت کیا کرتے تھے اور تدلیس بھی کیا کرتے تھے۔

"ميزان الاعتدال" میں ہے: "كان الحسن كثير التدليس، فإذا قال في حديث: عن فلان. ضعف الاحتجاج به"[2] یعنی حسن بصری رحمہ اللہ کثیر التدلیس تھے، پس جب یہ کسی حدیث میں "عن فلان" کہیں (یعنی عن کے ساتھ روایت کریں اور اپنا سماع اپنے شیخ سے نہ بیان کریں) تو ان کے ساتھ احتجاج ضعیف ہوگا۔

صحتِ حدیث کے لیے اس کی اسناد کا من اولہ الی آخرہ متصل ہونا ضرور ہے اور جب راوی مدلس ہو اور "عن" کے ساتھ روایت کرے، یعنی اپنا سماع اپنے شیخ سے نہ بیان کرے تو سند کا متصل ہونا ثابت نہیں ہوتا اور مانحن فیہ میں حسن بصری نے "عن" کے ساتھ روایت کی ہے، پس یہ حدیث صحیح نہیں ہوئی۔

الحاصل بیان بالا سے بخوبی ثابت ہے کہ حدیث زیرِ بحث صحیح نہیں ہے اور مسئلہ ثانیہ کہ "اگر عقیقہ میں گائے اور شتر کا ذبح کرنا بقول جمہور جائز ہے تو ایک گائے اور ایک شتر سات عقیقہ کے لیے کافی ہے یا نہیں؟" کے متعلق بھی کوئی آیت یا حدیث معلوم نہیں ہوئی۔ پس اگر عقیقہ کے بارے میں کہا جائے کہ اس میں بھی مثل اضحیہ کے ایک گائے یا ایک شتر سات عقیقہ کے لیے کافی ہے تو یہ بات محض قیاساً علی الاضحیۃ کہی جا سکتی ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ عقیقہ کا قیاس اضحیہ پر صحیح بھی ہے یا نہیں؟

امام احمد رحمہ اللہ کے قول "تشترط بدنة أو بقرة كاملة" [(عقیقے میں) مکمل اونٹ اور گائے کی شرط لگائی جاتی ہے] سے جو نیل الاوطار (۴/ ۲۷۴) میں منقول ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ امام احمد نے اس قیاس کو صحیح نہیں جانا اور امام رافعی کے قول "يجوز اشتراك سبعة في الإبل والبقر كما في الأضحية"[3] [اونٹ اور گائے میں قربانی کی طرح (عقیقے میں بھی) سات حصے داروں کا شریک ہونا جائز ہے] سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس قیاس کو صحیح سمجھا، مگر ان کے اس قدر قول سے کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے دونوں (عقیقہ اور اضحیہ) میں کیا جامع قرار دیا ہے کہ اُس پر غور کیا جائے اور اگر جامع ان دونوں میں تقرب باراقۃ الدم قرار دیا جائے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے تو اس پر یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اس تقدیر پر لازم ہوگا کہ ہر دم متقرب بہ میں احکامِ اضحیہ معتبر ہوں، حالانکہ ذبیحۃ العرس اور دیگر دمائے ولائم میں کوئی بھی نہیں کہتا کہ ان میں احکامِ اضحیہ کا اعتبار لازم ہے، حالانکہ اس قائس کے نزدیک کل

[1] تقريب التهذيب (ص: ١٦٠)

[2] ميزان الاعتدال (١/ ٥٢٧)

[3] نيل الأوطار (٤/ ٢٧٤)

دمائے و لائم متقرب بہا ہیں، نیز عقیقہ اور اضحیہ میں شارع نے یہ فرق کیا ہے کہ عقیقہ میں پسر کی طرف سے دو بکریاں رکھی ہیں اور دختر کی طرف سے ایک ہی بکری اور اضحیہ میں ایسا نہیں ہے۔

الحاصل عقیقہ کا قیاس اضحیہ پر صحیح ہے یا نہیں؟ یہ کچھ معلوم نہیں ہوتا، ایسی حالت میں احتیاط اسی میں ہے کہ ماثور عن الشارع پر اقتصار کیا جائے اور بلا ضرورت رائے اور قیاس کو اس میں دخل نہ دیا جائے۔ واللہ أعلم وعلمه أتم.

کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۲/ رجب ۱۳۳۲ھ)

سوال عقیقہ میں سوائے بکری کے اگر دوسرا جانور مثلاً گائے وشتر وغیرہ ذبح کریں تو درست ہے یا نہیں؟

جواب عقیقہ میں گائے واونٹ کا ذبح کرنا کسی حدیثِ صحیح سے ثابت نہیں ہوا۔ کتبہ: محمد عبد اللہ



کتاب الجنائز

کفن میں چادروں کی تعداد:

سوال کفن مردہ کا دو چادر ایک قمیص ہے یا ایک چادر و ایک تہ بند و ایک قمیص سنت ہے؟

جواب دونوں طور جائز ہے، اس میں شرعاً کچھ تنگی نہیں ہے۔ خوب ساتر ہونا کافی ہے۔

نمازِ جنازہ میں قراءت کا مسنون طریقہ:

سوال نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ مع ضم سورہ پڑھنا جائز ہے یا نہ؟ بر تقدیر جواز سراً و خفیتاً ہے یا جہراً و علانیتاً؟

جواب الحمد لله الذي جعل في الدين يسرا وسعة، و هدىٰ نبيه سبل السلام وأطوارا مختلفة، والصلاة والسلام على نبي التوبة والرحمة، وعلىٰ آله وأصحابه الكرام البررة. أما بعد:

بخاری و ابو داود و ترمذی میں سورہ فی صلاۃ الجنازہ پڑھنے کے بارے میں باب منعقد کر کے باختلافِ الفاظ اس حدیث کو ذکر کیا گیا ہے: وعن ابن عباس أنه صلىٰ على جنازة فقرأ بفاتحة الكتاب: وقال: لتعلموا أنها من السنة.[1] یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک جنازہ پر سورۂ فاتحہ پڑھی اور کہا کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ قراءتِ فاتحہ سنت سے ہے۔ نسائی نے سورہ کو بھی زیادہ کیا ہے[2] اور اصول میں عند الاکثر کالاجماع یہ بات قرار پا چکی ہے کہ صحابی کا "من سنته كذا" کہنا حدیث مرفوع ہوا کرتا ہے۔[3] ابن ماجہ نے ام شریک رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے:

"قالت: أمرنا رسول الله ﷺ أن نقرأ علىٰ الجنازة بفاتحة الكتاب"[4]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ہم کو جنازہ کی نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم کیا ہے۔

وفي إسناده ضعف يسير، كما قال الحافظ،[5] وهو ينجبر بضمه إلى الأول.

[اس کی سند میں تھوڑا سا ضعف ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے، لیکن اس کو پہلی روایت کے

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٩٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٢٧)

② سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٨٧)

③ فتح المغيث (١/ ١١٩) تدريب الراوي (١/ ١٨٨) توضيح الأفكار (١/ ٢٦٥)

④ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٩٦) اس کی سند میں "حماد بن جعفر العبدي" ضعیف ہے۔

⑤ التلخيص الحبير (٢/ ١١٩)

ساتھ ملانے سے وہ ضعف ختم ہو جاتا ہے]

و عن فضالة بن أبي أمية قال: "قرأ الذي صلىٰ علىٰ أبي بكر و عمر بفاتحة الكتاب" [1] (رواه البخاري في تاريخه)

یعنی فضالہ بن ابی امیہ سے روایت ہے، اس نے کہا کہ جس شخص نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر جنازہ کی نماز پڑھی تھی، اس نے سورۂ فاتحہ کو پڑھا تھا۔ اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے۔

پس خلاصہ یہ ہوا کہ صلاۃِ جنازہ میں سورت فاتحہ بلا تردد پڑھ سکتے ہیں، کیونکہ حدیثِ صحیح سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور حدیثِ صحیح پر عمل کرنے میں کسی کو کلام نہیں ہے، بلکہ سب متفق ہیں، چنانچہ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی مقدمہ مشکوۃ میں لکھتے ہیں: "الاحتجاج في الأحكام بالخبر الصحيح مجمع عليه" [احکام میں خبرِ صحیح کے ساتھ احتجاج کرنے پر اجماع ہے] فقہائے حنفیہ نے بھی بارادہ دعا سورۂ فاتحہ کا پڑھنا جنازہ کی نماز میں جائز لکھا ہے۔ "فلو قرأ الفاتحة بنية الثناء جاز، كذا في الأشباه" [2] [پس اگر ثنا کی نیت سے وہ سورۃ الفاتحہ پڑھے تو جائز ہے، "الأشباه" میں ایسے ہی ہے] مولوی عبدالحی لکھنوی نے شرح وقایہ کے حاشیہ پر قراءت فی صلاۃ الجنازۃ کے متعلق لکھا ہے:

"قوله: خلاف للشافعي فإن عنده يقرأ الفاتحة بعد التكبيرة الأولى وهو الأقوىٰ دليلا، وهو الذي اختاره الشرنبلالي من أصحابنا، وألف فيه رسالة" [3]

[اس کا یہ قول کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا اس میں اختلاف ہے۔ پس ان کے نزدیک وہ پہلی تکبیر کے بعد سورۃ الفاتحہ پڑھے گا اور دلیل کے اعتبار سے یہی زیادہ قوی بات ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے "الشرنبلالی" نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے اور اس میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا ہے]

شیخ عبدالرحیم صاحب دہلوی والد شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی بھی اس پر عمل کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے "حجة الله البالغة" میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کو جنازہ کی نماز میں لکھا ہے اور کہا ہے: "یہ خیر اور اجمع الادعیہ ہے اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں اپنے عباد کو سکھلایا ہے۔" [4] قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مصنف مالا بدمنہ نے اپنے وصیت نامہ میں نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی وصیت کی ہے۔ [5] غرض کہ جنازہ کی نماز میں

---

[1] التاريخ الكبير (٧/ ١٢٥) الجرح والتعديل (٧/ ٧٧)

[2] فتح القدير (٣/ ٣٧٨) رد المحتار (١/ ٥١٢)

[3] علامہ حسن شرنبلالی (١٠٦٩ھ) نے نمازِ جنازہ میں قراءتِ فاتحہ کے جواز پر "النظم المستطاب لحكم القراءة في صلاة الجنازة بأم الكتاب" کے نام سے رسالہ تحریر کیا ہے۔

[4] حجة الله البالغة (ص: ٤٩٢)

[5] وصیت نامہ (ص: ١٥٢، ملحق ما لا بد منہ) مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔

سورۂ فاتحہ ضرور پڑھنا چاہیے اور سنن نسائی کی زیادت کی رو سے سورۃ بھی ملا سکتے ہیں۔ لا محيص عن المصير إلى ذلك لأنها زيادة خارجة من مخرج صحيح.

"السراج الوهاج من كشف مطالب صحيح مسلم بن الحجاج" میں ہے:

"قال: الإمام الرباني الشوكاني في السيل الجرار: صلاة الجنازة صلاة من الصلوات التي قال فيها النبيﷺ فيما صح عنه: «لا صلاة إلا بفاتحة الكتاب» وهذا يكفي في كونها فرضا في صلاة الجنازة، بل في كونها شرطا يستلزم عدمها عدم الصلاة، فكيف وقد ثبت في الصحيح عنهﷺ أنه كان يقرأ في صلاة الجنازة فاتحة الكتاب، قال: وينبغي أن يعمد إلى سورة قصيرة فيقرأها، نعم لا يشتغل بغير الدعاء للميت بعد تكبيرة بما ورد وبما لم يرد فهذا هو المقصود من صلاة الجنازة"[1] انتهى

یعنی امام شوکانی عالم ربانی نے سیل جرار میں کہا ہے کہ نمازِ جنازہ ایک نماز ہے، ان نمازوں میں سے جن کی شان میں رسولِ خداﷺ نے یہ حدیث فرمائی ہے کہ بغیر فاتحہ پڑھنے کے کوئی نماز نہیں ہوتی، پس یہ حدیث نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے فرض، بلکہ اس کے شرط ہونے کے واسطے جو عدمِ فاتحہ سے عدمِ صلاۃ کو مستلزم ہو، کافی ہے، کیونکر یہ بات نہ ہو، حالانکہ نبیﷺ سے صحیح حدیث میں ثابت ہو چکا ہے کہ آپﷺ جنازہ کی نماز میں سورت فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ امام شوکانی نے یہ بھی کہا ہے کہ سورت فاتحہ کے ساتھ کسی قدر اور قرآن مجید بھی بانداز یسیر ملا لیا کرے اور وہ بھی کوئی چھوٹی سی سورت پڑھ لیا کرے، ہاں پھر تکبیر کے بعد میت کے حق میں دعاے ماثور پڑھنے کے سوا کوئی شغل نہ کرے، کیونکہ نمازِ جنازہ سے بھی دعا ہی تو مقصود ہے۔ انتہیٰ

هذا الذي قاله الإمام الشوكاني هو الحق الحقيق الذي بلغ غاية التحقيق.

اب رہی یہ بات کہ سورت فاتحہ وسورۃ سراً چاہیے یا جہراً؟ سو اس کی نسبت لکھنا، اُس جملہ کا جو غطیف بن حارث سائل نے نبیﷺ کی قراءت فی صلاۃ اللیل کے جہر یا خُفت سے سوال کے دربارہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جواب "ربما جهر به وربما خفت" میں کہا تھا، خالی از مناسبت نہیں ہے۔ وہ جملہ یہ ہے: "الحمد لله الذي جعل في الأمر سعة"[2]

غرضکہ سراً و جہراً ہر دو وجہ سے پڑھ سکتے ہیں، اس سے کوئی مانع شرعی و عقلی موجود نہیں ہے، بلکہ دونوں باتیں احادیث سے ثابت ہیں۔ سراً پڑھنے کے واسطے یہ حدیث جو بروایتِ ثقات نسائی میں ہے، دلیل ہے:

عن أبي أمامة قال: السنة في الصلاة على الجنازة أن يقرأ في التكبيرة الأولىٰ بأم القرآن

---

[1] السراج الوهاج للنواب صديق حسن خان (٣/ ٣٣٤) نیز دیکھیں: السيل الجرار المتدفق علىٰ حدائق الأزهار (١/ ٢١٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٦) مسند أحمد (٦/ ٤٧)

مخافتة.[1] الحديث

یعنی میت پر نماز پڑھنے میں سنت یوں ہے کہ تکبیر اولیٰ کے بعد سورۂ فاتحہ کو آہستہ سے پڑھا جائے۔

اور جہراً پڑھنے کے واسطے بھی بروایتِ ثقات مروی ہے:

عن طلحة بن عبد الله بن عوف قال: صليت خلف ابن عباس علىٰ جنازة فقرأ بفاتحة الكتاب و سورة، جهر حتى سمعنا، فلما فرغ أخذت بيده فسألته فقال: سنة وحق.[2]

دوسرے طریق میں ہے:

"فلما انصرفت أخذت بيده فسألته فقلت: تقرأ؟ قال: نعم، إنه حق وسنة"[3]

یعنی طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے مروی ہے، کہا کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے میت پر جنازہ کی نماز پڑھی، انھوں نے سورۂ فاتحہ اور کسی سورۃ کو ایسا جہراً پڑھا کہ ہم نے سنا، فارغ ہونے کے بعد میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر قراءت جہراً پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا، جواب دیا کہ یہ سنت وحق ہے۔

جہر بالقراءت کی یہ حدیث ابو داود کی بھی موید ہے:

عن واثلة بن الأسقع قال: صلىٰ بنا رسول اللهﷺ على رجل من المسلمين فسمعته يقول: اللهم إن فلان بن فلان في ذمتك...»[4] الحديث

[واثلہ بن الاسقع بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مسلمانوں میں سے ایک آدمی کی نمازِ جنازہ کی امامت کرائی۔ میں نے آپ ﷺ کو یہ پڑھتے ہوئے سنا: اے اللہ! فلاں بن فلاں تیرے ذمے میں ہے...]

عون الباری شرح تجرید بخاری میں ہے:

"قال الشوكاني في السيل: قد ورد الجهر، فأخرج البخاري وغيره عن ابن عباس رضي الله عنهما أنه صلىٰ على جنازة، فقرأ بفاتحة الكتاب، وقال: لتعلموا أنها سنة، ومعلوم أن قراءته هذه لا تكون إلا جهرا، حتى سمع ذلك من صلىٰ معه، وزاد النسائي بعد فاتحة الكتاب سورة، وذكر أنه جهر، ولفظه هكذا: فقرأ بفاتحة الكتاب، و سورة، وجهر، و يؤيد ذلك ما ثبت في صحيح مسلم وغيره من حديث عوف بن مالك قال: صلىٰ رسول اللهﷺ على جنازة فحفظنا من دعائه... الحديث، فإن هذا يدل أنه جهر بالدعاء، فلا وجه لجعل المخافتة مندوبة، وإن ورد في حديث أبي أمامة بن سهل أنه أخبره رجل

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٨٩)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٨٧)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٨٨)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٠٢)

من أصحاب النبيﷺ أن السنة في الصلاة على الجنازة أن يكبر الإمام، ثم يقرأ بفاتحة الكتاب بعد التكبيرة الأولىٰ سرا في نفسه، ثم يصلي على النبيﷺ، ويخلص الدعاء للجنازة في التكبيرات، ولا يقرأ في شيء منها، ثم يسلم سرا في نفسه. أخرجه الشافعي في مسنده، وفي إسناده اضطراب، وقواه البيهقي في المعرفة، وأخرج عن الزهري معناه، وأخرج نحوه الحاكم من وجه آخر، وأخرجه أيضاً النسائي وعبد الرزاق، قال ابن حجر في الفتح: و إسناده صحيح، وليس فيه قوله: بعد التكبيرة الأولىٰ، ولا قوله: سراً في نفسه"[1]

یعنی امام شوکانی نے سیل جرار میں کہا ہے کہ سورۂ فاتحہ کا جہراً پڑھنا حدیث میں وارد ہے۔ بخاری وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کسی جنازہ پر سورۂ فاتحہ کو پڑھ کر فرمایا تھا کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ قراءت جہراً ہی تھی، تب ہی تو ان کے ساتھ والے نمازیوں نے بھی اس کو سن لیا تھا اور نسائی نے سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ کو بھی زیادہ کر کے ذکر کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قراءت جہراً پڑھی تھی اور اس کا لفظ اس طور پر ہے کہ فاتحہ اور سورۃ کو پڑھا اور جہر کیا اور اس جہر پڑھنے کی وہ حدیث بھی مؤید ہے، جو صحیح مسلم وغیرہ میں عوف بن مالک سے ثابت ہے۔ عوف بن مالک فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک میت پر جنازہ کی نماز پڑھی تھی، تو میں نے آپ کی دعا یاد کر لی اور وہ دعا حدیث میں مذکور ہے، کیونکہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی ﷺ نے دعا کو جہراً پڑھا تھا، پس مخافتت کے مندوب ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اگرچہ ابو امامہ بن سہل کی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک صحابی نے اصحابِ نبی ﷺ سے اس کو خبر دی ہے کہ جنازہ کی نماز میں سنت یوں ہے کہ امام تکبیر کے بعد آہستہ سے سورۂ فاتحہ پڑھے، پھر نبی ﷺ پر درود پڑھے اور باقی تکبیرات میں میت کے واسطے دعا کرے اور کسی تکبیر میں قراءت نہ کرے، پھر آہستہ سے سلام کہے۔ اس حدیث کو امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں اضطراب ہے اور بیہقی رحمہ اللہ نے اس کو مضبوط کہا ہے اور زہری سے اس کا معنی روایت کیا ہے اور حاکم رحمہ اللہ نے دوسرے طریق سے اس کے مانند روایت کیا ہے اور نسائی اور عبدالرزاق رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے اور اس میں قول اس کا "بعد التكبيرة الأولىٰ" اور "سراً في نفسه" نہیں ہے۔

نیل الاوطار میں نسائی کے لفظ ''جہر'' کے تحت میں لکھا ہے:

"فيه دليل على الجهر في قراءة الصلاة في الجنازة" انتهى[2]

---

[1] عون الباري لحل أدلة البخاري للنواب صديق حسن خان (٣/ ٦٢٨)

[2] نيل الأوطار (٤/ ١٠٢)

[اس میں نمازِ جنازہ میں جہراً قراءت کرنے کی دلیل ہے]

ظاہر حدیث فضالہ بن ابی امیہ سے بھی جہراً قراءتِ فاتحہ ثابت ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث: "سمعت عوف بن مالك يقول: صلىٰ رسول اللهﷺ علی جنازة فحفظت من دعائه: اللهم... الحديث» کے تحت میں "السراج الوهاج" میں لکھا ہے:

"الحديث فيه دلالة واضحة علىٰ الجهر بالدعاء في صلاة الجنازة، ولا مانع منه شرعا وعقلًا، ولا داعي إليه، فيكون الجهر بالدعاء والإسرار فيها سواء، كباقي الصلوات"[1] انتهى

یعنی اس حدیث میں کھلی دلالت ہے نمازِ جنازہ میں دعا کے جہر پڑھنے پر اور اس سے کوئی مانع شرعی و عقلی بھی نہیں ہے اور نہ کوئی امر اس کی طرف داعی ہے، پس جہر اور اسرار اس میں دونوں برابر ہیں دوسری نمازوں کی طرح۔"

خلاصہ کلام و حاصل امر یہ کہ جنازہ کی نماز میں سورت فاتحہ و سورۃ دیگر، بلکہ دعا کو بھی جہراً پڑھ سکتے ہیں۔ احادیثِ صحیحہ سے یہ بات ثابت ہے۔ جہراً اور سراً دونوں مساوات کا درجہ رکھتے ہیں۔

الجواب صحيح. فی الواقع جنازہ کی نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنا اور بھی اس کے ساتھ ضم سورۃ کرنا احادیثِ معتبرہ سے ثابت ہے اور جہراً خواہ سراً جس طرح چاہیں پڑھیں، اختیار ہے۔ مجیب ۔لله دره۔ نے ان سب امور کو اچھی طرح کافی دلائل سے ثابت کر دیا ہے، جس پر مزید کی حاجت نہیں۔ والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

المجيب مصيب فيما أعلم، والله أعلم، وعلمه أتم. كتبه: محمد بن عبدالعزيز الجعفري المدعو بشيخ محمد۔ تجاوز الله عنه (١٦/ ذی الحجه ١٣١٢ھ)

بے نماز شخص اور اس کے بچے کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم:

سوال ① ایک مسلمان تارک الصلاۃ ہے، نماز کبھی نہیں پڑھتا ہے، پس ایسے شخص کی نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیے یا نہیں۔

② ایسے کلمہ گو شخص کے لڑکے کی نمازِ جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟ بینوا تؤجروا!

جواب ① ایسے شخص کی نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیے، جو کوئی پڑھے گا ثواب پائے گا اور جو نہ پڑھے گا ثواب سے محروم رہے گا۔ اگر کوئی نہ پڑھے تو سب گنہگار ہوں گے، کیونکہ ایسا شخص گو بسبب شامت ترکِ نماز کے کتنا ہی بڑا گنہگار ہو، لیکن بوجہ کلمہ گو ہونے کے زمرہ مسلمین میں داخل ہے، جس کے لیے دعائے مغفرت جائز ہے، گو ادنیٰ درجہ کا مسلمان سہی۔ کیا عجب ہے کہ کلمہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے سارے جرائم عفو کر دے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [سورۂ نساء: ٤٨] [بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا

---

① السراج الوهاج من كشف مطالب صحيح مسلم بن الحجاج (٣/ ٤٦)

جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا]

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «من اتبع جنازة مسلم إيمانا واحتسابا، وكان معه حتى يصلى، ويفرغ من دفنها، فإنه يرجع من الأجر بقيراطين، كل قيراط مثل أحد، ومن صلىٰ عليها، ثم رجع قبل أن تدفن فإنه يرجع بقيراط»[1]

(متفق عليه، مشكوة شريف، ص: ١٣٢)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ایمان اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازے میں شریک ہوتا ہے، اس کے ساتھ رہتا ہے، حتی کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے اور اس کے دفنانے سے فارغ ہوا جاتا ہے تو وہ دو قیراط اجر کے ساتھ واپس آتا ہے، ہر قیراط اُحد پہاڑ کی مثل ہے اور جو شخص نمازِ جنازہ پڑھتا ہے اور اس کے دفن ہونے سے پہلے واپس آ جاتا ہے تو وہ ایک قیراط اجر کے ساتھ واپس آتا ہے]

ہاں اگر کوئی ایسا مقتدا شخص ہو کہ اس کے نماز نہ پڑھنے سے ان کو عبرت ہونے کی امید ہو اور وہ مقتدا اسی خیال سے اس شخص کے جنازہ کی نماز نہ پڑھے کہ شاید دوسرے لوگ متنبہ ہو جائیں اور نماز میں سستی نہ کریں، اس خیال سے کہ نماز میں سستی کرنے کی شامت سے ایسے بزرگ کی نماز اور دعا سے محروم اور بے نصیب ہونا پڑے گا، تو ایسے مقتدا کو اس شخص کی جنازہ کی نماز نہ پڑھنی شاید جائز ہو۔ واللہ أعلم بالصواب.

② دوسرے سوال کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے سوال کا جواب ہے کہ اس لڑکے کے جنازہ کی نماز بھی پڑھنی چاہیے، کیونکہ وہ لڑکا مسلمان کا بچہ ہے اور مسلمان کا بچہ مسلمان کا حکم رکھتا ہے۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «ما من مولود إلا يولد على الفطرة»

(بخاري شريف مع فتح الباري: ١/ ٦٩٨ چھاپه دهلی) والله أعلم بالصواب.

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر بچہ فطرتِ (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے]

كتبه: محمد عبد الله

غائبانہ نمازِ جنازہ کا حکم:

سوال ایک مسلمان سفر میں مر گیا، اس کے انتقال کی خبر سن کے سننے والے کو نمازِ غائب موتی کی پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

جواب غائب پر نمازِ جنازہ پڑھنا درست ہے، اس لیے کہ جب نجاشی حبشہ کے بادشاہ نے حبشہ میں انتقال کیا تھا تو حضرت رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں اُس پر جنازہ کی نماز پڑھی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری مع فتح الباری (۱/ ٦٨٩ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤٥)

"عن أبي هريرةؓ أن رسول اللهﷺ نعىٰ النجاشي في اليوم الذي مات فيه، وخرج بهم إلى المصلىٰ فصف بهم، وكبر عليه أربع تكبيرات"[1] والله أعلم بالصواب.

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کے فوت ہونے کی خبر اس روز سنائی، جس روز وہ فوت ہوئے اور آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر عید گاہ تشریف لے گئے، آپ ﷺ نے ان کی صفیں بنائیں اور چار تکبیریں کہیں]

كتبه: محمد عبد الله. ابو الفياض محمد عبد القادر اعظم گڑهی مؤی۔ (مہر مدرسہ)

عصر کے بعد اور مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا:

سوال ① جنازہ کی نماز بعد نمازِ عصر پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

② مسجد میں اندر جنازہ لے جانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ① جنازہ کی نماز بعد نمازِ عصر پڑھی جا سکتی ہے۔ حدیثیں جو نمازِ عصر کے بعد دوسری نمازوں کی کراہت پر دلالت کرتی ہیں، وہ مخصوص منہ البعض ہیں اور حکمِ کراہت خاص ہے ان نمازوں کے ساتھ جو بلا سبب پڑھی جائیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے سنتِ ظہر کی قضا بعد نمازِ عصر پڑھی ہے۔

عن أم سلمة قالت: سمعت النبيﷺ ينهىٰ عنهما ... إلى آخر قوله: «يا بنت أبي أمية سألت عن الركعتين بعد العصر، فإنه أتاني ناس من بني عبد القيس فشغلوني عن الركعتين اللتين بعد الظهر فهما هاتان»[2] (متفق عليه)

[ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبیِ کریم ﷺ کو سنا تھا کہ آپ ﷺ ان (عصر کے بعد کی دو رکعتوں) سے منع فرماتے تھے ...اے دخترِ بنی امیہ! تو نے عصر کے بعد کی ان دو رکعتوں کے متعلق پوچھا ہے تو بات یہ ہے کہ میرے پاس قبیلۂ عبد القیس کے کچھ لوگ آئے اور انھوں نے مجھے ظہر کے بعد کی رکعتوں سے مشغول کر دیا۔ تو یہ وہی دو رکعتیں ہیں]

اس کے سوا جن حدیثوں میں نمازِ عصر کے بعد نماز سے منع کیا گیا ہے، انھیں میں نمازِ صبح کے بعد نماز سے بھی منع کیا گیا ہے۔ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ مسجدِ خیف میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے اور دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگوں نے نماز کیوں نہیں پڑھی؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہم پڑھ چکے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو۔ اگر تم نماز پڑھ چکے ہو اور ایسی مسجد میں پہنچو، جہاں جماعت ہوتی ہو تو پھر جماعت میں شریک ہو جایا کرو، یہ نفل ہو جائے گی۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٥١)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٤)

عن يزيد بن الأسود قال: شهدت مع النبيﷺ حجته، فصليت معه صلاة الصبح في مسجد الخيف فلما قضىٰ صلاته، وانحرف إذا هو برجلين في أخرىٰ القوم لم يصليا معه فقال: «علي بهما» فجيء بهما ترعد فرائصهما، فقال: «ما منعكما أن تصليا معنا؟» فقالا: يا رسول الله: إنا كنا قد صلينا في رحالنا، قال: «فلا تفعلا، إذا صليتما في رحالكما، ثم أتيتما مسجد جماعة، فصليا معهم فإنها لكما نافلة»[1] (نيل الأوطار: ٢/ ٣٤٠)

[یزید بن الاسود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبیِ کریم ﷺ کے ساتھ حج میں شریک ہوا تو میں نے آپ ﷺ کے ساتھ مسجدِ خیف میں صبح کی نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ نے نماز مکمل کر کے لوگوں کی طرف رخ کیا تو دیکھا کہ دو آدمی لوگوں کے پیچھے موجود ہیں اور انھوں نے (جماعت کے ساتھ) نماز نہیں پڑھی۔ آپ ﷺ نے انھیں بلوایا۔ انھیں آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کی یہ حالت تھی کہ ان کے پٹھے کانپ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''تمھیں کیا رکاوٹ تھی کہ تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟'' انھوں نے جواب دیا: ہم اپنی منزل میں نماز پڑھ آئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسے نہ کیا کرو۔ جب تم اپنی منزل میں نماز پڑھ چکے ہو، پھر تم مسجد میں آؤ، جہاں جماعت کھڑی ہو تو ان کے ساتھ مل کر نماز پڑھو، یہ تمھارے لیے نفل ہوگی]

نمازِ طواف کی بھی ان وقتوں میں اجازت دی ہے۔[2] (نيل الأوطار: ٢/ ٣٤٢)

ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوا کہ ان اوقات میں وہی نماز منہی عنہ ہے، جس کے لیے کوئی سبب دوسرا سوائے تطوع کے نہ پایا جائے اور نمازِ جنازہ ایک تو فرض کفایہ ہے، نفل نہیں۔ دوسرے جنازہ کا حاضر ہوجانا خود سبب ہے، بلکہ اس کی تجہیز و تکفین وغیرہ سے جلد فراغت کا حکم ہے۔

قال رسول اللهﷺ: «يا علي! ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا آنت، والجنازة إذا حضرت... الخ»[3] (أخرجه الترمذي، نيل الأوطار: ٢/ ٣٣٦)

[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! تین کاموں میں تاخیر مت کرو: نماز جب اس کا وقت ہوجائے اور جنازہ جب تیار ہوجائے ...'' الخ]

پس نمازِ عصر کے بعد نمازِ جنازہ پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

❷ مسجد میں جنازہ لے جانا جائز ہے۔ جب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے وفات کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٥٨)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٦٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٨٥) مسند أحمد (٤/ ٨٠)

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٨٦) مسند أحمد (١/ ١٠٥)

ان کا جنازہ مسجد میں لاؤ، تاکہ ہم بھی ان کی نماز پڑھیں، اس پر لوگوں نے انکار کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے دو بیٹے سہیل اور ان کے بھائی کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا۔

"عن عائشة أنها قالت لما توفي سعد بن أبي وقاص: ادخلوا به المسجد حتى أصلي عليه. فأنكروا ذلك عليها، فقالت: لقد صلىٰ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم على ابني بيضاء في المسجد سهيل و أخيه"[1] (رواه مسلم، نيل الأوطار: ٣/ ٣٠٦)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فوت ہوگئے تو انھوں نے کہا کہ ان (کی میت) کو مسجد میں لے آؤ، تاکہ میں ان کی نماز جنازہ ادا کرسکوں، مگر لوگوں نے ان کے اس مطالبے کا انکار کیا۔ انھوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے دو بیٹوں سہیل اور اس کے بھائی کی نمازِ جنازہ مسجد میں ادا فرمائی تھی]

ابو داود کی حدیث: «من صلىٰ علىٰ جنازة في المسجد فلا شيء له»[2] [جس نے مسجد میں کسی میت کی نمازِ جنازہ ادا کی تو اس کے لیے کچھ نہیں] سے اس کی کراہت پر بھی استدلال کیا گیا ہے، مگر اس کے راویوں میں صالح مولی التوأمہ ہے اور وہ ضعیف ہے، اس لیے یہ حدیث قابلِ استدلال نہیں۔ علاوہ بریں ابو داود ہی کے بعض معتبر نسخوں میں بجائے «لا شيء له» کے «لا شيء عليه» [اس پر کوئی گناہ نہیں پایا گیا ہے]
(نيل الأوطار: ٣/ ٣٠٧)

دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہوکر دعا کرنا:

سوال میت کو دفن کرنے کے بعد اس کی قبر کے ارد گرد کھڑے ہوکر اس کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا حدیثِ نبوی سے ثابت ہے یا نہیں؟ نیز گزارش ہے کہ ماحصل تحریر جواب سابق کا یہ ہے کہ بعد دفن المیت اس کے لیے استغفار کا ثبوت ہے اور آدابِ دعا سے رفع الیدین بھی حدیثِ نبوی سے ثابت ہے۔ پس بعد دفن المیت اس کے لیے ہاتھ اٹھا کر کرنا جائز ہے تو حضور میت کو دفن کرنے کے بعد کے لیے استغفار کا ثبوت ہے نہ کہ دعا کا اور رفع الیدینؔ آدابِ دعا سے ہے، نہ کہ استغفار سے۔ اس لیے کہ آدابِ استغفار سے "أن تشير بأصبع واحدة"[3] ہے۔ (مشكوة، باب الدعاء)

پس جب تک میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے لیے دعا کا ثبوت نہ ہو، تب تک کیونکر میت کو دفن کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا عمل اس پر محمول کیا جائے گا؟ محض بخیال رفعِ شک و احتمال بھی گزارش ہے کہ کیا لفظِ استغفار اور لفظِ دعا دونوں شے واحد ہیں یا نہیں اور جو حکم استغفار کا ہے، وہی حکم دعا کا بھی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر آدابِ استغفار

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥١٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٨٩) مشكاة المصابيح (٢/ ٦٩٨)

کی نسبت "أن تشیر بأصبع واحدة" فرمانے کا اور آدابِ دعا کی نسبت "أن ترفع یدیك حذو منکبیك أو نحوهما" [1] (مشکوۃ باب الدعا) کے کیا مطلب ہوں گے؟ تحریر فرمائیں۔

جواب استغفار بھی دعا میں داخل ہے۔ استغفار کے معنے ہیں مغفرت مانگنا اور دعا کے معنی ہیں کچھ مانگنا۔ کچھ مانگنے میں مغفرت مانگنا بھی آ گیا۔ اسی لیے اس حدیث کو جس میں "أن تشیر بأصبع واحدة" [کہ تو ایک ہی انگلی سے اشارے کرے] ہے، مشکاۃ میں باب الدعوات میں ذکر کیا ہے۔ "أن تشیر بأصبع واحدة" ہاتھ اٹھا کر استغفار کرنے کے منافی نہیں ہے، اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے:

① مسئلہ۔ ② استغفار۔ ③ ابتہال۔ یہ تینوں دعا کے اقسام ہیں، ان میں کوئی بھی دعا سے خارج نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (٢٥/ شوال ١٣٣٠ھ)

کیا عورت کی وفات کے بعد اس کا شوہر غیر محرم بن جاتا ہے؟

سوال بعد مر جانے عورت کے شوہر اس کا غیر محرم ہے یا نہیں اور اگر ہے تو جس صورت میں اس عورت کا کوئی محرم نہ ہو یا ہو، اس صورت میں شوہر اس کے جنازہ کو لے جا سکتا ہے یا نہیں اور قبر میں لٹا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب شوہر عورت کا مرنے کے بعد کیا زندگی میں بھی غیر ذی محرم ہے، اس واسطے کہ ذو محرم اس کو کہتے ہیں، جس سے کبھی نکاح جائز نہ ہو اور شوہر تو وہی ہے جس کے نکاح میں عورت ہے۔ عورت کا جنازہ لے چلنے اور اس کے قبر میں لٹانے کے لیے ذو محرم کی تخصیص نہیں۔ ہر شخص (عورت کو اس سے کسی قسم کا تعلق نسبی یا مہری ہو یا نہ ہو) اس کا جنازہ لے کر چل سکتا ہے اور اس کو قبر میں لٹا سکتا ہے۔ محرم اور ذی محرم کا فرق صرف حالتِ زندگی میں ہے، مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں۔ رسولِ خدا ﷺ کی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو قبر میں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے رکھا تھا، جو انصاری تھے اور ان سے آپ کو نسبی یا مہری تعلق کچھ بھی نہیں تھا اور رسولِ خدا ﷺ وہیں پر موجود تھے۔

عن أنس قال: شهدنا بنت رسول الله ﷺ تدفن، وهو جالس على القبر، فرأيت عينيه تدمعان، فقال: «هل منكم من أحد لم يقارف الليلة؟» فقال أبو طلحة: أنا. قال: «فانزل في قبرها» فنزل في قبرها. [2] (رواه البخاري)

[انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کی تدفین کے وقت حاضر ہوئے، اس حال میں کہ رسول اللہ ﷺ قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے آپ ﷺ کی آنکھوں کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تم میں سے کوئی شخص ہے جس نے اس رات (اپنی بیوی سے) مقاربت نہ کی ہو؟" ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اس کی قبر میں اترو۔" تو وہ ان کی قبر میں اترے]

---

[1] مصدر سابق.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٧)

کیا شوہر وفات کے بعد اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے؟

سوال کیا شوہر وفات کے بعد اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے؟

جواب میت عورت کو اس کا شوہر غسل دے سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے: ”عن عائشة رضي الله عنها أن النبي ﷺ قال لها: لو مت قبلي لغسلتك“[1] رواه أحمد وابن ماجه و صححه ابن حبان. حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے پہلے مرتی تو میں تجھ کو غسل دیتا۔ امام احمد اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو روایت کیا اور ابن حبان نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ یہ حدیث بلوغ المرام کے کتاب الجنائز کی اٹھارویں حدیث ہے۔[2] بلوغ المرام میں اس حدیث کی نقل کے بعد ہی متصلاً یہ اثر بھی منقول ہے:

”عن أسماء بنت عميس رضي الله عنها أن فاطمة رضي الله عنها أوصت أن يغسلها علي رضي الله عنه“[3] رواه الدار قطني.

”اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی کہ (میرے شوہر حضرت) علی رضی اللہ عنہ مجھ کو غسل دیں۔ اس اثر کو دارقطنی نے روایت کیا۔

”سبل السلام شرح بلوغ المرام“ (۱/۱۹۴ مطبوعہ دہلی) میں ہے: ”هو يدل على أنه كان أمرا معروفاً في حياة رسول الله ﷺ“ ”حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا یہ اثر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ (یعنی شوہر کا اپنی میت عورت کو غسل دینا) رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارک میں ایک معروف امر تھا۔ (اسی وجہ سے اس وصیت پر کسی نے اس عہد میں انکار نہیں کیا) واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبداللہ (۸/ ذی القعدہ ۱۳۲۹ھ)

ایصالِ ثواب کا طریقہ اور میت کے کپڑوں کو استعمال میں لانا:

سوال ① اہلِ حدیث کے یہاں موتیٰ کو ثواب پہنچانے کا ازروئے حدیث کے کوئی طریقہ مقرر ہے یا نہیں؟

② موتیٰ کے مثلاً کپڑے اس کے اعزا اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب ① مقرر ہے۔ احادیثِ ذیل ملاحظہ ہوں:

عن عبد الله بن عمرو أن العاص بن وائل نذر في الجاهلية أن ينحر مائة بدنة، وأن هشام بن العاص نحر حصته خمسين، وإن عمرا سأل النبي ﷺ عن ذلك فقال: «أما أبوك فلو أقر بالتوحيد فصمت وتصدقت عنه، نفعه ذلك»[4] (رواه أحمد)

[عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ان کے دادا) عاص بن وائل نے زمانۂ جاہلیت میں سو اونٹ نحر

---

① مسند أحمد (٦/ ٢٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٦٥) صحيح ابن حبان (١٤/ ٥٥١)

② بلوغ المرام (٥٥١)

③ سنن الدارقطني (٢/ ١٢) بلوغ المرام (٥٥٢)

④ مسند أحمد (٢/ ١٨١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٨٤)

کرنے کی نذر مانی تھی۔ چنانچہ ہشام بن عاص نے اپنے حصے کے پچاس اونٹ ذبح کر دیے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تیرا باپ توحید کا اقرار کر لیتا اور پھر تو اس کی طرف سے روزے رکھتا اور صدقہ کرتا تو اس کو اس کا فائدہ ہوتا۔'' (مگر جب اس کی موت کفر پر ہوئی ہے تو اسے ان چیزوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا)]

وعن أبي هريرة أن رجلا قال للنبيﷺ: إن أبي مات، ولم يوص أفينفعه أن أتصدق عنه؟ قال: «نعم»[1] (رواه أحمد و مسلم والنسائي وابن ماجه)

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میرا والد فوت ہوگیا ہے اور اس نے وصیت نہیں کی ہے۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو فائدہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں]

عن عائشة أن رجلا قال للنبيﷺ: إن أمي افتلتت نفسها، وأراها لو تكلمت تصدقت، فهل لها أجر إن تصدقت عنها؟ قال: «نعم»[2] (متفق عليه)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک آدمی نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کی: میری والدہ اچانک فوت ہوگئی ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر انھیں بات چیت کرنے کا موقع ملتا تو وہ صدقہ کرتیں۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انھیں ثواب ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں]

وعن ابن عباس أن رجلا قال لرسول اللهﷺ: إن أمي توفيت أفينفعها إن تصدقت عنها؟ قال: «نعم» قال: فإن لي مخرفا فأنا أشهدك أني قد تصدقت به عنها.[3]

(رواه البخاري والترمذي والنسائي وأبو داود)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: میری والدہ فوت ہوگئی ہے۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کو فائدہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' اس نے کہا کہ میرے پاس ایک باغ ہے، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے وہ ان کی طرف سے صدقہ کر دیا]

وعن الحسن عن سعد بن عبادة أن أمه ماتت فقال: يا رسول الله إن أمي ماتت أفأتصدق عنها؟ قال: «نعم» قلت: فأي الصدقة أفضل؟ قال: «سقي الماء» قال: فتلك

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣٠) مسند أحمد (٢/ ٣٧١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧١٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦١٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٥٥)

سقاية آل سعد بالمدينة.[1] (رواه أحمد والنسائي)

[حسن رحمہ اللہ سے روایت ہے، وہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی والدہ فوت ہوگئی، انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری ماں فوت ہوگئی، کیا میں اس کی طرف سے صدقہ کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' میں نے پوچھا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانی پلانا۔'' راوی کہتے ہیں کہ اس بنا پر سعد رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں سبیل قائم کر دی تھی (تاکہ مسافر وغیرہ کسی تنگی کے بغیر ہر وقت پانی پی سکیں)]

۲ موتی کے کپڑوں و دیگر اشیا کے مالک اس کے ورثا ہیں، اس کے ورثا وہ کپڑے و نیز دیگر اشیا اپنے استعمال میں خود بھی لا سکتے ہیں اور اگر وہ کسی کو ہبتاً وصدقتاً دے دیں، تو وہ بھی اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔ واللہ أعلم.

کتبه: محمد عبد الله

کیا ایصالِ ثواب کے لیے فقرا و مساکین کو کھانا کھلانا درست ہے؟

سوال بغرضِ ثواب رسانی بحق موتی فقیروں اور مسکینوں کو کھانا کھلانا درست ہے یا نہیں؟

جواب بغرضِ ثواب رسانی بحق موتی فقیروں اور مسکینوں کو کھانا کھلانا درست ہے۔ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہ کی ماں وفات کر گئیں اور وہ موجود نہ تھے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری ماں وفات کر گئیں اور میں حاضر نہ تھا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کو نفع ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔[2] انتهى بقدر الحاجة. والله أعلم بالصواب.

کتبه: أبو الفياض محمد عبدالقادر. أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المباركفوري.

کیا میت کو نماز، درود اور تلاوت کا ثواب پہنچتا ہے؟

سوال زندوں کی طرف سے میت کی روح کو نماز، درود شریف اور قرآن مجید پڑھنے کا ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟ بدلائلِ قویہ اس کا جواب دے کر عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں۔

جواب [فتاوی کے مسودے میں اس کا جواب نہیں، صرف یہی سوال مذکور ہے، البتہ اس کے حاشیے میں لکھا ہے: ''اس سوال کا جواب لکھنا چاہیے۔ فتاویٰ میں جواب ہے، مگر حافظ صاحب کی تصحیح نہیں ہے اور قابلِ تنقید ہے۔'' لہٰذا یہاں پر مذکورہ مسئلے سے متعلق مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کا فتویٰ درج کیا جاتا ہے، جو ''فتاویٰ نذیریہ'' (۱/ ۲۴۱) میں مذکور ہے]

سوال مردے کے واسطے ختمِ قرآن پڑھ کر بخشنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس بارے میں علما کا اختلاف ہے کہ قراءتِ قرآن کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ علمائے حنفیہ کے

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٨٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٦٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٠٥)

نزدیک اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک اور بعض اصحابِ شافعی کے نزدیک پہنچتا ہے اور اکثر علماے شافعیہ کے نزدیک نہیں پہنچتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مشہور مذہب یہی ہے کہ نہیں پہنچتا ہے، پس جن لوگوں کے نزدیک پہنچتا ہے، ان کے نزدیک مردے کے واسطے ختم قرآن پڑھ کر بخشنا جائز ہے اور جن کے نزدیک نہیں پہنچتا ہے، ان کے نزدیک نہیں جائز ہے۔ شرح کنز میں ہے:

"إن للإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة كان أو صوما أو حجا أو صدقة أو قراءة قرآن أو غير ذلك من جميع أنواع البر، ويصل ذلك إلى الميت، وينفعه عند أهل السنة"[1]

[بلاشبہ انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے عمل کا ثواب اپنے غیر کو بخش دے، خواہ وہ عمل نماز ہو یا روزہ، حج ہو یا صدقہ، قراءتِ قرآن ہو یا اس کے علاوہ تمام قسم کی نیکیاں۔ بہر حال اہلِ سنت کے نزدیک اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور اسے اس کا فائدہ ہوتا ہے]

امام نووی شرح مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"وأما قراءة القرآن فالمشهور من مذهب الشافعي أنه لا يصل ثوابها إلى الميت، وقال بعض أصحابه: يصل إلى الميت ثواب جميع العبادات من الصلاة والصوم والقراءة وغير ذلك"[2]

[جہاں تک قراءت کا تعلق ہے تو امام شافعی رحمہ اللہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ میت کو اس کا ثواب نہیں پہنچتا، ان کے بعض اصحاب کا کہنا ہے کہ نماز، روزے، قراءتِ قرآن وغیرہ تمام عبادات کا ثواب میت کو پہنچتا ہے]

اور اذکار میں لکھتے ہیں:

"وذهب أحمد بن حنبل وجماعة من العلماء وجماعة من أصحاب الشافعي إلىٰ أنه يصل"[3] والله أعلم بالصواب، حرره علي محمد عفي عنه

[امام احمد بن حنبل، علما کی ایک جماعت اور اصحابِ شافعی رحمہ اللہ کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اس (قراءتِ قرآن) کا ثواب (میت کو) پہنچتا ہے]   سید محمد نذیر حسین

هو الموفق: متاخرین علمائے اہل حدیث سے علامہ محمد بن اسماعیل امیر رحمہ اللہ نے سبل السلام میں مسلکِ حنفیہ کو ارجح دلیلاً بتایا ہے، یعنی یہ کہا ہے کہ قراءتِ قرآن اور تمام عباداتِ بدنیہ کا ثواب میت کو پہنچنا از روئے دلیل کے زیادہ قوی ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے بھی "نيل الأوطار" میں اسی کو حق کہا ہے، مگر اولاد کے ساتھ خاص کیا ہے،

---

[1] البحر الرائق (٣/٦٣) تبيين الحقائق (٦/٨٣)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (١/٩٠)

[3] الأذكار للنووي (ص: ٢٢٨)

یعنی یہ کہا ہے کہ اولاد اپنے والدین کے لیے قراءتِ قرآن یا جس عبادت بدنی کا ثواب پہنچانا چاہے تو جائز ہے، کیونکہ اولاد کا تمام عملِ خیر مالی ہو، خواہ بدنی اور بدنی میں قراءتِ قرآن ہو یا نماز یا روزہ یا کچھ اور، سب والدین کو پہنچتا ہے، ان دونوں علامہ کی عبارتوں کو مع ترجمہ یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سبل السلام شرح بلوغ المرام (۱/ ۲۰۶) میں ہے:

"إن هذه الأدعية ونحوها نافعة للميت بلا خلاف، وأما غيرها من قراءة القرآن له فالشافعي يقول: لا يصل ذلك إليه وذهب أحمد وجماعة من العلماء إلىٰ وصول ذلك إليه، وذهب جماعة من أهل السنة والحنفية إلى أن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة كان أو صوماً أو حجاً أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو أي نوع من أنواع القرب، وهذا هو القول الأرجح دليلا، وقد أخرج الدارقطني أن رجلا سأل النبيﷺ أنه كيف يبر أبويه بعد موتهما فأجابه بأنه يصلي لهما مع صلاته؟ ويصوم لهما مع صيامه، وأخرج أبو داود من حديث معقل بن يسار عنهﷺ: اقرأوا على موتاكم سورة يٰس، وهو شامل للميت، بل هو الحقيقة فيه، وأخرج الشيخان أنهﷺ كان يضحي عن نفسه. بكبش وعن أمته بكبش، وفيه إشارة إلى أن الإنسان ينفعه عمل غيره، وقد بسطنا الكلام في حواشي ضوء النهار بما يتضح منه قوة هذا المذهب"[1] انتهى

یعنی یہ زیارتِ قبر کی دعائیں اور مثل ان کے اور دعائیں میت کو نافع ہیں بلا اختلاف اور میت کے لیے قرآن پڑھنا سو امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ اور علما کی ایک جماعت کا یہ مذہب ہے کہ قرآن پڑھنے کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ علمائے اہل سنت سے ایک جماعت کا اور حنفیہ کا یہ مذہب ہے کہ انسان کو جائز ہے کہ اپنے عمل کا ثواب غیر کو بخشے خواہ نماز ہو یا روزہ یا صدقہ یا حج یا قراءتِ قرآن یا کوئی ذکر یا کسی قسم کی کوئی اور عبادت اور یہی قول دلیل کی رو سے زیادہ راجح ہے۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ ایک مرد نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ ان کے مرنے کے بعد کیونکر نیکی و احسان کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اپنی نماز کے ساتھ ان دونوں کے لیے نماز پڑھے اور اپنے روزے کے ساتھ ان دونوں کے لیے روزہ رکھے۔[2] ابو داود میں معقل بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے مردوں پر سورۂ یٰسین پڑھو اور یہ حکم میت کو بھی شامل ہے، بلکہ حقیقتاً میت ہی کے لیے ہے اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بھیڑ اپنی

[1] سبل السلام (٦/ ١١٩)

[2] دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٥٩٧)

طرف سے قربانی کرتے تھے اور ایک اپنی امت کی طرف سے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کو غیر کا عمل نفع دیتا ہے اور ہم نے حواشی ضوء النہار میں اس مسئلہ پر مبسوط کلام کیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہی مذہب قوی ہے۔

نیل الاوطار (۳/ ۳۳۵) میں ہے:

”والحق أنه يخصص عموم الآية بالصدقة من الولد كما في أحاديث الباب، بالحج من الولد، كما في خبر الخثعمية، ومن غير الولد أيضاً كما في حديث المحرم عن أخيه شبرمة، ولم يستفصلهﷺ هل أوصىٰ شبرمة أم لا، و بالعتق من الولد، كما وقع في البخاري في حديث سعد، خلافا للمالكية علىٰ المشهور عندهم، وبالصلاة من الولد أيضاً، لما روى الدارقطني، أن رجلا قال: يا رسول اللهﷺ! أنه كان لي أبوأن أبرهما في حال حياتهما، فكيف لي ببرهما بعد موتهما؟ فقالﷺ: إن من البر بعد البر أن تصلي لهما مع صلاتك، وأن تصوم لهما مع صيامك، وبالصيام من الولد لهذا الحديث، ولحديث ابن عباس عند البخاري ومسلم: إن امرأة قالت: يا رسول الله! إن أمي ماتت، وعليها صوم نذر، فقال: أرأيت لو كان دين علىٰ أمك فقضيته أكان يؤدى عنها؟ قالت: نعم، قال: فصومي عن أمك، وأخرج مسلم وأبو داود والترمذي من حديث بريدة أن امرأة قالت: إنه كان علىٰ أمي صوم شهر، فأصوم عنها؟ قال: صومي عنها، ومن غير الولد أيضاً لحديث من مات، وعليه صيام، صام عنه وليه، متفق عليه، وبقراء ة يٰس من الولد وغيره لحديث: اقرؤا علىٰ موتاكم يٰس، وبالدعاء من الولد لحديث: أو ولد صالح يدعو له، ومن غيره لحديث: استغفروا لأخيكم وسلوا له التثبيت، ولقوله تعالىٰ: والذين جاؤوا من بعدهم يقولون ربنا اغفرلنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان، ولما ثبت من الدعاء للميت عند الزيارة وبجميع ما يفعله الولد لوالديه من أعمال البر لحديث: ولد الإنسان من سعيه“ انتهى

حاصل اور خلاصہ ترجمہ اس عبارت کا بقدرِ ضرورت یہ ہے کہ حق یہ ہے کہ آیت ﴿وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ اپنے عموم پر نہیں ہے اور اس کے عموم سے اولاد کا صدقہ خارج ہے، یعنی اولاد اپنے مرے ہوئے والدین کے لیے جو صدقہ کرے اس کا ثواب والدین کو پہنچتا ہے اور اولاد اور غیر اولاد کا حج بھی خارج ہے، اس واسطے کہ خثعمیہ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اولاد جو اپنے والدین کے لیے حج کرے، اس کا ثواب والدین کو پہنچتا ہے اور شبرمہ کے بھائی کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حج کا ثواب میت کو غیر اولاد کی طرف سے بھی پہنچتا ہے اور اولاد جو اپنے

والدین کے لیے غلام آزاد کرے تو اس کا بھی ثواب والدین کو پہنچتا ہے، جیسا کہ بخاری میں سعد کی حدیث سے ثابت ہے اور اولاد جو اپنے والدین کے لیے نماز پڑھے یا روزہ رکھے، سو اس کا بھی ثواب والدین کو پہنچتا ہے، اس واسطے کہ دارقطنی میں ہے کہ ایک مرد نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ تھے، ان کی زندگی میں ان کے ساتھ نیکی و احسان کرتا تھا، پس ان کے مرنے کے بعد ان کے ساتھ کیونکر نیکی کروں؟ آپ نے فرمایا: نیکی کے بعد نیکی یہ ہے کہ اپنی نماز کے ساتھ اپنے والدین کے لیے بھی نماز پڑھ اور اپنے روزے کے ساتھ اپنے والدین کے لیے بھی روزہ رکھ اور صحیحین میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میری ماں مرگئی اور اس کے ذمہ نذر کے روزے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بتا اگر تیری ماں کے ذمہ قرض ہوتا اور اس کی طرف سے تو ادا کرتی تو ادا ہو جاتا یا نہیں؟ اس نے کہا: ہاں، ادا ہو جاتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: روزہ رکھ اپنی ماں کی طرف سے اور صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ ایک عورت نے کہا کہ میری ماں کے ذمے ایک مہینے کے روزے ہیں تو کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھ اور غیر اولاد کے روزہ کا بھی ثواب میت کو پہنچتا ہے، اس واسطے کہ حدیث متفق علیہ میں آیا ہے کہ جو شخص مر جائے اور اس کے ذمے روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے اور سورت یٰسین کا ثواب بھی میت کو پہنچتا ہے، اولاد کی طرف سے بھی اور غیر اولاد کی طرف سے بھی، اس واسطے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اپنے مُردوں پر سورت یٰسین پڑھو اور دعا کا نفع بھی میت کو پہنچتا ہے، اولاد دعا کرے یا کوئی اور، اور جو کارِ خیر اولاد اپنے والدین کے لیے کرے سب کا ثواب والدین کو پہنچتا ہے، اس واسطے کہ حدیث میں آیا ہے کہ انسان کی اولاد اس کی سعی سے ہے۔

جب علامہ شوکانی اور محمد بن اسماعیل امیر کی تحقیق ایصالِ ثواب قراءتِ قرآن و عباداتِ بدنیہ کے متعلق سن چکے تو اب آخر میں علامہ ابن النحوی کی تحقیق بھی سن لینا، خالی از فائدہ نہیں۔ آپ شرح المنہاج میں فرماتے ہیں:

”لا يصل إلىٰ الميت عندنا ثواب القراء ة علىٰ المشهور والمختار الوصول، إذا سأل الله إيصال ثواب قراءته، وينبغي الجزم به، لأنه دعاء فإذا جاز الدعاء للميت بما ليس للداعي فلأن يجوز بما هو له أولىٰ ويبقى الأمر فيه موقوفاً علىٰ استجابة الدعا، وهذا المعنى لا يختص بالقراءة، بل يجري علىٰ سائر الأعمال، والظاهر أن الدعاء متفق عليه، أنه ينفع الميت والحي القريب والبعيد بوصية وغيرها وعلىٰ ذلك أحاديث كثيرة، بل كان أفضل أن يدعو لأخيه بظهر الغيب“ انتهى، ذكره في نيل الأوطار۔[1]

یعنی ہمارے نزدیک مشہور قول پر قراءتِ قرآن کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا اور مختار یہ ہے کہ پہنچتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ سے قراءتِ قرآن کے ثواب پہنچنے کا سوال کرے (یعنی قرآن پڑھ کر دعا کرے اور یہ

[1] نيل الأوطار (٤/٤٨٥)

سوال کرے کہ یا اللہ اس قراءت کا ثواب فلاں میت کو تو پہنچا دے) اور دعا کے قبول ہونے پر امر موقوف رہے گا (یعنی اگر دعا اس کی قبول ہوئی تو قراءت کا ثواب میت کو پہنچے گا اور اگر دعا قبول نہ ہوئی تو نہیں پہنچے گا) اور اس طرح پر قراءت کے ثواب پہنچنے کا جزم کرنا لائق ہے، اس واسطے کہ یہ دعا ہے، پس جبکہ میت کے لیے ایسی چیز کی دعا کرنا جائز ہے، جو داعی کے اختیار میں نہیں ہے تو اس کے لیے ایسی چیز کی دعا کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا، جو داعی کے اختیار میں ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ دعا کا نفع میت کو بالاتفاق پہنچتا ہے اور زندہ کو بھی پہنچتا ہے، نزدیک ہو خواہ دور ہو اور اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، بلکہ افضل یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کے لیے غائبانہ دعا کرے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الرحمن المباركفوري ۔عفا اللّٰه عنه.

کیا پرانی قبروں کو توڑ کر مدرسہ یا مکان بنانا درست ہے؟

سوال مسلمانوں کا ایک وقف کردہ قدیم قبرستان جس میں پختہ و ناپختہ نشاندار قبریں ہوں، قبور توڑ پھوڑ کر مدرسہ یا خاص سکونت کا مکان تعمیر کرنا جائز ہے یا نہ؟

جواب اگرچہ پختہ قبریں بنانا جائز نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کی قبروں کو توڑ پھوڑ کر مدرسہ یا سکونت کا مکان تعمیر کرنا جائز نہیں ہے۔ مشکوۃ (ص: ۱۴۰ مطبوعہ مطبع انصاری) میں موجود ہے:

"عن جابر رضی اللہ عنہ نهىٰ رسول الله ﷺ أن يجصص القبر، وأن يبنىٰ عليه وأن يقعد عليه" [1] (رواہ مسلم)

[جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کو چونا گچ بنانے، اس پر عمارت (وغیرہ) بنانے اور اس پر بیٹھنے (مجاور وغیرہ بننے) سے منع فرمایا]

اس باب میں اور بھی حدیثیں آئی ہیں۔

كتبه: عبد الأحد ۔عفي عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبدالله. الجواب صحيح. كتبه: میاں محمد ۔عفي عنه.



[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٠)

کتاب الزکاۃ والصدقات



صدقات کس کے سپرد کیے جائیں؟

سوال مالِ صدقہ، فطر، زکوۃ، مٹھیا کس کو دیا جائے؟ تمباکو کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

جواب صدقہ فطر اور زکوۃ کا مال سردار کے پاس بھیجنا چاہیے، یعنی سردار کے حوالے کرنا چاہیے۔ تمباکو کھانا پینا بضرورت دوا جائز ہے۔[1] واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبداللہ (مہر مدرسہ)

زکات کس کے سپرد کی جائے؟

جواب مَا تقول أیها السادة العلماء! هل یصرف ملاك الأموال زکاة أموالهم وصدقة فطرهم بأنفسهم إلی الفقرآء والمساکین وغیرهم من المصارف کیف شاؤوا أو یجب علیهم أن یدفعوها إلی الإمام أو یطلب منهم الإمام ویصرفها بنفسه أو بنائبه إلی مصارفها؟ وکیف کانت العادة جاریة في عهد رسول اللهﷺ والخلفاء الراشدینؓ؟ بینوا تؤجروا.

علمائے دین اس مسئلے میں کیا فرماتے ہیں کہ مال کی زکوۃ اور عشر اور عید کا صدقہ ہر نکالنے والا اپنے طور پر غربا و مساکین کو بانٹ دے یا اپنے سردار کے حوالے کر دے یا سردار خود طلب کر کے اپنے طور پر تقسیم کرے؟ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہدِ شریف میں کیا دستور تھا؟

جواب زکوۃ اور عید کا صدقہ زکوۃ دینے والا اور صدقہ نکالنے والا اپنے طور پر غربا و مساکین کو نہ بانٹے، بلکہ اپنے سردار یا اس کے نائب کے حوالے کر دے یا سردار خود طلب کر کے اپنے طور پر اس کو تقسیم کروا دے۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہدِ شریف میں یہی دستور تھا۔

مشکوۃ شریف کی کتاب الزکوۃ کی فصل اول میں ہے:

عن ابن عباس أن رسول اللهﷺ بعث معاذا إلی الیمن، فقال: «إنك تأتي قوما أهل

---

[1] اس فتوے کے ساتھ حاشیے میں لکھا ہے: ''تنقید کرو'' یعنی حضرت مولانا محمد عبدالرحمن محدث مبارکپوری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ جواب درست نہیں ہے۔ اس فتوے سے متعلق ... صفحہ ... ملاحظہ ہو۔

كتاب، فادعهم إلى شهادة أن لا إلٰه إلا الله، وأن محمدا رسول الله ﷺ، فإن هم أطاعوا لذلك فأعلمهم أن الله قد فرض عليهم خمس صلوات في اليوم والليلة، فإن هم أطاعوا لذلك فأعلمهم أن الله قد فرض عليهم صدقة تؤخذ من أغنيائهم فترد على فقرائهم»[1] الحديث

[ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ تم اہلِ کتاب کے پاس جاتے ہو، پہلے ان کو یہ ہدایت کرو کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ خدا کے سوا کوئی پوجنے کے قابل نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اگر وہ اس کو مان لیں تو ان کو یہ تعلیم کرنا کہ اللہ نے ان پر رات دن میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو یہ سکھانا کہ اللہ پاک نے ان پر زکات[2] بھی فرض کی ہے کہ ان کے مالداروں سے لی جائے اور ان کے فقیروں کو بانٹی جائے]

فتح الباری (۳/۲۸۴ چھاپہ مصر) میں ہے:

"قوله: «توخذ من أغنيائهم» استدل به على أن الإمام هو الذي يتولىٰ قبض الزكاة، وصرفها، إما بنفسه وإما بنائبه، فمن امتنع منها أخذت منه قهرا"[3] انتهى

[یہ جو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے مال داروں سے لی جائے اور ان کے فقیروں کو بانٹی جائے، دلیل ہے کہ سردار ہی زکات کے لینے اور اس کے بانٹنے کا مالک ہے خود سردار ہی تحصیل کرے یا اپنے نائب کے ذریعے سے تحصیل کرائے تو جو شخص تحصیل دار کو نہ دے اس سے جبراً لی جائے گی۔ الخ]

"التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير" (ص: ۱۷۸) میں ہے:

"حديث أن سعد بن أبي وقاص وأبا هريرة وأبا سعيد الخدري سئلوا عن الصرف إلى الولاة الجائرين فأمروا به. رواه سعيد بن منصور عن عطاف بن خالد وأبي معاوية و ابن أبي شيبة عن بشر بن المفضل ثلاثتهم عن سهيل بن أبي صالح عن أبيه اجتمع نفقة عندي فيها صدقتي، يعني بلغت نصاب الزكوة، فسألت سعد بن أبي وقاص وابن عمر و أبا هريرة وأبا سعيد الخدري أقسمها أو أدفعها إلى السلطان؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۳۳۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۳۳) مشكاة المصابيح (۱/ ۳۹۹)

[2] رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بعد زکات کو ذکر فرمایا اور ایسے ہی اللہ پاک نے قرآن مجید میں اکثر جگہ ﴿اَقِيْمُوا الصَّلَاةَ﴾ کے بعد ﴿وَاٰتُوا الزَّكَاةَ﴾ فرمایا ہے، اس میں ایک نکتہ اور بھید ہے، یعنی جیسا کہ نماز فرض اکیلے اکیلے پڑھنا درست نہیں، ویسا ہی زکات کو اکیلے اکیلے اپنے طور پر ادا کرنا درست نہیں، جیسا کہ نماز فرض جماعت کے ساتھ ایک امام کے پیچھے ادا کرنا چاہیے، ویسا ہی زکات کو امام کے حوالے کرنا چاہیے خود بانٹنا درست نہیں۔ ابو الحسنات عفي عنه

[3] فتح الباري (۳/ ۳۶۰)

فقالوا: ادفعها إلى السلطان، ما اختلف علي منهم أحد، وفي رواية: قلت لهم: هذا السلطان يفعل ما ترون، فأدفع إليه زكاتي؟ فقالوا: نعم، ورواه البيهقي عنهم، وعن غيرهم أيضاً.

وروى ابن أبي شيبة من طريق قزعة قال: قلت لابن عمر: إن لي مالا فإلىٰ من أدفع زكاته؟ قال: ادفعها إلى هؤلاء القوم، يعني الأمراء. قلت: إذا يتخذون بها ثيابا وطيبا؟ قال: وإن، ومن طريق نافع قال: قال ابن عمر: ادفعوا صدقة أموالكم إلى من ولاه الله أمركم، فمن بر فلنفسه ومن آثم فعليها.

وفي الباب عنده عن أبي بكر الصديق وعن المغيرة بن شعبة وعائشة. وأما ما رواه ابن أبي شيبة أيضاً عن خيثمة قال سألت ابن عمر عن الزكاة، فقال: ادفعها إليهم، ثم سألته بعد ذلك فقال: لا تدفعها إليهم، فإنهم قد أضاعوا الصلاة، فهو ضعيف، لأنه من رواية جابر الجعفي.

و أصل هذا الباب ما رواه مسلم من حديث جرير مرفوعاً: «أرضوا مصدقيكم» قاله مجيبا لمن قال له من الأعراب: إن ناسا من المصدقين يأتوننا فيظلموننا، وعند أبي داود عن جابر بن عتيك مرفوعاً: «سيأتيكم ركب مبغضون فإذا أتوكم فرحبوا بهم، وخلوا بينهم، وبين ما يبتغون، فإن عدلوا فلأنفسهم، وإن ظلموا فعليها، وأرضوهم فإن تمام زكاتكم رضاهم» وعند الطبراني في الأوسط من حديث سعد بن أبي وقاص مرفوعاً: «ادفعوها إليهم ما صلوا الخمس» وعند أحمد والحارث وابن وهب من حديث أنس قال: أتى رجل من بني تميم فقال: يا رسول الله! إذا أذيت الزكاة إلى رسولك فقد برئت منها إلى الله ورسوله؟ قال: «نعم، ولك أجرها واثمها على من بدلها»

حديث أن ابن عمر كان يبعث صدقة الفطر إلى الذي تجمع عنده قبل الفطر بيومين. مالك في الموطأ والشافعي عنه، والدارقطني و ابن حبان والبيهقي، عند بعضهم: بيوم أو يومين، وعند مالك والشافعي بيومين أو ثلاثة.

وروى البخاري من حديث ابن عمر أنه كان يعطيها للذين يقبلونها، وكانوا يعطون قبل الفطر بيوم أو يومين.[1] اهـ

[سعد بن ابی وقاص اور ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم سے ظالم سرداروں کو زکات دینے کا فتویٰ پوچھا گیا تو ان لوگوں نے ان کو زکات دینے کا حکم کیا۔ اس کو سعید بن منصور نے عطاف بن خالد،

---

① التلخيص الحبير (٢/١٥٠)

ابو معاویہ سے روایت کی ہے اور ابن ابی شیبہ سے بشر بن مفضل سے روایت کیا ہے اور تینوں نے سہیل بن ابو صالح سے روایت کی ہے اور سہیل نے اپنے باپ ابو صالح سے کہ میرے پاس اتنا مال ہوگیا تھا جس پر زکات فرض ہوتی ہے تو میں نے سعد بن ابی وقاص اور ابن عمر اور ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ میں خود اس کو بانٹ دوں یا سردار کے حوالے کروں؟ تو کسی نے اختلاف نہ کیا، بلکہ سب نے بالاتفاق یہی جواب دیا کہ سردار کے حوالے کرو اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ میں نے کہا کہ یہ سردار جو کچھ کرتے ہیں وہ تو آپ دیکھتے ہی ہیں۔ اس پر بھی اپنی زکات ان کے حوالے کر دوں؟ فرمایا: ہاں، اس کو بیہقی نے ان لوگوں سے اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں سے روایت کیا ہے۔

اور ابن ابی شیبہ سے قزعہ کی سند سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میں مال دار ہوں، پس اس کی زکات کس کو دوں؟ کہا کہ ان لوگوں کے حوالے کر یعنی سرداروں کے۔ میں نے کہا کہ وہ تو اس کو اپنے کپڑے اور خوشبو میں خرچ کر ڈالیں گے، کہا تمھاری بلا سے۔ ابن ابی شیبہ نے نافع کی سند سے روایت کی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اپنے مالوں کی زکات ان سرداروں کے حوالے کرو جن کو اللہ نے تمھارے کام کا والی بنایا ہے، جو سردار نیک برتاؤ کرے گا، اپنا بھلا کرے گا، جو برا برتاؤ کرے گا، اس کا وبال اسی پر پڑے گا۔

اسی باب میں ابن ابی شیبہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت کی ہے اور ابن ابی شیبہ نے خیثمہ سے جو روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے زکات کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ وہ سرداروں کے حوالے کرو، پھر اس کے بعد ان سے پوچھا تو کہا کہ ان کو مت دے، کیوں کہ انھوں نے نماز کو ضائع کر ڈالا، مگر یہ روایت ضعیف ہے، اس میں راوی جابر جعفی بہت ہی ضعیف ہے۔

اس امر کی دلیل کہ سردار کیسا ہی ہو، مگر زکات اسی کو دینا چاہیے وہ حدیث ہے جس کو مسلم نے جریر سے مرفوعاً روایت کی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زکات لینے والوں کو راضی رکھو۔'' یہ اس وقت فرمایا تھا، جب بدوؤں نے نالش کی تھی، زکات لینے والے اگر ہم پر ظلم کرتے ہیں اور ابو داود نے جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ ''قریب ہے تمھارے پاس ظالم تحصیل دار آئیں گے، وہ جب آئیں تمھارے پاس تو تم ان کو خوش کرو اور وہ جو چاہیں ان کو لینے دو، اگر وہ انصاف کریں گے تو اپنا بھلا کریں گے اور بے انصافی کریں گے تو اس کا وبال انھیں پر ہے، بہرحال ان کو راضی رکھو، کیوں کہ تمھاری زکات کا پورا ہونا ان کو راضی رکھنے میں ہے۔'' اور طبرانی نے اوسط میں سعد بن ابی وقاص سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ ''اس زکات کو سردار کے حوالے کرو، جب تک وہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھیں۔'' اور احمد اور حارث اور ابن وہب نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے آ کر عرض

کی: یا رسول اللہ ﷺ! جب میں زکات آپ کے تحصیل دار کے حوالے کر دوں تو کیا میں اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک بَری ہو جاؤں گا۔ فرمایا: ''ہاں اور تیرے لیے اس کا ثواب ہے اور اس کا گناہ اس پر ہے، جو اس کو بدل ڈالے۔''

ابنِ عمر رضی اللہ عنہما صدقہ فطر دو دن پہلے اس شخص کے پاس بھیج دیا کرتے تھے، جس کے پاس فطرہ جمع کیا جاتا تھا، اس کو امام مالک نے موطا میں روایت کی ہے اور امام شافعی کی روایت میں دو دن یا تین دن ہے۔

اور بخاری کی روایت میں ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما عید الفطر سے ایک یا دو دن قبل صدقہ فطر لینے والوں کو دے دیا کرتے تھے]

فتح الباری میں ہے:

"قوله: وكان ابن عمر يعطيها للذين يقبلونها، أي الذي ينصبه الإمام لقبضها، وبه جزم ابن بطال وقال ابن التيمي: معناه: من قال أنا فقير، والأول أظهر، ويؤيده ما وقع في نسخة الصغاني عقب الحديث، قال أبو عبد الله، هو المصنف: كانوا يعطون للجمع لا للفقراء، وقد وقع في رواية ابن خزيمة من طريق عبد الوارث عن أيوب قلت: متى كان ابن عمر يعطي؟ قال: إذا قعد العامل. قلت: متى يقعد العامل؟ قال: قبل الفطر بيوم أو يومين، ولمالك في الموطا عن نافع أن ابن عمر كان يبعث زكاة الفطر إلى الذي تجمع عنده قبل الفطر بيومين أو ثلاثة، وأخرجه الشافعي عنه، وقال: هذا حسن، وأنا أستحبه يعنى تعجيلها قبل يوم الفطر، وفي الحديث بعث الإمام العمال لجباية الزكاة"[1] اھ

[راوی کا یہ قول ہے کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما صدقہ فطر لینے والوں کو دے دیا کرتے تھے، اس کا یہ مطلب ہے کہ اس شخص کے حوالے کر دیا کرتے تھے، جس کو امام نے فطرہ تحصیلنے کے لیے مقرر کیا تھا اور ابن بطال نے بھی یہی معنی سمجھا ہے اور ابن تیمی نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو اپنے کو فقیر کہتا ہو، اس کو دے دیتے اور پہلی بات (کہ تحصیل دار کو دے دیا کرتے تھے) زیادہ صاف ہے اور وہ روایت اس معنی کی تائید کرتی ہے جو صغانی کے نسخے میں اسی حدیث کے پیچھے ہے کہ امام ابو عبداللہ بخاری نے کہا کہ وہ لوگ جمع کرنے کے لیے دے دیتے تھے نہ کہ خود فقیروں کو بانٹ دیتے تھے اور ابنِ خزیمہ کی ایک روایت میں ہے کہ عبد الوارث کی سند سے ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا: ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کب دیتے تھے، کہا: تحصیل دار جب تحصیلنے کے لیے بیٹھتا، میں نے پوچھا: تحصیل دار کب بیٹھتا تھا، کہا: عید کے دو ایک دن قبل اور امام مالک کی موطا میں نافع سے مروی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما عید کے دو تین دن پہلے ہی زکاتِ فطر اس کے پاس بھیج دیا کرتے تھے، جس کے پاس جمع ہوتا تھا اور شافعی رحمہ اللہ نے بھی انھیں سے روایت کی ہے

[1] فتح الباري (۳/ ۳۷٦)

اور کہا ہے کہ یہ بہتر ہے اور ہم عید سے پہلے صدقہ فطر تحصیل دار کے پاس بھیج دینے کو مستحب جانتے ہیں۔ نیز حدیث میں امام کے وصولِ زکات کے لیے عاملین کو بھیجنے کا بھی ذکر موجود ہے]

ایضاً (۳/ ۲۸۵) میں ہے:

"وفيه بعث السعاة لأخذ الزكاة" اهـ

[اس حدیث سے بھی تحصیل داروں کو زکات تحصیلنے کے لیے بھیجنا ثابت ہے]

"التلخيص الحبير" (ص: ١٧٦) میں ہے:

"حديث أن رسول اللهﷺ والخلفاء بعده كانوا يبعثون السعاة لأخذ الزكاة، هذا مشهور، ففي الصحيحين عن أبي هريرة بعث عمر على الصدقة، وفيهما عن أبي حميد: استعمل رجلا من الأزد، يقال له: ابن اللتبية، وفيهما عن عمر أنه استعمل ابن السعدي، وعند أبي داود أن النبيﷺ بعث أبا مسعود ساعيا، وفي مسند أحمد أنه بعث أبا جهم بن حذيفة متصدقا، وفيه أنه بعث عقبة بن عامر ساعيا.

وفيه من حديث قرة بن دعموص: بعث الضحاك بن قياس ساعيا، وفي المستدرك أنه بعث قيس بن سعد ساعياً، وفيه من حديث عبادة بن الصامت أنهﷺ بعثه على أهل الصدقات، وبعث الوليد بن عقبة إلى بني المصطلق ساعيا، وروى البيهقي عن الشافعي أن أبا بكر و عمر كانا يبعثان على الصدقة، وقد أخرجه الشافعي عن إبراهيم بن سعد عن الزهري، بهذا وزاد: ولا يوخرون أخذها في كل عام، وقال في القديم: وروي عن عمر أنه أخرها عام الرمادة، ثم بعث مصدقا، فأخذ عقالين عقالين، وفي الطبقات لابن سعد أن النبيﷺ بعث المصدقين إلى العرب في هلال المحرم سنة تسع، وهو في مغازي الواقدي بأسانيده مفسرا"[1] اهـ

[رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد آپ کے خلفا تحصیل داروں کو زکات تحصیلنے کے لیے بھیجا کرتے تھے، یہ مشہور بات ہے، چناں چہ صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ﷺ نے عمر کو صدقہ تحصیلنے کے لیے بھیجا اور صحیحین میں ابی حمید کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ابو مسعود رضی اللہ عنہ کو زکات تحصیلنے کے لیے بھیجا اور امام احمد کی مسند میں ہے کہ آپ نے ابو جہم بن حذیفہ کو زکات کی تحصیل کرنے کے لیے بھیجا اور اسی میں ہے کہ آپ نے عقبہ بن عامر کو زکات کی تحصیل کرنے کے لیے بھیجا۔

اور اسی میں قرہ بن دعموص سے روایت کی ہے کہ آپ نے ضحاک بن قیس کو زکات کی تحصیل کرنے کے لیے بھیجا اور حاکم کی مستدرک میں ہے کہ انھوں نے قیس بن سعد کو زکات کی تحصیل کرنے کے لیے بھیجا اور

[1] التلخيص الحبير (٢/ ١٦٠)

اسی میں عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو زکات والوں کے پاس بھیجا اور ولید بن عقبہ کو بنی مصطلق کے پاس زکات تحصیلنے کے لیے بھیجا اور بیہقی نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما تحصیل دار کو زکات کے تحصیلنے کے لیے بھیجا کرتے تھے، اس کو شافعی نے ابراہیم بن سعد سے انھوں نے زہری سے روایت کی ہے اور اس قدر زیادہ کہا ہے کہ اس کی تحصیل میں کسی سال دیر نہیں کرتے تھے اور شافعی نے قدیم قول میں کہا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے عام الرماد میں زکات کے لیے تحصیل دار بھیجنا اٹھا رکھا تو پھر دوسرے سال تحصیل دار بھیج کر دونوں سال کی زکات وصول کرائی اور ابن سعد کی طبقات میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صدقہ تحصیلنے والے کو عرب کی طرف ہجرت کے نویں سال محرم کے شروع مہینے میں بھیجا اور یہ امام واقدی کے مغازی میں ان کی اسناد سے مفصل مذکور ہے]

امام شوکانی "السیل الجرار" (۲/ ۷۰) میں لکھتے ہیں:

"إن أمر الزكاة قد كان إلى رسول اللهﷺ بلا شك ولا شبهة، وكان يبعث السعاة لقبضها، ويأمر من عليهم الزكاة بدفعها إليهم، وإرضائهم واحتمال معرتهم وطاعتهم، ولم يسمع في أيام النبوة أن رجلا أو أهل قرية صرفوا زكاتهم بغير إذن من رسول اللهﷺ، وهذا أمر لا يجحده من له معرفة بالسيرة النبوية وبالسنة المطهرة، وقد انضم إلى ذلك التوعد على الترك والمعاقبة بأخذ شطر المال وعدم الإذن لأرباب الأموال بأن يكتموا بعض أموالهم من الذين يقبضون الصدقة منهم بعد أن ذكروا له أنهم يعتدون عليهم، ولو كان إليهم صرف أموالهم لأذن لهم في ذلك، وأيضاً جعل الله سبحانه للعامل على الزكاة جزءًا منها في الكتاب العزيز، فالقول بأن ولايتها إلى ربها، يسقط مصرفا من مصارفها، صرح به الله سبحانه في كتابه العزيز، وأما المعارضة لهذا الأمر الذي هو أوضح من شمس النهار بأن خالد بن الوليد حبس أدراعه وأعتاده في سبيل الله عز وجل، فهذا على تقدير أنه حبسها عن الزكاة لا يكون منه إلا بإذن من رسول اللهﷺ، ولهذا صار ذلك معلوما عند رسول اللهﷺ، ومعلوم أن خالدا لا يأخذ جواز هذا التحبيس و إجزاءه عن الزكاة إلا من رسول اللهﷺ لأن مثل ذلك لا يعلم إلا من الشرع والإذن من رسول اللهﷺ لرب المال بالصرف في حكم القبض للزكاة منه، وأما على تقدير أن المراد بقوله: إنه حبس أدراعه وأعتاده في سبيل الله تعالىٰ، أن من كان هذا فعله في التقرب إلى الله عزوجل بوقف أخص أملاكه، وأحبها إليه مع مزيد حاجته إليها يبعد عنه أن يمنع الزكاة، فلا دلالة له على مراد القائل بالمعارضة، وأما ابن جميل الذي قيل للنبيﷺ أنه قد منع دفع

الزكاة فقالﷺ: «ما ينقم ابن جميل إلا أنه كان فقيرا فأغناه الله تعالىٰ» فليس فيه ما يعارض ما تقدم، وإن هذا الذم فيه أعظم دلالة على تحريم ما وقع منه من المنع، وليس فيه أنه صرفها إلى مصارفها وقررهﷺ على ذلك، وهكذا المعارضة بقضية ثعلبة بن حاطب، لا وجه لها، فإن ذلك رجل أخبر الله سبحانه أنه أعقبه نفاقا في قلبه، ولهذا امتنعﷺ من قبضها منه لما جاء بها بعد ذلك، وكذلك امتنع من قبضها منه الخلفاء الراشدون.①

والحاصل أنه ليس في المقام ما يدل على أن أمر الزكاة إلى أربابها في زمن النبوة قط، وبه يندفع جميع ما ذكره الجلال في شرحه ههنا، فإنه لم يأت بشيء يعتد به في المعارضة، وإذا تقرر هذا فقد ثبت أن ما كان أمره إلى رسول اللهﷺ فهو إلى الأئمة من بعده، ومن ذلك ما في الصحيحين وغيرهما من حديث أبي مسعود أن رسول اللهﷺ قال: «إنها ستكون بعدي أثرة و أمور تنكرونها» قالوا: يا رسول الله! فما تأمرنا؟ قال: «تؤدون الحق الذي عليكم، وتسألون الله الذي لكم» وأخرج مسلم وغيره من حديث وائل بن حجر قال: سمعت رسول اللهﷺ ورجل يسأله، فقال: أرأيت إن كان علينا أمراء يمنعونا حقنا، ويسألون حقهم؟ فقال: «اسمعوا وأطيعوا، فإنما عليهم ما حملوا، وعليكم ما حملتم» وفي الباب أحاديث.

وإذا عرفت هذا علمت أن الدفع إلى الإمام واجب لجميع أنواع الصدقات إلا أن يأذن لرب المال بالصرف جاز له ذلك.

وأما تقييد ذلك بأنه نافذ الأمر والنهي في البلد التي فيها رب المال، فوجهه إنها من جملة أموال الله التي تصرف في المصارف التي من جملتها الدفع عن البلاد والعباد، فإذا كان الإمام لا ينفذ له أمر في تلك الجهة كان عاجزا عن هذا، ولكنه إذا كان صحيح الولاية، وقد بايعه من يعتد به من المسلمين كانت طاعته واجبة على من بلغته دعوته، ومن جملة الطاعة النصرة له، ودفع ما أمره إليه، وعليه أن يقوم بحماية أهل تلك الجهة، ودفع عدوهم عنهم بما تبلغ إليه طاقته ثم هو لا يعجز عن أن يأخذ الزكاة من أغنياء تلك الجهة، ويصرفها في فقراءهم، كما أمر بذلك رسول اللهﷺ،

① المعجم الكبير للطبراني (٨/ ٢١٨) في إسناده علي بن يزيد الألهاني وهو متروك. قال الألباني رحمه الله: "هذا حديث منكر على شهرته، وآفته علي بن يزيد الألهاني وهو متروك، ومعان لين الحديث... قال العراقي في تخريج الإحياء (٣/ ١٥٣): سنده ضعيف، وقال الحافظ في تخريج الكشاف (٤/ ٧٧): إسناده ضعيف جداً" (السلسلة الضعيفة: ٤/ ١١٢)

وأما قوله: فمن أخرج بعد الطلب لم تجزئه ولو جاهلا، فلا وجه له بعد أن أوضحنا لك أن أمرها إلى الإمام بتلك الأدلة، بل من أخرج إلى غيره بغير إذنه لم تجزئه، وفي حكم الإذن منه ما هو معلوم من كثير من الأئمة من تفويض أهل العلم والصلاح بصرف زكاتهم في مصارفها، وصار ذلك كالعادة لهم، فإن هذا بمنزلة الإذن لهم، وإن لم يقع الإذن صريحا"[1] انتهى والله أعلم

[زکات تحصیلنے کا حق رسول اللہ ﷺ کو بے شک وشبہہ حاصل تھا اور آپ تحصیل دار کو زکات تحصیلنے کے لیے بھیجا کرتے تھے اور جن پر زکات فرض ہوتی ہے، ان کو حکم فرماتے تھے کہ تحصیل داروں کو دو اور ان کو راضی رکھو اور ان کی سختی کو برداشت کرو اور ان کی اطاعت کرو اور زمانہ نبوت میں کبھی یہ بات نہیں کی گئی کہ کسی شخص نے یا کسی بستی والوں نے بغیر حکم رسول اللہ ﷺ کے زکات خود بانٹی ہو اور یہ ایسی بات ہے، جس کا ایسا شخص انکار نہیں کر سکتا، جس کو سیرتِ نبویہ اور سنتِ مطہرہ کی معرفت ہے اور بایں ہمہ اس کے ترک پر آدھا مال چھین لینے کی دھمکی وسزا بھی ہے، مالکِ مال کو تحصیل داروں سے تھوڑا مال بھی چھپانے کی اجازت نہیں ہے، باوجودیکہ آپ ﷺ سے لوگوں نے تحصیل داروں کی زیادتی بھی بیان کی اور اگر لوگوں کو مال زکات بانٹنے کا خود اختیار ہوتا تو آپ ﷺ ان کو ضرور اس کی اجازت دیتے اور نیز اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں زکات میں سے اس کے تحصیل دار کا بھی ایک حصہ مقرر فرمایا ہے تو یہ کہنا کہ زکات کے بانٹنے کا اختیار اس کے مالک کو ہے، زکات کے مصرفوں میں سے ایک ایسی مصرف کو بیکار کر دینا ہے، جس کی صراحت خود خدا نے قرآنِ مجید میں فرما دی ہے اور نیز بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کو زکات تحصیلنے کے لیے بھیجا تو انھوں نے پیغمبر ﷺ سے عرض کیا کہ ابن جمیل اور خالد بن ولید اور عباس زکات نہیں دیتے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابن جمیل تو زکات دینا اس وجہ سے نامنظور کرتا ہے کہ وہ ایک غریب آدمی تھا، اللہ و رسول نے اس کو مال دار کر دیا اور خالد پر تو تم خواہ مخواہ زبردستی کرتے ہو اس نے تو اپنی ساری زرہیں اور کل اسباب فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔ باقی عباس کی زکات تو وہ زکات اور اسی قدر اور بھی میرے ذمہ ہے۔ پھر فرمایا: اے عمر! تم کو خبر ہے کہ چچا باپ ہی کے مثل ہے اور یہ حدیث اس بات کی خاص دلیل ہے کہ زکات بانٹنے کا اختیار مالکِ مال کو نہیں ہے، بلکہ مالکِ مال پر واجب ہے کہ زکات سردار یا اس کے نائب کے حوالے کر دے، اگر مالکِ مال کو اختیار ہوتا تو اس کو زکات کے مصرفوں میں خود تقسیم کرنے کا ضرور اختیار ہوتا اور اس کی قبولیت سردار کے پاس اور اس کے نائب کے

[1] السيل الجرار (٢٦/٢)

حوالے کر دینے پر موقوف نہ ہوتی اور نہ سردار کو یہ حق ہوتا کہ جو اپنی زکات سردار کے حوالے نہ کرے، اس کو عتاب کرے، کیوں کر ہوسکتا ہے کہ جس نے اپنی زکات سردار یا ان کے نائب کو نہ دی اس نے خود زکات کے مصرفوں میں بانٹ دیا ہو اور بھی امام شوکانی رحمہ اللہ نے سیل الجرار میں فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ بات ہرگز دلائل سے ثابت نہیں کہ مالک اپنی زکات خود بانٹ دیا کرتا ہو اور اس بیان سے وہ شبہہ دور ہوگیا جو جلال الدین نے اسی بیان میں اس کی شرح میں لکھا ہے، کیوں کہ ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، جو معارضہ کے قابل ہو اور یہ بھی سیل الجرار میں ہے کہ جب یہ بات ہے کہ جب یہ بات ثابت ہوئی تو یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ جو دستور آپ کے زمانہ شریف میں تھا۔ آپ کے بعد بھی وہی دستور اماموں کے بعد بھی رہا ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے جو بخاری و مسلم وغیرہما میں ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قریب ہے کہ میرے بعد خرابیاں اور ایسے ایسے کام ہوں گے، جن کو تم ناپسند کرو گے۔'' لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اس وقت کے لیے آپ ہم لوگوں سے کیا فرماتے ہیں، فرمایا: ''سرداروں کا جو حق تم پر ہے اس کو ادا کیے جاؤ اور اپنا حق جو سردار پر ہے، اس کو خدا سے مانگو۔'' دوسری دلیل یہ ہے، جو مسلم وغیرہ نے وائل بن حجر سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ ایک شخص آپ سے پوچھتا تھا کہ جب سردار لوگ ہمارا حق ادا نہ کریں اور اپنا حق ہم سے مانگیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تو فرمایا: ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے رہو، اس لیے کہ سرداروں پر جو تمھارا حق ہے، اس کی جواب دہی ان کے ذمہ ہے اور اس مسئلے میں اور بھی حدیثیں ہیں۔ جب تم نے یہ مسئلہ جان لیا تو یہ بھی جان لو کہ امام کو کل قسم کے صدقے حوالے کر دینے واجب ہیں، ہاں اگر سردار مالکِ مال کو بانٹنے کی اجازت دے تو اس کا خود بانٹ دینا درست ہے۔

لیکن اسے یوں مقید کرنا کہ امام کا اس ملک میں امر و نہی نافذ ہوتا ہو جس میں مال کا مالک رہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ من جملہ اللہ کے ان اموال کے ہے جن کو ان کے مصارف میں صرف کیا جاتا ہے، وہ مصارف جن میں بلاد و عباد کی طرف سے ادا کرنا بھی شامل ہے۔ جب اس علاقے میں امام کا حکم نہ چلتا ہو تو وہ اس سے عاجز ہوگا۔ لیکن جب اس کی ولایت صحیح ہو اور قابلِ اعتماد مسلمانوں نے اس کی بیعت کر رکھی ہو تو اس کی اطاعت کرنا ہر اس شخص پر واجب ہوگی جسے اس کی دعوت پہنچی ہو۔ من جملہ اطاعت کے اس کی نصرت و تایید کرنا بھی ہے اور اس میں اس چیز کا اس طرف لوٹانا بھی شامل ہے جس کا اس نے حکم دیا ہے، اس امام پر لازم ہے کہ وہ اس علاقے کے لوگوں کی حمایت پر قائم ہو اور ان کے دشمنوں کو مقدور بھر ان سے دور کرے، پھر وہ اس بات میں عاجز شمار نہ ہوگا کہ وہ اس علاقے کے اغنیا سے زکات وصول

کرے اور وہاں کے فقرا میں صرف و خرچ کر دے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔ رہا ان کا یہ قول: تو جس نے طلب کے بعد (زکات) نکالی تو اس سے وہ کفایت نہ کرے گی اگرچہ وہ جاہل ہو۔ اس کے بعد اس کے لیے کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ ہم نے تمھارے سامنے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ ان دلائل کے ساتھ اس کا معاملہ امام کے سپرد ہے، بلکہ جس شخص نے اس (امام) کی اجازت کے بغیر اس کے غیر کو ادا کی اس سے وہ کفایت نہ کرے گی، اکثر ائمہ کی طرف سے یہ بات تو معلوم ہے کہ اہلِ علم و صلاح کا لوگوں کے اپنی زکات کو اس کے مصارف میں صرف کرنے کے عمل کو ان کے سپرد کرنا امام کی طرف سے اجازت ہی کے حکم میں ہے۔ یہ مثل ان کی عادت کے ہو جائے گا اور یہ ان کے لیے اجازت ہی کے مرتبے میں ہے، اگرچہ صراحتاً اجازت واقع نہ ہوئی ہو]

المجيب: محمد عبدالله الغازيفوري. الجواب صحيح. الحقير حسين بن محسن الأنصاري اليماني، عفي عنه. الجواب صحيح. محمد بشير، عفي عنه. الجواب صحيح. سلامت الله، عفي عنه.

چندہ اکٹھا کر کے کارِ خیر میں خرچ کرنا:

سوال زید اطراف و اکناف سے چندہ وصول کر کے کارِ خیر میں صَرف کیا کرتا ہے، مثلاً: مسجد و مدرسہ و خرچِ نکاح و پل و تالاب وغیرہ، آیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب اگر ان امور کی واقعی ضرورت ہو تو چندہ وصول کر کے ان امور میں صَرف کرنا جائز ہے، ورنہ ناجائز۔

عن جرير قال: كنا في صدر النهار عند رسول اللهﷺ فجاءه قوم حفاة عراة مجتابي النمار أو العباء، مقلدي السيوف، عامتهم من مضر، بل كلهم من مضر، فتمعر وجه رسول اللهﷺ لما رأى بهم من الفاقة، فدخل، ثم خرج، فأمر بلالا فأذن وأقام، فصلىٰ، ثم خطب، فقال: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ...﴾ [النساء: ١] إلى آخر الآية: ﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ والآية التي في الحشر: ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ [الحشر: ١٨] تصدق رجل من ديناره، من درهمه، من ثوبه، من صاع بره، من صاع تمره، حتىٰ قال: ولو بشق تمرة، قال فجاء رجل من الأنصار بصرة كادت كفه تعجز عنها، بل قد عجزت، ثم تتابع الناس..." الحديث (رواه مسلم)[1]

[جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم دن کے آغاز میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھے کہ کچھ لوگ آئے،

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۱۷)

جو ننگے پاؤں اور ننگے بدن تھے، انھوں نے اونی دھاری دار یا عام چادریں پہن رکھی تھیں اور وہ تلواریں حمائل کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر، بلکہ سب مضر قبیلے سے تھے۔ ان کی تنگ حالی اور بھوک دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا۔ آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے، پھر باہر آ گئے۔ آپ ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ انھوں نے اذان و اقامت کہی۔ آپ ﷺ نے جماعت کروائی، پھر آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا: ﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ...﴾ [اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا] اور سورۃ الحشر کی آیت تلاوت کی: ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ [اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرو] پس کسی نے دینار صدقہ کیا، کسی نے درہم، کسی نے کپڑا، کسی نے گندم کا صاع اور کسی نے ایک صاع کھجوریں صدقہ کیں، حتی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "خواہ کھجور کا ایک ٹکڑا صدقہ کرو۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک آدمی ایک تھیلی اٹھاتے ہوئے آیا، قریب تھا کہ اس کا ہاتھ اسے اٹھانے سے عاجز آ جائے، بلکہ عاجز ہی آ گیا، پھر لوگ مسلسل آنے لگے... الحدیث][1]

كتبه: محمد عبد الله (١٨/ محرم ١٣٢٧هـ)

کیا بنی ہاشم کو صدقہ دینا درست ہے یا نہیں؟

سوال بنی ہاشم یعنی سادات کو صدقہ دینا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب بنی ہاشم کو زکوۃ لینا جائز نہیں ہے، اس کی وجہ یہ احادیث صحیحہ ہیں:

عن أنس قال: مر النبيﷺ بتمرة في الطريق، فقال: «لو لا أني أخاف أن تكون من الصدقة لأكلتها»[2] (متفق عليه)

---

[1] **١٨٣٩** : عن عبد الله بن عمرؓ قال: قال رسول اللهﷺ: «ما يزال الرجل يسأل الناس حتىٰ يأتي يوم القيامة ليس في وجهه مزعة لحم» (متفق عليه) [صحيح البخاري، رقم الحديث: ١٧٤، صحيح مسلم: ١٠٤/ ١٠٤٠]

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی لوگوں سے مانگتا رہتا ہے، حتی کہ جب وہ روزِ قیامت پیش ہوگا تو اس کے چہرے پر کوئی گوشت نہیں ہوگا۔"

١٨٤٦ : عن سمرة بن جندبؓ قال: قال رسول اللهﷺ: «المسائل كدوح يكدح بها الرجل وجهه فمن شآء أبقى على وجهه ومن شاء تركه إلا أن يسأل الرجل ذا سلطان أوفي أمر لا يجد منه بدا» (رواه أبو داود والترمذي والنسائي) [سنن أبي داود، رقم الحديث: ١٦٣٩، سنن الترمذي، رقم الحديث: ٦٨١، وقال حسن صحيح، سنن النسائي، رقم الحديث: ٢٦٠٠]

"سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سوال کرنا خراش ہے، آدمی ان کی وجہ سے اپنے چہرے پر خراشیں ڈالتا ہے۔ جو چاہے انھیں اپنے چہرے پر باقی رکھے اور جو چاہے انھیں ترک کر دے، البتہ آدمی بادشاہ سے سوال کرے یا کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کرے جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو پھر سوال کرنا جائز ہے۔"

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٩٩)

[انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سر راہ ایک (گری ہوئی) کھجور کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقے کی ہوگی تو میں اسے کھا لیتا]

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: أخذ الحسن بن علي تمرة من تمر الصدقة، فجعلها في فيه، فقال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: «كخ كخ» ليطرحها، ثم قال: «أما شعرت أنا لا نأكل الصدقة» (متفق عليه) [1]

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے صدقے کی کھجوروں میں سے ایک کھجور پکڑی اور اسے منہ میں ڈال لیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ٹھہرو، ٹھہرو'' تاکہ وہ اسے پھینک دیں، پھر فرمایا: ''کیا تجھے معلوم نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے؟]

وعن عبد المطلب بن ربيعة قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: «إن هذه الصدقات إنما هي أوساخ الناس، وإنها لا تحل لمحمد ولا لآل محمد» (رواه مسلم، مشكوة، ص: ١٥٣) [2]

[عبد المطلب بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ صدقات تو لوگوں (کے مال) کا میل کچیل ہے، لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے حلال نہیں]

مقروض کو زکات سے روپیہ دے کر واپس لے لینا جائز ہے یا نہیں؟

سوال مدیون کو مدِ زکوۃ سے روپیہ دے کر واپس لے لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب زکوۃ دہندہ کو بطورِ خود مدِ زکوۃ سے مدیون یا اور کسی کو دینا ہی جائز نہیں ہے۔ مشکوۃ میں ہے:

عن ابن عباس أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذا إلى اليمن فقال: «إنك تأتي قوما (إلى) فأعلمهم أن الله قد فرض عليهم صدقة توخذ من أغنيائهم، فترد على فقرائهم» [3] الحديث (متفق عليه)

[سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بلاشبہہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ کیا تو فرمایا: یقیناً تو ایسی قوم کے پاس جانے والا ہے... تو ان کو بتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکات فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے لے کر ان کے فقیروں کو دی جائے گی]

فتح الباری (۲/ ۵۷) میں ہے:

''استدل به على أن الإمام هو الذي يتولىٰ قبض الزكاة، وصرفها، إما بنفسه وإما بنائبه'' اھ

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢٠)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧٢)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩)

[اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ امامِ وقت (خلیفہ وغیرہ) ہی زکات وصول کرنے اور اسے تقسیم کرنے کا ذمے دار وحق دار ہے، خواہ وہ یہ کام خود کرے یا اپنے کسی نائب سے کروائے]

شرح عمدۃ الاحکام (۲/۳) میں ہے:

"قد يستدل به على وجوب إعطاء الزكاة للإمام، لأنه وصف الزكاة بكونها مأخوذة من الأغنياء، فكل ما اقتضىٰ خلاف هذه الصفة فالحديث ينفيه" اهـ

[یقیناً اس حدیث سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ زکات امام کو جمع کروانا واجب ہے، کیونکہ اس حدیث نے زکات کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ وہ اغنیا سے لی جائے گی، پس ہر وہ چیز جس کا تقاضا اس صفت کے خلاف ہے تو حدیث اس کی نفی کرتی ہے]

"نيل الأوطار" (۱۰/٤) میں ہے:

"استدل به على أن ولاية قبض الزكاة إلى الإمام، وإلى ذلك ذهبت العترة وأبو حنيفة وأصحابه ومالك والشافعي في أحد قوليه" اهـ

[اس حدیث سے یہ دلیل لی گئی ہے کہ زکات وصول کرنے کا ذمے دار امام ہے، چناں چہ عترہ، ابو حنیفہ، ان کے شاگرد، مالک اور شافعی اپنے دو قولوں میں سے ایک قول میں اسی طرف گئے ہیں]

نیز مشکوۃ (ص: ۱۴۹) میں ہے:

"عن أبي هريرة قال: لما توفي النبيﷺ واستخلف أبو بكر بعده (إلى) فقال: والله لو منعوني عناقا كانوا يؤدونها إلى رسول اللهﷺ لقاتلتهم على منعها"[1] الحديث (متفق عليه)

[سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبیِ مکرم ﷺ فوت ہوگئے اور آپ ﷺ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے ...تو انھوں (ابوبکر رضی اللہ عنہ) نے کہا: اللہ کی قسم! اگر انھوں نے بھیڑ کا بچہ، جو وہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے، مجھے دینے سے انکار کیا تو میں اس کے انکار پر بھی ان سے ضرور قتال کروں گا]

سورۂ توبہ میں ہے: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ [التوبة: ۱۰۳] [ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا] فتح القدیر شرح ہدایہ (۱/ ۳۱۱) میں ہے:

"قوله تعالىٰ: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ...﴾ يوجب حق أخذ الزكاة مطلقا للإمام، وعلى هذا كان رسول اللهﷺ والخليفتان بعده فلما ولي عثمانؓ وظهر تغير الناس كره أن يفتش السعاة على الناس مستور أموالهم ففوض الدفع إلى الملاك نيابة عنه، ولم يختلف الصحابةؓ عليه في ذلك، وهذا لا يسقط طلب الإمام أصلاً" اهـ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠)

[اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ ...﴾ زکات وصول کرنے کا حق مطلق طور پر امام کے لیے واجب کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد دونوں خلفا اسی پر کاربند رہے، پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے اور لوگوں کے حالات بدل گئے تو انھوں نے ناپسند کیا کہ عاملینِ زکات لوگوں کے خفیہ مالوں کی جانچ پڑتال کریں، لہٰذا انھوں نے اپنی نیابت میں متعلقہ اسٹاف کو یہ کام سونپ دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بارے میں ان سے کوئی اختلاف نہ کیا، مگر اس سے امام کا طلب کرنا سرے سے ختم نہیں ہوتا]

"شرح معاني الآثار للطحاوي" (١/ ٣١٢) میں ہے:

"للإمام أن يولي أصحاب الأموال صدقات أموالهم حتى يضعوها مواضعها، وللإمام أيضاً أن يبعث عليها مصدقين حتى يعشروها ويأخذوا الزكاة منها، وهذا كله قول أبي حنيفة وأبي يوسف و محمد"

[امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مال دار لوگوں کو یہ کام سپرد کر دے کہ وہ اپنے مالوں کی زکات، زکات کے مصارف میں خرچ کریں، نیز امام کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ صدقہ وصول کرنے والے عامل ان کے پاس بھیجے، جو ان سے عشر و زکات وصول کریں، یہ سب امام ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ کا موقف ہے]

"السيل الجرار" میں ہے:

"جعل الله سبحانه للعامل على الزكاة جزءًا منها في الكتاب العزيز فالقول بأن ولايتها إلى ربها يسقط مصرفا من مصارفها، صرح به الله سبحانه في كتابه العزيز"[1] اهـ

[اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کتابِ عزیز میں زکات کے عامل کے لیے زکات میں سے ایک حصہ رکھا ہے، پس اس موقف سے کہ زکات کی ادائی صاحبِ مال کے ذمے ہے، مصارف زکات میں سے ایک مصرف ساقط ہو جاتا ہے، جس کی اللہ نے اپنی کتاب میں صراحت کی ہے]

پھر "السيل الجرار" میں ہے:

"قد كان أمر الزكاة إلى رسول الله ﷺ بلا شك ولا شبهة وكان يبعث السعاة لقبضها ويأمر من عليهم الزكاة بدفعها إليهم، وإرضائهم واحتمال معرتهم وطاعتهم، ولم يسمع من أيام النبوة أن رجلا أو أهل قرية صرفوا زكاتهم بغير إذن من رسول الله ﷺ، وهذا أمر لا يجحده من له أدنىٰ معرفة بالسيرة النبوية والسنة المطهرة، وقد انضم إلى ذلك التوعد على الترك والمعاقبة بأخذ شطر المال وعدم الإذن لأرباب الأموال بأن يكتموا بعض أموالهم من الذين يقبضون الصدقة منهم بعد أن ذكروا له أنهم

---

[1] السيل الجرار للشوكاني (١/ ٢٦٠)

يعتدون عليهم، ولو كان إليهم صرف أموالهم لأذن لهم في ذلك"[1] اهـ

[زکات کا معاملہ بلا شک وشبہہ رسول اللہ ﷺ کے سپرد تھا، چناں چہ آپ ﷺ زکات وصول کرنے کے لیے عاملینِ زکات کو روانہ کرتے تھے اور جن کے ذمے زکات واجب ہوتی انھیں حکم دیتے کہ وہ ان عاملین کو زکات ادا کر دیں، ان کو راضی کریں، ان کی سختی برداشت کریں اور ان کی اطاعت کریں۔ زمانہ نبوت میں یہ سننے میں نہیں آیا کہ کسی آدمی نے یا کسی بستی کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر از خود اپنی زکات کو تقسیم کیا ہو۔ جس شخص نے سیرتِ نبویہ اور سنتِ مطہرہ کی ادنا سی بھی معرفت حاصل کی ہے، وہ اس بات کا انکار نہیں کر سکتا۔ مزید یہ کہ جب مال دار لوگوں نے عاملین کی زیادتی کرنے کی آپ ﷺ کو شکایت لگائی تو آپ ﷺ نے ان کو زکات ادا نہ کرنے پر دھمکی دی، ان کا نصف مال چھین لینے کی سزا سنائی اور ان مال داروں کو یہ حکم دیا کہ وہ زکات وصول کرنے والے عاملین سے اپنے مال ہرگز نہ چھپائیں۔ اگر ان مال داروں کو اپنی زکات خود تقسیم کرنے اور صَرف کرنے کا حق ہوتا تو آپ ﷺ اس کی ضرور اجازت دے دیتے]

نیز "السیل الجرار" میں ہے:

"وهذا الحديث أوضح دليل على أنّ ولاية صرف الزكاة ليست إلى أربابها، بل عليهم أن يدفعوها إلى الإمام أو نائبه، ولو كانت الولاية إليهم لجاز صرفها إلى مصارفها بأنفسهم، ولم يتوقف قبولها على دفعها إلى الإمام أو نائبه، ولم يجز للإمام العتاب على من لم يدفعها إليه لاحتمال أنه قسمها بنفسه في مصارفها" اهـ

[یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ زکات کو از خود صَرف کرنے اور تقسیم کرنے کی ذمہ داری زکات دینے والوں کے سپرد نہیں ہے، بلکہ ان پر یہ لازم ہے کہ وہ امام یا اس کے نائب کو زکات جمع کروائیں۔ اگر یہ کام ان کے سپرد ہوتا تو ان کے لیے زکات کو اس کے مصارف میں صَرف کرنا جائز ہوتا اور زکات کی قبولیت امام یا اس کے نائب کو ادا کرنے پر موقوف نہ ہوتی اور امام کے لیے اس شخص کو سزا دینا جائز نہ ہوتا، جو اسے زکات جمع نہ کروائے، کیوں کہ اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ اس شخص نے از خود زکات کو اس کے مصارف میں خرچ کر دیا ہو]

اور بھی مشکوۃ میں ہے:

عن عمر بن الخطاب: حملت على فرس في سبيل الله فأضاعه الذي كان عنده فأردت أن أشتريه، وظننت أنه يبيعه برخص، فسألت النبي ﷺ فقال: «لا تشتره ولا تعد

[1] السيل الجرار (١/ ٢٦٠)

في صدقتك، وإن أعطاكه بدرهم فإن العائد في صدقته كالكلب يعود في قيئه»[1]
واللّٰه تعالیٰ أعلم

[عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کو فی سبیل اللہ ایک گھوڑا بطورِ سواری عطا کیا تو اس نے اسے ضائع کر دیا، میں نے اسے خریدنا چاہا اور مجھے خیال ہوا کہ وہ اسے ارزاں نرخوں پر فروخت کر دے گا، میں نے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے خریدو اور نہ اپنا صدقہ واپس لو خواہ وہ ایک درہم میں تمھیں عطا کرے، کیوں کہ اپنا صدقہ واپس لینے والا، اپنی قے چاٹنے والے کی طرح ہے]

قرض سے زکات کاٹنا اور زکات میں تصرف:

سوال اگر کسی شخص کے یہاں روپیہ باقی ہو اور روپیہ اس سے وصول بوجہ نادہندی کے نہ ہوتا ہو تو اس روپیہ کو اگر زکوۃ میں چھوڑ دیا جائے تو وہ زکوۃ ادا ہوسکتی ہے یا نہیں اور زکوۃ کے روپیہ سے مرمت کنواں یا مسجد یا کسی لڑکے یتیم کی شادی کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب خود زکوۃ دہندہ اگر اس روپیہ کو زکوۃ میں چھوڑ دے تو اُس سے زکوۃ ادا نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اگر زکوۃ دہندہ زکوۃ کے روپیہ سے مرمت کنواں یا مسجد کی کرے یا یتیم لڑکے کی شادی کر دے تو اس سے بھی زکوۃ ادا نہیں ہوسکتی۔ زکوۃ کا کل روپیہ زکوۃ وصول کنندہ کے پاس پہنچا دینا لازم ہے، خود زکوۃ دہندہ کو اس میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ لقولہ تعالیٰ:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ [الآية] [ان کے مالوں سے صدقہ لے]

ولحديث: «تؤخذ من أغنيائهم فترد علىٰ فقرائهم»[2]

[ان کے اغنیا سے لے کر ان کے فقرا و مساکین میں تقسیم کر دی جائے]

رہن اور قرض میں دیے ہوئے مال کی زکات:

سوال ایک شخص نے ہزار روپیہ دے کر دس گھماؤ زمین رہن لی ہے، تو آیا اس ہزار روپیہ کی زکوۃ بعد حولانِ حول کے اس شخص پر فرض ہے یا نہیں؟ عام رواج ہے کہ لوگ روپیہ دے کر زمین رہن لے لیتے ہیں اور مالک زمین جب تک روپیہ ادا نہ کرے، دس سال یا پندرہ سال ہوں، اتنے سال کی زکوۃ روپیہ والا نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے، کس چیز کی زکوۃ دوں اور زمین کا انتفاع کھاتا ہے۔ جب کچھ روپیہ جمع ہو جاتا ہے تو زمین رہن لے لیتا ہے۔ غرض بعض ہزار کا دولتمند ہے، بعض دو ہزار، بعض تین ہزار کا، مگر زمین گروی لے جاتا ہے اور روپیہ کی زکوۃ ایک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠٢) مشكاة المصابيح (١/ ٤٤١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩)

پیسہ نہیں دیتا۔ اسی طرح ایک شخص نے دو تین سو روپیہ کسی سے قرض لیا ہے، قرض دیے کو سال گزر گیا، مگر روپیہ قرضائی نے ابھی نہیں ادا کیا، آیا اس شخص پر مقروض روپیہ کی زکوۃ بعد حولانِ حول کے فرض ہوگی یا نہیں؟

جواب دونوں مندرجہ سوال صورتوں میں سے پہلی صورت میں کسی گذشتہ سال کی زکاۃ دائن (مرتہن) پر اس دین کی بابت فرض نہیں ہے۔ اسی طرح دوسری صورت میں گزشتہ سال کی زکاۃ مقروض پر اس قرض کی بابت نہیں ہے، بلکہ پہلی صورت میں ہر سال مدیون (راہن) پر اور دوسری صورت میں مستقرض پر فرض ہے (بشرطیکہ راہن مذکور اور مستقرض مذکور صاحبِ نصاب ہوں اور نصاب پر حولانِ حول بھی ہو چکا ہو) امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے، چنانچہ خود ان کی کتاب "کتاب الأم" (طبع مصر) میں یہ مصرح ہے اور استدلال میں وہی اثر حضرت عثمان کا پیش کیا ہے، جس کو امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

"إن عثمان بن عفان كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين فليؤد دينه حتى يحصل أموالكم فتؤدون منها الزكاة"[1] اھ

[بلاشبہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ یہ تمھاری زکات کا مہینا ہے، لہٰذا جس کے ذمے قرض ہو، وہ اپنا قرض ادا کرے، تاکہ تمھارے اصل مال باقی رہ جائیں تو تم ان کی زکات ادا کرو]

کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مدیونان ادائے زکوۃ کے وقت قبل اپنے اپنے ذمہ کے دین نہ ادا کیے رہیں گے، تو کل مال کی جو ان کے پاس موجود ہوگا، زکوۃ دینی پڑے گی، ورنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پہلے ہی اس بات کو گوش گزار کر دینا بے فائدہ ٹھہرے گا۔ دائن یعنی مرتہن کا یہ کہنا کہ روپیہ میرے پاس موجود نہیں ہے، کس چیز کی زکوۃ دوں؟ بہت ٹھیک ہے، اس روپیہ سے فائدہ تو اٹھائے مدیون اور زکوۃ فرض ہو دائن پر، کسی آیت یا حدیث سے اس کا ثبوت معلوم نہیں ہوتا، ہاں دائن جو زمین کا انتفاع کھاتا ہے، یہ بے شک ناجائز اور برا ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (۲۲/ شوال ۱۳۳۵ھ)

مالِ تجارت میں زکات کا مسئلہ:

سوال مالِ تجارت میں زکوۃ ہے یا نہیں؟ صحیح مسلک سے مطلع فرمائیں۔

(المستفتی: بہادر خان، صوبہ دار۔ صدر بازار، بریلی)

جواب صحیح مسلک اس باب میں جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے، یہی ہے کہ مالِ تجارت میں زکوۃ ہے۔ اس وقت صرف ایک مرفوع حدیث پر اکتفا کرتا ہوں اور وہ یہ ہے:

"عن سمرة بن جندب رضي الله عنه أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم كان يأمرنا أن نخرج الصدقة من الذي نعد للبيع"[2] (رواه أبو داود)

---

[1] موطأ الإمام مالك (۵۹۳)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۵۶۲) اس کی سند میں "جعفر بن سعد" اور "خبیب بن سلیمان" ضعیف ہیں۔ امام ہیثمی فرماتے ہیں:←

[سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ جو مال ہم تجارت کے لیے تیار کریں، اس سے صدقہ (زکات) دیا کریں]

اس باب میں اور روایات مرفوع اور موقوف بھی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

كتبه: محمد عبد الله (٥/ ذی الحجه ١٣٣١ھ)

زمین کا عشر اور پیداوار کے اخراجات:

سوال شریعت میں جو عشر مقرر ہے، آیا وہ سرکاری مالیہ کاٹ کر ادا کیا جائے یا مالیہ سرکاری اس میں شمار کیا جائے؟ جواب مدلل قرآن و حدیث سے ہو۔

جواب مالیہ سرکاری دو طرح کا ہے، ایک زمین کا، ایک پانی کا۔ زمین کا مالیہ کاٹ کر عشر دے، پانی کا مالیہ کاٹنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے بجائے دسویں حصے کے بیسواں حصہ دے، کیونکہ نہر کا پانی قیمتاً آیا ہے، گویا ایسا ہوگیا جیسے کنویں کا پانی۔ کاٹنے کی صورت یہ ہے کہ زمین کا تمام غلہ اگر نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے پہلے اتنے دانے الگ کر لیے جائیں جتنوں سے یہ مالیہ پورا ہو جائے، اس کے بعد عشر نکالا جائے۔ حدیث میں ہے:

عن عائشة رضي الله عنها قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول: «ما خالطت الزكاة مالا إلا أهلكته»[1] (رواه الشافعي، مشكوة، ص: ١٤٩)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جس مال میں زکات خلط ملط ہو جائے تو وہ (زکات) اس کو تباہ کر دیتی ہے]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زکوۃ کا تعلق مال سے ہے اور قرآن مجید میں بھی ہے، کہ پکنے کے دن کھیتی کا حق دو۔[2] اس آیت میں عشر کو کھیتی کا حق کہا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشر کا تعلق کھیتی سے ہے، پس جتنی کھیتی اس کے قبضہ میں ہے، اسی کی زکوۃ اس کے ذمہ ہوگی، جتنی مالیے میں گئی، وہ اس کے قبضہ میں نہیں، اس لیے اس کی زکوۃ اس کے ذمہ نہیں پڑے گی، اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص کے پاس سو روپیہ ہے، اس سے پچاس چوری چلے گئے تو وہ باقی پچاس کی زکوۃ دے گا نہ کہ سو کی۔ یہی فتویٰ عبداللہ صاحب روپڑی کا لکھا ہوا ہے۔[3]

← "وفي إسناده ضعف" (مجمع الزوائد: ٣/ ٦٩) البتہ ایک حدیثِ نبوی کے ان الفاظ: «وأدوا زكاة أموالكم» (سنن الترمذي، رقم الحديث: ٦١٦) سے واضح ہوتا ہے کہ ہر قسم کے مال میں زکات دینا ضروری ہے۔

[1] الأم للشافعي (٢/ ٥٩) شعب الإيمان (٣/ ٢٧٣) اس کی سند میں "محمد بن عثمان الجمحي" راوی ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٠٦) تمام المنة في التعليق على فقه السنة (ص: ٣٥٩)

[2] دیکھیں: سورة الأنعام [آیت: ١٤١]

[3] دیکھیں: ہفت روزہ "تنظیم اہل حدیث" (١٨/ ٧) فتاویٰ علمائے حدیث (٧/ ١٤١)

کیا عشر کے لیے ہر جنس کا پانچ وسق ہونا ضروری ہے؟

سوال زید نے اپنی اراضی میں مٹر، جَو، نخود [چنے] کی کاشت کی، فرداً فرداً ہر جنس کی پیداوار تین وسق کو نہیں پہنچتی، مگر ہر جنس کی پیداوار مل کر تین وسق ہو جاتی ہے، تو زکاۃ لازم آئے گی یا کیا اور زکاۃ ہر جنس سے علیحدہ دی جائے گی یا کیا؟

جواب پیداوار اراضی پر زکوۃ جب فرض ہوتی ہے کہ پیداوار مذکور پانچ وسق یا اس سے زائد ہو۔ پانچ وسق سے کم ہو تو اس میں زکوۃ فرض نہیں ہے اور اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا ہر جنس پانچ پانچ وسق ہو، تب زکوۃ فرض ہے یا سب مل کر پانچ وسق ہو جائے، تب بھی زکوۃ فرض ہو جاتی ہے؟ میں اس مسئلے کا جواب دینے کے لیے پوری طرح سے تیار نہیں ہوں، لیکن ظاہراً جہاں تک مجھے معلوم ہوتا ہے، یہی ہے کہ ہر جنس پانچ پانچ وسق ہو، تب زکوۃ فرض ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب.

خراجی زمین سے عشر لینا:

سوال عشر خراجی زمین سے لینا جائز اور حق ہے کہ نہیں؟ از روئے قرآن و حدیث کے بطریقِ قوت وصحت کے جو امر ثبوت یا عدمِ ثبوت عشر ارض خراجی کی نسبت ہو، لکھیں۔

جواب عشر یا نصف عشر ہر ایک زمین کی پیداوار میں فرض ہے، خواہ زمین خراجی ہو یا غیر خراجی۔ عشر یا نصف عشر کے فرض ہونے میں زمین کا غیر خراجی ہونا شرط نہیں ہے۔

بخاری شریف میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وفيما سقي بالنضح نصف العشر»[1]

[جس (کھیت یا باغ) کو بارش یا چشموں کے پانی سے سیراب کیا جائے یا اس (کھیت یا باغ) کی زمین تر ہو تو اس (کی پیداوار) میں سے عشر (فرض) ہے اور جس (کھیت یا باغ) کو کھینچ کر پانی پلایا جائے تو اس میں نصف عشر ہے]

اس حدیث سے ثابت ہے کہ جو کھیت یا باغ کہ مینہ یا چشمہ کے پانی سے سیراب کیا جائے یا اس کھیت یا باغ کی زمین ہی ایسی تر ہو کہ اس کی تری کافی ہو جائے، اس کی پیدوار میں عشر فرض ہے اور جس کھیت یا باغ کو پانی کھینچ کر سیراب کیا جائے، اس کی پیداوار میں نصف عشر فرض ہے۔

اس حدیث میں جو دو صورتیں مذکور ہوئی ہیں، ایک عشر کے فرض ہونے کی اور دوسری نصف عشر کے فرض ہونے کی، ان میں سے کسی صورت میں بھی یہ تخصیص نہیں ہے کہ اس کھیت یا باغ کی زمین خراجی ہو یا غیر خراجی۔ پس اگر خراجی ہو تو بھی اس میں عشر یا نصف عشر فرض ہے اور غیر خراجی ہو تو بھی، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤١٢) نیز دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٨١)

﴿ وَ مِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ﴾ [البقرة: ٢٦٧]

یعنی اور جو کچھ پیداوار ہم تمھارے لیے زمین سے پیدا کر دیں، اس میں سے دو۔

یہ آیتِ کریمہ عشر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ آیتِ کریمہ بھی عام ہے، اس میں بھی یہ تخصیص نہیں ہے کہ وہ زمین خراجی ہو یا غیر خراجی۔ پس اگر خراجی ہو تو بھی عشر یا نصف عشر فرض ہے اور غیر خراجی ہو تو بھی۔ اور بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ اٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ﴾ [الأنعام: ١٤١] یعنی جو کھیت یا باغ کہ بار آور ہوں تو ان کے کاٹنے اور توڑنے کے دن ان کا حق ادا کرو۔

یہ آیتِ کریمہ بھی عشر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور یہ بھی عام ہے، اس میں بھی یہ تخصیص نہیں ہے کہ اس کھیت یا باغ کی زمین خراجی ہو یا غیر خراجی۔ پس اگر خراجی ہو تو بھی عشر یا نصف عشر فرض ہے اور غیر خراجی ہو تو بھی، اور جو لوگ کہتے ہیں کہ خراجی زمین میں عشر فرض نہیں ہے اور اپنے اس قول پر حدیث «لا یجتمع عشر و خراج في أرض مسلم»[1] (یعنی کسی مسلمان کی کسی ایک ہی زمین میں عشر اور خراج دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے) سے استدلال کرتے ہیں، ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔

اولاً: اس وجہ سے کہ حدیث مذکور باطل اور بے اصل ہے، ہرگز استدلال کے قابل نہیں، اس لیے کہ اس کا راوی جس پر اس حدیث کا مدار ہے، ''یحییٰ بن عنبسہ'' ہے اور وہ سخت واہی ہے، یہاں تک کہ ائمہ حدیث نے اس کو کذاب اور دجال اور وضاع تک بھی فرما دیا ہے۔[2]

ثانیاً: اس وجہ سے کہ عشر زمین کی پیداوار میں ہے، پس خراجی زمین کی پیداوار میں عشر کے فرض ہونے سے حدیث مذکور کی مخالفت ہرگز لازم نہیں آتی، کیونکہ جب خراج نفس زمین پر مقرر ہوتا ہے، نہ کہ زمین کی پیداوار پر اور عشر زمین کی پیداوار میں فرض ہوتا ہے، نہ کہ نفس زمین میں تو عشر و خراج دونوں کا ایک ہی زمین میں ایک ساتھ جمع ہونا لازم نہیں آیا۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبداللہ (٢٢/ صفر ١٣٣٣ھ)

کیا ایک زمین میں عشر و خراج جمع ہو سکتے ہیں؟

سوال زمین ہندوستان کی عشری ہے یا خراجی اور عشر و خراج جمع ہو سکتے ہیں ایک قطعہ زمین میں یا نہیں؟

جواب ہر زمین کی پیداوار میں بشرطِ نصاب ہر مسلمان مالک پیداوار پر عشر یا نصف عشر، جیسی صورت ہو، واجب ہے، خواہ زمین مذکورہ مملوکہ مالک پیداوار ہو یا نہ ہو۔ مملوکیت کی تخصیص بلا مخصص ہے، دلائل وجوبِ عشر قیدِ مملوکیت سے معریٰ ہیں، اسی طرح زمین مذکور خراجی ہو یا غیر خراجی، اس کی قید بھی بلا دلیل ہے اور حدیث «لا یجتمع عشر و خراج في أرض مسلم» [کسی مسلمان کی ایک ہی زمین میں عشر اور خراج دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے] صالح

[1] دیکھیں: نصب الرایة (٣/ ٤٤٢)

[2] مصدر سابق

احتجاج نہیں ہے۔[1] ان سب امور کے دلائل کتاب و سنت میں موجود اور تحریراتِ اہلِ علم میں مسطور و شائع ہیں۔ لہٰذا صرف ان امور کے ذکر پر اکتفا کیا گیا اور ذکرِ دلائل سے قطع نظر رکھا گیا۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ الغازیفوري

نہروں سے سیراب ہونے والی زمین کا عشر:

سوال جو زمینیں نہروں سے سیراب ہوتی ہیں اور سرکار انگریزی پانی کا محصول لیتی ہے، آیا ان زمینوں میں عشر ہے یا نصف عشر؟

جواب ان زمینوں میں عشر واجب ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: «فیما سقت السماء والعیون أو کان عثریا العشر، و ما سقي بالنضح نصف العشر»[2] اھ

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس (کھیت یا باغ) کو بارش یا چشموں کے پانی سے سیراب کیا جائے یا اس (کھیت یا باغ) کی زمین تر ہو تو اس (کی پیداوار) میں عشر (فرض) ہے اور جس (کھیت یا باغ) کو کھینچ کر پانی پلایا جائے تو اس میں نصف عشر ہے]

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں پیداوار اراضی کے باب میں دو ہی صورتیں رکھی گئی ہیں: عشر یا نصف عشر۔ عشر تو جب ہے کہ وہ اراضی بارش کے پانی سے یا چشموں کے پانی سے سیراب کی گئی ہوں یا وہ اراضی عثری ہوں، اور نصف عشر جب کہ وہ اراضی بیل وغیرہ کے ذریعے سے پانی کھینچ کر سیراب کی گئی ہوں اور یہ معلوم ہے کہ چشموں کے پانی سے سیراب کرنے کی یہی صورت ہے کہ ان چشموں سے جداول کھدوا کر یا کھود کر اراضی مذکورہ کی طرف لے آئیں، تاکہ ان کے ذریعے سے چشموں کا پانی اراضی مذکورہ میں پہنچ کر اراضی مذکورہ کو سیراب کرے اور جداول اگر خود نہ کھودیں، بلکہ مزدوروں سے کھدوائیں تو اس صورت میں کھدوائی ضرور دینی پڑے گی، مگر شارع نے اس صورت میں بھی عشر ہی واجب فرمایا ہے تو اس سے ظاہر ہوا کہ جب اراضی چشموں کے پانی سے سیراب کی جائیں تو اگرچہ اس میں کچھ خرچ بھی پڑے، تب بھی عشر ہی واجب ہوتا ہے اور جو زمینیں نہروں سے سیراب ہوتی ہیں اور سرکار انگریزی پانی کا محصول لیتی ہے، وہ محصول جداول کی کھدوائی سے زیادہ نہیں ہوتا ہے، لہٰذا اُن زمینوں میں بھی جو نہروں سے سیراب ہوتی ہیں اور سرکار انگریزی پانی کا محصول لیتی ہے، عشر واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۲/ شوال ۱۳۳۵ھ)

---

[1] نصب الرایة (۳/ ٤٤۲) اس حدیث پر تفصیلی نقد و تبصرہ اگلے فتوے میں ملاحظہ کریں۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱٤۱۲) نیز دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۸۱)

زمین کا خراج اور زکات مالک اور کرایہ دار میں سے کس کے ذمے ہے؟

سوال ما قولكم أيها العلماء ـرحمكم الله ـ فيمن استأجر أرضا من مالكها المسلم، إجارة أو مزارعة، هل الزكاة على العامل في الأرض، وهو المستأجر أو على مالك الأرض، وهو المؤجر؟ وهل إذا كانت الأرض خراجية، واشتراها المسلم من الكافر الذي كان عليه الخراج، هل كان عليه الخراج والزكاة معا أو لا؟ وهل ورد في سقوط الزكاة إذا كانت خراجية، حديث صحيح يحتج به أم لا؟ بينوا تؤجروا.

[آپ کا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے زمین کے مسلمان مالک سے اجارے یا کھیتی باڑی کے لیے زمین کرائے پر لی۔ اس زمین کی زکات زمین کرائے پر لینے اور اس میں کاشت کاری کرنے والے پر ہوگی یا کرائے پر دینے والے مالک کے ذمے ہوگی؟ نیز جب کوئی مسلمان کسی کافر سے ایسی خراجی زمین خرید لے جس پر وہ (کافر) خراج ادا کرتا تھا، کیا اب اس خریدار مسلمان پر خراج اور زکات دونوں واجب ہوں گے یا نہیں؟ کیا خراجی زمین سے زکات کے ساقط ہونے کی کوئی ایسی صحیح حدیث وارد ہوئی ہے جس سے حجت پکڑی جا سکے یا نہیں؟]

جواب والله الموفق لإصابة الصواب. اعلم أن العشر ثبت بالكتاب والسنة والإجماع والمعقول.

أما الكتاب فقال الله تعالىٰ: ﴿وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ فإن عامة المفسرين على أنه العشر، وهو مجمل بينه قوله ﷺ: «ما سقت السماء ففيه العشر، وما سقي بغرب أو دالية ففيه نصف العشر»[1] ولأن العشر يجب في الخارج، لا في الأرض، فكان ملك الأرض وعدمه سواء. انتهى، كذا في رد المحتار على الدر المختار للعلامة الشامي رحمه الله.[2]

فظاهر القرآن والحديث أن الزكاة تتعلق بمن نبت الزرع في ملكه، فمن استخرج فوائد الأرض فعليه الزكاة، سواء كان الزارع المالك أو المستأجر أو المستعير أو غير ذلك، قال في الدر المختار: العشر على المؤجر،.وعندهما على المستأجر، قال في الحاوي: وبقولهما نأخذ.[3] انتهى

قال في فتح القدير: إن العشر منوط بالخارج، وهو للمستأجر عليه.[4] انتهى وفي فتاوىٰ شيخ الإسلام ابن تيمية رحمه الله:

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٤٥) ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت ضعیف ہے، کیوں کہ اس کی سند میں "محمد بن سالم الهمداني" ضعیف ہے۔

[2] رد المحتار (٢/ ٣٢٥)

[3] رد المحتار على الدر المختار (٢/ ٣٣٤)

[4] فتح القدير (٢/ ٢٥٠)

وأما العشر فهو عند الجمهور كمالك والشافعي وأحمد وغيرهم على من نبت الزرع علىٰ ملكه، كما قال الله تعالىٰ: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ﴾ فالأول يتضمن زكاة التجارة، والثاني يتضمن زكاة ما أخرج الله لنا من الأرض، [فمن أخرج الله له الحَبَّ فعليه العشر، فإذا استأجر أرضا ليزرعها] فالعشر على المستأجر [عند هؤلاء، العلماء كلهم، وكذلك عند أبي يوسف و محمد] وقال الإمام أبو حنيفة رحمه الله: العشر على المؤجر، وإذا زارع أرضا علىٰ النصف، فما حصل للمالك فعليه عشره، وما حصل للعامل فعليه عشره، علىٰ كل واحد منهما عشر ما أخرجه الله له، ومن أعير أرضا أو أقطعها أو كانت موقوفة علىٰ عينه فإن زرع فيها زرعا فعليه العشر، وإن آجرها فالعشر علىٰ المستأجر، و إن زارعها فالعشر بينهما، ودليل هؤلاء الأئمة أن العشر حق الزرع، ولهذا كان عندهم أنه يجتمع العشر والخراج، لأن العشر حق الزرع، ومستحقه أهل الزكاة، والخراج حق الأرض ومستحقه أهل الفيئ، فهما حقان لمستحقين بسببين مختلفين، فاجتمعا كما لو قتل مسلما خطأ فعليه الدية لأهله، والكفارة حق الله، وكما لو قتل صيدا مملوكا، وهو محرم، فعليه البدل لمالكه، وعليه الجزاء حق الله.

وأبو حنيفة رحمه الله يقول: العشر حق الأرض فلا يجتمع عليها حقان، ومما احتج به الجمهور أن الخراج يجب في الأرض التي يمكن أن تزرع، سواء زرعت أم لم تزرع، وأما العشر فلا يجب إلا في الزرع، والحديث المرفوع: «لا يجتمع العشر والخراج» كذب باتفاق أهل الحديث.[1] انتهى كلام شيخ الإسلام ابن تيمية رحمه الله.

وقال الحافظ ابن حجر في تخريج أحاديث الهداية: حديث «لا يجتمع عشر وخراج في أرض على مسلم» رواه ابن عدي عن ابن مسعود، رفعه بلفظ: «لا يجتمع علىٰ مسلم خراج وعشر» وفيه يحيىٰ بن عنبسة، وهو واه، وقال الدارقطني: هو كذاب، وصح هذا الكلام عن الشعبي، وعن عكرمة، أخرجهما ابن أبي شيبة، و صح عن عمر بن عبدالعزيز أنه قال لمن قال إنما علي الخراج: الخراج علىٰ الأرض، والعشر علي الحب. أخرجه البيهقي من طريق يحيىٰ بن آدم في الخراج له، وفيها عن الزهري: ولم يزل المسلمون على عهد رسول الله ﷺ وبعده يعاملون على الأرض، ويستكرونها، ويؤدون الزكاة عما يخرج منها، فنرى هذه الأرض على نحو ذلك، وفي الباب حديث ابن عمر: «فيما سقت السماء العشر» متفق عليه، ويستدل بعمومه.[2] انتهى

---

[1] مجموع الفتاوىٰ (٢٥/ ٥٥)

[2] الدراية لابن حجر (٢/ ١٣٢)

وقال الزيلعي في تخريج أحاديث الهداية: واستدل ابن الجوزي للشافعي في الجمع بين العشر والخراج بعموم الحديث، عن ابن عمر عن رسول اللهﷺ أنه سنَّ فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وفيما سقي بالنضح نصف العشر. انفرد به البخاري، قال: وهذا عام في الأرض الخراجية وغيرها، واستدل الشيخ تقيّ الدين في الإمام للشافعي بما أخرجه البيهقي عن يحيىٰ بن آدم حدثنا سفيان بن سعيد عن عمرو بن ميمون بن مهران قال: سألت عمر بن عبد العزيز عن المسلم تكون في يده أرض الخراج، فيسأل الزكاة، فيقول: إنما علي الخراج؟ فقال: الخراج على الأرض، والعشر على الحب.

و أخرج أيضاً عن يحيىٰ قال: حدثنا ابن المبارك عن يونس قال: سألت الزهري عن زكاة الأرض التي عليها الخراج. فقال: لم يزل المسلمون على عهد رسول اللهﷺ وبعده يعاملون على الأرض، ويستكرونها، ويؤدون الزكاة مما خرج منها فنرىٰ هذه الأرض على نحو ذلك. انتهى

قال الشيخ: الأول فتوىٰ عمر بن عبد العزيز، والثاني فيه إرسال عن النبيﷺ. انتهى كلام الزيلعي.[1]

وقال الحافظ ابن حجر في تخريج أحاديث الهداية: روى ابن أبي شيبة وعبد الرزاق من طريق الزبير بن عدي أن دهقانا أسلم على عهد عليؓ فقال عليؓ: إذا أقمت بأرضك رفعنا الجزية عن رأسك، وأخذناها من أرضك. فإن تحولت فنحن أحق بها، ومن طريق محمد بن عبيد الثقفي عن عمر و عليؓ قال: إذا أسلم، وله أرض، وضعنا الجزية، وأخذنا خراجها.[2] انتهى

ولا يخفىٰ أن الزكاة حق الفقراء كما تقدم، والخراج حق الأرض، ومستحقه أهل الفيء، فكيف يسقط حق الفقراء، ويبقىٰ حق أهل الفيء، هذا لا يقبله ذو إنصاف، لأنه إذا رفعت عنه الجزية الواجبة بسبب ذل الكفر، فلا شك أنه يكلف بالزكاة الواجبة التي هي حق الفقراء، وأحدُ أركانِ الإسلام التي لا يصح إلا بالإقرار بها وأدائها، وحديث ابن عمر السابق: «فيما سقت السماء العشر» متفق عليه، يؤيد ما قلناه، فكيف يترك حق الإسلام وحق الفقراء، ولا يلزم بذلك؟ فإن هذا لا يقوله إلا من لم يلاحظ الدلائل الشرعية التي لا تخفىٰ على كل ذي إنصاف. والله اعلم۔"تحفة المحتاج شرح المنهاج" میں ہے:

"وعلى زارع أرض فيها خراج وأجرة الزكاة، ولا يسقطها وجوبهما لاختلاف الجهة، والخبر النافي لاجتماعهما ضعيف إِجماعا بل باطل ولا يوديهما من حبها

---

[1] نصب الراية (٣/ ٤٤٢)

[2] الدراية لابن حجر (٢/ ١٣٢)

لا بعد اخراج زكاة الكل، وفي المجموع: لو آجر الخراجية فالخراج على المالك، ولا يحل لمؤجر أرض أخذ أجرتها من حبها قبل أداء زكاته فإن فعل لم يملك قدر الزكاة فيؤخذ منه عشر ما بيده أو نصفه كما لو اشترىٰ زكاويا لم تخرج زكاته"[1]

[آگاہ رہو کہ کتاب وسنت، اجماع اور معقول کے ساتھ عشر ثابت ہے۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ پس عام مفسرین کا یہی موقف ہے کہ اس سے مراد عشر ہے، یہ آیت مجمل ہے اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد اس کا بیان ہے:

«مَا سَقَتِ السَّمَاءُ فَفِيهِ الْعُشْرُ، وَمَا سُقِيَ بِغَرْبٍ أَوْ دَالِيَةٍ فَفِيهِ نِصفُ الْعُشْرِ»

[جو زمین بارش سے سیراب ہو اس میں عشر (دسواں حصہ) ہے اور جسے ڈول یا رہٹ کے ذریعے سیراب کیا جائے اس میں نصف العشر (بیسواں حصہ) ہے]

کیونکہ عشر پیداوار میں واجب ہے نہ کہ زمین میں، لہٰذا زمین کی ملکیت اور عدمِ ملکیت برابر ہے۔ پس قرآن و حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ زکات کا تعلق اس شخص کے ساتھ ہے جس کی ملکیت میں کھیتی باڑی اُگتی ہے۔ لہٰذا جسے زمین کے فوائد (پیداوار) حاصل ہوئے اس کے ذمے زکات ہے۔ خواہ کاشت کرنے والا زمین کا مالک ہو یا اس نے زمین کرائے پر دے رکھی ہو اور عاریتاً لی ہو یا کوئی اور صورت ہو۔ درمختار کے مصنف نے کہا ہے: عشر زمین کرائے پر دینے والے کے ذمے ہے اور ان دونوں کے نزدیک کرائے پر لینے والے کے ذمے ہے۔ حاوی میں ہے کہ ان دونوں کا قول ہی ہم اختیار کریں گے۔

فتح القدیر کے مصنف نے لکھا ہے: بلاشبہہ عشر پیداوار کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ زمین کرائے پر لینے (اور اس میں کاشت کاری کرنے) والے کے ذمے ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتاوی میں ہے: جمہور، جیسے امام مالک، شافعی، اور احمد رحمہم اللہ وغیرہ ہیں، کے نزدیک عشر اس شخص پر واجب ہے جو اپنی ملکیت میں کھیتی باڑی کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ پس آیت کا پہلا حصہ تجارت کی زکات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا حصہ اس پیداوار پر زکات کو بیان کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے نکالی ہے۔ [پس جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیداوار نکالی ہے اسی کے ذمے عشر ہے، جب وہ کاشتکاری کی غرض سے زمین کرائے پر لے]

پس (زمین) کرائے پر لینے والے کے ذمے عشر ہے۔ [ان تمام علما کے نزدیک اور اسی طرح قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک] امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: زمین کرائے پر دینے والے کے ذمے عشر ہے۔ جب وہ نصف پیداوار کے عوض زمین کاشتکاری کے لیے دے۔ مالک کے حصے میں جتنی پیداوار آئے اس کے ذمے اس کا عشر

[1] تحفة المحتاج، كتاب الزكاة، باب زكاة النبات (ص: ٢٤٢)

ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نکالی ہے۔ جس کو کوئی زمین عاریتاً دی گئی یا اسے الاٹ کر دی گئی یا زمین اس کی نگرانی میں دے دی گئی تو اگر وہ اس میں کاشتکاری کرے تو اس کے ذمے عشر ہوگا اور اگر وہ اسے کرائے پر دے دے تو کرائے پر لینے والے کے ذمے عشر ہوگا اور اگر وہ بٹائی پر کاشتکاری کے لیے کسی کو دے تو عشر ان دونوں کے ذمے ہوگا۔ ان ائمہ کی دلیل یہ ہے کہ عشر کھیتی باڑی کا حق ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک یہ موقف ہے کہ عشر اور خراج جمع ہوں گے، کیونکہ عشر پیداوار پر ہے اور اس کے مستحق وہی لوگ ہیں جو زکات کے مستحق ہیں اور خراج زمین پر ہے اور اس کے مستحق مال ہی کے مستحق لوگ ہیں۔ لہٰذا وہ دو مختلف سببوں کے ساتھ دو قسم کے مستحقوں کے حق ہیں، پس وہ دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح اگر وہ کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمے دیت ہوگی جو مقتول کے ورثا کو دی جائے گا اور اس کے ذمے کفارہ بھی ہوگا جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اسی طرح اگر وہ احرام میں کسی مملوکہ شکار کو قتل کر دے تو اسے اس جانور کے مالک کو اس کے بدلے میں اس جیسا جانور دینا ہوگا اور اس پر اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر جزا و بدلہ بھی ہوگا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عشر زمین کا حق ہے پس اس زمین پر دو حق جمع نہیں ہوں گے، جمہور نے جس چیز کے ساتھ دلیل پکڑی ہے وہ یہ ہے کہ خراج اس زمین میں واجب ہے جو زمین کاشتکاری کے لائق ہے، خواہ اس میں کاشتکاری کی جائے یا نہ کی جائے۔ رہا عشر تو وہ صرف پیداوار پر واجب ہے اور درج ذیل مرفوع حدیث: «لَا يَجْتَمِعُ الْعُشْرُ وَالْخَرَاجُ» [عشر و خراج جمع نہیں ہو سکتے] یہ روایت اہل الحدیث کے اتفاق سے جھوٹی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ھدایۃ کی احادیث کی تخریج میں فرمایا ہے: حدیث «لَا يَجْتَمِعُ الْعُشْرُ وَ خَرَاجٌ فِيْ أَرْضِ عَلٰى مُسْلِمٍ» [مسلمان پر کسی زمین میں عشر اور خراج اکٹھے نہیں ہو سکتے] اسے ابن عدی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ میں بیان کیا ہے: «لَا يَجْتَمِعُ عَلٰى مُسْلِمٍ خَرَاجٌ وَّ عُشْرٌ» [مسلمان کے ذمے خراج و عشر جمع نہیں ہو سکتے] اس کی سند میں یحییٰ بن عنبسہ راوی ہے، جو ضعیف ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا ہے؛ وہ کذاب راوی ہے۔ یہ کلام شعبی اور عکرمہ رحمہ اللہ سے بھی صحیح ثابت ہے، جس کو ابن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز سے صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے اس شخص کو کہا جس نے کہا تھا کہ میرے ذمے تو خراج ہے: خراج تو زمین پر ہے اور عشر پیداوار پر۔ اس روایت کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے یحییٰ بن آدم کے واسطے سے اپنی کتاب ''الخراج'' میں بیان کیا ہے۔ اس میں یہ زہری کے واسطے سے ہے: مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور اس کے بعد زمین پر معاملہ کرتے تھے۔ زمین کرائے پر لیتے تھے اور اس کی پیداوار سے زکات ادا کرتے تھے۔ پس ہم اس زمین کو اسی قبیل سے گمان کرتے ہیں۔ اس باب میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی درج ذیل حدیث مروی ہے: «فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرُ» (متفق علیہ) [بارش سے سیراب ہونے والی زمین پر عشر ہے] اور اس کے عموم سے استدلال کیا جاتا ہے۔

زیلعی رحمہ اللہ نے احادیثِ ہدایہ کی تخریج میں کہا ہے: ابن الجوزی رحمہ اللہ نے عشر اور خراج کے درمیان جمع میں عمومِ حدیث کے ساتھ شافعی رحمہ اللہ ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس زمین پر عشر مقرر کیا ہے جو زمین بارش اور چشموں سے سیراب ہوتی ہو یا وہ نمی والی زمین ہو۔ رہی وہ زمین جس کو کھینچ کر پانی پلایا جائے اس میں بیسواں حصہ ہے۔ اس روایت کو امام بخاری رحمہ اللہ بیان کرنے میں متفرد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ خراجی اور غیر خراجی زمین کے بارے میں عام ہے۔ شیخ تقی الدین نے امام میں امام شافعی رحمہ اللہ کے لیے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے بیہقی رحمہ اللہ نے یحییٰ بن آدم سے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم کو سفیان بن سعید نے بیان کیا ہے، انھوں نے عمرو بن میمون بن مہران سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا ہے: میں نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے اس مسلمان کے بارے میں سوال کیا جس کی ملکیت میں خراج کی زمین ہے، اس سے زکات کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے: مجھ پر تو صرف خراج ہے، تو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کہا: خراج تو زمین پر ہے، جب کہ عشر پیداوار پر۔

نیز امام بیہقی رحمہ اللہ نے یحییٰ سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا کہ ہمیں ابن المبارک نے یونس سے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ میں نے زہری رحمہ اللہ سے اس زمین کی زکات کے بارے میں سوال کیا جس پر خراج ہے تو انھوں نے جواب دیا: مسلمان رسول اللہ ﷺ کے دور میں اور اس کے بعد زمین کے بارے میں معاملہ کرتے رہے، وہ زمین کرائے پر لیتے تھے اور اس کی پیداوار سے زکات ادا کرتے تھے، لہٰذا ہم اس زمین کو اس جنس سے گمان کرتے ہیں، انتہیٰ

جنابِ شیخ (زیلعی رحمہ اللہ) نے فرمایا: پہلا فتوی عمر بن عبدالعزیز کا ہے اور دوسری روایت نبیِ مکرم ﷺ سے مرسلاً ثابت ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے احادیثِ ہدایہ کی تخریج میں کہا ہے: امام ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق رحمہما اللہ نے زبیر بن عدی کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک کسان نے اسلام قبول کیا تو علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر تو اپنی زمین میں رہے گا تو ہم تیرے اوپر سے جزیہ ہٹا دیں گے اور وہ تیری زمین سے لیں گے، پھر اگر تم اپنی زمین سے نقل مکانی اختیار کر لو گے تو ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں، نیز محمد بن عبید الثقفی کے واسطے سے عمر و علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: جب اس نے اسلام قبول کر لیا، درآنحالیکہ اس کے پاس زمین تھی تو ہم نے اس پر سے جزیہ ہٹا دیا اور ہم نے اس زمین کا خراج وصول کیا۔

مخفی نہ رہے کہ زکات فقرا کا حق ہے، جیسا کہ پہلے گزرا اور خراج زمین پر لازم ہے جو اہلِ فیٔ کا حق ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ فقرا کا حق ساقط ہو جائے اور اہل فیٔ کا حق باقی رہے۔ کوئی صاحبِ انصاف اس کو قبول نہیں کرتا ہے، کیونکہ جب کفر کی ذلت کی وجہ سے اس پر واجب جزیہ اس سے ہٹا دیا گیا تو بلاشبہہ اسے زکات کا مکلّف ٹھہرایا جائے گا جو کہ فقرا کا حق ہے اور ان ارکانِ اسلام میں سے ایک ہے جن کا اقرار کرنے اور ان کے ادا کرنے کے بغیر اسلام صحیح نہیں ہوتا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی وہ حدیث جو پہلے گزر چکی ہے: «فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ الْعُشْرِ» (متفق عليه) وہ بھی ہمارے اس موقف کی تایید کرتی ہے، لہٰذا اسلام اور فقرا کا حق لازم کیے بغیر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ یہ بات تو صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے دلائل شرعیہ کا ملاحظہ نہ کیا ہو جو ہر صاحبِ انصاف پر مخفی نہیں ہے۔ واللہ أعلم

تحفۃ المحتاج میں ہے: زمین کو کاشت کرنے والے پر خراج اور زکات کی اجرت ہے، ان دونوں کا وجوب زکات کو ساقط نہیں کرتا ہے، کیوں کہ دونوں کی جہت مختلف ہے۔ ان دونوں کے اجتماع کے لیے خبرِنافی اجماعاً ضعیف، بلکہ باطل ہے۔ وہ اس زمین کی پیداوار سے دونوں کو ادا کرے گا نہ سارے کی زکات نکالنے کے بعد۔ "المجموع" میں ہے: اگر وہ خراجی زمین کرائے پر لے تو اس کا خراج مالک کے ذمے ہوگا۔ زمین کرائے پر دینے والے کے لیے اس کی پیداوار سے، اس کی زکات ادا کرنے سے پہلے، اس کا کرایہ لینا حلال نہیں ہے۔ پس اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ زکات کی مقدار کا مالک نہیں بنے گا۔ اس کے ہاتھ میں جو پیداوار ہوگی اس سے دسواں حصہ یا بیسواں حصہ لیا جائے گا۔ جس طرح وہ اگر ایسی زکات والی زمین خرید لے جس کی زکات نہیں نکالی گئی]

صدقہ فطر ہر شخص پر فرض ہے:

سوال کتاب "هداية الإسلام" میں لکھا ہے کہ حضرت رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ صدقہ عید الفطر اپنی جورو کی طرف سے ایک ہو یا چار ہوں اور بڑے لڑکے اور چھوٹے دولتمند لڑکے کی طرف سے مالک مکان پر واجب نہیں ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ السائل: ابو محمد اکبر خان ڈاکٹر، از دار جلنگ

جواب حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ جورو کا صدقہ فطر شوہر پر واجب ہے، جیسا کہ امام مالک و امام شافعی و امام احمد بن حنبل و بعض دیگر ائمہ کا مذہب ہے۔ فتح الباری (ص: ۶۱ چھاپہ دہلی) میں ہے: "قال مالك والشافعي والليث وأحمد وإسحاق: تجب (صدقة الفطر) علىٰ زوجها" [امام مالک، شافعی، لیث، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ ہیں کہ (عورت کا) صدقہ فطر اس کے خاوند کے ذمے واجب ہے] اسی طرح جن لوگوں کا خرچ جس شخص پر واجب ہے، ان کا صدقہ فطر بھی اسی شخص پر واجب ہے۔ حدیث مذکور یہ ہے:

"عن نافع عن ابن عمر قال: فرض رسول اللهﷺ زكاة الفطر صاعا من تمر أو صاعا من شعير عن العبد والحر والذكر والأنثىٰ والصغير والكبير من المسلمين"

(سنن دارقطني، ص: ۲۰۰)

[نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے، وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے ہر غلام و آزاد، مرد و عورت اور چھوٹے اور بڑے پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو صدقہ فطر فرض فرمایا]

اسی صفحہ میں اثر ذیل بھی ہے، جو حدیث مذکور کا موید ہے:

"عن ابن عمر أنه كان يعطي صدقة الفطر عن جميع أهله صغيرهم وكبيرهم ممن يعول وعن رقيقه و عن رقيق نسائه"[1]

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنے پروردہ افرادِ خانہ خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سب کی

[1] سنن الدارقطني (۲/ ۱٤۱)

طرف سے صدقہ فطر ادا کرتے تھے، حتی کہ اپنے غلام اور اپنی بیویوں کے غلام کی طرف سے بھی]

اسی صفحہ میں ایک یہ حدیث بھی ہے:

"قال: أمر رسول اللهﷺ بصدقة الفطر عن الصغير والكبير والحر والعبد ممن يمونون"①

[راوی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زیرِ کفالت چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم دیا]

یہ آخر الذکر حدیث اگرچہ مرفوعاً ضعیف ہے، جیسا کہ خود دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"رفعه القاسم، وليس بقوي، والصواب موقوف" انتهى

[قاسم نے اسے مرفوع بیان کیا ہے اور وہ قوی نہیں ہے، جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے]

اس وجہ سے یہ بھی سابق حدیث کی تائید سے خالی نہیں ہے اور سابق حدیث کی مویدات اور بھی ہیں۔



① سنن الدار قطني (٢/ ١٤١) علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو تعددِ طرق کی بنا پر حسن قرار دیا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٣/ ٣٢١)

كتاب الصوم

آرام دہ سفر میں روزہ چھوڑنا:

سوال روزہ رمضان کو ایسے سفر میں کہ ہر طرح پر آسائش و آرام ملے اور سواری ریل کی ہو، ایسی صورت میں روزہ افطار کرنا چاہیے یا نہیں؟ کیونکہ کسی امر کی تکلیف اس سفر میں نہیں ہے۔

جواب حالتِ سفر میں روزہ رکھنے نہ رکھنے کا اختیار دیا گیا ہے اور یہ قید نہیں ہے کہ وہ سفر آرام کا ہو یا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾

(قرآن شريف پاره ٢ سورة بقرة، ركوع ٢٣)

[پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا کسی سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے]

وعن أنس بن مالك قال: كنا نسافر مع النبيﷺ فلم يعب الصائم على المفطر، ولا المفطر على الصائم.[1] والله أعلم (بخاري شريف مع فتح الباري، طبع دهلى: ٢/ ٢٨١)

[انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ ہم نبیِ کریم ﷺ کے ساتھ سفر کرتے تو روزے دار روزہ چھوڑنے والے پر اعتراض کرتا تھا اور نہ روزہ چھوڑنے والا روزے دار پر]

كتبه أضعف عباد المعبود المدعو بمحمود عفا الله عنه. الجوابات كلها صحيحة.

كتبه: محمد عبد الله. الأجوبة ناطقة بالحق والصواب بلا شك وارتياب. محمد سليمان.

روزے کا فدیہ:

سوال میں جہاں تک قرآن شریف کو دیکھتا ہوں، روزۂ رمضان کی بابت مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روزے کا رکھنا افضل و اولیٰ تو بے شک ہے، مگر یہ نہیں کہ اس کا فدیہ نہ ہو سکے۔ آیاتِ قرآن ملاحظہ ہوں: ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنَ﴾ [البقرة: ١٤٨] اس آیت کی نسبت جتنے اقوال ہیں، میری نظر میں ہے۔ ① "لا" مقدر ہے۔ ② ہمزہ افعالِ سلب کے لیے ہے۔ ③ ﴿فَلْيَصُمْهُ﴾ سے منسوخ ہے۔ (قولِ صحابہ فی البخاری)

تیسرا قول پہلے دونوں کے خلاف ہے، کیوں کہ نسخ چاہتا ہے کہ نہ "لا" مقدر ہے نہ ہمزہ سلب ہے، تاکہ مفہوم مخالف ہو کر نسخ ہو سکے، بلکہ وہی معنی ہیں جو متبادر ہیں کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں، نہ رکھنے کی صورت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٦)

میں ان پر فدیہ واجب ہے۔ روزہ رکھنا اچھا ہے: ﴿اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ہاں نسخ کا دعویٰ مرفوع نہیں، بلکہ موقوف ہے، جس کو ''لا'' مقدر یا ہمزہ سلب کہنے والوں نے بھی گویا تسلیم نہیں کیا۔ پس اگر میں بھی اس کا قائل نہ ہوں تو غالباً کسی بڑے نا قابلِ معافی جرم کا مرتکب نہیں ہوں گا۔[1]

جواب روزہ رمضان کا بیان سورہ بقرہ رکوع (۲۳) کی پہلی آیت سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے کل مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ اس میں کسی کو نہ خلاف ہے نہ ہوسکتا ہے کہ ﴿كُتِبَ﴾ یہاں ''فُرِضَ'' کے معنی میں ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ تم کل مسلمانوں پر روزہ فرض کیا گیا۔ پھر فرمایا: ﴿اَيَّاماً مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ یعنی روزہ جو تم کل مسلمانوں پر فرض کیا گیا، صرف گنتی کے چند روز فرض کیا گیا۔ پھر فرمایا: وہ گنتی کے چند روز کیا ہیں: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ یعنی ماہِ رمضان کے ایام ہیں، جو ۲۹ یوم ہیں یا زیادہ سے زیادہ ۳۰ یوم۔ پس اس آیت سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوا کہ ہر سال پورے ماہِ رمضان کا روزہ کل مسلمانوں پر فرض کیا گیا، پھر فرمایا: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ صیغہَ امر ہے، جو وجوب اور فرضیت کے لیے موضوع ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ جو شخص تم مسلمانوں میں سے اس مہینے میں حاضر و موجود ہو، اس پر اس مہینے کا روزہ رکھنا فرض ہے۔

اس آیت سے وہی مضمون ثابت ہوا، جو پہلی آیت سے ثابت ہوا تھا کہ ہر سال پورے ماہِ رمضان کا روزہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس تکرار سے فرضیتِ صومِ رمضان کو موکد فرما دیا۔ پھر فرمایا: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ یعنی روزے کی رات میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمھارے لیے حلال کیا گیا۔ رات کی قید سے ثابت ہوا کہ روزے کے دن میں عورت کے پاس جانا حلال نہیں ہے اور جب حلال نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ حرام ہے۔ پس اس آیت سے ثابت ہوا کہ روزے کے دن میں عورت کے پاس جانا حرام ہے۔ پھر فرمایا: ﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾، ﴿وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا﴾ [البقرة: ۱۸۷] یعنی جب روزے کی رات میں عورتوں کے پاس جانا تمھارے لیے حلال کر دیا گیا تو اب تم روزے کی رات میں اپنی عورتوں سے مباشرت کرو اور صرف مباشرت ہی نہیں، بلکہ کھاؤ اور پیو بھی۔ یعنی کھانا اور پینا بھی روزے کی رات میں تمھارے لیے حلال کر دیا گیا۔ یہاں بھی رات کی قید سے معلوم ہوا کہ روزے کے دن میں جس طرح عورت کے پاس جانا حرام ہے، اسی طرح کھانا پینا حرام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز حرام ہے، اس کا چھوڑ دینا فرض ہے۔

پس اس آیت سے ثابت ہوا کہ روزے کے دن میں ان تینوں کاموں کا چھوڑ دینا فرض ہے۔ پھر آگے اس مضمون کو اور بھی واضح کر دیا اور فرمایا: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ [البقرة: ۱۸۷] یعنی روزے کی رات میں جو تمھارے لیے عورت کے پاس جانا اور کھانا پینا حلال کر دیا گیا تو یہ سب اس

---

[1] ہفت روزہ ''اہلحدیث'' امرتسر (۴/ اگست ۱۹۱۱ء، ۲۵/ اگست ۱۹۱۱ء، ۱۸/ ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ)

وقت تک ہے کہ رات کی کالی دھاری سے صبح کی سفید دھاری تم کو نمایاں ہوجائے، یعنی صبح صادق تم کو نمایاں ہوجائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ صبح صادق نمایاں ہوتے ہی مذکورہ بالا تینوں کام روزے دار پر حرام ہوجاتے ہیں۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دن شرع میں صبح صادق سے شروع ہوتا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ یعنی پھر جب رات آ جائے تو روزہ ختم کر دو اور رات آتی ہے سورج ڈوبنے سے تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جب سورج ڈوب جائے تو روزہ ختم کر دو۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ رات شرع میں سورج ڈوبنے سے شروع ہوتی ہے اور ﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ تا ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ سے معلوم ہوا کہ روزہ اسی کا نام ہے کہ صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک مذکورہ بالا تینوں کاموں کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر چھوڑ دیں۔

اس آیت سے روزے کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی اور شرعی دن کی تحدید بھی، جس میں روزے دار پر مذکورہ بالا تینوں کام حرام ہوجاتے ہیں کہ وہ صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک ہے۔

الحاصل ان تمام آیاتِ صوم منقولہ بالا سے نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر سال ہر ماہِ رمضان کے ہر دن میں صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک عورت کے پاس جانے اور کھانے اور پینے کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر چھوڑ دینا ہر مسلمان پر فرض کیا ہے۔ پھر واضح ہو کہ جس طرح کبھی کبھی بعض قوانین سے بعض لوگ مستثنیٰ کر دیے جاتے ہیں، اسی طرح اس قانونِ فرضیتِ صوم سے بھی بعض لوگ مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں اور وہ مستثنیٰ مریض و مسافر ہیں۔ پھر مریض و مسافر جو مستثنیٰ کر دیے ہیں، ان کی قسمیں ہیں۔ ایک وہ مریض و مسافر جو روزہ رکھ ہی نہیں سکتے ہیں اور دوسرے وہ مریض و مسافر جو روزہ رکھ سکتے ہیں، مگر فی الجملہ مشقت کے ساتھ۔ اول قسم کی نسبت فرمایا: ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ یعنی اس قسم کے مریض و مسافر روزہ افطار ہی کر ڈالیں اور جب صحیح و مقیم ہوجائیں تو اپنی صحت و اقامت کے ایام میں اتنے روزے گن کر رکھیں اور اسی قسم کے مریض و مسافر کی نسبت حدیثِ صحیح میں وارد ہوا:

(١) «ليس من البر الصوم في السفر»[1] رواه الشيخان عن جابر مرفوعاً.

[سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے]

(٢) و روىٰ ابن ماجه عن عبد الرحمن بن عوف مرفوعاً: «صائم رمضان في السفر كالمفطر في الحضر»[2] مشكاة، باب صوم المسافر.

[سفر میں رمضان کا روزہ رکھنے والا حضر میں روزہ چھوڑنے والے کی طرح ہے]

دوسری قسم کی نسبت فرمایا: ﴿فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ نیز فرمایا: ﴿وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ یعنی اس

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٥)

(2) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦٦) اس کی سند میں انقطاع ہے، کیوں کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے والد عبدالرحمٰن بن عوف سے نہیں سنا۔

دوسری قسم کے مریض و مسافر روزہ رکھیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے اور روزہ افطار کریں تو بھی جائز ہے، مگر اس صورت میں ان کو فی روزہ ایک مسکین کو کھانا دینا واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبد اللہ الغازیفوري (۱۳/ شعبان ۱۳۲۹ھ)

ایک تعاقب کا جواب: ۸/ شعبان سنہ رواں کے ''اہلِ حدیث'' میں سوال شائع ہوا تھا کہ آیتِ کریمہ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ﴾ کے مطابق روزے کا رکھنا فرض نہیں معلوم ہوتا، بلکہ بحکم ﴿اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ افضل ہے۔ اس عاجز نے سوال ہذا کا ایک جواب لکھا تھا، جو ۲۹/ شعبان سنہ رواں کے ''اہلِ حدیث'' میں شائع ہوا تھا، جس میں سورت بقرہ رکوع (۲۳) کی متعدد آیات سے فرضیت روزہ رمضان کی ثابت کی تھی۔ پھر اثباتِ فرضیت کے بعد یہ لکھا تھا کہ جس طرح کبھی کبھی بعض قوانین سے بعض لوگ مستثنیٰ کر دیے جاتے ہیں، اسی طرح اس قانون فرضیتِ صومِ رمضان سے بھی بعض لوگ مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں اور وہ مستثنیٰ مریض اور مسافر ہیں، پھر مریض اور مسافر جو مستثنیٰ کیے گئے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ مریض اور مسافر جو روزہ رکھ سکتے ہیں، مگر فی الجملہ مشقت کے ساتھ۔ اول قسم کی نسبت فرمایا: ﴿فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ یعنی اس قسم کے مریض اور مسافر روزہ افطار ہی کر ڈالیں اور جب صحیح اور مقیم ہو جائیں تو صحت اور اقامت کے ایام میں اتنے روزے گن کر رکھ لیں اور اسی قسم کے مریض اور مسافر کی نسبت حدیثِ صحیح میں وارد ہوا:

① «لیس من البر الصوم في السفر»[1] رواہ الشیخان عن جابر مرفوعاً.

[سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے]

② و رویٰ ابن ماجه عن عبد الرحمن بن عوف مرفوعاً: «صائم رمضان في السفر کالمفطر في الحضر»[2] مشکاة، باب صوم المسافر.

[سفر میں رمضان کا روزہ رکھنے والا حضر میں روزہ چھوڑنے والے کی طرح ہے]

دوسری قسم کی نسبت فرمایا: ﴿فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ نیز فرمایا: ﴿وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی اس دوسری قسم کے مریض اور مسافر روزہ رکھیں تو یہ اُن کے لیے بہتر ہے اور روزہ افطار کریں تو یہ بھی ان کو جائز ہے، مگر اس صورت میں ان کو فی روزہ ایک مسکین کو کھانا دینا واجب ہے۔

اس کے بعد ۱۲/ شوال سنہ رواں کے ''اہلِ حدیث'' میں جناب نواب وقار نواز جنگ مولانا وحید الزمان خان

---

① صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۸٤٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۱۵)

② سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱٦٦٦) اس کی سند میں انقطاع ہے، کیوں کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے والد عبدالرحمٰن بن عوف سے سماع نہیں کیا۔

صاحب کی ایک تحریر شائع ہوئی، جس میں میرے جواب مذکورہ بالا کے آخری حصے پر، جو مستثنیٰ سے تعلق رکھتا ہے، ایک پسندیدہ عالمانہ طریقے سے کچھ بحث کی ہے، جو قابلِ قدر ہے۔ اگر علما اسی طرح کے پسندیدہ عالمانہ طریقے سے آپس میں بحث کر لیا کریں تو بہت کچھ علمی فوائد کے حصول کی امید کی جا سکتی ہے۔

مولانا ممدوح کی بحث حسبِ تفصیل ذیل ہے:

1. قسم ثانی کے اشخاص صحیح و مقیم ہو جائیں تو اُن پر قضا لازم ہے یا نہیں؟
2. ہمارے زمانے کے بعض لوگ خلافِ مسلک جمہور سلف اور خلف ابو مسلم اصفہانی اور اصم کے قولِ مردود کی طرف مائل ہو رہے ہیں کہ ان پر قضا نہیں ہے۔
3. اگر قضا نہ ہو تو قسم ثانی کے مریض اور مسافر قسم اول کے مریض اور مسافر سے اچھے رہے کہ صرف فدیہ پر سے چھوٹ گئے۔ حالاں کہ قیاس اس کو مقتضی تھا کہ قسم اول کے لوگ اچھے رہتے، کیوں کہ وہ بالکل غیر مستطیع تھے۔
4. اگر قضا لازم ہو تو یہ دریافت طلب ہوگا کہ وجوبِ قضا کی دلیل قرآن شریف سے کیا ہے؟
5. اگر یہ کہا جائے کہ آگے چل کر جو فرمایا: ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ﴾ تو یہ اعتراض ہوگا کہ ایک جگہ مریض اور مسافر سے صرف غیر مستطیع مراد رکھنا اور دوسری جگہ عام کہ مستطیع اور غیر مستطیع دونوں کو شامل ہو، یہ ذرا بعید معلوم ہوتا ہے۔
6. ایک شبہہ اَور اس عاجز کے مسلک پر وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ جس مریض اور مسافر کو بالکل طاقت صوم نہ ہو، اس کو تو فدیہ دینا تا صحتِ کامل نادرست ٹھہرا اور جس کو جہد کے ساتھ طاقت ہو، اس کو فدیہ دینا درست ٹھہرا۔ یہ بھی ذرا بعید معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے کہ ان شبہات کو رفع فرمائیں گے۔

اس بحث کا جواب حسبِ تفصیل ذیل ہے:

جواب ① و ④ و ⑤: قسم ثانی کے اشخاص (یعنی قسم ثانی کے مریض اور مسافر) صحیح و مقیم ہو جائیں تو ان پر قضا لازم نہیں ہے اور نہ قضا لازم ہونے کی کوئی وجہ ہے۔ اس لیے کہ اگر انھوں نے روزہ رکھ لیا، جو ان کے لیے فدیہ سے کہیں بہتر ہے تو اس صورت میں عدمِ لزومِ قضا ظاہر ہے اور اگر انھوں نے فدیہ ہی دے دیا تو بھی عدمِ لزومِ قضا ظاہر ہے، اس لیے کہ یہ فدیہ روزے کا مالی معاوضہ ہے۔

جواب نمبر ②: ابو مسلم اصفہانی اور اصم کا قول، جو اس مسئلے میں ہے، مردود کیوں ہے؟ وجہ مردودیت سے اطلاع بخشی جائے کہ اس پر غور کیا جائے اور کیا جمہور کا مجرد قول خود کوئی شرعی دلیل ہے یا اس پر بھی دلیل کی ضرورت ہے؟ اگر شقِ اول حق ہے تو اس کی دلیل ارشاد ہو۔

جواب نمبر ③ و ⑥: قسم ثانی کے اشخاص پر یہ تنگی ہے کہ اُن پر عین حالتِ مرض یا سفر میں بطورِ واجب مخیّر کے دو امروں میں سے ایک کا عمل میں لانا فرض ہے کہ وہ لوگ یا تو مشقت اٹھا کر روزہ ہی رکھیں یا مالی معاوضہ یعنی

فدیے کی مشقت گورا کریں کہ فی روزہ ایک مسکین کو کھانا دے دیا کریں اور فدیے کی مشقت نفوس پر روزے کی مشقت سے کچھ کم نہیں ہے۔ إِلَّا مَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ. اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ [النساء: ۱۲۸] یعنی شدتِ بخل تو گویا نفوس کی فطرت ہی میں داخل ہے، چناں چہ اسی کے مطابق ایک مثل بھی مشہور ہے:

"گر جاں طلبی مضائقہ نیست ور زر طلبی سخن ور نیست"

[اگر تم جاں طلب کرو تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر تم مال طلب کرو تو اس کی گنجایش نہیں ہے]

یہی وجہ ہے کہ اگر روزے دار تلاش کیے جائیں تو بہت مل سکیں گے اور زکاۃ دینے والے تلاش کیے جائیں تو بہت کم ملیں گے اور فدیہ کی مشقت گوارا کرنے کی صورت میں اگر چہ بجائے ایک مسکین کے بہت سے مساکین کو کھانا کیوں نہ دے دیا کریں، مگر روزے کی فضیلت کو نہیں پہنچ سکیں گے، جس کی طرف آیتِ کریمہ: ﴿وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ یہ ان کا کتنا بڑا گھاٹا ہے۔ گو اس صورت میں ترکِ فرض کے مواخذہ سے بَری ہو جائیں گے۔

الغرض قسم ثانی کے اشخاص پر تنگی کا حال معلوم ہوا کہ ان کو عین حالتِ مرض یا سفر میں بطورِ واجب مخیّر کے دو امروں میں سے ایک امر کی مشقت اٹھانے سے چارہ نہیں ہے بخلاف قسمِ اول کے اشخاص کے کہ ان پر یہ تنگی ہرگز نہیں ہے کہ عین حالتِ مرض یا سفر میں روزہ یا فدیہ میں سے کسی ایک کی مشقت ضرور اپنے اوپر گوارا کریں، بلکہ ان پر طرح طرح سے آسانیوں کی رعایت کی گئی ہے، جن میں سے ایک آسانی ان پر یہ کی گئی ہے کہ اگر وہ لوگ خواہ مخواہ اپنے اوپر سختی گوارا کر کے عین حالتِ مرض یا سفر میں روزہ ہی رکھ لیں تو ان کی یہ سختی، جو انھوں نے خواہ مخواہ اپنے اوپر گوارہ کر لی ہے، قبول بھی نہیں کی جائے گی، کیوں کہ ان کی یہ سختی نیکی کے زمرے سے خارج کر کے بدی اور گناہ کے زمرہ میں داخل کر دی گئی ہے۔ چناں چہ فرما دیا گیا: «ليس من البر الصوم في السفر» اور «أولئك العصاة أولئك العصاة»[1] اور «الصائم في السفر كالمفطر في الحضر»

دوسری آسانی ان پر یہ کی گئی ہے کہ جب وہ لوگ صحیح اور مقیم ہو جائیں تو روزے کی قضا کا وجوب ان پر فوری نہیں رکھا گیا، بلکہ ان کو اختیار دے دیا گیا کہ ایامِ صحت وا قامت میں جب چاہیں قضا رکھ لیں۔ تیسری آسانی ان پر یہ کی گئی ہے کہ اگر وہ لوگ صحت اور اقامت کے ایام نہ پائیں، بلکہ مرض یا سفر ہی کی حالت میں مر جائیں تو ان پر کوئی مواخذہ نہیں، نہ روزے کا اور نہ فدیے کا۔ یہ سب کیسی کیسی ان پر آسانیاں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کی آسانیوں کی طرف کس خوبی سے اس آیتِ کریمہ میں اشارہ فرما دیا: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵] یعنی اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر سختی نہیں چاہتا۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٤)

یہاں سے خوب واضح ہوگیا کہ قسمِ اول کے اشخاص سستی نہیں چھوٹے، بلکہ ان کے حسبِ حال سختی کی گئی، جس کو قیاس مقتضی تھا، بخلاف قسمِ اول کے اشخاص کے کہ ان پر متعدد طرح سے آسانیاں کی گئیں، جو ان کے حق میں بھی قیاس کا مقتضیٰ تھا۔ الحاصل ہر ایک قسم کے ساتھ وہی کیا گیا، جو اُس قسم کے لائق اور مناسب تھا۔

کتبہ: محمد عبداللہ غازی پوری (۴/ ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ)

اگر غروبِ آفتاب کے بعد افطار سے پہلے حیض آ جائے؟

سوال ہندہ نے رمضان کا روزہ رکھا، آفتاب غروب ہوگیا، مگر ہنوز افطار نہیں کیا ہے، کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے کہ اتنے میں حیض آ گیا، اس کو روزہ قضا کرنا پڑے گا یا نہیں؟

جواب اس صورت میں ہندہ کا روزہ پورا ہوگیا، کیونکہ روزے کی تعریف اس پر صادق آ گئی، لہٰذا ہندہ کو اس روزے کی قضا کرنا نہیں پڑے گا۔ واللّٰه تعالیٰ أعلم.

صیامِ رمضان کی قضا اور وجوبِ کفارہ:

سوال زید سے دس روزے ماہِ رمضان کے چھوٹ گئے اور اب دوسرا رمضان شریف بھی آ پہنچا، کل بارہ یا تیرہ روز اور باقی رہ گئے ہیں تو اب اس صورت میں زید کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب اگر زید سے رمضان کے روزے عذرِ مرض یا سفر کی وجہ سے چھوٹ گئے ہیں تو ان کے عوض دس روزے دوسرے دنوں میں رکھ لے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵] یعنی جو شخص تم لوگوں میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو گنتی پوری کرے دوسرے دنوں سے۔ اگر کھانے یا پینے سے قصداً روزہ توڑا ہے تو اس نے بڑا گناہ کا کام کیا ہے، اپنے اس گناہ پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں توبہ کرے۔ اپنی مغفرت چاہے اور قصداً کھا پی کر روزہ توڑنے والے پر بعض ائمہ کے نزدیک کفارہ دینا لازم ہے اور بعض کے نزدیک نہیں۔

جامع ترمذی (ص: ۹۵ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

"وأما من أفطر متعمداً من أكل وشرب، فإن أهل العلم قد اختلفوا في ذلك، فقال بعضهم: عليه القضاء، والكفارة، وشبهوا الأكل والشرب بالجماع، وهو قول سفيان الثوري وابن المبارك وإسحاق، وقال بعضهم: عليه القضاء، ولا كفارة عليه، لأنه إنما ذكر عن النبيﷺ الكفارة في الجماع، ولم يذكر في الأكل والشرب، وقالوا: لا يشبه الأكل والشرب الجماع، وهو قول الشافعي وأحمد"[1]

[جس شخص نے کچھ کھا پی کر عمداً روزہ توڑ دیا تو اس کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، بعض نے کہا

[1] سنن الترمذي (۳/ ۱۰۲)

ہے کہ اس کو روزے کی قضا کے ساتھ ساتھ اس کا کفارہ بھی دینا ہوگا، چنانچہ انھوں نے کھانے پینے کو جماع کے ساتھ تشبیہ دی ہے، یہ موقف سفیانِ ثوری، عبداللہ بن مبارک اور اسحاق رحمہم اللہ کا ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس پر روزے کی قضا ہے، کفارہ نہیں ہے، کیوں کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف جماع کی صورت میں کفارے کو روایت کیا گیا ہے، کھانے پینے کے بارے میں نہیں، چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ کھانا پینا جماع کے مشابہ نہیں ہے، یہ قول امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کا ہے]

مگر جو لوگ اس صورت میں کفارہ واجب کہتے ہیں، ان کے پاس کوئی کافی ثبوت نہیں ہے اور جو دلائل وجوبِ کفارہ پر پیش کیے جاتے ہیں، ان سے احتجاج صحیح نہیں۔ وجوبِ کفارہ پر دارقطنی کی یہ ایک روایت پیش کی جاتی ہے:

"عن أبي هريرة أن رجلا أكل في رمضان فأمره النبيﷺ أن يعتق رقبة أو يصوم شهرين أو يطعم ستين مسكينا"[1]

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کچھ کھا لیا (اور روزہ توڑ دیا) تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ ایک گردن (غلام، لونڈی) آزاد کرے یا دو مہینے کے روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے]

مگر یہ روایت ضعیف ہے، اس کا ایک راوی ابو معشر قوی نہیں ہے، چنانچہ خود دارقطنی اس حدیث کے بعد ہیں:

"أبو معشر هو نجيح، ليس بالقوي" [ابو معشر نجیح قوی نہیں ہے]

مولانا عبدالحی صاحب مرحوم "التعليق الممجد" میں فرماتے ہیں:

"والأحسن في الاستدلال ما أخرجه الدارقطني من طريق محمد بن كعب عن أبي هريرة أن رجلا أكل في رمضان فأمره النبيﷺ أن يعتق رقبة. الحديث، لكن إسناده ضعيف، لضعف أبي معشر، راويه عن ابن كعب"[2] انتهى

[اس سلسلے میں استدلال کے لیے بہتر دلیل وہ ہے، جسے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے محمد بن کعب کے واسطے سے بیان کیا ہے، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رمضان میں روزہ توڑ دیا تو نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گردن (غلام، لونڈی) آزاد کرنے کا حکم دیا...لیکن اس کی سند ضعیف ہے، کیوں کہ محمد بن کعب سے روایت کرنے والا راوی ابو معشر ضعیف ہے]

وجوبِ کفارہ پر ایک یہ حدیث بھی پیش کی جاتی ہے، جو ہدایہ (ص: ۱۲۳ مطبوعہ علوی) میں مذکور ہے:

«من أفطر في رمضان فعليه ما على المظاهر»

[جس نے رمضان کا کوئی روزہ توڑا تو اس پر ظہار کرنے والے آدمی جیسا کفارہ ہے]

مگر اس حدیث کا پتا اس لفظ کے ساتھ ہدایہ کے مخرجین کو نہیں لگا ہے، چنانچہ زیلعی فرماتے ہیں: "قلت:

[1] سنن الدارقطني (۲/ ۱۹۱) نیز دیکھیں: نصب الراية (۲/ ۳۲۸)

[2] التعليق الممجد (۲/ ۱۶۱)

غریب بھذا اللفظ"[1] اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "لم أجده ھكذا"[2] [مجھے یہ حدیث اس طرح نہیں ملی] پس جب تک اس حدیث کا پتا اس لفظ کے ساتھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، اس حدیث سے استدلال کیسے صحیح ہوگا؟ اس حدیث سے استدلال کرنے والے کو لازم ہے کہ اولاً یہ بتائے کہ یہ حدیث کس کتاب کی ہے اور صحیح ہے یا ضعیف؟ پھر بعد اس کے اس سے استدلال کا قصد کرے۔ وجوبِ کفارہ پر بخاری اور مسلم کی یہ ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے:

"عن أبي هريرة أن النبيﷺ أمر رجلا أفطر في رمضان أن يعتق رقبة أو يصوم شهرين متتابعين أو يطعم ستين مسكينا"

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ مکرم ﷺ نے اس آدمی کو، جس نے رمضان کا روزہ توڑا تھا، گردن (غلام، لونڈی) آزاد کرنے کا یا پے در پے دو مہینوں کے روزے رکھنے کا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا]

مگر اس روایت سے بھی احتجاج صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث سے وجوبِ کفارہ پر احتجاج صحیح نہ ہونے کی وجہ زیلعی حنفی فرماتے ہیں:

"ومن أصحابنا من احتج بحديث أبي هريرة المتقدم، وليس فيه حجة، لأنهم يحملونه علىٰ الجماع، قالوا: وقد جاء مبينا في رواية جماعة عن الزهري نحو عشرين رجلا، ذكرهم البيهقي، فقالوا فيه: إن رجلا وقع علىٰ امرأته في رمضان. قال البيهقي: ورواية هؤلاء الجماعة عن الزهري مقيدة بالوطي أولىٰ بالقبول لزيادة حفظهم وأدائهم الحديث على وجهه"[3]

[ہمارے اصحاب میں سے وہ بھی ہے جس نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ بالا حدیث سے حجت پکڑی ہے، جب کہ اس میں کوئی حجت نہیں ہے، کیوں کہ انھوں نے اس (مذکورہ بالا حدیث) کو جماع پر محمول کیا ہے۔ چناں چہ انھوں نے کہا کہ امام زہری رحمہ اللہ سے تقریباً بیس آدمیوں کی جماعت سے یہ روایت وضاحت کے ساتھ وارد ہوئی ہے، جن کا امام بیہقی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ ان تمام نے اس حدیث میں یہ وضاحت کی ہے کہ ایک آدمی نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کر لیا۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ امام زہری رحمہ اللہ سے اس جماعت کی روایت کو وطی کے ساتھ مقید کرنا زیادہ لائق قبول ہے، کیوں کہ وہ (اصحابِ زہری) زیادہ حافظ اور اس کو صحیح طرح بیان کرنے والے ہیں]

---

[1] نصب الراية (١/ ٢٧٩)

[2] الدراية في تخريج أحاديث الهداية (١/ ٢٧٩) نیز اسے علامہ ابن ہمام حنفی نے بھی ضعیف کہا ہے۔ فتح القدير (٢/ ٣٣٨) مرقاة المفاتيح (٤/ ٤٣٣)

[3] نصب الراية (٢/ ٣٢٨)

وقال الحافظ ابن حجر في تخريج الهداية: «وقد ورد في بعض طرقه أن النبي ﷺ أمر رجلا أفطر في رمضان أن يعتق رقبة... الحديث، وأخرجه الدارقطني عن أبي هريرة: أمر الذي أفطر يوما من رمضان بكفارة الظهار، والحديث واحد، والقصة واحدة، والمراد أنه أفطر بالجماع، لا بغيره، توفيقا بين الأخبار»[1]

[حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ہدایہ کی تخریج میں اس سلسلے کی مختلف خبروں میں تطبیق دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کے بعض طرق میں یہ مروی ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے ایک ایسے شخص کو گردن آزاد کرنے کا حکم دیا، جس نے رمضان کا روزہ توڑا تھا... الحدیث۔ اس حدیث کو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، جس میں اس شخص کو ظہار کا کفارہ دینے کا حکم ہے، جس نے رمضان کا روزہ توڑا تھا۔ یہ حدیث اور وہ واقعہ ایک ہی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس شخص نے جماع کے ذریعے روزہ توڑا تھا نہ کہ کسی اور طریق سے]

انھیں مذکورہ روایتوں سے قصداً کھا پی کر روزہ توڑنے والے پر کفارہ واجب کہا جاتا ہے اور ظاہر ہوا کہ ان روایتوں سے مطلوب نہیں ثابت ہوتا۔ ہاں قصداً جماع سے روزہ توڑنے والے پر کفارہ بلاشبہہ واجب ہے، کیونکہ اس بارے میں صحاح ستہ و دیگر کتبِ احادیث میں نص صریح موجود ہے اور قصداً کھانے پینے سے روزہ توڑنے کو قصداً جماع سے روزہ توڑنے پر قیاس کرنا ہرگز صحیح نہیں، کیونکہ دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت سے دوسری صورت کہیں اَفحش ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ ''مصفی شرح موطا'' میں فرماتے ہیں:

''وغیر جماع را بر جماع حمل نتواں کرد زیرا کہ جماع افحش است ولہٰذا در اعتکاف اکل وشرب جائز داشتند نہ جماع را''[2] انتھی

[غیر جماع کو جماع پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ جماع افحش ہے، لہٰذا دورانِ اعتکاف کھانے پینے کو جائز کیا گیا ہے نہ کہ جماع کو]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''فتح الباری'' میں فرماتے ہیں:

"والفرق بين الانتهاك بالجماع والأكل ظاهر، فلا يصح القياس المذكور"[3]

[جماع کے ساتھ روزہ توڑنے اور قصداً کھانے پینے سے روزہ توڑنے میں فرق ظاہر ہے، لہٰذا مذکورہ

---

[1] الدراية لابن حجر (١/ ٢٧٩)

[2] المصفی مع المسوی (١/ ٢٣٧)

[3] فتح الباري (٤/ ١٦١)

قیاس درست نہیں ہے]

باقی رہا قضا رکھنا، پس قصداً جماع سے روزہ توڑنے والے کو قضا رکھنا بعض روایتوں سے ثابت ہے۔ "تلخیص الحبیر" (ص: ١٩٦) میں ہے:

"وروي في بعض الروايات أنه قال للرجل: « واقض يوما مكانه » أبو داود من حديث هشام بن سعد عن الزهري عن أبي سلمة عن أبي هريرة، وأعله ابن حزم بهشام بن سعد، وقد تابعه إبراهيم بن سعد، كما رواه أبو عوانة في صحيحه... وقال سعيد بن منصور: ثنا عبد العزيز بن محمد عن ابن عجلان عن المطلب بن أبي وداعة عن سعيد بن المسيب جاء رجل إلىٰ النبيﷺ فقال: يا رسول الله! إني أصبت امرأتي في رمضان؟ فقال رسول اللهﷺ: «تب إلى الله واستغفره، وتصدق، واقض يوما مكانه»[1] انتهى ملخصاً

[بعض روایات میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس آدمی کو کہا کہ اس دن کے عوض ایک دن کا روزہ رکھ کر قضا دو۔ ابو داود نے ہشام بن سعد کے واسطے سے بیان کیا ہے، وہ زہری سے بیان کرتے ہیں، وہ ابوسلمہ سے اور وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے ہشام کی وجہ سے اسے معلول قرار دیا ہے، جب کہ ابراہیم بن سعد نے ان کی متابعت کی ہے، جس طرح ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں اسے روایت کیا ہے... سعید بن منصور نے کہا کہ ہمیں عبد العزیز بن محمد نے بیان کیا ہے، انھوں نے ابن عجلان سے روایت کیا ہے، انھوں نے مطلب بن ابی وداعہ سے اور انھوں نے سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نبیِ کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے رمضان میں (روزے کے دوران میں) اپنی بیوی سے جماع کر لیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی طرف توبہ کر، اس سے بخشش طلب کر، صدقہ دے اور اس دن کے عوض ایک دن کا روزہ رکھ]

قصداً کھانے یا پینے سے روزہ توڑنے والے کے قضا رکھنے کی نسبت اختلاف ہے، بعض کے نزدیک قضا رکھنا ہے اور بعض کے نزدیک نہیں۔

كتبه: أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفي عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله.

اختلافِ مطالع شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

سوال اختلافِ مطالع شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

---

[1] التلخيص الحبير (٢/ ٢٠٧)

جواب اختلافِ مطالع شرعاً ضرور معتبر ہے، اس لیے کہ بہت سے بلادِ شرقیہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان میں صبح صادق ہوتی ہے اور نمازِ فجر کا وقت ہوجاتا ہے اور سحری کا وقت باقی نہیں رہتا، اس وقت بہتیرے بلادِ غربیہ میں رات رہتی ہے اور نمازِ فجر کا وقت نہیں ہوتا اور سحری کا وقت باقی رہتا ہے۔ پس اگر اختلافِ مطالع شرعاً معتبر نہ ہو تو یہ لازم آجائے گا کہ اسی وقت ان بلادِ غربیہ میں جہاں ہنوز صبح نہیں ہوئی ہے، بلکہ رات باقی ہے، شرعاً نمازِ فجر فرض اور سحری ناجائز ہوجائے۔ وھو کما تری.

اسی طرح بہتیرے بلادِ شرقیہ وغربیہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان میں سے ایک میں ظہر کا وقت ہوجاتا ہے، اس وقت دوسرے میں نصف النہار بھی نہیں ہوتا یا اسی وقت دوسرے میں عصر کا وقت ہوجاتا ہے، بلکہ بہتیرے بلادِ شرقیہ وغربیہ ایسے بھی ہیں، جن میں اس قدر اختلاف پڑ جاتا ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک میں صبح ہے اور دوسرے میں شام تو اگر اختلافِ مطالع شرعاً معتبر نہ ہو تو یہ لازم آجائے گا کہ ایک ہی وقت میں دونوں جگہوں میں شرعاً نمازِ فجر و نمازِ مغرب ایک ساتھ فرض ہوجائے۔ وھو کما تری.

بلکہ یہ لازم آجائے گا کہ تمام بلاد میں (خواہ شرقی ہوں یا غربی، شمالی ہوں یا جنوبی) ہر وقت کل نمازیں (ظہر، عصر، مغرب، عشا، فجر) ایک ساتھ شرعاً فرض ہوجائیں، کیونکہ ہر وقت کسی نہ کسی جگہ کسی نماز کا وقت ضرور ہوتا ہے۔ كما لا يخفى على الماهر، وفي ذلك تكليف ما لا يطاق وهو مدفوع شرعاً. [جیسا کہ ایک ماہر آدمی پر مخفی نہیں اور اس میں ناقابلِ استطاعت امر کا مکلّف بنانا ہے اور وہ شرعاً درست نہیں ہے]

اسی طرح اگر اختلافِ مطالع شرعاً معتبر نہ ہو تو یہ لازم آجائے گا کہ ماہِ رمضان میں ہر وقت تمام بلاد میں صوم وافطار دونوں ایک ساتھ فرض ہوجائیں، کیونکہ ہر وقت کسی نہ کسی جگہ دن ہے اور کسی نہ کسی جگہ رات۔ وفي ذلك من تكليف ما لا يطاق، بل من تكليف المحال ما لا يخفى.

اس مسئلہ اختلافِ مطالع کے شرعاً معتبر ہونے میں حدیثِ ذیل سے بھی استئناس ہوسکتا ہے۔ وھو ھذا:

"عن كريب أن أم الفضل بعثته إلىٰ معاوية بالشام قال: فقدمت الشام فقضيت حاجتها، واستهل علي رمضان، وأنا بالشام فرأيت الهلال ليلة الجمعة، ثم قدمت المدينة، في آخر الشهر فسألني عبدالله بن عباس، ثم ذكر الهلال، فقال: متى رأيتم الهلال؟ فقلت: رأيناه ليلة الجمعة. فقال: أنت رأيته؟ فقلت: نعم، ورآه الناس، وصاموا، وصام معاوية، فقال: لكنا رأيناه ليلة السبت، فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلاثين أو نراه، فقلت: أو لا تكتفي برؤية معاوية وصيامه؟ فقال: لا، هكذا أمرنا رسول الله ﷺ"[1] (رواه الجماعة إلا البخاري وابن ماجه)

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٨٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢١١١) مسند أحمد (١/ ٣٠٦)

[کریب رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ (ابن عباس رضی اللہ عنہما کی والدہ) ام الفضل بنت حارث رضی اللہ عنہا نے ان کو شام میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا، چنانچہ میں شام آیا اور وہاں ان کا کام مکمل کیا۔ اسی دوران میں رمضان کا چاند نظر آ گیا، جب کہ میں ابھی شام ہی میں تھا، ہم نے جمعہ کی شام کو چاند دیکھا۔ پھر مہینے کے آخر میں مدینے واپس پہنچا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ سے حال احوال پوچھے اور چاند کا ذکر کیا کہ تم نے اسے کب دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہم نے اسے جمعے کی رات کو دیکھا تھا۔ انھوں نے کہا: کیا تم نے خود دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں اور دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا تھا۔ پھر سب نے روزے رکھے اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی روزہ رکھا۔ انھوں نے کہا: مگر ہم نے اسے ہفتے کی رات کو دیکھا تھا اور ہم روزے رکھیں گے اور (اپنی رؤیت کے مطابق) پورے تیس کریں گے یا چاند دیکھ لیں۔ میں نے کہا: کیا آپ معاویہ رضی اللہ عنہ کے چاند دیکھنے اور روزے رکھنے پر کفایت نہیں کریں گے؟ انھوں نے کہا: نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسے ہی حکم دیا ہے]

والقول بأن هذا الحديث ليس بمحكم في هذا المعنى لجواز أن يكون مراد ابن عباس إنا لا نكتفي برؤية معاوية بنقلك هذا حتى تثبت لنا بحجة شرعية، ويدل عليه قوله: أنت رأيته ليلة الجمعة؟ فمفادهِ إنك إذا لم تره بنفسك، وأخبرت برؤية الناس فهذا رواية الناس بهذا الوجه من الأخبار لا نكتفى به، غير قادح في الاستيناس بهذا الحديث في هذه المسئلة، فإن كريبا قد ذكر رؤية الهلال بنفسه مرارا في هذا الحديث، منها قوله: فرأيت الهلال ليلة الجمعة، ومنها قوله: رأيناه ليلة الجمعة، ومنها قوله: نعم، في جواب سؤال ابن عباس: أنت رأيته؟

[یہ کہنا کہ یہ حدیث اس معنی میں محکم نہیں ہے، کیوں کہ اس بات کا احتمال موجود ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد یہ ہو کہ ہم تیری اس نقل اور روایت کی بنا پر معاویہ رضی اللہ عنہ کی رویت پر اکتفا نہیں کریں گے، حتی کہ ہمیں کوئی شرعی دلیل مل جائے، اس بات پر دلیل ان کا یہ قول ہے: تم نے خود اسے جمعہ کی شام دیکھا تھا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے خود اسے نہیں دیکھا اور تم نے صرف لوگوں کی رؤیت کی خبر دی ہے، تو اس اعتبار سے یہ لوگوں کی روایت ہے اور ان اخبار سے ہے، جس پر ہم اکتفا نہیں کریں گے۔ تو اس مسئلے میں اس حدیث سے استئناس کرنے میں یہ احتمال غیر قادح ہے، کیوں کہ اس حدیث میں کریب رحمہ اللہ نے کئی بار خود چاند دیکھنے کا ذکر کیا ہے، چنانچہ ان کا قول ہے: پس میں نے جمعہ کی شب چاند دیکھا۔ نیز ان کا کہنا ہے: ہم نے اسے جمعے کی رات کو دیکھا۔ ایسے ہی ابن عباس رضی اللہ عنہما کے استفسار پر کہ تو نے خود اسے دیکھا۔ ان کا یہ جواب دینا: جی ہاں]

والفرق بين الصوم وبين الصلاة والحج والأضحية وغيرها بأنه إنما لم يعتبر

اختلاف المطالع في الصوم لتعلق الخطاب عاما في الصوم بمطلق الرؤية في حديث: «صوموا لرؤيته» بخلاف الصلاة والحج والأضحية وغيرها مما لا يجدي نفعا، لأنه قد تعلق الخطاب عاما في الصلاة والحج والأضحية جميعا بمطلق أوقاتها، كوقت زوال الشمس لصلاة الظهر، ووقت صيرورة ظل كل شيئ مثله لصلاة العصر، و وقت غيبوبة الشمس لصلاة المغرب، ووقت غيبوبة الشفق لصلاة العشاء، ووقت طلوع الفجر الصادق لصلاة الصبح، مثلا في حديث جبرئيل الذي رواه أحمد والنسائي والترمذي. وعن جابر بن عبدالله رضی اللہ عنہ والترمذي عن ابن عباس رضی اللہ عنہما أيضاً، وكأشهر معلومات للحج في قوله تعالىٰ: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ﴾ الآية. كالوقت الذي بعد الفراغ عن صلاة عيد الأضحىٰ للأضحية في حديث البراء قال: خطبنا النبي صلی اللہ علیہ وسلم يوم النحر فقال: إن أول ما نبدأ به يومنا هذا أن نصلي ثم نرجع ...... الحديث رواه الشيخان. واللّٰه تعالىٰ أعلم

[روزے، نماز، حج اور قربانی وغیرہ میں یہ فرق کہ روزے میں اختلافِ مطالع کو معتبر نہیں سمجھا گیا، کیوں کہ حدیث: «صوموا لرؤيته» ''اسے دیکھ کر روزہ رکھو۔'' میں روزے کے متعلق مطلق رؤیت کا خطاب عام ہے برخلاف نماز، حج اور قربانی وغیرہ کے تو یہ قطعاً نفع بخش نہیں ہے، کیوں کہ نماز، حج اور قربانی تمام میں مطلق اوقات کے ساتھ حکم عام ہے، جیسے ظہر کی نماز کے لیے زوالِ شمس کا وقت، عصر کی نماز کے لیے ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہونے کا وقت، نمازِ مغرب کے لیے غروبِ آفتاب کا وقت، نمازِ عشا کے لیے شفق کے غروب ہونے کا وقت، صبح کی نماز کے لیے فجرِ صادق طلوع ہونے کا وقت۔ مثال کے طور پر جبریل علیہ السلام کی اس حدیث میں جسے احمد، نسائی اور ترمذی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے اور جیسے فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ﴾ میں حج کے لیے معلوم مہینے اور جیسے قربانی کے لیے عید الاضحیٰ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد کا وقت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نحر والے دن خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اس دن ہم سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ ہم نماز ادا کریں، پھر ہم لوٹیں گے ... الحدیث۔'' اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے]

كتبه: محمد عبد الله (٤/ ذی الحجة ١٣٢٧هـ)

رؤیتِ ہلال کتنے فاصلے تک معتبر ہوگی؟

سوال رویتِ ہلال اگر ایک شہر میں ہو تو دیگر اہلِ امصار و بلاد کے لیے بھی اس کا اعتبار ہوگا یا خاص اسی اہلِ شہر کے لیے رویت معتبر ہوگی کہ جہاں رؤیت ہوئی، بصورت اول شہادت بذریعہ تار برقی و خطوط و اخبار قابلِ حجت ہوں گی یا نہیں اور

اس حالت میں شہادت واجب التسلیم کس طرح ہونی چاہیے؟ دوسری صورت میں جس موضع میں رؤیت ہوئی، اس کے باہر قرب و جوار کے امصار وقری کے لیے بھی وہ رؤیت معتبر ہو سکے گی یا نہیں؟ اگر ہو سکے گی تو اس کے فاصلے کا اندازہ کس قدر ہے؟ یعنی جس شہر میں چاند دیکھا گیا، اس سے باہر کس قدر فاصلے تک اس رؤیت کا اعتبار کیا جائے گا؟

جواب رؤیتِ ہلال اگر ایک شہر میں ہو تو دیگر اہلِ امصار و بلاد کے لیے بھی اس رؤیت کا اعتبار ہوگا۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته»[1] الحديث (متفق عليه)

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ رکھنا چھوڑ دو]

نیل الاوطار (۴/ ۷۹) میں ہے:

"الأمر الكائن من رسول الله ﷺ هو ما أخرجه الشيخان وغيرهما بلفظ: «لا تصوموا حتى تروا الهلال، ولا تفطروا حتى تروه، فإن غم عليكم فأكملوا العدد ثلاثين» وهذا لا يختص بأهل ناحية على جهة الانفراد، بل هو خطاب لكل من يصلح له من المسلمين، فالاستدلال به على لزوم رؤية أهل بلد لغيرهم من أهل البلاد أظهر من الاستدلال به على عدم اللزوم، لأنه إذا رآه أهل بلد فقد رآه المسلمون، فيلزم غيرهم ما لزمهم" انتهى

[رسول اللہ ﷺ کا حکم وہ ہے، جسے بخاری و مسلم وغیرہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''جب تک تم چاند نہ دیکھ لو، روزہ نہ رکھو اور اسے دیکھ کر ہی روزہ رکھنا چھوڑو، پھر اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو تیس کی گنتی پوری کر لو۔'' یہ حکم کسی خاص علاقے کے لوگوں کے لیے انفرادی طور پر مختص نہیں ہے، بلکہ یہ مسلمانوں میں سے ہر شخص کے لیے خطاب ہے، جس کے لیے وہ مناسبِ حال ہے۔ پس اس حدیث سے ایک ملک کے باسیوں کو چھوڑ کر کسی ایک ملک کے باشندوں کی رویت کے لزوم پر استدلال کرنا اس حدیث سے عدمِ لزوم پر استدلال کرنے کی نسبت زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ جب اسے ایک ملک کے باشندے دیکھ لیں گے تو مسلمانوں نے بھی اسے دیکھ لیا تو ان پر بھی وہی کچھ لازم آئے گا، جو دوسروں پر لازم ہے]

اس باب میں امورِ دینیہ میں تار برقی کی خبر یا شہادت کا قابلِ حجت ہونا شرعاً ثابت نہیں ہے اور خطوط اگر موثوق بہا ہوں، یعنی ان خطوط پر وثوق ہو کہ وہ ثقات کے لکھے ہوئے ہیں تو قابلِ حجت ہوں گے۔ صحیح بخاری (۴/ ۱۹۴ چھاپہ مصر) میں ہے:

"عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: لما أراد النبي ﷺ أن يكتب إلى الروم، قالوا: إنهم لا يقرؤون كتابا إلا مختوما، فاتخذ النبي ﷺ خاتما من فضة كأني أنظر إلى وبيصه،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۸۱۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۰۸۱)

ونقشه: محمد رسول الله"[1]

[انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روم (کے بادشاہ) کی طرف خط لکھنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو) بتایا کہ وہ (رومی بادشاہ وغیرہ) مہر زدہ خط ہی قبول کرتے اور پڑھتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی (مہر) بنوائی، گویا کہ میں اس کی چمک کو (ابھی بھی) دیکھ رہا ہوں، اس انگوٹھی پر یہ نقش تھا: "محمد رسول اللہ"]

اسی صفحہ میں ہے:

"وقد كتب النبي ﷺ إلىٰ أهل خيبر: إما أن تدوا صاحبكم، وإما أن تؤذنوا بحرب"[2]

[نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر کو خط لکھا کہ یا تو اپنے ساتھی کی دیت ادا کرو یا لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ]

اسی طرح اخبار سماعی اگر موثوق بہا ہوں، یعنی وہ ثقات کی خبریں ہوں تو قابلِ حجت ہیں۔ كما حقق في الأصول، والله أعلم بالصواب.

کیا رؤیتِ ہلال وغیرہ میں برقی تار کی خبر معتبر ہے؟

سوال امورِ شرعیہ مثل رویتِ ہلال، طلاق، عتاق، ہبہ، عطیہ، بیع و شراء وغیرہ میں تار برقی کی خبر معتبر ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولوی ضیاء الرحمٰن۔ کولوٹولہ رتو سرکار لین نمبر ٦ کلکتہ

جواب چونکہ تار برقی کی خبر من جملہ اخبار ہے، لہٰذا امورِ شرعیہ میں اس کے معتبر یا نا معتبر ہونے کے بھی وہی شرائط ہیں، جو عام اخبار کے شرائط ہیں۔ امورِ شرعیہ میں خبر متواتر تو علی الاطلاق معتبر ہے، اس کے راوی کیسے ہی ہوں، اس کے راویوں کے حالات کی تفتیش کی کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں، کچھ ضرورت نہیں ہے۔ رہی خبر غیر متواتر یعنی خبرِ آحاد سو خبرِ آحاد کے معتبر ہونے کی یہ شرط ہے کہ اس خبر کی راستی اور سچائی کسی طریق سے ثبوت کو پہنچ جائے کہ اس خبر کے راوی ثقہ ہیں، خواہ اس طریق سے کہ وہاں ایسے قرائن موجود ہیں، جو اس خبر کی راستی اور سچائی کو ظاہر کر رہے ہیں۔

واضح ہو کہ ہر ایک تار کی خبر میں کم از کم غالباً تین راوی ضرور ہوتے ہیں، جن کے حالات کی تفتیش کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں؟ ایک نہایت ضروری امر ہے، بشرطیکہ وہ خبر متواتر نہ ہو یا وہاں ایسے قرائن موجود نہ ہوں، جو اس خبر کی راستی اور سچائی پر دلالت کرتے ہوں۔

(١) وہ تار بابو جو خبر بھیجتا ہے۔

(٢) وہ تار بابو جس کے پاس بابو نمبر (١) خبر بھیجتا ہے۔

(٣) وہ شخص جو بابو نمبر (١) سے خبر بھیجنے کی استدعا کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ استدعا بواسطہ ہوتی ہے تو ایسی حالت میں نمبر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٩٢)

[2] مصدر سابق.

(۱) و نمبر (۳) کے درمیان وہ راوی جو واسطہ پڑتا ہے، بڑھ جاتا ہے اور بڑھ کر کبھی سب مل کر چار ہو جاتے ہیں اور کبھی چار سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں، جب کہ واسطہ ایک سے زائد ہو جاتا ہے اور کبھی نمبر (۳) کے انگریزی میں ہونے کی وجہ سے کسی انگریزی دان سے مضمون تار کے انگریزی میں لکھوانے کی ضرورت پڑتی ہو، ایسی حالت میں راویوں کی تعداد اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور بھی واضح ہو کہ نمبر (۳) کے حالات کی تفتیش میں صرف اسی قدر کافی نہیں ہے کہ وہ ثقہ ہے یا نہیں؟ بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس نے فی الواقع نمبر (۱) سے خبر بھیجنے کی استدعا بھی کی ہے یا نہیں؟ کیونکہ کبھی ایسا بھی وقوع میں آتا ہے کہ نمبر (۳) نے فی الواقع خبر نہیں بھجوائی ہے، بلکہ اس کے نام سے کسی دغا باز نے جھوٹی خبر بھجوا دی ہے، جس کی اس کو خبر نہیں۔

اس جواب میں جو جو باتیں لکھی گئی ہیں، ہر چند ایسی صاف اور واضح ہیں، جن کے لیے کسی کتاب کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم ایک عبارت کتاب "نزهة النظر شرح نخبة الفكر" سے نقل کر دی جاتی ہے۔ وهي هذه:

"وفيها، أي الآحاد، المقبول، وهو ما يجب به العمل عند الجمهور، وفيها المردود، وهو الذي لم يرجح صدق المخبر به، لثبوت الاستدلال بها علىٰ البحث عن أحوال رواتها دون الأول، وهو المتواتر، فكله مقبول لإفادته القطع بصدق مخبره بخلاف غيره من أخبار الآحاد، لكن إنما وجب العمل بالمقبول منها لأنه إما أن يوجد فيها أصل صفة القبول، وهو ثبوت صدق الناقل، أو أصل صفة الرد، وهو ثبوت كذب الناقل، أو لا، فالأول يغلب علىٰ الظن صدق الخبر لثبوت صدق ناقله فيؤخذ به، والثاني يغلب علىٰ الظن كذب الخبر لثبوت كذب ناقله فيطرح، والثالث إن وجدت قرينة تلحقه بأحد القسمين التحق به، وإلا فيتوقف فيه، وإذا توقف عن العمل به صار كالمردود، لا لثبوت صفة الرد، بل لكونه لم يوجد فيه صفة توجب القبول"[1] انتهى والله تعالىٰ أعلم

[اخبارِ آحاد میں سے ایک مقبول ہے اور وہ جمہور کے نزدیک واجب العمل ہوتی ہے اور اس میں ایک مردود ہے، جس کے مخبر کا سچ راجح نہ ہو، کیوں کہ اس سے استدلال کرنے کے لیے اس کے راویوں کے احوال کی جانچ پڑتال کرنا پڑتی ہے، برخلاف پہلی قسم کے اور یہ متواتر ہے، کیوں کہ متواتر تمام کی تمام مقبول ہوتی ہیں، اس لیے کہ اخبارِ آحاد کے برخلاف وہ اپنے مخبر کی سچائی کے قطعی علم کا فائدہ دیتی ہے۔ البتہ اخبارِ آحاد میں سے جو مقبول ہے، اس پر عمل کرنا واجب ہے، کیوں کہ یا تو اس میں اصل صفتِ قبول

[1] نزهة النظر لابن حجر (ص: ۱۰)

پائی جائے گی اور وہ ہے اس کے ناقل کے سچ کا ثابت ہونا، یا اس میں اصل صفتِ رد پائی جائے گی اور وہ ہے اس کے ناقل کے جھوٹ کا ثابت ہونا، یا اس میں یہ دونوں چیزیں نہیں پائی جائیں گے۔ پس (مقبول) کے متعلق اس کے ناقل کے سچ کے ثابت ہونے کی وجہ سے غالب گمان یہی ہے کہ وہ خبر سچی ہے، لہٰذا وہ مقبول ہے، جب کہ دوسری کے متعلق اس کے ناقل کے جھوٹ کے ثابت ہونے کی وجہ سے غالب گمان یہی ہے کہ وہ خبر جھوٹی ہے، لہٰذا وہ مردود ہے۔ رہی تیسری قسم تو اگر اس کو مذکورہ بالا دو قسموں (مقبول و مردود) کے ساتھ ملانے والا کوئی قرینہ مل جائے، جو وہ اس کے ساتھ مل جائے گی، ورنہ اس میں توقف کیا جائے گا۔ جب اس پر عمل میں توقف کیا جائے تو وہ مردود کی طرح (متروک العمل) ہوجائے گی، لیکن اس وجہ سے نہیں کہ اس میں صفت رد پائی گئی ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں صفتِ قبول نہیں پائی جاسکی]

کتبہ: محمد عبد اللہ (١٤/ ذیقعدة ١٣٢٧ھ)

شوال کے روزے کب شروع کریں؟

سوال عید الفطر کے مہینے میں جو چھ روزے رکھے جاتے ہیں تو عیدِ فطر کی دوسری تاریخ روزہ شروع کرے یا آنکہ اندر ماہ کے جب چاہے چھ روزہ رکھ لے؟

نیاز مند: حافظ عبدالقادر، مؤ ائمہ محلّہ کوٹ ضلع اِلٰہ آباد

جواب عید الفطر کی دوسری تاریخ اس روزے کا شروع کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اندر ماہ کے جب چاہے رکھ لے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبد اللہ (٢٤/ ذي القعدة ١٣٣٠ھ)





كتاب الحج

ہندوستان کے حجاج کہاں سے احرام باندھیں؟

سوال جو لوگ ہندوستان سے حج کے ارادے سے جاتے ہیں، وہ لوگ احرام یلملم سے باندھیں یا جدہ سے اور ان لوگوں کو جدہ سے احرام باندھنا حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب یہ احرام سنتِ نبویہ (علی صاحبہا وآلہ الصلوات والتسلیمات) میں درست نہیں ہوسکتا، اگر زید اور دیگر حجاج یمن کے راستے سے گزرے ہوں۔

فقد روىٰ ابن أبي شيبة في مصنفه عن ابن عباس أن النبيﷺ قال: «لا تجاوزوا الوقت إلا بالإحرام»[1] اهـ (نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية) والله تعالىٰ أعلم

[ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ یقیناً نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا: احرام باندھے بغیر میقات سے آگے نہ بڑھو]

کتبہ: محمد عبداللہ

یہ جواب بہت صریح و درست ہے۔ پیغمبر ﷺ نے مواقیت احرام کے لیے تصریح کے ساتھ مقرر فرمائے۔ پس جو شخص حج و عمرہ کی نیت سے سفر کرے، ان کے لیے ضروری ہے کہ مواقیتِ مذکورہ پر احرام باندھے، ورنہ احرام صحیح و درست نہ ہوگا۔ جو چاہے فتح الباری وغیرہ میں دیکھ لے۔

کتبہ: محمد عبدالجبار عمر پوری

دوسرے کے مال سے اور زمین بیچ کر حج کرنا:

سوال ① زید اپنے بڑھاپے میں عمرو کو ساتھ لے کر حج کرنے گیا اور یہ خیال تھا کہ عمرو کی وجہ سے سفر میں آرام ہوگا اور عمرو کو اپنے خرچ سے لے گیا۔ اب عمرو اس وقت ذی مقدرت ہے۔ آیا حج دوبارہ ادائے فرض کے لیے عمرو کو کرنا ہوگا یا پہلا حج ادائے فرض کے لیے کافی ہوگا؟

② خالد کے پاس دس بیگہ زمین ہے اور زمین کی قیمت فی بیگہ سو روپیہ ہے، مگر نقود نہیں ہیں۔ زمین بیچ کر حج کرنے جا سکتا ہے یا نہیں؟

راقم: محمد علی ابو المعالی از اسلام پور

جواب ① پہلا حج ادائے فرض کے لیے کافی ہوگا، کیونکہ زید جب عمرو کے خرچ سفرِ حج کا متحمل ہوگیا تو عمرو مستطیع

---

[1] المعجم الكبير للطبراني (١١/ ٤٣٥) اس کی سند میں "خصيف بن عبد الرحمن الجزري"، ضعیف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٤٧٧٤)

ہوگیا اور حج اس پر فرض ہوگیا تو اُس نے جو زید کے شامل حج کیا، حج فرض ادا کیا، لہٰذا وہ حج ادائے فرض کے لیے کافی ہوگیا۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

② اس صورت میں کہ خالد کے پاس دس بیگہ زمین ہے اور نقود نہیں ہیں، آیا خالد پر حج فرض ہے یا نہیں اور زمین بیچ کر حج کو جا سکتا ہے یا نہیں؟ اصل اس باب میں آیتِ کریمہ: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ [آل عمران: ۹۷] [اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے] ہے اور اس آیتِ کریمہ میں استطاعت کی قید ہے، پس بغیر استطاعت حج فرض نہیں ہے، پس خالد کے پاس جو دس بیس بیگہ زمین ہے، جس سے وہ گزران کرتا ہے اور نقود نہیں ہیں، اگر اس زمین کو بیچ کر اور جن لوگوں کا خرچ اس پر فرض ہے، ان کا خرچ اپنے واپس آنے تک دے کر باقی روپیہ سے حج کر سکتا ہو اور حج سے فارغ ہونے کے بعد اپنے گزر کی صورت بغیر بھیک مانگے ہوئے نکال سکتا ہو تو وہ صاحبِ استطاعت ہے، اس پر حج فرض ہے، حج کر آئے، ورنہ اس پر حج فرض نہیں ہے، لقولہ تعالیٰ:

﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ [البقرة: ۲۱۹، ۲۲۰]

[اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ کہہ دے جو بہترین ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم غور و فکر کرو۔ دنیا اور آخرت کے بارے میں] واللہ أعلم

کتبہ: محمد عبد اللہ

کیا اپنے حج سے پہلے حجِ بدل کر سکتا ہے؟

سوال ایک شخص ایک زن متوفیہ کی جانب سے حجِ بدل فرض کرنا چاہتا ہے اور ابھی تک اس نے حج بالکل ادا نہیں کیا، کیونکہ حج اس پر فرض نہیں، وہ متوفیہ کی طرف سے حج بدل کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ حج متوفیہ کی طرف سے ادا ہوجائے گا یا نہیں؟ مطابق قرآن و حدیث جواب عنایت فرمایا جائے۔

عبدالقیوم ڈاک خانہ کانواڑہ۔ موضع بمبنی۔ ضلع سیونی چھپارہ (۲۹/ جمادی الثانی)

جواب حدیث جو اس بارے میں وارد ہوئی ہے، اس سے تو صاف یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس نے اپنی طرف سے حج نہ کیا ہو، وہ دوسرے کی طرف سے حج بدل نہیں کر سکتا، لیکن چونکہ اس حدیث میں کچھ تھوڑا ضعف ہے، اس وجہ سے یہ مسئلہ اختلافی ہوگیا ہے، مگر احوط یہی ہے کہ جو پہلے خود اپنی طرف سے حج کر چکا ہو، وہی دوسرے کی طرف سے حج بدل کرے، اور وہ حدیث یہ ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن النبي ﷺ سمع رجلا يقول: لبيك عن شبرمة. قال: «من شبرمة؟»

قال: أخ لي أو قريب لي، فقال: «حججت عن نفسك؟» قال: لا، قال: «حج عن نفسك، ثم حج عن شبرمة»[1]

(رواه أبو داود وابن ماجه، و صححه ابن حبان، والراجح عند أحمد وقفه، بلوغ المرام)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بلاشبہہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو یوں کہتے ہوئے سنا: شبرمہ کی طرف سے لبیک۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شبرمہ کون ہے؟'' اس نے کہا: میرا بھائی یا میرا قریبی رشتے دار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے (پہلے) اپنی طرف سے حج کیا ہے؟'' اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (پہلے) اپنی طرف سے حج کر، پھر (بعد میں) شبرمہ کی طرف سے حج کرنا]

والله تعالیٰ أعلم — کتبه: محمد عبدالله (٦/ رجب ١٣٣٢هـ)

میت کی طرف سے حجِ بدل کرنا:

سوال ① زید متمول و مالدار و مستطیع تھا۔ چالیس پچاس برس یا چند سال حالت مالداری و استطاعت میں بعیش و آرام بسر کیا اور بہت کچھ سرمایہ چھوڑ کر بلا وصیت مر گیا تو حجِ بدل، یعنی بالنیابۃ حج کرانا اس کی طرف سے جائز و محکوم شرع ہے یا منہی عنہ اور فرض جو اس پر تھا، ساقط ہوگا یا نہیں؟

② بکر جس پر حالتِ پیرانہ سالی میں جو استطاعت طی مسافت کی نہیں رکھتا تھا یا کسی عذر سے معذور تھا، یعنی مریض تھا یا اندھا و لنگڑا وغیر وغیرہ حج فرض ہوا، یعنی مالدار ہوا، مگر بسبب عجز و ناچاری کے حج نہ کر سکا اور مر گیا تو اس کی جانب سے حج جائز و مشروع ہے یا نہیں اور فرضیت اس کے ذمہ سے ساقط ہوگی یا نہیں؟

③ کسی نے حج کی نذر کیا اور بلا عجز و عذر مدت تک عیش و آرام سے بسر کیا اور کسی نے حج کی نذر کیا اور فوراً مر گیا، دونوں کا حکم مساوی ہے یا مختلف؟

④ حج فرض بالنذر و حج فرض بالاستطاعت کی ایک شان ہے اور دونوں متحد الاحکام ہیں یا مختلف الاحکام؟ بینوا بالتفصیل.

جواب ① اس صورت میں حجِ بدل، یعنی بالنیابۃ حج کرانا زید کی طرف سے جائز و محکوم شرع شریف ہے، منہی عنہ نہیں

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٠٣) صحيح ابن خزيمة (٤/ ٣٤٥) صحيح ابن حبان (٩/ ٢٩٩) امام ابن القطان الفاسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "والرافعون ثقات، فلا يضرهم وقف الواقفين له، إما لأنهم حفظوا مالم يحفظوا، وإما لأن الواقفين رووا عن ابن عباس رأيه، و الرافعين رووا عنه روايته" (بيان الوهم والإيهام: ٥/ ٤٥٢)

نیز امام ابن الملقن رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وقد أعله الطحاوي بالوقف، والدارقطني بالإرسال، وابن المغلس الظاهري بالتدليس، وابن الجوزي بالضعف، وغيرهم بالاضطراب والانقطاع، وقد زال ذلك كله بما أوضحناه في الأصل" (خلاصة البدر المنير: ١/ ٣٤٥) نیز دیکھیں: البدر المنير (٦/ ٤٥) التلخيص الحبير (٢/ ٤٨٨) إرواء الغليل (٤/ ١٧١)

ہے۔اس حجِ بدل کرانے سے جو حج کہ زید پر فرض تھا، ساقط ہو جائے گا۔

قال مسلم في صحيحه (١/ ٣٦٢): عن عبد الله بن بريدة عن أبيه بريدة أن امرأة أتت رسول الله ﷺ فقالت: إن أمي ماتت ولم تحج قط، أفأحج عنها؟ قال: «حجي عنها»[1]

''عبداللہ بن بریدۃ نے اپنے باپ بریدہ سے روایت کی کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کے حضور میں آ کر عرض کیا کہ میری ماں مرگئی اور اس نے حج نہیں کیا تھا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف سے حج کر دے۔''

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حجِ بدل، یعنی کسی کی طرف سے بالنیابۃ حج کرنا جائز و محکوم شرع شریف ہے، منہی عنہ نہیں ہے۔

وقال ابن ماجه في سننه (ص: ٢١٤): عن أبي الغوث بن حصين، رجل من الفرع، أنه استفتىٰ النبي ﷺ عن حجة كانت على أبيه، مات ولم يحج، قال النبي ﷺ «حج عن أبيك»[2]

''ابو الغوث بن حصین رضی اللہ عنہ نے، جو مقام فرع کے رہنے والے تھے، نبی ﷺ سے فتویٰ پوچھا کہ میرے باپ پر حج فرض تھا، وہ مرگیا اور حج نہیں کیا؟ نبی ﷺ نے فرمایا: تو اپنے باپ کی طرف سے حج کر دے۔''

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جس پر حج فرض ہو، اس کی طرف سے حجِ بدل کرنا جائز و محکوم شرع شریف ہے، منہی عنہ نہیں ہے۔

وقال الدارقطني في سننه (ص: ٢٧٢) عن ابن عباس قال: أتىٰ رسول الله ﷺ رجل، فقال له: إن أبي مات، وعليه حجة الإسلام أفأحج عنه؟ قال: «أرأيت لو أن أباك ترك دينا عليه أقضيته؟» قال: نعم، قال: «فاحجج عن أبيك»[3]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کی کہ ایک مرد نے رسول اللہ ﷺ کے حضور میں آ کر عرض کیا کہ میرا باپ مرگیا اور اس پر حجِ اسلام فرض تھا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو یہ تو بتا کہ اگر تیرا باپ اپنے اوپر دین (قرض) چھوڑ جاتا تو کیا اس کی طرف سے اس کا دین ادا کر دیتا؟ عرض کیا: ہاں، فرمایا: تو تو اپنے باپ کی طرف سے حج بھی کر دے۔''

وقال الدارقطني في سننه أيضاً (ص: ٢٧٢): عن ابن عباس أن رجلا سأل رسول الله ﷺ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤٩)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٠٥) اس کی سند میں ''عثمان بن عطاء الخراساني'' راوی متروک ہے۔ البتہ اسی معنی میں اس سے ماقبل مذکور روایت صحیح ہے۔ دیکھیں: سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٠٤) صحيح ابن خزيمة (٤/ ٣٤٣)

[3] مسند أحمد (١/ ٢١٢) سنن الدارقطني (٢/ ٢٦٠)

عن الحج عن أبيه، قال: «احجج عنه، ألا ترى أنه لو كان عليه دين فقضيته عنه أن ذلك يجزئ عنه؟» قال: بلىٰ. قال: «فحق الله أحق»[1]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کی کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے باپ کی طرف سے حج کرنے کو پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس کی طرف سے حج کر دے، تو یہ تو بتا کہ اگر تیرے باپ پر دین ہوتا اور تو اس دین کو اپنے باپ کی طرف سے ادا کر دیتا تو وہ دین تیرے باپ کی طرف سے ادا ہو جاتا؟ عرض کیا: کیوں نہیں، فرمایا: تو اللہ کا حق تو اس سے بھی زیادہ اَحق ہے۔''

ان دونوں حدیثوں سے علاوہ جائز اور مشروع ثابت ہونے کے یہ بھی ثابت ہوا کہ جس شخص کے ذمہ حج فرض ہو، اس کی طرف سے حج بدل کر دینے سے وہ حج فرض اس کے ذمہ سے ساقط بھی ہو جاتا ہے، جس طرح دین کہ مدیون کی طرف سے ادا کرنے سے اس کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سائلین سے استفصال نہ فرمانا (یعنی یہ نہ پوچھنا کہ جس میت کی نسبت سوال کر رہے ہو، اس نے حج کی وصیت بھی کی تھی یا نہیں؟) اس بات پر دلیل ہے کہ حکم دونوں صورتوں میں یکساں ہے، یعنی خواہ میت نے وصیت کی ہو یا نہیں کی ہو۔ دونوں حالتوں میں اس کی طرف سے حجِ بدل کرنا جائز و مشروع ہے، کیونکہ اگر حکم مختلف ہوتا تو آپ ضرور استفصال فرماتے اور بغیر استفصال فرمائے ایک حکم ارشاد نہ فرماتے۔

وقال في الهداية في باب الحج عن الغير: "العبادات أنواع، مالية محضة كالزكاة، وبدنية محضة كالصلاة، ومركبة منهما كالحج، والنيابة تجري في النوع الثالث عند العجز، و لا تجري عند القدرة، ثم ظاهر المذهب أن الحج يقع عن محجوج عنه، وبذلك تشهد الأخبار الواردة في هذا الباب كحديث الخثعمية فإنه ﷺ قال فيه: حجي عن أبيك"[2] انتهى بقدر الحاجة

[دوسروں کی طرف سے حج کرنے کے باب میں ہدایہ کے مصنف نے کہا کہ عبادات کی چند قسمیں ہیں: ایک وہ جو خالص مالی عبادت ہے، جیسے زکات، ایک وہ جو محض بدنی عبادت ہے، جیسے نماز اور ایک وہ جو ان دونوں سے مرکب ہے، جیسے حج۔ عبادت کی اس تیسری قسم میں عاجزی آ جانے کی صورت میں نیابت چلتی ہے اور قدرت کے وقت نیابت جاری نہیں ہوتی، پھر ظاہر مذہب یہ ہے کہ حج اس کی طرف سے واقع ہو جاتا ہے، جس کی طرف سے کیا جائے۔ اس باب میں وارد شدہ روایات اس کی گواہی دیتی ہیں، جیسے خثعمیہ کی حدیث ہے کہ بلاشبہہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں فرمایا ہے کہ اپنے باپ کی طرف سے حج کرو]

[1] سنن الدارقطني (٢/ ٢٦٠)

[2] الهداية (١/ ١٨٣)

② اس صورت میں بکر کی جانب سے حج جائز ومشروع ہے اور اس حجِ بدل سے فرضیت اس حج کی جو بکر کے ذمہ تھی، ساقط ہو جائے گی۔

قال البخاري في صحيحه: عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: جاءت امرأة من خثعم، عام حجة الوداع، فقالت: يا رسول الله إن فريضة الله على عباده في الحج أدركت أبي شيخا كبيرا لا يستطيع أن يستوي على الراحلة، فهل يقضي عنه أن أحج عنه؟ قال: «نعم»[1]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کی کہ خثعم قبیلے کی ایک عورت نے حجۃ الوداع کے سال آ کر عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کا فرض جو اس کے بندوں پر حج کے بارے میں ہے، اس فرض نے میرے باپ کو ایسی حالت میں پا لیا ہے (یعنی ایسی حالت میں میرے باپ پر حج فرض ہوا ہے) کہ وہ نہایت ہی بوڑھا ہو گیا ہے، سواری پر بھی بیٹھ نہیں سکتا تو کیا اس کی طرف سے حج ادا ہو جائے گا، اگر میں اس کی طرف سے حج کر دوں؟ فرمایا: ہاں۔''

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بکر جیسے شخص پر بھی جو کسی طرح طی مسافت کی استطاعت نہیں رکھتا، حج فرض ہو جاتا ہے اور جب حج فرض ہو گیا اور بغیر ادا کے مر گیا تو وہ فرض اس کے ذمہ باقی رہا، پس بحکم جواب سوال نمبر (۱) اس کی طرف سے حجِ بدل کرنا جائز ومشروع ہوگا اور اس حجِ بدل سے جو حج کہ اس کے ذمہ فرض تھا، اس کی فرضیت بھی ساقط ہو جائے گی۔

③ دونوں کا حکم (حج کی نذر کرنے سے حج کے فرض ہو جانے اور بغیر حج ادا کیے مر جانے سے اس حجِ فرض کے ذمہ وار رہ جانے اور دونوں کی طرف سے حجِ بدل کے جائز ومشروع ہونے میں) مساوی ہے۔

عن ابن عباس أن امرأة من جهينة جاءت إلى النبي صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: إن أمي نذرت أن تحج، فلم تحج حتى ماتت، أفأحج عنها؟ قال: «حجي عنها، أرأيتِ لو كان علىٰ أمك دين أكنت قاضية؟ اقضوا حق الله، فالله أحق بالوفاء»[2]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جہینہ کے قبیلے کی ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آ کر عرض کیا کہ میری ماں نے حج کی نذر کی تھی اور بغیر حج کیے مر گئی تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر دوں؟ فرمایا: تو اس کی طرف سے حج کر دے، بھلا یہ تو بتا کہ اگر تیری ماں پر دین ہوتا تو کیا تو اس کو ادا کرتی یا نہیں؟ اللہ کا حق ادا کیا کرو، کیونکہ اللہ کا حق وفا میں اس دین سے اَحق ہے۔''

اس حدیث سے ثابت ہے کہ حج کی نذر کرنے سے حج فرض ہو جاتا ہے اور بغیر ادا کیے مر جانے سے اس حج

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٥٤)

کی فرضیت ناذر کے ذمہ باقی رہ جاتی ہے اور آپ ﷺ نے اس عورت سے اس بیان میں کہ ''میری ماں نے حج کی نذر کی تھی اور بغیر حج کے مرگئی'' یہ استفصال نہیں فرمایا کہ تیری ماں حج کی نذر مان کر فوراً مرگئی یا مدت کے بعد مری؟ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں حالتوں میں حجِ بدل کے جائز و مشروع ہونے میں حکم مساوی ہے، ورنہ اگر حکم مختلف ہوتا تو استفصال فرمانا ضروری ہوتا اور بغیر استفصال ایک خاص حکم لگانا صحیح نہ ہوتا۔

④ حج فرض بالنذر اور حج فرض بالاستطاعت، یعنی حجۃ الاسلام حکمِ فرضیت میں دونوں متحد ہیں، اس لیے کہ جس طرح آیتِ کریمہ: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ [آل عمران: ٩٧] [اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے] خدائے تعالیٰ کا کلام ہے، اسی طرح آیتِ کریمہ: ﴿وَ لْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ﴾ [الحج: ٢٩] [اور اپنی نذریں پوری کریں] بھی اسی کا کلام ہے۔ جس طرح آیتِ اولیٰ استطاعت کی فرضیت پر دال ہے، اسی طرح آیتِ ثانیہ بھی حج کی فرضیت پر دال ہے اور یہ دونوں جس طرح حکمِ فرضیت میں متحد ہیں (بغیر ادا کیے مرجانے کی حالت میں) بقاحکمِ فرضیت (بذمہ مستطیع و ناذر) میں و جواز و مشروعیتِ حجِ بدل میں بھی متحد ہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا سوالات کے جوابات سے واضح ہوا۔ ہاں صراحتاً ارکانِ خمسہ اسلام سے ہونے میں دونوں مختلف ہیں، کیونکہ حجۃ الاسلام تو صراحتاً ارکان مذکورہ میں سے ہے اور حج فرض بالنذر صراحتاً ان میں سے نہیں ہے اور اگر زیادہ استقراء کیا جائے تو ممکن ہے کہ احکامِ مذکورہ کے علاوہ اور احکام میں بھی دونوں متحد یا مختلف ثابت ہوں۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)



کتاب النکاح

دخترانِ رسول ﷺ کی شادیاں اور ہمارے معاشرتی رسم و رواج:

سوال ہمارے رسولِ کریم ﷺ کی کتنی صاحبزادیاں تھیں اور ہر ایک صاحبزادی کا نکاح کس طرح حضور نے کیا اور جہیز میں کیا کیا چیزیں حضور نے دیں اور مہر کیا مقرر ہوا تھا؟ خاص کر کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں کس طرح کیا گیا اور جہیز میں کیا کیا چیزیں دی گئیں تھیں اور رخصت کس طرح کی گئی تھیں؟ لباس کیا تھا؟ سواری پر یا پیدل اور پیر میں جوتا تھا یا نہیں؟ بستر پلنگ دیا گیا تھا یا نہیں؟ غرضکہ جو جو کام حضور نے اپنی صاحبزادیوں کے نکاح میں کیے ہوں، ان سب کام کی تفصیل سے پوری طور سے اچھی طرح سے لکھیے۔ اگر کوئی حضور کے صاحبزادیوں کی نقل کرے تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ آج کل نکاح میں بہت سی رسم ہوتی ہے، یعنی نئے کپڑے دینا۔ بستر عمدہ خوبصورت پلنگ کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں، ورنہ لوگ طعن کرتے ہیں۔ اسی طرح برتن میں بھی کرتے ہیں، اسی طرح مہر کی بھی تفصیل فرمائیے، زیادہ سے زیادہ کس قدر اور کم سے کم کس قدر؟ کیونکہ اس میں بھی لوگ غلطی کیا کرتے ہیں، کوئی ہزار روپیہ مقرر کرتا ہے، اس شرط پر کہ یہ مہر خاندانی ہے۔

جواب حضرت رسول کریم ﷺ کی صاحبزادیاں چار تھیں۔ (زاد المعاد: ۱/ ۲۵) ان صاحبزادیوں کا نکاح آپ نے کس طرح کیا اور جہیز میں کیا کیا چیزیں دیں اور رخصت کس طرح کیا اور لباس کیا دیا اور سوار یا پیدل رخصت کیا اور پیر میں جوتی دی یا نہیں؟ بستر پلنگ دی یا نہیں؟ کسی حدیث صحیح میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ مہر کی نسبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ۱۲ اوقیہ سے، جس کا ایک سو پچاس روپیہ یا کچھ کم ہوتا ہے، زیادہ آپ نے کسی صاحبزادی کا مہر نہیں مقرر فرمایا۔[1] (مشکوة، ص: ۲٦۹)

واضح رہے کہ شرع میں کسی آیت یا صحیح حدیث سے مہر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، نہ کم کی جانب نہ زیادہ کی جانب، بلکہ صرف یہ فرمایا گیا ہے: ﴿اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ﴾ [النساء: ٢٤] [اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو] جس میں قلت و کثرت کی کوئی قید نہیں ہے، غالباً اس بارے میں حیثیت کا اعتبار ہوگا اور واضح ہو کہ نکاح میں عورت کی جانب کوئی خرچ نہیں رکھا گیا ہے، جو کچھ خرچ رکھا گیا ہے، سب مرد پر رکھا گیا ہے۔ مہر بھی مرد ہی پر رکھا گیا ہے، نفقہ اور سکنیٰ بھی مرد ہی پر ہے، دعوتِ ولیمہ بھی مرد ہی پر ہے۔

الغرض عورت کے ذمہ نکاح کے متعلق کوئی خرچ نہیں ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٠٦)

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ [سورة نساء: ٣٤]

[مرد عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے خرچ کیا]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مرد کے عورت پر حاکم ہونے کی وجہ ایک یہ بیان فرمائی ہے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ عورت پر اس بارے میں کچھ خرچ نہیں ہے، ورنہ اس کو بھی مرد پر کچھ حکومت ملتی۔ اس بیان سے یہ صاف ہوگیا کہ نکاح کے وہ سب رسوم، جن میں عورت پر مال خرچ کرنا رکھا گیا ہے، شرع کے خلاف ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (٢٢/ ربیع الآخر ١٣٣١ھ)

ھو الموفق: رسول اللہ ﷺ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رخصتی کے وقت جہیز دینا، ابن ماجہ اور مسند احمد کی روایت میں آیا ہے، مسند احمد کی روایت یہ ہے:

"عن علي رضی اللہ عنہ قالَ: جَهَّزَ رسولُ اللهِ ﷺ فَاطِمَة في خميل و قربة و وسادة آدم، حشوها ليف الإذخر"[1]

[علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو صوف کی ایک سفید چادر، ایک مشک اور چمڑے کا ایک ایسا تکیہ جہیز دیا، جس میں کھجور کی چھال اور اذخر گھاس بھری ہوئی تھی]

مسند احمد کی دوسری روایت اس طرح ہے:

"عن علي أن رسول الله ﷺ لما زوجه فاطمة بعث معها بخميلة و وسادة من آدم حشوها ليف و رحيين وسقاء وجرتين"[2]

[علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو ان کے ساتھ صوف کی ایک سفید چادر، ایک چمڑے کا تکیہ، جس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، دو چکیاں، ایک مشک اور دو گھڑے بھیجے]

ابن ماجہ کی روایت یہ ہے:

"عن علي رضی اللہ عنہ أن رسول الله ﷺ: أتىٰ عليا و فاطمة، وهما في خميل لهما، والخميل القطيفة البيضاء من الصوف، قد كان رسول الله ﷺ جهزهما بها و وسادة محشوة إذخرا وقربة"[3]

---

[1] مسند أحمد (١/ ٨٤)

[2] مسند أحمد (١/ ١٠٤)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٥٢)

[علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ علی و فاطمہ کے پاس اس وقت آئے، جب وہ اپنی صوف کی ایک چادر میں تھے۔ ''خمیل'' صوف کی سفید چادر کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو یہ چادر، اذخر گھاس سے بھرا ہوا ایک تکیہ اور ایک مشک عنایت فرمائی تھی]

خلاصہ ان روایتوں کا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو صوف کی ایک سفید چادر اور ایک تکیہ اور ایک مشک، دو چکی اور دو گھڑے جہیز میں دیے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبد الرحمن المبارکفوري ـعفا اللّٰہ تعالیٰ عنه.

جنات اور انسانوں میں نکاح و ازدواج کا مسئلہ:

سوال انسان کے مرد اور جن کی عورت میں ازدواج وصحبت جائز ہے یا نہیں؟

جواب جس طرح انسان کے مرد کو دوسرے کسی جنس کی مادہ سے صحبت کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ انسان کے مرد کا جوڑا اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کی عورت کو بنایا ہے، اسی طرح جن کی عورت سے بھی ہم جفت ہونا اور صحبت کرنا، خواہ نکاح سے ہو یا بغیر نکاح کے، جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ نحل رکوع (۱۰) میں فرمایا: ﴿وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا﴾ [النحل: ۷۲] ''اللہ ہی نے تمھاری لیے تمھیں میں سے جوڑے بنائے۔'' سورہ روم رکوع (۳) میں فرمایا: ﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا﴾ [الروم: ۲۱] ''اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھیں میں سے جوڑے بنائے کہ تم ان سے آرام پاؤ۔''

امام احمد و ابو داود و ترمذی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«من وقع علی بهيمة فاقتلوه، واقتلوا البهيمة»[1]

(رواہ أحمد و أبو داود والترمذي، منتقی الأخبار متن نیل الأوطار: ۷/ ۳۱)

''جو شخص چار پایہ کے ساتھ وطی کرے تو اس کو مار ڈالو اور اس چار پایہ کو بھی مار ڈالو'' واللّٰہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللّٰہ

کیا ترکِ نماز سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال کیا ترکِ نماز سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب اس سے نکاح نہیں ٹوٹتا، لیکن بلا عذر شرعی نماز ترک کرنے سے آدمی بہت بڑا گنہگار ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایسے شخص پر لفظ کافر تک کا بھی اطلاق آ گیا ہے۔

کیا گناہ والی شادی بیاہ میں شرکت کرنا جائز ہے؟

سوال کیا گناہ والی شادی بیاہ میں شرکت کرنا جائز ہے؟

[1] مسند أحمد (۱/ ۲۶۹) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٤٦۲) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱٤٥٥)

جواب ایسا شخص جس کی ایسی شادی یا غمی میں شریک نہ ہونے یا دعوت قبول نہ کرنے سے لوگوں کو تنبیہ ہونے کی امید ہو تو بہ نیت تنبیہ ان لوگوں کی اُس شادی یا غمی میں شریک نہ ہو اور ایسا شخص جس کے وہاں جا کر وعظ و نصیحت کرنے سے امید ہو کہ وہ لوگ اس کی نصیحت مان جائیں گے، اس کو اس شادی یا غمی میں شریک ہونا جائز ہے۔

متعدد خاوندوں والی عورت جنت میں کس کو ملے گی؟

سوال کتاب ''بہشت نامہ'' میں حضرت رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ یہاں دنیا میں جس عورت نے کئی شوہر کیے ہوں گے، پہلے جس کے نکاح میں ہوئی ہوگی، وہی شوہر اس کو روزِ قیامت میں بہشت میں ملے گا۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ مسئلہ راست ہے تو بیوؤں سے عقد ثانی کرنا محض فعل بے فائدہ ہے۔

جواب کتاب ''بہشت نامہ'' یہاں موجود نہیں ہے کہ دیکھا جائے کہ کیسی کتاب ہے اور کس کی تصنیف ہے اور جو روایت لکھی ہے، حدیث کی کس معتبر کتاب سے لکھی ہے، لیکن شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخیص الحبیر في تخریج أحادیث الرافعي الکبیر" (ص: ۲۸۵ چھاپہ دہلی) میں امام بیہقی سے حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ جس عورت نے دنیا میں کئی شوہر کیے ہوں گی، قیامت میں وہ عورت پچھلے شوہر کو ملے گی۔ تلخیص الحبیر کی عبارت یہ ہے:

"المرأة لآخر أزواجها في الدنیا"[1] [یعنی وہ عورت اپنے آخری دنیوی خاوند کو ملے گی]

یہ قول حذیفہ کا اگرچہ ظاہراً موقوف ہے، لیکن حکماً مرفوع ہے۔ کما تقرر في الأصول.

سوال زید نے ہندہ کے ساتھ نکاح کیا، بعد چند روز یا چند ماہ یا چند سال قبل تولد اولاد یا بعد تولد اولاد زید کا انتقال ہوا۔ بعدہ بعد عدت ہندہ نے نکاح ثانی عمرو کے ساتھ کر لیا، اب اس میں دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ روزِ قیامت کے حساب کے بعد، مثلاً: زید بہ باعث نکوکاری جنتی ہوا اور ہندہ برعکس اس کے اور دوسرے صورت یہ کہ زید و ہندہ دونوں جنتی ہوے، بہر کیف جنت میں ہندہ زید کو ملے گی یا عمرو کو؟

مرسلہ: احمد محمدی از مکان مولوی غلام یحییٰ صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ الٰہ آباد۔

جواب بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو اختیار دیا جائے گا، جس کو چاہے اختیار کر کے اور بعض روایت سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو شوہر دنیا میں اس کے ساتھ حسنِ خلق کے ساتھ زیادہ برتاؤ رکھتا تھا[2] بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخری شوہر کو دی جائے گی۔[3] (معجم طبرانی و مسند بزار و طبقات ابن سعد) واللّٰہ أعلم بالصواب.

کتبہ: ابو الفیاض محمد عبد القادر اعظم گڈھی مؤی۔ مہر مدرسہ (۹۴/۹/۲۵)

---

[1] یہ حدیث مرفوعاً بھی مروی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۱۲۸۱)

[2] المعجم الکبیر (۲۳/ ۳۶۷) امام ہیثمی فرماتے ہیں: "رواہ الطبراني وفیه سلیمان بن أبي کریمة ضعفه أبو حاتم وابن عدي"

[3] المعجم الأوسط (۳/ ۲۷۵) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۱۲۸۱)

هو الموفق: اس بارے میں کہ عورت کس شوہر کو ملے گی؟ وہی تین روایتیں جو جواب میں لکھی گئی ہیں، نقل کی جاتی ہیں، مگر جن کتابوں سے یہ روایتیں نقل کی جاتی ہیں، وہ یہاں موجود نہیں کہ ان میں دیکھ کر ان روایتوں کا صحیح ہونا یا ضعیف ہونا معلوم ہو۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبدالرحمن مبارکپوری

نکاحِ متعہ کا حکم:

سوال متعہ کا حکم مثل خنزیر ہے یا مثل زنا کے اور وقتِ اضطرار جائز ہے یا نہیں؟

جواب نکاحِ متعہ جائز نہیں ہے یعنی ہر حال میں حرام ہے۔ یہ نکاح قیامت تک حرام ہے۔

قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾

[المومنون والمعارج: ٥، ٦، ٧]

[اور وہی جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں، یا ان (عورتوں) پر جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ بنے ہیں تو بلاشبہہ وہ ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں۔ پھر جو اس کے سوا تلاش کرے تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں]

وعن سبرة الجهني أنه كان مع النبي ﷺ فقال: «يا أيها الناس إني كنت أذنت لكم في الاستمتاع من النساء، وإن اللّٰه تعالىٰ حرم ذلك إلى يوم القيامة»[1] الحديث

(رواه أحمد و مسلم، المنتقىٰ مع النيل: ٦/ ٤٣)

[سبرہ جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نبیِ مکرم ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! میں نے تم کو عورتوں سے (نکاحِ) متعہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور (اب سن لو!) بلاشبہہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک حرام قرار دیا ہے] کتبہ: محمد عبداللہ

اس کے متعلق واضح ہو کہ آنحضرت ﷺ نے متعہ کی اجازت حالتِ اضطرار میں فرمائی تھی، اس کے بعد آپ ﷺ نے منسوخ فرمائی تو اِس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ جواز حالتِ اضطرار پر نسخ وارد ہوا، اب حالت اضطرار وغیرہ میں یکساں ناجائز وحرام ہے، جس طرح زنا و استمناء بالید ہر حال میں حرام ہے۔ خنزیر و مردار پر اس کا قیاس نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ گوتنگی میں جو اضطرار ہوتا ہے، اس میں ہلاکِ نفس اور جان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے سدِ رمق کے لیے تھوڑی مقدار میں اکلِ حرام جائز کیا گیا۔ بخلاف شہوت انسانیہ کے کہ اس کی زیادتی میں جان کا اندیشہ نہیں ہے، البتہ زنا کا اندیشہ ہے، چنانچہ حسبِ فرمان شارع علیہ الصلاۃ والسلام اس کا علاج اس شخص کے لیے جسے نکاح کا مقدور نہ ہو، روزہ ہے اور بہت سی دوائیں بھی اس قوت کی گھٹانے والی ہیں۔ بعض لوگ جو یہ عذرِ رکیک پیش کرتے ہیں کہ صحیح مسلم میں چونکہ لفظ کا تحذیر متعہ کے بارے میں وارد ہے، اس لیے ہم بھی اسی کے موافق یہ لفظ بولتے ہیں۔

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٦) مسند أحمد (٣/ ٤٠٥)

سو واضح ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں، بلکہ اور لوگوں کا قول ہے۔ یہاں پر صحیح مسلم کی عبارت نقل کی جاتی ہے، تاکہ ناظرین کو خود اس کی کیفیت معلوم ہو جائے:

"قال ابن أبي عمرة أنها كانت رخصة في أول الإسلام لمن اضطر إليها كالميتة والدم ولحم الخنزير ثم أحكم الله الدين ونهى عنها"[1]

یعنی متعہ کرنا جسے اضطرار کی حالت ہو تو اس کے لیے ابتداے اسلام میں جائز تھا، جیسا کہ مردہ اور گوشت خنزیر کا حالتِ اضطرار میں جائز ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی باتوں کو محکم اور دوامی قرار دیا اور متعہ سے منع فرمایا۔

ایک عذرِ نامعقول یہ کیا جاتا ہے کہ محدثین نے "باب نكاح المتعة" منعقد کیا اور کتبِ حدیث میں اس کو لفظِ نکاح سے تعبیر کیا گیا اور جب اس کو نکاح کہا گیا تو اب ہم اس کو مثل زنا کے نہیں کہہ سکتے۔ یہ بھی سخت غلط فہمی ہے، اس کو نکاح اس لیے کہا گیا کہ اس میں ظاہراً صورت عقد کی پائی جاتی ہے، اس لیے اس کو تزویج و نکاح کہا گیا۔ ابو داود و نسائی وغیرہ میں ابو بردۃ سے مروی ہے:

"انه بعثه رسول الله ﷺ إلى رجل تزوج امرأة أبيه من بعده أن يقتله و يأخذ ماله"[2]

یعنی ابو بردہ کو آنحضرت ﷺ نے اس شخص کی طرف بھیجا، جس نے اپنے باپ کی عورت سے نکاح کر لیا تھا اور حکم فرمایا کہ اس شخص کو قتل کر ڈالو اور اس کا مال لے لو۔

یہاں پر باپ کی منکوحہ سے عقد کرنے کو "تزوج" یعنی نکاح کہا گیا، حالاں کہ یہ فعل زنا سے بھی بڑھ کر ہے، کیوں کہ زنا کی سزا کوڑے مارنا یا سنگ سار کرنا مقرر کی گئی، فعل مذکور کی طرح قتل کر ڈالنا اور مال لے لینا نہیں قائم کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ ﴾ [النساء: ٢٢] [اور ان عورتوں سے نکاح مت کرو، جن سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں] یہاں بھی فعل مذکور پر لفظِ نکاح بولا گیا۔ یہی مسلک تاج المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ امام ابن خزیمہ و امام ابن حزم صاحب محلی وغیرہم رحمہم اللہ کا ہے۔ اگر تفصیل کی ضرورت ہوئی تو آیندہ ان شاء اللہ مفصل طور پر لکھا جائے گا۔ کتبہ: محمد عبدالجبار عمرپوری

طلاق کے بغیر دوسرا نکاح کرنا:

سوال زید نے اپنی لڑکی ہندہ نابالغہ کا نکاح بکر کے ساتھ کیا۔ زید نے بعد بلوغ ہندہ کے چاہا کہ میں بغیر طلاق بکر کے، ہندہ کا نکاح ساتھ دوسرے کے کر دوں اور ہندہ بعد بلوغ کے نکاحِ ثانی پر راضی نہیں ہے، اس صورت میں ہندہ کا نکاح بغیر طلاق دیے ہوئے بکر کے جائز ہے یا نہیں؟

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٥٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٠٨)

جواب بغیر طلاق حاصل کیے مذہبِ اہلِ اسلام میں نکاح دوسرا جائز نہیں ہے۔ یہ اظہر من الشمس ہے، حاجت دلیل نہیں اور عند الحنفیہ نابالغہ کا نکاح اگر باپ دادا کے سوا کوئی اور کرے تو بعد بلوغ کے اس کو اگر خلوتِ صحیحہ اور تبدل مجلس نہ ہوا ہو، تب فوراً فسخ کا اختیار ہے اور اگر باپ دادا نکاح کر دے، تب وہ نکاح لازم ہوا، اس کو بلوغ کے بعد فسخ کا اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

"وللولي، الآتي بيانه إنكاح الصغير والصغيرة جبراً، ولو ثيبا، كمعتوه، و مجنون شهرا، و لزم النكاح، ولو بغبن فاحش، بنقص مهرها وزيادة مهره أو زوجها بغير كفؤ إن كان الولي المزوج بنفسه بغبن أبا أو جدا"[1]

''اور واسطے ولی کے ایسا ولی کہ آنے والا ہے بیان اس کا، نکاح کرنا چھوٹے لڑکا اور چھوٹی لڑکی کا زبردستی اگرچہ ثیبہ ہو اور لازم ہوتا ہے نکاح، اگرچہ ہو ساتھ نقصان بہت کے مہر میں یا نکاح کرے اسی لڑکی کا بغیر اپنے کفو کے، اگر ہو وہ ولی نکاح کرنے والا باپ یا دادا۔'' واللہ أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله. أبو الفياض محمد عبدالقادر أعظم گھڑی مئوی. مہر مدرسہ

جنون کی وجہ سے بھائی کی بیوی سے بغیر طلاق نکاح کرنے کا حکم:

سوال ایک شخص مجنون ہوگیا ہے اور اس وجہ سے اس کے حقیقی بڑے بھائی نے اس کی بی بی سے نکاح کر لیا ہے، یہ نکاح شرعاً جائز ہوا یا نہیں؟ المستفتی: فضل اللہ۔ دولت پور۔ آرہ

جواب صورت مسئولہ میں اُس مجنون شخص کے بڑے بھائی نے جو اس شخص کے مجنون ہو جانے کی وجہ سے اس کی بی بی سے نکاح کر لیا ہے، وہ نکاح شرعاً جائز نہیں ہوا، اس لیے کہ وہ شوہر دار عورت ہے اور شوہر دار عورت سے نکاح جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ [النساء: ٢٣۔ ٢٤]

[1] الدر المختار مع رد المحتار (٣/ ٦٦)

[حرام کی گئیں تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں اور تمھاری بیویوں کی مائیں اور تمھاری پالی ہوئی لڑکیاں، جو تمھاری گود میں تمھاری ان عورتوں سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری پشتوں سے ہیں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو، مگر جو گزر چکا۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔ اور خاوند والی عورتیں (بھی حرام کی گئی ہیں) مگر وہ (لونڈیاں) جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں، یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا ہے اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں کہ اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو، اس حال میں کہ نکاح میں لانے والے ہو، نہ کہ بدکاری کرنے والے۔ پھر وہ جن سے تم ان عورتوں میں سے فائدہ اٹھاؤ، پس انھیں ان کے مہر دو، جو مقرر ہوں اور تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم مقرر کر لینے کے بعد آپس میں راضی ہو جاؤ، بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے] واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب

كتبه: أبو يوسف محمد عبدالمنان الغازيفوري. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله

(٤/ شوال ١٣٢٦هـ)

محمدیوں اور حنفیوں کے درمیان رشتہ ازدواج کا حکم:

سوال ١ محمدیوں کے لڑکے اور لڑکی کا حنفیوں کی لڑکی اور لڑکے سے نکاح شادی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

٢ محمدیوں کو حنفیوں کے ساتھ کھانا پینا کرنا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

٣ اگر حنفیوں کے ساتھ محمدیوں کی شادی بیاہ جائز نہیں ہو اور اگر کسی نے کر لیا ہے تو اس کی معافی کی کیا صورت ہے اور اگر شادی بیاہ فریقین سے جائز ہے اور کسی نے شادی کر لیا ہے تو کرنے والے کو جماعت سے نکال دینے والے کی کیا سزا ہے؟

جواب ١ محمدیوں کے لڑکا لڑکی کا نکاح شادی حنفیوں کی لڑکی لڑکا سے کرنا جائز ہے، کیونکہ دونوں فریق مسلمان ہیں اور مسلمان مسلمان میں نکاح شادی کرنا جائز ہے۔ ہاں مسلمان اور کافر میں مناکحت جائز نہیں ہے، بشرطیکہ عورت کافرہ کتابیہ نہ ہو۔

﴿وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ﴾ [سورۂ بقرۃ، رکوع: ٢٧]

[اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور یقیناً ایک مومن لونڈی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ تمھیں اچھی لگے اور نہ (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں دو،

یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور یقیناً ایک مومن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے، خواہ وہ تمھیں اچھا معلوم ہو]

﴿وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ [سورۂ ممتحنة، رکوع:۲]

[اور کافر عورتوں کی عصمتیں روک کر نہ رکھو]

۲ محمدیوں کو حنفیوں کے ساتھ کھانا پینا کرنا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے۔

﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ﴾ [سورۂ بقرہ، رکوع:۵][اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو]

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: «الصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم، برا كان أو فاجرا، وإن عمل الكبائر»[1] (أبو داود، چھاپه دهلى، ص:۳٤٤)

[ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (فرض) نماز ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے، خواہ نیک ہو یا بد، اگرچہ وہ کبائر کا مرتکب ہو]

۳ شادی بیاہ فریقین سے جائز ہے، جیسا کہ جواب سوال نمبر (۱) سے معلوم ہوا۔ اگر کسی نے شادی کر لی تو شادی کرنے والے کو صرف اس وجہ سے جماعتِ مسلمین سے نکال دینے والا سخت گنہگار ہے۔ نکال دینے والے کو چاہیے کہ اس بات سے توبہ کرے اور جس کو اس وجہ سے نکال دیا ہے، اس کو جماعتِ مسلمین میں شامل کر لے اور آیندہ پھر ایسی حرکت نہ کرے۔ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ (سورۂ حجرات، رکوع:۱) [مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ] والله أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله

بلوغت سے قبل شادی کا حکم:

سوال زید نے اپنی لڑکی کا عقد خالد کے ساتھ بعمر نابالغی کر دیا۔ یعنی لڑکا اور لڑکی کی عمر تخمیناً گیارہ سال کی تھی اور خالد کا ولی اور سرپرست سوائے اس کی والدہ کے اور کوئی نہ تھا۔ عقد ہو جانے کے دو ماہ بعد زید کو معلوم ہوا کہ خالد کی والدہ جو خاوند کی ولی اور سرپرست ہے اور بیوہ ہے، اپنے کسی قرابت دار سے ناجائز تعلق رکھتی ہے اور وہ قرابت دار اسی کے گھر میں رہتا ہے اور وہ بھی بطورِ مالک اور منتظم کے ہے، اس کا علم ہونے کے بعد زید نے اپنی لڑکی کا اس مکان میں رہنا پسند نہ کیا کہ جس میں خلافِ شرع شریف ناجائز امور ظہور میں آتے ہیں۔ اس خیال سے اس نے خالد سے کہا کہ یا تو تم اپنی والدہ کا عقد اس قرابت دار یا کسی دوسرے شخص کے ساتھ، جس کو وہ منظور کرے، کر دو یا خود اس سے علیحدہ ہو تو میں اپنی لڑکی کو تمھارے گھر چھوڑوں گا، ورنہ ایسی ناجائز جگہ اپنی لڑکی کا رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس پر نہ اس کی

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٩٤) اس حدیث کی سند میں انقطاع ہے، لہٰذا یہ ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: نصب الراية (۲/ ۱۹) إرواء الغليل (۲/ ۳۰٤)

والدہ نے اپنا عقد کیا اور نہ وہ اپنی والدہ سے علیحدہ ہوا، بلکہ نفسانیت اور والدہ کے بہکانے کی وجہ سے ایک اور عقد کر لیا۔ اب زید کی لڑکی تخمیناً چار سال سے زید کے گھر میں ہے اور خالد دوسری بی بی کے ساتھ رہتا ہے اور اسی کے نان ونفقہ کا کفیل ہے۔ زید کی لڑکی کا بار باپ کے سر ہے۔ ایسی حالت میں زید کو کیا کرنا چاہیے؟

السائل: عبدالرحمٰن۔ دیدار بخش بازار سوت ہٹی۔ متصل کوتوالی۔ فرخ آباد

جواب زید نے جو اپنی لڑکی کا عقد خالد کے ساتھ کر دیا، اگر خالد یا وہ لڑکی یا دونوں عقد کے وقت نابالغ تھے تو عقد مذکورہ دو وجہ سے صحیح نہیں ہوا۔ اولاً اس وجہ سے کہ نکاح کی عمر سن بلوغ ہے اور یہ نکاح سن بلوغ سے قبل ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ﴾ [سورہ النساء، رکوع ۱] یعنی یتیم بچوں کو آزماتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر تک پہنچیں۔ ظاہر ہے کہ نکاح کی عمر سن بلوغ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ ثانیاً اس وجہ سے کہ عورت کا نکاح اس کے اذن کے بغیر ناجائز ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لا تنكح البكر حتى تستأذن، ولا تنكح الأيم حتى تستأمر»[1] الحديث

(متفق عليه، مشكوة شريف، باب الولي والاستيذان)

یعنی کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے، جب تک کہ اس سے اذن نہ لیا جائے اور بیوہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے حکم نہ لیا جائے۔

حالت نابالغی کا اذن شرعاً نامعتبر ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عقد مذکور صحیح نہ ہوا اور جب ثابت ہوا کہ عقد مذکور صحیح نہیں ہوا تو ایسی حالت میں اس لڑکی کا دوسرا عقد کر دیا جائے اپنے ضلع کے صاحب جج سے اجازت لے کر، اگر وہ لڑکی سن بلوغ کو پہنچ چکی ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۳/ صفر ۱۳۳۵ھ)

عدت کے اندر نکاح کرنے کا حکم:

سوال ایک عورت بلا طلاق اپنے شوہر کو چھوڑ کر غیر آدمی کے پاس چار برس تک رہی۔ وہاں پر ایک لڑکا بھی تولد ہوا، بعد اس کے وہ شخص جس کے پاس وہ عورت تھی، اس نے اس کے شوہر کو ایک سو روپیہ دے کر خلع کر کے فوراً بلا عدت اس سے نکاح پڑھوا لیا۔ موافق شرع شریف کے وہ نکاح جائز ہے یا نہیں اور خلع میں عدت شرط ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنے روز؟

جواب موافق شرع شریف کے وہ نکاح جائز نہیں، اس لیے کہ وہ نکاح عدت کے اندر ہوا اور ایسا نکاح جائز نہیں اور خلع میں عدت شرط ہے اور وہ ایک حیض ہے۔

في المنتقى عن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن امرأة ثابت بن قيس اختلعت من زوجها فأمرها النبي ﷺ أن تعتد بحيضة.[2] والله أعلم بالصواب.

(رواه أبو داود والترمذي وقال: حديث حسن غريب)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٢٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٥)

[منتقی میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بلاشبہہ ثابت بن قیس کی بیوی نے اپنے خاوند سے خلع لیا تو نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک حیض عدت گزارنے کا حکم دیا]

كتبه: محمد عبدالله. الجواب صحيح عندى. محمد ضمير الحق عفي عنه. الجواب صحيح. وصيت على، مدرس دوم مدرسه احمديه آره. الجواب صحيح. ألفت حسين. أصاب من أجاب، أبو محمد إبراهيم. الجواب صحيح. كتبه: محمود، عفا الله عنه. الأولاد المتولدة قبل النكاح أولاد الزنا بلاشبهة، والله أعلم [نکاح سے پہلے پیدا ہونے والی اولاد بلاشبہہ اولادِ زنا (حرامی) ہوتی ہے] و الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب.

سوال مسمی عبداللہ نے ہندہ بی بی سے عدت کے اندر نکاح کیا اور صحبت بھی کیا، پھر چند لوگوں نے اس کو روکا اور صحبت سے منع کیا، پھر جو عدت کا ایام باقی تھا، اس کو اختتام کر کے پھر تجدیدِ نکاح کا کر دیا۔ اب کوئی عالم کہتے ہیں کہ اول نکاح جو عدت میں واقع ہوا، باطل ہے، اب تم کو پھر عدت کرنا ہوگا۔ پہلی عدت کفارہ میں گئی ہے تو بعد گزرنے عدت جدیدہ کے نکاح کر لینا، پس اس صورت میں نکاح پہلا صحیح یا دوسرا ہوگا یا اب جو حساب میں تیسرا ہے؟

جواب اس صورت میں اختلاف ہے کہ آیا ہندہ پر دو مستقل عدتیں واجب ہیں یا دو متداخل عدتیں؟ ایک قول یہ ہے کہ دو مستقل عدتیں واجب ہیں، یعنی ہندہ پر یہ واجب ہے کہ اولاً پہلی عدت کرے اور جب وہ پوری ہو جائے، تو اس وقت سے دوسری عدت از سرنو شروع کرے اور جب وہ بھی پوری ہو جائے تب اگر نکاح کرے تو وہ نکاح صحیح ہوگا اور تا انقضائے اس دوسری عدت کے عبداللہ اور ہندہ میں تفریق رہنا چاہیے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ دو متداخل عدتیں واجب ہیں، یعنی ہندہ پر یہ واجب ہے کہ اولاً پہلی عدت پوری کرے اور اسی پہلی عدت میں دوسری عدت بھی اس وقت سے شروع ہوجاتی ہے، جب سے کہ عبداللہ اور ہندہ میں تفریق واقع ہوئی ہے۔ یعنی جب سے عبداللہ نے ہندہ سے صحبت ترک کر دی ہے اور جب پہلی عدت پوری ہوجائے تو دوسری عدت کا حصہ جس قدر باقی رہ گیا ہے، اسی قدر کو پورا کر دے، دوسری عدت از سرنو اس پر واجب نہیں ہے۔

پہلا قول حضرت عمر و حضرت علی رضی اللہ عنہما کا ہے اور یہی قول ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا ہے اور حسبِ روایتِ اہلِ مدینہ یہی قول امام مالک رحمہ اللہ کا ہے اور اسی قول کو امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور دوسرا قول زہری رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کا ہے اور بروایت یہی قول امام مالک رحمہ اللہ کا ہے اور اسی کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ پہلا قول احوط ہے اور اس احوط قول کے مطابق ہندہ کے دونوں نکاح عدت کے اندر واقع ہوئے اور جو نکاح کہ عدت کے اندر واقع ہو، وہ نکاح صحیح نہیں ہے، اس وجہ سے اس احوط قول کے موافق ان دونوں نکاحوں میں کوئی بھی صحیح نہیں ہوا۔

لقوله تعالىٰ: ﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ﴾ [بقرة، ركوع ٣٠]

[اور نکاح کی گرہ پختہ نہ کرو، یہاں تک کہ لکھا ہوا حکم اپنی مدت کو پہنچ جائے]

جب دوسری عدت بھی بالاستقلال ختم ہو جائے، تب اگر دوسرا نکاح کرے تو وہ نکاح صحیح ہوگا۔ "التلخیص الحبیر" (ص: ٣٢٨) میں ہے:

"أما قول عمر فرواه مالك، والشافعي عنه عن ابن شهاب، عن سعيد بن المسيب و سليمان بن يسار أن طليحة كانت تحت رشيد الثقفي. فطلقها البتة فنكحت في عدتها فضربها عمر، و ضرب زوجها بالدرة ضربات، وفرق بينهما، ثم قال عمر: أيما امرأة نكحت في عدتها فإن كان زوجها الذي تزوجها لم يدخل بها فرق بينهما، ثم اعتدت بقية عدتها من زوجها الأول، وكان خاطبا من الخطاب، وإن كان دخل فرق بينهما، ثم اعتدت بقية عدتها من زوجها الأول، ثم اعتدت من الآخر، ثم لم ينكحها أبدا. قال ابن المسيب: ولها مهرها بما استحل منها. قال البيهقي: وروى الثوري عن أشعث عن الشعبي عن مسروق عن عمر أنه رجع فقال: لها مهرها، ويجتمعان إن شاء.

"أما قول علي فرواه الشافعي من طريق زاذان عنه أنه قضىٰ في التي تزوج في عدتها أنه يفرق بينهما، ولها الصداق بما استحل من فرجها، وتكمل ما أفسدت من عدة الأول، وتعتد من الآخر، و رواه الدارقطني والبيهقي من حديث ابن جريج عن عطاء عن علي نحوه"[1] اھ

[عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو امام مالک و شافعی رحمہ اللہ نے اس سے ابن شہاب کے واسطے سے روایت کیا ہے، وہ سعید بن المسیب اور سلیمان بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ بلاشبہہ طلیحہ، رشید الثقفی کے نکاح میں تھی۔ رشید نے اسے طلاق بتہ دے دی تو طلیحہ نے اپنی عدت کے دوران میں نکاح کر لیا، اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اور اس کے خاوند کو درے مارے اور ان کے درمیان جدائی کروا دی۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جو عورت اپنی عدت میں نکاح کر لے تو اگر اس کے اس خاوند نے اس سے دخول نہیں کیا تو ان کے درمیان جدائی کروا دی جائے گی، پھر وہ اپنے پہلے خاوند کی بقیہ عدت گزارے گی اور یہ (دوسرا خاوند) دوسرے پیغامِ نکاح دینے والوں کے ساتھ پیغامِ نکاح دے سکتا ہے اور اگر اس نے دخول کر لیا ہے تو بھی ان کے درمیان جدائی کروائی جائے گی۔ پھر وہ پہلے خاوند کی بقیہ عدت گزارے گی، پھر دوسرے خاوند کی عدت گزارے گی اور پھر یہ (دوسرا خاوند) کبھی اس سے نکاح نہیں کرے گا۔ ابن المسیب نے کہا: دوسرا خاوند اسے مہر دے گا، کیوں کہ اس نے عورت کی عصمت کو اپنے اوپر حلال کیا۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا: سفیان ثوری رحمہ اللہ نے اشعث سے روایت کیا ہے، انھوں نے شعبی سے، انھوں نے مسروق سے، انھوں نے

---

[1] التلخیص الحبیر (٣/ ٢٣٦)

عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انھوں نے اس موقف سے رجوع کر لیا۔ چناں چہ انھوں نے کہا کہ اسے مہر ملے گا اور پھر اگر وہ چاہیں تو دوبارہ (نکاح کے ذریعے) اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

رہا علی رضی اللہ عنہ کا قول تو اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے زاذان کے واسطے سے ان سے روایت کیا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے بارے میں یہ فیصلہ کیا، جس نے اپنی عدت میں نکاح کر لیا کہ ان دونوں میں جدائی کروائی جائے، اس عورت کو (دوسرے خاوند سے) مہر ملے گا، کیوں کہ اس نے اس کی عصمت کو اپنے لیے حلال کیا، پھر وہ پہلے خاوند کی باقی ماندہ عدت پوری کرے، پھر دوسرے خاوند کی عدت گزارے۔ امام دارقطنی اور بیہقی نے ابن جریج سے حدیث روایت کی ہے، انھوں نے عطا سے اور عطا نے علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی روایت بیان کی ہے]

صحیح بخاری (۳/۲۴۴ چھاپہ مصر) میں ہے:

"وقال إبراهيم فيمن تزوج في العدة فحاضت عنده ثلاث حيض: بانت من الأول، ولا يحتسب به لمن بعده، وقال الزهري: تحتسب، وهذا أحب إلى سفيان يعني قول الزهري" اهـ

[ابراہیم رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں فرمایا جس نے عدت ہی میں نکاح کر لیا پھر اسے تین حیض آئے کہ وہ پہلے سے جدا ہو گئی اور پھر وہ دوسرے نکاح کی عدت کا شمار اس میں نہیں ہوگا، لیکن زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں دوسرے نکاح کی عدت کا شمار ہوگا، یہی، یعنی زہری کا قول سفیان کو زیادہ پسند ہے]

قسطلانی شرح صحیح بخاری میں ہے:

"وروى المدنيون عن مالك: إن كانت حاضت حيضة أو حيضتين من الأول أنها تتم بقية عدتها منه، ثم تستأنف عدة أخرىٰ، وهو قول الشافعي وأحمد"[1] اهـ

[مدینہ والوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، اگر اسے پہلے خاوند کی عدت سے ایک یا دو حیض آ چکے تو وہ پہلے اول شوہر کی باقی ماندہ عدت پوری کرے، بعد میں دوسرے خاوند کی عدت گزارے۔ یہ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کا قول ہے]

ہدایہ اولین (ص: ۴۰۵ چھاپہ مصطفائی) میں ہے:

"وإذا وطيت المعتدة بشبهة فعليها عدة أخرى، وتداخلت العدتان، ويكون ما تراه المرأة من الحيض محتسبا منهما، وإذا انقضت العدة الأولىٰ، ولم تكمل الثانية، فعليها إتمام العدة الثانية، وهذا عندنا، وقال الشافعي: لا تتداخلان" اهـ

[1] إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري (۸/ ۱۸۲)

[جب عدت گزارنے والی عورت شبہ نکاح کے ساتھ وطی کرے تو اس کے ذمہ ایک اور عدت گزارنا واجب ہوگا اور وہ دو متداخل عدتیں گزارے گی۔ اسے جو حیض آئے گا، وہ دونوں عدتوں میں شمار ہوگا۔ جب پہلی عدت پوری ہوجائے اور دوسری عدت پوری نہ ہوئی ہو تو اس پر باقی ماندہ دوسری عدت پوری کرنا بھی واجب ہے۔ یہ ہمارا موقف ہے۔ جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ متداخل عدتیں نہیں گزارے گی]

واضح رہے کہ یہ جو اوپر لکھا گیا ہے کہ دوسری عدت کے ختم ہوجانے پر اگر ہندہ نکاح کرے تو وہ نکاح صحیح ہوگا، یہ اس تقدیر پر ہے کہ تجدیدِ نکاح کے بعد عبداللہ نے ہندہ سے پھر صحبت نہ کی ہو، ورنہ ہندہ پر قول احوط کے مطابق ایک اور عدت واجب ہے اور جب یہ تیسری عدت بھی پوری ہوجائے، تب اگر نکاح کرے تو وہ نکاح صحیح ہوگا۔ واللہ أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. كتبه: أبو العلى محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفي عنه. صح الجواب. أبو الفياض محمد عبد القادر۔ الجواب صحيح. عبد الغفار. الجواب صحيح، و المجيب نجيح. والله أعلم بالصواب. حرّره راجي رحمة الله أبو الهدىٰ محمد سلامت الله المباركفوري، عفا عنه الباري. الجواب صحيح، والله أعلم بالصواب. أبو محمد إبراهيم. (١٧/ محرم ١٣١٣ھ)

بیوہ عورتوں کے نکاح کا حکم:

سوال ① نکاح زنان بیوگان چہ حکم میدارد و لفظ ایامی کہ در کلام مجید وارد شدہ چہ معنی دارد؟

[بیوہ عورتوں کے نکاح کا کیا حکم ہے، نیز قرآن مجید میں وارد شدہ لفظ ﴿اَیَامٰی﴾ کا کیا معنی ہے؟]

② مطلقاً نکاح واجب است یا سنت یا مستحب؟ [مطلقاً نکاح واجب ہے یا سنت ہے یا مستحب ہے؟]

جواب ① افسوس ہے کہ اپنے آپ کو اہلِ اسلام کہلا کر جس کا ترجمہ "گردن نہادن بطاعت" [سرِ تسلیم خم کر دینا] ہے، پھر صریح حکم سے گریز کرنا اور نفرت ظاہر کرنا، اپنے دعوے کو آپ باطل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَیَامٰی مِنْكُمْ﴾ [النور] بے شوہر عورتوں کا نکاح کر دو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہر بے شوہر عورت کا، خواہ بیوہ ہو خواہ نا کد خدا [غیر شادی شدہ] نکاح کرنا چاہیے۔ حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «النكاح من سنتي»[1] [نکاح میری سنت ہے] «فمن رغب عن سنتي فليس مني»[2] [جس نے میری سنت سے بے رغبتی کی، اس کا مجھ سے تعلق نہیں]

---

① سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٤٦)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

اس لیے بھی ہر شخص کو بشرطِ استطاعت نکاح کرنا ضروری ثابت ہوتا ہے۔ آپ کی ازواجِ مطہرات میں جو تمام مسلمانوں کی ماں ہیں، بجز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کون ہیں، جن کا دو یا تین نکاح نہ ہو چکا تھا؟ عقدِ ثانی قولاً وفعلاً ثابت ہے، سلفاً اور خلفاً معمول بہ رہا ہے۔ اس سے انحراف سراسر غلطی ہے۔

(۲) نکاح بوقتِ تیزی خواہش کے واجب ہے اور بوقتِ تیقنِ زنا فرض اور حالتِ اعتدال میں سنتِ موکدہ اور بوقتِ خوفِ جور مکروہ۔

"ويكون واجبا عند التوقان فإن تيقن الزنا إلا به فرض (نهايه) وهذا إن ملك المهر والنفقة، ويكون سنة مؤكدة في الأصح فيأثم بتركه حال الاعتدال ومكروها لخوف الجور" [1] (من الدر المختار ملتقطا)

[غلبۂ شہوت کے وقت یہ (نکاح) واجب ہوگا، پھر اگر اسے زنا کے سرزد ہونے کا یقین ہو جائے تو فرض ہے اور یہ اس وقت ہے، جب وہ مہر (کی رقم) اور نان ونفقہ (چلانے) کا مالک ہو جائے، جب کہ صحیح موقف یہ ہے کہ وہ اس صورت میں سنتِ موکدہ ہے اور حالتِ اعتدال (وطی، مہر اور نان و نفقہ کی قدرت) میں اس کو ترک کرنے والا گناہ گار ہوگا۔ اگر اسے جور کا ڈر اور خوف ہو تو مکروہ ہے]

اب خیال کرنا چاہیے کہ اکثر لوگوں پر فرض یا واجب یا سنت موکدہ ہے، کمتر لوگ ہوں گے، جن کے لیے مکروہ ہوگا۔ فقط كتبه: محمد عين الحق. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله.

سوال بیوگان کا نکاح کرنا کیسا ہے اور لفظ "أيامى" کا جو قرآن مجید میں آیا ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ مطلقاً نکاح فرض ہے یا سنت یا مستحب؟ بينوا توجروا!

جواب الحمد لله رب العالمين، و الصلاة والسلام علىٰ رسوله محمد خاتم النبيين شفيع المذنبين، وعلىٰ آله وأصحابه وأهل بيته أجمعين أما بعد! اللہ تعالیٰ سورہ نور رکوع (۴) میں فرماتا ہے:

﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ (النور: ۳۲) [اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دو]

"أيامٰى" "أَيِّمٌ" کی جمع ہے۔ "أيم" کے اصلی معنی بے شوہر والی عورت کے ہیں، کنواری ہو خواہ شوہر مر گیا ہو یا طلاق دے دی ہو اور بے جورو والے مرد کو بھی ایم کہتے ہیں، لیکن یہ معنی مجازی ہیں اور مجازی معنی مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ ضروری ہے اور جہاں قرینہ نہ ہو وہاں مجازی معنی نہیں مراد لیے جاتے۔ آیتِ کریمہ میں ظاہراً کوئی قرینہ نہیں ہے، لہٰذا یہاں ظاہر ہے کہ اصلی معنی (بے شوہر والی عورتیں) مراد ہیں۔ تفسیر کبیر (ص: ۳۸۳ چھاپہ مصر) میں ہے:

"لفظ الأيامىٰ وإن تناول الرجل والنساء، فإذا أطلق لم يتناول إلا النساء، وإنما يتناول الرجال إذا قيد ... الخ" [2]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار (۳/ ۷)

[2] تفسير الرازي (۲۳/ ۳۷۶)

["ایامیٰ" کا لفظ اگرچہ مردوں اور عورتوں کو شامل ہے، لیکن جب یہ مطلق استعمال ہو تو صرف عورتوں کو شامل ہوتا ہے، مردوں کو تب شامل ہوتا ہے، جب یہ مقید استعمال ہو...الخ]

تفسیر فتح البیان (٦، چھاپہ مصر) میں ہے:

"قال أبو عمرو والكسائي: اتفق أهل اللغة علىٰ أن الأيم في الأصل هي المرأة التي لا زوج لها، بكرا كانت أو ثيبا. قال أبو عبيد: يقال: رجل أيم، وامرأة أيم، وأكثر ما يكون في النساء، وهو كالمستعار في الرجل"[1] الخ

[ابوعمرو اور کسائی نے کہا ہے: اہلِ لغت نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ "الأیم" کے اصل معنی بے شوہر والی عورت کے ہیں، خواہ وہ کنواری ہو یا ثیبہ۔ ابوعبید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: "رجل أيم" (بے جورو مرد) "امرأة أيم" (بے شوہر عورت) اس لفظ کا اکثر اطلاق عورتوں پر ہوتا ہے، مرد کے لیے استعمال میں مستعار لیا گیا ہے]

تو آیتِ کریمہ کے معنی یہ ہوئے: "جو تم میں بے شوہر والی عورتیں ہیں، ان کو بیاہ دو۔" اگر "اَیامی" کا لفظ مرد و عورت دونوں کو شامل مانا جائے تو معنی یہ ہوئے: "جو تم میں بے جورو والے مرد و بے شوہر والی عورتیں ہیں ان کو بیاہ دو۔"

تفسیر کبیر میں ہے:

قوله تعالیٰ: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ أمر، وظاهر الأمر الوجوب علىٰ ما بيناه مراراً، فيدل على أن الولي يجب عليه تزويج مولاته... الخ"[2]

یعنی ﴿اَنْكِحُوْا﴾ کا لفظ (جو آیت کریمہ میں ہے، جس کے معنی ہیں بیاہ دو) امر ہے اور امر کے ظاہر معنی وجوب ہیں۔ تو یہ لفظ اس بات پر دلیل ہے کہ ولی پر اپنی مَولیّہ کا (جس کا وہ ولی ہے) بیاہ دینا واجب ہے۔ تفسیر ابن کثیر (٧/ ٨٥ چھاپہ مصر) میں ہے: "هذا أمر بالتزويج، وقد ذهب طائفة من العلماء إلى وجوبه على كل من قدر عليه... الخ"[3] یعنی ﴿اَنْكِحُوْا﴾ امر ہے "إنكاح" کا اور علما کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ ہر ایک شخص پر جو "أيامى" کے بیاہ دینے پر قادر ہے، بیاہ دینا واجب ہے۔

واضح رہے کہ اللہ پاک نے اس آیت میں بے شوہر والی عورتوں کے والی وارثوں کو حکم دیا کہ تم ان کا نکاح کر دو اور یہ نہیں فرمایا کہ ان کی درخواست کا انتظار کرو، یعنی جب وہ تم سے نکاح کر دینے کی درخواست کریں، تب تم ان کا نکاح کر دو، بلکہ مطلق فرمایا کہ تم نکاح کر دو، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کنواری عورتوں کے نکاح کر دینے میں

---

[1] فتح البيان للنواب صديق حسن خان رحمه الله (٩/ ٢١٣)

[2] تفسير الرازي (٢٣/ ٣٧٧)

[3] تفسير ابن كثير (٦/ ٥١)

ان کی درخواست کا انتظار نہیں کرتے، بلکہ شرع شریف کے مطابق ان سے اجازت لے کر ان کا نکاح کر دیتے ہیں، اسی طرح بیوہ کے والی وارث کو چاہیے کہ ان کے نکاح کر دینے میں ان کی درخواست کا انتظار نہ کریں، بلکہ شرع شریف کے مطابق ان سے اجازت لے کر ان کا نکاح کر دیں۔ مشکوۃ شریف "باب تعجیل الصلاۃ" میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«یا علي! ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا أتت، و الجنازة إذا حضرت، والأیم إذا وجدت لها كفوا» [1] (رواہ الترمذي)

یعنی اے علی تو تین کام میں دیر نہ کریو: ایک نماز میں جب اس کا وقت آجائے، دوسرے جنازے میں جب موجود ہو جائے، تیسرے بے شوہر والی عورت کے نکاح کر دینے میں جب اس کا جوڑا مل جائے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بے شوہر والی عورت کا جب جوڑا مل جائے تو اس کے نکاح کر دینے میں دیر کرنا ایسا ہی برا جانیں، جیسے نماز میں دیر کرنا یا جنازہ کا پڑا رکھنا برا جانتے ہیں۔ اب یہ بات دیکھنا چاہیے کہ نکاحِ بیوگان میں ہمارے پیشوا حضرت رسول اللہ ﷺ کا اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کیا معمول رہا؟ پہلے آپ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا حال سنیے۔

ازواجِ مطہرات کا حال:

آپ کی بیبیاں (باستثنائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے) سب کی سب بیوہ تھیں، آپ سے پہلے ان میں سے کسی کا ایک نکاح ہو چکا تھا، دوسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔ کسی کے دو نکاح ہو چکے تھے، تیسرا آپ ﷺ سے ہوا۔

اس کی تفصیل:

آپ کی بیوہ بیبیوں میں سے پہلی بی بی حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں، جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ماں، بلکہ (آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کے سوا) آپ ﷺ کی جملہ اولاد ذکور و اناث کی ماں ہیں۔ ان کا نکاح پہلے ابو ہالہ سے ہوا تھا۔ ابو ہالہ کے بعد عتیق بن عائذ سے ہوا یا پہلے عتیق بن عائذ سے ہوا تھا، پھر ابو ہالہ سے ہوا، بہر کیف پہلے ان کے دو نکاح ہو چکے تھے، تیسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔

(أسد الغابة للإمام ابن الأثير الجزري چھاپه مصر: ٥/ ٤٣٤، وإكمال في أسماء الرجال للشيخ ولي الدين الخطيب صاحب المشكوة، چھاپه مجتبائی، دهلی (ص: ٩) و أسماء الرجال للشيخ عبدالحق المحدث الدهلوي رحمه الله، ورقه: ٣٩)

آپ ﷺ کی دوسری بی بی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح پہلے سکران بن عمرو سے ہوا تھا۔ دوسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٨٤، وإكمال، ص: ١٥، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٣٩)

آپ ﷺ کی تیسری بی بی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں، ان کا نکاح پہلے خنیس بن حذافہ سہمی سے ہوا تھا، ان کے بعد دوسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔

(أسد الغابة: ٥/ ٤٢٥، وإكمال، ص: ٨، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٤٠)

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧١، ١٠٧٥)

آپ ﷺ کی چوتھی بی بی حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح پہلے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے بعد دوسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا تھا اور ایک قول یہ ہے کہ پہلے ان کا نکاح طفیل بن حارث سے ہوا تھا، پھر عبیدہ بن حارث سے ہوا تھا، پھر آپ ﷺ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٦٦)

آپ ﷺ کی پانچویں بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح پہلے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے بعد دوسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٥٨٨، وإكمال، ص: ١٥، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٤١)

آپ ﷺ کی چھٹی بی بی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح پہلے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے طلاق دینے کے بعد اللہ پاک نے دوسرا نکاح آسمان پر آپ ﷺ سے کر دیا، جس کا ذکر سورت احزاب رکوع (۵) میں ہے۔
(أسد الغابة: ٥/ ٤٦٣، وإكمال، ص: ١٢، وأسماء الرجال للشيخ، ورقه: ٤١)

آپ ﷺ کی ساتویں بی بی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپ کا نکاح پہلے عبیداللہ بن جحش سے ہوا تھا، اس کے بعد دوسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٥٧٣، وأسماء الرجال للشيخ، ورقه: ٤١)

آپ ﷺ کی آٹھویں بی بی حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح پہلے مسافع بن صفوان سے ہوا، پھر دوسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٤٢)

آپ ﷺ کی نویں بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حیی ہیں، ان کا نکاح پہلے سلام بن مشکم سے ہوا تھا، اس کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا، اس کے بعد تیسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٩٠)

دسویں بی بی آپ ﷺ کی حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح پہلے مسعود بن عمرو سے ہوا تھا، پھر ابورہم بن عبدالعزی سے ہوا، پھر تیسرا نکاح آپ ﷺ سے ہوا۔ (إكمال، ص: ٣٦، أسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٤٢)

اب رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادیوں اور نواسیوں کا حال سنیے!

رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادیوں اور نواسیوں کا حال:

آپ ﷺ کی ایک صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح پہلے عتبہ بن ابی لہب سے ہوا تھا، اس کے بعد دوسرا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٥٦، ٦١٢، وأسماء الرجال للشيخ عبد الحق، ورقه: ٢٦)

دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں، ان کا نکاح پہلے عتیبہ بن ابی لہب سے ہوا تھا، اس کے بعد دوسرا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٥٦، ٦١٢، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٢٦)

آپ کی ایک نواسی حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وحضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں۔ ان کا نکاح پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے بعد عون بن جعفر سے ہوا۔
(أسد الغابة: ٥/ ٦١٤ و ٦١٥)

دوسری نواسی حضرت امامہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ یہ ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ اور آپ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی

بیٹی ہیں، ان کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعد انھیں کی وصیت کے بموجب پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے بعد ان کی وصیت کے بموجب دوسرا نکاح مغیرہ بن نوفل سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٠٠ و ٥٢٠)

دیگر صحابیات:

اب ان عورتوں کا حال سنیے، جو رسول اللہ ﷺ کی صحابیات رضی اللہ عنہن اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی بیبیاں یا مائیں یا بیٹیاں یا بہنیں وغیرہ وغیرہ ہیں۔

① اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا۔ ان کا نکاح پہلے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ ان کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے، پھر تیسرا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٣٩٥، وإكمال، ص: ٣، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٥٨)

② حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا، جو رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی کی بیٹی ہیں، ان کا نکاح پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے بعد دوسرا نکاح طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔

(أسد الغابة: ٥/ ٤٢٨، وإكمال، ص: ٨، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٩٧)

③ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا، جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ماں ہیں، ان کا نکاح پہلے مالک بن نضر سے ہوا تھا، اس کے بعد دوسرا نکاح حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٥٩١، وإكمال، ص: ١٥)

④ صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا، جو حضرت رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی ماں ہیں، ان کا نکاح پہلے حارث بن حرب سے ہوا تھا، اس کے بعد دوسرا نکاح عوام سے ہوا۔

(أسد الغابة: ٥/ ٤٩٥، وإكمال، ص: ١٧، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ١٥٧)

⑤ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا۔ ان کا نکاح پہلے ابوحفص بن مغیرہ یا ابوعمرو بن حفص سے ہوا تھا۔ ان کے طلاق دینے کے بعد دوسرا نکاح اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٥٢٦، وإكمال، ص: ٢٩، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٢٤١)

⑥ ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا۔ ان کا نکاح پہلے فاکہ بن مغیرہ سے ہوا تھا، اس کے طلاق دینے کے بعد دوسرا نکاح ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (تاريخ الخلفاء، مطبع مجتبائى دهلى، ص: ١٢٤ و ١٣٥)

⑦ اُم کلثوم بنت العباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی چچیری بہن ہیں، ان کا نکاح پہلے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے طلاق دینے کے بعد ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ ان کے بعد تیسرا نکاح عمران بن طلحہ سے ہوا۔

(أسد الغابة: ٥/ ٦١٢)

⑧ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا۔ ان کا نکاح پہلے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے بعد زبیر رضی اللہ عنہ سے ہوا، ان کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ ان کے بعد چوتھا نکاح عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ہوا۔

(أسد الغابة: ٥/ ٦١٤، وإكمال، ص: ٣١)

⑨ خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کا نکاح پہلے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے بعد دوسرا نکاح نعمان بن عجلان سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٦١٨)

⑩ امیمہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا ان کا نکاح پہلے عبدالرحمن بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، ان کے طلاق دینے کے بعد دوسرا نکاح رفاعہ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٠٢)

⑪ امیمہ بنت بشر رضی اللہ عنہا، ان کا نکاح پہلے حسان بن دحداحہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، پھر دوسرا نکاح سہل بن حنیف سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٠٢)

⑫ اُم ایمن رضی اللہ عنہا، ان کا نکاح پہلے عبید سے ہوا تھا، پھر دوسرا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٠٨ و ٥٦٧، وأسماء الرجال للشيخ عبدالحق، ورقه: ٦٠)

⑬ جمیلہ بنت ابی رضی اللہ عنہا، ان کا نکاح پہلے حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ سے ہوا تھا، ان کے بعد ثابت بن قیس بن شماس سے ہوا، پھر مالک بن دخشم سے ہوا، پھر چوتھا نکاح حبیب بن یساف سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤١٧ و ٤١٨)

⑭ جمیلہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا، ان کا نکاح پہلے حضرت عمرو سے ہوا تھا، ان کے طلاق دینے کے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٢٦)

⑮ حمیمہ بنت صیفی رضی اللہ عنہا، ان کا نکاح پہلے براء بن معرور سے ہوا تھا، پھر دوسرا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٤٢٦)

⑯ زینب بنت حنظلہ رضی اللہ عنہا، ان کا نکاح پہلے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے ہوا تھا، ان کے طلاق دینے کے بعد نعیم بن عبداللہ سے ہوا۔ (أسد الغابة: ٥/ ٥٦٦)

اب اتنے پر بس کیا جاتا ہے۔ اگر اس کی پوری تفصیل لکھی جائے تو ایک بہت بڑی ضخیم کتاب ہوجائے۔ سمجھ دار آدمی کے لیے اتنا بہت ہے اور بے سمجھ کا کوئی علاج نہیں۔ جس کو تھوڑی سی بھی خداداد عقل ہے، وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جس طرح آدمی کو اللہ پاک نے کھانے پینے سونے جاگنے پیشاب پاخانہ وغیرہ وغیرہ کی ضرورت لگا دی ہے، اسی طرح مرد کو عورت کی اور عورت کو مرد کی ضرورت لگا دی ہے۔ اس لیے دنیا کا دستور ہے کہ جب لڑکے لڑکیاں جوان ہونے لگتے ہیں تو ان کے ولیوں کو نکاح کی فکر کیسی مقدم ہوجاتی ہے۔ پھر جو عورت کہ خاوند کا منہ دیکھ چکی اور اس کے مزے سے واقف ہوچکی، اس کی خواہش کا حال کیا پوچھنا ہے؟ اگر ایسی عورت بیوہ ہوجائے اور اس کا دوسرا نکاح نہ کر دیا جائے تو شیطان سے کیونکر امن میں رہ سکتی ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں کہ بڑے بڑے گھروں میں اس حکمِ خداوندی کی تعمیل میں سستی کرنے سے صدہا، بلکہ ہزارہا ایسے ایسے بے غیرتی کے واقعات ہوچکے اور ہوتے رہتے ہیں کہ الامان۔ لیکن بے سمجھ لوگوں کو پھر بھی تنبہ نہیں ہوتا اور کچھ بھی اس بے غیرتی کا خیال نہیں کرتے اور کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ عورت مر جائے اور مرد دوسرا نکاح فوراً ہی کر لے تو یہ کچھ عیب کی بات نہیں اور مرد مر جائے اور عورت اپنا نکاح عدت گزرنے کے بعد کر لے تو بڑا عیب ہے اور کنواری لڑکی کے نکاح میں دیر کریں تو عیب ہے اور جوان عورت بیوہ رہ جائے تو کچھ عیب نہیں، حالانکہ جو قباحت کنواریوں کے نکاح کے توقف میں ہے، وہی قباحت، بلکہ اس سے زیادہ بیواؤں کے نکاح کے توقف میں ہے۔ مینہ سے بھاگنا اور پرنالے کے نیچے جا کھڑا ہونا اور کیا ہے؟

افسوس شیطان نے بڑا دھوکا دیا۔ اللہ تعالیٰ سچ فرماتا ہے:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوری: ۲۱]

[یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں، جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے، جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی؟]

خدا تعالیٰ ہم لوگوں کو سمجھ اور توفیق دے۔ الحمد لله رب العالمین، و صلی الله تعالیٰ علی خیر خلقه محمد و آله و أصحابه أجمعین۔ کتبه: محمد عبد الله الغازیفوري

شادی شدہ عورت سے نکاح کا حکم:

سوال ایک عورت مسلمہ کا نکاح اس کے ماں باپ نے لڑکپن میں کر دیا تھا۔ وہ لڑکپن ہی میں وہاں سے بھاگ آئی۔ جب بالغہ ہوئی تو ایک دوسرے مرد مسلمان سے اس نے نکاح کیا اور ایک رات کے بعد اس نے اس کو طلاق دیا۔ تب ایک تیسرے سے نکاح کیا، اس کے یہاں ایک زمانہ تک رہ کر چلی گئی۔ اب ایک چوتھے نے نکاح کیا ہے اور وہاں وہ عورت ابھی تک موجود ہے اور وہ دو شوہر اس کے جنھوں نے طلاق نہیں دیا ہے، یعنی (پہلے اور تیسرے) مرد فاسق ہیں اور اب جس کے پاس ہے، وہ پڑھے لکھے پابند صوم و صلاۃ ہیں اور یہ عورت بھی جیسا کہ اس کی سوانح سے ظاہر ہے، پہلے فاسقہ تھی، مگر اب نہیں ہے تو یہ نکاح جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا تؤجروا.

جواب صورت مسئولہ میں باستثنائے اول نکاح کے اور سب نکاح ناجائز اور حرام ہوئے، اس لیے کہ یہ عورت جس کا ذکر سوال میں ہے، اول نکاح سے شوہر دار ہو چکی تو اس کے جو اور نکاح ہوتے گئے، سب شوہر دار عورت سے ہوتے گئے اور شوہر دار عورت سے نکاح ناجائز اور حرام ہے۔

لقوله تعالیٰ: ﴿وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع ٤]

یعنی شوہر دار عورتیں تم پر حرام کی گئیں۔ والله أعلم بالصواب. کتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

سوال اگر کوئی حالتِ نشہ میں یا بباعث جنون و دیوانگی کے کسی عورت کو جو اپنے سسرال جاتی ہو، کہاروں کو ملا کر اور کچھ روپیہ دے کر اپنے گھر پہنچوائے اور بعد لانے کے اس کو خوفِ خدا آئے اور توبہ کرے اور کسی وقت اس عورت سے ہم صحبت نہیں ہوا تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے، اس کو نکاح میں در لائے یا اس کے مکان یا سسرال پہنچوا دے؟ لیکن اس عورت کو لائے ہوئے عرصہ پندرہ بیس دن کا ہوا، مکان وغیرہ پہنچوانے سے اس کے ماں باپ یا شوہر رکھنے پر راضی نہیں ہوگا اور نہ رکھے گا تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے اور اس کا شوہر طلاق بھی نہیں دیتا ہے؟

جواب وہ شخص اس عورت کو نکاح میں نہیں لا سکتا، کیونکہ وہ عورت شوہر دار ہے اور شوہر دار عورت سے نکاح درست نہیں ہے۔ ﴿وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع ٤] یعنی شوہر دار عورتیں تم پر حرام کی گئیں۔

اس عورت کو جہاں کی تہاں پہنچوا دے، اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ۔ مہر مدرسہ۔ (۲۸/ستمبر ۱۸۹۵ء)

سوال ایک عورت کی نسبت مقرر تھی۔ نکاح کے وقت باراتی اور ناکح عورت کے مکان پر آئے۔ عورت نمازی تھی، جب کہ باراتی اور ناکح سب لوگ جاہل اور بے نمازی و مشرک تھے، اس وقت ناکح کو قاضی نے ہر بات سے توبہ کرا کے اس عورت سے نکاح پڑھا دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد وہ عورت اپنی سسرال گئی۔ وہاں وہ نماز پڑھنے لگی، اس وجہ سے وہاں کے لوگ بوجہ رد و بدل عقیدہ کے اس کو ناپسند کرتے تھے اور عورت بھی اپنی شوہر کو مذہبی پھوٹ کی وجہ سے ناپسند کرتی تھی، اس وجہ سے بے پوچھے اپنے میکہ چلی آئی۔ کئی دنوں کے بعد اس کا شوہر اس کی چاہت کی وجہ سے اپنے سسرال گیا تو لوگوں نے میاں بیوی میں ملاپ کرانا چاہا، مگر لوگوں نے اس عورت کو یہ بھرا دیا کہ تیرا نکاح ٹھیک نہیں ہوا، اس وجہ سے اس عورت نے دوسرے مرد کے ساتھ چمپت ہونے کی ٹھان لی ہے تو بے پہلے شوہر کے طلاق دیے دوسرے سے نکاح جائز ہے یا نہیں اور پہلے شوہر کے ساتھ نکاح درست ہوا یا نہیں؟

جواب بغیر طلاق دیے ہوئے دوسرے مرد سے نکاح اس عورت کا درست نہیں ہوگا اور اس عورت کا نکاح پہلے مرد سے درست ہوا تھا۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

ولد الزنا سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال ایک لڑکا حرام زادہ ہے، یعنی زنا سے اس کی پیدایش ہے۔ اس لڑکے سے ایک لڑکی حلال زادی ہے، یعنی حلال پیدایش سے ہے۔ آیا ان دونوں لڑکی لڑکے سے نکاح از روئے قرآن مجید صحیح و درست ہوگا یا نہیں؟

المستفتي: عبد الرحیم، موضع چھوٹی مشنگری۔ ڈاکخانہ پورندر پور۔ ضلع بیزبھوم

جواب اس نکاح کے درست نہ ہونے کی وجہ کوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص اس کو نادرست بتائے تو اس کا بار ثبوت اس کے ذمہ ہے۔ اگر وہ شخص اس کا کوئی ثبوت دے دے تو سائل اس ثبوت کو یہاں بھیج کر اس کا حال دریافت کرے۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (۲/ شوال ۱۳۲۶ھ)

سوال ایک عورت اپنے آپ کو صحیح النسب جان کر کہتی ہے کہ میں خاوند کے پاس نہیں جاتی۔ میرا خاوند ولد الزنا ہے۔ اگر میں خاوند کے پاس جاؤں گی تو میری اولاد بھی حرامی ہوگی اور میرا نکاح اس کے ساتھ درست نہیں اور عورت اور اس کے والدین اور غیر لوگ بھی کہتے ہیں کہ عورت صحیح النسب کا نکاح مرد ولد الزنا سے شرع شریف میں درست نہیں ہے اور ولد الزنا دوزخی ہے۔ سو یہ کہنا عورت اور اس کے والدین اور غیر لوگوں کا صحیح ہے یا نہیں؟ موافق قرآن و حدیث و اقوالِ صحابہ بسند صحیح بتفصیل جواب تحریر فرمائیں۔

جواب عورت یا اس کے والدین یا اور لوگوں کا یہ کہنا کہ عورت صحیح النسب کا نکاح مرد ولد الزنا سے شرع شریف میں

درست نہیں ہے، بالکل غلط ہے۔ شرع شریف میں کہیں اس کا پتا نہیں ہے۔ عورت مسلمہ کے نکاح کے لیے صرف اس قدر شرط ہے کہ مرد بھی مسلمان ہی ہو، غیر ملت کا شخص نہ ہو اور یہ کہ ولد الزنا بھی نہ ہو، کہیں سے یہ ثابت نہیں ہے، محض بے اصل ہے۔ اسی طرح عورت یا اس کے والدین یا اور لوگوں کا یہ کہنا کہ ولد الزنا دوزخی ہے، بھی غلط ہے۔ اصول شرع شریف سے یہ ہے کہ ایک شخص کے گناہ سے دوسرا شخص نہیں پکڑا جاتا، جو گناہ کرتا ہے، وہی پکڑا جاتا ہے۔ اس مضمون کی آیاتِ کریمات قرآنِ مجید میں بہت ہیں، جیسے: ﴿وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ [الأنعام: ١٦٤] [اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی] واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

دو بہنوں کو نکاح میں اکٹھا کرنا حرام ہے:

سوال زید نے بکر کی لڑکی سے نکاح کیا اور وہ لڑکی محل اول سے تھی۔ ایک لڑکی بکر کے محل ثانی سے ہے تو زید وہ لڑکی سے بکر کی، جو محل ثانی سے ہے، نکاح کرنا چاہتا ہے تو نکاح ثانی زید کا اس لڑکی سے زوجہ اول کے موجود رہتے ہوئے درست ہوگا یا نہیں؟

جواب ایسی حالت میں کہ زید کی زوجہ اولیٰ جو بکر کی لڑکی محل اول سے تھی اور ہنوز وہ زید کے نکاح میں ہے، زید کا نکاح بکر کی اس لڑکی سے، جو محل ثانی سے ہے، درست نہیں ہے، کیونکہ بکر کی یہ دونوں لڑکیاں آپس میں علاتی بہنیں ہیں اور دو بہنوں کا (عینی ہوں، خواہ علاتی، خواہ اخیافی) نکاح میں اکٹھا کرنا درست نہیں ہے۔ ﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ٤] یعنی دو بہنوں کا اکٹھا کرنا تم پر حرام کیا گیا۔

دو بہنوں کو نکاح میں اکٹھا کرنا اور ان کی اولاد کا حکم:

سوال ایک شخص نے اپنی بی بی کی حقیقی بہن سے نکاح کیا ہے، اب وہ شخص مرتکب حرام کاری کا ہے یا نہیں اور ہر دو مرد وعورت شرع شریف میں زانی قرار دیے جائیں گے یا نہیں اور جو لڑکا ان سے پیدا ہوا ہے، وہ حرامزادہ ہے یا نہیں اور آیت: ﴿حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ﴾ جس میں بیان ۱۴ عورتوں کا ہے، ان پر صادق آتی ہے یا نہیں اور جس کے نطفہ سے پیدا ہوا، اس سے محرومِ میراث ہے یا نہیں؟

جواب جب تک بی بی نکاح میں موجود رہی، تب تک اس کی بہن سے نکاح کرنا بحکم آیتِ کریمہ: ﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ﴾ حرام ہے اور جو شخص ایسا کرے، وہ مرتکب حرام کا ہے۔ اگر وہ دونوں باوجود علم حرمت کے ایسا کریں تو شرع شریف میں زانی اور زانیہ قرار دیے جائیں گے۔ اس کے بعد جو اُن سے لڑکا پیدا ہوگا، حرامزادہ ہوگا اور مرد زانی سے جس کے نطفہ سے وہ پیدا ہوا، محروم المیراث ہوگا، لیکن زانیہ سے محروم المیراث نہ ہوگا۔ زانیہ شرعاً اس کی ماں ہوگی اور وہ اس کا بیٹا۔ دونوں میں توارث جاری ہوگا۔ واللّٰہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللّٰہ

بہنوئی کی پہلی بیوی کی بیٹی سے نکاح کرنا:

سوال زید نے بکر کی ہمشیرہ سے نکاح کیا، ایک لڑکی زید کو زوجہ اولیٰ سے ہے، اس سے اگر بکر نکاح کرنا چاہے تو درست ہوگا؟

جواب بکر کا نکاح زید کی اس لڑکی سے جو ہمشیرۂ بکر کے بطن سے نہیں ہے، بلکہ زید کی اور بی بی سے ہے، درست ہے، اس لیے کہ محرمات یعنی جن عورتوں سے کہ نکاح ناجائز ہے، ان کی تفصیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۃ نسا رکوع (۳ و ۴) میں فرما کر فرما دیا ہے: ﴿أُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَآءَ ذَٰلِكُمْ﴾ [النساء: ٢٤] یعنی ان مذکورہ بالا عورتوں کے سوا اور سب عورتیں تمھارے لیے حلال کی گئیں۔ زید کی مذکورہ بالا لڑکی بکر کے حق میں ان محرمات عورتوں میں سے نہیں ہے، لہٰذا بکر کا نکاح اس سے درست ہے۔

والد کے چچا کی بیٹی سے نکاح کرنا:

سوال زید اپنے بیٹے عمرو کا نکاح اپنے سگے چچا کی لڑکی سے کرانا چاہتا ہے، کیا جائز ہوگا؟

جواب زید جو اپنے بیٹے کا نکاح اپنے سگے چچا کی بیٹی سے کرانا چاہتا ہے، یہ نکاح بلاشبہہ جائز ہے، اس کے ناجائز ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ لڑکی مذکورہ زید کے لڑکے کے حق میں ﴿مَا وَرَآءَ ذَٰلِكُمْ﴾[1] میں داخل ہے، جو قطعاً حلال ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

بھانجی سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال زید اپنے سوتیلے بھانجے کی پوتی سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ آیا یہ نکاح شرعاً جائز ہے یا کہ حرام؟ مراد سوتیلے بھانجے سے یہ ہے کہ بھانجہ مذکور زید کی علاتی بہن کا بیٹا ہے۔ (مقصود علی از نگینہ)

جواب نکاح مذکور، یعنی نکاح زید کا اپنے سوتیلے بھانجے کی پوتی سے قطعاً ناجائز اور حرام ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فہرستِ محرمات میں بنات الاخت کو بھی داخل فرمایا ہے اور اخت میں کوئی قید نہیں لگائی ہے، پس لفظ اخت تینوں قسم کی اخت (عینی، علاتی، اخیافی) کو شامل ہے اور بنات میں بھی کوئی قید نہیں لگائی ہے، پس لفظ بنات بھی بنات صلبی و غیر صلبی دونوں کو شامل ہے، پس معنی بنات الاخت کے یہ ہوئے کہ اخت (عینی ہو یا علاتی یا اخیافی) کی بنات (صلبی ہوں خواہ غیر صلبی) بھی تم پر حرام کی گئی ہیں اور زید کے سوتیلے بھانجے کی پوتی زید کی اخت علاتی کی بنات غیر صلبی میں قطعاً داخل ہے، پس وہ بھی قطعاً زید پر حرام ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۳/ صفر ۱۳۳۰ھ) فی دھلی

حقیقی بھانجی کی بیٹی سے نکاح کا حکم:

سوال بھانجی کی حرمت تو صاف ہے، یعنی بھانجی سے نکاح نہیں کر سکتا۔ آیا حقیقی بھانجی کی بیٹی سے نکاح درست ہے یا نہیں؟

---

[1] یعنی اس قرآنی آیت: ﴿وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَآءَ ذَٰلِكُمْ﴾ [النساء: ٢٤] کے تحت حلال ہے۔

جواب حقیقی بھانجی کی بیٹی بھی حقیقی بھانجی کے حکم میں داخل ہے، یعنی حقیقی بھانجی کی بیٹی سے بھی نکاح نہیں ہوسکتا۔

والله تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله

بھانجے کی بیٹی سے نکاح کا حکم:

سوال زید اپنے بھانجے کی لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ تفسیر جلالین میں "بنات الأخ وبنات الأخت ويدخل فيهن بنات أولادهم"[1] [بھتیجیاں اور بھانجیاں اور ان میں ان کی اولاد کی بیٹیاں بھی شامل ہیں] ہے، اس سے صرف بھانجی و بھتیجی کی لڑکیاں مراد ہیں یا اس میں بھتیجی بھانجی و بھتیجا و بھانجا کی لڑکیاں بھی مراد ہیں؟

منشی عبدالرحمٰن از مقام ماگوار۔ ڈاکخانہ دوریہ۔ دینا جپور (بنگالہ)

جواب زید اپنے بھانجے کی لڑکی سے نکاح نہیں کرسکتا، اس لیے کہ بانجھے کی لڑکی "بنات الأخت" میں داخل ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح "بناتکم" میں اپنی پوتیاں، پروتیاں، نواسیاں جہاں تک نیچے ہوں، داخل ہیں، اُسی طرح "بنات الأخ وبنات الأخت" میں بھائی اور بہن کی پوتیاں، پروتیاں اور نواسیاں، پرنواسیاں جہاں تک نیچے ہوں، سب داخل ہیں اور تفسیرِ جلالین کی عبارت سے صرف بھانجی و بھتیجی کی لڑکیاں مراد نہیں ہیں، بلکہ بھانجا و بھتیجا کی لڑکیاں بھی مراد ہیں۔ "الفتوحات الآلهيه معروف بحاشية سليمان الجمل على الجلالين" میں ہے:

"(قوله ويدخل فيهن) أي في بنات الأخ والأخت، وقوله: أولادهم أي أولاد الأخ والأخت... ولعله جمع الضمير باعتبار إطلاق الجمع على ما فوق الواحد، والأولاد يشمل الذكور والأناث، فشملت العبارة بنت ابن الأخ وإن سفل، وبنت ابن الأخت وإن سفل"[2] اھ

[اس کا یہ قول: "ويدخل فيهن" (اور ان میں داخل ہیں) یعنی بھتیجوں اور بھانجیوں میں داخل ہیں۔ اس کا قول: "أولادهم" (ان کی اولاد) یعنی بھائی اور بہن کی اولاد...شاید مصنف جمع کی ضمیر اس لیے لائے ہیں کہ جمع کا اطلاق ایک سے اوپر پر ہوتا ہے اور اولاد کا لفظ مذکروں اور مونثوں سب کو شامل ہے، پس یہ عبارت بھتیجے کی بیٹی کو نیچے تک اور بھانجے کی بیٹی کو نیچے تک شامل ہے]

''موضح القرآن'' میں ہے:

''بھتیجی میں بھائی کی بیٹی پوتی نواسی سب داخل ہیں۔ اسی طرح بھانجی میں بہن کی بیٹی، پوتی، نواسی۔''[3]

والله تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (٢٣/ ذي قعده ١٣٣٤ھ)

---

[1] تفسير الجلالين (ص: ٩٠) دار السلام .رياض.

[2] حاشية سليمان الجمل على تفسير الجلالين (ص: ٤٤٤) مطبع مرتضوي.

[3] موضح قرآن ترجمہ قرآن از شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ (حاشیہ سورۃ النساء، آیت: ٢٣)

سوال زید اپنے بھانجے کی لڑکی کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟

مرسل: فدوی محمد عبدالرحمٰن عفی عنہ۔ ساکن مالگوارہ۔ ڈاکخانہ بھدوریہ

جواب زید اپنے بھانجے کی لڑکی کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا۔ اپنے بھانجے کی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے، اس لیے کہ بھانجے کی لڑکی بنات الاخت میں داخل ہے اور بنات الاخت کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع:٤] والله تعالىٰ أعلم

[حرام کی گئیں تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں] کتبہ: محمد عبد الله (١٦/ ربيع الثاني ١٣٣٥هـ)

بیوہ بھاوج سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال زید کے بڑے بھائی نے اپنی زوجہ کو چھوڑ کر انتقال کیا تو زید کو اس بھاوج سے نکاح کر لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب بعد عدت گزر جانے کے بھاوج سے نکاح کر لینا جائز ہے، بڑے بھائی کی زوجہ ہو یا چھوٹے بھائی کی، اس لیے کہ جن عورتوں سے اللہ نے نکاح حرام کیا ہے، چوتھے پارے کے آخر اور پانچویں کے اول میں بیان فرمایا ہے، اس کے بعد فرمایا ہے: ﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ [النساء: ٢٤] یعنی ان عورتوں کے سوا، جن کا ذکر اوپر ہوا، تمھارے لیے تمام عورتیں حلال کر دی گئی ہیں اور بھاوج ان عورتوں میں سے نہیں ہے، جن کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی۔ عدت اس عورت کی جس کا شوہر مر جائے، اگر حمل سے نہ ہو تو چار مہینہ دس دن ہے، یعنی جب چار مہینہ دس دن شوہر کے مر جانے سے گزر جائے تو اس سے دوسرے شخص کو نکاح کر لینا جائز ہے اور اگر حمل سے ہو تو جب وضع حمل کر چکے، تب اس سے نکاح جائز ہے۔ سورت بقرہ (رکوع: ٢٩) میں ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ [البقرة: ٢٣٤]

[اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ (بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے اور دس راتیں انتظار میں رکھیں]

سورت طلاق میں ہے: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [الطلاق: ٤]

[اور ان کی بھی جنھیں حیض نہیں آیا اور جو حمل والی ہیں، ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں]

والله أعلم بالصواب كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. أبو محمد إبراهيم.

خالہ سے نکاح کا حکم:

سوال کیا فرماتے ہیں علما اس مسئلہ میں کہ ایک لڑکی ہوئی ہے لڑکا کے بیٹا ہے اور پھر

زید کے محل ثانی سے لڑکی پیدا ہوئی تو فرمایئے کہ زید کے ناتنی اور زید کے محل ثانی سے جو بیٹی ہے، دونوں میں نکاح جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

جواب زید کے ناتنی اور زید کے محل ثانی سے جو لڑکی ہے، دونوں میں نکاح جائز نہیں ہے، اس لیے کہ زید کے محل ثانی سے جو بیٹی ہے، وہ زید کے ناتنی کی خالہ علاتیہ ہے اور خالہ سے نکاح جائز نہیں ہے۔ خواہ خالہ عینیہ ہو یا علاتیہ یا اخیافیہ۔ ہدایہ (۱/ ۲۸۷ چھاپہ مصطفائی) میں ہے:

"قال: لا يحل للرجل أن يتزوج بأمه... إلى أن قال: ولا بخالته، لأن حرمتهن منصوص عليها في هذه الآية، وتدخل فيها العمات المتفرقات والخالات المتفرقات، وبنات الإخوة المتفرقين، لأن جهة الاسم عامة" انتهى، والله أعلم بالصواب

[انھوں نے کہا: آدمی کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی ماں سے نکاح کرے... نہ اپنی خالہ کے ساتھ، کیوں کہ ان کی حرمت اس آیت: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ ...الخ﴾ میں منصوص علیہا ہے اور ان میں متفرق پھوپھیاں، متفرق خالائیں اور متفرق بھتیجیاں بھی داخل ہیں، کیوں کہ (ان کے) اسم کی جہت عام ہے]

كتبه: محمد عبد الله (مهر مدرسه) تاريخ ٢/ جمادى الاولىٰ ١٣١٠ھ. المجيب مصيب. أبو محمد إبراهيم. الجواب صحيح. كتبه: أبو العلىٰ محمد عبدالرحمن المباركفوري. الجواب صحيح على اصغر. الجواب صحيح. محمد حسن بصري.

ہم زلف کی لڑکی سے نکاح کا حکم:

سوال اگر کسی شخص نے اپنے حقیقی ساڑھو [ہم زلف] کی لڑکی سے نکاح کیا تو جائز ہے یا نہیں اور کون کون عورت حرام ہیں؟

جواب جس شخص نے اپنے حقیقی ساڑھو کی لڑکی سے نکاح کیا، اگر وہ لڑکی اس شخص کی زوجہ کی بہن کے بطن سے ہو اور اس کی زوجہ، جو اس لڑکی کی خالہ ہے، بوقت اس نکاح کے اس شخص کے تحت نکاح یا عدت میں رہی ہو تو نکاح مذکور ناجائز ہے اور اگر وہ لڑکی اس شخص کی زوجہ کی بہن کے بطن سے نہ ہو، بلکہ اس کے ساڑھو کی کوئی دوسری زوجہ ہو اور وہ لڑکی اسی دوسری زوجہ کے بطن سے ہو یا وہ لڑکی اسی شخص کی زوجہ کی بہن ہی کے بطن سے ہو، لیکن اس شخص کی زوجہ جو اس لڑکی کی خالہ ہے، بوقت اس نکاح کے اس شخص کے نکاح یا عدت میں نہ رہی ہو، یعنی اس نکاح کے پہلے ہی مر چکی ہو یا طلاق پا کر عدت گزر گئی ہو تو ان سب صورتوں میں نکاح مذکور جائز ہے۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «لا يجمع بين المرأة وعمتها ولا بين المرأة وخالتها»[1] (متفق عليه، مشكوة شريف، مطبوعه انصاري دهلي، ص: ٢٦٥)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت اور اس کی پھوپھی نیز عورت اور اس

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٨)

کی خالہ کو نکاح میں اکٹھا نہ کیا جائے]

کون کون عورتیں حرام ہیں، اس کی تفصیل دیکھنا ہو تو سورۃ النسا رکوع سوم و چہارم ملاحظہ ہو۔

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح عندي. أبو محمد إبراهيم، غفرله ولوالديه.

جواب صحیح ہے۔محمد عبدالغفار۔(مہر مدرسہ)

سگی چچی سے نکاح کا حکم:

سوال ایک شخص نے اپنی سگی چچی سے نکاح کیا ہے، باوجود یکہ چچا زاد بہن بھی اس عورت کی طرف سے ہے، اس صورت میں اس عورت سے نکاح کرنا از روئے شرع شریف درست ہوگا یا نہ؟ بینوا تؤجروا!

جواب سگی چچی سے اس وقت نکاح درست نہیں ہے جبکہ چچا زاد بہن اسی چچی کے بطن سے اس شخص کے نکاح میں ہو، کیونکہ ساس سے نکاح درست نہیں ہے۔

﴿وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ﴾ [سورۂ نساء، رکوع ٤]

''اور تمھاری بیبیوں کی مائیں تم پر حرام کی گئی ہیں۔''

اگر چچا زاد بہن اس شخص کے نکاح میں نہیں ہے یا ہے، لیکن اس چچی کے بطن سے نہیں ہے تو اس صورت میں سگی چچی سے نکاح درست ہے:

﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ٤] والله أعلم بالصواب.

[اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں] كتبه: محمد عبد الله

چچیرے بھائی کی بہو سے نکاح کا حکم:

سوال اپنے چچیرے بھائی کی بہو سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟

جواب چچیرے بھائی کی بہو سے نکاح جائز ہے، اس لیے کہ یہ اُن عورتوں میں سے نہیں ہے، جن سے نکاح حرام ہے، پس بحکم آیت کریمہ: ﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ (سورۂ نساء، رکوع: ٤) [اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں] نکاح اس عورت سے حلال ہے۔ والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

بی بی کی پھوپھی محرم ہے یا غیر محرم؟

سوال بی بی کی پھوپھی محرم ہے یا غیر محرم؟

جواب بی بی کی پھوپھی غیر محرم ہے۔محرم وہ ہے جس سے نکاح ہمیشہ کو حرام ہو، جیسا ماں بیٹی، بہن، اپنی پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی وغیرہ اور بی بی کی پھوپھی سے نکاح اسی وقت حرام ہے جب تک بی بی نکاح یا عدت میں ہے اور جب عدت گزر گئی تو اس کی پھوپھی سے نکاح حلال ہے۔

مشکوۃ شریف (ص: ۲۶۵ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

عن أبي هريرةﷺ قال: قال رسول اللهﷺ: «لا يجمع بين المرأة وعمتها ولا بين المرأة وخالتها»[1] (متفق عليه) والله أعلم بالصواب

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت اور اس کی پھوپھی نیز عورت اور اس کی خالہ کو نکاح میں اکٹھا نہ کیا جائے] کتبہ: محمد عبد الله ۔مہر مدرسہ۔ (۲۲/نومبر ۹۳ء)

حاملہ عورت سے نکاح درست ہے یا نہیں؟

سوال حاملہ عورت سے نکاح درست ہے یا نہیں؟

جواب حاملہ عورت سے نکاح درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [سورۂ طلاق رکوع:۱ پارہ: ۲۸]

[اور جو حمل والی ہیں، ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں]

كتبه: محمد عبد الله (مهر مدرسه أحمديه). هذا الجواب صحيح لا ريب فيه. كتبه: أبو العلىٰ محمد عبدالرحمن.

کیا سید کی لڑکی سے پٹھان شادی کر سکتا ہے؟

سوال سید کی لڑکی سے پٹھان شادی کر سکتے ہیں یا نہیں؟ قرآن و حدیث سے اس کا جواب مدلل و مفصل مرحمت فرمایا جائے۔

جواب سید کی لڑکی سے پٹھان لوگ شادی کر سکتے ہیں۔ اگر لڑکی اور لڑکی کا ولی دونوں اس شادی سے راضی ہوں۔ اس کی ناجوازی کسی آیت اور حدیث سے ثابت نہیں۔ ومن ادعى فعليه البيان.

قرآن مجید سے صرف اس قدر ثابت ہے کہ نکاح میں زوج اور زوجہ، یعنی ان دو شخصوں کا جن کی باخود باشادی کی جائے، باہم کفو، یعنی مثل اور نظیر ہونا دو امروں میں ضروری ہے:

1. یہ کہ وہ دونوں آدمی ہوں، پس آدمی کا نکاح غیر آدمی سے، مثلاً: جنیہ سے درست نہیں ہے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا﴾ [النحل: ۷۲]

[اور اللہ نے تمھارے لیے خود تمھی میں سے بیویاں بنائیں]

2. یہ کہ وہ دونوں مسلمان ہوں یا مرد مسلمان اور عورت کتابیہ ہو۔ پس مرد مسلمان کا نکاح عورت مشرکہ سے یا عورت مسلمہ کا نکاح مرد مشرک سے صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح عورت مسلمہ کا مرد کتابی سے صحیح نہیں۔

قال الله تعالىٰ: ﴿ وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٨)

اَعْجَبَتْكُمْ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ [البقرة: ٢٢١]

[اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور یقیناً ایک مومن لونڈی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ تمھیں اچھی لگے اور نہ (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں]

وقال تعالیٰ: ﴿وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ [المائدة: ٥] والله تعالیٰ أعلم

[اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی]

کتبہ: محمد عبد الله (٢١/ ربيع الأول ١٣٣٢هـ)

شیعہ مرد و عورت سے نکاح کرنے اور وراثت کا حکم:

سوال عورت سنت و جماعت کا نکاح مرد شیعہ مذہب کے ساتھ اور مرد سنت و جماعت کا نکاح عورت شیعہ کے ساتھ ازروئے شرع شریف وقرآن و حدیث جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو ان میں توریث جاری ہوگی یا نہیں؟

جواب نکاح بھی جائز ہے اور توریث بھی جاری ہوگی، اس لیے کہ ان میں جو اختلاف ہے، وہ کتاب وسنت کی تاویل کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف موجب اختلافِ ملت نہیں ہے، ہاں نکاح مذکور خلافِ اولیٰ ہے، لیکن جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو، اس سے بوجہ اختلافِ ملت نہ مناکحت جائز ہے نہ توریث جاری ہوگی۔

درمختار کی فصل ''محرمات'' میں ہے:

"تجوز مناكحة المعتزلة لأنا لا نكفر أحدا من أهل القبلة وإن وقع إلزاما في المباحث"[1]

[معتزلہ سے نکاح جائز ہے، کیوں کہ ہم اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر نہیں کہتے، اگرچہ مباحث میں الزام واقع ہے]

''فرائض شریفی'' (ص: ۱۸ مطبوعہ مصطفائی) میں ہے:

"بخلاف أهل الأهواء فإنهم معترفون بالأنبياء والكتب، ويختلفون في تأويل الكتاب والسنة، وذلك لا يوجب اختلاف الملة" انتهى

[اہلِ اہوا کے برخلاف، کیوں کہ وہ انبیا اور کتابوں کے معترف ہیں اور کتاب و سنت کی تاویل میں اختلاف کرتے ہیں، مگر یہ چیز اختلافِ ملت کو واجب نہیں کرتی]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار (٣/ ٤٦) اس عبارت کی توضیح کرنے کے بعد علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں کہ ''اگر کوئی رافضی (شیعہ) علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت یا جبریل کے وحی میں غلطی کرنے یا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی محبت کے انکار یا سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان طرازی کا نظریہ رکھتا ہے تو وہ کافر ہے، کیوں کہ وہ قطعی دلائل کے ساتھ معلوم ہونے والے دین کے یقینی امور کی مخالفت کرتا ہے۔'' لہٰذا آج کل کے شیعہ [illegible] ہیں۔

’’شرح مواقف‘‘ (ص: ۷۶۲ مطبوعہ نولکشور) میں ہے:

’’المقصد الخامس في أن المخالف للحق من أهل القبلة هل يكفر أم لا؟ جمهور المتكلمين والفقهاء على أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة، فإن الشيخ أبا الحسن قال في أول كتاب مقالات الإسلاميين: اختلف المسلمون بعد نبيهم عليه السلام في أشياء، ضلل بعضهم بعضا، وتبرأ بعضهم عن بعض، فصاروا فرقا متباينين إلا أن الإسلام يجمعهم ويعمهم فهذا مذهبه، وعليه أكثر أصحابنا، وقد نقل عن الشافعي أنه قال: لا أرد شهادة أحد من أهل الأهواء إلا الخطابية، فإنهم يعتقدون حل الكذب، وحكى الحاكم صاحب المختصر في كتاب المنتقىٰ عن أبي حنيفة رحمه الله أنه لم يكفر أحدا من أهل القبلة، وحكى أبو بكر الرازي مثله عن الكرخي وغيره‘‘[1] انتهى

[پانچواں مقصد اس بارے میں کہ اہلِ قبلہ میں سے حق کی مخالفت کرنے والے کو کافر کہا جائے گا یا نہیں؟ جمہور متکلمین اور فقہا کا یہ موقف ہے کہ اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہا جائے۔ شیخ ابو الحسن رحمہ اللہ نے کتاب ’’مقالات الإسلاميين‘‘ کے آغاز میں لکھا ہے: مسلمانوں نے اپنے نبی کے بعد کئی ایک چیزوں میں اختلاف کیا، ایک نے دوسرے کو گمراہ کہا، ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار کیا، پس وہ اس طرح مختلف فرقوں میں تقسیم ہوگئے، ہاں ان کو اسلام عمومی طور پر جمع کرتا ہے، پس یہ ان کا مذہب ہے اور اس مذہب پر ہمارے اکثر اصحاب قائم ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں اہلِ اہوا میں سے خطابیہ فرقے کے سوا کسی کی گواہی رد نہیں کرتا، کیوں کہ وہ جھوٹ کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ حاکم صاحب المختصر نے کتاب المنتقیٰ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر نہیں کہتے۔ ابوبکر رازی رحمہ اللہ نے بھی کرخی رحمہ اللہ وغیرہ سے اس قسم کی روایت بیان کی ہے]

پھر اسی صفحہ میں ہے:

’’أما على ما هو المختار عندنا، وهو أن لا يكفر أحد من أهل القبلة، إن المسائل التي اختلف فيها أهل القبلة من كون الله عالما بعلم أو موجدا لفعل العبد أو غير متحيز و لا في جهة ونحوها ككونه مرئيا أو لا، لم يبحث النبي صلی اللہ علیہ وسلم عن اعتقاد من حكم بإسلامه فيها، ولا الصحابة ولا التابعون، فعلم أن صحة دين الإسلام لا تتوقف على معرفة الحق في تلك المسائل، وأن الخطأ فيها ليس قادحا في حقيقة الإسلام، إذ لو توقفت عليها، وكان الخطأ قادحا في تلك الحقيقة، لوجب أن يبحث عن كيفية اعتقادهم فيها، لكن لم يجر حديث فى شيئ منها في زمانه، ولا في زمانهم أصلا.

[1] شرح المواقف للجرجاني (۸/ ۳۷۰)

"فإن قيل لعله ﷺ عرف منهم ذلك أي كونهم عالمين بها إجمالا فلم يبحث عنها لذلك، كما لم يبحث عن علمهم بعلمه وقدرته مع وجوب اعتقادهما، وما ذلك إلا بعلمه بأنهم عالمون على طريق الجملة بأنه تعالىٰ عالم قادر، فكذا الحال في تلك المسائل. قلنا: ما ذكرتم، مكابرة، لأنا نعلم أن الأعراب الذين جاؤا إليه ﷺ ما كانوا كلهم عالمين بأنه تعالىٰ عالم بالعلم لا بالذات وأنه مرئي في الدار الآخرة، وأنه ليس بجسم، ولا في مكان وجهة، وأنه قادر على أفعال العباد كلها، وأنه موجد لها بأسرها، فالقول بأنهم كانوا عالمين بها مما علم فساده بالضرورة، وأما العلم والقدرة فهما مما يتوقف عليه ثبوت نبوته لتوقف دلالة المعجزة عليهما، فكان الاعتراف والعلم بها أي بالنبوة دليلا للعلم بهما، ولو إجمالا فلذلك لم يبحث عنهما.

"قال الإمام الرازي: الأصول التي يتوقف عليها صحة نبوة محمد ﷺ أدلتها على ما يليق بأصحاب الجمل ظاهرة، فإن من دخل بستانا، ورآى أزهارا حادثة بعد أن لم تكن، ثم رآى عنقود عنب، قد اسود جميع حباته إلا حبة واحدة مع تساوي نسبة الماء والهواء وحر الشمس إلى جميع تلك الجهات، فإنه يضطر إلى العلم بأن محدثه فاعل مختار، لأن دلالة الفعل المحكم على علم فاعله واختياره ضرورية، وكذا دلالة المعجزة على صدق المدعي ضرورية أيضاً، وإذا عرف هذه الأصول أمكن العلم بصدق الرسول فثبت أن أصول الإسلام جلية، وأن أدلتها مجملة واضحة، ولذلك لم يبحث عنها بخلاف المسائل التي اختلف فيها، فإنها في الظهور والجلاء ليس مثل تلك الأصول، بل أكثرها مما ورد في الكتاب والسنة ما يتخيله المبطل معارضا لما يحتج المحق فيها، وكل واحد منها يدعي أن التاويل المطابق لمذهبه أولىٰ فلا يمكن جعلها مما يتوقف عليه صحة الإسلام فلا يجوز الإقدام علىٰ التكفير، إذ فيه خطر عظيم"[1] انتهى

[رہا یہ مسئلہ کہ ہمارے نزدیک مختار مذہب کیا ہے، تو وہ یہ ہے کہ اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہو۔ یقیناً وہ مسائل جن میں اہلِ قبلہ نے اختلاف کیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا علم کے ساتھ عالم ہونا یا بندے کے فعل کا موجد ہونا یا اس کا جہت میں متحیز نہ ہونا اور اسی طرح وہ دکھائی دے گا یا نہیں۔ نبیِ کریم ﷺ نے جس شخص کے اسلام کا حکم لگایا تو ان مسائل میں اس کے اعتقاد کے بارے میں کھوج نہیں لگایا۔ صحابہ و تابعین نے

① شرح المواقف للجرجاني (٨/ ٣٧٠-٣٧١)

بھی ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ دینِ اسلام کی صحت ان مسائل میں حق کی معرفت پر موقوف نہیں ہے اور ان میں غلطی حقیقتِ اسلام میں قادح نہیں ہے۔ اگر حقیقتِ اسلام ان مسائل پر موقوف ہوتا اور اس حقیقت میں غلطی کرنا قادح ہوتا تو پھر یہ بھی واجب ہوتا کہ ان مسائل میں ان کے اعتقاد کی کیفیت کو معلوم کیا جائے اور اس کا کھوج لگایا جائے، لیکن آپ ﷺ کے دور میں اور نہ صحابہ و تابعین کے زمانے میں ان مسائل میں سے کسی پر بات نہیں چلی۔

اگر کہا جائے کہ شاید آپ ﷺ کو ان لوگوں کے ان اعتقادات کا اجمالی علم ہونا معلوم ہو، اسی لیے آپ ﷺ نے اس کا کھوج نہیں لگایا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ان کے اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کے علم کا کھوج نہیں لگا، باوجود اس کے کہ ان دونوں کا اعتقاد رکھنا واجب ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ آپ ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ وہ اجمالی طور پر اس بات کو جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم و قادر ہے اور یہی حال مذکورہ بالا اختلافی مسائل کا تھا۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے: جو کچھ تم نے اس اشکال میں ذکر کیا ہے وہ تو محض عناد اور سینہ زوری ہے، کیوں کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ بدو جو آپ ﷺ کے پاس آئے تھے، وہ سب اس بات کا علم نہیں رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ عالم بالعلم ہے، نہ کہ بالذات اور یہ کہ وہ عالم آخرت میں دکھائی دے گا، وہ جسم نہیں ہے، وہ کسی مکان میں ہے نہ جہت میں، وہ تمام افعال عباد پر قادر ہے اور وہ ان تمام کا موجد ہے۔ پس یہ کہنا کہ وہ ان چیزوں کا علم رکھنے والے تھے، یہ ان چیزوں سے ہے، جس کا فساد یقینی طور پر معلوم ہے۔ رہا اس کا علم اور اس کی قدرت تو یہ دونوں ان چیزوں سے ہے، جن پر آپ ﷺ کی نبوت کا ثبوت موقوف ہے، کیوں کہ معجزے کی دلالت ان دونوں پر موقوف ہے، اگرچہ وہ اجمالی ہو، اسی لیے آپ ﷺ نے ان کے متعلق بحث اور تفتیش نہیں کی۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا: وہ اصول جن پر محمد ﷺ کی نبوت کا صحیح ہونا موقوف ہے، ان کے دلائل اس لائق ہیں کہ وہ اونٹوں والوں پر بھی ظاہر و واضح ہیں۔ پس جو شخص ایک باغ میں داخل ہوا، وہاں اس نے کچھ نو پیدا پھول دیکھے، جو پہلے نہیں تھے، پھر اس نے انگوروں کا ایک گچھا دیکھا، جس کے تمام دانے سوائے ایک دانے کے (پک کر) سیاہ ہو چکے تھے، باوجود اس کے کہ ان سب کو پانی، ہوا اور سورج یکساں طور پر تمام جہات سے میسر آئی۔ تو وہ یہ جاننے پر مجبور ہوگا کہ اس کا موجد فاعلِ مختار ہے، کیوں کہ محکم فعل کی اپنے فاعل کے علم اور اس کے اختیار کی دلالت ضروری اور یقینی ہے۔ اسی طرح معجزے کی دلالت مدعی کی صداقت پر یقینی ہوتی ہے۔ جب یہ اصول معلوم ہو جائیں تو رسول کی صداقت کا معلوم ہو جانا ممکن بن

جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اسلام کے اصول جلی ہیں، اس کے دلائل اجمالاً واضح ہیں، اسی لیے ان کی ٹوہ نہیں لگائی جاتی۔ برخلاف ان مسائل کے جن میں اختلاف ہوا ہے، کیوں کہ وہ ظہور میں ان مسائل کی طرح نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر وہ ہیں کہ جو کتاب و سنت میں وارد ہوا ہے، اس کو مبطل اس کے معارض و مخالف نہیں سمجھتا، جس سے حق گو دلیل پکڑتا ہے، ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ تاویل جو اس کے مذہب کے مطابق ہے، وہی اولیٰ ہے۔ پس اس کو یہ مقام دینا ممکن نہیں ہے، جس پر اسلام کا صحیح ہونا موقوف ہو، پس کسی کو کافر قرار دینے میں کوئی اقدام کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں بہت بڑا خطرہ ہے] واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ (مهر مدرسه). الجواب صحيح عندي، واللہ أعلم بالصواب. محمد ضمير الحق، عفي عنه. أصاب من أجاب. وصيت على. الجواب صحيح عندي، واللہ أعلم الصواب. أبو محمد إبراهيم۔ الجواب صحيح. أبو العلیٰ محمد عبدالرحمن، عفي عنه.

بیٹے کی زنا شدہ عورت سے نکاح کا حکم:

سوال اگر کوئی شخص اپنے فرزند حقیقی کی مزنیہ سے نکاح کرے تو یہ نکاح جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب اس مسئلے میں فیما بین العلماء اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ نکاح ناجائز ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جائز۔ اس اختلاف کا منشا یہ ہے کہ جہاں پر قرآن مجید میں محرمات عورتوں کا بیان ہے اور بعد بیانِ محرمات یہ فرمایا ہے کہ ان کے سوا اور جو عورتیں ہیں، وہ حلال ہیں، اس جگہ اس مسئلے کے متعلق یہ فرمایا ہے:

﴿ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ ﴾ [النساء: ۲۳]
''تمھارے صلب، یعنی حقیقی فرزندوں کی حلائل تم پر حرام کی گئیں۔''

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حلائل حلیلہ کی جمع ہے اور حلیلہ کے معنی زوجہ کے ہیں۔ قاموس میں ہے: ''حليلتك: امرأتك'' اھ[1] [یعنی تمھاری ''حلیلہ'' سے مراد تمھاری بیوی ہے] ''مجمع البحار'' میں ہے: ''وفيه أن تزاني حليلة جارك أي امرأته، والرجل حليلها'' اھ [اور اس میں ہے کہ تو اپنے پڑوسی کی حلیلہ، یعنی اس کی بیوی سے زنا کرے اور مرد اس کا حلیل (شوہر ہوتا) ہے] منتخب اللغات میں ہے: ''حلائل زنان نکاحی، جمع حلیلہ است'' اھ [حلائل حلیلہ کی جمع ہے اور یہ منکوحہ عورتوں کو کہتے ہیں] غیاث اللغات میں ہے: ''حلیلہ زن منکوحہ'' اھ [حلیلہ منکوحہ عورت کا نام ہے]

جب ''حلیلہ'' کے معنی ''زوجہ'' کے ہیں اور مزنیہ زوجہ نہیں ہے، تو آیتِ کریمہ سے صرف حقیقی فرزندوں کی زوجات کی حرمت ثابت ہوئی، نہ ان کی مزنیات کی بھی اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ حلیلہ کے معنی زوجہ

[1] القاموس المحيط (ص: ۹۸۶)

ہی کے ہیں اور مزنیہ زوجہ نہیں ہے، لیکن مزنیہ بوجہ موطوء ہ ہو جانے کے حکم میں زوجہ کے ہوگئی تو وہ بھی مثل واقعی زوجہ فرزند حقیقی کے حرام ہوگئی ہیں۔ جلالین میں ہے: "وحلائل أزواج أبناء كم الذين من أصلابكم"[1] اھ [اور حلائل، یعنی بیویاں، تمھارے صلبی بیٹوں کی] تفسیر ابو السعود میں ہے:

"وحلائل أبناءكم أي زوجاتهم. سميت الزوجة حليلة لحلها للزوج أو لحلولها في محله، وقيل لحل كل منهما إزار صاحبه، وفي حكمهن مزنياتهم، ومن يجرين مجراهن من الممسوسات ونظائرهن"[2] اھ

[تمھارے بیٹوں کی حلائل، یعنی ان کی بیویاں، زوجہ کو حلیلہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ (اپنے) خاوند کے لیے حلال ہوتی ہے، یا اس وجہ سے کہ اس (اپنے خاوند) کے گھر میں اترنے والی ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں (میاں بیوی) ایک دوسرے کا ازار کھولنے والے ہوتے ہیں۔ مزنیات (جن سے زنا ہوا ہے) بھی انھیں کے حکم میں ہوں گی۔ اسی طرح فاحشہ عورتیں وغیرہ بھی انھیں کی طرح ہی ہیں]

بہر کیف صراحتاً کتاب اللہ سے صرف زوجہ فرزند حقیقی کی حرمت ثابت ہے، نہ مزنیہ فرزند حقیقی کی بھی۔ مزنیہ فرزند حقیقی کی حرمت جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے، صرف اجتہادی امر ہے۔ اگرچہ اس مسئلے میں امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل صاف اور قوی ہے اور حدیث ابن ماجہ (ص: ۱۴۶) «لا يحرم الحرام الحلال»[3] یعنی حرام چیز حلال کو حرام نہیں کرتی، بھی امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کی موید ہے، کیونکہ باپ کو اپنے بیٹے کی مزنیہ سے نکاح کرنا قبل زنا کرنے بیٹے کے حلال تھا اور جب بیٹے نے اس عورت سے زنا کر لیا تو یہ زنا جو محض ایک حرام فعل ہے، بیٹے کی مزنیہ کو باپ کے حق میں بحکم اس حدیث کے حرام نہیں کر سکتا، لیکن اس نکاح کی حلت خالی از شبہہ نہیں ہے، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ باپ اس نکاح سے پرہیز کرے۔ دنیا میں اور بہت سی عورتیں ہیں اور جس کسی عورت سے چاہے، نکاح کر لے اور بیٹے کی مزنیہ کو بھی اگر نکاح کرنا ہی ہے تو اور جس کسی مرد سے چاہے کر لے۔ صحیح بخاری (۱/ ٦٦) میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الحلال بين، والحرام بين، وبينهما مشتبهات، لا يعلمها كثير من الناس، فمن اتقى المشتبهات استبرأ لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات، كراع يرعىٰ حول الحمىٰ يوشك أن يواقعه»[4] والله أعلم بالصواب

[حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، جب کہ ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں، بہت سے لوگ

---

[1] تفسير الجلالين (ص: ۱۰۲)

[2] تفسير أبي السعود (۲/ ۱٦۲)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۰۱۵) اس کی سند میں "عبد الله بن عمر العمري"، ضعیف ہے۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵۹۹)

ان کو نہیں جانتے، پس جو شخص شبہات سے بچ گیا تو اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا اور جو شخص شبہات میں مبتلا ہوگیا (تو وہ حرام میں مبتلا ہوگیا) جیسے وہ چرواہا جو چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے، تو قریب ہے کہ وہ اس (چراگاہ) میں چرائے گا]

کتبہ: محمد عبد اللہ

کیا زنا شدہ عورت کی بیٹی سے نکاح درست ہے؟

سوال ایک شخص نے باغوائے نفس امارہ ایک عورت سے زنا کیا، بعد اُس کے اس مزنیہ کی لڑکی سے نکاح کیا اور بعد نکاح کے بھی دونوں سے وطی کیا تو یہ نکاح درست ہوا یا نہیں؟ برتقدیر عدمِ جواز کوئی صورت نباہ کی ہے یا نہیں؟

جواب نکاح مذکور درست ہوا، اس لیے کہ یہ عورت ان عورتوں میں سے نہیں ہے، جن سے نکاح حرام ہے، پس بحکم آیتِ کریمہ: ﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ٤] [اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں] اس عورت سے نکاح درست ہوا۔ رہا یہ شبہہ کہ یہ عورت اس شخص کی ربیبہ ہے اور ربیبہ سے نکاح ناجائز ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہہ اس بنا پر ہے کہ زنا نکاح کے حکم میں ہے اور جب زنا نکاح کے حکم میں ہو تو عورت مذکورہ جو اس شخص کی مزنیہ کی لڑکی ہے، اس شخص کی ربیبہ ہوگئی، لیکن اس بات پر کہ زنا نکاح کے حکم میں ہے، کوئی شرعی نص نہیں ہے۔ البتہ بعض ائمہ دین کا اجتہاد ہے، جو آیتِ کریمہ: ﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ [اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں] کے مقابلے میں معتبر نہیں ہوسکتا۔

الحاصل اس مسئلے میں اختلاف ہے اور جب کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو اس وقت ہمارے لیے آسمانی قانون یہ ہے کہ ہم اللہ و رسول کے قول سے جو بات ثابت ہو، اس پر کاربند ہوں۔

اللہ تعالیٰ سورۂ نساء رکوع (٨) میں فرماتا ہے:

﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ [النساء: ٥٩]

[پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے]

پس اس قانون کے بموجب ہم نے اللہ و رسول کی طرف رجوع کیا تو اللہ کی کتاب میں یہ پایا کہ عورت مذکورہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے، جس طرح اوپر معلوم ہوا، تب بحکم آیتِ شریفہ: ﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ یہ عورت حلال ٹھہری اور حدیث شریف میں یہ پایا:

«لا یحرم الحرام الحلال»[1] [حرام چیز حلال کو حرام نہیں کرتی]

(رواہ الدارقطني، ص: ٤٠٢ و ابن ماجہ، ص: ١٤٦، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

---

[1] سنن ابن ماجه ... (٢٠١٥) ...

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ زنا نکاح کے حکم میں نہیں ہے، ورنہ حرام کا حلال کو حرام کر دینا لازم آ جائے گا اور حدیث اس کی نافی ہے۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

زنا سے حاملہ عورت کے ساتھ نکاح اور وطی کا حکم:

سوال ایک عورت ہے باکرہ غیر منکوحہ، مگر زنا سے حاملہ ہوگئی اور ایک عورت ہے مطلقہ یا بیوہ، جو قانونِ شرع کے موافق عدت پوری کر چکی ہے، مگر بعد انقضائے عدت وہ زنا سے حاملہ ہوگئی۔ پس کیا ان عورتوں کا حالتِ حمل میں نکاح جائز ہے یا نہیں؟ اگر نکاح جائز ہے تو کیا وطی بھی جائز ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث اس بارے میں جو کچھ حکم فرمائیں، اس کو ظاہر فرمایا جائے۔

جواب درصورت مرقومہ جس عورت کو زنا کا حمل ہے، اس سے نکاح جائز ہے، عام اس بات سے کہ وہ مطلقہ ہو یا بیوہ، نکاح جائز و درست ہے۔ اگر زانی خود نکاح کرنا چاہتا ہے تو نکاح اور وطی دونوں حلال ہیں اور اگر غیر زانی نکاح کرنا چاہتا ہے تو نکاح جائز ہے اور وطی تا وضعِ حمل حلال نہیں۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں مذکور ہے:

"وقال أبو حنیفة و محمد رحمهما الله: یجوز أن یتزوج امرأة حاملا من الزنا، ولا یطأها حتی تضع، وقال أبو یوسف رحمه الله: لا یصح، والفتویٰ علی قولهما، کذا في المحیط، وفي مجموع النوازل: إذا تزوج امرأة قد زنیٰ هو بها فظهر بها حبل فالنکاح جائز عند الکل، وله أن یطأها عند الکل، وتستحق النفقة عند الکل، کذا في الذخیرة" انتهی

[امام ابو حنیفہ اور محمد رحمہما اللہ نے کہا: زنا سے حاملہ عورت سے نکاح کرنا جائز ہے، البتہ نکاح کرنے والا تا وضعِ حمل اس سے وطی نہ کرے۔ ابو یوسف رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نکاح درست نہیں ہے، جب کہ (احناف کے ہاں) امام ابو حنیفہ اور محمد رحمہما اللہ کے قول کے مطابق ہی فتویٰ دیا جاتا ہے۔ محیط میں بھی ایسے ہی ہے۔ مجموع النوازل میں ہے کہ جب کوئی شخص ایسی عورت سے نکاح کرے، جس سے اس نے خود ہی زنا کیا ہو اور اس کے نتیجے میں حمل ظاہر ہو چکا ہو تو تمام کے نزدیک نکاح جائز ہے۔ سب کے نزدیک اس کو اس عورت سے وطی کرنا حلال ہے اور تمام کے نزدیک عورت نفقے کی حق دار ہے۔ ذخیرہ میں بھی ایسے ہی ہے]

وهکذا في شرح الوقایة، وفتح القدیر: وحبلی من زنا لا توطأ حتی تضع حملها.[1] انتهی (شرح وقایة)

[شرح الوقایہ اور فتح القدیر میں بھی ایسے ہی ہے: زنا سے حاملہ ہونے والی عورت سے اس وقت تک وطی نہ کی جائے، جب تک وہ وضعِ حمل نہ کر دے]

وهذا کله إذا کان الناکح غیر الزاني، فإن نکح الزاني بحبلیٰ من زنا منه جاز النکاح

[1] شرح الوقایة (۱/ ۳/ ۱٤) فتح القدیر (۳/ ۲٤۱)

اتفاقا، وحل الوطي أيضاً، كذا في فتح القدير. والله أعلم بالصواب

[یہ سب اس صورت میں ہے، جب نکاح کرنے والا زانی کے علاوہ کوئی آدمی ہو۔ اگر زانی اس عورت سے نکاح کرے، جو اس کے ساتھ زنا کرنے کی وجہ سے حاملہ ہوئی ہو تو بالاتفاق نکاح اور وطی جائز ہے۔ فتح القدیر میں ایسے ہی ہے]

كتبه: السيد محمد عبد السلام، عفي عنه. أبو الحسن سيد محمد. الجواب صحيح. أبو محمد عبدالحق.

ان عورتوں کا حالتِ حمل میں نکاح جائز نہیں ہے۔

لقوله تعالیٰ: ﴿مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ﴾ [النساء: ٢٥]

[جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چھپے یار بنانے والی]

وقوله تعالیٰ: ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [النور: ٣]

[زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے، یا کسی مشرک عورت سے، اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے]

ان دونوں آیتوں سے ثابت ہے کہ عورت زانیہ سے مردِ مومن کا نکاح جائز نہیں ہے۔

وقوله تعالیٰ: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [الطلاق: ٤]

[اور جو حمل والی ہیں ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں]

اس آیت سے ثابت ہے کہ حاملہ عورت سے بھی حالتِ حمل میں نکاح جائز نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت میں حمل سے وہ حمل مراد ہے، جو ثابت النسب ہو اور زنا سے جو حمل ہو، وہ ثابت النسب نہیں ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں یہ قید مذکور نہیں ہے اور نہ کسی آیت یا حدیث میں یہ قید مذکور ہے اور اپنی طرف سے کوئی قید لگانا جائز نہیں ہے۔ پس یہ آیت اپنے اطلاق پر باقی رہے گی، ہاں اگر یہ عورتیں زنا سے سچی توبہ کر ڈالیں تو ان کا نکاح بعد وضع حمل کے جائز ہے، کیونکہ آدمی جب گناہ سے سچی توبہ کر ڈالتا ہے تو گناہ سے بالکل پاک ہوجاتا ہے۔ پس یہ عورتیں زنا سے توبہ کر ڈالنے کے بعد زانیہ ہی نہ رہیں، بلکہ عفیفہ ہوگئیں۔ پس اس سے پہلی وجہ نکاح کے ناجائز ہونے کی جاتی رہی اور وضعِ حمل کے بعد حاملہ بھی نہیں رہیں، پس دوسری وجہ بھی جاتی رہی اور جب ان عورتوں کا حالتِ حمل میں نکاح ہی جائز نہیں تو وطی کیوں کر جائز ہوگی؟ واللہ تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبدالله (٤/ رجب ١٣٣١هـ)

سوال ایک عورت بیوہ تھی، اس سے خطا ہوگئی، حمل اس کا ظاہر ہوگیا۔ اب وہ عورت چاہتی ہے کہ دوسرے شخص سے نکاح کرے اور ایک مرد اس سے راضی بھی ہے۔ وہ اس وقت نکاح کر سکتی ہے یا نہیں اور اس کے کھانے کا کوئی وسیلہ

نہیں ہے، کب تک وہ انتظار کرے؟ جواب سے جلد سرفراز فرمایئے گا۔ (۳۰ر نومبر ۱۹۱۶ھ)

فدوی امیر علی خان و صاحب علی خان۔ مقام بارہ محلہ کوٹ پراٹین گھر۔ ضلع غازیپور

جواب اگر حمل عدت کے اندر ظاہر ہوا تو وہ عورت قبل گزرنے عدت کے، یعنی قبل جننے سے اس حمل کے نکاح نہیں کر سکتی ہے، لیکن اگر وہ اس حمل جننے کا انتظار کرے اور جننے کے بعد نکاح کرے تو یہ احتیاط کی بات ہے اور دونوں صورتوں میں لازم ہے کہ اس خطا سے سچی توبہ کر کے نکاح کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (سورہ طلاق رکوع ۱ پارہ ۲۸) [اور جو حمل والی ہیں ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں] نیز فرماتا ہے:

﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [سورۂ نور، رکوع اول]

[زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے، یا کسی مشرک عورت سے، اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے]

اور فرماتا ہے:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [الفرقان: ۷۰] واللہ أعلم

[مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا، نیک عمل تو یہ لوگ ہیں، جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے] کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۱/ صفر ۱۳۳۵ھ)

زانیہ عورت سے وضع حمل کے بعد نکاح کا حکم:

سوال ایک شخص نے ایک عورت سے عقد کیا۔ بعد عقد کے معلوم ہوا کہ اس عورت کو حمل ہے۔ بعد وضع حمل کے پھر اس شخص نے عقد کیا اور پھر اسی شخص سے حمل قرار پایا۔ اب فرمایئے کہ اب سے وہ نکاح درست ہوا یا نہیں اور وہ عورت اس پر حلال ہوئی یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر کس تدبیر سے نکاح درست ہوگا اور وہ لڑکا جو پیدا ہوگا حلال ہوگا یا حرام ہوگا اور اس عورت کی بہن سے پھر وہ شخص نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا تؤجروا۔

جواب نکاح مذکور درست ہوا اور وہ عورت سائل پر حلال ہوئی اور وہ لڑکا جو پیدا ہوگا حلال ہوگا اور اس عورت کی بہن سے وہ نکاح نہیں کر سکتا۔ ہاں جب وہ عورت مر جائے یا سائل اس کو طلاق دے دے اور طلاق کی عدت بھی گزر جائے تو اس کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع ٤]

[اور یہ کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو، یعنی تم پر حرام ہے] کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

کیا زانی مرد اور عورت میں نکاح ہو سکتا ہے؟

سوال ایک شخص نے ایک عورت منکوحہ کے ساتھ زنا کیا اور اس کو حمل قرار پایا۔ شوہر نے اس کے طلاق دیا۔ اب وہ عورت اس شخص سے نکاح کرنا چاہتی ہے، کب تک نکاح کرے؟ بینوا تؤجروا!

جواب اس صورت میں جب وہ عورت اور وہ شخص جس نے اس عورت کے ساتھ زنا کیا ہے، دونوں فعلِ زنا سے سچے دل سے تائب ہو جائیں اور عورت کے طلاق کی عدت گزر جائے، یعنی عورت وضع حمل کر لے، تب اس شخص کے ساتھ اس عورت کا نکاح جائز ہے اور قبل پائے جانے ان دونوں باتوں کے نکاح عورت مذکورہ کا شخص مذکورہ کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [سورۂ نور، رکوع أول، آیت: ۳]

[زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے، یا کسی مشرک عورت سے، اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے]

وقال تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [سورۃ فرقان، رکوع آخر، آیت: ٦٨۔ ٧٠]

[اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو یہ کرے گا وہ سخت گناہ کو ملے گا۔ اس کے لیے قیامت کے دن عذاب دگنا کیا جائے گا اور وہ ہمیشہ اس میں ذلیل کیا ہوا رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا، نیک عمل تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے]

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال النبي ﷺ: «الولد للفراش، وللعاهر الحجر»[1]

(صحيح بخاري مطبوعه مصر: ٤/ ١٤٥)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بچہ بستر والے کا ہے اور زانی کے لیے پتھر ہیں]

وقال تعالیٰ: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [سورۂ طلاق، رکوع أول، آیت: ٤]

[اور ان کی بھی جنھیں حیض نہیں آیا اور جو حمل والی ہیں ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں]

والله أعلم بالصواب — كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٧)

کیا بیوی زنا کرے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال کسی شخص نے اپنی عورت کو زنا کراتے دیکھا غیر شخص کے ساتھ، اب نکاح اس کا رہا یا ٹوٹ گیا؟

جواب کوئی شخص اپنی عورت کو زنا کراتے دیکھے تو اس سے نکاح نہیں ٹوٹتا، لیکن وہ عورت اگر اس فعل شنیع سے تائب نہ ہو تو اس کو طلاق دے دینا چاہیے۔

سوال ایک عورت نے کہ اس کا خاوند بھی زندہ ہے، ایک دوسرے شخص سے آشنائی کر لی تو اس کے خاوند نے دس برس سے اس کو چھوڑ دیا ہے اور اس عرصے میں اس شخص زانی سے اس عورت کو چار بچے پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اس کے خاوند سے جو کہا گیا کہ تو اپنی عورت کو رکھ لے تو اس نے یہ کہا کہ میں اس کو ہرگز نہیں رکھنے کا اور اس نے دوسری عورت سے اپنے نکاح بھی کر لیا ہے۔ اب وہ اس کے نکاح سے باہر ہوئی یا نہیں اور اس عورت کا اس زانی سے نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں وہ عورت اپنے خاوند کے نکاح سے باہر نہیں ہوئی۔ ہنوز وہ اسی کے نکاح میں ہے اور جب تک اس کا خاوند زندہ ہے، تب تک بغیر اس کے طلاق دیے اور عدت گزرے ہوئے اس عورت کا دوسرا نکاح جائز نہیں ہے، اس زانی سے نہ اور کسی سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ [النساء: ٢٤]

یعنی تم پر شوہر دار عورتیں حرام کی گئیں۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

دو نکاحوں میں سے کون سا نکاح درست ہے؟

سوال ایک شخص نے اپنی بالغہ لڑکی کی نسبت اپنے بھتیجے سے کر دی، جو لڑکی سے عمر میں چھوٹا ہے۔ بعد وفات اپنے باپ کے لڑکی نے اپنا نکاح ایک دوسرے شخص سے کر لیا، جو اس کی متوفیہ بہن کا شوہر تھا، اس نکاح میں لڑکی کا ایک چچا جو اس کا ماموں بھی ہے (اس طور پر کہ لڑکی کے باپ کا بھائی ہے باپ کی طرف سے اور ماں کا بھائی ہے ماں کی طرف سے) شریک اور رضا مند تھا۔ مگر لڑکی کے دوسرے دو چچا جن میں سے بڑے کے لڑکے سے وہ منسوب تھی، شریک نہ تھے اور نہ رضا مند تھے اور نہ ان کے علم میں یہ نکاح ہوا۔ جس چچا کے بیٹے سے اس کا انتساب ہوا تھا، وہ سب سے بڑا چچا ہے اور حقیقی چچا ہے۔ بعد علم ہونے اس نکاح کے دونوں مخالف چچا نے بغیر علم و اطلاع یا رضا مندی کے لڑکی کا نکاح اس لڑکے سے کر دیا، جس سے اس کی پیشتر میں نسبت ہوئی تھی۔ لڑکی اس جدید نکاح کی مخالفت اور انکار ایک ماہ تک کرتی رہی۔ اس عرصہ میں اس کو حراست میں رکھا گیا اور اس کی رضا مندی کے شوہر کو آمد و رفت کا موقع نہیں دیا گیا۔ بعد ایک ماہ کسی وجہ سے خواہ بوجہ اس کے کہ اس کو سخت حراست میں رکھا گیا تھا، خواہ منت و سماجت کی گئی، لڑکی نے دوسرے شوہر سے رضا مندی کا اظہار کر دیا اور کہا جاتا ہے کہ خلوت بھی ہوگئی۔ اس صورت میں ہر دو نکاحوں میں سے کونسا نکاح بموجب شرع شریف وحسبِ فقہ حنفی جائز سمجھا جائے گا؟

جواب اس صورت میں لڑکی ہر دو نکاح کے وقت مکلفہ (عاقلہ بالغہ) تھی تو ان ہر دو نکاحوں میں سے پہلا نکاح

حسبِ فقہ حنفی جائز سمجھا جائے گا اور دوسرا ناجائز۔ پہلا نکاح جائز اس وجہ سے سمجھا جائے گا کہ حرہ مکلفہ کا نکاح، گو بلا ولی ہی کیوں نہ ہو، حسبِ فقہ حنفی نافذ سمجھا جاتا ہے:

"نفذ نكاح حرة مكلفة بلا ولي عند أبي حنيفة في ظاهر الرواية"

(فتاویٰ عالمگیریہ، طبع مصطفائي: ۲/ ۱۳)

[ظاہر الروایۃ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حرہ مکلفہ کا نکاح بغیر ولی نافذ ہوگا]

دوسرا نکاح ناجائز اس وجہ سے سمجھا جائے گا کہ جب پہلا نکاح جائز سمجھا گیا تو وہ لڑکی شوہر دار ہوگئی اور شوہر دار عورت سے کسی کا نکاح جائز نہیں ہے۔ "لا يجوز للرجل أن يتزوج زوجة غيره" (فتاویٰ عالمگیریہ: ۲/ ۹) [کسی آدمی کے لیے کسی دوسرے کی بیوی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے] اور بھی جب لڑکی نے دوسرے نکاح سے اپنی ناراضی کا اظہار کر دیا تو دوسرا نکاح فسخ ہوگیا اور جب فسخ ہوگیا، اس کے بعد رضا مندی کا اظہار خواہ کسی وجہ سے ہو کچھ مفید نہیں ہوسکتا:

"ولو زوجها وليها، فقالت: لا أرضىٰ، ثم رضيت في المجلس، لم يجز، كذا في محيط السرخسي" (فتاویٰ عالمگیریہ: ۲/ ۱٤)

[اگر عورت کے ولی نے اس کا نکاح کر دیا تو اس نے کہا: میں راضی نہیں ہوں، پھر اسی مجلس میں وہ راضی بھی ہو جائے تو یہ نکاح جائز نہ ہوگا۔ سرخسی کی محیط میں بھی ایسے ہی ہے]

حسبِ حدیث شریف بھی یہی جواب ہے، بشرطیکہ ہر دو چچا، یعنی وہ چچا جس نے کہ لڑکی کا پہلا نکاح کر دیا اور وہ چچا جس نے کہ لڑکی کا دوسرا نکاح کر دیا، برابر کے ولی ہوں۔

عن سمرة بن جندب أن رسول الله ﷺ قال: «أيما امرأة زوجها وليان فهي للأول منهما»[1] الحديث (ترمذي: ۱/ ۱٤۱) والله تعالىٰ أعلم

[سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دو ولی کسی عورت کا نکاح کر دیں، تو یہ ان میں سے پہلے والے کے لیے ہوگی] کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ)

بارات کا کھانا اور دعوتِ ولیمہ:

سوال داماد کو بعد فراغت شادی طعامِ ولیمہ کرنے کی لیاقت نہ ہو تو اس کا سسر داماد کے عوض طعامِ ولیمہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب اگر داماد کو دعوتِ ولیمہ کرنے کی استطاعت نہ ہو اور سسر صاحب کو استطاعت ہو اور چاہتا ہو کہ میرے خرچ سے داماد کی طرف سے دعوتِ ولیمہ ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ داماد کو دعوتِ ولیمہ کا خرچ دے دے، پھر داماد خود

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۰۸۸) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۱۰) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٨٢)

اپنے انتظام سے دعوت کرے یا سسر کو اپنا نائب کر دے کہ سسر اپنے انتظام سے داماد کی طرف سے دعوت کرے۔

واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

نکاح میں باراتیوں کے کھانے کی شرعی حیثیت:

سوال بتقریب نکاحِ صبیہ دعوت و ضیافتِ باراتیان جسے ضروریاتِ نکاحِ صبیہ سے جان کر کرتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی سودی تمسک لکھ کر قرض لیتا ہے اور کوئی اس کے لیے لوگوں سے سائل ہوتا ہے اور جو صاحبِ دولت و ثروت ہے، وہ خود اپنی دولت سے لوگوں کو دعوت دیتا ہے، یہ دعوت اور ضیافت ازروئے شرع شریف ثابت ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد اطہر حسین، موضع چنڈی پور ضلع ندیہ ڈاک خانہ، ڈانگہ۔

جواب نکاح کے کسی قسم کے خرچ کا بار کسی آیت یا حدیث سے عورت پر ثابت نہیں ہوتا، بلکہ نکاح کے منعقد ہوتے ہی نکاح کے متعلق سارا خرچ عورت کا نفقہ (سکنی۔ مہر۔ طعامِ ولیمہ وغیرہ) صرف مرد پر عائد ہو جاتا ہے، بلکہ آیتِ کریمہ: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ [مرد عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے خرچ کیا] میں اس امر کی صاف صراحت موجود ہے کہ مردوں کو عورتوں پر جو افسری حاصل ہے، اس کی دو وجہیں ہیں، جن میں سے دوسری وجہ یہی ہے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ یہاں سے ظاہر ہے کہ عورت کے گھر باراتیوں کو لے جا کر عورت پر ان کی طعام داری کے خرچ کا بار ڈالنا یا عورت پر اور کسی قسم کے خرچے کا بار ڈالنا خلافِ مرضی شارع و قلبِ موضوع و ناجائز ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۱/ رمضان المبارک ۲۶ھ)

سوال ایک لڑکی ہے، جس کے باپ و دادا دونوں موجود ہیں اور دادا ایک تونگر آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری اس میں خوشی ہے کہ بعد عقد دو روز یا تین روز نوشہ مع خویش و اقارب خود ہمارے یہاں کھانا کھائے تو ہم رخصتی کریں گے، ازروئے شرع شریف یہ دعوت جائز ہے یا نہیں؟

مولوی محمد منیر خان۔ شہر بنارس مدنپورہ مکان مولوی عبد اللطیف

جواب عقدِ نکاح کے متعلق شرع شریف نے دلہن کی جانب کوئی خرچ نہیں رکھا ہے، بلکہ جو کچھ اس کے متعلق خرچ رکھا ہے، وہ سب نوشہ کی جانب رکھا ہے۔ دلہن کی جانب اس کے متعلق کوئی خرچ نہیں رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا ہے اور قرآن میں اس کی دو وجہ بتائی ہے، جن میں سے دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ [سورة نساء: ٣٤]

[مرد عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے خرچ کیا]

اس سے ثابت ہوا کہ عقدِ نکاح کے متعلق دلہن کی جانب کوئی خرچ نہیں ہے۔ اگر دلہن کی جانب بھی خرچ ہوتا تو اس کو بھی حکومت کا کچھ حصہ مرد پر دیا جاتا، کیونکہ حاکم ہونے کی دوسری وجہ مال کا خرچ کرنا ہی فرمایا ہے، حالانکہ عورت کو مرد پر حکومت کا حصہ کچھ بھی نہیں دیا گیا، بلکہ صاف فرمایا: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ پس جو دلہن کے دادا نے کہا ہے کہ "میری اس میں خوشی ہے" اس کو بدل کر یوں کہنا مناسب ہے کہ اللہ و رسول کی جس میں خوشی ہے، اس میں میری خوشی ہے، کیونکہ جو کچھ میرے پاس ہے، سب اللہ کا ہی دیا ہوا ہے اور درحقیقت سب اسی کا ہے، جیسا کہ میں خود اسی کا ہوں۔ پھر مجھے کیا اختیار ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ کروں اور کیا خوب بات ہوتی کہ دلہن کے دادا کو جو کچھ اس دعوت میں خرچ کرنے کا ارادہ تھا، وہ سب دلہن اور نوشہ دونوں کو دے دیتا کہ اس میں دونوں کا فائدہ اور صلہ رحمی ہے، جو بڑے ثواب کا کام ہے اور شرع شریف کے بھی خلاف نہیں ہے، بلکہ عین رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے موافق ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری (۱/ ۱۶۰ چھاپہ مصر) کتاب الانبیاء، ذکر بنی اسرائیل میں بروایت ابو ہریرہ مرفوعاً مذکور ہے کہ ایک شخص نے کسی سے ایک زمین خریدی۔ خریدنے کے بعد اس زمین میں اشرفیوں کا بھرا ایک گھڑا پایا۔ مشتری سے کہا کہ یہ مال تمھارا ہے، تم اسے لے لو، اس لیے کہ میں نے صاف زمین خریدی ہے، اشرفیاں نہیں خریدی ہیں۔ بائع نے کہا: میں تو اسے نہیں لینے کا، اس لیے کہ میں تمھارے ہاتھ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے، سب بیچ دی ہے۔ آخر ان دونوں نے ایک شخص کو پنچ مانا۔ پنچ نے دونوں کا بیان سن کر پوچھا کہ تم دونوں کی اولاد بھی ہے؟ ایک نے کہا کہ ہاں میرے ایک لڑکا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میری ایک لڑکی ہے۔ پنچ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ تم دونوں اپنے لڑکے اور لڑکی کو آپس میں بیاہ دو اور یہ اشرفیاں ان دونوں پر خرچ کر دو۔ صحیح بخاری کی یہ عبارت ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال النبي ﷺ: «اشترىٰ رجل من رجل عقارا فوجد الرجل الذي اشترى العقار في عقاره جرة، فيها ذهب، فقال له الذي اشترى العقار: خذ ذهبك مني، إنما اشتريت منك الأرض، ولم أبتع منك الذهب، وقال الذي له الأرض: إنما بعتك الأرض، وما فيها، فتحاكما إلى رجل فقال الذي تحاكما إليه: ألكما ولد؟ قال أحدهما: لي غلام، و قال الآخر: لي جارية، قال: انكحوا الغلام الجارية، وأنفقوا

علیٰ أنفسهما منه وتصدقا»[1]

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی نے کسی شخص سے زمین خریدی۔ زمین کے خریدار کو زمین سے سونے سے بھرا ہوا ایک مٹکا ملا۔ زمین خریدنے والے نے اس (فروخت کنندہ) سے کہا: تم مجھ سے اپنا سونا لے لو، کیوں کہ میں نے تجھ سے زمین خریدی ہے، سونا نہیں خریدا۔ اس زمین (بیچنے) والے نے کہا کہ میں نے تجھے زمین بیچی اور جو کچھ اس میں تھا (وہ بھی ساتھ ہی بیچا) چناں چہ وہ ایک (تیسرے) آدمی کے پاس اپنا مقدمہ لے گئے تو اس نے پوچھا: کیا تمھاری کوئی اولاد ہے؟ ایک نے کہا: میرا ایک لڑکا ہے اور دوسرے نے کہا: میری ایک لڑکی ہے۔ اس (فیصلہ کرنے والے) نے کہا: لڑکے کا نکاح لڑکی سے کر دو۔ اس (مال) میں سے ان دونوں کی ذات پر بھی خرچ کرو اور صدقہ بھی کرو]

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس واقعہ کے بیان فرمانے سے اس کے سوا اور کیا ہے کہ میری امت بھی ایسی صورت میں ایسا ہی کرے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ صورت اس واقعہ کی صورت مسئولہ سے ملتی جلتی ہے، کیونکہ جیسا کہ اس میں ہے کہ مشتری دیتا ہے اور بائع قبول نہیں کرتا، اسی طرح اس میں ہے کہ ایک فریق کھانا کھلانا چاہتا ہے اور دوسرا فریق عذر کرتا ہے۔ پس کیا خوب ہوتا کہ اس صورت میں بھی اسی فیصلے کے مطابق عمل کیا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کا موجب ہوتا اور آپ کی خوشی اللہ تعالیٰ کی خوشی کی موجب ہوتی۔ اللهم وفقنا لما تحب وترضىٰ. آمین. واللہ تعالیٰ أعلم. کتبه: محمد عبداللہ (۹/ ربیع الأول ۱۳۳۰ھ)

اگر خاوند کئی سال بلا نان ونفقہ بیوی کو چھوڑ کر روپوش ہو جائے؟

سوال زید کا نکاح ہندہ سے ہوئے سات برس ہوئے۔ زید نکاح سے پندرہ روز بعد اپنی بیوی چھوڑ کر چلا گیا۔ تقریباً ایک سال انتظار کر کے ہندہ کے باپ نے اس کی جانب سے زید پر نان ونفقہ و دینِ مہر کی عدالت میں نالش کر دی۔ عدالت نے جبراً اس کو بذریعہ حکم نامہ طلب کیا، یہاں تک کہ اس پر مہر وغیرہ کی ڈگری ہوگئی، زید مقدمہ فیصل ہونے سے پہلے ہی فرار ہوگیا، اب تک اس کو روپوش ہوئے اور فرار ہوئے پانچ سال ہوگئے، کوئی خط وغیرہ اپنی بیوی کے پاس نہیں روانہ کیا، یہاں تک کہ سمن سرکاری طور پر اس کی گرفتاری کا اور خطوط رجسٹری شدہ اس کے پاس (یعنی جہاں اس کا پتا پایا) بھیجا، مگر سب واپس آئے تو اس صورت میں کہ وہ اپنی بیوی کو نہ تو نان ونفقہ دے اور نہ اس کے پاس آئے اور نہ خط وغیرہ بھیجے اور نہ طلاق دے، اس کا باپ چاہتا ہے کہ اس کا نکاح کہیں دوسری جگہ کر دے، اس میں قرآن وحدیث کے رو سے کیا حکم ہے؟

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۸۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۲۱)

جواب اس صورت میں حاکم سے زید اور ہندہ کے درمیان تفریق کرا کر ہندہ کا کہیں دوسرا نکاح کر دیا جائے، بلوغ المرام میں ہے:

"عن سعيد بن المسيب في الرجل لا يجد ما ينفق علىٰ أهله؟ قال: يفرق بينهما. أخرجه سعيد بن منصور عن سفيان عن أبي الزناد، قال: قلت لسعيد بن المسيب: سنة؟ قال: سنة، وهذا مرسل قوي"[1]

[سعید بن المسیب سے اس آدمی کے متعلق مروی ہے، جو اپنے اہل پر خرچ کرنے کو مال نہیں پاتا ہے، چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان جدائی کرا دی جائے گی۔ اس کو سعید بن منصور نے سفیان سے بیان کیا ہے، انھوں نے ابو الزناد سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے سعید بن المسیب سے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں سنت ہے۔ یہ قوی مرسل ہے]

"سبل السلام شرح بلوغ المرام" (۲/ ۱۲۷) میں ہے:

"ومراسيل سعيد معمول بها، لما عرف من أنه لا يرسل إلا عن ثقة" انتهى

[مراسیلِ سعید معمول بہا ہیں، کیوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ وہ صرف ثقہ ہی سے ارسال کرتے ہیں]

نیز اسی صفحہ میں ہے:

"وقد أخرج الدارقطني والبيهقي من حديث أبي هريرة مرفوعاً بلفظ: قال رسول الله ﷺ في الرجل لا يجد ما ينفق على امرأته قال: «يفرق بينهما»"[2]

[امام دارقطنی اور بیہقی رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ میں روایت کی ہے: رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے متعلق فرمایا، جسے اپنی بیوی پر خرچ کرنے کے لیے مال میسر نہ ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے درمیان جدائی کرا دی جائے]

اگر زید نادار نہ ہو اور لاپتا ہو تو مفقود الخبر کا حکم جاری ہوگا، وہ یہ کہ اس صورت میں حسبِ حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ وحضرت عثمان رضی اللہ عنہ زید اور ہندہ کے درمیان تفریق کرا کر اور عدت کے ایام (چار مہینے دس روز) گزار کر ہندہ کا کہیں دوسرا نکاح کر دیا جائے اور یہی قول امام مالک رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

ہدایہ میں ہے:

"قال مالك رحمه الله: تم له أربع سنين، يفرق القاضي بينه وبين امرأته، وتعتد عدة الوفاة، ثم تتزوج من شاءت لأن عمر رضی اللہ عنہ فعل في الذي استهوته الجن بالمدينة"[3] اھ

---

[1] بلوغ المرام (۱۱۵۸) نیز دیکھیں: سنن سعيد بن منصور (۲/ ۵۵)

[2] سبل السلام للصنعاني (۳/ ۲۲٤)

[3] الهداية (۲/ ۱۸۱)

[امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب چار سال مکمل ہوجائیں تو قاضی اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی کرا دے، وہ عورت عدتِ وفات گزارے اور پھر جس سے چاہے نکاح کر لے، کیوں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے متعلق یہی فیصلہ کیا تھا، جسے مدینے سے جنات اٹھا کر لے گئے تھے]

''نصب الرایة لأحادیث الهدایة'' (۲/ ۱٦٥) میں ہے:

"روی مالك في الموطأ عن یحییٰ بن سعید عن سعید بن المسیب أن عمر بن الخطاب قال: أیما امرأة فقدت زوجها فلم تدر أین هو، فإنها تنتظر أربع سنین، ثم تعتد أربعة أشهر وعشرا، ثم تحل. انتهی، ورواه عبد الرزاق في مصنفه: أخبرنا ابن جریج حدثنا یحییٰ بن سعید به، وزاد: و تنکح إن بدا لها. انتهی، أثر آخر: رواه ابن أبي شیبة في مصنفه: حدثنا عبد الأعلیٰ عن معمر عن الزهري عن سعید بن المسیب أن عمر بن الخطاب و عثمان بن عفان قالا في امرأة المفقود: تربص أربع سنین، و تعتد أربعة أشهر وعشرا" واللّٰه تعالیٰ أعلم

[امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں یحییٰ بن سعید سے روایت کیا ہے، وہ سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں کہ یقیناً عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس عورت کا خاوند گم ہوجائے، حتی کہ اسے کچھ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے تو وہ عورت چار سال تک اس کا انتظار کرے اور پھر چار ماہ دس دن عدت گزار کر حلال ہو جائے۔ عبد الرزاق رحمہ اللہ نے اسے اپنی مصنف میں یوں روایت کیا ہے کہ ہمیں ابن جریج نے خبر دی، انھوں نے کہا کہ یحییٰ بن سعید نے ہمیں یہ بیان کیا۔ انھوں نے اس روایت میں یہ الفاظ زائد بیان کیے: اگر وہ چاہے تو کہیں نکاح کر لے۔ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اپنی مصنف میں ایک اور اثر روایت کیا ہے کہ ہمیں عبد الاعلیٰ نے بیان کیا، انھوں نے معمر سے روایت کیا، انھوں نے زہری سے روایت کیا، انھوں نے سعید بن میسّب سے روایت کیا کہ عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے متعلق فرمایا، جس کا شوہر گم ہوچکا ہو، وہ چار سال تک انتظار کرے اور چار ماہ دس دن عدت گزارے]

کتبہ: محمد عبداللہ (۱۱/ شعبان ۱۳۳۰ھ)

سوال ایک شخص زید عرصہ چار سال سے افریقہ چلا گیا، پیچھے اس جگہ اپنی بیوی منکوحہ کو چھوڑ گیا۔ تین سال تک اس نے دوسو روپیہ بھیج دیا۔ اب سنا جاتا ہے کہ سال بھر سے وہ خمر خواری میں مشغول ہے اور کوئی عورت بھی بغیر نکاح کے رکھے ہوئے ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں وطن کو کبھی جاتا ہی نہیں نہ وہ اب خرچ دیتا ہے اور نہ آباد کرتا ہے نہ چھوڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اس عورت کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب عورت منکوحہ کے شوہر کے ذمہ دو حق ہیں۔ ایک اس کی ذات اور جان میں کہ وہ اس کی حاجت نفسانی کو، جو

درحقیقت ایمانی ہے، پورا کرے۔ دوسرے اس کے مال میں کہ وہ موافق دستور کے اور حسبِ حیثیت اس کو مہر و نان پارچہ وغیرہ ضرورتوں کے لیے خرچ دے۔

پہلے حق کی میعاد شارع نے نہایت چار ماہ تک رکھی ہے، اس کے بعد اس حق کو باوجود استطاعت شوہر کے روکنے پر عورت کو طلاق لینے کا حق عطا کیا ہے۔ جو شخص قسم کھا لے یا بغیر قسم کے اپنی عورت کو یہ کہہ دے کہ میں اس کے پاس نہ جاؤں گا اور سالہا سال اس پر عمل کرے، اس کی عورت چار ماہ تک اس کا انتظار کرے گی اور اس کے بعد وہ طلاق لینے کی مستحق ہوجائے گی۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [سورۂ بقرۃ، رکوع ۲۸]

یعنی جو لوگ اپنی ازواج کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیں، ان کے رجوع کا انتظار چار ماہ تک ہوگا، پھر اگر وہ رجوع کریں تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اگر وہ طلاق کا ارادہ کر لیں تو اللہ اس کو سننے جانے والا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے بارہ اصحاب کا فتویٰ ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد ان لوگوں کو حاکموں کے سامنے حاضر کیا جائے گا، تاکہ وہ عورتوں کی طرف رجوع کریں یا ان کو طلاق دیں۔ یہ منتقی و نیل الاوطار (۶/۱۸۴) میں منقول ہے۔ بغیر قسم کھانے کے بھی جو لوگ گھر میں رہ کر یا سفر اور جنگوں میں شامل ہونے کی وجہ سے گھر سے غیر حاضر رہیں، ان کے حق میں بصورت حاضری وطن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بحکم آیتِ قرآن شریف چوتھے مہینے عورت کی حاجت روائی کا حکم کرنے اور بصورت غیر حاضری یا سفر کے چوتھے مہینے اپنی عورتوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔

تاریخ الخلفاء کے صفحہ (۹۶ و ۹۷) میں روایت ہے:

"أخرج عبد الرزاق في مصنفه عن قتادة والشعبي قال: جاءت عمر رضی اللہ عنہ امرأة فقالت: زوجي يقوم الليل، ويصوم النهار. فقال عمر: لقد أحسنت الثناء على زوجك. فقال كعب: لقد شكت. فقال عمر رضی اللہ عنہ: كيف؟ قال: تزعم أنه ليس لها من زوجها نصيب. قال: فإذا قد فهمت ذلك، فاقض بينهما. فقال: يا أمير المؤمنين: أحل الله له من النساء أربعا، فلها من كل أربعة أيام يوم، ومن كل أربع ليال ليلة،[1] وأخرج عن ابن جريج قال: أخبرني من أصدقه أن عمر رضی اللہ عنہ بينا هو يطوف، سمع امرأة تقول:

تطاول هذا الليل واسود جانبه   وأرقني أن لا خليل ألاعبه
فلو لا حذار الله لا شيئ مثله   لزحزح من هذا السرير وجوانبه

فقال عمر رضی اللہ عنہ: مالك؟ قالت: أَغْرَبْتَ زوجي منذ أشهر، وقد اشتقت إليه. قال: أردت

[1] مصنف عبد الرزاق (۷/۱۴۹)

سوءاً؟ قالت: معاذ الله. قال: فاملكي عليك نفسك، فإنما هو البريد إليه، فبعث إليه، ثم دخل على حفصة فقال: إني سائلك عن أمر قد أهمني فافرجيه عني: كم تشتاق المرأة إلى زوجها؟ فخفضت رأسها واستحيت. قال: فإن الله لا يستحي من الحق فأشارت بيدها ثلاثة أشهر، وإلا فأربعة أشهر، فكتبه عمر رضی اللہ عنہ أن لا تحبس الجيوش فوق أربعة أشهر"[1] انتهى

ایک عورت نے اپنے خاوند کی شکایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کی کہ وہ نماز روزہ میں مشغول رہتا ہے (یعنی اپنی عورت کا حق ادا نہیں کرتا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو چوتھے دن اپنی عورت کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔ پھر آپ طواف کر رہے تھے کہ ایک عورت نے اَشعار میں اپنے خاوند کے فراق پر اشتیاق ظاہر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تجھے کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ آپ نے میرے خاوند کو کئی مہینوں سے باہر بھیجا ہوا ہے، اس لیے میں فراق کی وجہ سے اس کی مشتاق ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تو صبر کر، میں قاصد اس کی طرف بھیجتا ہوں اور آپ حفصہ کے پاس، جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم تھیں، پہنچے اور ان سے مسئلہ دریافت کیا کہ کتنے عرصہ کے بعد عورت اپنے خاوند کا اشتیاق کر سکتی ہے؟ انھوں نے فرمایا: تین ماہ یا نہایت چار ماہ، اس پر حضرت عمر نے سپہ سالاروں کے نام حکم جاری کیا کہ چار ماہ سے اوپر لشکر گھروں سے روکے نہ جائیں۔

ان احکامِ قرآنی کا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صادر فرمائے ہیں، صاف اور صریح مفاد ہے کہ جو شخص زوجہ کے پاس جانے سے انکار کرے اور اس پر مصر رہے تو اس کی زوجہ کو طلاق لینے کا استحقاق ہے کہ وہ حاکمِ وقت کی طرف رجوع کرے اور اس کے حکم سے طلاق لے، اگر خاوند اپنے ظلم پر قائم رہے۔ حق ادا کرنے کی شارع نے کوئی میعاد مقرر نہیں کی ہے اور عورت کو ہر وقت شوہر سے یہ کہنے کا اختیار دیا ہے کہ تو مجھ کو کھانے کو دے یا طلاق دے۔

قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: «امرأتك ممن تعول، تقول: أطعمني وإلا فارقني»[2]

(رواه أحمد والدارقطني و رواه الشيخان في الصحيحين)

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھاری بیوی ان لوگوں میں شامل ہے، جس کی کفالت و پرورش کے تم ذمے دار ہو۔ وہ کہتی ہے: مجھے کھلاؤ یا مجھے (اپنے نکاح سے) الگ کر دو (یعنی طلاق دے دو)]

"وظاهر الأدلة أنه يثبت الفسخ للمرأة بمجرد عدم وجدان الزوج لنفقتها، بحيث يحصل عليها ضرر من ذلك، فقيل: إنه يؤجل الزوج مدة، فروي عن مالك أنه يؤجل شهرا، وعن الشافعية ثلاثة أيام، ولها الفسخ في أول اليوم الرابع، وروي عن حماد أن

[1] مصنف عبد الرزاق (٧/ ١٥١) تاريخ الخلفاء للسيوطي (ص: ١٢٤)

[2] مسند أحمد (٢/ ٥٢٧) سنن الدارقطني (٣/ ٦٩٥) اس حدیث میں "تقول: أطعمني وإلا فارقني" مرفوع نہیں، بلکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ الفاظ ہیں۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٤٠)

الزوج يؤجل سنة، ثم يفسخ قياسا على العنين. فهل تحتاج المرأة إلى الترافع إلى الحاكم؟ روي عن المالكية في وجه لهم أنها ترافعه إلى الحاكم ليجبره على الإنفاق أو يطلق عنه" (نيل الأوطار: ٦/ ٢٦٥)

"وإليه ذهب جمهور العلماء، كما حكاه صاحب البحر عن علي و عمر وأبي هريرة والحسن البصري وسعيد بن المسيب و حماد و ربيعة ومالك و أحمد بن حنبل والشافعي والإمام يحيىٰ. وحكى صاحب الفتح عن الكوفيين أنه يلزم المرأة الصبر، وتتعلق النفقة بذمة الزوج، وحكاه في البحر عن عطاء والزهري والثوري والقاسمية وأبي حنيفة وأحد قولي الشافعي" (نيل الأوطار: ٦/ ٢٦٤)

اس حدیث کو امام احمد و بخاری و مسلم و دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کتاب نیل الاوطار میں کہا ہے کہ ظاہر دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف خاوند کے نادار اور عورت کو خرچ دینے سے ناچار ہو جانے پر عورت کو حق فسخِ نکاح حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ شوہر کو کچھ مہلت بھی دی جائے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ شوہر کو ایک ماہ کی مہلت دی جائے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ تین دن کی مہلت دی جائے، چوتھے دن کے شروع میں عورت کو فسخِ نکاح کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ امام حماد شوہر نامرد کے حکم پر قیاس کر کے ایک سال کی مہلت دیتے ہیں۔ پھر کہا کہ کیا عورت کو فسخِ نکاح کے لیے حاکم کی طرف مرافعہ کی حاجت ہے؟ مالکیہ سے روایت ہے کہ عورت حاکم کی طرف رجوع کرے کہ وہ اس کو خرچ دینے پر مجبور کرے یا اس سے طلاق دلوائے۔ یہ حکم استحقاقِ فسخِ نکاح بوجہ ناداری و ناچاری شوہر اصحاب نبویہ میں حضرت عمر فاروق و علی مرتضی و حضرت ابوہریرہ سے اور تابعین میں حسن بصری و سعید بن مسیّب سے اور ائمہ میں حماد و ربیعہ و مالک، امام شافعی وغیرہ سے منقول ہے اور ائمہ کوفہ وغیرہ کہتے ہیں کہ عورت کو صبر کرنا لازم ہے، اسے قرض لے کر گزارا کرنا چاہیے، جس کا ادا کرنا شوہر کے ذمہ ہوگا۔

یہ اختلاف بعض ائمہ کا اس صورت میں ہے کہ شوہر خرچ دینے سے عاجز و ناچار و نادار ہو جائے اور اگر کوئی شوہر باوجود استطاعت کے عورت کو خرچ نہ دے اور دوسری عورت سے جائز یا ناجائز تعلق پیدا کر کے اپنی عورت منکوحہ کو محض ضرر رسانی کی نیت سے معلق کر رکھے اور خرچ نہ دے تو ایسے شوہر سے عورت کو طلاق لینے کے استحقاق میں کسی امامِ مذہب کا اختلاف ثابت اور معلوم نہیں ہے اور قرآن شریف اس ضرر رساں کو ظالم ٹھہراتا ہے اور عورت کا استحقاقِ طلاق ثابت کرتا ہے۔ ایک آیتِ قرآن میں ارشاد ہے کہ مردوں کو عورتوں پر ایک تو قدرتی فضیلت کی رو سے حکومت کا حق حاصل ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [سورة نساء: ٣٤]

[مرد عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی]

دوسرے اس وجہ سے کہ وہ مال (مہر و نفقہ) خرچ کرتے ہیں، جس سے صاف ثابت ہے کہ اگر کوئی شوہر عورت کو باوجود وسعتِ مال مہر و نفقہ نہ دے تو اس کا حقِ حکومت باقی نہیں رہتا ہے اور عورت طلاق لینے کی مستحق ہو جاتی ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدت گزرنے لگے تو تم ان کو دستور کے موافق مہر و خرچ دے کر روک لو یا دستور کے مطابق (اگر ان کو خرچ و مہر نہ دے سکو) اس کو چھوڑ دو اور ضرر رسانی کے لیے نہ تو خرچ دو نہ خلاصی کرو، مت روکو، تاکہ ان پر تعدی کرو۔

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ [سورۂ بقرۃ، رکوع ۲۹]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے، سو بلاشبہہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا]

اس آیت کا صریح مفاد یہ ہے کہ خرچ نہ دینے کے ساتھ اس کو نکاح میں پھنسا رکھنا ظلم ہے، جس سے خلاصی پانے اور طلاق لینے کا عورتوں کو حق حاصل ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مطلقہ عورتوں کو اگر پھر نکاح میں لانا چاہو تو جہاں خود رہتے ہو، وہاں ان کو بساؤ اور ان کو ضرر نہ پہنچاؤ، تاکہ اس پر تمھاری طرف سے تنگی ہو (نہ کھانے کو دو، نہ دوسرے شخص سے نکاح کرنے دو)۔

﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ﴾ [سورۂ طلاق: ٦]

[انھیں وہاں سے رہایش دو، جہاں تم رہتے ہو، اپنی طاقت کے مطابق اور انھیں اس لیے تکلیف نہ دو کہ ان پر تنگی کرو]

یہ آیت بھی صاف مشعر و مثبت ہے کہ نکاح میں لانا اس صورت میں جائز ہے کہ عورت کو اس کا حقِ سکنیٰ و نفقہ شوہر ادا کرے۔ اگر ایسا نہ کرے تو عورت کو طلاق لینے کا استحقاق حاصل ہے۔ انھی قرآنی آیات سے استنباط کر کے فاروق اکبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سپہ سالاروں کے نام فرمان جاری کیا تھا کہ جو لوگ اپنی عورتوں سے غائب ہیں، وہ یا تو ان کو خرچ بھیجیں یا ان کو طلاق دیں اور جس قدر عرصہ انھوں نے اپنی عورتوں کو نکاح میں رکھا ہے، اس قدر کا خرچ بھی بھیج دیں۔

"عن عمر عند الشافعي و عبد الرزاق و ابن المنذر أنه كتب إلى أمراء الأجناد في رجال غابوا عن نسائهم إما أن ينفقوا وإما أن يطلقوا، ويبعثوا نفقة ما حبسوا"

(نيل الأوطار، ص: ٢٦٣)

[امام شافعی، عبد الرزاق اور ابن المنذر رحمہم اللہ عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے لشکروں کے امرا کو ان مردوں کے بارے میں خط لکھا، جو اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ کر گئے ہوئے ہیں کہ یا تو وہ ان کو نفقہ

دیں یا پھر ان کو طلاق دے دیں اور ساتھ اس مدت کا بھی نفقہ دیں، جتنی مدت انھوں نے اپنی بیویوں کو روک کر رکھا ہے]

اس حکم فاروقی کا (جو آیاتِ ثلاثہ مذکورہ کے عین مطابق اور ان سے مستنبط ہے) خلاف کسی امام یا مجتہد سے مروی نہیں کہ جو لوگ باوجود وسعت و استطاعت کے اپنی عورتوں کو نفقہ نہ دیں اور اس سے انکار کریں اور اس پر مصر رہیں، ان کی عورتیں ان کے قیدِ نکاح میں بیٹھی رہیں اور وہ حاکمِ وقت سے طلاق کی درخواست نہ کریں، لہٰذا اس عورت کا، جس کے بارے میں سوال ہے، یہ حق ہے کہ وہ فتویٰ کی دستاویز سے حکامِ وقت سے درخواست کرے کہ وہ اس کے شوہر کو اس کے حقوق جانی و مالی ادا کرنے پر مجبور کریں یا اس کو طلاق دینے پر مجبور کریں۔ وہ اگر طلاق نہ دے تو حاکمِ وقت خود اس کی طرف سے عورت کو طلاق دے دے اور بعد عدت عورت کو دوسرے شوہر سے نکاح کرنے کی اجازت دے۔

صورت مندرجہ سوال میں عورت مذکورہ حاکمِ وقت کے یہاں اس مضمون کا استغاثہ کرے کہ میرا شوہر نہ میرے حقوق ادا کرتا ہے اور نہ مجھے چھوڑتا ہے، لہٰذا میرے شوہر کو حکم دیا جائے کہ وہ یا تو میرے حقوق ادا کرے یا مجھے طلاق دے دے۔ اگر وہ ان دو امروں میں سے کوئی امر بجا نہ لائے تو حاکمِ وقت خود بقائم مقامی میرے شوہر کے مجھے طلاق دے دے۔ اس کے دلائل مجیب کے مذکور بالا جواب میں بما لا مزید علیہ مرقوم ہیں۔ فمن شاء فليرجع إليها. واللّٰه تعالىٰ أعلم

كتبه: محمد عبد الله الغازيفوري (١٣/ ذی الحجه ١٣٣٤ھ)

سوال زید اپنی زوجہ ہندہ کو عرصہ چار سال سے چھوڑ کر ملک دکن کی طرف چلا گیا اور اسی اطراف میں ہے اور اس درمیان میں خبر گیری نان و نفقہ کی نہ لی، اس درمیان میں ہندہ سے زنا بھی سرزد ہوا، یہاں تک کہ ایک لڑکا زنا سے پیدا ہوا۔ اب ہندہ نے بسبب نہ پوری ہونے حاجت اور نہ ملنے نان نفقہ کے عمرو سے نکاح کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نکاح اول فسخ نہیں ہوا اور نہ عدت بیتی، اس وجہ سے نکاح ثانی جائز نہیں۔ آیا شرعاً نکاح ثانی جائز ہوا یا نہیں؟ درصورت عدمِ جواز کے ہندہ کو کیا کرنا چاہیے؟ آیا فسخ کرالے اور فسخ کون شخص کرے اور فسخ کرنے والا کن الفاظوں سے کہے اور بعد فسخ کے عدت بیٹھے یا نہیں؟ جملہ مضمون کو خیال فرما کر جواب مع مواہیر مرحمت ہو۔

جواب اس صورت میں ہندہ کا نکاح ثانی جائز نہیں ہوا، کیونکہ ہندہ بوقتِ نکاحِ ثانی شوہر دار عورت تھی اور شوہر دار عورت کا نکاح حرام ہے: ﴿ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع ٤] یعنی شوہر دار عورتیں تم پر حرام کی گئیں اور جب نکاح ثانی جائز نہیں ہوا تو ہندہ شوہر اول کے نکاح میں علی حالہا باقی رہی۔ اب اس کو اختیار ہے کہ معلق رہے یا بذریعہ حاکمِ وقت و سردارانِ شہر کے جو دونوں کے خیر خواہ ہوں، شوہر سے اپنا حق طلب کرے۔ اگر اس تشدد پر اس کی حق رسی ہوئی تو بہتر، ورنہ شوہر سے طلاق طلب کرے۔ اگر شوہر طلاق نہ دے تو سرداروں کو مناسب ہے کہ ان دونوں میں تفریق کر دیں اور صورت تفریق کی یہ ہے کہ عورت سے کہہ دیں کہ تیرا گزران اس کے ساتھ نہیں ہوسکتا، اس لیے ہم لوگ تیرا نکاح فسخ کر دیتے ہیں۔ پس جب سرداروں نے نکاح فسخ کر دیا تو عورت پر لازم ہے کہ تین حیض

اگر حیض آتا ہو، ورنہ تین ماہ عدت گزارے۔

"عن عائشة رضي الله عنها أمرت بريرة أن تعتد بثلاث حيض"[1] (أخرجه ابن ماجه)

[عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بلاشبہہ بریرہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا گیا کہ وہ تین حیض عدت گزارے]

قال الحافظ في فتح الباري: حديث ابن ماجه على شرط الشيخين، بل هو في أعلى درجات الصحة.[2] انتهى

[حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ابن ماجہ کی حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر ہے، بلکہ وہ صحت کے اعلا درجات پر فائز ہے]

بعد اس کے اگر عورت چاہے تو کسی سے نکاح کرا لے۔

﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾ [سورۂ نساء، رکوع:٦]

[اور اگر ان دونوں کے درمیان مخالفت سے ڈرو تو ایک منصف مرد کے گھر والوں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو، اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا]

«اليد العليا خير من اليد السفلىٰ، ويبدأ أحدكم بمن يعول» تقول المرأة: أطعمني أو طلقني.[3] رواه الدارقطني، وإسناده حسن عن أبي هريرة مرفوعاً.

[اوپر والا ہاتھ (خرچ کرنے والا) نیچے والے ہاتھ (مانگنے والے) سے بہتر ہے۔ تم میں سے کوئی (خرچ کی) ابتدا اس سے کرے جس کی کفالت کا وہ ذمے دار ہے۔ اس کی بیوی کہتی ہے: مجھے کھانے پینے کو دو، نہیں تو مجھے طلاق دے دو]

"وعن عمر رضي الله عنه أنه كتب إلى أمراء الأجناد في رجال غابوا عن نسائهم أن يأخذوهم بأن ينفقوا أو يطلقوا، فإن طلقوا بعثوا نفقة ما حبسوا"[4]

(أخرجه الشافعي ثم البيهقي بإسناد حسن، بلوغ المرام، مطبوعه فاروقی دهلی، ص: ٧٦)

[عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے لشکروں کے امرا کو ان لوگوں کے بارے میں خط لکھا جو اپنی بیویوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہوئے ہیں کہ ان کو پکڑ کر کہیں کہ وہ اپنی بیویوں کو نفقہ بھیجیں یا ان کو طلاق دے دیں۔ اگر

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٧٧)
[2] فتح الباري (٩/ ٤٠٥)
[3] سنن الدارقطني (٣/ ٢٩٥)
[4] مسند الشافعي (١٢٧٤) سنن البيهقي (٧/ ٤٦٩)

وہ ان کو طلاق دیں تو جتنی دیر انھوں نے ان کو روکا ہے، اس مدت کا بھی نفقہ دیں]

﴿وَالّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِيْ لَمْ يَحِضْنَ﴾

[سورۂ طلاق رکوع ۱] واللہ أعلم بالصواب

[اور وہ عورتیں جو تمھاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں، اگر تم شک کرو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور ان کی بھی جنھیں حیض نہیں آیا]

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ) صح الجواب، واللہ أعلم بالصواب، کتبہ أبو الفیاض محمد عبدالقادر أعظم گڑھی مؤی.

سوال ایک عورت کا شوہر نکاح کے بعد کہیں چلا گیا، اب اس کو گئے ہوئے دسواں برس ہے اور جب سے گیا ہے، کچھ اس کا پتا نہیں ہے کہ کہاں ہے؟ مر گیا یا جیتا ہے؟ اس عورت نے بشکل تمام اب تک اس کا انتظار کیا اور اب انتظار نہیں کر سکتی، اس صورت میں اس کا نکاح دوسرے کسی سے کر دینا درست ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں اس عورت کا نکاح دوسرے شخص سے کر دینا درست ہے، لیکن اس عورت کو چاہیے کہ اولاً اس مقدمہ کو اپنے سردار کے پاس پیش کرے اور سردار اس عورت کا بیان سن کر اور اس بیان کی تحقیق کر کے اس کے شوہر کے موت کا حکم دے اور اس عورت کو حکم دے کہ چار مہینے دس روز عدت بیٹھے، بعد اس کے اس کا ولی دوسرے سے نکاح کر دے۔ موطا امام مالک رحمہ اللہ میں ہے:

"مالك عن يحيیٰ بن سعيد عن سعيد بن المسيب عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ: أيما امرأة فقدت زوجها فلم تدر أين هو؟ فإنها تنتظر أربع سنين، ثم تعتد أربعة أشهر وعشرا، ثم تحل"[1] انتهى

[امام مالک رحمہ اللہ یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں، وہ سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں، وہ عمر بن خطاب سے بیان کرتے ہیں کہ جس عورت کا خاوند گم ہو جائے اور اسے کچھ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں چلا گیا ہے، تو وہ چار سال اس کا انتظار کرے، پھر چار ماہ دس دن عدت گزار کر حلال ہو جائے]

"واتفق على ذلك خمسة من الصحابة، منهم الخليفة الراشد الناطق بالصواب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، والخليفة الراشد ذو النورين عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ كذا قاله الحافظ في فتح الباري، لأنه منع حقها بالغيبة فينوب القاضي منابه في التسريح بإحسان، وهو مؤيد بقوله تعالیٰ: ﴿فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ٢٢٩] وقوله تعالیٰ: ﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ [البقرة: ٢٣١]

[1] موطأ الإمام مالك (٢/ ٥٧٥)

وأيضاً يؤيده تأجيل العنين سنة مع أنه ينفق ويكسو ويتعهد بما لا بد منه مع بقاء الاحتمال على صحته بعد السنة، وقدرته على الجماع، والغائب لا يعلم حاله، ولا ينفق ولا يتعهد و لا يقدر بالفعل على أمر فكيف لا يفتىٰ بعد أربع سنين بنكاح جديد؟" (التعليق المغني على سنن الدارقطني، ص:٤٢١) والله أعلم بالصواب.

[پانچ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر اتفاق کیا ہے: ان میں سے ایک خلیفہ راشد ناطق بالصواب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور خلیفہ راشد ذوالنورین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری میں یہی کہا ہے، کیونکہ اس (گم شدہ خاوند) نے غیب رہ کر اس (عورت) کا حق روکا ہوا ہے، لہٰذا قاضی اس (خاوند) کا قائم مقام بن کر اس عورت کو اچھے انداز میں رخصت کر دے گا۔ اس موقف کی تایید اس فرمانِ باری تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے: ﴿فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے] نیز اس کا فرمان ہے: ﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ [تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو] اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نامرد کی مدتِ مہلت ایک سال مقرر کی گئی ہے، باوجود اس کے کہ وہ نان ونفقہ اور لباس دیتا ہے، اس پر جو ضروری ہے، اس کے دینے کا عہد کرتا ہے اور سال کے بعد اس کے صحت یاب ہونے اور جماع پر قادر ہونے کا احتمال بھی ہوتا ہے، جب کہ گم شدہ آدمی کے احوال کا کچھ علم نہیں ہوتا، نہ وہ نان ونفقہ دیتا ہے نہ کوئی عہد و معاہدہ کرتا ہے اور بالفعل کسی معاملے کی قدرت نہیں رکھتا تو آخر چار سال کے بعد (اس کی بیوی کو) نئے نکاح کا فتویٰ کیوں نہ دیا جائے؟]

كتبه: محمد عبد الله. صح الجواب. أبو الفياض محمد عبد القادر اعظم گڑھی مؤی.

الجواب صحيح. كتبه أبو العلىٰ عبد الرحمن المباركفوري. (مہر مدرسہ)

شوہر کے پاگل ہو جانے کی صورت میں بیوی کیا کرے؟

سوال جناب مولانا مولوی حافظ عبداللہ صاحب۔ السلام علیکم۔ عرض خدمت یہ ہے کہ حال انتقال جناب منشی معین الدین صاحب مرحوم کا آپ کو خوب معلوم ہوگا اور یہ بھی سنا ہوگا کہ اپنی لڑکی کی شادی مقام صاحب گنج میں کیا تھا۔ شادی کے ہفتہ عشرہ بعد خود قضا کیا، اب ان کے دونوں لڑکے اور یہ لڑکی جس کی شادی کیا، ہمارے ساتھ ہیں اور میں ان لڑکوں کا حقیقی ماموں ہوں۔ مرضی مالک ایسی ہوئی کہ شادی کے دو مہینہ بعد داماد معین الدین مرحوم کا یعنی شوہر اس لڑکی کا پاگل ہو گیا اور آج تک صحت نہیں ہے۔

چنانچہ بانکی پور پاگل خانہ میں ایک برس سے زیادہ ہوتا ہے کہ واسطے علاج کے داخل کیا گیا ہے، مگر ہنوز کچھ صورت افاقہ نہیں ہے اور نہ امید معلوم ہوتی ہے اور لڑکی بالغ ہوگئی ہے اور سن پندرہ تخمیناً برس سے زیادہ کا ہے اور لڑکی کا سسر جو کچھ زیور بدن میں لڑکی کے تھا، وہ سب علاوہ اس کے اسباب کے مقبوضہ اس کا وقت آنے کے روک رکھا، اس شک پر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس لڑکی کی دوسری شادی کر دیں اور یہاں میکہ کے لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اس بارے میں جناب حافظ صاحب سے مسئلہ دریافت کرو کہ اس لڑکی کا دوسرا عقد ہوسکتا ہے یا نہیں اور ہم کو کب تک انتظار صحت کا اس کے کرنا چاہیے؟

اس واسطے عرض خدمت یہ ہے کہ حضور اس بات کو خوب سمجھ کر اور تحقیق فرما کر تحریر فرمایئے کہ ایسی حالت میں دوسرا عقد ہوسکتا ہے اور میں کیا کروں؟ جیسا تحریر فرمائیں گے، ویسا عمل کروں گا۔ مقام آرہ، محلّہ ملکی کتھاری بولن میاں۔

جواب ایسی حالت میں حاکم وقت کے حضور میں منجانب لڑکی درخواست کی جائے کہ اس کا شوہر اس قدر مدت سے پاگل ہوگیا ہے اور آج تک صحت نہیں ہے اور ایک برس سے زیادہ ہوتا ہے کہ واسطے علاج کے بانکی پور پاگل خانہ میں داخل کیا گیا ہے، مگر ہنوز کچھ صورت افاقہ نہیں ہے اور نہ امید معلوم ہوتی ہے، لہٰذا حضور میں عرضی ہذا گزران کر امیدوار ہوں کہ حسبِ فتویٰ شرع شریف منسلکہ عرضی ہذا میرے اور میرے شوہر فلاں ولد فلاں کے درمیان تفریق کر دی جائے کہ بعد تفریق دوسرا عقد کرلوں، جس سے میرا گزر ہو سکے۔ زاد المعاد (۲/۱۹۳ مطبوعہ کانپور) میں ہے:

"عن ابن سيرين أن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ أجل مجنونا سنة فإن أفاق وإلا فرق بينه وبين امرأته"[1] اھ واللہ تعالیٰ أعلم

[ابن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ بلاشبہہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجنون آدمی کے لیے ایک سال کی مدت مقرر کی۔ اگر اس کو اس دوران افاقہ ہوجائے تو درست، ورنہ (مجنون شوہر اور اس کی بیوی) دونوں کے درمیان جدائی کرا دی جائے] كتبه: محمد عبد الله (۹/ جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ)

کیا شوہر کی بدچلنی کا علم ہونے پر نکاح ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال زید نے اپنی بیٹی صغیرہ مسماۃ ہندہ کا نکاح بکر سے کر دیا اور وقت نکاح کے زید بکر کو صالح جانتا تھا اور زید خود شراب خوار ہے نہ اس کے کنبے والے۔ جب ہندہ بالغہ ہوئی تو اس کو بکر کے فسق و فجور و بدچلنی کا حال معلوم ہوا، تب سے ہندہ برابر اس نکاح سے ناراضی ظاہر کرتی ہے اور بکر کے یہاں جانے سے انکار کرتی ہے، اس صورت میں ہندہ کا نکاح فقہ حنفیہ کے رو سے صحیح رہا یا باطل ہوگیا؟

جواب اس صورت میں فقہ حنفیہ کے رو سے نکاح باطل ہوگیا، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری مطبوعہ ہوگلی ۱۲۵۸ ہجری (۱/ ۴۱۱، سطر ۴) میں ہے:

[1] زاد المعاد (٥/ ١٦٣)

"رجل زوج ابنته الصغيرة من رجل على ظن أنه صالح لا يشرب الخمر فوجده الأب شريبا مدمنا، وكبرت الابنة، فقالت: لا أرضیٰ بالنکاح، إن لم يعرف أبوها بشرب، وغلبة أهل بيته الصالحون، فالنكاح باطل أي يبطل، وهذه المسئلة بالاتفاق، كذا في الذخيرة"

''ایک شخص نے اپنی بیٹی صغیرہ کا نکاح ایک شخص سے، اس گمان پر کہ وہ شخص نیک چلن ہے اور شراب نہیں پیتا ہے، کر دیا، بعد میں اس لڑکی کے باپ نے اس شخص کو (جس سے اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا تھا) شرابی پایا۔ اب لڑکی بڑی ہوئی اور صاف اس نے کہا کہ میں اس نکاح سے راضی نہیں ہوں تو اگر باپ لڑکی کا نشہ خواری میں مشہور نہ تھا اور اس کے گھر والے اکثر نیک چلن ہیں، پس ایسی صورت میں نکاح باطل ہو جاتا ہے اور یہ مسئلہ متفق علیہ فقہا حنفیہ کا ہے، جیسا کہ ذخیرہ میں ہے۔''

حاشیہ درمختار عرف شامی "باب الكفو" میں ہے

"إذا كان الأب صالحا، وظن الزوج صالحا فلا يصح. قال في البزازية: رجل زوج بنته من رجل ظنه مصلحا لا يشرب مسكراً فإذا هو مدمن، فقالت بعد الكبر: لا أرضیٰ بالنکاح، إن لم يكن أبوها يشرب المسكر، ولا عرف به، وغلبة أهل بيتها مصلحون، فالنكاح باطل بالاتفاق"[1] انتهی

''ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح ایک شخص سے اس گمان پر کر دیا کہ وہ شخص نشہ خوار نہیں ہے اور نیک چلن ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بڑا نشہ خوار ہے۔ بعد بڑے ہونے، یعنی بالغ ہونے کے خود اس لڑکی نے کہا کہ میں نکاح سے راضی نہیں ہوں، اس صورت میں اگر باپ اس لڑکی کا نشہ خوار نہیں ہے اور نہ اس امر میں مشہور ہے اور لڑکی کے گھر والے بھی اکثر نیک چلن ہیں تو یہ نکاح باطل ہے باتفاق فقہائے حنفیہ۔''

ان روایتوں سے کتبِ فقہ حنفیہ کے صاف صاف نکاح کے باطل ہونے کا حکم نکلتا ہے، دونوں میں تفریق ضروری ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبه: محمد عبدالله. الجواب صحيح. عبد الحكيم، عفا الله عنه صادقپوري. لله در من أجاب. أبو المجد عبد الصمد البهاري، غفرله ولوالديه. المجيب مصيب. على حيدر عفا الله عنه لكهنوي. أصاب من أجاب. أبو محمد إبراهيم، والله تعالیٰ أعلم.

مفقود الخبر شوہر کا حکم:

سوال مسماۃ ہندہ کا نکاح ورثائے ہندہ نے مسمی زید سے کر دیا۔ بعد گزرنے دو ماہ نکاح کے مسمی زید مفقود الخبر ہوگیا، جس کو عرصہ دس برس کا گزر گیا۔ ورثائے ہندہ نے مسمی زید کو بہت تلاش کیا، کچھ پتا نہیں ملتا اور مسماۃ ہندہ جوان

[1] رد المحتار (۳/ ۸۹)

عورت ہے، اس کے گھر کی کوئی صورت نہیں ہے اور ورثائے ہندہ حنفی المذہب ہیں۔ دوسرے شخص سے نکاح از روئے مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے درست ہوگا یا نہیں؟

جواب بے شک اگر از روئے مذہب امام مالک رحمہ اللہ کے مسماۃ ہندہ کا نکاح کرایا جائے تو ازروئے مذہب حنفی کے درست ہوگا، کیونکہ یہاں ضرورت ہے اور حاکم مالکی بھی نہیں ہیں، جس کے یہاں مقدمہ لے جائیں۔ ایسی حالت میں امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب پر فتویٰ دینا حنفی مذہب میں جائز ہے، جیسا کہ جب کسی عورت کو تین دن حیض اگر موقوف ہوجائے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی عدت تین حیض ہے، چاہے جتنے دن اس میں گزریں اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نو مہینے گزرنے سے اس کی عدت پوری ہوجاتی ہے، مگر فتوی حنفی مذہب میں ایسی صورت میں امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب پر ہے۔ "رد المحتار" میں ہے:

"ذكر ابن وهبان في منظومته أنه لو أفتى بقول مالك رحمه الله في موضع الضرورة يجوز، واعترضه شارحها ابن الشحنه بأنه لا ضرورة للحنفي إلى ذلك، لأن ذلك خلاف مذهبنا فحذفه أي حذف قوله "خلافا لمالك" أولىٰ. وقال في الدر المنتقى: ليس بأولىٰ، لقول القهستاني: لو أفتى به في موضع الضرورة لا بأس به على ما ظن. انتهى قلت: ونظير هذه المسئلة عدة ممتدة الطهر التي بلغت برؤية الدم ثلاثة أيام، امتد طهرها، فإنها تبقىٰ في العدة إلى أن تحيض ثلاث حيض، وعند مالك تنقضي عدتها بتسعة أشهر، وقد قال في البزازية: الفتوى في زماننا على قول مالك رحمه الله، وقال الزاهدي: كان بعض أصحابنا يفتون به للضرورة، واعترضه في النهر و غيره بأنه لا داعي إلى الإفتاء بمذهب الغير لإمكان الترافع إلى حاكم مالكي يحكم بمذهبه، وعلى ذلك مشىٰ ابن وهبان في منظومته هناك، لكن قدمنا أن الكلام عند تحقق الضرورة حيث لم يوجد حاكم مالكي" (رد المحتار، باب المفقود: ٤/ ٤٥٦)

[ابن وہبان نے اپنے منظومہ میں ذکر کیا ہے کہ اگر وہ (قاضی و مفتی وغیرہ) بہ وقتِ ضرورت امام مالک رحمہ اللہ کے قول کے مطابق فتویٰ دے تو یہ جائز ہوگا۔ ابن الشحنہ اس کے شارح نے اس پر اعتراض کیا کہ حنفی کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے، لہٰذا اس کو حذف کرنا یعنی اس کے اس قول: "خلافا لمالك" کو حذف کرنا اولیٰ ہے۔ الدر المنتقی کے مولف نے کہا: قہستانی کے مندرجہ ذیل قول کی وجہ سے یہ اولیٰ نہیں ہے: اگر وہ ضرورت کے وقت اس کے مطابق فتویٰ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ اس کا یہ گمان ہے۔

میں کہتا ہوں: اس مسئلے کی نظیر ایسی عورت کی عدت ہے جس کا طہر لمبا ہوجائے جو تین دن خونِ حیض

دیکھ کر بالغ ہو (پھر اس کا حیض موقوف ہوجائے اور) اس کا طہر لمبا ہوجائے تو وہ عورت (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک) تین حیض آنے تک عدت میں ہی رہے گی، جب کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نو ماہ گزرنے سے اس کی عدت پوری ہوجائے گی۔ البزازیہ کے مصنف نے کہا ہے: ہمارے اس دور میں امام مالک رحمہ اللہ کے قول کے مطابق فتویٰ دیا جاتا ہے اور زاہدی نے کہا: ہمارے بعض اصحاب بوقتِ ضرورت اس کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ النہر وغیرہ میں اس پر اعتراض کیا ہے: کسی دوسرے کے مذہب کے مطابق فتویٰ دینے کا کوئی سبب نہیں ہے، کیوں کہ یہاں پر اس بات کا امکان موجود ہے کہ حاکمِ مالکی کے پاس مقدمہ لے جایا جائے اور وہ اپنے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے۔ اسی بنا پر ابن وہبان نے اپنی منظومہ میں یہ موقف اختیار کیا ہے، لیکن ہم پہلے یہ عرض کر چکے ہیں کہ ہیں یہ اس صورت کے متعلق بات ہے، جب ضرورت ثابت ہوجائے اور حاکمِ مالکی میسر نہ ہو]

كتبه: أضعف عباد الرحمن: محمد سليمان، والله أعلم بالصواب. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. محمد عبدالرحمن المباركفوري. مہر مدرسہ (۲۹/نومبر ۹۳ء)

اگر خاوند شروطِ نکاح کی پاسداری نہ کرے؟

سوال ① عمرو نے نکاح اپنی دختر ہندہ کا بشراکت مرضی دختر خود زید کے ساتھ مشروط بشرائطِ ذیل کیا: ادائے دین مہر ۵۰۰، و نان و نفقہ سہ روپیہ ماہانہ، و اصلاح حال و مآل، و عدمِ تصرف بمالِ زوجہ و تراضی اور در رخصتی اور نکاح مبنی انھیں شرائط پر ہے۔ زید نے بعد نکاح ایفائے شرط نہیں کیا، اس کی نسبت کیا حکم ہے؟

② مسماۃ ہندہ اپنے شوہر زید سے ناراض ہے اور وہ ناراضی ترقی پا کر عداوت ہوگئی ہے اور عداوت ایسی کہ تمام عمر دور ہونی غیر ممکن، بموجبِ شریعت ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

③ مسماۃ ہندہ اپنے شوہر سے کئی وجہ سے قطع تعلق چاہتی ہے اور شوہر طلاق نہیں دیتا، پس از روئے قرآن و حدیث ان کے مابین کس طرح فیصلہ کرنا چاہیے؟

جواب ① ایفا ان شرطوں کا زید پر واجب ہے۔ مشکوۃ المصابیح (ص: ۲۶۳ مطبوعہ انصاری) میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"قال: قال رسول الله ﷺ: «أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج»[1] (متفق عليه)

[عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جن شروط کے ساتھ تم نے شرم گاہ کو حلال بنایا ہے، وہ (شروط) زیادہ حق رکھتی ہیں کہ انھیں پورا کیا جائے]

اگر اپنی بی بی کو نان و نفقہ نہیں دے سکتا ہو اور عورت بے چاری تکلیف میں ہو تو تفریق جائز ہے۔ "دلیل

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۵۷۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۴۱۸)

الطالب علىٰ أرجح المطالب" (ص: ٤٧٠) طلب کر کے دیکھیے:

"وقد ثبت في الفسخ لعدم النفقة ما أخرجه الدارقطني والبيهقي من حديث أبي هريرة مرفوعاً، قال: قال رسول اللهﷺ في الرجل لا يجد ما ينفق على امرأته: «يفرق بينهما»[1] أخرجه الشافعي و عبد الرزاق عن سعيد بن المسيب، وقد سأله سائل عن ذلك، فقال: يفرق بينهما، فقيل له: سنة؟ فقال: نعم، سنة"

[عدمِ نفقہ کی وجہ سے نکاح کے فسخ کیے جانے کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے، جسے امام دارقطنی اور بیہقی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی کے متعلق فرمایا، جس کے پاس اپنی بیوی پر خرچ کرنے کے لیے مال نہیں ہے: "ان دونوں کے درمیان جدائی کر دی جائے۔" اس حدیث کو امام شافعی اور عبدالرزاق رحمہما اللہ نے سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے۔ کسی آدمی نے ان سے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ان دونوں کے درمیان جدائی کرا دی جائے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ سنت ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں یہ سنت ہے]

بلوغ المرام (ص: ١٣٧) میں بھی ہے مثل اس کے، ان کے علاوہ اور بھی اَدلہ ہیں، جن کی تفصیل مخافتِ تطویل سے نہیں کی گئی۔ والله المستعان.

(٢)، (٣) ایسی صورت میں ہندہ اپنے نفس کا فدیہ دے کر زوج سے خلع کرا لے اور بعد خلع کے ایک حیض عدت میں رہ کر جی چاہے تو دوسرا نکاح کر لے۔ اللہ سبحانہ فرماتا ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾

[سورة بقرة: ركوع: ٢٩]

[پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں، جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے]

و عن ابن عباس قال: جاءت امرأة ثابت بن قيس بن شماس إلى رسول اللهﷺ فقالت: يا رسول الله! إني ما أعتب عليه في خلق ولا دين، ولكني أكره الكفر في الإسلام. فقال رسول اللهﷺ: «أتردين عليه حديقته؟» قالت: نعم، فقال رسول اللهﷺ: «اقبل الحديقة، وطلقها تطليقة»[2] (رواه البخاري)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں اس (اپنے خاوند) کے دین اور اخلاق (کی کسی

---

(1) مسند الشافعي (١٢٧٣)

(2) صحيح البخاري [illegible] (٤٩٧١) [illegible] (٣٤٦٣)

خرابی) کی وجہ سے ناراض نہیں، لیکن مجھے مسلمان ہوتے ہوئے (خاوند کی) ناشکری کرنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اسے اس کا باغ واپس دے دو گی؟" اس نے کہا: جی ہاں، رسول اللہ ﷺ نے (ثابت کو) حکم دیا کہ اس (اپنی بیوی) سے باغ واپس لے لیں اور اسے طلاق دے دیں]

وفي رواية عند ابن ماجه: "فأمره رسول اللهﷺ أن يأخذ منها حديقته ولا يزداد"[1]

[ابن ماجہ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ان (ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ) کو حکم دیا کہ وہ اس (اپنی بیوی) سے باغ واپس لے لیں اور زائد کچھ نہ لیں]

وفي رواية النسائي والترمذي: "فأمرها رسول اللهﷺ أن تربص حيضة واحدة"[2]

[سنن النسائی اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے (ثابت بن قیس کی بیوی کو) حکم دیا کہ وہ ایک حیض اپنے آپ کو انتظار میں رکھے]

اگر اس طرح پر شوہر نہ راضی ہو تو زن و شوہر کے آدمی مل کر اس بارے میں حکم دیں۔ اللہ سبحانہ فرماتا ہے، سورۂ نساء رکوع (۵) پارہ "والمحصنت" میں:

﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾ [النساء: ٣٥]

[اگر ان دونوں کے درمیان مخالفت سے ڈرو تو ایک منصف مرد کے گھر والوں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو، اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا]

بدعتی اور مشرک خاوند کی موحد بیوی کیا کرے؟

سوال ہندہ موحدہ ہے اور شوہر اس کا فاسق اور فاجر ہے، علاوہ اس کے بدعتی اور مشرک ہوگیا ہے، پس ہندہ کو طلاق دلوائی جائے یا کیا کیا جائے؟

جواب اگر وہ کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قائل ہے اور اپنے کو زمرۂ مومنین میں گنتا ہے تو نکاح فسخ نہیں ہوگا، اگرچہ کبائر یا ایسے فعلِ شنیعہ کا مرتکب ہو، جس کو علمائے مدققین شرک بتاتے ہوں، اس کا حساب خدا کے یہاں ہوگا، چنانچہ شرح مواقف (ص: ۷۲۶ نول کشوری) میں ہے:

"المقصد الخامس في أن المخالف من أهل الحق هل يكفر أم لا؟ جمهور المتكلمين والفقهاء على أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة، الخ"

[پانچواں مقصد اس بارے میں ہے کہ کیا اہلِ حق سے مخالفت رکھنے والے کو کافر کہا جائے گا یا نہیں؟ جمہور

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٩٧)

متکلمین اور فقہا اس موقف پر ہیں کہ اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا...الخ]

مسند امام اعظم للحصفکی مع شرح ملا علی قاری (ص: ۱۹۵ و ۱۹۶) میں ہے:

"وبه أي بسند أبي حنيفة عن عبد الكريم بن أبي المخارق عن طاؤس قال: جاء رجل إلى ابن عمر فسأله فقال: يا أبا عبد الرحمن أرأيت الذين يكسرون أغلاقنا أي أقفالنا ويفتحون أبوابنا وينقبون بيوتنا ويغيرون على أمتعتنا أكفروا به قال: لا قال: أي الرجل السائل: أرأيت هؤلاء الذين يتأولون علينا أي من الخوارج والبغاة ويسفكون دماءنا أي يرقبونها والمعنى يبيحون قتلنا بتأويلات فاسدة وآراء كاسدة أكفروا به، قال: لا أي لأنهم أخطأوا في اجتهادهم، ووقعوا في خلاف مرادهم فتوهموا أنا نستحق القتل لما صدر عنا من التقصير في الدين على زعمهم، والحاصل إنهم وغيرهم لم يكفروا حتى يجعلوا مع الله شيئاً أي شريكا وفي معناه كل ما يوجب كفرا قال طاؤس: وأنا انظر إلى أصبع ابن عمر وهو يحركها إشارة إلى التوحيد ومقام التفريد، ويقول سنة رسول الله ﷺ أي هذا شريعته وطريقته، وهذا الحديث وإن كان بظاهره موقوفاً لكن رواه جماعة آخرون فرفعوه عن رسول الله ﷺ"[1]

[اور اس کے ساتھ یعنی ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی سند کے ساتھ عبدالکریم بن ابی المخارق سے مروی ہے، انھوں نے طاؤس سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا ہے: ایک آدمی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور سوال کرتے ہوئے کہا: اے ابو عبدالرحمن! آپ کا کیا خیال ہے جو ہمارے تالے توڑتے ہیں، ہمارے دروازے کھولتے ہیں اور ہمارا سامان لوٹ لیتے ہیں، کیا وہ اس کے ساتھ کافر ہو جاتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں، پھر اس سائل نے یہ دریافت کیا: آپ کا ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو ہمارے خلاف تاویلیں کرتے ہیں، یعنی خارجی لوگ اور باغی گروہ اور ہمارے خون بہاتے ہیں، یعنی وہ خون بہانے کے منتظر رہتے ہیں، معنی یہ ہے کہ وہ فاسد تاویلوں اور کاسد آرا کے ساتھ ہمارے قتل کو جائز سمجھتے ہیں، کیا وہ اس وجہ سے کافر ہو جائیں گے؟ انھوں نے کہا: نہیں، کیونکہ انھوں نے اجتہادی غلطی کی ہے اور وہ اپنی مراد کے سلسلے میں اختلاف میں واقع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ اس وہم کا شکار ہو گئے ہیں کہ ہم قتل کے مستحق ہو گئے ہیں، کیونکہ ان کے گمان کے مطابق ہم سے دین کے معاملے میں کوتائی سرزد ہوئی ہے، مختصر یہ کہ انھوں نے اور دیگر لوگوں نے کفر نہیں کیا ہے، حتی کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک بنائیں یا اس جیسا کوئی کام کریں جو کفر کو واجب کرتا ہو۔ طاؤس رحمہ اللہ نے کہا: میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی انگلی کی طرف

[1] الدر المختار (٣/ ٦٣)

دیکھ رہا تھا اور وہ توحید اور مقام تفرید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو حرکت دے رہے تھے اور کہتے تھے: رسول اللہ ﷺ کی سنت، یعنی یہ ان کی شریعت اور طریقہ ہے۔ یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے، لیکن اسے ایک اور جماعت نے روایت کیا ہے، پس اسے رسول اللہ ﷺ تک مرفوع بیان کیا ہے]

نکاح میں عورت کی رضا مندی:

سوال زید فضولی نے ہندہ بالغہ باکرہ کا نکاح خالد سے بلاتعیین دو گواہ باجازت باپ ہندہ کے بعوض مبلغ اکیس ہزار روپیہ کے ایک جماعت عام میں کر دیا۔ زید نے ہندہ سے نہ خود قبل نکاح اجازت لی تھی نہ بعد نکاح اطلاع دی، مگر ہندہ کو قبل سے خبر تھی کہ آج میرا نکاح ہے اور جب دوسرے اجنبی لوگوں نے ہندہ کو نکاح کی خبر دی تو ہندہ چپ رہی اور انکار نہیں کیا اور خلوت صحیحہ بھی ہوئی، ایسی صورت میں نکاح ہوگیا یا تجدیدِ نکاح کی ضرورت ہے؟

جواب اس صورت میں کتبِ معتبرہ فقہ حنفی کے موافق نکاح ہوگیا، تجدیدِ نکاح کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہندہ سے صاف لفظوں میں منظوریِ نکاح کا اقرار کرا لینا ضروری ہے، اس لیے کہ گو اس صورت میں ہندہ کا مجرد سکوت نکاح ہوجانے کے لیے کافی نہیں ہے، لیکن اُس کا یہ سکوت اس کے ایک ایسے فعل کے ساتھ پایا گیا، جو اس کی منظوریِ نکاح پر دال ہے اور وہ اس کا رضا مند ہونا ہے خلوتِ صحیحہ پر اور ایسا سکوت نکاح ہوجانے کے لیے کافی ہے۔ درمختار میں ہے:

"فإن استأذنها غير الأقرب، كأجنبي أو ولي بعيد، فلا عبرة لسكوتها، بل لا بد من القول كالثيب البالغة، لا فرق بينهما إلا في السكوت، لأن رضاهما يكون بالدلالة، كما ذكره بقوله: أو ما هو في معناه من فعل يدل على الرضا، كطلب مهرها ونفقتها وتمكينها من الوطي ودخوله بها برضاها. ظهيرية، وقبول التهنئة والضحك سرورا و نحو ذلك" [1] اھ

[پھر اگر قریبی رشتے دار کے علاوہ کوئی اس (عورت) سے نکاح کی اجازت طلب کرے، جیسے اجنبی آدمی یا دور کا ولی، تو اس کے سکوت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ ثیبہ بالغہ کی طرح اس کا بول کر اجازت دینا ضروری ہے، ان دونوں کے درمیان صرف سکوت ہی کا فرق ہے، کیوں کہ ان کی رضا دلالت کے ذریعے ہی معتبر ہوگی، جیسے انھوں نے اپنے اس قول کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ "یا جو اس کے معنی میں ہو" یعنی عورت کا کوئی ایسا کام کرنا جو اس کی رضا مندی پر دلالت کرتا ہو، جیسے اس کا اپنا مہر اور خرچہ طلب کرنا، مرد کو وطی کرنے کی اجازت دینا، یا مبارک باد کو قبول کرنا اور خوشی سے ہنس دینا وغیرہ]

"رد المحتار" (۲/ ۳۰۱ مصری) میں ہے:

---

[1] الدر المختار (۳/ ۶۲، ۶۳)

"لأنه إذا ثبت الرضا بالقول، يثبت بالتمكين بالوطي بالأولىٰ، لأنه أدل على الرضا" اھ

[جب اس کے بول کر اجازت دینے سے اس کی رضا مندی ثابت ہوجاتی ہے تو مرد کو اپنے اوپر وطی کی قدرت دینے سے تو یہ بالاولیٰ ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ یہ اس کی رضا پر زیادہ دلالت کرنے والی ہے]

فتح القدیر (۲/ ۴۸) نولکشوری میں ہے:

"بل رضاها يكون إما به أي القول كنعم، ورضيت، وبارك الله لنا، وأحسنت، أو بالدلالة كطلب المهر أو النفقة أو تمكينها من الوطي أو قبول التهنية أو الضحك سرورا" انتهى

[بلکہ اس کی رضا یا تو قول سے ثابت ہوگی، جیسے وہ یہ کہے: ہاں یا میں راضی ہوں یا کہے: اللہ ہمیں برکت عطا کرے اور تم نے (میرے نکاح کا) اچھا فیصلہ کیا، یا یہ رضا دلالت سے ثابت ہوگی، جیسے عورت کا مہر یا خرچہ طلب کرنا یا مرد کو اپنے اوپر وطی کی قدرت عطا کرنا یا مبارک قبول کرنا یا خوشی سے ہنسنا]

صورت مسئولہ میں خلوتِ صحیحہ سے بھی جو برضا مندی پائی گئی ہے، کتبِ معتبرہ حنفی کے موافق نکاح ہوگیا۔ فتاویٰ ظہیریہ اور فتاویٰ بزازیہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ شامی (۲/ ۳۰۱ مصری) میں ہے:

"وقوله: ودخوله بها الخ، هذا مكرر، والظاهر أنه تحريف، والأصل: وخلوته بها، فإن الذي في البحر عن الظهيرية: ولو خلا بها برضاها هل يكون إجازة؟ لا، رواية لهذا المسألة، وعندي أن هذا إجازة، وفي البزازية: الظاهر أنه إجازة"

[اس کا یہ قول: ''مرد کا اس پر دخول ...الخ'' یہ تکرار ہے جو بظاہر تحریف ہے۔ اس میں اصل لفظ مرد کا اس عورت سے خلوت اختیار کرنا ہے۔ بحر میں جو ظہیریہ سے مروی ہے وہ یہ ہے: اگر وہ مرد اس عورت کی رضا سے اس کے ساتھ خلوت کرے تو کیا یہ عورت کی طرف سے اجازت شمار ہوگی؟ نہیں اس مسئلے میں ایک روایت مروی نہیں ہے، لیکن میرے نزدیک یہ اجازت ہے۔ بزازیہ میں ہے کہ بظاہر یہ اجازت ہی معلوم ہوتی ہے]

اور بھی اگر بالفرض اس خاص جزئی (خلوتِ صحیحہ برضا) کی تصریح موجود نہ بھی ہو تو بھی اس وجہ سے کہ یہ اصلی کلی "فعل يدل علىٰ الرضا" کے تحت میں داخل ہے اور جزئی من جزئیاتہ ہے، اس نکاح کے ہوجانے میں اشتباہ نہیں ہونا چاہیے۔

کتبہ: محمد عبداللہ

الجواب صحيح. حرره: الحقير حسين بن محمد الأنصاري اليماني، عفا الله عنه آمين

المجيب مصيب عندي، والله أعلم بالصواب. أبو محمد إبراهيم، غفرله ولوالديه.

ولایتِ نکاح کے مسائل

ولایتِ نکاح کے حق دار اور ولی کے بغیر نکاح کا حکم:

سوال ایک لڑکی نابالغہ ہے اور اس کی ماں حقیقی اور ماموں حقیقی اور نانا حقیقی نے اس کا نکاح کر دیا اور اس کا ایک سوتیلا بھائی بھی ہے کہ وہ بوقتِ نکاح موجود نہ تھا اور وہ اس نکاح سے بالکل ناخوش و ناراض ہے اور کہتا ہے کہ ہم کو ہرگز یہ نکاح منظور نہیں، تو ایسی حالت میں نکاح شرعاً درست ہوا یا نہیں اور ولی اس نابالغہ کا کون شخص شرعاً قرار پائے گا؟ جواب مدلل بدلیل شرعیہ ارقام فرمایا جائے۔

جواب ایسی حالت میں نکاح شرعاً درست نہیں ہوا۔ "منتقی الأخبار" میں ہے:

عن أبي موسیٰ عن النبي ﷺ قال: «لا نکاح إلا بولي»[1]

[ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا: سرپرست (ولی کی اجازت) کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہوتا]

وعن سلیمان بن موسیٰ عن الزهري عن عائشة أن النبي ﷺ قال: «أیما امرأة نکحت بغیر إذن ولیها فنکاحها باطل، فنکاحها باطل، فنکاحها باطل»[2] الحدیث (رواهما الخمسة إلا النسائي)

[سلیمان بن موسیٰ رحمہ اللہ زہری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں، وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ بلاشبہہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: جو عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لے تو اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے]

وعن أبي هریرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: «لا تزوج المرأة المرأة، ولا تزوج المرأة نفسها، فإن الزانیة هي التي تزوج نفسها»[3] (رواه ابن ماجه و الدارقطني)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے، نہ عورت خود اپنا نکاح کرے، پس بلاشبہہ بدکار عورت ہی اپنا نکاح خود کرتی ہے]

"نیل الأوطار" میں ہے:

"قوله: «لا نکاح إلا بولي» هذا النفي یتوجه إما إلی الذات الشرعیة، لأن الذات

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۰۸۵)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۰۸۳) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۱۰۲) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۸۷۹)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۸۸۲)

الموجودة أعني صورة العقد بدون ولي ليست بشرعية أو يتوجه إلى الصحة التي هي أقرب المجازين إلى الذات فيكون النكاح بغير ولي باطلا كما هو مصرح بذلك في حديث عائشة المذكور، وكما يدل حديث أبي هريرة المذكور، لأن النهي يدل على الفساد المرادف للبطلان، وقد ذهب إلى هذا علي و عمر و ابن عباس و ابن عمر و ابن مسعود و أبو هريرة و عائشة والحسن البصري وابن المسيب وابن شبرمة وابن أبي ليلىٰ والعترة وأحمد وإسحاق والشافعي و جمهور أهل العلم فقالوا: لا يصح العقد بدون ولي، وقال ابن المنذر: إنه لا يعرف عن أحد من الصحابة خلاف ذلك"[1]

[آپ ﷺ کا یہ فرمان: ''ولی (کی اجازت) کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہوتا'' اس فرمان میں موجود نفی یا تو ذاتِ شرعیہ کی نفی ہے، کیوں کہ ذات موجودہ، یعنی عقد کی صورت، ولی کے بغیر شرعی نہیں ہے، یا اس نفی کا تعلق صحت کے ساتھ ہے، جو ذات کی طرف اقرب المجازین ہے، تو اس بنا پر ولی کے بغیر نکاح باطل ہوگا، جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مذکورہ بالا روایت میں اس کی صراحت کی گئی ہے اور جس طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ حدیث دلالت کرتی ہے، کیوں کہ نہی فساد پر دلالت کرتی ہے اور فساد بطلان کے مترادف ہے۔ چناں چہ علی، عمر، ابن عباس، ابن عمر، ابن مسعود، ابو ہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم، حسن بصری، ابن المسیب، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ، عترہ، احمد، اسحاق، شافعی اور جمہور اہلِ علم رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ولی کے بغیر عقدِ (نکاح) صحیح اور درست نہیں ہے۔ ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے اس کے خلاف معروف ومعلوم نہیں ہے]

ولی اس نابالغہ کا اس کا سوتیلا بھائی ہے۔ نیل الاوطار میں ہے:

"والمراد بالولي هو الأقرب من العصبة من النسب ثم من السبب ثم من عصبته"[2] اھ

[ولی سے مراد وہ قریبی رشتے دار جو عصبہ نسبی میں سے ہو، پھر عصبہ سببی میں سے اور پھر اُن کے عصبہ میں سے]

سوال ایک زن بیوہ نے اپنی نابالغہ لڑکی کا نکاح بحیثیتِ ولایت ایک نابالغ لڑکے کے ساتھ برضا مندی والدین اس لڑکے کے پڑھا دیا اور لڑکی کو اس کے سسرال بھیج دیا۔ کچھ دنوں بعد وہ نابالغہ لڑکی اپنی ماں کے پاس چلی آئی، تو اس ماں نے بغیر ہونے طلاق کے اس نابالغہ لڑکی کا نکاح دوسرے بالغ آدمی سے پڑھوا دیا۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ پہلا نکاح از روئے شرع شریف جائز ہوا یا نہیں اور یہ دوسرا نکاح باوجود طلاق نہ ہونے کے جائز ہوا یا نہیں؟

جواب دونوں نکاحوں میں سے کوئی بھی از روئے شرع شریف کے بوجوہات ذیل جائز نہیں ہوا:

---

[1] نیل الأوطار (٦/ ١٧٨)

[2] المصدر السابق

① یہ دونوں نکاح بولایتِ عورت ہوئے ہیں اور نکاح بولایتِ عورت جائز نہیں ہے، کیونکہ عورت کو نکاح میں ولایت حاصل نہیں ہے۔ مشکوۃ شریف (ص:۲۶۳ چھاپہ مطبع احمدیہ دہلی) میں مرقوم ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «لا تزوج المرأة المرأة، ولا تزوج المرأة نفسها...» الحديث (رواه ابن ماجه)[1]

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی عورت کا نکاح کرے نہ عورت خود اپنا نکاح کرے...الحدیث]

② ولی بابِ نکاح میں صرف عصبہ ہے۔ ہدایہ (ص:۲۰۴ چھاپہ علوی) میں مرقوم ہے:

"والوليّ هو العصبة" یعنی ولایت بابِ نکاح میں صرف عصبہ کو حاصل ہے اور اس کے ثبوت میں ہدایہ جلد مذکور (ص:۲۰۵) میں یہ حدیث مرقوم ہے:

«النكاح إلىٰ العصبات»[2] یعنی نکاح کی ولایت صرف عصبات کو ہے۔

یہ حدیث حنفی مذہب میں تسلیم کر لی گئی ہے اور ماں عصبات میں سے نہیں ہے تو اس کو ولایت بابِ نکاح میں حاصل نہیں ہے۔

③ نکاح بغیر ولی کے باجماعِ صحابہ باطل ہے۔ نیل الاوطار (۶/ ۲۶ چھاپہ مصر) میں مرقوم ہے:

"وقد ذهب إلىٰ هذا علي و عمر و ابن عباس وابن عمر و ابن مسعود و أبو هريرة و عائشة والحسن البصري وابن المسيب وابن شبرمة وابن أبي ليلىٰ والعترة و أحمد و إسحاق والشافعي و جمهور أهل العلم فقالوا: لا يصح العقد بدون ولي. قال ابن المنذر: إنه لا يعرف عن أحد من الصحابة خلاف ذلك"

[علی، عمر، ابن عباس، ابن مسعود، ابوہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم، حسن بصری، ابن المسیب، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلی، عترہ، احمد، اسحاق، شافعی اور جمہور اہلِ علم رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں اور انھوں نے کہا ہے کہ ولی (کی اجازت) کے بغیر عقدِ (نکاح) صحیح نہیں ہوتا۔ ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک سے بھی اس کے خلاف کوئی شے معلوم نہیں ہے]

بعض لوگ جو نکاح بولایتِ عورت کے جواز پر اس سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی بھتیجی کا نکاح اپنے بھانجے سے کر دیا تھا، یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں جو "زَوَّجَتْ" کا لفظ مذکور ہے، اس سے نکاح کر دینا مراد نہیں ہے، بلکہ اسبابِ نکاح کا مہیا کر دینا مراد ہے۔ دلیل اس پر یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۸۸۲)

[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث نہیں ملی۔ (الدراية: ۲/ ٦٢)

کا عام دستور تھا کہ جب اپنی قرابت کی کسی عورت کے نکاح کا پورا سامان کر چکتیں اور صرف نکاح کر دینا باقی رہ جاتا تو اس عورت کے ولی سے فرما دیتیں کہ تو اس کا نکاح کر دے، کیونکہ عورت ولایت نکاح کی نہیں رکھتی، چنانچہ بیہقی نے کتاب ''المعرفة'' میں اس بات کو بصراحت بیان کر دیا ہے اور شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تخریج ہدایہ میں اس کو نقل فرما دیا ہے۔ تخریج ہدایہ کی عبارت یہ ہے:

''وأجاب البيهقي عن ذلك بأن قوله في هذا الأثر: زوجت أي مهدت أسباب التزويج لا أنها وليت عقدة النكاح، واستدل لتأويل هذا بما أسنده عن عبد الرحمن بن القاسم قال: كانت عائشة تخطب إليها المرأة من أهلها فتشهد فإذا بقيت عقدة النكاح قالت لبعض أهلها: زوج، فإن المرأة لا تلي عقدة النكاح''[1]

[امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس اثر میں جو ''زَوَّجَتْ'' کا لفظ مذکور ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں (عائشہ رضی اللہ عنہا) نے اسبابِ نکاح مہیا کر دیے نہ کہ انھوں نے عقدِ نکاح کی ولایت اختیار کی۔ چناں چہ انھوں نے اس تاویل کی دلیل اس روایت کو بنایا ہے، جو انھوں نے عبد الرحمن بن القاسم سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھرانے میں سے کوئی عورت ان کو نکاح کرنے کا کہتیں تو عائشہ رضی اللہ عنہا اس کے نکاح کی پوری تیاری کر دیتیں اور جب صرف نکاح کر دینا باقی رہ جاتا تو اس عورت کے ولی سے کہتیں کہ اس کا نکاح کر دے، کیوں کہ عورت ولایتِ نکاح کا حق نہیں رکھتی]

نیز نیل الاوطار میں سے اوپر منقول ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مذہب یہ ہے کہ نکاح بغیر ولی کے صحیح نہیں ہے، بلکہ صحابہ میں کسی سے اس کا اختلاف صحیح نہیں اور عورت بابِ نکاح میں ولی نہیں ہے تو پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی ولایت سے کسی کا نکاح کر دیں، یہ نہایت بعید ہے۔ علاوہ اس کے جب خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو چکا کہ نکاح بولایتِ عورت جائز نہیں ہے تو بمقابلہ قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مل جائے تو اس کے مقابلے میں کسی کی بات نہ مانو اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے صاف فرما دیا کہ جب تک کسی کو ہمارے قول کی سند معلوم نہ ہو، ہمارے قول پر فتویٰ دینا اس کو حلال نہیں ہے۔ (دیکھو: حجة الله البالغة، چھاپہ صدیقی بریلی، ص: ۱۶۲۔۱۲۳ وغیرہ)

④ یتیمہ نابالغہ کا نکاح قبل بلوغ حضرت سفیان ثوری اور امام شافعی و دیگر اہل علم رحمہم اللہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ ترمذی شریف (۱/ ۱۴۱ چھاپہ مطبع احمدی میرٹھ) میں لکھا ہے:

''واختلف أهل العلم في تزويج اليتيمة، فرأى بعض أهل العلم أن اليتيمة إذا زوجت، فالنكاح موقوف حتى تبلغ، فإذا بلغت فلها الخيار في إجازة النكاح وفسخه، وهو قول بعض التابعين وغيرهم، وقال بعضهم: لا يجوز نكاح اليتيمة

---

[1] الدراية لابن حجر (۲/ ۶۰) نیز دیکھیں: معرفة السنن والآثار للبيهقي (۱۰/ ۳۳)

حتی تبلغ، ولا یجوز الخیار في النکاح، وھو قول سفیان الثوري والشافعي وغیرھما من أھل العلم'' واللّٰہ أعلم بالصواب

[یتیمہ (نابالغہ) کا نکاح کرانے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ بعض اہلِ علم کا یہ خیال ہے کہ جب یتیمہ (نابالغہ) کا نکاح کر دیا جائے تو اس کے بالغ ہونے تک اس کا نکاح موقوف رہے گا۔ پھر جب وہ بالغ ہوجائے تو اپنے نکاح کی اجازت اور اس کے فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔ بعض تابعین وغیرہ کا یہ موقف ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ یتیمہ (نابالغہ) کے بالغ ہونے تک اس کا نکاح جائز نہیں ہے اور نکاح میں اختیار دینا بھی جائز نہیں ہے، چناں چہ امام سفیان ثوری اور شافعی رحمہما اللہ وغیرہ اہلِ علم کا یہی موقف ہے۔''

أملاہ محمد عبد اللّٰہ، مدرس أول مدرسہ أحمدیہ آرہ. قد أصاب من أجاب، واللّٰہ أعلم بالصواب، أبو محمد إبراھیم. أصاب من أجاب، واللّٰہ أعلم بالصواب محمد ضمیر الحق الآروي، عفي عنہ. الجواب صحیح. شیخ حسین بن محسن عرب. الجواب صحیح. أبو المعالي محمد إسماعیل، عفي عنہ.

سوال ① جمیلۃ النساء کے ورثا حسبِ ذیل ہیں: ① علاتی دادا ② پھوپھی ③ خالہ ④ ماموں۔ پس ان میں سے جمیلۃ النساء نابالغہ کا ولی جائز، جس کی اجازت سے اس کا نکاح ہو سکے، کون ہے؟

② جمیلۃ النساء کی مادر مظہر النساء نے اپنی وفات کے دس بارہ گھنٹہ قبل بغیر اجازت علاتی دادا کے جمیلۃ النساء نابالغہ کا نکاح اپنے برادر زاد سے کر دیا، جس کو علاتی دادا نے ناپسند کیا۔ پس یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو انفساخ کی ضرورت ہے یا نہیں اور علاتی دادا کو بغیر کسی کارروائی و انتظار بلوغ اس کے عقد کا اختیار حاصل ہے یا نہیں؟

③ جمیلۃ النساء اپنے ماموں کے قبضہ میں ہے۔ پس علاتی دادا اپنی ولایت کے حقوق سے بلا انتظار بلوغ نابالغہ کا نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟

④ اگر عدالت مجاز اس نابالغہ کو پرورش کے لیے علاتی دادا کے علاوہ دوسرے کے سپرد کر دے تو اس کو نکاح کر دینے کا بھی اختیار حاصل ہے یا نہیں اور علاتی دادا اس کے کیے ہوئے نکاح کو اپنی عدمِ رضا سے فسخ کر سکتا ہے یا نہیں؟

⑤ ولی جائز نے نکاحِ نابالغہ کیا ہے، پس بحالتِ بلوغ نابالغہ کو اس کے فسخ کا اختیار حاصل ہے یا نہیں، جیسا کہ ناجائز نکاح کے فسخ کا اختیار ہوتا ہے؟

⑥ مطابق شجرہ دادہالی و نانہالی ورثاء جمیلۃ النساء نابالغہ موجود ہیں، پس ولایت، یعنی حق پرورش کے لیے کس شخص کو ترجیح ہے؟

جواب ① ان میں سے جمیلۃ النساء کا ولی صرف علاتی دادا، یعنی باپ کا چچا ہے اور کوئی نہیں۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

جواب نمبر ❷ و ❸ و ❹۔ یہ نکاح ناجائز ہے، اس کے فسخ کی ضرورت نہیں، صرف علاتی دادا کو بعد بلوغ جمیلۃ النساء کے جمیلۃ النساء کی منظوری سے اس کے عقد کا اختیار حاصل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

❺ صحیح مسئلہ یہ ہے کہ نکاح بعد بلوغ ہونا چاہیے، اذن لے کر، نہ حالت نابالغی میں۔[1] صحیح حدیث یہ ہے:

«لا تنكح الأيم حتى تستأمر، ولا تنكح البكر حتى تستأذن»[2]

''نہ نکاح کیا جائے بیوہ کا یہاں تک کہ اس سے حکم لیا جائے اور نہ نکاح کیا جائے باکرہ کا یہاں تک کہ اس سے اِذن لیا جائے۔''

❻ اس صورت میں حقِ پرورش کے لیے خالہ کو ترجیح ہے، اگر خالہ شوہردار نہ ہو یا ہو تو اس کا شوہر پرورش پر راضی ہو۔ صحیح حدیث میں ہے:

«الخالة بمنزلة الأم»[3] یعنی خالہ بمنزلہ ماں کے ہے۔ (مشکوۃ شریف، ص: ۲۸۵)

واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبداللہ (۱۵/ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ)

سوال ایک بیوہ عورت ہندہ ہے اور بالغہ ہے، اس کا باپ مر گیا ہے، اس کے لیے بھائی اور ماموں موجود ہیں۔ مسماۃ ہندہ اور اس کی ماں حنفی المذہب ہیں۔ ایک شخص اہلِ حدیث نے ہندہ سے نکاح کرنے کا پیغام اس کے بھائی کے یہاں بھیجا۔ مسماۃ ہندہ کو اس شخص اہلِ حدیث سے نکاح کرنا منظور ہوا اور ہر طرح راضی ہوئی، کیونکہ وہ شخص اہلِ حدیث بہت لائق اور صالح و دیندار ہے اور ہندہ کی ماں کو بھی اس شخص سے نکاح کر دینا منظور و پسند ہوا، مگر ہندہ کے بھائی نے منظور نہیں کیا۔ اس درمیان میں ہندہ کو خبر لگی کہ اس کا بھائی اس کا نکاح ایک دوسرے شخص سے کرے گا، جو بے نمازی ہے، چونکہ ہندہ کو اس دوسرے شخص سے نکاح کرنا کسی طرح منظور نہ تھا، اس وجہ سے بہت گھبرائی کہ میرا نکاح کہیں اس دوسرے شخص سے نہ کر دیا جائے اور بعجلت تمام بلا اجازت و بلا اطلاع اپنے بھائی کے اس اہلِ حدیث شخص سے اپنا نکاح کر لیا اور اس اہلِ حدیث نے بھی اس خیال سے کہ نکاح ہو جانے کے بعد اس کا بھائی اجازت دے دے گا، نکاح کر لیا۔ جب نکاح کی خبر ہندہ کے بھائی کو لگی تو وہ ہندہ سے بہت ناخوش ہوا اور اب وہ کسی طرح سے نکاح کی اجازت نہیں دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ جو چاہے کرے، ہم کبھی اجازت نہ دیں گے اور نہ کسی طرح اس کی اجازت دینے کی امید معلوم ہوئی۔

اب ہندہ سخت مصیبت میں پڑ گئی کہ نہ اس کا بھائی نکاح کی اجازت دیتا ہے اور نہ وہ اہلِ حدیث اس کو اپنی منکوحہ سمجھ کر رکھ سکتا ہے اور نہ اس سے معاملہ زن وشو کا کر سکتا ہے، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ یہ نکاح حدیث کی رو

① یعنی عموماً ایسا ہو، ورنہ حالتِ نابالغی میں بھی نکاح درست ہے اور اس کی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حالتِ نابالغی میں ہوا تھا۔

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١٩)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨٢)

سے صحیح نہیں ہوا۔ پس سوال یہ ہے کہ از روئے قرآن و حدیث کے ایسی صورت میں ہندہ کی گلوخلاصی کی کیا صورت ہے؟

جواب ایسی صورت میں ہندہ حاکم سے درخواست کرے کہ میں فلاں شخص سے اپنا نکاح کرنا چاہتی ہوں، حاکم میرے بھائی کو حکم دے کہ وہ میرا نکاح اس شخص سے کر دے اور اگر میرا بھائی میرا نکاح کر دینا اس شخص سے منظور نہ کرے تو (بشرطیکہ ہندہ کا اور کوئی ولی نہ ہو) ایسی حالت میں حاکم خود ولی ہے، اپنی ولایت سے میرا نکاح اس شخص سے کر دے یا اپنی طرف سے کسی شخص کو حکم دے دے کہ وہ شخص میرا نکاح اس شخص سے کر دے۔ نیل الاوطار (۶/ ۲۶) میں ہے:

"فإذا لم يكن ثم ولي أو كان موجودا و عضل، انتقل الأمر إلىٰ السلطان، لأنه ولي من لا ولي له"

[پس جب ولی نہ ہو یا ولی تو ہو، لیکن وہ اس کو نکاح سے روکے تو امرِ ولایت سلطان کی طرف منتقل ہو جائے گا، کیوں کہ ولی نہ ہونے کی صورت میں وہ ولی ہے]

ایضاً (۶/۳۳) میں ہے:

"وفي حديث معقل هذا دليل على أن السلطان لا يزوج المرأة إلا بعد أن يأمر وليها بالرجوع عن العضل، فإن أجاب فذاك وإن أصر زوّجها"

[معقل بن یسار کی اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ سلطان کسی عورت کا نکاح کرانے سے پہلے اس کے ولی کو حکم دے کہ وہ نکاح سے روکنے والا عمل ترک کر دے، اگر وہ بجا آوری کرے تو ٹھیک اور اگر وہ اپنی ضد پر مصر رہے تو سلطان اس کا نکاح کر دے] والله تعالىٰ أعلم.

كتبه: محمد عبدالله (٦/ ذو القعده ١٣٢٩هـ)

سوال اگر دادا اپنی پوتی نابالغہ کا عقد اپنے لڑکے کے ہوتے ہوئے کسی سے کر دے اور بعد بلوغ کسی وجہ سے پوتی نے نکاح مذکورہ کو فسخ کر دیا اور شوہر کے گھر جانے سے منکر ہوئی تو نکاح مذکور فسخ ہوا یا نہیں؟

جواب نکاح مذکور اگر بلا اجازت لڑکی کے باپ کے ہوا ہے تو یہ نکاح درست ہی نہیں ہوا اور جب نکاح مذکور درست ہی نہیں ہوا تو اس نکاح کے فسخ کی بھی حاجت نہیں، اس لیے کہ باپ کی موجودگی میں دادا ولی نہیں ہو سکتا اور جب دادا ولی نہیں ہو سکتا تو یہ نکاح بلا اجازت ولی کے ہوا اور نکاح جو بلا اجازت ولی کے ہو باطل اور نادرست ہے۔ صحیح بخاری (۳/ ۱۵۳ طبع مصری) میں ہے:

"عن عائشة رضي الله عنها أن النكاح في الجاهلية كان علىٰ أربعة أنحاء، فنكاح منها نكاح الناس اليوم، يخطب الرجل إلىٰ الرجل وليته أو ابنته فيصدقها، ثم ينكحها... فلما بعث محمد ﷺ بالحق هدم نكاح الجاهلية كله إلا نكاح الناس اليوم... إلىٰ آخر الباب"[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٣٤)

[بلاشبہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو خبر دی کہ زمانۂ جاہلیت میں چار طرح سے نکاح ہوتے تھے: ایک صورت تو یہی تھی، جیسے آج کل لوگ کرتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے شخص کے پاس اس کی زیرِ پرورش لڑکی یا اس کی بیٹی کے نکاح کا پیغام بھیجتا اور اس کی طرف پیش قدمی کر کے اس سے نکاح کرتا... پھر جب محمد ﷺ حق کے ساتھ رسول بن کر آئے تو آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام نکاح باطل قرار دیے۔ صرف اس نکاح کو باقی رکھا، جس کا آج کل رواج ہے...]

مشکوۃ شریف (ص: ۱۶۱) میں ہے:

عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله ﷺ قال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل»[1] الحديث (رواه أحمد والترمذي وأبو داود وابن ماجه والدارمي)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے] واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبداللہ (۱۲/ ذي القعدة ۱۳۳۱ھ)

سوال ایک عورت نابالغہ نے اپنے گھر سے نکل کر بلا رضا مندی و بغیر اجازت اپنے والدین اور دیگر جملہ رشتہ داران کے ایک شخص سے جس کے ساتھ گھر سے نکلی تھی، نکاح کر لیا اور قریباً دو ڈھائی ماہ اس کے گھر میں رہی۔ پس اس عورت نابالغہ کا یہ نکاح جائز ہوا یا نہیں؟ جواب مفصل از روئے حدیث شریف و کتاب اللہ تحریر فرمائیں۔

جواب صورت مسئولہ میں چونکہ عورت نابالغہ نے بلا رضا مندی و بغیر اجازت اپنے والدین و دیگر جملہ رشتہ داران کے، یعنی بغیر اجازت ولی جائز کے اپنا نکاح کر لیا اور بعد نکاح کے بھی ولی جائز کی منظوری و اجازت نکاح مذکور کی نسبت نہیں پائی گئی، اس لیے نکاح مذکور بالاتفاق ناجائز ہوا۔ اس میں مذہبِ اہلِ حدیث اور مذہبِ حنفی میں اختلاف نہیں ہے۔

عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله ﷺ قال: «أيما امرأة نكحت نفسها بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل»[2] (رواه أحمد والترمذي وأبو داود وابن ماجه والدارمي)

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال رسول الله ﷺ: «لا تزوج المرأة المرأة ولا تزوج المرأة نفسها فالزانية هي التي تزوج نفسها»[3] (رواه ابن ماجه)

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی عورت کا نکاح کرے نہ عورت

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

[2] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٢)

خود اپنا نکاح کرے۔ بدکار عورت ہی اپنا نکاح خود کرتی ہے]

ہدایہ کے "باب الأولياء والأكفاء" میں ہے: "ويجوز نكاح الصغير والصغيرة إذا زوجهما الولي... الخ"[1] [صغیر اور صغیرہ کا نکاح جائز ہے، جب ان کے ولی ان کا نکاح کریں ...الخ] در مختار کے "باب الولي" میں ہے: "وهو أي الولي شرط صحة نكاح صغير"[2] [اور وہ یعنی ولی (کی اجازت)، صغیر کے نکاح کے صحیح ہونے کی شرط ہے] اور "رد المحتار" میں ہے:

"(قوله: صغير الخ) الموصوف محذوف أي شخص صغير الخ فيشمل الذكر والأنثى... الخ"[3] والله أعلم بالصواب

[اس کا قول: "صغیر" یہاں پر موصوف محذوف ہے، یعنی: "شخص صغیر" لہٰذا یہ مذکر و مونث دونوں کو شامل ہے]

کتبہ: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

سوال لڑکی کنواری بالغہ کا ولی بوجہ ناخوشی اپنی اجازت عقد کی اس لڑکی کے نہیں دیتا، ایسی حالت میں لڑکی کا عقد اپنی اجازت سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب عورت کا نکاح بغیر اذن ولی کے نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر اپنا نکاح بغیر اذن ولی کے کر لے تو وہ نکاح باطل ہے۔

عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله ﷺ قال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل»[4] الحديث (مشکوۃ شریف، ص: ٢٦٢)

[سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے]

ہاں اگر ولی اقرب نکاح سے روکے تو اس وقت ولایت سے وہ معزول ہوجاتا ہے اور ولی ابعد اس کا قائم مقام ہوجاتا ہے، یعنی ولی ابعد کا اذن صحتِ نکاح میں کافی ہوجاتا ہے۔

"ويثبت للأبعد التزويج بعضل الأقرب أي بامتناعه عن التزويج إجماعا"[5] (در مختار)

[اس پر اجماع ہے کہ جب ولیِ اقرب نکاح سے روکے تو ولیِ ابعد کو نکاح کروانے کا حق حاصل ہوجاتا ہے] والله أعلم.

کتبہ: محمد عبد الله

---

[1] الهداية (١/ ١٩٨)

[2] رد المحتار مع الدر المختار (٣/ ٥٥)

[3] المصدر السابق.

[4] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

[5] الدر المختار مع رد المحتار (٣/ ٨٢)

سوال باکرہ بالغہ کا نکاح بغیر موجودگی اور بغیر رضا مندی باپ ہندہ کے جو بارہ کوس اپنے علاقہ پر تھا برضا مندی مادر ہندہ وبسکوت خود ہندہ وقتِ اجازت غیر ولی کے ہو گیا۔ باپ ہندہ کا جو ولی ہے، پہلے بھی اس نکاح سے راضی نہیں تھا اور اب بھی نہیں۔ لہٰذا ایسا نکاح جو وقوع میں آیا ہو، وہ عند اللہ وعند الرسول جائز اور صحیح نکاح ہے یا باطل اور فاسد قابلِ فسخ ہے؟

جواب ایسا نکاح جائز نہیں ہے، اس لیے کہ جو نکاح عورت کا بلا اذن اس کے ولی کے ہو، جائز اور صحیح نہیں ہے، بلکہ باطل اور ناجائز ہے اور جبکہ ایسا نکاح صحیح نہیں ہے، بلکہ باطل و ناجائز ہے تو اس کا فسخ کیسا؟ فسخ تو اُس چیز کا ہوتا ہے جو موجود اور ثابت ہو اور جب ایسا نکاح شرعاً ثابت و موجود ہی نہیں تو فسخ کی کیا صورت ہے؟ ہاں ہندہ میں اور اس شخص میں جس کے ساتھ ہندہ کا نکاح کیا گیا ہے، تفریق واجب ہے۔ مشکوۃ شریف (ص: ۲۶۲ چھاپہ دہلی) میں ہے:

عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله ﷺ قال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل»[1] الحديث (رواه الترمذي وأبو داود و ابن ماجه والدارمي)

[سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے]

نیل الاوطار (۶/ ۲۶ چھاپہ مصر) میں ہے:

''وقد ذهب إلى هذا (أي إلى بطلان نكاح المرأة بغير إذن وليها) علي و عمر و ابن عباس وابن عمر و ابن مسعود و أبو هريرة وعائشة والحسن البصري وابن المسيب وابن شبرمة و ابن أبي ليلىٰ والعترة وأحمد وإسحاق والشافعي و جمهور أهل العلم فقالوا: لا يصح العقد بدون ولي. قال ابن المنذر: إنه لا يعرف عن أحد من الصحابة خلاف ذلك'' انتهى والله أعلم بالصواب

[علی، عمر، ابن عباس، ابن عمر، ابن مسعود، ابو ہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم، حسن بصری، ابن المسیب، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلی، عترہ، احمد، اسحاق، شافعی اور جمہور اہلِ علم رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ عورت کے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر کیا ہوا نکاح باطل ہے، چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ ولی (کی اجازت) کے بغیر عقدِ (نکاح) صحیح نہیں ہوتا۔ ابن المنذر نے کہا ہے: کسی صحابی سے اس کے خلاف مروی نہیں ہے] کتبہ: محمد عبد اللہ

سوال ایک لڑکی جب وہ بالغہ ہو تو بغیر ولی جائز کی اجازت کے بصلاح مادر و نانا و مادر کی نانی کی رضا مندی سے لڑکی نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ اور اگر لڑکی نابالغہ ہو تو بلا رضا مندی ولی کے بصلاح مذکورہ بالا لڑکی اپنا نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ اور جب لڑکی کی عمر میں شبہہ ہو کہ بالغہ ہے یا نابالغہ تو اس صورت میں بغیر ولی کی رضا مندی کے اور بصلاح

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

مادر و نانا و مادر کی نانی کی اجازت سے لڑکی نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ خلاصہ یہ ہوا کہ حالتِ شبہہ میں کہ لڑکی بالغہ ہے یا نابالغہ ہے، اس تین شخص کی اجازت سے اور بغیر اجازت و رضا مندی ولی کے اس لڑکی کا نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟ جواب قرآن اور حدیث سے مدلل فرمایا جائے۔

جواب کوئی عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتی، اگر کر لے تو وہ نکاح باطل ہے۔

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ [البقرة: ٢٣٢] "فدخل فيه الثيب، وكذلك البكر، وقال: ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ وقال: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ إلى آخر الباب" (صحيح بخاري، كتاب النكاح، باب من قال لا نكاح إلا بولي)

[جس نے کہا کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "پس تم ان کو مت روکو اس میں ثیبہ اور باکرہ سب شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے: "اور (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔" نیز اس کا فرمان ہے: "اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دو" ...]

وعن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله ﷺ قال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل» [1] الحديث

(رواه أحمد والترمذي وأبو داود و ابن ماجه والدارمي، مشكوة شريف، باب الولي في النكاح)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے]

مادر اور مادر کی نانی نکاح میں ولی نہیں ہوسکتیں۔ ہاں اگر نانا سے قریب کوئی اور ولی نہ ہو یا ہو مگر نکاح سے مانع ہو تو ایسی صورت میں نانا کی اجازت سے بالغ عورت اپنا نکاح کر سکتی ہے۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «لا تزوج المرأة المرأة ولا تزوج المرأة نفسها، فإن الزانية هي التي تزوج نفسها» [2] (رواه ابن ماجه، مشكوة شريف، باب الولي في النكاح)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی عورت کا نکاح کرے نہ عورت خود اپنا نکاح کرے، کیوں کہ بدکار عورت ہی اپنا نکاح خود کرتی ہے] واللّٰه تعالىٰ أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد اللّٰه

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٢)

ولایتِ نکاح کا حق دار اور ولی کے بغیر نکاح کا حکم[1]:

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ زید کی بیٹی ہندہ عرصہ نو برس سے عدمِ بلوغیت کے زمانے میں بیوہ ہوگئی، اس درمیان میں چند جگہ سے پیغام نکاح بھی ہندہ کے آئے، مگر زید نے بوجہ پابندی رسم وعیب و برا سمجھنے کے نامنظور کیا۔ آخر ہندہ زید کے مکان سے باہر آئی اور جماعت مسلمین کے سردار کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ میرا نکاح فلاں شخص سے جلد پڑھا دیجیے، ورنہ حرام کاری کی مرتکب ہو جاؤں گی اور میرے والد کو مت خبر دیجیے، ورنہ وہ نکاح نہ ہونے دیں گے، سردار صاحب کو بہت خیال ہوا اور دریافت کر کے ایک جماعت مسلمین کے روبرو خود قاضی و وکیل و ولی بن کر ہندہ کا نکاح پڑھوا دیا، جب اس کے والد وغیرہ کو خبر ہوئی تو اس کو زدوکوب کر کے پکڑ کر مکان میں لے گئے اور یہ مشہور کیا کہ ہندہ کہتی ہے کہ وہ نکاح میری منظوری سے نہیں ہوا اور ہم کو منظور نہ تھا۔ یہ کہنا زید کا یا ہندہ کا معتبر ہے یا نہیں اور یہ نکاح بیوہ کا جو ولی اقرب کے ہوتے ہوئے، ولی ابعد سردار مسلمین نے پڑھوایا صحیح ہے یا نہیں؟

جواب عورت کے نکاح میں عورت کا اذن بھی ضروری ہے اور اس کے ولی کا اذن بھی۔ اگر عورت ثیبہ ہے تو اس کا صریح اذن ضروری ہے اور باکرہ ہے تو صریح اذن ضرور نہیں، اس کا سکوت بھی کافی ہے تو اگر عورت کا نکاح بلا اذن اس کے کر دیا جائے تو صحیح نہیں، جب تک کہ وہ منظور نہ کرے، اسی طرح اگر عورت کا نکاح بلا اذن اس کے ولی کے کر دیا جائے تو بھی صحیح نہیں، جب تک ولی منظور نہ کرے، ہاں جس عورت کا کوئی ولی نہ ہو، یا ہو، لیکن عورت کو نکاح کرنے سے روکتا ہو، جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو ان دونوں صورتوں میں سلطان، یعنی سردار جماعت مسلمین ہی اس عورت کا ولی ہے، اس کے اذن سے اس عورت کا نکاح صحیح ہے۔ في المشكاة (ص: ٢٦٢):

١ عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: لا تنكح الأيم حتى تستأمر ولا تنكح البكر حتى تستأذن، قالوا: يا رسول الله ﷺ! وكيف إذنها؟ قال: أن تسكت" [2] متفق عليه

[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیوہ یا مطلقہ کا نکاح اس کے حکم کے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری سے بھی اجازت لی جائے۔'' لوگوں نے پوچھا: اس کی اجازت کس طرح ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ خاموش ہو جائے'']

٢ وعن عائشة أن رسول الله ﷺ قال: أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل (إلى قوله) فإن اشتجروا فالسلطان ولي من لا ولي له. رواه أحمد والترمذي وأبو داود و ابن ماجه والدارمي" [3] اهـ

---

[1] فتاویٰ نذیریہ (۲/ ۴۸۶)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١٩)

[3] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

[آپ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کرے۔ اس کا نکاح باطل ہے، اگر جھگڑا ہو جائے تو بادشاہ ولی ہے، جس کا کوئی ولی نہ ہو]

وفي نيل الأوطار (ص: ٢٢٦):

"فإذا لم يكن ثمه ولي أو كان موجودا وعضل، انتقل الأمر إلى السلطان، لأنه ولي من لا ولي له، كما أخرجه الطبراني من حديث ابن عباس، وفي إسناده الحجاج بن أرطاة" اهـ

اگر نکاح میں ولی موجود نہ ہو یا ہو اور وہ ولایت کے قابل نہ ہو تو بادشاہ ولی ہوگا۔

وفي فتح الباري (ص: ٥/ ٧٢):

"وفي إسناده الحجاج بن أرطاة وفيه مقال، و أخرجه سفيان في جامعه، ومن طريقه الطبراني في الأوسط بإسناد آخر حسن عن ابن عباس بلفظ: لا نكاح إلا بولي مرشد أو سلطان" اهـ

[اس کی سند میں حجاج بن اَرطاۃ راوی متکلم فیہ ہے۔ سفیان نے اسے اپنی جامع میں بیان کیا ہے، اس کے طریق سے ایک دوسری حسن سند سے امام طبرانی رحمہ اللہ نے "المعجم الأوسط" میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے درجِ ذیل الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے: صحیح ولی یا بادشاہ کے بغیر نکاح نہیں ہے]

باقی رہا یہ امر کہ ہندہ کا یہ نکاح اس کی منظوری سے ہوا یا نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر شہادتِ معتبرہ سے سے ثابت ہو کہ ہندہ کی منظوری سے نکاح مذکور ہوا تھا اور اب بخوف زد و کوب منظوری سے انکار کرتی ہے تو نکاح مذکور صحیح ہوگیا اور اب زید یا ہندہ کا کہنا کہ یہ نکاح بمنظوری ہندہ نہیں ہوا ہے، نا معتبر ہے، ورنہ معتبر ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبداللہ (مدرسہ احمدیہ ۱۲۹۸ھ) سید محمد نذیر حسین

کیا عورت اپنا یا دوسری عورت کا نکاح کر سکتی ہے؟

سوال عورت اپنے نفس کا یا عورت عورت کا نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب عورت نہ خود اپنا نکاح کر سکتی ہے اور نہ دوسری کا نکاح کر سکتی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ (البقرة: ٢٢١) [اور نہ (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں] وقال تعالیٰ: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ (النور: ٣٢) [اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دو]

وعن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله ﷺ قال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل»[1] الحديث (رواه أحمد والترمذي وأبو داود وابن ماجه والدارمي)

[1] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے]

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «لا تزوج المرأة المرأة، ولا تزوج المرأة نفسها فإن الزانية هي التي تزوج نفسها»[1] والله تعالىٰ أعلم

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے، نہ عورت خود اپنا نکاح کرے، کیوں کہ بدکار عورت ہی اپنا نکاح خود کرتی ہے] کتبہ: محمد عبداللہ

یہ جواب بہت صحیح ہے، نہ عورت عورت کی ولی ہوسکتی ہے نہ اپنا نکاح بغیر ولی کے کر سکتی ہے، جیسا کہ احادیثِ مذکورہ سے ثابت ہے۔ یہی مسلک محدثین رحمہم اللہ کا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں یہ باب منعقد کیا:

"باب من قال لا نكاح إلا بولي لقوله تعالىٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ فدخل فيه الثيب وكذلك البكر... الخ"

بعض لوگ جو یہ حدیث پیش کیا کرتے ہیں: «الأيم أحق بنفسها من وليها»

اس کا جواب اسی حدیث کے تحت میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اس طرح دیا ہے:

"واحتج بعض الناس في إجازة النكاح بغير ولي بهذا الحديث، وليس في هذا الحديث ما احتجوا به لأنه قد روي من غير وجه عن ابن عباس عن النبي ﷺ قال: «لا نكاح إلا بولي» وهكذا أفتى به ابن عباس بعد النبي ﷺ فقال: لا نكاح إلا بولي وإنما معنى قول النبي ﷺ: «الأيم أحق بنفسها من وليها»[2] عند أكثر أهل العلم أن الولي لا يزوجها إلا برضاها وأمرها"

[بعض لوگوں نے ولی کے بغیر نکاح کے جواز پر اس حدیث سے احتجاج کیا ہے، حالاں کہ اس میں ان کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ متعدد طرق سے مروی ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی نبیِ مکرم ﷺ کے بعد یہی فتویٰ دیا ہے کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں۔ اس حدیث «الأيم أحق بنفسها من وليها» کا معنی اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ ہے کہ ولی صرف اس کی رضا اور امر ہی سے اس کا نکاح کرے گا] کتبہ: محمد عبدالجبار عمر پوری

سوال ہندہ نے اپنی ایک لڑکی نابالغہ (چھ سات برس کے سن) کا عقد ایک لڑکے نابالغ (نو دس برس کے سن) سے کرا

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۸۸۲) اس حدیث کے آخری الفاظ "فإن الزانية هي التي تزوج نفسها" مرفوع نہیں، بلکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذکر کردہ الفاظ ہیں۔ دیکھیں: سنن الدارقطني (۳/ ۲۲۷) سنن البيهقي (۷/ ۱۱۰) إرواء الغليل (٦/ ٢٤٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۰۸)

دیا اورلڑکی نابالغہ تین چار روز کے لیے اپنی سسرال بھی گئی، اس کے بعد آج تک اپنی سسرال نہیں گئی۔ اب بالکل بالغ ہے اور نکاح سابق کو ناپسند کرتی ہے اور اپنی سسرال جانا نہیں چاہتی ہے، چونکہ اس کا شوہر بالکل آوارہ ہے اور اس کا شوہر بھی مخاطب نہیں ہوتا ہے، ایسی حالت میں بلا طلاق کے اس لڑکی کا نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب عورت شرعاً ولی نہیں ہوسکتی، پس ہندہ نے جو اپنی نابالغہ لڑکی کا عقد ایک نابالغ لڑکے سے کرا دیا، یہ نکاح بلا، اذنِ ولی ہوا اور نکاح جو بلا اِذنِ ولی ہو، شرعاً باطل ہے، لہٰذا ایسی حالت میں بلاطلاق کے اُس لڑکی کا نکاح جدید ہوسکتا ہے۔ مشکوۃ (ص: ۲۶۲) میں ہے:

عن عائشة أن رسول اللهﷺ قال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل»[1] الحديث (رواه أحمد والترمذي و أبو داود و ابن ماجه والدارمي)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے]

نیز مشکوۃ (ص: ۲۶۳) میں ہے:

عن أبي هريرة قال: قال رسول اللهﷺ: «لا تزوج المرأة المرأة ولا تزوج المرأة نفسها، فإن الزانية هي التي تزوج نفسها»[2] (رواه ابن ماجه)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے، نہ عورت خود اپنا نکاح کرے، کیوں کہ بدکار عورت ہی اپنا نکاح خود کرتی ہے]

سوال زینب نے اپنی بیٹی ہندہ کا نکاح نو برس کی عمر میں جو آج تک نابالغ ہے، بوکالت عمرو اجنبی کے زید سے پڑھا دیا۔ زید چار مہینے تک ہندہ کو کھانا خرچ دیتا اور اس کے گھر آتا جاتا رہا۔ اب تین برس سے کھانا خرچ نہیں دیتا، نہ ہندہ سے سروکار رکھتا ہے۔ تین مرتبہ پنچایت بھی ہوئی کہ زید خواہ ہندہ کو کھانا خرچ دے، آمد و رفت رکھے، خواہ جس صورت سے ہو، اس سے شرعی طور پر بے سروکار ہوجائے، لیکن باوجود خبر دینے اور تاکید کرنے کے بھی زید پنچایت میں حاضر نہ ہوا۔ لوگ خود اس کے مکان پر گئے، تاکہ کہیں کہ زید دو راہ میں سے ہندہ کی ایک راہ کر دے۔ زید خبر پاتے ہی روپوش ہوگیا، دو ڈھائی برس ہوئے کہ پختہ خبر نہیں ملتی کہ زید کہاں ہے؟ صحیح و سالم زندہ ہے کہ مرگیا؟ اب ہندہ کی خلاصی کی کیا صورتیں ہیں؟ تحریر ہوں۔

جواب ہندہ کا نکاح جو زید سے ہوا ہے، یہ نکاح بولایتِ عورت، یعنی بولایتِ زینب مادر ہندہ کے ہوا ہے اور نکاح

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٢)

بولایتِ عورت صحیح نہیں ہے۔ عورت کو نکاح میں ولایت حاصل نہیں ہے۔

مشکوۃ شریف (ص: ۲۶۳ چھاپہ احمدی دہلی) میں ہے:

عن أبي هريرة ﷺ قال: قال رسول الله ﷺ: «لا تزوج المرأة المرأة، ولا تزوج المرأة نفسها»[1] الحديث (رواه ابن ماجه)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی عورت کا نکاح کرے نہ عورت خود اپنا نکاح کرے]

جب نکاح مذکور صحیح نہ ہوا، پس ہندہ اب تک کسی کی زوجہ صحیحہ شرعیہ نہیں ہے تو اس کے اولیا کو اختیار ہے کہ اس کا نکاح کسی اچھے شخص سے برضا مندی ہندہ کے کر دیں۔ واللّٰہ أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

ولایتِ نکاح میں دوسرے کو وکیل بنانا:

سوال ہندہ بالغہ باکرہ کہ منسوب ایک سال سے تھی۔ ہندہ اور ہندہ کے باپ وغیرہ کو معلوم تھا کہ آج ہندہ کا نکاح ہے، لیکن ہندہ کا باپ چار کوس پر تھا۔ ہندہ کے باپ نے بکر کے نام خط لکھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں بیمار ہوں، سواری ملتی نہیں، پیادہ روی سے مجبور ہوں۔ میں تو چاہتا تھا کہ تاریخ بڑھا دی جاتی، تاکہ میری بھی شرکت ہوتی، مگر جبکہ عورتوں نے تاریخ مقرر کر لی ہے، تو انجام ہی ہوجانا بہتر ہے، زید وہاں موجود ہے، بعوض ایک ہزار نکاح کر دے، لڑکی میری دانست میں بالغ ہے، اس سے بھی اجازت لے لیں اور احمد آرندہ خط کو بھی زبانی ہدایت ایسے ہی کر دی۔ زید ہندہ کے باپ کا صرف خط بھیجنا سنتا تھا، بغیر اجازت بکر کے خط پڑھ کر اور احمد آرندہ خط کا زبانی بیان سن کر، بلا لیے ثبوت شہادت کے زید نے مبلغ ایک ہزار روپیہ جو مہر مثل سے نصف کے قریب ہے، ایک مجمع عام میں بلا نام زد کرنے نام دو گواہ کے ہندہ کا نکاح خالد سے کر دیا۔ زید یا پدر ہندہ نے خود ہندہ سے قبل نکاح اجازت نہیں لی اور نہ بعد نکاح خود زید یا کسی دوسرے شخص خاص نے ہندہ کو خبر نکاح کی دی، مگر جب نکاح ہوگیا۔ گھر باہر شور وغل مچل گیا کہ ہندہ کا نکاح ہوگیا، جس وقت تواتر سے نکاح کی خبر ہندہ کو پہنچی، ہندہ بہیتر [اندرونِ خانہ] میں تھی، ہندہ نے صریح لفظوں میں اقرار یا انکار نہ کیا اور خلوتِ صحیحہ بھی ہوگئی۔ ہندہ خالد سے راضی ہے اور ہندہ کے باپ کو بھی کوئی کلام نہیں ہے۔ ایسی صورت میں نکاح صحیح و نافذ ہوجائے گا یا تجدیدِ نکاح وصریح اقرارِ ہندہ کی ضرورت ہے؟

انتباہ: ما نحن فیہ میں امور خمسہ مفصلہ ذیل پر ضرور دلیل شافی ہونی چاہیے:

1. اس صورت میں زید وکیل من جانب پدر ہندہ قرار پائے گا یا نہیں؟ خانیہ وغیرہ میں مصرح ہے کہ ولی نے اگر بلا اجازت اپنی لڑکی بالغہ کا نکاح پڑھا دیا تو یہ نکاح لڑکی کی رضا پر موقوف ہے۔ اگر بالغہ باکرہ ہے تو سکوت ہی

---

[1] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۱۸۸۲)

رضا ہوگا، جیسا کہ عند الاستیذان سکوت رضا پر محمول ہے، پس اگر زید وکیل پدر ہندہ قرار پاتا ہے تو اس نکاح پڑھا دینے میں سکوت رضا پر محمول ہوگا یا نہیں اور اگر بالفرض زید وکیل نہیں، بلکہ فضولی قرار دیا جائے تو بغیر تصریح اذن ہندہ کے یہ نکاح نافذ ہوگا یا نہیں؟

۲ انعقادِ نکاح کے وقت نام زد کرنا دو گواہوں کا جیسا کہ فی زمانہ رائج ہے، یہی ضروری ہے یا صرف موجود رہنا کافی ہے؟

۳ بعد نکاح منکوحہ کے پاس روبرو شخص خاص کو جا کر نکاح کی اطلاع بھی دینا ضروری ہے یا کسی طرح اطلاع ہوجانا کافی ہے؟

۴ استیذان غیر ولی میں تکلم بلسان شرط ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے: ”وإذا استأذنها الولي فسكتت أو ضحكت فهو إذن، وإن فعل هذا غير الولي لم يكن رضا حتى تتكلم به“ [جب ولی اس (لڑکی) سے (نکاح کی) اجازت طلب کرے تو وہ خاموش رہے یا ہنسنے لگے تو یہ اجازت شمار ہوگی اور اگر غیر ولی یہ کام کرے تو جب تک وہ بول کر اجازت نہ دے تو یہ (اس کی خاموشی وغیرہ) اس کی رضا شمار نہیں ہوگی] اور ما نحن فیہ میں یہ نکاح بوجہ ترکِ استیذان ہندہ کے اجازت پر موقوف ہے، جیسا کہ ہدایہ میں ہے: ”وتزويج العبد والأمة بغير إذن مولاهما فهو موقوف، فإن أجازه المولى جاز، وإن رده بطل، وكذلك لو زوج رجل امرأة بغير رضاها أو رجلا بغير رضاه“ [غلام اور لونڈی کے آقا کی اجازت کے بغیر کیا ہوا نکاح موقوف ہوگا۔ اگر ان کا آقا نکاح کی اجازت دے دے تو جائز ہے اور اگر وہ اس کو رد کر دے تو نکاح باطل ہوگا۔ یہی حکم اس صورت میں بھی ہوگا، جب کوئی آدمی عورت کی رضا کے بغیر یا مرد کی رضا کے بغیر ان کا نکاح کر دے] پس استیذان اور اجازت شرعاً دو شے ہے یا شے واحد؟ اگر دو شے ہے تو جس طرح استیذان غیر ولی میں تکلم باللسان شرط ہے، اسی طرح تکلم باللسان اجازت میں بھی شرط ہے یا نہ اور ہر واحد کے بقول مفتیٰ بہ اجمالاً یا جداگانہ کیا تعریف ہے؟

۵ مجرد سکوت دلیل اجازت ہے یا نہ؟ اور اگر بالفرض مجرد سکوت دلیل اجازت نہیں ہے تو خلوتِ صحیحہ دلیل اجازت ہوگی یا نہ؟

جواب اس صورت میں نکاح صحیح و نافذ ہو جائے گا، تجدیدِ نکاح و صریح اقرار ہندہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لما سيأتي.

۱ اس صورت میں کہ پدر ہندہ نے بکر کو یہ لکھا اور احمد کی زبانی بھی کہلا بھیجا کہ زید وہاں موجود ہے، بعوض ایک ہزار روپیہ کے نکاح کر دے، زید وکیل منجانب پدر ہندہ قرار پائے گا اور اس کا نکاح کیا ہوا پدر ہندہ کا نکاح کیا ہوا سمجھا جائے گا، اس لیے کہ وکیل کا فعل عین موکل کا فعل تصور کیا جاتا ہے اور جب بکر بالغہ کا نکاح اس کا ولی کر دے اور اس نکاح کی خبر اس کو کوئی ایک ہی فضولی کر دے، جو عدل ہو یا دو مستور فضولی کر دیں اور وہ اس خبر کو سن کر سکوت کرے تو ایسا سکوت دلیلِ رضا ہوتا ہے، بس اسی طرح جب وکیل نکاح کر دے اور باقی حالت بدستور ہو تو سکوت

مذکور دلیلِ رضا ہوگا اور مانحن فیہ تو ہندہ کو نکاح کی خبر بتواتر پہنچ گئی تھی، جو دو ایک فضولی کی خبر سے کہیں بڑھ کر ہے تو اس صورت میں تو ہندہ کا سکوت بطریق اولیٰ دلیلِ رضا ہوگا۔ درمختار میں ہے:

"فإن استأذنها هو أي الولي، وهو السنة، أو وكيله أو رسوله، أو زوجها وليها، وأخبرها رسوله أو فضولي عدل فسكتت عن رده مختارة أو ضحكت غير مستهزئة أو تبسمت أو بكت بلا صوت، فلو بصوت، لم يكن إذنا ولا ردا حتى لو رضيت بعده انعقد. سراج وغيره. فما في الوقاية والملتقىٰ فيه نظر، فهو إذن"[1] انتهى

[اگر ولی اس (عورت) سے (نکاح کی) اجازت طلب کرے اور سنت طریقہ یہی ہے، یا اس (ولی) کا وکیل یا اس کا ایلچی اجازت طلب کرے یا اس (عورت) کا ولی اس کا نکاح کر دے اور ولی کا ایلچی یا عادل فضولی اس (عورت) کو اس کی خبر دے تو وہ مختار ہونے کے باوجود اس کو رد کرنے سے خاموش رہے یا بغیر استہزا کے ہنسنے لگے یا تبسم کرے یا بغیر آواز کے رونے لگے تو یہ اجازت ہوگی نہ انکار۔ لیکن اگر وہ بعد میں راضی ہوجائے تو یہ نکاح منعقد ہوجائے گا۔ وقایہ اور ملتقی میں جو مذکور ہے، وہ محلِ نظر ہے، درحقیقت یہ اجازت تصور ہوگی]

شامی (۲/ ۲۹۶ مصری) میں ہے:

"قوله: أو فضولي عدل. شرط في الفضولي العدالة أو العدد فيكفي إخبار واحد عدل أو مستورين عند أبي حنيفة"

[اس کا یہ قول: یا عادل فضولی۔ فضولی میں عدالت یا عدد کی شرط لگائی گئی ہے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایک عادل یا دو مستور افراد کا خبر دینا کافی ہے]

اگر بالفرض زید وکیل منجانب پدر ہندہ نہ ہو، بلکہ فضولی قرار دیا جائے تو بھی بغیر تصریح اذن باللسان ہندہ کے یہ نکاح نافذ ہوگا۔ اس لیے کہ ہندہ کی رضا سے خلوتِ صحیحہ کا ہونا تصریحِ اذن سے بڑھ کر ہے۔ شامی (ص: ۳۰۱) میں ہے:

"لأنه إذا ثبت الرضا بالقول يثبت بالتمكين من الوطي بالأولىٰ، لأنه أدل على الرضا" اھ

[کیوں کہ جب بول کر اجازت دینے سے رضا ثابت ہوجاتی ہے تو اپنے اوپر وطی کی قدرت دینے سے تو بالاولیٰ ثابت ہوجائے گی، اس لیے کہ یہ رضا کی زیادہ صراحت کرتا ہے]

۲ انعقادِ نکاح کے وقت گواہوں کا ہونا، یعنی موجود رہنا کافی ہے، ان کا نام زد کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے:

"ولا ينعقد نكاح المسلمين إلا بحضور شاهدين... الخ"[2]

[مسلمانوں کا نکاح گواہوں کی موجودگی ہی میں منعقد ہوتا ہے... الخ]

---

[1] الدر المختار مع رد المحتار (۳/ ۵۹)

[2] الهداية (۱/ ۱۹۰)

۳ بعد نکاح کے منکوحہ کو نکاح کی اطلاع ہوجانا خواہ ولی خود اطلاع دے یا اُس کا کوئی فرستادہ اطلاع دے یا کوئی ایک فضولی اطلاع دے، کافی ہے۔ عبارت درمختار و شامی منقولہ نمبر (۱) ملاحظہ ہو۔

۴ استیذان کے معنی ہیں اذن طلب کرنا اور اجازت کے معنی ہیں اذن دینا۔ استیذان خواہ ولی اقرب کرے یا غیر ولی اقرب، ان دونوں میں سے کسی صورت میں بھی اجازت، یعنی اذن دینا تکلم باللسان پر موقوف نہیں ہے۔ ہاں پہلی صورت میں مجرد سکوت کافی ہے اور دوسری صورت میں سکوت کے ساتھ کسی فعل دال علی الرضا کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ کما سیأتی تفصیله.

۵ استیذانِ ولی اقرب کی صورت میں مجرد سکوتِ بکر بالغہ تحقیقِ اذن کے لیے کافی ہے اور استیذان غیر ولی اقرب کی صورت میں مجرد سکوت کافی نہیں ہے، بلکہ سکوت کے ساتھ بکر بالغہ کی جانب سے کسی ایسے فعل کا پایا جانا بھی ضروری ہے، جو اذن اور رضا مندیِ نکاح پر دال ہو، جیسے مہر یا نفقہ طلب کرنا یا قبول کرنا وغیرہ وغیرہ اور خلوتِ صحیحہ بھی جو برضا ہو، اس میں داخل ہے، یعنی وہ دلیلِ اجازت ہے۔ درمختار میں ہے:

”فإن استأذنها غير الأقرب كأجنبي أو ولي بعيد، فلا عبرة لسكوتها، بل لا بد من القول كالثيب البالغة، لا فرق بينهما إلا في السكوت، لأن رضاهما يكون بالدلالة كما ذكره بقوله: ”أو ما هو في معناه“ من فعل يدل على الرضا، كطلب مهرها ونفقتها وتمكينها من الوطي ودخوله بها برضاها. ظهيريه، وقبول التهنية والضحك سرورا ونحو ذلك“[1] والله أعلم

[پھر اگر قرابت دار کے سوا کوئی اور اس (عورت) سے اذن (نکاح) طلب کرے، جیسے اجنبی یا دور کا ولی تو ایسی صورت میں عورت کی خاموشی کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ثیبہ بالغہ کی طرح اس کا بول کر اجازت دینا ضروری ہے۔ ان دونوں کے درمیان صرف خاموشی کا فرق ہے، کیوں کہ ان دونوں کی رضا دلالت کے ساتھ ہوگی، جیسے اس نے اپنے اس قول کے ساتھ ذکر کیا: ''یا جو اس کے معنی و مفہوم میں ہو'' یعنی اس کی طرف سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جو اس کی رضا پر دلالت کرتا ہو، جیسے اس (عورت) کا مہر اور نفقہ طلب کرنا، شوہر کو اپنے اوپر وطی کی قدرت فراہم کرنا اور اس (شوہر) کا اس (عورت) کی اجازت کے ساتھ اس پر داخل ہونا (شادی کی) مبارک باد کو قبول کرنا اور خوشی سے ہنس دینا وغیرہ]

کتبہ: محمد عبداللہ (۹/ رجب ۱۳۳۰ھ)

سوال زید نے اپنے لڑکے بکر کو حالتِ نابالغیت میں خالد کے سپرد کیا تھا اور لڑکا بکر گھر میں خالد کے برابر پرورش پاتا رہا۔ جب لڑکا بالغ ہوا تو خالد نے اپنی لڑکی مسماۃ ہندہ کا نکاح اس سے کر دیا، چنانچہ مسماۃ ہندہ کو زوج بکر سے لڑکی

[1] الدر المختار مع رد المحتار (۳/ ٦٣)

مسماۃ رحمت پیدا ہوئی، جو ہنوز نابالغہ ہے۔ عرصہ تین سال سے زیادہ ہوا کہ حسبِ رسم و رواج برادری لڑکی رحمت کو منسوب باجازت بکر کے خالد نے عمرو سے کیا اور بکر و مسماۃ ہندہ اس تقررِ نسبت میں رضا مند تھے اور ہیں اور بکر بوجہ بدچلنی اپنی چند دفعہ ماخوذ ہو کر سزا یافتہ جیل کا ہوا، اس وجہ سے مسماۃ ہندہ نے ہمیشہ اپنے باپ خالد کے گھر رہنا اختیار کیا، جو آج تک موجود ہے اور رحمت نے بھی ماں کے ہمراہ برابر اپنے نانا خالد کے گھر پرورش پائی۔

چنانچہ مسمی خالد ہمیشہ متکفل اس کے ضروری امورات کے ہوتے رہے ہیں اور عرصہ ایک ماہ کا ہوتا ہے کہ بکر نے بالمشافہہ چند آدمیوں کے اختیار نکاح کا خالد کو دیا ہے، چنانچہ خالد اس اختیار کے سبب سے رحمت کا بیاہ کرنا چاہتا ہے، تاریخ بارات کی مقرر ہو چکی ہے اور بکر بوجہ بدچلنی و آوارگی اپنی بالفعل ایک مقدمہ فوجداری میں غیر ضلع ماخوذ ہو کر سزا جیل کی پائی ہے، تاریخ معینہ کو بارات میں شریک نہیں ہوسکتا ہے تو خالد اس اختیار سے اپنے جو اس کو بکر سے چند دفعہ حاصل ہوا ہے، رحمت کا نکاح وکالت سے اپنی عمرو سے کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں کہ بکر خالد کو اس امر کا اختیار دے چکا ہے کہ رحمت کا نکاح عمرو سے کر دے، خالد رحمت کا نکاح عمرو سے وکالتاً کرسکتا ہے اور یہ نکاح اس نکاح کے برابر ہے جو بکر خود کرتا۔ وکیل کا فعل عین موکل کا فعل سمجھا جاتا ہے۔ نکاح بوکالت کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں اور اس مسئلے میں کسی کو خلاف نہیں ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ

باپ کی عدمِ دلچسپی کی صورت میں ولایتِ نکاح کا حق دار:

سوال ایک لڑکی بالغہ اور اس کی ماں کو اس کے باپ نے ناپرسازی میں ڈال رکھا ہے، بلکہ نان نفقہ کا بھی کفیل نہیں۔ ناداری نہیں، بلکہ بے رغبتی کے سبب سے بالغہ کے نکاح کی طرف اصلاً توجہ نہیں کرتا۔ اس کی ماں نکاح کرا دینا چاہتی ہے، اس صورت میں بغیر اذن باپ کے اس کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ جواب با صواب سے عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور ہوں۔

جواب اس لڑکی کا نکاح اس کی ماں نہیں کروا سکتی، اس لیے کہ عورت کا نکاح اذنِ ولی کے بغیر نہیں ہوسکتا اور عورت ولی نہیں ہوسکتی۔ پس اس صورت میں باپ کو ہدایت کی جائے کہ لڑکی مذکورہ کا نکاح کرا دے اور بے توجہی سے باز آئے۔ اگر اس پر بھی نہ مانے تو ولایت سے معزول ہو جائے گا اور بجائے اس کے اس لڑکی کا کوئی اور ولی اس کا نکاح کرا دے اور اگر کوئی اس کا ولی نہ ہو تو سلطان اس کا نکاح کرا دے، کیونکہ جس عورت کا کوئی ولی نہ ہو تو سلطان ہی اس کا ولی ہے۔

نیل الاوطار (۶/۳۳) میں حدیثِ معقل بن یسار کے تحت میں ہے:

"وفي حديث معقل هذا دليل على أن السلطان لا يزوج المرأة إلا بعد أن يأمر وليها بالرجوع عن العضل فإن أجاب فذاك وإن أصرَّ زوَّجها" اھ

[معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ سلطان کسی عورت کا نکاح کرانے سے

پہلے اس کے ولی کو حکم دے کہ وہ عورت کو نکاح سے روکنے والے عمل سے باز آجائے، اگر تو وہ یہ بات مان لے تو ٹھیک، ورنہ اس کے اس عمل پر اصرار کی صورت میں سلطان اس کا نکاح کرا دے]

مشکوۃ (ص: ۲۶۲) میں ہے:

عن عائشة أن رسول اللهﷺ قال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل ... فالسلطان ولي من لا ولي له»[1]

(رواه أحمد والترمذي و أبو داود و ابن ماجه والدارمي)

[سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل (کالعدم) ہے، جس کا کوئی ولی (سرپرست) نہ ہو، بادشاہ اس کا ولی (سرپرست) ہے]

صحیح بخاری (۱۵۲/۳) میں ہے:

"باب من قال: لا نكاح إلا بولي، لقول الله تعالىٰ: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ فدخل فيه الثيب، وكذلك البكر، وقال: ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ وقال: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ...﴾ أخبرني عروة بن الزبير، أن عائشة زوج النبيﷺ أخبرته أن النكاح في الجاهلية كان على أربعة أنحاء، فنكاح منها نكاح الناس اليوم، يخطب الرجل إلى الرجل وليته أو ابنته فيسبقها ثم ينكحها ... فلما بعث محمدﷺ بالحق هدم نكاح الجاهلية كله إلا نكاح الناس اليوم... عن الحسن قال: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ قال: حدثني معقل بن يسار أنها نزلت فيه. قال: زوجت أختا لي من رجل فطلقها حتى إذا انقضت عدتها، جاء يخطبها، فقلت له: زوجتك، و فرشتك، وأكرمتك، فطلقتَها، ثم جئت تخطبها، لا والله لا تعود إليك أبدا، وكان رجلا لا بأس به، وكانت المرأة تريد أن ترجع إليه، فأنزل الله هذه الآية ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ فقلت: الآن أفعل يا رسول الله، قال: فزوجها إياه"[2] والله تعالىٰ أعلم

[باب: جس نے کہا کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''پس تم ان کو مت روکو'' اس میں ثیبہ اور باکرہ سب داخل ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اور (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ''اور اپنے میں

[1] مسند أحمد (٦/ ٦٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٣٧)

سے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دو۔'' مجھے عروہ بن زبیر نے خبر دی کہ بلاشبہہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو خبر دی کہ زمانۂ جاہلیت میں چار طرح سے نکاح ہوتے تھے: ایک صورت تو یہی تھی، جیسے آج کل لوگ کرتے ہیں، ایک شخص دوسرے شخص کے پاس اس کی زیرِ پرورش لڑکی یا اس کی بیٹی کے نکاح کا پیغام بھیجتا اور اس کی طرف پیش قدمی کر کے اس سے نکاح کرتا... پھر جب محمد ﷺ حق کے ساتھ رسول بن کر آئے تو آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام نکاح باطل قرار دیے۔ صرف اس نکاح کو باقی رکھا، جس کا آج کل رواج ہے... حسن رحمہ اللہ سے آیت: ﴿فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ﴾ کی تفسیر میں مروی ہے، کہ ہمیں معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ یہ آیت انھی کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ معقل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص سے کر دیا تھا۔ اس نے اسے طلاق دے دی، لیکن جب عدت پوری ہوئی تو وہ شخص پھر اس (میری بہن) سے نکاح کا پیغام لے کر آیا۔ میں نے اس سے کہا: میں نے تم سے (اپنی بہن کا) نکاح کیا۔ اسے تیری بیوی بنایا اور تمھیں عزت دی، لیکن تم نے اسے طلاق دے دی اور اب پھر تم اس سے نکاح کا پیغام لے کر آئے ہو! ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اب میں تمھیں کبھی اسے نہ دوں گا۔ وہ شخص (ابو البداح) کوئی آدمی برا نہیں تھا اور عورت بھی اس کے پاس واپس جانا چاہتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''تم ان (عورتوں) کو مت روکو'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اب میں کر دوں گا۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر انھوں نے اپنی بہن کا نکاح اس شخص سے کر دیا]

اگر ولی نکاح میں رکاوٹ بنے؟

سوال ہندہ (جو ثیبہ ہے) کے والدین اس کا نکاح عمرو سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہندہ اس کو منظور نہیں کرتی۔ وہ کہتی ہے کہ میرا نکاح خالد سے کر دو۔ والدین اس کو منظور نہیں کرتے۔ اہلِ محلہ نے و نیز علمائے محلہ نے ہندہ کے والدین کو سمجھایا کہ ہندہ کی مرضی کے مطابق اس کا نکاح کر دو، لیکن والدین کسی طرح بھی راضی نہیں ہوتے اور ہندہ بھی اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے اور ہندہ نے بھی ہر طرح سے والدین کے رضا کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ ایسی صورت میں اگر ہندہ بلا رضائے والدین خالد سے نکاح کرے تو کیا یہ نکاح درست و نافذ ہوگا اور اگر امورِ نکاح کے انجام دہی کے لیے والدین کے علاوہ کسی شخص کو سرپرست مقرر کرے تو اس کا یہ فعل درست ہوگا؟

المستفتی: مولوی عبدالمجید بن مولوی عبداللطیف۔ بنارس۔ مدنپورہ۔

جواب اس صورت میں والدِ ہندہ کو چاہیے کہ ہندہ کا نکاح خالد سے کر دے، بشرطیکہ اس میں کوئی محذورِ شرعی (جیسے بے دینی وغیرہ) نہ ہو اور اگر والدِ ہندہ اس صورت میں ہندہ کا نکاح خالد سے نہ کر دے تو وہ ولایتِ ہندہ سے معزول ہو جائے گا اور اس صورت میں اگر ہندہ بلا رضائے والد دوسرے کے اذن سے جس کا درجۂ ولایت والد کے بعد ہو، خالد سے نکاح کر لے تو یہ نکاح درست و نافذ ہوگا اور مجرد ہندہ کا کسی شخص کو جو اس کا ولی نہ ہو، سرپرست مقرر کر کے اس کے اذن سے

نکاح کر لینا جوازِ نکاح کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ نکاح بلا اذنِ ولی ہے، جو نصاً باطل ہے۔

مشکوۃ (ص: ۲۶۲) میں ہے:

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «لا تنكح الأيم حتى تستأمر، ولا تنكح البكر حتى تستأذن»[1] الحديث (متفق عليه)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیوہ کا نکاح نہ کیا جائے، حتی کہ اس سے مشورہ کر لیا جائے اور کنواری کا نکاح نہ کیا جائے، مگر اس کی اجازت سے]

وعن عائشة رضی اللہ عنہا أن النبي ﷺ قال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل... الحديث، وفيه: فإن اشتجروا فالسلطان ولي من لا ولي له»[2]

(رواه أحمد والترمذي وأبو داود وابن ماجه والدارمي)

[سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ بلاشبہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: جو عورت اپنے ولی (سرپرست) کی اجازت کے بغیر نکاح کر لے تو اس کا نکاح باطل ہے۔ اور اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں: اگر ان (اولیا) کا اختلاف ہو تو سلطانِ وقت ہر اس عورت کا ولی ہے، جس کا کوئی ولی نہ ہو]

نیل الاوطار (۶/۳۳) میں ہے:

"وفي حديث معقل هذا دليل على أن السلطان لا يزوج المرأة إلا بعد أن يأمر وليها بالرجوع عن العضل فإن أجاب فذاك، وإن أصر زوجها. والله تعالىٰ أعلم"

[معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں یہ دلیل ہے کہ سلطان کسی عورت کا نکاح کرانے سے پہلے اس کے ولی کو حکم دے کہ وہ (اپنی مولیہ کو) نکاح سے روکنے کے عمل سے باز آجائے، اگر تو وہ بات مان لے تو درست اور اگر وہ اپنے فعل پر مصر رہے تو پھر سلطان اس عورت کا نکاح کرا دے]

كتبه: محمد عبد الله (٦/ جمادى الآخره ١٣٣١هـ)

ولی کے بغیر نکاح کا حکم اور دو حدیثوں میں تطبیق:

سوال عورت بالغہ مطلقہ بغیر اذن اپنے والد کے اپنا نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کر لیا تو جائز ہوگا یا نہیں؟ قرآن و حدیث سے جو حکم ہو بیان فرمایا جائے اور حدیث «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل» اور حدیث «والأيم أحق بنفسها من وليها» میں کیا صورت جمع کی ہے؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١٩)

[2] مسند أحمد (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

قصبہ شکوہ آباد۔ضلع حسین پور (یا جن پور) بازار کٹرا اندرون پھاٹک بر مکان میاں محمد حسین جنرل مرچنٹ ابو الحسن کو ملے۔

جواب کوئی عورت بغیر اذن اپنے ولی کے اپنا نکاح نہیں کر سکتی۔ صحیح بخاری (۱۵۴/۳ طبع مصر) میں ہے:

"باب من قال: لا نكاح إلا بولي، لقول الله تعالىٰ: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ فدخل فيه الثيب، وكذلك البكر، وقال: ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ وقال: ﴿وَاَنْكِحُوْا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ (إلى قوله) أن عائشة زوج النبيﷺ أخبرته أن النكاح في الجاهلية كان علىٰ أربعة أنحاءٍ فنكاح منها نكاح الناس اليوم، يخطب الرجل إلى الرجل وليته أو ابنته فيصدقها ثم ينكحها (إلى قولها) فلما بعث محمدﷺ بالحق هدم نكاح الجاهلية كله إلا نكاح الناس اليوم (إلى آخر الباب)"[1]

[جس نے کہا کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''پس تم ان کو مت روکو۔ اس میں ثیبہ اور باکرہ سب شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے: ''اور (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ''اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دو'' ... مجھے عروہ بن زبیر نے خبر دی، بلاشبہہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو خبر دی کہ زمانۂ جاہلیت میں چار طرح سے نکاح ہوتے تھے: ایک صورت تو یہی تھی، جیسے آج کل لوگ کرتے ہیں، ایک شخص دوسرے شخص کے پاس اس کی زیرِ پرورش لڑکی یا اس کی بیٹی کے نکاح کا پیغام بھیجتا اور اس کی طرف پیش قدمی کر کے اس سے نکاح کرتا... پھر جب محمد ﷺ حق کے ساتھ رسول بن کر آئے تو آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام نکاح باطل قرار دیے۔ صرف اس نکاح کو باقی رکھا، جس کا آج کل رواج ہے...]

حدیث: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل»[2] اور حدیث: «الأيم أحق بنفسها من وليها»[3] میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ جمع کی ضرورت ہو، اس لیے کہ حدیث اول و نیز آیات و دیگر احادیثِ مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی عورت بغیر اذن اپنے ولی کے اپنا نکاح نہیں کر سکتی اور حدیثِ ثانی سے اس کا خلاف ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی عورت اپنا نکاح بغیر اذن اپنے ولی کے بھی کر سکتی ہے، بلکہ حدیثِ ثانی میں صرف اس قدر مذکور ہے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٣٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢١)

کہ ایّم عورت اپنے نفس کے ساتھ بہ نسبت اپنے ولی کے زیادہ حق رکھتی ہے، مگر اس حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ عورت مذکورہ کس امر میں بہ نسبت اپنے ولی کے زیادہ حق رکھتی ہے؟

ظاہر یہ ہے کہ اذن میں بہ نسبت ولی کے زیادہ حق رکھتی ہے، پس اس صورت میں اس حدیث سے صرف اس قدر ثابت ہوگا کہ اگر عورت مذکورہ کے اذن اور اس کے ولی کے اذن میں تعارض واقع ہو تو عورت مذکورہ کا اذن ولی کے اذن پر مقدم سمجھا جائے گا، یعنی اگر عورت مذکورہ کا ولی اس کے کسی کفو شخص سے اس کا نکاح کر دینا چاہے اور عورت مذکورہ اس نکاح کو نامنظور کرے تو ولی عورت مذکورہ کا نکاح اس شخص سے نہیں کر سکتا اور اگر عورت مذکورہ چاہے کہ میرا نکاح فلاں شخص کفو ~~سے~~ کر دیا جائے تو ولی کو اس کا نکاح اس شخص سے کر دینا ہوگا اور اگر ولی نا منظور کرے گا اور نا منظوری پر اصرار کرے گا تو ولیِ مذکور ولایت سے معزول ہو جائے گا اور عورت مذکورہ کا کوئی اور ولی جو درجۂ ولایت میں ولی مذکور کے بعد ہے، عورت مذکورہ کا نکاح اس شخص سے کر دے گا اور اگر وہ بھی نامنظور کرے گا اور نا منظوری پر اصرار کرے گا تو وہ بھی معزول ہو جائے گا اور اس کے بعد کے درجہ کا ولی عورت مذکورہ کا نکاح اس شخص سے کر دے گا اور اگر عورت مذکورہ کے تمام اولیا اسی طرح نامنظور کرتے جائیں گے تو سب کے سب معزول ہوتے چلے جائیں گے اور جب کوئی ولی باقی نہ رہے گا تو آخر میں سلطان اس کا نکاح کر دے گا کہ اس صورت میں سلطان ہی اس کا ولی ہے، جیسا کہ حدیث اول کے آخر میں ہے: «فالسلطان ولي من لا ولي له»[1]

الحاصل حدیثِ ثانی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عورت مذکورہ اپنا نکاح بغیر اذن اپنے ولی کے کر سکتی ہے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ اذنین کے تعارض کے وقت عورت مذکورہ کا اذن مقدم سمجھا جائے گا، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور ظاہر ہے کہ اس معنی میں اور حدیثِ اول کے معنی میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ جمع کی ضرورت ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبداللہ (۲٦/ جمادی الآخرہ ۱۳۳۱ھ)

نکاح کے بعد ولی کی رضا کا حکم:

سوال ایک شخص مسافرت کو گیا ہے اور اس کی لڑکی کا نکاح جو نابالغ ہے، بھائی نے بلا اِذن اس کے کر دیا اور جب وہ باہر سے آیا تو اس کے بھائی نے اس کی لڑکی کا جو نکاح کر دیا تھا، اس کو سن کر راضی ہے، تو یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟

جواب بہ صورتِ نکاح جائز ہے۔

بیٹے کی موجودگی میں دادا ولی نہیں بن سکتا:

سوال اگر باپ بیٹے میں نا اتفاقی ہو اور باپ اپنے بیٹے کی لڑکی، یعنی اپنی پوتی کا عقد اپنے بیٹے کے ہوتے ہوئے، یعنی بغیر بیٹے کی رضا مندی کے کسی سے نکاح کر دے تو یہ نکاح جائز ہوا یا ناجائز؟

جواب یہ نکاح ناجائز ہوا، اس لیے کہ باپ کے رہتے ہوئے دادا ولی نہیں ہے۔ پس یہ نکاح بلا اجازت ولی کے ہوا اور

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۰۸۳)

جو بلا اجازت ولی کے ہو باطل اور ناجائز ہے۔ صحیح بخاری (۳/۱۵۴ مصری) میں ہے:

"باب من قال: لا نكاح إلا بولي، لقول الله تعالىٰ: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ فدخل فيه الثيب، وكذلك البكر، وقال: ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ وقال ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾... أن عائشة زوج النبيﷺ أخبرته أن النكاح في الجاهلية كان على أربعة أنحاء فنكاح منها نكاح الناس اليوم، يخطب الرجل إلى الرجل وليته أو ابنته فيصدقها فينكحها... فلما بعث محمدﷺ بالحق هدم نكاح الجاهلية كله إلا نكاح الناس اليوم... إلى آخر الباب"[1] والله تعالىٰ أعلم بالصواب

[جس نے کہا کہ ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''پس تم ان کو مت روکو۔'' اس میں ثیبہ اور باکرہ سب شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے: ''اور (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ''اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کر دو'' ... مجھے عروہ بن زبیر نے خبر دی، بلاشبہہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو خبر دی کہ زمانۂ جاہلیت میں چار طرح سے نکاح ہوتے تھے۔ ایک صورت تو یہی تھی، جیسے آج کل لوگ کرتے ہیں، ایک شخص دوسرے شخص کے پاس اس کی زیرِ پرورش لڑکی یا اس کی بیٹی کے نکاح کا پیغام بھیجتا اور اس کی طرف پیش قدمی کر کے اس سے نکاح کرتا... پھر جب محمد ﷺ حق کے ساتھ رسول بن کر آئے تو آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام نکاح باطل قرار دیے۔ صرف اس نکاح کو باقی رکھا، جس کا آج کل رواج ہے ...] کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۲/ ذی القعدۃ ۱۳۳۹ھ)

ولی کے بغیر اور خفیہ نکاح کا حکم:

سوال ایک شخص کی ایک بیوہ لڑکی بالغہ اور ذی جمال ہے، جس کی نسبت دو تین جگہوں سے آتی رہی اور اس کے والد بھی حسبِ خواہ اپنے نکاح کرانے کا ارادہ رکھتے تھے، ناگاہ اس نسبتی کا ایک شخص اس پر عاشق ہوگیا اور کٹنیوں [نائکہ] کے ذریعے سے بلوا کر اس سے نکاح کرنے کے لیے اپنی بی بی کو بلاقصور طلاق دے دیا، بعدہ خفیہ طور پر نکلوا کر غیر بستی کے دو شخصوں کے سامنے نکاح کیا، یہاں تک کہ اس بستی کے کسی شخص کو نہ اس کے ولی کو اس کی خبر ہے اور اس کے ولی لوگ بیزار و ناراض ہیں۔ ایسی حالت میں ایسا نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟ المستفتی: محمد نزول الحق آرہ۔ خیراتی مسجد

جواب مذکورہ بالا نکاح دو وجہوں سے صحیح نہیں ہے:

(۱) خفیہ طور پر کیا گیا، حالانکہ اس کی ممانعت ہے اور نکاح میں اعلان کا حکم ہے۔ لقولہ تعالیٰ: ﴿وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٣٤)

أَخْدَانٍ﴾ (سورة المائدة: ٥) [اور نہ چھپی آشنائیں بنانے والے] شاہ ولی اللہ صاحب مصفی ترجمہ موطا میں فرماتے ہیں: ''مترجم می گوید قول خدائے تعالیٰ: ﴿وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ أَخْدَانٍ﴾ دلالت می کند بتحریم نکاح سر'' (مصفی: ۲/۳) [مترجم کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ أَخْدَانٍ﴾ خفیہ نکاح کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے]

ولقوله عليه السلام «أعلنوا النكاح» [1] (رواه أحمد و صححه الحاكم، عن عامر بن عبدالله بن الزبير عن أبيه. بلوغ المرام، كتاب النكاح)

[نیز (خفیہ نکاح) آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے (بھی جائز نہیں ہے): نکاح کا اعلان کرو]

② اس لیے کہ بغیر اجازت ولی کے محض عورت کی خواہش کے موافق کیا گیا، حالانکہ ولی کی اجازت شرط ہے اور عورت بغیر اجازت ولی کے نکاح کی مختار نہیں۔ لقوله عليه السلام «لا نكاح إلا بولي» [2]

[آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے: ولی (کی اجازت) کے بغیر نکاح نہیں ہوتا]

وقال: «أيما امرأة نكحت بغير إذن وليها فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فنكاحها باطل، فإن دخل بها فلها المهر بما استحل من فرجها» [3]

[اور آپ ﷺ نے فرمایا: جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے۔ اگر شوہر اس سے صحبت کر لے تو اس کو مہر دینا پڑے گا، کیوں کہ اس نے اس کی شرم گاہ کو حلال کیا ہے]

وقال: «لا تزوج المرأة المرأة. ولا تزوج المرأة نفسها، فإن الزانية هي التي تزوج نفسها» [4] (مشكوة باب، الولي في النكاح)

[آپ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے، نہ عورت خود اپنا نکاح کرے کیوں کہ بدکار عورت ہی اپنا نکاح خود کرتی ہے]

كتبه: نور الدين، عفي عنه. الجواب صحيح. كتب محمد عبدالله (٢٤/ رمضان المبارك)

الجواب صحيح. كتبه: أبو يوسف محمد عبدالمنان الغازيفوري

گواہوں کے بغیر نکاح کا حکم:

سوال ہندہ کا نکاحِ ثانی زید سے ہوا، لیکن گواہ و وکیل بوقتِ نکاح نہ تھا۔ صرف ایک شخص نکاح پڑھانے والا تھا

① مسند أحمد (٤/ ٥) بلوغ المرام (٩٨٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٥٢)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٠)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٧٩)

④ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٢)

تو ایسی حالت میں نکاح ہندہ کا زید سے شرعاً صحیح و درست ہوا یا کہ نہیں؟ جواب اس کا ازروئے حدیث شریف و کتاب اللہ کے مرحمت ہو۔

جواب صورت مذکورہ میں نکاح ہندہ کا زید سے صحیح و درست نہیں ہوا۔ صحتِ نکاح میں کم از کم دو گواہ شرط ہیں۔

عن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ: «لا نكاح إلا بولي، وشاهدي عدل، وما كان من نكاح علىٰ غير ذلك فهو باطل» الحديث

(أخرجه ابن حبان في صحيحه، نصب الراية لأحاديث الهداية: ٢/ ٢)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ولی (کی اجازت) اور دو عادل گواہوں (کی موجودگی) کے بغیر کوئی نکاح صحیح نہیں ہوتا۔ جو نکاح اس طریقے کے سوا ہو، وہ باطل ہے] والله أعلم بالصواب

كتبه: محمد عبدالله. المجيب مصيب. نمقه أضعف عباد الرحمن: محمد سليمان، غفرله المنان. لقد أصاب من أجاب. كتبه: محمود، عفا الله عنه. لقد أصاب من أجاب. كتبه: نذير الدين حسين.

حق مہر کے مسائل

بیوی کو دیے ہوئے زیورات کا حکم:

سوال جو زیورات زوجہ منکوحہ کو شوہر کے عزیز و اقارب یا شوہر دیتے ہیں، یعنی ساس و سسر و ہمشیرہ شوہر وغیرہ نے دیا ہے، وہ ہبہ ہوتا ہے یا نہیں اور بعد طلاق کے شوہر یا دہندہ مذکورہ مطالبہ واپسی کا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جونپور، جامع مسجد کلاں۔ مدرسہ قرآنیہ فاروقیہ۔ محمد صدیق طالب علم

جواب زوجہ منکوحہ کو زیورات دینے والے اگر تصریح کر دیں کہ ہبتاً دیے ہیں تو اس صورت میں ہبہ ہوگا اور دینے والے واپس نہیں لے سکتے اور اگر تصریح کر دیں کہ عاریتاً دیے ہیں تو اس صورت میں عاریت ہوگا اور واپس لے سکتے ہیں اگر ہبہ و عاریت میں سے کسی بات کی تصریح نہ کریں تو اس صورت میں عرف معتبر ہوگا۔ پس اگر وہاں کا عرف ہبہ کا ہے تو ہبہ سمجھا جائے گا اور واپسی کا حق نہ ہوگا اور اگر عرف عاریت کا ہے تو عاریت سمجھا جائے گا اور واپسی کا حق ہوگا۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔ كتبه: محمد عبد الله (٦/ جمادى الآخر ١٣٣١هـ)

بیوی کی وفات کے بعد زرِ مہر کی حیثیت:

سوال ① زید نابالغ کا نکاح ہندہ نابالغہ سے ہوا۔ زید کا باپ ہندہ کو اپنے گھر میں نابالغی کی حالت میں اس شخص سے رخصت کرا لایا کہ بچپن ہی سے میرے گھر کا طریقہ سیکھے، پھر اپنے میکے چلی گئی اور وہاں سے اپنے ننھال آئی۔ اتفاق

سے ہندہ طاعون میں اپنی نانہال میں فوت کر گئی اور ترکہ میں صرف اپنا زرِ مہر چھوڑ گئی۔ آیا ہندہ کی تجہیز و تکفین اس کے ترکہ زرِمہر سے ہونی چاہیے یا اس کا باپ یا ماں یا شوہر اپنی طرف سے کرے؟ اگر باپ ماں نے اپنے پاس سے ہندہ کی تجہیز و تکفین کی؟

② زید چاہتا ہے کہ ہمیں زرِمہر دیتا ہے، میں اسی ترکہ سے تجہیز و تکفین میں جو صَرف ہو، اسے منہا کر کے مہر دوں تو زید ایسا کرسکتا ہے؟ ہندہ نانہال میں مری اور نانہال ہی میں تجہیز و تکفین ہوئی۔

③ ہندہ نابالغہ ہی تھی کہ زید کا باپ بغرض تعلیم طریقہ اپنے خاندان کے اس کو رخصت کرا لایا۔ زید کہتا ہے کہ ہندہ سے شادی تو ضرور ہوئی، مگر بوجہ نابالغیت قربت نہ ہوئی۔ آیا زید پر کل مہر ادا کرنا واجب ہے یا نصف، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں ایسی حالت میں دینا لکھا ہے اور آیت ﴿وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ [اور اگر تم انھیں اس سے پہلے طلاق دے دو کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، اس حال میں کہ تم ان کے لیے کوئی مہر مقرر کر چکے ہو تو تم نے جو مہر مقرر کیا ہے اس کا نصف (لازم) ہے] مطلقہ کے لیے خاص ہے یا متوفیہ کے لیے بھی؟ اگر متوفیہ کے لیے بھی ہے تو اس کا ثبوت شرعی کیا ہے؟

④ زید کے یہاں برادری میں ہمیشہ کا قدیم دستور ہے کہ جب کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کرتا ہے تو لڑکے کا باپ حسبِ رواج برادری کچھ زیورات بہو کو دیتا ہے۔ زید کے باپ نے بھی حسبِ رسم و رواج کے کچھ زیورات اپنی بہو کو دیا، مگر زیورات کا مالک نہ بنایا۔ بہو اپنے زیورات میں تصرفات مالکانہ مثل بیع و عاریت کے کچھ اختیار نہیں رکھتی۔ آیا یہ زیورات جو زید کے باپ نے ہندہ کو بغرض پہننے کے دیا، ہندہ کی ملکیت شمار ہو کر اس کا ترکہ قرار پا سکتا ہے اور مثل ترکہ مہر کے زیورات میں تقسیم ما بین الزوج زید و باپ ہندہ کے ہوسکتی ہے؟ زید کی برادری کا رسم و رواج ہے کہ جب بہو مر جاتی ہے اور میکہ میں مرتی ہے تو سارے زیورات میکہ والے اس کے شوہر کو واپس کر دیتے ہیں؟

جواب ① درباره تجہیز و تکفین مسئلہ یہ ہے کہ میت کے ترکہ سے کیا جائے (اگر کچھ چھوڑا ہو) پس اگر حالتِ نابالغی کا نکاح صحیح ہے، جیسا کہ جمہور کا خیال ہے تو اس تقدیر پر ہندہ کی تجہیز و تکفین ہندہ کے ترکہ زرِمہر سے کی جائے گی۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

② زید نے ہندہ کی تجہیز و تکفین اگر تبرعاً کی ہے تو زید یہ صَرفہ ہندہ کے زرِمہر سے منہا نہیں کر سکتا اور اگر ہندہ کے زرِمہر سے کی ہے، یعنی بوقتِ تجہیز و تکفین یہ نیت کر لی ہے کہ یہ تجہیز و تکفین ہندہ کے زرِمہر سے کرتا ہوں تو بر تقدیر صحتِ نکاح مذکور زید یہ صرف ہندہ کے زرِمہر سے منہا کر سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

③ زید پر بر تقدیر صحتِ نکاح مذکور ہندہ کا کل زرِمہر واجب الادا ہے، مگر چونکہ زید ہندہ کے نصف ترکہ کا وارث ہے، لہٰذا نصف مہرِ ہندہ زید کے ذمہ سے ساقط ہوگیا اور باقی نصف زید کے ذمہ واجب الادا ہے، جو ہندہ کے دیگر ورثہ کا حق ہے اور یہ آیت کریمہ: ﴿وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ (الآیۃ) [اور اگر تم انھیں اس سے

پہلے طلاق دے دو کہ انھیں ہاتھ لگاؤ] عورت مطلقہ کے ساتھ خاص ہے، چنانچہ خود آیتِ کریمہ میں لفظ ﴿طَلَّقْتُمُوْھُنَّ﴾ موجود ہے۔ عورت متوفاۃ کے کل مہر کے واجب ہونے کا ثبوت شرعی یہ حدیث ہے:

"عن علقمة عن ابن مسعود أنه سئل عن رجل تزوج امرأة، ولم يفرض لها شيئاً، ولم يدخل بها حتى مات، فقال ابن مسعود: لها مثل صداق نسائها، لا وكس ولا شطط، وعليها العدة، و لها الميراث، فقام معقل بن سنان الأشجعي فقال: قضى رسول اللهﷺ في بروع بنت واشق امرأة منا بمثل ما قضيت، ففرح بها ابن مسعود"[1]

(رواه الترمذي وأبو داود و النسائي والدارمي، مشكوة باب الصداق، ص: ٢٦٩، "وقال الترمذي: حديث ابن مسعود حديث حسن صحيح، وقد روي من غير وجه)

[علقمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک ایسے آدمی کے متعلق سوال کیا گیا، جس نے ایک عورت سے شادی کی، ابھی اس نے (مہر وغیرہ) کچھ مقرر نہ کیا تھا اور نہ اس سے صحبت ہی کی تھی کہ وہ فوت ہوگیا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اسے اس جیسی عورتوں کی مثل مہر ملے گا۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اسے عدت بھی گزارنی ہوگی اور اسے (خاوند سے) وراثت بھی ملے گی۔ (یہ سن کر) معقل بن سنان اشجعی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہماری ایک عورت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپ کے فیصلے جیسا فیصلہ کیا تھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس پر خوش ہوئے]

"سبل السلام شرح بلوغ المرام" (٢/ ٨٤) میں ہے:

"والحديث دليل على أن المرأة تستحق كمال المهر بالموت، وإن لم يسم لها الزوج، ولا دخل بها" اهـ والله تعالىٰ أعلم

[مذکورہ بالا حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت وفات پر مکمل مہر کی مستحق ہوگی، اگرچہ خاوند نے اس کے لیے مہر مقرر کیا ہو اور نہ اس کے ساتھ خلوت کی ہو]

④ زیورات مذکورہ نہ ہندہ کی ملکیت شمار ہوں گی اور نہ ترکہ قرار پا کر ورثہ ہندہ پر تقسیم ہوں گی، بلکہ زید کے باپ کو، جس نے یہ زیورات ہندہ کو بغرض پہننے کے دیے تھے، واپس دے دیے جائیں گے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (٢٩/ جمادی الاولیٰ ١٣٣٢ھ)

بیوی کی وفات کے بعد زرِ مہر کس کو دیا جائے؟

سوال کسی شخص کی بی بی مرگئی اور اس بی بی کا مہر شوہر کے ذمہ باقی رہ گیا ہے۔ اب شوہر اس دین مہر کو بی بی کے ماں باپ کو دے یا بی بی کی طرف سے راہِ خدا میں دے دے؟

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٥٤) مشكاة المصابيح (٢/ ٢٢٧)

جواب اگر بی بی کی کوئی اولاد نہیں ہے تو اس صورت میں بی بی کے مہر میں سے آدھا خود شوہر کا ہوا اور باقی آدھا بی بی کے ماں باپ کا ہوا اور اگر بی بی کی کوئی اولاد بھی ہے تو اس صورت میں بی بی کے مہر میں سے ایک چوتھائی شوہر کا ہوا اور باقی تین چوتھائی بی بی کی اولاد اور بی بی کے ماں باپ کا ہوا۔ واللہ أعلم بالصواب.

بیوی کی وفات کے بعد شوہر زرِ مہر کس کے سپرد کرے؟

اگر کوئی عورت مر جائے اور دینِ مہر نہ بخشا ہو۔ ماں باپ بھی اس کے مر گئے ہیں، صرف بھائی بہن زندہ ہیں تو اس حال میں شوہر اس کا مہر کس کو ادا کرے گا یا کس سے معاف کرائے گا؟

جواب:

اگر عورت نے اولاد نہیں چھوڑی ہے تو اس کے مہر میں سے (بعد تقديم ما تقدم على الإرث ورفع موانعه) نصف شوہر کا حق ہے، باقی نصف عورت کے بھائی بہن کا ہے۔ اگر باقی ادا کرے تو انھی کو ادا کرے اور معاف کرائے تو انھی سے معاف کرائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ﴾ [سورۂ نساء، رکوع ۲]

[اور تمھارے لیے اس کا نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑ جائیں، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو]

﴿وَإِنْ كَانُوْٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع آخر]

[اور اگر وہ کئی بھائی بہن مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا]

کیا عورت اپنا حق مہر معاف کر سکتی ہے؟

سوال جس عورت کی عمر ۱۶ سال کی ہو اور علاماتِ بلوغت کے جو ہوتے ہیں، وہ ہو گئے ہوں اور نکاح کے بعد وہ عورت اپنا زرِ مہر پہلی رات کو معاف کر دے تو مہر شرعی معاف ہو گیا یا نہیں؟

جواب جب عورت نے بعد بلوغ اپنا مہر بخوشی خاطر معاف کر دیا تو وہ مہر شرعاً معاف ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا﴾ [نساء، رکوع ۱]

[پھر اگر وہ اس میں سے کوئی چیز تمھارے لیے چھوڑنے پر دل سے خوش ہو جائیں تو اسے کھالو، اس حال میں کہ مزے دار، خوشگوار ہے]

کتبہ: محمد عبداللہ الغازیفوری (۷/ شعبان ۱۳۳۲ھ)

کیا زانیہ عورت مہر پا سکتی ہے؟

سوال جو عورت علانیہ فاحشہ ہو جائے اور نافرمان ہو اور زنا کیا کرے تو وہ عورت اپنے شوہر سے مہر پا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب ان افعال سے عورت بڑی گنہگار ہوتی ہے، لیکن اس سے مہر ساقط نہیں ہوتا، مہر پا سکتی ہے۔

سوال عورت زانیہ جس کا زنا ثابت ہو جائے گواہ سے یا اقرار سے، وہ عورت مہر دین اپنا پائے گی یا نہیں؟

جواب وہ عورت اگر مدخولہ شوہر ہو چکی ہے تو پورا مہر پانے کی مستحق ہے، ورنہ اگر قبل وطی طلاق ہو جائے اور مہر مقرر ہو تو نصف مہر پانے کی مستحق ہے، ورنہ صرف کچھ حسب حیثیت شوہر پانے کی مستحق ہے۔

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ [سورۂ نساء، رکوع ٤]

[پھر وہ جن سے تم ان عورتوں میں سے فائدہ اٹھاؤ، پس انھیں ان کے مہر دو، جو مقرر شدہ ہوں]

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ۝ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ [سورۂ بقرة، رکوع ٣١]

[تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو، جب تک تم نے انھیں ہاتھ نہ لگایا ہو، یا ان کے لیے کوئی مہر مقرر نہ کیا ہو اور انھیں سامان دو، وسعت والے پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگی والے پر اس کی طاقت کے مطابق ہے، سامان معروف طریقے کے مطابق دینا ہے، نیکی کرنے والوں پر یہ حق ہے۔ اور اگر تم انھیں اس سے پہلے طلاق دے دو کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، اس حال میں کہ تم ان کے لیے کوئی مہر مقرر کر چکے ہو تو تم نے جو مہر مقرر کیا ہے، اس کا نصف (لازم) ہے، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں، یا وہ شخص معاف کر دے، جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے]

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الأحزاب: ٤٩] والله أعلم بالصواب

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس سے پہلے کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، سو انھیں سامان دو اور انھیں چھوڑ دو، اچھے طریقے سے چھوڑنا]

کتبہ: محمد عبد اللّٰه (٨/ جنوری ٩٣ء)

سوال شوہر کے ہوتے ہوئے کوئی عورت مدخولہ زنا کی مرتکب ہوئی تو اس عورت کا نکاح باقی رہا یا نہیں اور اس ارتکاب سے عورت دینِ مہر کی مستحق ہے یا نہیں؟

جواب اس عورت کا نکاح باقی ہے اور دینِ مہر کی مستحق ہے:

عن ابن عمر أن النبي ﷺ قال للمتلاعنين: «حسابكما على الله، أحدكما كاذب، لا سبيل لك عليها» قال: يا رسول الله! مالي؟ قال: «لا مال لك، إن كنت صدقت عليها فهو بما استحللت من فرجها، وإن كنت كذبت عليها فذاك أبعد وأبعد لك منها»[1] (متفق عليه، كذا في المشكوة) والله أعلم، وعلمه أتم

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٩٣)

[عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لعان کرنے والوں کو کہا: ''تمھارا حساب اللہ کے پاس ہے، تم دونوں میں سے ایک تو جھوٹا ہے اور (شوہر سے کہا کہ) تجھے اس پر کوئی حق حاصل نہیں رہا۔'' اس نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میرا مال؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرے لیے کوئی مال نہیں ہے، اگر تو سچا ہے تو وہ اس کا بدل ہے جو تو نے اس کی عصمت کو حلال کیا اور اگر تو نے اس پر جھوٹ بولا ہے تو وہ بعید تر ہے اور تیرے لیے اس سے اور بھی بعید تر ہے]

حرره الفقير محمد إبراهيم الأعظم الدانافوري عفي عنه. الجواب صحيح. كتبه محمد عبدالله. الجواب صواب. وصيت علي، عفي عنه. نکاح باقی رہا اور دین مہر کی بھی مستحق بدستور ہے۔ أبو محمد إبراهيم.

کیا عدت گزرنے کے بعد نکاح میں مہرِ جدید لازم ہے؟

سوال ایک شخص اپنی زوجہ مطلقہ رجعیہ سے بوجہ گزرنے عدت کے نکاحِ جدید کرے تو اس کو مہرِ جدید کی حاجت ہوگی یا وہی مہر سابق کافی ہوگا؟

جواب جو شخص اپنی زوجہ مطلقہ رجعیہ سے بعد گزرنے عدت کے نکاح جدید کرے تو اس پر دینِ مہر بھی جدید لازم آئے گا، کیونکہ قانونِ شرع کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی شخص نکاح کرے تو اس کے ذمہ دینِ مہر واجب ہو جاتا ہے۔

قال اللہ تبارك وتعالیٰ: ﴿اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ﴾ [سورۂ نساء، رکوع ٤ پارہ ٥]

[اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو]

كتبه: أبو الفياض محمد عبد القادر. عفي عنه. أعظم گڑھی مدرس مدرسه أحمديه، آره ضلع شاه آباد.

اگر عورت بلا اجازت شوہر گھر سے چلی جائے تو وہ مہر کی حق دار ہے؟

سوال ایک عورت بلا اجازتِ اور بلا رضا مندی شوہر کے مکان سے نکل کر چلی جائے، آیا اس حالت میں شوہر کے اوپر اس عورت کا حق، یعنی مہر وغیرہ سابق دستور باقی رہتا ہے یا کم وبیش ہو جاتا ہے؟

جواب اگر عورت بلا اجازت شوہر کے مکان سے نکل جائے تو مہر میں کمی وبیشی نہیں ہوتی، اس لیے کہ مہر بسبب نکاح کے واجب ہوا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ﴾ [النساء: ٢٤] یعنی تمھارے لیے سوائے محرمات کے کل عورتیں حلال ہیں، بشرطیکہ تم ان سے نکاح کرو مال، یعنی مہر دے کر۔

ظاہر ہے کہ بلا اجازت چلے جانے سے نکاح میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر عورت بلاوجہ شرعی چلی گئی تو گنہگار ہوئی۔ البتہ نفقہ، یعنی خرچ اس درمیان کا ساقط ہو جائے گا، اگر عورت ناحق نکل کر چلی گئی ہو اور اگر حق پر چلی گئی ہو تو نفقہ

بھی ساقط نہ ہوگا، بلکہ سابق دستور دینا ہوگا۔ شرح وقایہ میں ہے: ”لا لناشزة خرجت من بيته بغير حق“ واللہ أعلم بالصواب [اس نافرمان عورت کے لیے نہیں جو ناحق اس (اپنے شوہر) کے گھر سے نکل کر چلی گئی ہو]

اگر عورت مہر معاف کرنے کے بعد دوبارہ مطالبہ کرے؟

سوال زید نے قضا کیا۔ بعد ایک دن کے اس کی زوجہ ہندہ نے پچاس ساٹھ عورتوں کے سامنے بطیب خاطر یہ کہا کہ ہم نے کل دین مہر اپنے زوج کا معاف کر دیا، پھر چند دن کے بعد بھی دو مرد کے سامنے جو اس کے اہلِ قرابت سے ہیں، اپنے دین کی معافی کا اقرار کیا اور کہا کہ ہم نے اپنے زوج کا دین معاف کر دیا ہے، پھر اس کے عرصہ کے بعد دو ایک عورت مفتریہ مفسدہ نے ہندہ کو بہکایا اور اغوا کرنا شروع کیا کہ تم نے دین کیوں معاف کر دیا؟ تم اس معافی سے انکار کر جاؤ اور کہو کہ ہم نے معاف نہیں کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ گواہان و شاہدان عادل اس کے معافی دین کے موجود ہیں اور وہ لوگ شہادت معافی دین کی دیتے ہیں، اس حالت میں وہ دینِ مہر زید میت کے ذمہ سے ساقط ہوگیا یا ورثہ زید پر اُس دین کی ادا کاری واجب و لازم ہے اور اب انکار سے ہندہ کے وہ شے ساقط شدہ عود کرے گی یا نہیں؟

جواب اس صورت میں وہ دینِ مہر زید میت کے ذمہ سے ساقط ہوگیا اور ورثہ زید پر اُس دین کی ادا کاری واجب و لازم نہیں ہے، جب وہ دینِ مہر زید میت کے ذمہ سے ساقط ہوگیا تو اب ہندہ کے انکار سے وہ دینِ مہر ساقط شدہ عود نہیں کرے گا۔ کتاب اشباہ و نظائر مع حموی (ص: ۳۹۱ چھاپہ مصطفائی دہلی) میں ہے:

”ظاهر المذهب وعليه الفتوىٰ أن الحق متى ثبت واستقر لا يسقط إلا بإسقاطه، وهو الصريح بلسانه كما في سائر الحقوق“[1] اهـ واللہ أعلم بالصواب

[ظاہر مذہب یہ ہے اور اسی پر فتویٰ ہے کہ حق جب ثابت ہو جائے تو وہ اس (حق دار کے) ساقط کیے بغیر ساقط نہیں ہوتا، جب کہ وہ (حق دار) اپنی زبان کے ساتھ صراحتاً اس کو ساقط کر دے، جیسا کہ تمام حقوق میں دستور ہے]

کتبہ: محمد عبد اللہ (مدرسہ احمدیہ آرہ)

کیا نابالغ لڑکی ملاپ سے پہلے خاوند کی وفات کے بعد مکمل مہر کی حق دار ہوگی؟

سوال ما قولكم رحمكم اللہ تعالیٰ! اندریں مسئلہ مثلاً زید نابالغ کا نکاح ہندہ نابالغہ کے ساتھ بعوض ایک سو پچاس روپیہ دینِ مہر کے ہوا۔ چند روز کے بعد حالتِ نابالغی میں زید کا انتقال ہوا، لیکن ہندہ کے ساتھ زید کی ہمبستری و مساس و خلوتِ صحیحہ نہ ہوئی۔ اس صورت میں ہندہ مذکورہ کل دینِ مہر کی مستحق ہوگی یا نصف کی؟ جیسا کہ ان غیر ممسوسہ مطلقہ کے باب میں کلام مجید میں آیا ہے:

﴿وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ [البقرة: ۲۳۷]

[1] غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر للحموي (۵/ ۱۷۳)

[اور اگر تم انھیں اس سے پہلے طلاق دے دو کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، اس حال میں کہ تم ان کے لیے کوئی مہر مقرر کر چکے ہو تو تم نے جو مہر مقرر کیا ہے اس کا نصف (لازم) ہے]

آیا ان دونوں کا حکم ایک ہے یا فرق ہے؟ اگر فرق ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ مع دلائل تحریر فرما دیں۔

جواب اگر حالت نابالغی کا نکاح شرعاً صحیح ثابت ہو تو صورت مندرجہ سوال میں ہندہ مذکورہ کل دینِ مہر کی مستحق ہے، اس کی دلیل حدیثِ ذیل ہے:

"عن علقمة عن ابن مسعود أنه سئل عن رجل تزوج امرأة، ولم يفرض لها شيئاً، ولم يدخل بها حتى مات، فقال ابن مسعود: لها مثل صداق نسائها، لا وكس ولا شطط، وعليها العدة، ولها الميراث، فقام معقل بن سنان الأشجعي فقال: قضى رسول اللهﷺ في بروع بنت واشق امرأة منا بمثل ما قضيت، ففرح بها ابن مسعود"[1]

(رواه الترمذي و أبو داود والنسائي والدارمي، مشكوة المصابيح، باب الصداق، فصل ٢)

[علقمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک ایسے آدمی کے متعلق سوال کیا گیا، جس نے ایک عورت سے شادی کی، ابھی اس نے (مہر وغیرہ) کچھ مقرر نہ کیا تھا اور نہ اس سے صحبت ہی کی تھی کہ وہ فوت ہوگیا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اسے اس جیسی عورتوں کے مثل مہر ملے گا۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اسے عدت بھی گزارنی ہوگی اور اسے (خاوند سے) وراثت بھی ملے گی۔ (یہ سن کر) معقل بن سنان اشجعی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہماری ایک عورت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپ کے فیصلے جیسا فیصلہ کیا تھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس پر خوش ہوئے]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ موت کی حالت میں عورت کل دینِ مہر کی مستحق ہوتی ہے، حتی کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو تو پورے مہرِ مثل کی مستحق ہوتی ہے، اگرچہ ہم بستری یا خلوتِ صحیحہ وقوع میں نہ آئی ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبداللہ

رضاعت کے مسائل

کیا بہن اپنے بھائی کو دودھ پلا سکتی ہے؟

سوال ہندہ ایک لڑکا شیر خوار چھوڑ کر انتقال کر گئی، اس کے خویشان میں سے ایسی کوئی عورت نہیں ہے کہ اُس بچہ کی مرضعہ ہو۔ ایسی حالت میں اگر ہندہ کی لڑکی (بچہ کی بہن) دودھ پلائے تو جائز ہوگا یا نہیں؟

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٥٤) مشكاة المصابيح (٢/ ٢٢٧)

جواب بہن کا اپنے شیر خوار بھائی کو دودھ پلانا بلاشبہہ جائز ہے، اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہاں اس دودھ پلانے سے یہ شیر خوار بھائی اپنی شیردہ بہن کا رضاعی بیٹا اور اس کی شیردہ بہن اس کی رضاعی ماں ہوجائے گی، پھر ان میں رضاعت کے تمام احکام جاری ہو جائیں گے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

رضاعت کا ثبوت اور اس کے اثرات:

سوال ① زید کی زوجہ اپنے حین حیات میں خالد کی زوجہ سے کہا کرتی تھی کہ تمھارا لڑکا میری لڑکی کے ساتھ مل کر دودھ پی لیا کرتا ہے، اس اثنا میں زید کی زوجہ مذکورہ نے قضا کی، بعدہ زید نے چاہا کہ اپنی زوجہ متوفی کی لڑکی کے ساتھ خالد کے لڑکے کی نسبت کر دے، تب خالد کی زوجہ نے کہا کہ میرے لڑکے نے زید کی زوجہ کا دودھ پیا ہے اور حلفاً کہتی ہوں کہ ایک بار خود بھی اپنے لڑکے کو دودھ پیتے ہوئے دیکھا ہے اور بھی دو عورتوں نے بیان کیا ہے کہ ہم لوگوں نے بھی زید کی زوجہ متوفی سے اس کی حیات میں سنا ہے کہ خالد کے لڑکے نے میرا دودھ پیا ہے، تو اب صورت مرقومہ بالا میں عورتوں کی گواہیاں معتبر ہوں گی یا نہیں اور خالد و زید کی اولاد میں باہم رضاعت تصور کی جائے گی یا نہیں اور درصورتِ رضاعت ہونے کے اگر زید اپنی کسی لڑکی کے ساتھ خود خالد مذکور کا نکاح کر دینا چاہے تو ہوسکتا ہے یا نہیں؟

② عمرو کی تین بیبیاں ہیں، ان میں سے ایک نے بکر کی لڑکی کو دودھ پلایا ہے تو اس صورت میں عمرو کی سب بیبیوں کی اولاد بکر کی اولاد پر حرام ہوجائے گی یا جس عورت نے دودھ پلایا ہے، اسی کی اولاد اور بکر کی اولاد میں رضاعت شمار کی جائے گی؟

جواب ① اس صورت میں رضاعت ثابت ہے، یعنی خالد کے جس لڑکے نے زید کی زوجہ کا دودھ پیا ہے، وہ لڑکا زید کا اور زید کی اس زوجہ کا رضاعی بیٹا ہے اور زید کی اولاد کا رضاعی بھائی ہوگیا۔ ثبوتِ رضاعت کے لیے عورت کا بیان کافی ہے، پس خالد کے جس لڑکے نے زید کی زوجہ کا دودھ پیا ہے، اس لڑکے میں اور زید کی اولاد میں مناکحت جائز نہیں ہے اور یہ رضاعت خود خالد اور زید یا خالد و زوجہ زید یا خالد و اولادِ زید کی طرف متعدی نہیں ہے۔ پس اگر زید خود خالد کے ساتھ اپنی کسی لڑکی کا نکاح کر دینا چاہے تو ہوسکتا ہے:

عن عقبة بن الحارث أنه تزوج أم يحيىٰ بنت أبي إهاب فجاءت امرأة فقالت: قد أرضعتكما فسأل النبيﷺ فقال: «كيف و قد قيل؟» ففارقها عقبة و نكحت زوجا غيره" [1] (أخرجه البخاري)

[عقبہ بن حارث سے روایت ہے کہ انھوں نے ام یحییٰ بنت ابی اہاب سے شادی کر لی تو ایک عورت آئی، اس نے کہا: میں نے تم دونوں (عقبہ اور اس کی بیوی ام یحییٰ) کو دودھ پلایا ہے۔ (یعنی یہ آپس میں بہن بھائی ہیں) انھوں نے نبیِ کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت فرمایا: (تم اس کے ساتھ) کس طرح (تعلق زن وشو قائم

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥١٦)

کر سکتے ہو) حالاں کہ یہ کہہ دیا گیا ہے (کہ تم اس کے رضاعی بھائی ہو اور وہ تمھاری رضاعی بہن ہے؟)
عقبہ نے اسے الگ کر دیا اور اس نے ان کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کر لیا]

و عن ابن عباس أن النبيﷺ قال: «يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب»[1]
(متفق عليه، بلوغ المرام مطبوعه دهلي، ص: ٧٥) والله أعلم بالصواب

[دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں، جو نسب سے حرام ہوتے ہیں]

◈ ۲ اس صورت میں عمرو کی سب بیبیوں کی اولاد جو عمرو کے نطفے سے ہے، بکر کی اس اولاد پر حرام ہے، جس نے عمرو کی کسی بی بی کا دودھ پیا ہے، اسی طرح اگر عمرو کی اس بی بی کی جس نے بکر کی اولاد کو دودھ پلایا ہے، اس قسم کی اولاد ہو، جو عمرو کے سوا دوسرے شوہر کے نطفے سے ہو، وہ بھی بکر کی اس اولاد پر حرام ہوگی، کیونکہ اس صورت میں عمرو کی سب بیبیوں کی اولاد مرقومہ بالا بکر کی اس اولاد کی رضاعی بھائی ہیں، خواہ بطور عینی یا علاتی یا اخیافی اور بھائی بہن نسبی کسی طرح ہوں، خواہ عینی یا علاتی یا اخیافی، ان میں مناکحت حرام ہے، پس اسی طرح رضاعی بھائی بہن میں بھی خواہ کیسے ہی ہوں، مناکحت حرام ہوگی، جیسا کہ گزر چکا ہے:

«يحرم من الرضاع ما يحرم من النسب»[2] والله أعلم بالصواب.

[دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں، جو نسب سے حرام ہوتے ہیں] كتبه: محمد عبد الله

سوال مسماۃ حمیدہ مادرِ محمودہ سابق میں کہتی تھی کہ میں نے حامد کو دودھ پلایا ہے اور اب اس دودھ پلانے سے بحلف انکار کرتی ہے کہ میں نے دودھ نہیں پلایا ہے اور کوئی شہادت مرد یا عورت کی نسبت اُس رویت کے دودھ پلانے کی نہیں ہے، الا خالہ حامد کی نسبت شوہر محمودہ یہ کہتا ہے کہ مجھے خالہ مذکورہ نے بحلف یہ کہا تھا کہ حامد کے منہ میں مادرِ محمودہ نے اپنے پستان کو دیا تھا، لیکن خالہ حامد سب سے بحلف بیان کرتی ہے کہ ہم نے شوہر محمودہ سے نہیں کہا تھا کہ پستان منہ میں دیا گیا، بلکہ میں بحلف کہتی ہوں کہ میں نے دودھ پلانے یا پستان منہ میں دیتے نہیں دیکھا ہے، اس صورت میں شوہر محمودہ یہ کہتا ہے کہ ایسی شکل میں مجھے دربارہ رضاعت کے شک واقع ہے اور فتاوی عالمگیری، کتاب الرضاع (ص: ۳۵۸ مطبوعہ نول کشور) کی اس عبارت پر استدلال کرتا ہے کہ عند القضاء حرمت ثابت نہ ہوگی، مگر عند الاحتیاط حرمت ثابت ہوگی اور عبارت یہ ہے:

"المرأة إذا جعلت ثديها في فم الصبي، ولا تعرف مص اللبن ففي القضاء لا يثبت الحرمة بالشك، وفي الاحتياط تثبت"

[عورت نے جب اپنا پستان بچے کے منہ میں ڈالا، مگر اسے یہ معلوم نہیں کہ دودھ پیا گیا ہے تو قضا کے وقت شک کی بنا پر حرمت ثابت نہ ہوگی، ہاں احتیاط کے وقت حرمت ثابت ہوگی]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٧)

[2] حوالہ بالا.

حامد وعزیزانِ حامد یہ کہتے ہیں کہ ہم کو یقینِ کامل ہے کہ مادرِ محمودہ نے حامد کو ہرگز دودھ نہیں پلایا ہے اور وجہ یقین کی یہ ہے کہ حامد ومحمودہ و مادر محمودہ رشتہ داران قریبی ہیں، پس ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ احتیاط مذکورہ فتاویٰ عالمگیری مقتضی اس کی ہے کہ نکاح حامد کا ساتھ دختر محمودہ کے کیا جائے یا نہیں؟ اگر نکاح ہو گیا ہو تو احتیاط مذکور کا کیا مقتضا ہے اور اس صورت میں رضاعت متذکرہ میں شک پیدا ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہوسکتا ہے تو ترک کرنے والے پر بمقتضائے احتیاط مرقومہ بالا کے کیا حکم ہوسکتا ہے؟

جواب عبارت منقولہ عالمگیری اس صورت سے متعلق ہے، جہاں عورت کا اپنے پستان کو لڑکے کے منہ میں دینا ثابت ہے اور صورت مسئولہ میں اس کا کوئی ثبوت مذکور نہیں ہے، صرف شوہر محمودہ کا یہ بیان ہے کہ ''خالہ حامد نے مجھے بحلف بیان کیا تھا کہ مادر محمودہ نے حامد کے منہ میں اپنے پستان کو دیا تھا۔'' جس کا خود خالہ حامد بحلف انکار کرتی اور کہتی ہے کہ ''میں نے شوہر محمودہ سے یہ بات نہیں کہی تھی اور نہ میں نے دودھ پلاتے یا منہ میں پستان دیتے دیکھا ہے۔'' پس ایسی حالت میں اگر شوہر محمودہ کو اپنی یاد پر پورا اطمینان ہو، یعنی اس کو خوب یاد ہو کہ خالہ حامد نے اس سے بحلف کہا تھا کہ ''مادرِ محمودہ نے حامد کے منہ میں اپنے پستان کو دیا تھا'' تو ایسی حالت میں عبارت مذکورہ صورت مسئولہ سے متعلق ہے، جس کا مقتضی یہ ہے کہ شوہر محمودہ کو اپنی دختر کا نکاح جو بطن محمودہ سے ہے، حامد سے کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کر چکا ہو تو تفریق واجب ہے اور اگر شوہر محمودہ کو اپنی یاد پر اطمینان نہ ہو تو عبارت مذکورہ صورت مسئولہ سے متعلق نہیں ہے، اس حالت میں مادرِ محمودہ کا اپنے پستان کو حامد کے منہ میں دینا اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

اس سوال کے متعلق ایک اور بات قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ سوال میں مادرِ محمودہ کے دو متناقض بیان درج ہوئے ہیں، پہلا بیان تو یہ ہے کہ میں نے حامد کو دودھ پلایا ہے اور دوسرا بیان یہ ہے کہ میں نے دودھ نہیں پلایا ہے، پس اگر مادرِ محمودہ کا بیان سابق ثابت ہے تو وہی بیان معتبر ہوگا اور بیان لاحق، اس وجہ سے کہ یہ بیان سابق سے رجوع ہے، غیر مسموع و نامعتبر ہوگا اور جب اس صورت میں بیان سابق ہی معتبر ہوا تو حسبِ حدیث صحیح نکاح حامد کا دخترِ محمودہ کے ساتھ ناجائز ہوا اور اگر نکاح ہو گیا ہو تو تفریق واجب ہوئی۔ مشکوۃ شریف (ص: ۲۶۵ چھاپہ دہلی) میں ہے:

''عن عقبة بن الحارث ﷺ أنه تزوج ابنة لأبي إهاب بن عزيز، فأتت امرأة فقالت: قد أرضعت عقبة والتي تزوج بها، فقال لها عقبة: ما أعلم أنك قد أرضعتني ولا أخبرتني، فأرسل إلى آل أبي أهاب فسألهم فقالوا: ما علمنا أرضعت صاحبتنا، فركب إلى النبي ﷺ بالمدينة فسأله فقال رسول اللهﷺ: «كيف وقد قيل؟» ففارقها عقبة، ونكحت زوجا غيره''[1] (رواه البخاري)

[عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ابو اہاب بن عزیز کی بیٹی (ام یحییٰ) سے شادی کی تو اس کے پاس ایک عورت نے آ کر کہا: میں نے عقبہ کو اور اس کو جس سے عقبہ نے شادی کی ہے، دودھ پلایا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٤٠)

تھا۔ عقبہ رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے کہا: مجھے نہیں معلوم کہ تو نے مجھے دودھ پلایا ہے اور نہ ہی تو نے ہمیں اس کی خبر دی ہے۔ عقبہ رضی اللہ عنہ نے آلِ ابی اہاب کی طرف کسی کو روانہ کر کے اس کی تحقیق کی تو انھوں نے کہا: ہمیں نہیں معلوم کہ اس نے ہماری صاحبہ (تیری بیوی ام یحییٰ) کو دودھ پلایا ہے۔ چناں چہ عقبہ رضی اللہ عنہ سواری پر بیٹھے اور مدینے میں پہنچ کر نبیِ مکرم ﷺ سے دریافت کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (تم اس کے ساتھ) کس طرح (تعلقِ زن و شو قائم کر سکتے ہو؟) جب کہ اس کے بارے یہ کہہ دیا گیا ہے؟ لہٰذا عقبہ رضی اللہ عنہ نے اس کو الگ کر دیا اور اس نے ان کے علاوہ کسی اور خاوند سے شادی کر لی]

بخاری شریف (۳/۳۰۲ چھاپہ مصر) میں ایک روایت یوں ہے:

عن عقبة بن الحارث قال: تزوجت امرأة فجاءتنا امرأة سوداء فقالت: أرضعتكما، فأتيت النبيﷺ فقلت: فزوجت فلانة بنت فلان فجاءتنا امرأة سوداء فقالت لي: إني أرضعتكما وهي كاذبة فأعرض عنه، فأتيته من قبل وجهه فقلت: إنها كاذبة. قال: «كيف بها، وقد زعمت أنها أرضعتكما؟ دعها عنك»[1] والله أعلم بالصواب.

[عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے شادی کر لی تو ہمارے پاس ایک سیاہ رنگ کی عورت آئی، اس نے کہا: میں نے تم دونوں (میاں بیوی) کو دودھ پلایا ہے۔ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میں نے فلانہ (ام یحییٰ) بنت فلاں (ابو اہاب) سے شادی کر لی تو ہمارے پاس ایک کالے رنگ کی عورت آئی اور مجھے کہا: میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے، حالاں کہ وہ جھوٹی ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے منہ پھیر لیا۔ میں آپ ﷺ کے چہرے کی طرف آیا اور کہا: بے شک وہ جھوٹی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (تم) اس کے ساتھ کس طرح (تعلقِ زن و شو قائم کر سکتے ہو؟) حالاں کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے؟ لہٰذا اس کو اپنے (نکاح) سے الگ کر دو]

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفا الله عنه.

سوال ہندہ کہتی ہے کہ ہم نے خالد کو دودھ پلایا ہے، لیکن کوئی گواہ نہیں رکھتی ہے اور گواہ ایسی ایک عورت کو دیتی ہے جو مر گئی۔ ایسی حالت میں خالد کا نکاح ہندہ کی سوتیلی نتنی سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ایک عورت کی شہادت پر رضاعت کا حکم ثابت ہوگا یا نہیں؟ وہ عورت، یعنی ہندہ ایسی ہے کہ اب بعد چند روز کے انکار دودھ پلانے سے کرتی ہے؟

جواب صرف عورت مرضعہ کی شہادت پر رضاعت ثابت ہوجاتی ہے۔ مشکوۃ شریف (ص: ۲۶۵ مطبوعہ مطبع انصاری) ملاحظہ ہو، لیکن اب جب ہندہ نے دودھ پلانے سے انکار کر دیا اور دوسرا کوئی گواہ نہیں ہے تو اب اس کی شہادت کالعدم ہوگئی اور خالد کا نکاح ہندہ کی سوتیلی نتنی سے ہوسکتا ہے۔ والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨١٦)

سوال مسماۃ کلثوم نے اپنے حقیقی بھائی زید کو دودھ پلایا، پھر کلثوم نے نکاحِ ثانی کیا، کلثوم کا بیٹا بکر زید کی بیٹی فاطمہ کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ بينوا توجروا!

جواب اگر صورت مسئولہ میں بکر نکاحِ ثانی سے پیدا ہوا ہے، تب تو فاطمہ کا نکاح بکر سے درست ہے، اس وجہ سے کہ پہلے اور دوسرے دودھ میں باہم مشارکت نہیں ہے۔

قال في فتح القدير: "لو تزوجت برجل، وهي ذات لبن لآخر قبله فأرضعت صبية، فإنها ربيبة للثاني، وبنت للأول، فيحل تزوجها بأبناء الثاني"[1] اهـ

[فتح القدیر میں ہے: اگر اس عورت نے ایک آدمی سے شادی کی، اس حال میں کہ وہ اس (شوہر) سے پہلے کسی اور سے دودھ والی تھی۔ پس اس نے ایک بچی کو دودھ پلایا تو وہ دوسرے کی ربیبہ اور پہلے کی بیٹی ہوئی۔ لہٰذا اس لڑکی کا نکاح دوسرے شوہر کے بیٹوں سے حلال اور جائز ہے]

اگر بکر نکاحِ اول سے پیدا ہوا ہے تو دونوں کا نکاح نادرست ہے، کیونکہ بکر و زید باہم رضاعی بھائی ہیں اور فاطمہ رضاعی بھتیجی ہے اور رضاعی بھتیجی سے نکاح ناجائز ہے۔

لقوله تعالىٰ: ﴿وَ بَنٰتُ الْاَخِ﴾ [اور بھتیجیاں] أي وحرمت عليكم ﴿وَ بَنٰتُ الْاَخِ﴾ [النساء: ٢٣] [اور بھانجیاں]

ولقوله عليه الصلاة والسلام: «يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب أو من الولادة»[2] (رواه الشيخان) والله أعلم وعلمه أتم وأحكم.

[دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں، جو نسب سے یا ولادت سے حرام ہوتے ہیں]

حرره: محمد أيوب الإسرائيلي. عاشر ذي الحجة

جب کلثوم نے زید کو دودھ پلایا تو کلثوم زید کی رضاعی ماں اور زید کلثوم کا رضاعی بیٹا اور فاطمہ کلثوم کی رضاعی پوتی ہوگئی اور بکر (خواہ کلثوم کے نکاحِ اول سے پیدا ہوا خواہ نکاحِ ثانی سے، ہر صورت میں) کلثوم کا بیٹا اور زید کا رضاعی بھائی اور بھتیجا فاطمہ کا رضاعی چچا اور فاطمہ اس کی رضاعی بھتیجی ہوگی اور جب فاطمہ ہر صورت میں بکر کی رضاعی بھتیجی ہوگی تو بکر کا نکاح فاطمہ سے کبھی درست نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ جس طرح نسبی بھتیجی محرمات ابدیہ سے ہے، اسی طرح رضاعی بھتیجی بھی محرمات ابدیہ سے ہے۔ لقولہ تعالیٰ: ﴿وَ بَنٰتُ الْاَخِ﴾ [النساء: ٢٣] [اور بھتیجیاں تم پر حرام ہیں]

ولحديث: «يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب»[3] (رواه الشيخان)

[دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں، جو نسب سے حرام ہوتے ہیں]

---

(1) فتح القدير لابن الهمام (٣/ ٤٤٨)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٧)

(3) حوالہ بالا۔

فتح القدیر میں جس صبیہ سے زوج ثانی کے ابناء کا نکاح حلال بتایا گیا ہے، صحیح ہے، اس لیے کہ اس صورت میں صبیہ مذکورہ اور ابنائے زوج ثانی میں کوئی رشتہ نسبی یا رضاعی موجود نہیں ہے، بخلاف صورتِ سوال کے کہ اس میں درمیان فاطمہ اور بکر کے رضاعی رشتہ موجود ہے کہ فاطمہ بکر کی رضاعی بھتیجی ہے، جو محرمات ابدیہ سے ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم. (کتبہ: ۲۰/ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ)

سوال ایک عورت فاطمہ نے زید اور ہندہ کو دودھ پلایا۔ یہ دونوں بھائی اور بہن رضاعی ہوئے۔ اب ہندہ کی دختر سے زید کا نکاح جائز ہے یا نہیں؟ دودھ پلانے کی شہادت عینی نہیں ہے، مگر بعض لوگوں کا خیال و گمان ایسا ہے کہ زید و ہندہ نے فاطمہ کا دودھ پیا ہے، نیز اگر زید و ہندہ کا نکاح ہوگیا ہو اور قبل از نکاح ایسے وہم و گمان کی خبر معلوم نہ ہوئی ہو اور نہ لوگوں کو وقت نکاح کے یا قبل از نکاح کے یہ خیال پیدا ہوا ہو، بلکہ بعد از نکاح تو یہ عقدِ نکاح جائز ہے اور کہاں تک شرع شریف میں ایسے وہم و خیال کی پابندی کی جا سکتی ہے؟ جبکہ زید اور ہندہ کے والدین کو یاد نہ ہو اور نہ کوئی شہادت اور چشم دید ہو، محض بعض لوگوں کے وہم و گمان کی بنا پر نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے اور طلاق دینا ایسی صورت میں ضروری ہے یا نہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے سورت نساء میں محرمات کا ذکر فرما کر فرمایا: ﴿ أُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ﴾ یعنی ان مذکورہ بالا عورتوں کے سوا کل عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں، تو جب تک کوئی کافی ثبوت اس بات کا نہ ملے کہ زید اور ہندہ دونوں باہم رضاعی بھائی بہن ہیں، تب تک ہندہ کی دختر زید پر حرام نہیں ہوسکتی، کیونکہ کوئی حلال چیز بلا دلیل محض وہم وخیال و گمان سے حرام نہیں ہوسکتی، جیسا کہ کوئی حرام چیز محض وہم و خیال و گمان سے حلال نہیں ہوسکتی۔ واللہ أعلم

کتبہ: محمد عبدالعزیز (١٤/ ذوالحجہ ١٣٣٠ھ). الجواب صحیح. کتبہ: محمد عبداللہ (١٤/ ذو الحجہ ١٣٣٠ھ)

کون سی رضاعت نکاح میں مانع ہے؟

سوال زید کی شادی خالد کی ہمشیرہ زینب کے ساتھ ہوئی۔ کچھ مدت کے بعد خالد کی زوجہ نے کہا کہ میں نے زید کو اس کی والدہ کی بیماری کی حالت میں دودھ پلایا ہے۔ زید ماہ اساڑھ میں پیدا ہوا اور میں ماہ اگھن میں اپنے میکے گئی اور ماہ جیٹھ میں میکے سے واپس آئی اور جس وقت میں میکے سے واپس آئی، زید کی والدہ بیمار تھی اور میں نے بیماری کی حالت میں دودھ پلایا ہے اور مجھے خیال ہے کہ دو برس کے بعد دودھ پلایا ہے اور ایک عورت کہتی ہے کہ خالد کی بیوی نے زید کو دودھ پلایا ہے، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مدتِ رضاعت میں پلایا ہے یا اُس کے بعد؟ ان دونوں عورتوں کے سوا اور کوئی شہادت نہیں ہے۔ اب اس صورت میں زید کا نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟

فقیر محمد چودھری۔ موضع دہ دھونیاں۔ ڈاکخانہ رامدت گنج۔ ضلع بستی

جواب اس صورت میں زید کا نکاح صحیح ہوا۔ اگر خالد کی زوجہ کا یہ خیال صحیح ثابت ہو کہ اس نے زید کو اس کی ولادت کے ہر دو برس کے بعد دودھ پلایا ہے، اس لیے کہ رضاع کی مدت صرف دو برس ہے۔ دو برس کے اندر دودھ پلانے سے دودھ کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے، بعد میں نہیں۔ لقوله تعالیٰ: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (البقرة: ٢٣٣) [اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے] وقوله تعالیٰ: ﴿وَ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ (لقمان: ١٤) [اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے] پس جب خالد کی زوجہ نے زید کو دو برس کے بعد دودھ پلایا تو نہ وہ اس سے زید کی رضاعی ماں ہوئی اور نہ خالد زید کا باپ ہوا اور نہ زینب زید کی رضاعی پھوپھی ہوئی، لہٰذا اس صورت میں یہ نکاح صحیح ہوا۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد الله (١٥/ محرم ١٣٣٥ھ)

رضاعی بھانجی سے نکاح کا حکم:

سوال زید نے اپنی دادی ہندہ کا دودھ پیا ہے، پس زید کا نکاح ہندہ کی نتنی [نواسی] سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب نہیں، کیوں کہ ہندہ کی نتنی زید کی رضاعی بھانجی ہے اور نسبی بھانجی حرام ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ٤ پارہ چہارم]

[حرام کی گئیں تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں]

جو لوگ نسب سے حرام ہیں، رضاعت سے بھی حرام ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إن الله حرم من الرضاعة ما حرم من النسب» [1] (مشکوۃ شریف، ص: ٢٦٥ مطبوعہ انصاري)

کتبہ: محمد عبد الرحمن، عفی عنه. الجواب صحیح. کتبہ: محمد عبد الله.

رضاعی بھائی کی نسبی بہن سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال زید کی کئی لڑکیاں ہیں اور ایک لڑکا۔ صرف اس لڑکے نے اپنے ماموں بکر کی بیوی کا دودھ پیا ہے اور بکر کی اس بیوی سے کئی لڑکے ہیں تو اس صورت میں بکر کے پسر کی شادی زید کی دختر سے ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں بکر کے پسر کی شادی زید کی دختر سے ہوسکتی ہے، اس لیے کہ جب زید کی لڑکیوں نے بکر کی بیوی کا دودھ نہیں پیا ہے تو نہ بکر کی بیوی زید کی لڑکیوں کی ماں ہوئی اور نہ بکر کے لڑکے زید کی لڑکیوں کے بھائی ہوئے اور جب بکر کے لڑکے اور زید کی لڑکیوں میں رشتہ رضاعت متحقق نہیں ہوا تو بکر کے پسر کی شادی زید کی دختر سے ہو سکنے میں کسی طرح شبہہ نہیں ہے۔ واللہ تعالی أعلم. کتبہ: محمد عبد الله (١٤/ ذي القعدة ١٣٣٠ھ)

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٤٤)

هو الموفق: صورتِ مسئولہ میں زید کی لڑکیاں بکر کے پسر کے رضاعی بھائی کی نسبی بہنیں ہوئیں اور رضاعی بھائی کا نسبی بہن سے نکاح کرنا بلاشبہہ جائز ہے۔فقہائے حنفیہ نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔شرح وقایہ میں ہے:

"وتحل أخت أخيه رضاعا كما تحل نسبا كأخ من الأب، له أخت من أمه، تحل لأخيه من أبيه"[1] انتهى

[اس کے رضاعی بھائی کی بہن حلال ہے، جس طرح نسبی بھائی کی بہن حلال ہے، جیسے علاتی بھائی کی ایک اخیافی بہن ہے تو وہ اپنے علاتی بھائی کے لیے حلال ہوگی]

"عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية" میں ہے:

قوله: رضاعا. يصح اتصاله بالمضاف إليه وبالمضاف وبكليهما، كأن يكون لك أخ نسبي، له أخت رضاعية، فهي حلال عليك، وكذا إذا كان لك أخ رضاعي، له أخت نسبية، وكذا الأخت الرضاعية للأخ الرضاعي، والوجه فيه أن المحرم من الرضاع إنما هو ما يحرم من النسب، ومثل هذه القرابة من النسب، قد يكون غير محرمة، فلا يحرم مثلها من الرضاع" انتهى

[اس کا قول: ''رضاعاً'' تو اس کا تعلق مضاف الیہ "أخيه"، مضاف "أخت" اور مضاف و مضاف الیہ دونوں کے ساتھ ہوسکتا ہے، گویا کہ تمھارا ایک نسبی بھائی ہو، اس کی ایک نسبی بہن ہو تو تمھارے لیے اس سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ اسی طرح جب تمھارا ایک رضاعی بھائی ہو، اس کی ایک نسبی بہن ہو اور یہی معاملہ رضاعی بہن کا رضاعی بھائی کے ساتھ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رضاعی رشتہ تو صرف وہی حرام ہے، جو رشتہ نسب سے حرام ہے اور اس طرح کی قرابت و رشتے داری بعض اوقات حرام نہیں ہوتی تو پھر اس طرح کا رضاعی رشتہ بھی حرام نہیں ہوگا]

نیز "عمدة الرعاية" میں ہے:

"قوله: كأخ من الأب. صورته أن يكون لك أخ من الأب أي يكون أبوك وأبوه واحدا، وأمك غير أمه، بأن تزوج أبوك امرأتين، أحدهما أمك، والثانية أم أخيك، وكانت لأخيك المذكور أخت من الأم، بأن كان أمه متزوجة قبل أبيك بزوج آخر فولدت منه بنتا فهي حلال عليك اتفاقا" انتهى والله تعالىٰ أعلم

[اس کا یہ قول: ''جیسے علاتی بھائی'' اس کی صورت یہ ہے کہ تمھارا ایک علاتی بھائی ہو، یعنی تمھارا اور اس کا

[1] شرح الوقاية (١/ ٣/ ٥٣) طبعة الوراق۔ عمان

باپ ایک ہو، جب کہ تمھاری ماں اس کی ماں کے سوا ہو۔ جیسے تمھارے باپ نے دو عورتوں سے شادی کی ہو اور ان عورتوں میں سے ایک تمھاری ماں ہو اور دوسری تمھارے بھائی کی ماں ہو۔ تمھارے اس مذکورہ بالا بھائی کی ایک اخیافی بہن ہو، یعنی اس کی ماں نے تیرے باپ سے نکاح کرنے سے پہلے کسی اور خاوند سے شادی کی ہو اور اس خاوند سے اس نے ایک بیٹی پیدا کی ہو تو اس لڑکی سے تمھارا نکاح بالاتفاق جائز ہوگا]





کتاب الطلاق و الخلع

مسنون طلاق اور رجوع کا طریقہ:

سوال زید نے لفظِ طلاق کہہ کر اپنی بی بی کو اپنے ایک دوسرے عزیز کے، جو اس کا خالہ زاد بھائی ہے، حوالے کر دیا اور بعد عرصہ دو ماہ کے عدت کے اندر اندر اس نئے شوہر مجوزہ کا انتقال ہوگیا اور وہ عورت پھر اپنے شوہر اول کے پاس آ گئی، اب زید از سر نو نکاح بغیر حلالہ کرے یا بعد حلالہ یا نکاح کی ضرورت نہیں ہے؟ بعض لوگوں نے لفظِ طلاق سے تین طلاق مراد لے کر کہا ہے کہ تین طلاق سے منشا قرآن شریف پورا ہوجاتا ہے۔ سائل: حاجی محمد یعقوب۔ مقام انبالہ

جواب منشا قرآن شریف اور حدیث شریف کا دربارہ طلاق یہ ہے کہ اگر ضرورت طلاق کی ہو تو صرف ایک طلاق دے دے، پھر اگر رجعت کرنا چاہے، یعنی طلاق جو اس کو دے چکا ہے، واپس لے لینا چاہے تو عدت کے اندر واپس لے سکتا ہے اور اگر عدت گزر چکی ہو تو بتراضی طرفین بغیر حلالہ کے پھر سے نکاح کر سکتا ہے۔ اگر بعد رجعت یا بعد نکاحِ جدید پھر کبھی ضرورت طلاق کی پیش آئے تو پھر صرف ایک طلاق دے دے۔ یہ دوسری طلاق ہوگی۔ یہ اور اول مل کر دو طلاقیں ہو جائیں گی، اس دوسری طلاق کے بعد بھی عدت کے اندر رجعت کر سکتا ہے اور عدت گزر چکی ہو تو بتراضی طرفین بغیر حلالہ کے جدید نکاح کر سکتا ہے۔ اس رجعت یا نکاح جدید کے بعد بھی اگر پھر کبھی ضرورت طلاق کی ہو تو اب بھی صرف ایک طلاق دے دے، یہ تیسری طلاق ہوگی اور اب یہ اور اوپر والی دو طلاقیں مل کر تین طلاقیں ہوجائیں گی، تین طلاقیں اس طریق سے دی جا سکتی ہیں۔

اب اس تیسری طلاق کے بعد نہ عدت کے اندر رجعت کر سکتا ہے اور نہ عدت گزر جانے پر بغیر حلالہ کے پھر سے نکاح کر سکتا ہے اور طریقہ مذکورہ کے برخلاف دو یا تین طلاقیں دے دینا (مثلاً) دو یا تین طلاقیں ایک ہی جلسہ میں دے دینا منع ہے اور اگر کوئی اس ناجائز طریقے سے دو یا تین طلاقیں دے دے تو اس سے صرف ایک ہی طلاق پڑے گی۔ دو یا تین طلاقیں نہیں پڑیں گی۔

صورتِ طلاق جو سوال میں مذکور ہے، اگر اس میں اس شخص نے برخلاف طریقہ مذکورہ بالا تین طلاقیں دے دی ہیں، مثلاً: ایک ہی جلسہ میں تین طلاقیں دے دی ہیں تو اس صورت میں صرف ایک طلاق پڑے گی۔ اگر عدت نہیں گزری ہے تو رجعت وہ شخص کر سکتا ہے، اگر اس کے قبل اور دو طلاقیں نہیں دے چکا ہے اور اگر عدت گزر چکی ہے اور اس کے قبل دو طلاقیں نہیں دے چکا ہے، تو بغیر حلالہ کے پھر سے نکاح کر سکتا ہے بتراضی طرفین اور اس صورت

میں جو اس شخص نے اپنی اس مطلقہ بی بی کو دوسرے شخص کے حوالے کر دیا، یہ اس کی غلطی ہے، اس صورت میں حلالے کی اصلاً ضرورت نہیں۔ صورتِ طلاق مندرجہ سوال کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، یہ اس تقدیر پر ہے کہ اس شخص کی وہ مطلقہ بی بی بعد نکاح کے اس کی مدخولہ بھی ہو چکی ہو، ورنہ عدت کے اندر رجعت نہیں کر سکتا۔ ہاں بتراضی طرفین پھر سے نکاح کر سکتا ہے۔

قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ٢٢٩]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [بقرة، ع ٢٩]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو]

إلى قوله: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرة، رکوع: ٢٩، ٣٠]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں]

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الأحزاب: ٤٩]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس سے پہلے کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، سو انھیں سامان دو اور انھیں چھوڑ دو، اچھے طریقے سے چھوڑنا]

"حدثنا عبد اللّٰه حدثني أبي ثنا سعد بن إبراهيم ثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثني داود بن الحصين عن عكرمة مولى ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا. قال: فسأله رسول اللّٰه ﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم. قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها" الحديث، واللّٰه تعالىٰ أعلم بالصواب. (مسند إمام أحمد بن حنبل: ١/ ٢٦٥)

[ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم

نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ عکرمہ مولی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، وہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ "تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟" رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "کیا ایک ہی مجلس میں؟" انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کرلو۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کرلیا]

"عن محمود بن لبيد قال: أخبر رسول الله ﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعا، فقام غضبان، ثم قال: «أيلعب بكتاب الله، وأنا بين أظهركم؟» حتى قام رجل فقال: يا رسول الله! ألا أقتله؟"[1] (رواه النسائي، مشكوة المصابيح، ص: ٢٧٦)

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے بارے میں بتایا گیا، جس نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے کی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: "کیا میری موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلا جاتا ہے؟" حتی کہ ایک آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اسے قتل نہ کردوں؟]

کتبہ: محمد عبد اللہ (٢٧/ شوال ١٣٢٩ھ)

سوال ایک شخص نے اپنے والدین کے روبرو اپنی بی بی کو طلاق دے دی۔ ایک مہینے کے بعد اپنے والدین کے کہنے اور دوسروں کے اصرار سے باوجود نا اتفاقی کے اس عورت سے رجعت کر کے ہم بستر ہوا اور ہنوز وہ نا اتفاقی چلی آتی ہے تو قرآن وحدیث کے رو سے وہ طلاق جائز ہے یا نہیں اور اب پھر شرعاً طلاق دینے کا مجاز ہے یا نہیں؟ اور دینِ مہر دینا ہوگا یا کیا؟ مع شرائط طلاق تحریر فرمایئے۔

جواب صورتِ سوال میں مرد جو عورت کو طلاق دے چکا ہے، شرعاً جائز ہوا، بشرطیکہ وہ طلاق حیض میں نہ دیا ہو، بلکہ ایسے طہر میں دیا ہو، جس میں وطی نہ کی ہو اور اس عورت سے رجعت کرنے کے بعد جو پھر ہم بستر ہوا تو بھی اس کو طلاق شرعاً دے سکتا ہے، اسی شرط سے جو اوپر مذکور ہوئی اور دینِ مہر اس عورت کو مرد پر دینا لازم ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [سورۂ بقرۃ، رکوع ٢٩]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٠١)

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ [سورۂ نساء، رکوع:٤]

[پھر وہ جن سے تم ان عورتوں میں سے فائدہ اٹھاؤ، پس انھیں ان کے مہر دو، جو مقرر شدہ ہوں]

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ [سورۂ طلاق رکوع:١]

[اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو]

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما أنه طلق امرأته، وهي حائض، علی عهد رسول اللہ ﷺ فسأل عمر بن الخطاب رسول اللہ ﷺ عن ذلك، فقال رسول اللہ ﷺ: «مره فليراجعها، ثم يمسكها، حتی تطهر، ثم تحيض، ثم تطهر، ثم إن شاء أمسك بعد، وإن شاء طلق قبل أن يمس، فتلك العدة التي أمر اللہ أن يطلق لها النساء»[1] (صحیح بخاري: ٣/ ٢٢٣، مطبوعه مصر)

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی، جب کہ وہ ایامِ حیض میں تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر اس کو اپنے ہاں رکھے، حتی کہ وہ پاک ہو، پھر اسے حیض آئے، پھر پاک ہو، پھر اگر چاہے تو اسے بیوی بنائے رکھے یا چاہے تو طلاق دے دے، مگر مباشرت سے پہلے اور یہی وہ عدت ہے جس کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے]

کتبه: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

سوال ایک شخص نے اولاً ایک طلاق دیا، پھر اس طلاق سے رجعت نہیں کیا، پھر عدت کے اندر ہی دوسرا طلاق دے دیا، اب رجعت کر سکتا ہے یا نہیں؟ رجعت کے لیے عورت و مرد کا ساتھ ضروری ہے یا نہیں؟ زبانی یا تحریری رجعت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں جب تک اول طلاق کی عدت نہ گزرے، مرد رجعت کر سکتا ہے۔ زبانی اور تحریری رجعت ہو سکتی ہے۔ رجعت کے لیے عورت و مرد کا ساتھ ضرور نہیں۔ عدت گزر جانے پر رجعت نہیں ہو سکتی۔ طلاق رجعی عدت گزر جانے پر بائن ہو جاتی ہے۔ طلاق کی عدت اگر عورت کو حیض آتا ہو تو تین حیض ہے اور حمل ہو تو وضع حمل، ورنہ تین مہینے۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبه: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

سوال (١) ایک شخص مسمی عمرو نے اپنی زوجہ مسماۃ رفیعہ سے کہا کہ میں نے تجھ کو طلاق دیا۔ ایک جلسہ میں دو دفعہ کہا اور اس کا اعلان نہیں کیا۔ بعد ازاں دو تین ہفتہ تک ان دونوں میں ملاقات نہیں ہوئی، اس کے بعد آپس میں پھر اختلاف ہو گیا اور عمرو کے والدین نے رفیعہ کو میکہ پہنچا دیا۔ رفیعہ کے میکے جانے کے چار پانچ مہینے کے بعد اس کو ایک لڑکی پیدا ہوئی اور بعد ازاں انتقال کر گئی۔ رفیعہ کے میکہ رہنے کی حالت میں عمرو نے ماقبل و مابعد پیدا ہونے لڑکی کے

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٩٥٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٧١)

اکثر اپنے احباب سے تذکرہ کیا کہ اس نے اپنی بیوی رفیعہ کو طلاق دے دیا ہے اور آیندہ ہرگز اس سے تعلق نہیں رکھے گا اور یہ کہا کہ اس بات کی خبر رفیعہ کو اور اس کے والدین کو اور اقارب کو نہ ملے۔

بعد ازاں رفیعہ کے اپنے میکے جانے کے ایک یا ڈیڑھ سال کے اپنے والدین و دیگر اقارب سے کہا کہ اس نے اپنی بی بی رفیعہ کو طلاق دے دیا ہے اور ہرگز ہرگز اس سے تعلق نہیں رکھے گا اور یہ کہا کہ اس کلام کی خبر رفیعہ کو اور اس کے والدین کو کر دی جائے، تاکہ اس کے والدین رفیعہ کا عقدِ ثانی کر دیں اور اس طلاق کا پورا اعلان اپنے کل اہلِ برادری میں کر دیا جائے، چنانچہ اس کے والدین نے ویسا ہی کیا۔

یعنی عمرو و رفیعہ کی شادی کو عرصہ آٹھ دس برس گزر چکا ہے اور ثانی عقد سے رفیعہ کے میکہ جانے کی تاریخ تک درمیان زن و شو کے برابر اختلاف رہا۔ کیا پس ایسی حالت میں عمرو کا طلاق رفیعہ پر پورا ہو چکا یا نہیں اور عمرو پھر رجعت یا حلالہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) رفیعہ کے پاس اب تک ایک دختر چار سال کی عمرو سے موجود ہے، اس دختر کا اور رفیعہ کا یا دونوں میں سے کسی ایک کا نفقہ عمرو پر واجب ہے یا نہیں؟

(۳) رفیعہ کا نکاح عمرو کے ساتھ بعوض چالیس ہزار روپیہ اور کسی قدر اشرفیوں کے مہر کے ہوا تھا، اس وقت میں عمرو طالب العلم تھا، مگر بالغ تھا، اس کو یا اس کے والدین کو استطاعت اس قدر کثیر مہر کے ادا کرنے کی نہ تھی، مگر عمرو نے حسب الحکم والدین مہر کو منظور کر لیا تھا اور عمرو شادی کے دو ہی چار سال کے بعد ملازم گورنمنٹ انگریزی ہے اور بالفعل قریب سو روپیہ ماہوار کے مشاہرہ پاتا ہے اور عمرو کہتا ہے کہ ادا کاری اس مہر کی اس پر کچھ بھی واجب نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عمرو شاید اس خیال سے اپنے کو ادا کاری مہر سے بری سمجھتا ہے کہ نکاح کے وقت اس کو کچھ بھی حیثیت ادا کاری کی نہ تھی اور اس نے اطاعتِ والدین میں آ کر مہرِ کثیر کو قبول کر لیا تھا، پس ایسی حالت میں عمرو عند اللہ مہر کے لیے ماخوذ ہوگا یا نہیں اور اگر ہوگا تو کس قدر مقدار کے لیے اور حاکمِ شرع عمرو سے رفیعہ کو کس قدر مہر دلوائے گا؟

جواب (۱) ایسی حالت میں عمرو پھر رجعت نہیں کر سکتا، کیونکہ جب عمرو نے اپنے احباب سے و نیز اپنے دوسرے لوگوں سے کہا کہ میں نے رفیعہ کو طلاق دے دیا ہے اور آیندہ سروکار نہیں رکھیں گے تو دوسرا طلاق بھی ہو چکا، اس دوسرے طلاق کی عدت بھی گزر چکی اور ایک طلاق پہلے ہو چکا ہے، جس سے عمرو نے رجعت کر لیا تھا تو اب دو طلاقیں ہو چکیں، اب اگر عمرو و رفیعہ راضی ہوں تو اس وجہ سے کہ ابھی دو طلاق ہوئی ہیں، دوسرا نکاح بلا حلالہ کے کر سکتے ہیں۔

(۲) ایسی حالت میں عمرو پر رفیعہ کا نفقہ واجب نہیں ہے، لیکن اس لڑکی کا، جو اس کے نطفہ سے ہے، واجب ہے۔

(۳) اگر عمرو نکاح کے وقت قابلیت ادا کاری چالیس ہزار روپیہ اور اشرفیوں کے مہر کا نہیں رکھتا تھا اور گو اس نے اپنے والدین کے اطاعت میں آ کر اس مہر کو قبول کر لیا تھا، لیکن وہ جب بالغ تھا اور اس نے اپنی زبان سے اتنا مہر

قبول کر لیا تھا تو وہ عند اللہ کل دینِ مہر کے لیے ماخوذ ہوگا اور بر وقتِ دعویٰ حاکمِ شرع اس سے دینِ مہر دلوائیں گے۔ واللّٰه أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللّٰه (مہر مدرسہ)

سوال زید نے اپنی زوجہ کو بحالتِ غیبوبت بسبب کسی رنج کے روبرو دو شخص کے ایک بار طلاق دیا اور چار ماہ منقضی ہوگئے۔ ہنوز اس زن مطلقہ کو خبر طلاق کی نہیں پہنچی، پس ایسی حالت میں وہ عورت زید پر حلال ہوگی یا نہیں؟

جواب اگر وہ عورت غیر مدخولہ ہو تو زید پر بغیر نکاح جدید حلال نہیں ہے۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الأحزاب، رکوع ٦]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس سے پہلے کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، سو انھیں سامان دو اور انھیں چھوڑ دو، اچھے طریقے سے چھوڑنا]

"عدة الطلاق لا تجب إلا بعد الدخول أو الخلوة"[1] (كفاية، باب العدة)

[عدتِ طلاق صرف دخول یا خلوت کے بعد ہی واجب ہوتی ہے]

اگر وہ عورت مدخولہ ہو تو اگر طلاق کے وقت حامل تھی اور اب وضع حمل کر چکی ہو تو بھی زید پر بغیر نکاحِ جدید حلال نہیں اور اگر وضع حمل نہ کیا ہو تو اگر زید قبل وضع کے اس سے رجعت کر لے تو زید پر حلال ہوجائے گی۔ ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (سورۂ طلاق رکوع ١) [اور جو حمل والی ہیں ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں] "وإن كانت حاملًا فعدتها أن تضع حملها"[2] (ہدایہ، باب العدة) [اگر وہ حاملہ تھی تو اس کی عدت یہ ہے کہ وہ حمل وضع کر دے]

اگر عورت طلاق کے وقت حامل نہ تھی تو اگر حیض والی ہو اور طلاق کے بعد اس کو تین حیض آ چکے ہوں تو بھی زید پر بغیر نکاحِ جدید کے حلال نہیں ہے۔ اگر تین حیض نہ آئے ہوں تو اگر زید تین حیض آنے کے قبل اس سے رجعت کر لے تو زید پر حلال ہوجائے گی۔ ﴿وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ (بقرة، رکوع ٣٢) [اور وہ عورتیں جنھیں طلاق دی گئی ہے، اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں]

"وإذا طلق الرجل امرأته طلاقا بائنا أو رجعيا أو وقعت الفرقة بينهما بغير طلاق، وهي حرة ممن تحيض فعدتها ثلاثة أقراء، والأقراء الحيض عندنا"[3] (ہدایہ، کتاب العدة)

[اور جب آدمی اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی یا طلاقِ بائن دے چکے یا بغیر طلاق کے ان کے درمیان جدائی ہو

[1] الكفاية شرح الهداية (٢/ ٣٣٢)
[2] الهداية (٢/ ٢٨)
[3] الهداية (٢/ ٢٧)

جائے اور وہ اس سے آزاد ہوجائے، جس سے وہ حیضہ ہوئی تو اس کی عدت تین اقراء ہے اور اقراء ہمارے نزدیک حیض ہیں]

اگر وہ عورت حیض والی بھی نہ ہو تو زید پر بغیر نکاحِ جدید حلال نہیں ہے۔

﴿ وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ﴾ [سورۂ طلاق رکوع ۱]

[اور وہ عورتیں جو تمھاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں، اگر تم شک کرو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور ان کی بھی جنھیں حیض نہیں آیا]

”وإن كانت ممن لا تحيض من صغر أو كبر فعدتها ثلاثة أشهر، وكذا التي بلغت بالسن ولم تحض“[1] (هدايه باب العدة) والله أعلم بالصواب

[اگر وہ ان عورتوں سے ہیں جن کو صغر سنی یا بڑھاپے کی وجہ سے حیض نہیں آتا تو اس کی عدت تین مہینے ہے، اسی طرح وہ جو حیض کی عمر کو تو پہنچ گئی، لیکن اسے ابھی حیض نہیں آیا] کتبہ: محمد عبداللہ

سوال ① ایک شخص نے غصے کی حالت میں بی بی کو اپنی، تین طلاق بیک جلسہ دیا، اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کیا، بعدہ اس شخص نے بغیر وطی کے اس عورت کو طلاق دیا، اب شخص اول کا نکاح اس عورت سے درست ہوسکتا ہے یا نہیں؟

② ایک شخص نے اپنی منکوحہ کو فجر کے وقت تین طلاق ایک وقت میں دیا اور شام کو اس عورت سے وطی کیا تو اس عورت کو طلاق ہوا یا نہیں اور طلاق بائن درست ہے یا نہیں؟ (۲۱/ اکتوبر ۱۸۹۵ء)

جواب ① اس شخص کا اس عورت سے نکاح درست ہے۔ جب تین طلاقیں بیک جلسہ دی جائیں تو ایک ہی طلاق پڑتی ہے اور ایک طلاق پڑنے کی صورت میں اگر عدت گزر چکی ہو تو پہلے شوہر کو بغیر حلالہ بھی اس عورت سے نکاح درست ہے۔ (البقرۃ، رکوع ۲۹، صحیح مسلم: ۱/ ۴۷۷ و ۴۷۸)

② طلاق تو ہوا، لیکن اگر وہ عورت اس شخص کی مدخولہ نہیں ہے تو طلاق بائن ہوا، ورنہ رجعی (الاحزاب، رکوع ۶)۔

والله أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

سوال زید کی بی بی نوید شادی میں اپنی بہن و بھائی کے گھر دوسرے موضع گئی اور عرصہ تین مہینے اپنی بہن اور بھائی کے گھر رہی اور بعد اس کے چند بار زید نے اپنے مکان پر چلنے کا تقاضا کیا۔ بی بی زید نے گفتگو اور اور بات کا کیا کہ جس سے رنج زیادہ ہوا، تب زید نے کہا کہ اب تم جاؤ تو تم کو طلاق ہے۔ یہ واقعہ ۲۸/ شوال حال روز منگل کا ہے، جس کو آج عرصہ پانچ روز کا ہوتا ہے، پھر اس کی صبح کو، یعنی روز بدھ کو زید اپنے مکان آنے کو چاہا، تب بی بی زید کی زید کے گھر آنے پر راضی ہوئی، مگر زید اب نہیں لاتا ہے کہ بغیر دریافت کسی عالم کے ہم اپنے گھر کو کیونکر لے

[1] الهداية (۲/ ۲۸)

جائیں؟ جو حکم خدا و رسول کا ہو، تحریر فرمائیں۔

جواب زید اگر اپنی بی بی کو اپنے گھر لانا اور رکھنا چاہتا ہے تو گھر لائے، لیکن جب وہ زید کے گھر آ جائے گی تو اس پر ایک طلاق پڑ جائے گی، پھر اگر وہ بی بی زید کی مدخولہ ہے تو طلاق پڑ جانے کے بعد عدت کے اندر اس سے رجعت کر لے، یعنی دو معتبر مسلمانوں کے روبرو زبان سے کہہ دے کہ میں نے جو طلاق اپنی فلانی بی بی کو دی تھی، اس کو واپس کر لیا۔ اگر وہ بی بی زید کی مدخولہ نہیں ہے تو طلاق پڑ جائے گی، بعدہ بتراضی طرفین زید کو پھر اس سے جدید نکاح کرنا پڑے گا۔ زید کو اختیار ہوگا کہ طلاق پڑ جانے کے بعد جب چاہے اس سے نکاح کر لے، اس میں عدت گزرنا شرط نہیں ہے۔

سورۂ بقرہ، رکوع (۲۸) میں ہے: ﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ (البقرۃ: ۲۲۸) [اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ (معاملہ) درست کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں] سورۂ طلاق، رکوع (۱) میں ہے: ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ [پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنوں میں سے دو صاحبِ عدل آدمی گواہ بنا لو] سورہ احزاب رکوع (۶) میں ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا﴾ [الأحزاب: ٤٩] واللّٰه أعلم بالصواب

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس سے پہلے کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں، جسے تم شمار کرو]

کتبہ: محمد عبد اللّٰه

طلاق کے الفاظ اور زنا کے بعد نکاح کا حکم:

سوال ایک شخص دو بھائی ہیں۔ بڑے بھائی نے اپنی عورت کو عرصہ تین چار برس سے چھوڑ دیا ہے اور نان ونفقہ اس کا بند کر دیا اور باہر میں جا کر ایک عورت کر لیا۔ عورت اس کی آوارہ ہوگئی۔ ایک معتبر آدمی نے کہا کہ ہم نے دو آدمی کے سامنے اس سے کہا کہ عورت کو رکھو۔ وہ جواب دیا کہ ہم اس کو ہرگز نہیں رکھیں گے اور نہ ہم سے کچھ واسطہ ہے، جہاں چاہے چلی جائے۔ چونکہ یہاں طلاق کا کہنا نہیں جانتے، یہ کہنا اس کا بجائے طلاق کے ہوسکتا ہے یا نہیں؟ چونکہ وہ عورت اس کے بھائی چھوٹے سے آشنائی ہوگئی اور ایک لڑکا بھی جنا۔ وہ عورت اور اس کے شوہر کا بھائی دونوں راضی ہیں کہ نکاح ہو جائے۔ نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہوسکتا ہے تو کس صورت سے؟

جواب اولاً اس بات کی تحقیق کر لی جائے کہ عورت مذکورہ کے شوہر نے الفاظ مذکورہ ''ہم اس کو ہرگز نہیں رکھیں گے اور نہ ہم سے کچھ واسطہ ہے، جہاں چاہے چلی جائے۔'' فی الواقع عورت مذکورہ کے حق میں کہے تھے یا نہیں۔ اگر کہے تھے تو یہ دریافت کیا جائے کہ کیا وہاں کے لوگ ان الفاظ کے بولنے سے طلاق دینا ہی مراد لیتے ہیں یا شوہر عورت مذکورہ

نے ان الفاظ کے بولنے سے طلاق دینا ہی مراد لیا ہے؟ تو ان دونوں صورتوں میں عورت مذکورہ پر طلاق پڑ گئی۔ پھر اگر عورت مذکورہ اپنے شوہر مذکور کی مدخولہ نہیں ہوچکی ہے یا ہوچکی ہے، مگر عدت طلاق مذکور کی گزر چکی ہے تو ان دونوں صورتوں میں عورت مذکورہ اور اس کے شوہر کے بھائی میں نکاح ہوسکتا ہے اور اگر عدت نہیں گزر چکی ہے تو بعد عدت گزر جانے کے نکاح ہوسکتا ہے، مگر ان سب صورتوں میں یہ شرط ہے کہ عورت مذکورہ اور اس کے شوہر کا بھائی دونوں بدکاری سے سچی توبہ کرلیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم. كتبہ: محمد عبد اللہ (٤/ جمادی الأولی ١٣٣١ھ)

طلاق میں نسبت کرنا اور کسی کو مخاطب کرنا ضروری ہے:

سوال زید نے مسماۃ زینب زوجہ اپنی کو کہ وہ ایک گٹھری میں کپڑے اور زیور وغیرہ باندھ کر اپنے میکے جانے پر مستعد تھی روکا اور منع کیا کہ جاتی ہو تو گٹھری کیوں لیے جاتی ہو اور گٹھری چھین لی، مگر وہ ضد کیے جاتی تھی کہ میں جاؤں گی، گٹھری میری دے دو تو زید نے وہ گٹھری اپنی خالہ پر پھینک کر کہا: طلاق طلاق طلاق۔ تب اس کی خالہ نے کہا کہ تو نے یہ کیا کہا؟ تو جواب دیا کہ میں نے تو کچھ نہ کہا اور اس وقت زوجہ اس کی میکے نہیں گئی اور وقت شام چند شخص اس کے باپ نے بھیجے کہ وہ بجبر تمام اسے میکے لے گئے اور گٹھری چھوڑ گئی۔

جواب صورت مسئولہ میں اگر زید کی زبان سے اس سے زیادہ کوئی لفظ نہیں نکلا تو طلاق نہیں ہے۔ اس لیے کہ طلاق کی نسبت کسی کی طرف نہیں کی اور نہ کسی کو مخاطب کیا۔ واللہ أعلم وعلمہ أتم.

حررہ: محمد إسماعیل، عفا اللہ عنہ. الجواب صحیح. كتبہ: محمد عبداللہ.

سوال کسی شخص کی زن وشو میں باخود ہا کچھ تکرار ہوئی، اس پر عورت کے طلب کرنے سے مرد نے مہر دے دیا تو کسی شخص نے پوچھا کہ کیا مہر دے دینے سے طلاق ہوجاتی ہے؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ ہاں ہوگئی۔ وہاں پر تین شخص اور بھی موجود تھے۔ پہلا شخص (عورت کا چچا) بیان کرتا ہے کہ میں نے چار بار یہی سنا کہ مہر دے دیا تو طلاق ہوگئی۔ دوسرا شخص کہتا ہے: مجھے یاد نہیں کہ دو بار کہا یا تین بار، مگر پوچھنے پر یہی کہا کہ مہر دے دیا تو طلاق ہوگئی۔ تیسرے شخص کا بیان ہے کہ اس نے دو بار یہی کہا، مگر عورت سے مخاطب ہو کر ایک بار بھی نہیں۔ تو شرع شریف کی رو سے طلاق واقع ہوئی کہ نہیں؟

جواب شارع نے ہر امر کے لیے قانون مقرر کر دیے ہیں، جن سے کاموں کا جواز وعدمِ جواز سمجھا جاتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر طلاق کی صحت وجواز کے واسطے محاورے کے اعتبار سے دو طرح کے الفاظ ٹھہرائے گئے:

1. صریح، جو طلاق ہی میں مستعمل ہوتے ہیں اور ان کے استعمال سے بلا نیت طلاق ہی سمجھی جاتی ہے۔
2. کنایہ، جن میں طلاق کے سوا اور باتوں کا بھی احتمال رہتا ہے اور ان کے استعمال سے بلا نیت طلاق معتبر نہیں ہوتی۔

ہدایہ (١/ ٣٣٩ مصطفائی) میں ہے:

"الطلاق علیٰ ضربین: صریح و کنایة" [طلاق کی دو قسمیں ہیں: صریح اور کنائی]

مگر جب تک کہ طلاق عورت کی طرف بالخطاب یا بالاضافہ منسوب نہ ہو، واقع نہیں ہوتی۔

درمختار کے (ص:۱۹۳) کے "باب الصریح" میں "صریحه ما لم یستعمل إلا فیه کطلقتك، وأنت طالق و مطلقة" کے تحت میں مرقوم ہے:

"لو قال: إن خرجت یقع الطلاق، أو لا تخرجي إلا بإذني، فإني حلفت بالطلاق، فخرجت لم یقع لترکه الإضافة إلیها"[1]

[اگر اس نے کہا: اگر تو نکلی تو طلاق واقع ہو جائے گی یا میری اجازت کے بغیر نہ نکلنا، کیوں کہ میں نے طلاق کی قسم اٹھائی ہے۔ پس وہ نکلی تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیوں کہ اس نے اس (عورت) کی طرف طلاق کی نسبت نہیں کی]

کتبِ احادیث سے بھی طلاق کا عورت کی طرف ہی منسوب ہونا سمجھا جاتا ہے۔ صحیح بخاری (۲/ ۷۹ مطبوعہ احمدی) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا بنت الجون سے بخطاب یہ فرمانا مروی ہے:

«لقد عذت بعظیم، الحقي بأهلك»[2] ملخصاً

[تو نے بہت عظیم ہستی کے ساتھ پناہ پکڑی ہے، لہٰذا تو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا]

"مشکوۃ المصابیح" (ص: ۲۷٦ مطبوعہ بمبئی) میں موطا امام مالک سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بالاضافۃ یہ کہا:

"إني طلقت امرأتي مائة تطلیقة..."[3] ملخصاً

[بلاشبہہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں...]

اب میں کہتا ہوں کہ صورت مسئولہ میں کسی طرح طلاق نہیں واقع ہوئی، کیونکہ اس مرد کا یہ کہنا کہ مہر دے دیا تو طلاق ہوگئی، دو حال سے خالی نہیں، یا بہ نیتِ طلاق ہے یا بلا نیت۔ شق اول میں طلاق اس عورت کی طرف منسوب نہ ہونے کی وجہ سے واقع نہیں ہوئی۔ شق ثانی میں دو احتمال ہیں، یا تو قول مذکور سے اس کا صرف یہ خبر دینا مقصو ہے کہ ادائے مہر کے وقت طلاق کی نیت غیر واقع امر کی خبر دینا ہے، کیونکہ بے زبان سے کچھ کہے مجرد مہر (جو اس پر واجب تھا) دے دینے سے طلاق نہیں ہوتی، اس لیے یہ خبر غیر معتبر ٹھہری۔

دوسری صورت میں خود وہ مسئلہ ہی غلط ہے۔ ایسی حالت میں تو اگر اس مسئلے کی صحت کے گمان پر زبان سے بھی عورت کی طرف نسبت کر کے طلاق دیتا تو بھی واقع نہیں ہوتی، کیونکہ اگر کوئی شخص صحیح نکاح کو فاسد سمجھ کر توڑ دے،

---

[1] الدر المختار (۳/ ۲٤۸)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٩٥٥)

[3] موطأ الإمام مالك (۲/ ۵۵۰) مشکاة المصابیح (۲/ ۲٤۱)

اس کے بعد ظاہر ہو کہ وہ نکاح فاسد نہ تھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ فتاویٰ عالمگیری (۱/ ۵۳۰ مطبوعہ کلکتہ) میں ہے:

"ظن الزوج أن نكاح امرأته وقع فاسداً، فقال: تركت هذا النكاح الذي بيني وبين امرأتي، فظهر أن نكاحها كان صحيحا، لا تطلق امرأته" والله أعلم بالصواب

[خاوند نے یہ گمان کیا کہ اس کا بیوی سے نکاح فاسد واقع ہوا ہے تو اس نے کہا کہ میں نے اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان ہونے والے اس نکاح کو ترک کر دیا۔ پھر یہ ظاہر ہوا کہ اس کا اس (عورت) کے ساتھ نکاح صحیح تھا تو اس کی بیوی کو طلاق نہیں ہوگی]

حرره العبد الضعيف الراجي رحمة ربه القوي أبو الخير محمد ضمير الحق الآروي، تجاوز الله عن ذنبه الجلي والخفي. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبدالله الغازيفوري. الجواب صحيح. كتبه: و صيت على نگينوي. الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب.

سوال زید نے اپنی زوجہ کو بلا قصد و بلا نیت دلی صرف ایک بار ایک موقع میں یہ لفظ اپنی زوجہ کو کہا کہ اگر اس کی زوجہ زید سے بولے تو طلاق ہے و بعد اس کے زید کی زوجہ زید سے بولی اور اس نے، یعنی زوجہ نے اس طلاق کو قبول نہیں کیا تو ایسی حالت میں زید کو مباشرت کرنا اپنی زوجہ سے حرام ہوگا یا کیا؟ اور اگر حرام نہیں ہے تو کوئی کفارہ وغیرہ عائد ہوگا یا نہیں؟ جواب اس کا جلد درکار ہے۔ راحت حسین خان۔ سب رجسٹرار، مقام بہوہ، ضلع شاہ آرہ (۱۴/ شوال ۱۳۰۹ھ)

جواب صورت مسئولہ میں ظاہراً طلاق نہیں واقع ہوگی، اس لیے کہ طلاق متعلق بہ تلفظ ہے اور صورت مسئولہ میں طلاق دہندہ نے جو تلفظ کیا ہے، صرف اسی قدر کیا ہے کہ زید کی زوجہ اگر اس سے بولے تو طلاق ہے اور اس نے یہ نہیں کہا ہے کہ کس کو طلاق ہے، اس کی زوجہ کو یا کسی اور کو؟ اس لیے طلاق نہیں ہوگی اور علاوہ اس کے اس کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ زید کی زوجہ اگر اس سے بولے تو طلاق دینا مجھ پر لازم ہے اور یہ وعدہ ہوا اور طلاق کا وعدہ کرنے سے طلاق نہیں پڑتی ہے۔ اس کے سوا اس میں اور بھی عدمِ وقوعِ طلاق کا احتمال نکل سکتا ہے اور جب اس میں جس طرح وقوعِ طلاق کا احتمال ہے، ویسا ہی عدمِ وقوع کا بھی ہے، تو اب وقوعِ طلاق مشکوک فیہ ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جو بات یقینی ہوتی ہے، وہ شک سے زائل نہیں ہوتی اور یہ ظاہر ہے کہ پہلے اس عورت کا غیر مطلقہ ہونا یقینی تھا اور اب اس لفظ کے کہنے سے شک پڑ گیا تو موافق قاعدہ مذکورہ وہ عورت مطلقہ نہیں ہوسکتی۔ ''در المختار'' (ص: ۲۶۳) کی عبارت سے بھی ایسا ہی ظاہر ہے کہ طلاق اس صورت میں واقع نہیں ہوگی۔ وہ عبارت یہ ہے:

"لو قال: إن خرجت يقع الطلاق أو لا تخرجي إلا بإذني فإني حلفت بالطلاق فخرجت لم يقع لتركه الإضافة إليها"

[اگر اس نے کہا کہ اگر تو نکلی تو طلاق واقع ہوجائے گی یا یہ کہا کہ میری اجازت کے بغیر نہ نکلنا، بلاشبہہ میں نے طلاق کی قسم اٹھائی ہے، پھر وہ (اس کی بیوی) نکلی تو طلاق واقع نہیں ہوگی، کیوں کہ اس (کے شوہر) نے اس (عورت) کی طرف طلاق کی نسبت نہیں کی]

مگر احتیاطاً اگر عورت عدت میں ہے تو رجعت کر لے اور اگر عدت گزر گئی ہے تو تجدیدِ نکاح کر لے۔

واللّٰہ أعلم وعلمه أتم.

كتبه أضعف عباد المعبود المدعو بمحمود، حماه الله عن شر الحسود. الجواب صحيح.

كتبه: محمد عبد الله۔مہر مدرسہ۔المجيب مصيب عندي والله أعلم و علمه أتم. أبو محمد إبراهيم.

الفاظِ کنایات میں طلاق کی نیت ہونا ضروری ہے:

سوال جو شخص اپنی بی بی کو لفظِ طلاق کے بدلے زبان ہندی میں کہے کہ نکل جا یا ہم سے تم سے کوئی واسطہ نہیں اور اس لفظ سے معنی طلاق کا سمجھے تو اس کے کہنے سے بی بی اس کے نکاح سے باہر ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب ایسے الفاظ کنایاتِ طلاق سے ہیں۔ اگر بہ نیتِ طلاق کہے جائیں گے تو طلاق پڑ جائے گی، وگرنہ نہیں۔

سوال زید کی ہندہ سے شادی ہوئی اور ایک لڑکا ہوا۔ بعدہ زید کو ہندہ کی بد وضعی ثابت ہوئی اور دو ایک مرتبہ زید نے خود اپنی آنکھ سے اس کی بد چلنی دیکھ لی اور تمام برادری میں بھی اس کی بد وضعی مشہور ہوگئی تو زید نے ہندہ کو اس کے مکان پر چھوڑ کر بہت دور کسی ملک میں بود و باش اختیار کی، یہاں تک کہ عرصہ چودہ پندرہ برس کا ہوگیا اور اس کا لڑکا جوان ہوگیا۔ اب اس کے ملک کے لوگ جب وہاں گئے تو اس سے کہا کہ اپنی عورت کے نان و نفقہ کی خبر کیوں نہیں لیتا؟ تو اس نے جواب دیا کہ مجھے عورت سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک گواہ نے تو یہ کہا اور دوسرے گواہ نے یہ کہا کہ میں نے جب اس عورت کے نان و نفقہ کے بارے میں کہا تو اس نے کہا کہ مجھے عورت سے کیا کام ہے اور اس کے گاؤں کی عورتوں نے کہا کہ وہ کہتا ہے کہ مجھے اس عورت سے کوئی واسطہ نہیں اور اب عرصہ پندرہ برس کے بعد وہ عورت اپنے گاؤں سے پھر شہر میں آئی تو اور ایک دوسرے شخص سے واسطہ ہوگیا اور حاملہ بھی ہوگئی، اس صورت میں اب اس شخص سے جس کا حمل ہے، اس عورت کا اس سے نکاح درست ہے یا نہیں اور طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب اگر زید نے فی الواقع اپنی عورت ہندہ کی نسبت یہ الفاظ "مجھے عورت سے کوئی واسطہ نہیں" "مجھے عورت سے کیا کام؟" کہے ہیں اور زید کی نیت ان الفاظ کے کہنے سے ہندہ کو طلاق دینے کی تھی تو اس صورت میں ہندہ پر طلاق واقع ہوگئی اور انقضائے عدت کے بعد ہندہ کا نکاح اس شخص سے درست ہے، جس کا حمل کہا جاتا ہے، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ دونوں، مذکور و ہندہ، نکاح کے قبل ایسے فعلِ بد سے سچی توبہ کر ڈالیں۔

"وأما الضرب الثاني وهو الكنايات، فلا يقع بها الطلاق إلا بالنية أو بدلالة الحال، لأنها غير موضوعة للطلاق، بل تحتمله وغيره، فلا بد من التعيين أو دلالته"[1] (ہدایہ)

[رہی (طلاق کی) دوسری قسم تو وہ کنایات ہے، ان کنایات کے ساتھ تب ہی طلاق ہوتی ہے، جب نیت طلاق دینے کی ہو یا صورت حال کی دلالت کے ساتھ، کیوں کہ یہ الفاظ (کنایات) طلاق (دینے) کے لیے

[1] الهداية (١/ ٢٤١)

وضع نہیں ہوئے ہیں، بلکہ وہ طلاق کا بھی اور کسی اور مفہوم کا بھی احتمال رکھتے ہیں، لہٰذا ان سے (طلاق کی) تعیین یا اس کی دلالت ضروری ہے]

”وقال إبراهيم: إن قال: لا حاجة لي فيك، نيته“ (صحيح بخاري، مصرى: ٤/ ١٦٩)

[ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر وہ کہے کہ مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں، تو اس کی نیت کا اعتبار ہوگا]

وقال تعالىٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [بقرة، ع:٣٠]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کرلیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں]

وقال تعالىٰ: ﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ﴾ [نساء، ع:٤]

[اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں کہ اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو، اس حال میں کہ نکاح میں لانے والے ہو، نہ کہ بدکاری کرنے والے]

وقال تعالىٰ: ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [سورة النور، ع:١]

[زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے، یا کسی مشرک عورت سے، اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے] واللہ تعالیٰ أعلم

كتبه: محمد عبد الله (٦/ محرم ١٣٢٧هـ)

سوال زید نے اپنی بی بی ہندہ کو اتہام حمل حرام لگایا اور اپنے گھر لے جا کر خوب بندوبست کیا اور دائیوں کے ذریعہ حمل کی خوب تحقیق کی۔ جب کسی طرح سے حمل ثابت نہ ہوا تو ہندہ کو یہ کہہ کر تو میرے کام کی نہیں، اپنے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ اپنے میکے میں ہے۔ والد ہندہ نے اپنے داماد کو نوٹس بھی دیا کہ اپنی بیوی کو لے جاؤ اور اپنے گھر رکھو، ورنہ طلاق دو۔ بجواب نوٹس شوہر ہندہ نے صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ میری بی بی میرے کام کی نہیں ہے، اس کو اختیار ہے، جو چاہے کرے۔ اس کو بھی عرصہ بہت ہوگیا، اس صورت میں ہندہ کو کیا کرنا چاہیے؟ آیا اپنا نکاح کسی دوسرے شخص سے کرے یا نہیں؟ اس کا شوہر تو بجواب نوٹس صاف لکھ چکا کہ ہندہ میرے کام کی نہیں ہے، وہ جو چاہے سو کرے، اسے اختیار ہے؟

جواب اس صورت میں ہندہ پر طلاق واقع ہوگئی۔ اس لیے کہ گو زید (شوہر ہندہ) کے یہ الفاظ کہ ”میری بی بی میرے کام کی نہیں ہے، اس کو اختیار ہے، جو چاہے وہ کرے“ صریح طلاق نہیں، بلکہ کنایہ طلاق ہیں، لیکن کنایاتِ طلاق سے

بھی اسی طرح طلاق پڑ جاتی ہے، جس طرح صریح طلاق سے، جب کہ کنایات کے ساتھ شوہر کی نیت طلاق دینے کی ہو یا دلالتِ حال (قرینہ حالیہ) موجود ہو۔ صورت مسئولہ میں گو زید کی نیت کا حال معلوم نہیں، ممکن ہے کہ اس کی نیت بھی ہو، لیکن دلالتِ حال (والدِ ہندہ کا سوال طلاق) ضرور موجود ہے، پس اس صورت میں ہندہ پر ضرور طلاق پڑ گئی۔ اب اگر اس طلاق کی عدت گزر چکی ہے یا ہندہ ہنوز زید کی مدخولہ ہی بعد نکاح کے نہیں ہوئی ہے، تو ہندہ ان دونوں صورتوں میں اپنا نکاح دوسرے شخص سے کر سکتی ہے۔ یا اگر زید و ہندہ پھر باہم نکاح پر راضی ہو جائیں تو دونوں پھر باہم نکاح کر سکتے ہیں۔ اگر اس طلاق کی عدت نہ گزر چکی ہو اور ہندہ زید کی مدخولہ بعد نکاح کے ہو چکی ہو تو زید اس صورت میں رجعت کر سکتا ہے۔ اگر زید کی نیت اس رجعت سے ہندہ کو اچھی طرح رکھنے کی ہو، ستانے اور تنگ کرنے کی نہیں۔

وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [بقرۃ، ع:۳۰]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں]

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الأحزاب: ٤٩]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس سے پہلے کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، سو انھیں سامان دو اور انھیں چھوڑ دو، اچھے طریقے سے چھوڑنا]

وقال تعالیٰ: ﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾ [البقرۃ: ۲۲۸] [اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں] وقال تعالیٰ: ﴿وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ واللہ تعالیٰ أعلم. [اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو] کتبہ: محمد عبداللہ (۱۱/ ربیع الآخر ۱۳۳۵ھ)

اگر الفاظِ طلاق میں دو معانی کا احتمال ہو؟

سوال زید نے سفر کا قصد کیا۔ ہندہ اس کی بی بی نے کہا کہ سفر میں مجھے ساتھ لے چلو یا طلاق دے دو۔ زید نے کہا کہ جب تم نے طلب طلاق کا کیا طلاق ہو گیا۔ یہ کہہ کر سفر پر چلا گیا۔ بعد چند برس کے ہندہ نے بذریعہ خط طلب خرچ کا کیا کہ یا مجھے خرچ بھیجیں یا طلاق دے دیجیے۔ زید نے جواب میں لکھا کہ جس وقت میں نے پہلے سفر کا قصد کیا تھا تو نے اسی وقت طلب طلاق کا کیا تھا، اسی وقت تجھ کو طلاق ہو چکا، پھر دوبارہ طلاق مانگنے اور خرچ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس صورت میں طلاق واقع ہوا یا نہیں؟ اس عورت کا نکاح دوسری جگہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب ہندہ کے طلبِ طلاق کے جواب میں زید کا یہ کہنا کہ ''جب تم نے طلب طلاق کا کیا'' ایقاعِ طلاق میں صریح نہیں ہے۔ یہ کلام دو مطلب کا محتمل ہے۔ ایک یہ کہ جب تم نے طلب طلاق کا کیا طلاق ہوگیا، یعنی تمھارا طلب طلاق کا کرنا ہی طلاق ہو جاتا ہے، یعنی عورت کے مجرد طلب طلاق سے طلاق واقع ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ جب تم نے طلب طلاق کا کیا طلاق ہوگیا، کیونکہ جب طلب طلاق کا کیا، اسی وقت میں نے تم کو طلاق دے دیا۔ اگر زید کا مطلب اس کلام سے احتمالِ اول ہے تو طلاق نہیں ہوا، کیونکہ عورت کے مجرد طلبِ طلاق سے طلاق نہیں ہوتا اور اگر زید کا مطلب احتمالِ ثانی ہے تو طلاق ہوگیا اور عدت بھی گزر گئی۔ اب ہندہ کا دوسرا نکاح جائز ہے۔

بہر کیف زید سے استفسار کیا جائے کہ اس نے اس کلام کو کس مطلب سے کہا تھا؟ حسبِ بیان اس کے عمل کیا جائے اور اگر کہے کہ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے کس مطلب سے کہا تھا تو اس سے دریافت کیا جائے کہ ہندہ کے طلاق طلب کرنے کے وقت تمھیں یہ معلوم تھا کہ عورت کے مجرد طلبِ طلاق سے طلاق ہو جاتا ہے؟ اگر یہ کہے کہ یہ مجھے معلوم نہیں تھا، تو اس صورت میں طلاق ہو جائے گا، کیونکہ اب احتمال اول باقی نہیں رہا۔ صرف احتمال ثانی متعین ہے۔ اگر کہے کہ ہاں یہ مجھے معلوم تھا، مگر اب یاد نہیں رہا کہ میں نے کس مطلب سے کہا تھا یا زید کچھ بیان ہی نہ کرے تو اس صورت میں طلاق نہ ہوگا، کیونکہ زید کا مذکورہ بالا کلام محتمل ہے اور جو کلام اس نے سفر سے لکھا ہے، اس سے بھی کسی مطلب کی تعیین نہیں ہوتی، کیونکہ وہ بھی مثل اس کے محتمل ہے اور ہندہ اس کلام کے پہلے یقیناً زید کی منکوحہ تھی اور اس محتمل کلام کے بعد شک پڑ گیا کہ طلاق ہوا یا نہیں اور یہ شرعی اصول ہے کہ "اليقين لا يزول بالشك"، یعنی یقین، شک سے زائل نہیں ہوتا، تو نکاحِ ہندہ جو یقینی ہے، اس مشکوک طلاق سے زائل نہیں ہوا۔ وہ بدستور زید کی منکوحہ رہی۔

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. أبو الفياض محمد عبد القادر اعظم گڑھی مؤی.

دو طلاقوں کے بعد رجوع کا مسئلہ:

سوال عبداللہ سردار نے اپنی بی بی کو بوجہ اس کے اِعراض ونشوز کے لکھ کر طلاق بائن دے دیا تھا، بعدہ بوقت نکاحِ ثانی مجلسِ نکاح میں پھر دوبارہ زبانی طلاق دے دیا تھا اور مدت ڈیڑھ برس کی گزر گئی ہے، اس بنا پر وہ بی بی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں اور اس انقضا پر عبداللہ سردار پر وہ بی بی حرام ہوگئی ہے یا حلال ہے اور عبداللہ سردار بلاتجدیدِ نکاح اس بی بی کو جبراً اپنے تحت میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ سردار نے اپنی بی بی کو صرف دو بار طلاق دی، پہلی بار لکھ کر، دوسری بار زبانی اور سوال سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دوسری طلاق پہلی طلاق کی عدت کے اندر دی یا عدت کے بعد دی اور اگر عدت کے بعد دی تو نکاحِ ثانی کے قبل یا نکاحِ ثانی کے بعد دی؟ پس اگر عبداللہ سردار نے اپنی بی بی کو فی الواقع دو ہی طلاق دی ہو اور دوسری طلاق پہلی طلاق کی عدت گزر جانے اور اس بی بی سے نکاحِ ثانی کرنے کے بعد دی ہو تو اس صورت میں اگر طلاق ثانی کی عدت نہ گزری ہو تو عبداللہ سردار اپنی بی بی کو بلا تجدیدِ نکاح صرف رجعت کر کے

اپنے تحت لا سکتے ہیں، اس میں بی بی کی رضا مندی کی ضرورت نہیں ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس رجعت سے اصلاح کی نیت ہو، یعنی بی بی کو اچھی طرح رکھنے کی نیت ہو، ایذا اور تکلیف پہنچانے کی نیت نہ ہو۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا﴾ [البقرۃ: ۲۲۸]

[اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ (معاملہ) درست کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں]

اگر طلاقِ ثانی کی عدت گزر چکی ہو تو اس بی بی کو اختیار ہے، چاہے دوسرے مرد سے نکاح کرے، چاہے عبداللہ سردار سے کرے۔ الغرض اس میں بی بی کی رضا مندی کی ضرورت ہے، جس سے راضی ہو، اس سے نکاح کر سکتی ہے، اس پر کسی کا جبر نہیں پہنچتا۔ وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ (بقرۃ، ع: ۲۹) [اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو] صرف ڈیڑھ برس گزر جانے سے نہیں کہا جا سکتا کہ عدت گزر گئی یا نہیں؟ اس کو ٹھیک طور پر دریافت کر لیا جائے، اس لیے کہ عورتیں مختلف قسموں کی ہوتی ہیں، لہٰذا ان کی عدتیں بھی مختلف ہیں۔ واضح ہو کہ جواب جو لکھا ہے، یہ سوال کے اس مطلب کا جواب ہے جو سوال سے ظاہر ہوتا ہے اور اگر سوال کا کچھ اور مطلب ہو تو اِس جواب کو اُس مطلب کا جواب نہ سمجھیں۔ فقط

کتبہ: محمد عبد اللہ (فی دہلی)

بیک وقت تین طلاقوں کے بعد رجوع کا مسئلہ:

سوال زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو وقت لڑائی کے تین طلاق دیا اور بعد طلاق کے ڈیڑھ مہینے تک ہندہ اپنے شوہر سے الگ رہی، مگر ڈیڑھ ماہ کے بعد زید نے ہندہ کو پھسلا کر اپنی طرف میل جول کر لیا اور ہندہ بسبب ناواقفیت مسئلہ شریعت کے اس کے پاس قریب برس کے رہی اور اب اس کا افشا عام ہوگیا، پس ہندہ بھی اس سے واقف ہوگئی۔ اب ازروئے قرآن و حدیث کیا کیا جائے؟

جواب اگر زید نے تین طلاق ایک ساتھ دیا ہے تو قطع نظر اس کے کہ یہ طلاق مبغوضِ الٰہی ہے، جیسا کہ مشکوۃ (ص: ۲۷۶ مطبوعہ انصاری) میں محمود بن لبید سے مروی ہے:

"قال: أخبر رسول اللّٰہ ﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعا، فقام غضبان، ثم قال: «أيلعب بكتاب اللّٰہ، وأنا بين أظهركم» حتى قام رجل فقال: يا رسول اللّٰہ! ألا أقتله؟"[1] (روہ النسائي)

[رسول اللہ ﷺ کو ایک آدمی کے بارے میں بتایا گیا، جس نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دی تھیں۔ آپ ﷺ غصے کی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: "کیا میری موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (۳۴۰۱)

کتاب سے کھیلا جاتا ہے؟'' حتی کہ ایک آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا میں اسے قتل نہ کر دوں؟]

حکم ایک ہی طلاق کا رکھتا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم (۱/ ۴۷۷ چھاپہ دہلی) میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

"قال: كان الطلاق على عهد رسول اللهﷺ وأبي بكر و سنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة، فقال عمر بن الخطاب: إن الناس قد استعجلوا في أمر كانت لهم فيه أناة فلو أمضيناه عليهم فأمضاه عليهم"[1]

[راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کیا جاتا تھا، تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگ اس معاملے (طلاق) میں، جس میں انھیں مہلت حاصل تھی، جلدی کرنے لگے ہیں، اگر ہم (ان کی تین طلاقوں کو، تین طلاقیں ہی) ان پر نافذ کر دیں (تو بہتر ہے) چنانچہ انھوں نے اس کو نافذ کر دیا]

پس اگر ڈیڑھ مہینے میں تین حیض سے اس عورت کو فراغت ہو چکی تھی، تب شوہر اس کا اسے اپنے گھر لے آیا تو بے شک یہ فعل ناجائز ہوا۔ اب یہی شکل دونوں کے ملنے کی ہے کہ نکاح کرایا جائے اور اگر قبل تین حیض سے فراغت کرنے کے شوہر اس عورت کو لے آیا، وہ بے شبہہ رجعتِ صحیحہ ہے۔ ہدایہ (ص: ۳۷۵ مصطفائی) میں ہے:

"والرجعة أن يقول: راجعتك أو راجعت امرأتي، وهذا صريح في الرجعة، ولا خلاف فيه بين الأئمة. قال: أو يطأها، أو يقبلها، أو يلمسها بشهوة، أو ينظر إلى فرجها بشهوة"[2]

[رجوع یہ ہے کہ وہ (رجوع کرنے والا) کہے: میں نے تجھ سے رجوع کیا یا میں نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا۔ رجوع کے یہ الفاظ صریح ہیں، ائمہ کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ انھوں نے کہا: (رجوع اس طرح بھی ہو جاتا ہے کہ وہ) اس (اپنی مطلقہ بیوی) سے وطی کر لے یا اسے بوسہ دے یا شہوت کے ساتھ اسے چھوئے یا شہوت کے ساتھ اس کی شرم گاہ کو دیکھے]

كتبه: أضعف عباد الرحمن أبو عبد المنان محمد سليمان، غفرله السبحان. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبدالله.

کیا دو مہینے میں تین طلاقیں دے کر رجوع ہو سکتا ہے؟

سوال ایک شخص نے اپنی بی بی کو دو مہینے کے عرصے میں تین طلاق دے دیا، اس قصور پر کہ بی بی نماز نہیں پڑھتی ہے اور اب بعد طلاق کے بی بی بہت عاجزی کرتی ہے کہ ہمارا قصور معاف کرو، ہم نماز پڑھتی ہیں اور میاں بھی چاہتا ہے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٢)

[2] الهداية (٢/ ٦)

کہ کوئی صورت اس کے پاس رہنے کی ہو تو ہم رکھتے۔ اس صورت میں حضور کے پاس سوال جاتا ہے اور پہلی طلاق سے آج تک دو مہینہ گزرا ہے، از روئے شریعت کے ارقام فرمائیں۔

جواب جس شخص نے اپنی عورت کو دو مہینے کے عرصہ میں تین طلاق دے دیا، اگر پہلا طلاق دے کر بلا رجعت دوسرا طلاق دے دیا، اسی طرح دوسرا طلاق دے کر بلا رجعت تیسرا طلاق دے دیا، تو جب تک پہلے طلاق کی عدت نہ گزرے، رجعت کر سکتا ہے، یعنی طلاق کو واپس لے سکتا ہے اور جب طلاق کو واپس لے لے گا تو وہ عورت اس کی بی بی ہو جائے گی اور وہ اس بی بی کے ساتھ رہ سکتا ہے اور اگر عدت گزر گئی ہو تو اگر دونوں راضی ہوں تو پھر دونوں میں جدید نکاح ہو سکتا ہے۔ صحیح مسلم (۱/ ۴۷۷ چھاپہ دہلی) میں ہے:

"عن ابن عباس قال: كان الطلاق على عهد رسول اللهﷺ وأبي بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة" [1] الحديث. والله أعلم بالصواب

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کیا جاتا تھا]

جس عورت کو حیض آتا ہو، اس کی عدت تین حیض ہے: ﴿وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ (سورۂ بقرة: ۲۲۸) [اور وہ عورتیں جنھیں طلاق دی گئی ہے، اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں] جس عورت کو حیض نہ آتا ہو، اس کی عدت تین مہینے ہیں اور جس عورت کو حمل ہو، اس کی عدت وضع حمل ہے۔ ﴿وَالّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِيْ لَمْ يَحِضْنَ﴾ [سورۂ طلاق رکوع ۱] والله أعلم بالصواب

[اور وہ عورتیں جو تمھاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں، اگر تم شک کرو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور ان کی بھی جنھیں حیض نہیں آیا]

كتبه: عبد الله

تین طلاقوں کے بعد رجوع نہیں ہو سکتا:

سوال زید نے اپنی بیوی کو حالتِ غصہ میں طلاق دے دی اور رجوع کر لیا، پھر ایک سال کے بعد بیوی کو غصہ ہو کر طلاق دے دی، پھر رجوع کر لیا، پھر دو ایک سال کے بعد آپس میں جھگڑا ہوا اور اس جھگڑے میں بیوی نے شوہر کو کہا: تیری ماں تیری بیوی ہے۔ اب یہ بات سن کر غصہ ہو گیا اور طلاق دے دی۔ اب سوال یہ ہے کہ تین طلاق کے بعد اس بیوی کو لے سکتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں اگر محدثین کا اختلاف ہو تو صحیح مذہب اور راجح قول با دلائل مع حوالہ قرآن و حدیث دے کر تسلی فرمائیں۔

جواب صورتِ مسئولہ میں زید نے اگر پہلی اور دوسری اور تیسری طلاق جو بحالتِ غصہ ہے، اگر اس کا یہ غصہ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٤۷۲)

معمولی تھا اور زید کا ہوش و حواس علیٰ حالہ باقی تھا تو اس صورت میں ان تین طلاق کے بعد اپنی بیوی مطلقہ سے رجوع نہیں کر سکتا ہے اور نہ اس سے بغیر حلالہ کے نکاح جدید کر سکتا ہے۔ تمام محدثین اور فقہا کا بالاتفاق یہی قول ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

بیک وقت تین طلاقوں کا وقوع اور اس کی شرعی حیثیت:

سوال ایک شخص حنفی نے بحالت غصہ کے اپنی بیوی کو ایک ہی جلسہ میں لفظ طلاق تین مرتبہ کہا۔ بعد طلاق دینے کے برادری کے لوگوں نے اس کو کہا کہ تمھاری بیوی تم پر حرام ہوگئی اور طلاق ثابت ہوگئی، چنانچہ اس کا مسئلہ علمائے مذہب حنفیہ سے دریافت کیا گیا، بجواب اس کے علمائے حنفیہ نے یہ لکھا کہ طلاق جائز ہوگیا اور بغیر دوسرے شخص سے نکاح کیے ہوئے، پھر وہ دوسرا شخص یعنی محلل کے طلاق دینے پر محض اپنی خوشی سے اور بعد گزرنے عدت کے، تب البتہ پھر شوہر اول سے عقد نکاح جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔ بہر کیف برادری کے لوگوں نے ان دونوں شوہر و بیوی کو علیحدہ کر دیا، لیکن بعد تھوڑے دنوں کے ان دونوں زن و شوہر میں محبت ہوگئی اور شوہر اپنی بیوی کو اپنے مکان پر لے گیا، تب پھر برادری کے لوگوں نے اسے گرفت کیا اور اس کا حقہ تمبا کو موافق دستور برادری کے بند کر دیا کہ تم حرام کاری کرتے ہو، اس پر شوہر نے اپنی برادری میں ایک کتاب لا کر دکھلایا کہ اس کتاب کے رو سے ہم نے اپنی بیوی کو لا کر رکھا ہے، چنانچہ برادری میں وہ کتاب پڑھی گئی اور وہ یہ ہے: ''مجموعہ فتاویٰ مولانا مولوی عبدالحی صاحب۔ علیہ الرحمۃ۔'' مطبوعہ مطبع یوسفی واقع لکھنو۔ اس کتاب کے جلد دویم صفحہ ۵۳ میں یہ مسطور ہے:

استفتا کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ زید نے اپنی عورت کو حالتِ غضب میں کہا کہ میں نے طلاق دیا، میں نے طلاق دیا، میں نے طلاق دیا۔ پس اس تین بار کہنے سے تین طلاق واقع ہوں گی یا نہیں اور اگر حنفی مذہب میں واقع ہوں اور شافعی میں مثلاً واقع نہ ہوں تو حنفی کو شافعی مذہب پر اس صورت خاص میں عمل کرنے کی رخصت دی جائے گی یا نہیں؟

ھو المصوب اس صورت میں حنفی کے نزدیک تین طلاق واقع ہوں گی اور بغیر تحلیل کے نکاح نہ درست ہوگا، مگر بوقتِ ضرورت کہ اس عورت کا علیحدہ ہونا اس سے دشوار ہو اور احتمال مفاسد زائد کا ہو، تقلید کسی اور امام کی اگر کرے گا تو کچھ مضائقہ نہیں ہوگا۔ نظیر اس کی مسئلہ نکاحِ زوجہ مفقود و عدت ممتدۃ الطہر موجود ہے کہ حنفیہ عند الضرورت قولِ امام مالک پر عمل کرنے کو درست رکھتے ہیں، چنانچہ ''رد المحتار'' میں مفصلاً مذکور ہے، لیکن اولیٰ یہ ہے کہ وہ شخص کسی عالم شافعی سے استفسار کرے اور اس کے فتوے پر عمل کرے۔ واللہ أعلم. حررہ: محمد عبدالحی۔ عفي عنہ۔ تمام شد

جب یہ مضمون پڑھا گیا تو برادری کے لوگوں نے کہا کہ عالم شافعی سے مسئلہ دریافت کرنے کو لکھا ہے، بہتر ہے کہ عالم شافعی سے مسئلہ دریافت کیا جائے کہ ان کے نزدیک اس امر میں کیا حکم ہے؟ جب جواب آئے، اس کے

مطابق عمل کیا جائے، اس لیے حضور والا سے یہ عرض ہے کہ اس امر میں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک کیا حکم ہے؟ موافق قرآن پاک و احادیث شریفہ کے جواب سے شاد فرمایا جائے، تاکہ اسلام میں رخنہ نہ ہو۔

زیادہ نیاز حد ادب۔ فقط شیخ چھٹو میاں از مقام آسن سول قصائی محلّہ ندی پار ضلع بردوان، مورخہ (۲/ ذیقعدة ۱۳۳۰ھ) بروز دوشنبہ

جواب اس صورت میں موافق قرآن پاک اور حدیث شریف کے یہ حکم ہے کہ اس شخص نے جس نے غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دیا ہے، اگر وہ ایسا غصہ تھا، جس میں وہ از خود رفتہ ہوگیا تھا، یا ایسا غصہ تھا کہ جس میں وہ از خود رفتہ تو نہیں ہوگیا تھا، مگر ایسا تھا کہ اس میں الفاظِ طلاق اس کے منہ سے بلا قصد نکل گئے تھے، تو ان دونوں صورت میں طلاق اس کی بیوی پر واقع نہیں ہوئی اور اگر ایسا خفیف غصہ تھا کہ جس میں اس شخص نے الفاظِ طلاق بالقصد منہ سے نکالے تھے تو اس صورت میں اس کی بیوی پر صرف ایک طلاق رجعی پڑی، جس میں وہ شخص عدت کے اندر رجعت کرسکتا ہے، یعنی دو معتبر آدمیوں کے روبرو یہ کہہ کر کہ ''میں نے جو اپنی فلاں بیوی کو طلاق دی تھی، اس طلاق کو واپس لے لیا'' طلاق واپس لے سکتا ہے، بعد رجعت پھر وہ بیوی اس کی زوجہ ہوجائے گی اور اگر عدت گزر چکی ہو تو وہ شخص اس بیوی سے بہ تراضی طرفین پھر نکاح کرسکتا ہے اور وہ صورت جس میں تین طلاق پڑ جاتی ہیں اور پھر اس میں نہ رجعت جائز ہوتی ہے اور نہ بغیر حلالہ کے شوہر اول سے نکاح جائز ہوتا ہے، وہ صورت اور ہے، صورتِ مذکورہ سوال اس قبیل سے نہیں ہے۔ صورت مذکورہ سوال کا وہی حکم ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ زیلعی (ص: ۳۰ مطبوعہ علوی) میں ہے:

''أخرج أبو داود وابن ماجه عن صفية بنت شيبة عن عائشة سمعت رسول الله ﷺ يقول: «لا طلاق ولا عتاق في إغلاق»[1] انتهى. قال أبو داود: أظنه الغضب. يعني الإغلاق. قال ابن الجوزي: قال ابن قتيبة: الإغلاق الإكراه، ورواه الحاكم في المستدرك، وقال: على شرط مسلم. قال في التنقيح: وقد فسره أحمد أيضاً بالغضب. قال شيخنا: والصواب أنه يعم الإكراه والغضب والجنون، وكل أمر انغلق علىٰ صاحبه علمه وقصده، مأخوذ من غلق الباب''[2] اھ

[ابو داود اور ابن ماجہ نے صفیہ بنت شیبہ سے روایت کیا ہے، وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتی ہیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''زبردستی میں نہ طلاق ہوتی ہے اور نہ غلام آزاد ہوتا ہے۔'' امام ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں ''اِغلاق'' غضب اور غصے کے معنی میں ہے۔ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کہا: ابن قتیبہ نے کہا کہ ''اِغلاق'' کا معنی جبر و اکراہ ہے۔ اس کو امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۹۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۰٤٦)
2. نصب الراية (۳/ ۲۱۸)

روایت کیا اور فرمایا کہ یہ روایت مسلم کی شرط پر ہے۔ تنقیح میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اس کا مطلب غضب و غصہ بیان کیا ہے۔ ہمارے شیخ نے کہا ہے: درست یہ ہے کہ یہ لفظ جبر و اکراہ، غضب و غصہ، جنون اور ہر اس معاملے کو جس کا علم و قصد اس کے صاحب پر منغلق ہو، تمام معنوں میں عام ہے۔ یہ لفظ "غلق الباب" دروازہ بند کر دیا سے ماخوذ ہے]

وقال الله تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [بقرة، ع: ٢٩]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو]

قال الله تعالیٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ٢٢٩]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

إلی قوله: ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ [البقرة: ٢٣٠]

[تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے]

وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرة، رکوع: ٢٩ و ٣٠]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں]

"حدثنا عبد الله حدثني أبي ثنا سعد بن إبراهيم ثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثني داود بن الحصين عن عكرمة مولى ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا. قال: فسأله رسول الله ﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم. قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها"[1]

[ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ عکرمہ مولی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٥)

عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ ''تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟'' رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا ایک ہی مجلس میں؟'' انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کرلو۔'' راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کرلیا]

كتبه: محمد عبد الله (١٠/ ذيقعده ١٣٣٠ھ)

سوال ایک شخص مسمی عبدالغنی جس کی صرف ایک زوجہ مسماۃ زہرہ ہے، اپنی زوجہ سے ناخوش ہوا، مگر اس کے سامنے کچھ نہیں کہا، وہ باہر گیا، دو آدمی کو بلا کر ان سے یہ کہا کہ ہم نے اس کو طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا، اس کو بیٹی سمجھتے ہیں۔ فقط اس صورت میں طلاق ہوا یا نہیں؟ اگر طلاق ہوا تو کیا طلاق ہوا؟ ایک طلاق ہوا یا تین طلاق ہوا اور زوجہ عبدالغنی بلا حلالہ کے، یعنی بغیر دوسرے سے نکاح کے عبدالغنی کے پاس رہ سکتی ہے یا نہیں اور بلا حلالہ کے عبدالغنی کے پاس رہ سکے تو تجدیدِ نکاح کی عبدالغنی کے ساتھ حاجت ہوگی یا نہیں؟ و کفارہ ظہار بھی دینا ہوگا یا نہیں؟ واضح رہے کہ عبدالغنی کا لفظ ''ہم اسے بیٹی سمجھتے ہیں'' تک ہے، جس کے اوپر لکیر کھینچی ہے۔ عبدالغنی نے ان دونوں آدمی سے یہ کلام پہنچانے کو زوجہ تک نہیں کہا تھا اور نہ لفظ زوجہ کا کہا تھا اور نہ نام زوجہ کہا تھا، وقت کلام کے صرف وہی لفظ بولا تھا، جو اوپر مذکور ہوا۔

جواب اس صورت میں ایک طلاق واقع ہوئی اور حلالہ کی حاجت نہیں ہے اور نہ کفارہ لازم ہے۔ اگر عدت نہ گزری ہو تو عبدالغنی رجعت کر سکتے ہیں، یعنی طلاق مذکور واپس لے سکتے ہیں اور صرف اس قدر کہنے سے کہ ہم نے جو اپنی زوجہ مسماۃ فلانہ کو طلاق دیا تھا، اس طلاق کو واپس لیا، رجعت ہوجائے گی اور اگر عدت گزر گئی ہو اور دونوں باہم راضی ہوں تو تجدیدِ نکاح کی ضرورت ہے۔ صحیح مسلم (١/ ٤٧٧ چھاپہ دہلی) میں ہے:

''عن ابن عباس قال: كان الطلاق على عهد رسول اللهﷺ وأبي بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة، فقال عمر بن الخطاب: إن الناس قد استعجلوا في أمر كانت لهم فيه أناة فلو أمضيناه عليهم فأمضاه عليهم''[1] انتهى والله أعلم بالصواب

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کیا جاتا تھا تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگ اس معاملے (طلاق) میں جس میں انھیں مہلت حاصل تھی، جلدی کرنے لگے ہیں۔ اگر ہم (ان کی تین طلاقوں کو، تین طلاقیں ہی) ان پر نافذ کر دیں (تو بہتر ہے) چناں چہ انھوں نے اس کو نافذ کر دیا]

كتبه: محمد عبد الله۔ مہر مدرسہ۔ هذا الجواب صحيح ثابت عندي. كتبه: أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المباركفوري.

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٢)

سوال ایک شخص نے ایک وقت میں تین طلاقیں اپنی بی بی کو دیں۔ آیا وہ طلاقیں نزدیک خدا و رسول کے تینوں پڑ گئیں یا نہیں؟ اگر پڑ گئی ہیں تو اس کا ثبوت دیجیے اور اگر نہ پڑی ہیں تو اس کا ثبوت دیجیے۔

جواب اس صورت میں صرف ایک طلاق پڑی۔ صحیح مسلم (ص: ۴۷۷ چھاپہ دہلی) میں ہے:

”عن ابن عباس قال: كان الطلاق على عهد رسول اللهﷺ وأبي بكر و سنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة. فقال عمر بن الخطاب: إن الناس قد استعجلوا في أمر، كانت لهم فيه أناة، فلو أمضيناه عليهم، فأمضاه عليهم“[1]

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کیا جاتا تھا تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگ اس معاملے (طلاق) میں جس میں انھیں مہلت حاصل تھی، جلدی کرنے لگے ہیں۔ اگر ہم (ان کی تین طلاقوں کو، تین طلاقیں ہی) ان پر نافذ کر دیں (تو بہتر ہے) چناں چہ انھوں نے اس کو نافذ کر دیا]

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

سوال ایک جلسہ میں عورت کو تین طلاق دینے سے وہ عورت شوہر پر حرام ہو جاتی ہے یا نہیں؟

جواب اگر عورت مدخولہ ہو تو اس صورت میں صرف ایک طلاق رجعی پڑ جاتی ہے، جس میں عدت کے اندر شوہر رجعت کر سکتا ہے، یعنی اگر اس طلاق کو وہ واپس لے لے تو وہ واپس ہو سکتا ہے اور اگر عورت غیر مدخولہ ہو تو اس طلاق سے حرام ہو جاتی ہے اور پھر بتراضی طرفین جدید نکاح سے حلال ہو سکتی ہے، اسی طرح اگر عورت مدخولہ ہو اور بلا رجعت عدت گزر جائے تو بھی حرام ہو جاتی ہے اور پھر بتراضی طرفین جدید نکاح سے حلال ہو سکتی ہے۔

سوال کسی شخص نے ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دی، پھر وہ شخص عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب اگرچہ ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دینا منع ہے، لیکن آپس میں تین طلاقوں کے بعد اس بی بی کو عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے، بشرطیکہ بی بی مذکورہ اس شخص کی مدخولہ بعد نکاح کے ہو چکی ہو:

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرۃ: ۲۲۹]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [بقرۃ، ع: ۲۹]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۷۲)

وفي مسند الإمام أحمد بن حنبل رحمه الله: "حدثنا عبدالله حدثني أبي حدثنا سعد بن إبراهيم حدثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثني داود بن الحصين عن عكرمة مولى ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد، فحزن عليها حزنا شديدا قال: فسأله رسول الله ﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم، قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها"[1] الحديث والله تعالىٰ أعلم

[مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ میں ہے: ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ مولی ابن عباس عکرمہ سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ ''تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟'' رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا ایک ہی مجلس میں؟'' انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کر لو۔'' راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کر لیا]

كتبه: محمد عبد الله (٧/ رمضان المبارك ١٣٢٩هـ)

سوال تکرار کی حالت میں زید نے ہندہ کو بطور تہدید کے سمجھانے کے ارادے سے یہ چاہا کہ بیوی، یعنی ہندہ اصلاح پر آئے۔ ہندہ بی بی یہ کہتی تھی کہ اصل کے آپ ہوں، تو طلاق دیں۔ کئی مرتبہ ہندہ نے یہ کلام کہا تو شوہر کا ارادہ نہیں تھا کہ طلاق دے۔ محض ڈرانے کی وجہ سے تین طلاق دیا، مگر بعد میں دونوں آدمی یہ چاہتے ہیں کہ کوئی شرع سے پناہ کی صورت ہو تو اچھی بات ہے، چونکہ دونوں میاں بی بی راضی ہیں اور اس واقعہ سے چار خواہ پانچ روز کے بعد یہ خیال ہوا کہ ہم نے کیا کیا؟

جواب اس صورت میں کہ زید نے ہندہ کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، گو گنہگار ہوا، جس سے زید کو استغفار کرنا چاہیے، مگر ہندہ پر ایک طلاق رجعی پڑ گئی۔ اگر عدت نہ گزری ہو تو زید رجعت کر سکتا ہے اور عدت گزر چکی ہو تو بتراضی طرفین دونوں میں جدید نکاح ہو سکتا ہے۔

قال الله تعالىٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ٢٢٩]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٥)

وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [بقرة، ع: ٢٩]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو]

"حدثنا عبد اللّٰہ حدثني أبي ثنا سعد بن إبراهيم ثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثني داود بن الحصين عن عكرمة مولى ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا. قال: فسأله رسول اللّٰہﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم. قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها" الحديث، واللّٰہ تعالیٰ أعلم بالصواب.[1]

[ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ عکرمہ مولی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ "تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟" رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا ایک ہی مجلس میں؟" انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کر لو۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کر لیا]

کتبہ: محمد عبد اللّٰہ (١٠/ محرم ١٣٢٧ھ)

سوال زید نے اپنی زوجہ ہندہ کے روبرو بحالتِ فرطِ غضب بیک جلسہ تین مرتبہ کہا کہ طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا اور زید کا یہ بیان ہے کہ میرا ارادہ زوجہ کو طلاق دینے کا تھا، مگر رجعی، یعنی غیر بائن، اور طلاق سنی کا طریقہ اس کو معلوم تھا اور اس کا خیال اور عقیدہ پہلے سے اور اس وقت بھی مستحکم تھا کہ طلاق بائن صرف طریقہ معینہ مسنونہ کے ساتھ ہوتا ہے اور طلاق بدعی بائن نہیں ہوتا ہے، بلکہ رجعت کا اختیار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حالاتِ مذکورہ بالا میں طلاق بائن ہوا یا نہیں؟ مطابق حکمِ خدا و رسول کے جواب عنایت ہو۔

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٥)

جواب صورتِ مسئولہ میں صرف ایک طلاق رجعی پڑی اور بعد کو جو زید نے دوبارہ لفظ ''طلاق دیا'' کہا، وہ لغو ہوگیا، لیکن بالقصد کہا تو گنہگار ہوا۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ (سورۂ بقرہ، رکوع: ۲۹) [اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو] وقال تعالیٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [بقرۃ، ع: ۲۹]

في مسند الإمام أحمد (٢/ ٢٦٥): "حدثنا عبد الله حدثني أبي ثنا سعد بن إبراهيم ثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثني داود بن الحصين عن عكرمة مولى ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا. قال: فسأله رسول اللهﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم. قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها" الحديث (في المشكوة، ص: ٢٧٦)[1]

[مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ میں ہے، ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ عکرمہ مولی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ ''تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟'' رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا ایک ہی مجلس میں؟'' انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کرلو۔'' راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کرلیا]

"عن محمود بن لبيد قال: أخبر رسول اللهﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعا، فقام غضبان، ثم قال: «أيلعب بكتاب الله، وأنا بين أظهركم؟» حتى قام رجل فقال: يا رسول الله! ألا أقتله؟"[2] (روه النسائي) والله تعالىٰ أعلم.

[رسول اللہ ﷺ کو ایک آدمی کے بارے میں بتایا گیا، جس نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دی

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٥)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٠١)

تھیں۔ آپ ﷺ غصے کی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''کیا میری موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلا جاتا ہے؟'' حتی کہ ایک آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا میں اسے قتل نہ کر دوں؟]

كتبه: محمد عبد الله (۱۲/ ذيقعده ۱۳۲۹ھ). الجواب صحيح. سيد محمد عبدالسلام۔ الجواب صحيح سيد أبو الحسن. الجواب صحيح. كتبه: أبو يوسف محمد عبدالمنان الغازيفوي.

سوال زید نے اپنی بیوی ہندہ کو ایک جلسہ میں تین مرتبہ طلاق دیا، بلکہ تین مرتبہ سے بھی زیادہ طلاق دیا ہے، مگر تعداد یاد نہیں ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ رکھی جائے یا نہیں؟ بينوا تؤجروا.

جواب یک طلاق واقع شود او را نکاح کردن درست ست بغیر وطی کہ اگر عدت باقی است رجعت کند والا تجدید نکاح کند۔

[اس صورت میں ایک طلاق واقع ہو چکی ہے۔ اب اگر عدت باقی ہے تو وہ اس میں رجوع کر سکتا ہے اور اگر عدت گزر چکی ہو تو وہ تجدید نکاح کر سکتا ہے]

دستخط: نور الحق غزنوی۔ الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله.

سوال زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو ایک وقت اور ایک جلسہ میں تین طلاق دیں۔ بعدہ زید نے یہ سمجھ کر کہ گو میں نے تین طلاق آنِ واحد میں سنت کے خلاف دی ہیں، لیکن اصل مسئلہ میں ایک طلاق واقع ہوئی ہے، لہٰذا اس نے پھر رجوع کر لیا، اس صورت میں بعض اشخاص زید پر طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زوجہ تیری طالق ہوگئی ہے، بغیر حلالہ کے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا تحریر فرمایئے کہ ازروئے شرع شریف کے رجوع کرنا زید کا جائز ہے یا نہیں؟

جواب زید نے جس طریق سے طلاقیں دیں ہیں، یہ ناجائز طریق ہے۔ ایک وقت میں دو یا تین طلاقیں دینا سخت ممنوع ہے، لیکن صورتِ مسئول عنہا میں ایک ہی طلاق واقع ہوئی، جس میں رجوع کرنا زید کا جائز ہے۔ ہاں جب تین طلاقیں اس طرح دی جائیں کہ اولاً صرف ایک طلاق دے اور عدت کے اندر رجوع کر لیا یا عدت کے اندر رجوع نہیں کیا، لیکن بعد انقضائے عدت کے بتراضی طرفین پھر سے نکاح کر لیا۔ پھر کبھی کسی ضرورت سے دوسری طلاق دے دی اور اس سے بھی عدت کے اندر رجوع کر لیا یا بعد انقضائے عدت بتراضی طرفین پھر سے نکاح کر لیا۔ پھر کبھی ضرورت پیش آئی تو تیسری طلاق دے دی تو اب اس تیسری طلاق کے بعد وہ عورت اس طلاق دینے والے شوہر کے لیے بغیر باضابطہ حلالہ (حقیقی دوسرا نکاح) کے کسی طرح حلال نہیں ہو سکتی۔

قال الله تعالىٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ۲۲۹]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

وقال تعالىٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [بقرة، ع: ۲۹]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو]

وفي مسند الإمام أحمد (١/ ٢٦٥): "حدثنا عبدالله حدثني أبي حدثنا سعد بن إبراهيم حدثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثني داود بن الحصين عن عكرمة مولىٰ ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد، فحزن عليها حزنا شديدا قال: فسأله رسول اللهﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم، قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها" الحديث واللّٰه تعالىٰ أعلم

[مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ میں ہے، ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم سے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ عکرمہ مولی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ "تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟" رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا ایک ہی مجلس میں؟" انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کر لو۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کر لیا]

كتبه: محمد عبد الله (١٣/ صفر ١٣٢٨ھ)

سوال زید نے اپنی بیوی کو ایک جلسہ میں تین طلاقیں لکھ کر اس کے پاس بھیج دیا، جس کو ایک سال سے زائد ہوا۔ اس خصوص میں سوال یہ ہے کہ یہ طلاق تصور کیا جائے گا یا نہیں؟ اگر طلاق متصور ہوگا تو ایک یا تین اور ایک ہونے پر رجعت کی کیا صورت ہوگی؟ یہ بھی واضح ہو کہ اب تک عورت مطلقہ نے نکاح نہیں کیا ہے اور اب زید کے ساتھ رجعت کرنے کو راضی ہے۔

جواب گو اس طریقے سے طلاق دینا ناجائز ہے، مگر یہ طلاق تصور کیا جائے گا اور ایک طلاق متصور ہوگا اور اس تقدیر پر رجعت کی یہ صورت ہوگی کہ اگر زید کی بیوی مدخولہ ہو چکی ہو تو زید عدت کے اندر دو معتبر آدمیوں کے سامنے کہہ دے کہ میں نے جو اپنی فلاں بیوی کو طلاق دی تھی، اس کو واپس لے لیا ہے اور اگر عدت گزر چکی ہو یا زید کی بیوی مذکور مدخولہ نہ ہو چکی ہو تو ان دونوں صورتوں میں بتراضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے

وفي مسند الإمام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ: "حدثنا عبداللّٰه حدثني أبي حدثنا سعد بن إبراهيم حدثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثني داود بن الحصين عن عكرمة مولىٰ ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد، فحزن عليها حزنا شديدا قال: فسأله رسول اللّٰه ﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم، قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها"[1] الحديث واللّٰه تعالىٰ أعلم

[مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ میں ہے، ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ عکرمہ مولی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، وہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ ''تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟'' رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا ایک ہی مجلس میں؟'' انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کر لو۔'' راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کر لیا]

قال اللّٰه تعالىٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ٢٢٩]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

وقال تعالىٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [بقرة، ع: ٢٩]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو] کتبہ: محمد عبد اللّٰه (٢٢/ جمادى الاول ١٣٣٢هـ)

سوال زید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایک وقت میں دے دیں۔ اب دریافت کرنا ہے کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے آیا وہ رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟ جواب صرف قرآن و حدیث سے مدلل و مفصل ہو۔

جواب اس صورت میں زید اگر اس کے قبل کبھی اور دو طلاقیں نہ دے چکا ہو تو عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے، بشرطیکہ بیوی مذکورہ زید کی مدخولہ بعد نکاح کے ہو چکی ہو اور اگر عدت گزر چکی ہو تو بتراضی طرفین دونوں میں نکاح کی تجدید ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٥)

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرۃ، ع: ۳۰]
[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]
اور فرماتا ہے:
وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [بقرۃ، ع: ۲۹]
[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو]
مسند امام احمد میں ہے:
"حدثنا عبد اللّٰه حدثني أبي ثنا سعد بن إبراهيم ثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثني داود بن الحصين عن عكرمة مولى ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا. قال: فسأله رسول اللّٰهﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم. قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها"[1] الحديث،
[ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ عکرمہ مولی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ "تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟" رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا ایک ہی مجلس میں؟" انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کرلو۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کرلیا] واللّٰه تعالیٰ أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد اللّٰه (۱۴/ محرم ۱۳۳۵ھ)

سوال زید نے اپنی زوجہ مدخولہ کو ایک طلاق دی یکم شعبان ۱۳۳۱ھ کو اور دوسری طلاق دی پانچ ماہِ رمضان المبارک سنہ مذکورہ کو، پھر ماہِ شوال یعنی شروع ماہِ شوال سنہ مذکورہ میں رجوع ہوگیا، یعنی عدت کے اندر پھر بارہ ماہِ

[1] مسند أحمد (۱/ ۲۶۵)

ذیقعدۃ سنہ مذکورہ میں تنازع ہوا، ایک طلاق دے دی۔ عورت نے کہا: مجھ کو لوگ کہتے ہیں: طلاق تین لو اور کاغذ پر درج کرالو۔ زید نے تین طلاق دے دی۔ ۱۷/ ذی الحجہ سنہ مذکور کو ایک مرتبہ ایک وقت میں اور کاغذ میں کچھ لکھ دیا کہ تین طلاق۔ اب زید اس صورت میں رجوع کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب زید اس صورت میں عدت کے اندر رجوع کرسکتا ہے، اس لیے کہ اس صورت میں صرف دو ہی طلاقیں پڑیں۔ ایک وہ جو کیم شعبان کو دی اور دوسری وہ جو ۱۲/ ذی القعدہ کو دی۔ پس یہی دو طلاقیں پڑیں اور وہ طلاق جو ۵/ رمضان المبارک کو دی اور وہ تین طلاقیں جو ۱۷/ ذی الحجہ کو دیں، ان میں سے کوئی بھی نہیں پڑی، پس چونکہ اس صورت میں دو ہی طلاقیں پڑیں اور دو طلاق کے بعد عدت کے اندر رجوع ہوسکتا ہے، لہٰذا زید اس صورت میں عدت کے اندر رجوع کرسکتا ہے، ہاں اگر تین طلاقیں پڑ گئی ہوتیں تو رجوع نہیں ہوسکتا تھا۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرۃ: ۲۲۹]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾

[بقرۃ، ع: ۲۹] واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب.

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو] کتبہ (٦/ محرم ۱۳۳۲ھ)

خاوند نے طلاق دی، لیکن اس کی والدہ راضی نہیں تو وہ کیا کرے؟

سوال زید نے اپنی بی بی کو طلاق مطابق حکم قرآن و حدیث کے دیا اور عدت بھی پوری ہوچکی۔ اب اپنے یہاں سے رخصت کر دینا چاہتا ہے، مگر زید کی ماں کسی طرح اس بات پر راضی نہیں۔ یہ کہتی ہے کہ اگرچہ تم نے طلاق دیا، مگر ہم تمھاری بی بی کو ہمیشہ تمھارے مکان میں رکھیں گے اور زید کہتا ہے کہ ہم بدکار لوگ کو کبھی اپنے مکان میں نہیں رکھیں گے، علاوہ اس کے ہم طلاق دے چکے۔ اس واسطے زید کی ماں نے برابر فتنہ فساد کرنا اور اپنے بیٹے زید کو کھانا کپڑا سے انکار کرنا، گالی دینا، بد دعا کرنا جاری کر دیا ہے، اس حالت میں زید کیا کرے؟ از روئے قرآن و حدیث فتویٰ دیجیے۔

جواب اگر زید نے اپنی بی بی کو تین طلاقیں شرعی دی ہیں، تب تو اس سے بغیر حلالہ نکاح نہیں کرسکتا اور اگر ایک یا دو طلاقیں دی ہیں اور عورت بدکاری سے تائب ہے تو نکاح کرسکتا ہے۔ اگر زید اس صورت میں بعد نکاح کے اس عورت کے حقوق، جو اللہ نے زید پر فرض کیے ہیں، ادا کرنے پر قادر ہے تو اپنی ماں کی اطاعت کرے اور اس عورت سے نکاح کرلے، ورنہ نہ کرے۔

سورۂ بقرہ رکوع ۲۹ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرۃ: ۲۲۹]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

مشکوۃ (ص: ۴۲۰ چھاپہ دہلی) میں ہے:

عن أبي هريرة قال رجل: يا رسول الله! من أحق بحسن صحابتي؟ قال: «أمك» قال: ثم من؟ قال: «أمك» قال: ثم من؟ قال: «أمك» قال: ثم من؟ قال: «أبوك» [1] (متفق عليه)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کسی شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیری والدہ'' اس نے عرض کی: پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے عرض کی: پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیری ماں'' اس نے عرض کی: پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرا باپ'']

صفحہ (۴۱۳) میں ہے:

عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: «من أصبح مطيعا لله في والديه، أصبح له بابان مفتوحان من الجنة، وإن كان واحدا فواحدا، ومن أصبح عاصيا لله في والديه أصبح له بابان مفتوحان من النار، إن كان واحدا فواحدا» قال رجل: وإن ظلماه؟ قال: «وإن ظلماه، وإن ظلماه، وإن ظلماه» [2]

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے والدین (کے حق) کے متعلق اللہ کی اطاعت میں صبح کرتا ہے تو اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر ایک ہو تو (دروازہ بھی) ایک اور جو شخص اپنے والدین (کے حق) کے متعلق اللہ کی نافرمانی میں صبح کرتا ہے تو اس کے لیے جہنم کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر وہ ایک تو (جہنم کا دروازہ بھی) ایک۔'' ایک آدمی نے عرض کی: اگرچہ وہ اس پر ظلم کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ وہ اس پر ظلم کریں، اگرچہ وہ اس پر ظلم کریں، اگرچہ وہ اس پر ظلم کریں]

کیا محض تہمت سے نکاح فسخ ہوتا ہے یا نہیں؟

سوال کسی کی عورت اگر متہم ہو جائے اور وہ عورت طالبِ طلاق ہو تو مرد کو اپنی زوجیت سے خارج کر دینا ضروری ہے یا نہیں؟ محض تہمت سے نکاح فسخ ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں کہ عورت متہم ہے اور اس شخص سے طلاق بھی مانگتی ہے، وہ شخص اس عورت کو اپنی زوجیت سے خارج کر دے، یعنی یا اس کو طلاق دے دے یا اس سے خلع کر لے اور اگر وہ عورت اس سے خود طالبِ طلاق وفراق

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٨)

[2] شعب الإيمان (٥/ ٢٠٦) مشكاة المصابيح (٣/ ٧١) یہ حدیث سخت ضعیف ہے، کیوں کہ اس کی سند میں "عبداللہ بن یحییٰ بن موسی السلامی" متہم ہے۔ دیکھیں: لسان المیزان (۳/ ۳۷۶)

نہ ہوتی تو طلاق دینا یا خلع کرنا کچھ ضروری نہیں ہوتا، کیونکہ عورت کے فعل ناجائز سے خود عورت پر اس کا گناہ عائد ہوا، مرد پر اس کا مواخذہ نہیں ہے اور نہ اس سے نکاح فسخ ہوا۔

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ [البقرة: ٢٢٩]

[پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں، جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے]

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: جاءت امرأة ثابت بن قيس بن شماس إلى رسول الله ﷺ فقالت: يا رسول الله! إني ما أعتب عليه في خلق ولا دين، ولكني أكره الكفر في الإسلام، فقال رسول الله ﷺ: «أتردين عليه حديقته؟» قالت: نعم. فقال: رسول الله ﷺ: «اقبل الحديقة، وطلقها تطليقة»[1] (رواه البخاري)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اس (ثابت بن قیس اپنے شوہر) پر دین یا اخلاق کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں لگاتی، لیکن میں مسلمان ہو کر کفر کے کام کرنا ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تو اس کا دیا ہوا باغ اسے واپس کر دے گی؟'' اس نے کہا: جی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے (ثابت بن قیس کو) فرمایا: باغ واپس لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو]

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن رجلا جاء إلى النبي ﷺ فقال: إن امرأتي لا ترد يد لامس؟ قال: «غربها» قال: أخاف أن تتبعها نفسي. قال: «فاستمتع بها»[2]

(رواه أبو داود و البزار، ورجاله ثقات، وأخرجه النسائي من وجه آخر عن ابن عباس بلفظ: قال: «طلقها» قال: لا أصبر عنها. قال: «فأمسكها» بلوغ المرام، ص: ٧٣)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میرے نکاح میں ایک ایسی عورت ہے، جو کسی چھونے والے کا ہاتھ نہیں روکتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے طلاق دے دے۔'' وہ کہنے لگا: مجھے خطرہ ہے کہ میرا دل اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اس سے فائدہ اٹھاتا رہ]

كتبه: محمد عبدالله. أبو محمد إبراهيم. الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب. تاريخ (٥/ شعبان ١٣٠٨هـ) مطابق (١٦/ مارچ ١٨٩١ء)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٦٤)

کیا خاوند شروطِ نکاح کی مخالفت کرے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے؟

سوال زید نے اپنی لڑکی ہندہ کا نکاح خانہ دامادی کی شرط پر بکر کے ساتھ کر دیا۔ کتنے روز تک بکر زید کے گھر میں رہا۔ زید کے ساتھ بکر کی کسی بارے میں نا اتفاقی ہوئی، اس لیے بکر نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ زید نے معلوم کر کے اس کو پکڑ کر رکھا۔ رات کو بکر پر بڑا ظلم وستم ہوا، بعد صبح زید نے آس پاس کے چند اشخاص کو بلایا، انھوں نے پوچھا: اب تمھاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا کہ مجھ کو کچھ اختیار نہیں۔ میرا جو کچھ چیز اسباب زید کے پاس موجود ہے، اگر وہ سب کچھ مجھ کو دے دے تو میں اس کی لڑکی کو طلاق دیتا ہوں، ورنہ نہیں۔ آخرش انھوں نے بہت کچھ سمجھایا، تب کہا: خیر آپ لوگ جو کہیں گے، عمل کروں گا، تب اسٹامپ کاغذ منگوایا گیا، اس میں بکر کی طرف سے یہ شرط لکھی گئی کہ سات برس تک میں زید کے گھر میں رہوں گا۔ اگر اس مدت کے اندر کہیں دوسری جگہ چلا جاؤں تو میری بی بی ہندہ پر طلاق ہوگی۔ بعدہ بکر کا دستخط کروا لیا، کئی ایک ماہ بکر وہاں رہا، پھر کسی نا اتفاقی کی جہت سے وہاں سے بھاگا۔ پس ایسی صورت میں شرعاً ہندہ پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں و نیز ہندہ کا نکاح غیر شخص سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟

المرسل: محمد حسین ساکن شعیب پور، ضلع دینا جپور، ڈاک خانہ بیرام پور۔

جواب ایسی صورت میں ہندہ پر طلاق واقع ہوگئی، نیز ہندہ کا نکاح غیر شخص سے ہوسکتا ہے، لیکن اگر ہندہ بکر کی مدخولہ ہوچکی ہو تو اس صورت میں اس کا نکاح غیر شخص سے بعد انقضاے عدت ہی ہوسکتا ہے۔ صحیح بخاری (۲/ ۷۳ مطبوع مصر) میں ہے:

”عن عقبة بن عامر قال: قال رسول الله ﷺ: «أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج»[1] اهـ والله تعالیٰ أعلم

[عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جن شروط کے ساتھ تم نے شرم گاہ کو حلال بنایا ہے، وہ (شروط) زیادہ حق رکھتی ہیں کہ انھیں پورا کیا جائے] کتبہ: محمد عبد الله (۲٦/ شوال ۱۳۲٦ھ)

نابالغ کی طلاق اور نکاح کے وقوع کا مسئلہ:

سوال ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق ایک جلسہ میں دیا، جس کی عمر بارہ برس کی ہے اور بیوی کی عمر نو برس کی ہے، یعنی دونوں نابالغ ہیں اور دو گواہ کے سامنے طلاق دیا ہے۔ طلاق ہوا یا نہیں؟ اگر ہوا ہو تو مہر پوری ادا کی جائے یا نصف ادا کی جائے اور عدت و کپڑا کس قدر دیا جائے؟ اس کا فتویٰ چاہیے اور دوسرے اس کا بھی مسئلہ چاہیے کہ لڑکی کا والد جو شادی کے وقت جہیز دیا تھا، پھر مانگتا ہے اور لڑکے کا والد اپنا زیور جو شادی کے وقت دیا ہے، پھر مانگتا ہے۔ دونوں فریقین میں فساد ہے اور اگر طلاق نہ ہوا ہو تو اور ہوا ہو تو بھی فرمایئے گا اور طلاق اس باعث سے ہوا ہے کہ سسر نے اپنے داماد کو گالیاں دی ہیں تو اس نے طلاق دیا ہے۔ اس پتے پر فتویٰ روانہ فرمایئے گا۔ ضلع پرتاب گڑھ،

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۷۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٤۱۸)

يحبس، ويضيق عليه حتى يطلق. قال ابن الأعرابي: غلق زيد عمرا على شيئ يفعله، إذا أكرهه عليه" (لسان العرب: ۱۲/ ۱۶۵)

[حدیث میں ہے کہ اغلاق میں طلاق نہیں اور نہ غلام کو آزاد کرنا ہے، یعنی اِکراہ میں۔ اغلاق کا معنی اِکراہ ہے، کیوں کہ مغلق کو اس کے معاملے میں مجبور کیا جاتا ہے اور اس کے تصرف میں اس پر تنگی کی جاتی ہے، گویا اس پر دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، اسے قید کر دیا جاتا ہے اور اس کی آزادی تک اس پر تنگی کی جاتی ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے "غلق زيد عمرا على شيئ يفعله" اس وقت بولا جاتا ہے جب زید نے اسے مجبور کر دیا ہو]

"اکراہ" کے معنی ہیں: بزور وستم کسی کو کسی کام پر رکھنا۔ قاموس میں ہے: "جبره على الأمر أكرهه كأجبره"[1] انتهى ["جبره على الأمر" کا مطلب ہے، "أكرهه" (اس نے اسے مجبور کیا) یہ "أجبره" کی طرح ہے] "غیاث اللغات" میں ہے: "اکراہ بزور وستم کسے را بر کارے داشتن و اجبار کسے را بزور بر کارے داشتن" ["اِکراہ" کا مطلب ہے کہ زور وستم سے کسی کو کسی کام پر لگانا اور "اِجبار" کا مطلب ہے کہ کسی کو زبردستی کے ساتھ کسی کام پر رکھنا]

عبارتِ سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت بکر سے طلاق دلوائی گئی تھی، اس وقت بکر کی حالت پر اِکراہ کی تعریف صادق آتی تھی، پس اس بنا پر ہندہ پر وہ طلاق تو واقع نہیں ہوئی، لیکن جس وقت بکر سے شرطیہ طلاق نامہ لکھوایا گیا، اس وقت اور جس وقت بکر نے وہاں سے گریز کیا، اس وقت بکر کی حالت پر اِکراہ کی تعریف صادق آتی تھی یا نہیں؟ عبارتِ سوال سے کوئی بات صاف معلوم نہیں ہوتی اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بکر نے جس مجبوری سے گریز کیا تھا، وہ مجبوری کیا تھی؟ لہٰذا جب تک کوئی صاف بات معلوم نہ ہو، تب تک نہ وقوعِ طلاق کا حکم لگایا جا سکتا ہے اور نہ عدمِ وقوعِ طلاق کا۔ واللہ تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (۱۹/ محرم ۱۳۳۷ھ)

سوال اگر کوئی شخص جبراً بخوفِ جان یا بخوفِ زد و کوب طلاق دے دے تو وہ طلاق ازروئے شرع شریف کے جائز ہے یا نہیں؟

جواب جو طلاق اِکراہاً، یعنی جبراً دی جائے وہ شرعاً نامعتبر ہے، یعنی نہیں پڑتی۔ سنن ابو داود (ص: ۱۹۹ چھاپہ دہلی) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لا طلاق ولا عتاق في إغلاق»[2] یعنی جو طلاق حالتِ اغلاق میں دی جائے، وہ نامعتبر ہے۔

اسی طرح عتاق میں بھی یعنی غلام لونڈیاں کا آزاد کرنا حالتِ اِغلاق میں نامعتبر ہے۔ اغلاق کی تفسیر میں علماء کی عبارات مختلف ہیں۔ خود ابو داود رحمہ اللہ ہیں: "أظنه الغضب" یعنی میں گمان کرتا ہوں کہ اِغلاق کے معنی غصہ کے

[1] القاموس المحيط (ص: ٣٦٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٩٣)

ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی یہی معنی منقول ہیں، چنانچہ امام زیلعی رحمہ اللہ "نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية" (٢/ ٣٠) میں فرماتے ہیں: "قال في التنقيح: وقد فسره أحمد أيضاً بالغضب" یعنی تنقیح میں کہا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اِغلاق کے معنی غصہ کے کیے ہیں اور صاحبِ قاموس رحمہ اللہ اِغلاق کے معنی اکراہ کے لکھتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ "الإغلاق الإكراه"[1] یعنی اِغلاق کے معنی اِکراہ کے ہیں۔ یہ معنی امام ابن قتیبہ سے بھی منقول ہے، چنانچہ امام زیلعی رحمہ اللہ "نصب الراية" میں فرماتے ہیں: "قال ابن الجوزي: قال ابن قتيبة: الإغلاق الإكراه"[2] یعنی ابن جوزی رحمہ اللہ نے کہا کہ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اغلاق کے معنی اکراہ کے ہیں۔

صاحبِ مجمع البحار بھی اِغلاق کے معنی اِکراہ کے لکھتے ہیں، چنانچہ اس حدیث کے تحت میں ہیں:

"لا طلاق ولا عتاق في إغلاق أي في إكراه، لأن المكره مغلق عليه في أمره، ومضيق عليه في تصرفه، كما يغلق الباب على أحد"[3]

یعنی اغلاق کے معنی اکراہ کے ہیں، اس لیے کہ مکرہ پر اس کا معاملہ بند کر دیا جاتا ہے اور اس کے تصرف میں تنگی ڈال دی جاتی ہے، جس طرح کسی پر دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

"نيل الأوطار" (٦/ ١٦٠) میں ہے:

"فسره علماء الغريب بالإكراه، روىٰ ذلك في التلخيص عن ابن قتيبة والخطابي وابن رشيد وغيرهم"

یعنی علمائے غریب نے اِغلاق کی تفسیر اکراہ ہی سے کی ہے، چنانچہ تلخیص میں اس کو ابن قتیبہ اور خطابی اور ابن رشید وغیرہم سے روایت کیا ہے۔

امام زیلعی رحمہ اللہ کے استاد فرماتے ہیں کہ اغلاق اکراہ اور غصہ اور جنون اور بہت سی چیزوں کو شامل ہے، چنانچہ امام زیلعی "نصب الراية" میں فرماتے ہیں:

"قال شيخنا: والصواب أنه يعم الإكراه والغضب و الجنون، وكل أمر انغلق على صاحبه علمه وقصده، مأخوذ من غلق الباب"[4]

یعنی ہمارے شیخ نے فرمایا کہ صواب یعنی ٹھیک بات یہ ہے کہ اغلاق اکراہ کو اور غصہ کو اور جنون کو اور ہر ایسے امر کو شامل ہے، جس کا علم و قصد اس امر والے پر بند ہو جائے اور یہ لفظ غلق الباب سے، جس کے معنی دروازہ بند کر دینے کے ہیں، ماخوذ ہے۔

---

[1] القاموس المحيط (ص: ٩١٥)

[2] نصب الراية (٢/ ٣٠)

[3] مجمع بحار الأنوار (٢/ ٣٣)

[4] نصب الراية (٢/ ٣٠)

یہی تحقیق حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی بھی ہے کہ اغلاق کا لفظ ان سب مذکورہ بالا معنوں کو شامل ہے۔ میرے نزدیک بھی یہی بات صحیح ہے کہ لفظِ اِغلاق ایک عام لفظ ہے، جو ان سب معانی کو شامل ہے۔ پس جب آدمی کسی کام کے کرنے یا کسی بات کے بولنے پر ایسا مجبور کیا جائے کہ اگر اس کام کو نہ کرے یا اس بات کو نہ بولے تو اس کی جان جانے یا ضربِ شدید پڑنے کا خوف ہو تو ایسی حالت اغلاق کی حد میں داخل ہے۔ اگر ایسی حالت میں طلاق دے تو وہ طلاق شرعاً نامعتبر ہے۔ نیل الاوطار (ص: ۱۶۱) میں ہے:

"احتج عطاء بقوله تعالیٰ: ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ وقال الشرك أعظم من الطلاق. أخرجه سعيد بن منصور عنه بإسناد صحيح"

یعنی عطا نے اس مسئلہ کو (کہ اکراہ کی حالت کی طلاق نہیں پڑتی ہے) آیتِ کریمہ ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ سے ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ شرک طلاق سے بڑھ کر ہے اور جب اکراہ کی حالت میں کلمہ شرک منہ سے نکالنا شرعاً نامعتبر ہے، یعنی اس سے وہ شخص مشرک نہیں ہوجاتا، جیسا کہ آیتِ کریمہ سے ثابت ہے تو اکراہ کی حالت کا کلمہ طلاق منہ سے نکالنا بطریقِ اولیٰ نامعتبر ہوگا، یعنی اس سے بطریقِ اولیٰ طلاق نہیں پڑے گی۔ عطاء کے اس قول کو سعید بن منصور نے اسنادِ صحیح سے روایت کیا ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

سوال زوجہ نے اپنے شوہر کو یہ دھوکا دیا کہ میرا ناجائز تعلق ایک شخص سے ہوگیا ہے۔ اگر تم مجھے طلاق دے دو تو میں اپنا زرِمہر تعدادی پنج صد صمار کا معاف کر دیتی ہوں، اس سے پیشتر طرفین کے، یعنی زوجہ وشوہر میں دیوانی وفوجداری مقدمات بھی ہوچکے تھے۔ اتفاق سے زوجہ کل مقدمات عدالت سے ہار بھی چکی ہے اور زوجہ کے دو برادر اور ایک ہمشیرہ نہایت بدوضع وکوکین باز بھی ہیں۔ عورت کو ہمیشہ بدوضع خیالات کی ترغیب بھی دیتے رہتے ہیں اور اس کی کمائی سے اپنے نشہ پانی کا کام چلاتے ہیں۔ دوم یہ کہ عورت کے شوہر کو اس کے برادران نے جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی کہ تم کو طلاق دینی ہوگی، ورنہ جان نہ ہوگی۔

ایسی حالت میں جان کے خوف سے اور عورت کی قسموں پر اور دیوثی کا خیال کر کے شوہر بیچارہ نے تین مرتبہ کہہ دیا کہ طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی، نہ تو عورت مرد کے سامنے ہے اور نہ اس میں کوئی خطاب کیا گیا۔ صرف ظلم کے خوف سے یہ لفظ کہہ دیے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں قرآن و حدیث کے رو سے طلاق واقعی طلاق ہوگئی یا نہیں؟ اگر ہوگئی تو رجعی ہوئی یا بائن ہوئی یا ثلاثہ ہوئی؟ عورت نے شوہر کو زرِمہر معاف کر دیا ہے اور ایک اقرار نامہ اسٹامی کاغذ پر بطمانیت شوہر کے لکھ دیا ہے کہ زرِمہر معاف کرتی ہوں، طلاق لیتی ہوں اور بنائے مخاصمت اپنی طرف سے یہ قائم کی ہے کہ زوجہ اور شوہر کا آپس میں جی نہیں ملتا ہے، زوجہ شوہر کے گھر میں سات سال اور چھ ماہ رہی ہے، تین بچے شوہر کے صلب سے اور عورت کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ایک حمل اسقاط ہوا اور دو بچہ قائم ہیں۔ ایک لڑکا پونے چار سال کا اور ایک لڑکی سات سال کی موجود ہے، جن کی پرورش مرد کرتا ہے، جو باپ ہے۔

جواب ایسی حالت میں کہ شوہر نے جو الفاظ طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی، بخوف جان کہے ہیں، اس میں نہ تو تصریح اس بات کی ہے کہ کس نے طلاق دی اور نہ اس بات کی کہ کس کو طلاق دی؟ لہٰذا یہ طلاق واقع نہیں ہوئی، اس لیے کہ اگر ان الفاظ سے شوہر کی یہ مراد ہے کہ دنیا میں کس نے کس کو طلاق دی تو ظاہر ہے کہ اس سے طلاق واقع نہیں ہوئی اور اگر یہ مراد ہے کہ میں نے اپنی زوجہ کو طلاق دی تو اس سے طلاق اس وجہ سے واقع نہیں ہوئی کہ اس نے یہ الفاظ بخوفِ جان تلفظ کیے ہیں اور ایسی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔

''نصب الراية لأحاديث الهداية'' (۲/ ۳۰) میں ہے:

''أخرج أبو داود وابن ماجه عن صفية بنت شيبة قالت: سمعت رسول اللهﷺ يقول: «لا طلاق ولا عتاق في إغلاق » قال أبو داود: أظنه الغضب، يعني الإغلاق. قال ابن الجوزي: قال ابن قتيبة: الإغلاق الإكراه، و رواه الحاكم في المستدرك، وقال: على شرط مسلم. قال في التنقيح: وقد فسره أحمد أيضاً بالغضب. قال شيخنا: والصواب أنه يعم الإكراه والغضب والجنون، وكل أمر انغلق على صاحبه علمه وقصده، مأخوذ من غلق الباب، واستدل عليه بحديث: «رفع عن أمتي الخطأ والنسيان وما استكرهوا عليه » وهذا الحديث تقدم في الصلاة بجميع طرقه، وأصحها حديث ابن عباس، رواه ابن حبان وابن ماجه والحاكم في المستدرك وقال: على شرط الشيخين'' اهـ

[ابو داود اور ابن ماجہ نے صفیہ بنت شیبہ سے روایت کیا ہے، وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتی ہیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''زبردستی میں نہ طلاق ہوتی ہے اور نہ غلام آزاد ہوتا ہے۔'' امام ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں ''اِغلاق'' غضب اور غصے کے معنی میں ہے۔ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کہا: ابن قتیبہ نے کہا کہ ''اِغلاق'' کا معنی جبر و اکراہ ہے۔ اس کو امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں روایت کیا اور فرمایا کہ یہ روایت مسلم کی شرط پر ہے۔ تنقیح میں ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اس کا مطلب غضب و غصہ بیان کیا ہے۔ ہمارے شیخ نے کہا ہے: درست یہ ہے کہ یہ لفظ جبر و اِکراہ، غضب و غصہ، جنون اور جو معاملہ جس کا علم و قصد اس کے صاحب پر منغلق ہو، تمام معنوں میں عام ہے۔ یہ لفظ ''غلق الباب'' (دورازہ بند کر دینا) سے ماخوذ ہے، اس پر درجِ ذیل حدیث سے استدلال کیا گیا ہے: ''اس (اللہ تعالیٰ) نے میری امت سے غلطی، بھول اور وہ گناہ معاف کر دیے ہیں، جن پر انھیں زبردستی مجبور کیا گیا ہو۔'' یہ حدیث نماز کے باب میں اپنی تمام سندوں سے گزر چکی ہے۔ ان میں سے سب سے صحیح حدیث عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، جسے ابن حبان، ابن ماجہ اور حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر ہے]

صحیح بخاری (۳/ ۱۶۹ مصری) میں ہے: ''وقال ابن عباس: طلاق السكران والمستكره ليس

بجائز" اھ [عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس شخص کی دی ہوئی طلاق جائز نہیں ہے جو نشے میں ہو یا اسے مجبور کیا گیا ہو] اگر وجوہِ مذکورہ بالا سے قطع نظر کر کے کہا جائے کہ ایسی حالت میں طلاق واقع ہو ہی گئی تو صرف ایک طلاق بائن واقع ہوئی، جس میں عدت کے اندر یا بعد عدت بتراضی طرفین نکاح جدید جائز ہے۔ طلاق بائن اس لیے کہ صورت مذکورہ سوال خلع کی صورت ہے اور خلع کی صورت میں طلاق بائن واقع ہوتی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرۃ: ۲۲۹]

[یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے]

وقال تعالیٰ: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [بقرۃ، ع: ۲۹]

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو]

وفي مسند الإمام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ: حدثنا عبد الله حدثني أبي حدثنا سعد بن إبراهيم حدثنا أبي عن محمد بن إسحاق حدثنى داود بن الحصين عن عكرمة مولىٰ ابن عباس عن ابن عباس قال: طلق ركانة بن عبد يزيد أخو بني مطلب امرأته ثلاثا في مجلس واحد، فحزن عليها حزنا شديدا قال: فسأله رسول الله ﷺ: «كيف طلقتها؟» قال: طلقتها ثلاثا. قال: فقال: «في مجلس واحد؟» قال: نعم، قال: «فإنما تلك واحدة، فارجعها إن شئت» قال: فرجعها.[1] الحديث، والله تعالىٰ أعلم

[مسند امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ میں ہے: ہمیں عبداللہ نے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سعد بن ابراہیم نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انھوں نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا، انھوں نے کہا کہ مجھے داود بن حصین نے بیان کیا، وہ عکرمہ مولیٰ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ بنو مطلب کے ایک فرد رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر وہ اس پر سخت غمگین ہوئے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ "تم نے اس (اپنی بیوی) کو کیسے طلاق دی؟" رکانہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا ایک ہی مجلس میں؟" انھوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ صرف ایک طلاق ہی ہے، اگر تم چاہو تو اس سے رجوع کرلو۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رجوع کرلیا]

كتبہ: محمد عبد الله (۱۱/ رجب ۱۳۳۲ھ)

---

[1] مسند أحمد (۱/ ۲۶۵)

نشے کی حالت میں طلاق کا حکم:

سوال زید نے حالتِ نشہ میں اپنے باپ سے یہ کہا کہ آپ گواہ رہیے کہ ہم نے اپنی بی بی کو طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا۔ چار یا پانچ دفعہ جلسہ واحد میں اور بی بی اس کی اس وقت حاضر نہیں ہے۔ طلاق مسنون واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب جو شخص اپنی عورت کو حالتِ نشہ یا سخت غصہ میں طلاق دے، وہ طلاق نہیں واقع ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء: ٤٣) [نماز کے قریب نہ جاؤ، اس حال میں کہ تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم جانو جو کچھ کہتے ہو]

اس سے معلوم ہوا کہ حالتِ نشہ کا قول معتبر نہیں، کیونکہ اس کو اپنے قول کا علم نہیں۔ بخاری شریف میں مروی ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے حالتِ نشہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اہانت کے الفاظ استعمال کیے، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قول کا اعتبار نہ کیا، حالانکہ نبی کی اہانت کفر ہے۔[1] ایک شخص نے زنا کا اقرار کیا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا منہ تو سونگھو، کہیں نشہ میں تو نہیں اقرار کرتا ہے؟[2] معلوم ہوا کہ اگر نشہ میں ہوتا تو یہ اقرار معتبر نہ ہوتا اور مثل اس کے بہت سے دلائل ہیں، جن سے حالتِ نشہ میں طلاق کا غیر معتبر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ غصہ کی طلاق کا غیر معتبر ہونا بھی حدیث سے ثابت ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے: «قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: لا طلاق ولا عتاق في إغلاق»[3] "غصہ میں طلاق اور عتاق کا اعتبار نہیں ہے۔" درمختار میں ہے: "لا يقع طلاق المولىٰ على امرأة عبده (إلى أن قال) والمدهوش"[4] [آقا کی اپنے غلام کی بیوی کو طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی (یہاں تک کہ انھوں نے کہا) اور مدہوش (کی دی ہوئی طلاق بھی واقع نہیں ہوتی)] مدہوش کے معنی میں مغلوب الغیظ بھی داخل ہے۔ پس مغلوب الغیظ کا طلاق نہیں۔

الجواب صحیح. كتبه: محمد عبد الله

غصے کی حالت میں طلاق کا حکم:

سوال مجرد گالی دینے ہندہ کے لفظ طلاق طلاق طلاق کا بلا اشارہ کے بمقابلہ ایک کر کے بحالت غصہ شوہر ہندہ کے زید کے منہ سے نکل گیا۔ آیا اس امر میں اوپر ہندہ کے طلاق بائن عائد ہوگا یا نہیں؟ اس کا جواب کما حقہ بدلائلِ قرآن و حدیث کے مرحمت فرمایا جائے۔

جواب اس صورت میں ہندہ پر طلاق بائن تو عائد نہیں ہوئی، لیکن طلاق رجعی عائد ہوئی یا نہیں؟ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے، وہ یہ کہ اگر زید کے منہ سے یہ الفاظ بحالتِ غصہ بلا قصد نکل گئے تھے تو اس صورت میں طلاق رجعی بھی نہیں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٧٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩٥)

[3] مسند أحمد (٦/ ٢٧٦)

[4] الدر المختار مع رد المحتار (٣/ ٢٤٣)

ہوئی۔ اگر بالقصد نکلے تھے تو اگر اس وقت زید کی نیت ہندہ کے طلاق دینے کی نہ تھی تو بھی رجعی نہیں ہوئی اور اگر اس وقت ہندہ کے طلاق دینے کی نیت تھی تو طلاق رجعی عائد ہوئی، جس میں زید کو اختیار ہے کہ عدت کے اندر اس طلاق کو واپس کر لے اور اگر عدت گزر چکی ہو اور تجدیدِ نکاح پر دونوں راضی ہوں تو تجدیدِ نکاح کر لے۔

"عن صفية بنت شيبة قالت: سمعت عائشة رضي الله عنها تقول: سمعت رسول الله ﷺ يقول: «لا طلاق ولا عتاق في غلاق» قال أبو داود: الغلاق أظنه الغضب"[1]

(سنن أبي داود، مطبوعه مصر: ١/ ٢١٧)

[صفیہ بنت شیبہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: غلاق میں نہ طلاق ہے اور نہ غلام کو آزاد کرنا۔" امام ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرا خیال ہے کہ غلاق سے مراد غضب و غصہ ہے]

"وقد فسر الإغلاق بالغضب الإمام أحمد أيضاً، وفسره أبو عبيد وغيره بالإكراه، وفسره آخرون بالجنون"[2] كذا قال الحافظ ابن القيم في زاد المعاد (ص: ٢٠٣)

[امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اِغلاق کا معنی غضب و غصہ بیان کیا ہے۔ ابو عبید وغیرہ نے اس کا معنی جبر و اِکراہ کیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کا معنی جنون کیا ہے]

ثم قال: "قال شيخنا: وحقيقة الإغلاق أن يغلق على الرجل قلبه، فلا يقصد الكلام أو لا يعلم به، كأنه انغلق عليه قصده وإرادته"

[ہمارے شیخ نے کہا: اِغلاق کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے لیے اس کا دل بند کر دیا جائے، پس وہ کلام کا قصد کرے نہ اس کا مفہوم جانے، گویا اس پر اس کا قصد و ارادہ بند ہو گیا]

"قلت: قال أبو العباس المبرد: الغلق ضيق الصدر وقلة الصبر، بحيث لا يجد له مخلصا. قال شيخنا: ويدخل في ذلك طلاق المكره والمجنون، ومن زال عقله بسكر أو غضب، وكل من لا قصد له ولا معرفة له بما قال، والغضب على ثلاثة أقسام: أحدها ما يزيل العقل فلا يشعر صاحبه بما قال، وهذا لا يقع طلاقه بلا نزاع، والثاني ما يكون في مباديه بحيث لا يمنع صاحبه من تصور ما يقول، وقصده، فهذا يقع طلاقه. الثالث أن يستحكم ويشتد به فلا يزيل عقله بالكلية، ولكن يحول بينه وبين نيته بحيث يندم على ما فرط منه إذا زال، فهذا محل نظر، و عدم الوقوع في هذه الحالة قوي متجه" والله أعلم بالصواب (زاد المعاد، مطبوعه نظامي: ٢/ ٢٠٤)

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٩٣)

[2] زاد المعاد (٥/ ١٩٥)

[میں کہتا ہوں کہ ابو العباس المبرد نے کہا: غلق کا معنی ہے سینے کا تنگ ہونا اور صبر کا کم ہونا، اس طور پر کہ اس سے نجات کا کوئی وسیلہ نہ ہو۔ ہمارے شیخ نے کہا: اس کے مفہوم میں مجبور و مجنون کی طلاق بھی داخل ہے اور اس کی بھی جس کی عقل نشے اور غصے سے زائل ہو چکی ہو، نیز اس کی جس کا کوئی قصد و ارادہ ہو اور نہ اسے یہ سمجھ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ غضب و غصے کی تین قسمیں ہیں: ایک قسم تو یہ ہے جو عقل کو اس طرح زائل کرتی ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کیا کہا ہے؟ اس صورت میں تو بلا نزاع طلاق واقع نہیں ہوتی۔ دوسری قسم وہ ہے کہ غصہ اس شخص کو اپنے قول و قصد کے تصور اور سمجھ سے نہ روکے تو اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ تیسری قسم یہ ہے کہ اس کا غصہ مستحکم اور شدید تو ہو مگر اس سے اس کی عقل کلیتاً زائل نہ ہو، لیکن وہ اس کے اور اس کی نیت کے درمیان اس طرح حائل ہو جائے کہ اسے غصہ زائل ہونے کے بعد اپنی اس زیادتی پر ندامت ہو تو یہ محلِ نظر ہے اور اس حالت میں طلاق کا عدمِ وقوع زیادہ قوی اور مناسب ہے]

كتبه: محمد عبد الله. صح الجواب، والله أعلم بالصواب. أبو الفياض محمد عبد القادر أعظم گڑھی مئوی. أبو العلىٰ محمد عبد الرحمن، عفي عنه.

سوال ایک شخص نے اپنی زوجہ کو ایک جلسے میں غصے کی حالت میں یہ کہا کہ تم ہماری ماں ہو اور ہم نے تم کو طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا، لیکن یہ نہیں کہا کہ تین طلاق دیا اور اس کے دل میں بھی نہ تھا کہ طلاق بائن دیتے ہیں۔ صرف غصے کی حالت میں زبان سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد کے جب اس کے شوہر کا غصہ فرو ہو گیا تو اپنی زوجہ سے بات کرنا چاہا، تب اس کی زوجہ نے یہ کہا کہ تم نے مجھ کو طلاق دیا ہے، اب میں تمھاری بی بی نہیں ہوں۔ اس کے شوہر نے کہا کہ میں نے غصے کی حالت میں تم کو طلاق دیا، مگر فی الواقع میں نے طلاق نہیں دیا ہے۔ شوہر اس کا ہمیشہ جاتا ہے، مگر عورت قبول نہیں کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بغیر فتویٰ کے میں تم سے مل نہیں سکتی۔ اس صورت میں اس کی زوجہ پر طلاق بائن واقع ہوگا یا نہیں؟ اگر طلاق بائن واقع نہیں ہوا اور درمیان عدت کے طلاق دینے والا نے اس عورت کو زبان سے کہہ دے کہ میں نے تم کو بی بی بنا لیا تو ایسی حالت میں پھر دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہے یا نہیں اور اب کونسی صورت ہے کہ زن و شو میں نکاح قائم رہے؟ بینوا تؤجروا!

جواب پہلے یہ جاننا چاہیے کہ غصے کے تین درجے ہیں:

① اعلیٰ: جس میں عقل بالکل زائل ہو جاتی ہے اور اس وقت جو بات آدمی کے منہ سے نکلتی ہے نہ اس کی اس کو خبر ہوتی کہ کیا کیا بول گیا اور نہ قصد و ارادہ سے بولتا ہے۔

② اوسط: جس میں عقل تو بالکل زائل نہیں ہو جاتی، لیکن قصد و ارادہ نہیں رہتا، اس وقت جو بات اس کے منہ سے نکلتی ہے، بلا قصد و ارادہ نکلتی ہے، لیکن اس قدر اس کو خبر رہتی ہے کیا کہ بول گیا۔

③ ادنی: جس میں نہ عقل زائل ہوتی ہے نہ قصد و ارادہ اور اس وقت جو بات اس کے منہ سے نکلتی ہے، بقصد و ارادہ

نکلتی ہے اور یہ جانتا بھی ہوتا ہے کہ کیا بول رہا ہوں۔

اب جاننا چاہیے کہ اعلیٰ اور اوسط درجے کے غصے میں طلاق نہیں پڑتی اور ادنیٰ درجے کے غصے میں پڑ جاتی ہے۔ تو شخص مذکور جس کی نسبت سوال ہے، اپنے غصے کی حالت کو خیال کرے کہ جس وقت اس نے اپنی زوجہ کو طلاق دیا تھا، اس وقت اس کا غصہ کس درجے کا تھا؟ اگر اعلیٰ یا اوسط درجہ کا تھا تو طلاق نہیں پڑی اور اگر ادنیٰ درجہ کا تھا تو پڑ گئی، لیکن اگر عورت مدخولہ ہے تو بائن نہیں، صرف رجعی طلاق پڑی، جس میں عدت کے اندر رجعت کر سکتا ہے، یعنی اگر اس قدر دو معتبر آدمیوں کے روبرو کہہ دے کہ میں نے اپنی زوجہ کو جو طلاق دیا تھا، اسے میں نے واپس لے لیا تو اس کی زوجہ بدستور زوجہ باقی رہے گی اور اگر عدت گزر چکی ہو تو بتراضی طرفین بلا حلالہ پھر نکاح ہوسکتا ہے۔ اگر عورت غیر مدخولہ ہے تو ایک طلاق بائن پڑ گئی، لیکن عدت کے اندر خواہ عدت کے بعد، بتراضی طرفین بلاحلالہ پھر نکاح جائز ہے۔ زاد المعاد (۲/۲۰۴) میں ہے:

"الغضب علیٰ ثلاثة أقسام: أحدها: ما يزيل العقل فلا يشعر صاحبه بما قال، وهذا لا يقع طلاقه بلا نزاع، و الثاني: ما يكون في مباديه بحيث لا يمنع صاحبه من تصور ما يقول وقصده، فهذا يقع طلاقه. الثالث: أن يستحكم ويشتد به فلا يزيل عقله الكلية، ولكن يحول بينه وبين نيته بحيث يندم على ما فرط منه إذا زال، فهذا محل نظر و عدم الوقوع في هذه الحالة قوي متجه" اھ

[غصے کی تین قسمیں ہیں: ① ایک قسم وہ ہے جس میں عقل بالکل زائل ہوجاتی ہے اور اس وقت جو بات غضبناک آدمی کے منہ سے نکلتی ہے، اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا بول رہا ہے، اس میں تو بلا نزاع طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ② دوسری قسم یہ ہے کہ اس قسم کے غصے کے دوران میں اس کو یہ خبر رہتی ہے کہ وہ کیا بول رہا ہے اور کیا ارادہ رکھتا ہے؟ اس صورت میں طلاق واقع ہوتی ہے۔ ③ تیسری قسم یہ ہے کہ اس کا غصہ تو مستحکم اور شدید ہوتا ہے، لیکن اس کی عقل بالکل زائل نہیں ہوتی۔ البتہ وہ اس کے اور اس کی نیت کے درمیان اس طرح حائل ہوجاتی ہے کہ اسے غصے کے دور ہونے پر وہ اپنے کیے پر نادم ہوتا ہے۔ یہ قسم محلِ نظر ہے، اس حالت میں طلاق کا عدمِ وقوع قوی اور مناسب ہے]

صحیح مسلم (۱/۴۷۷ چھاپہ دہلی) میں ہے:

"عن طاؤس عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: كان الطلاق على عهد رسول الله ﷺ وأبي بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة"[1] الحديث

[طاؤس رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں،

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱٤٧٢)

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی]

صفحہ (۴۷۸) میں ہے:

"عن طاؤس أن أبا الصهباء قال لابن عباس: أتعلم إنما كانت الثلاث تجعل واحدة على عهد النبي ﷺ وأبي بكر وثلاثا من إمارة عمر؟ فقال ابن عباس: نعم"[1]

[طاؤس رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بلاشبہہ ابو الصہبا رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کی: کیا آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی امارت کے تین سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی؟ تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جی ہاں]

سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [بقرة، ع:٣٠] والله أعلم بالصواب

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں] كتبه: محمد عبد الله

طلاقِ معلق کا حکم:

سوال زید نے اپنی بی بی ہندہ کو طلاق صریح دیا، پھر کچھ روز بعد رجعت کر لیا، پھر مدت کے بعد طلاق کسی شرط پر موقوف کیا اور وہ شرط بھی وقوع میں آ گئی، اس کے بعد بھی رجعت کر لیا، پھر مدت کے بعد ایک اور طلاق صریح واقع کیا۔ اب حاصل سوال یہ ہے کہ شرط والی طلاق اہلِ حدیث کے یہاں معتبر ہے یا نہیں؟ اگر معتبر نہیں ہے تو رجعت صحیح ہے یا نہیں؟

جواب شرط والی طلاق معتبر ہے، یعنی اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو کسی شرط پر طلاق دے اور وہ شرط وقوع میں آ جائے تو وہ طلاق اس کی زوجہ پر پڑ جائے گی، اس مسئلے میں اہلِ حدیث اور غیر اہلِ حدیث میں اختلاف نہیں ہے۔ ہاں اختلاف ایک دوسرے مسئلے میں ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کوئی اجنبیہ کو جو اس کی زوجہ نہیں ہے، یوں کہے کہ اگر میں اس عورت سے نکاح کروں تو یہ طالق ہے یا عام طور پر یوں کہے کہ "میں جس عورت سے نکاح کروں وہ طالق ہے" اس مسئلے میں اہلحدیث اور غیر اہلحدیث میں اختلاف ہے۔ اس مسئلے کے متعلق فتح الباری (ص: ۳۳۹ مصری) میں یہ عبارت ہے:

"وهذه المسألة من الخلافيات الشهيرة، وللعلماء فيه مذاهب، الوقوع مطلقا وعدم الوقوع مطلقا، والتفصيل بين ما إذا عين أو عمم، ومنهم من توقف، فقال بعدم الوقوع الجمهور، وهو قول الشافعي وابن مهدي وأحمد وإسحاق و داود وأتباعهم

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٢)

نکلتی ہے اور یہ جانتا بھی ہوتا ہے کہ کیا بول رہا ہوں۔

اب جاننا چاہیے کہ اعلیٰ اور اوسط درجے کے غصے میں طلاق نہیں پڑتی اور ادنیٰ درجے کے غصے میں پڑ جاتی ہے۔ تو شخص مذکور جس کی نسبت سوال ہے، اپنے غصے کی حالت کو خیال کرے کہ جس وقت اس نے اپنی زوجہ کو طلاق دیا تھا، اس وقت اس کا غصہ کس درجے کا تھا؟ اگر اعلیٰ یا اوسط درجہ کا تھا تو طلاق نہیں پڑی اور اگر ادنیٰ درجہ کا تھا تو پڑ گئی، لیکن اگر عورت مدخولہ ہے تو بائن نہیں، صرف رجعی طلاق پڑی، جس میں عدت کے اندر رجعت کر سکتا ہے، یعنی اگر اس قدر دو معتبر آدمیوں کے روبرو کہہ دے کہ میں نے اپنی زوجہ کو جو طلاق دیا تھا، اسے میں نے واپس لے لیا تو اس کی زوجہ بدستور زوجہ باقی رہے گی اور اگر عدت گزر چکی ہو تو بتراضی طرفین بلا حلالہ پھر نکاح ہو سکتا ہے۔ اگر عورت غیر مدخولہ ہے تو ایک طلاق بائن پڑ گئی، لیکن عدت کے اندر خواہ عدت کے بعد، بتراضی طرفین بلا حلالہ پھر نکاح جائز ہے۔ زاد المعاد (۲/۲۰۴۴) میں ہے:

"الغضب علیٰ ثلاثة أقسام: أحدها: ما يزيل العقل فلا يشعر صاحبه بما قال، وهذا لا يقع طلاقه بلا نزاع، و الثاني: ما يكون في مباديه بحيث لا يمنع صاحبه من تصور ما يقول وقصده، فهذا يقع طلاقه. الثالث: أن يستحكم ويشتد به فلا يزيل عقله الكلية، ولكن يحول بينه وبين نيته بحيث يندم على ما فرط منه إذا زال، فهذا محل نظر و عدم الوقوع في هذه الحالة قوي متجه" اھ

[غصے کی تین قسمیں ہیں: ① ایک قسم وہ ہے جس میں عقل بالکل زائل ہو جاتی ہے اور اس وقت جو بات غضبناک آدمی کے منہ سے نکلتی ہے، اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا بول رہا ہے، اس میں تو بلا نزاع طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ② دوسری قسم یہ ہے کہ اس قسم کے غصے کے دوران میں اس کو یہ خبر رہتی ہے کہ وہ کیا بول رہا ہے اور کیا ارادہ رکھتا ہے؟ اس صورت میں طلاق واقع ہوتی ہے۔ ③ تیسری قسم یہ ہے کہ اس کا غصہ تو مستحکم اور شدید ہوتا ہے، لیکن اس کی عقل بالکل زائل نہیں ہوتی۔ البتہ وہ اس کے اور اس کی نیت کے درمیان اس طرح حائل ہو جاتی ہے کہ اسے غصے کے دور ہونے پر وہ اپنے کیے پر نادم ہوتا ہے۔ یہ قسم محلِ نظر ہے، اس حالت میں طلاق کا عدمِ وقوع قوی اور مناسب ہے]

صحیح مسلم (۴۷۷/۱ چھاپہ دہلی) میں ہے:

"عن طاؤس عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: كان الطلاق على عهد رسول الله ﷺ وأبي بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة"[1] الحديث

[طاؤس رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں،

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۷۲)

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی]

صفحہ (۴۷۸) میں ہے:

"عن طاؤس أن أبا الصهباء قال لابن عباس: أتعلم إنما كانت الثلاث تجعل واحدة على عهد النبي ﷺ وأبي بكر وثلاثا من إمارة عمر؟ فقال ابن عباس: نعم"[1]

[طاؤس رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بلاشبہہ ابو الصہبا رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کی: کیا آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی امارت کے تین سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی؟ تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جی ہاں]

سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [بقرة، ع:۳۰] والله أعلم بالصواب

[اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کرلیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہوجائیں]

کتبہ: محمد عبد اللہ

طلاقِ معلق کا حکم:

سوال زید نے اپنی بی بی ہندہ کو طلاق صریح دیا، پھر کچھ روز بعد رجعت کر لیا، پھر مدت کے بعد طلاق کسی شرط پر موقوف کیا اور وہ شرط بھی وقوع میں آ گئی، اس کے بعد بھی رجعت کر لیا، پھر مدت کے بعد ایک اور طلاق صریح موقع کیا۔ اب حاصل سوال یہ ہے کہ شرط والی طلاق اہلِ حدیث کے یہاں معتبر ہے یا نہیں؟ اگر معتبر نہیں ہے تو رجعت صحیح ہے یا نہیں؟

جواب شرط والی طلاق معتبر ہے، یعنی اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو کسی شرط پر طلاق دے اور وہ شرط وقوع میں آ جائے تو وہ طلاق اس کی زوجہ پر پڑ جائے گی، اس مسئلے میں اہلِ حدیث اور غیر اہلِ حدیث میں اختلاف نہیں ہے۔ ہاں اختلاف ایک دوسرے مسئلے میں ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کوئی اجنبیہ کو جو اس کی زوجہ نہیں ہے، یوں کہے کہ اگر میں اس عورت سے نکاح کروں تو یہ طالق ہے یا عام طور پر یوں کہے کہ "میں جس عورت سے نکاح کروں وہ طالق ہے" اس مسئلے میں اہلحدیث اور غیر اہلحدیث میں اختلاف ہے۔ اس مسئلے کے متعلق فتح الباری (ص: ۳۳۹ مصری) میں یہ عبارت ہے:

"وهذه المسألة من الخلافيات الشهيرة، وللعلماء فيه مذاهب، الوقوع مطلقا وعدم الوقوع مطلقا، والتفصيل بين ما إذا عين أو عمم، ومنهم من توقف، فقال بعدم الوقوع الجمهور، وهو قول الشافعي وابن مهدي وأحمد وإسحاق و داود وأتباعهم

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٢)

وجمهور أصحاب الحديث"[1] الخ

[یہ مسئلہ مشہور اختلافی مسائل میں سے ہے۔ علما کے اس مسئلے میں کئی مذاہب ہیں۔ ایک مذہب مطلق طور پر طلاق واقع ہونے کا ہے اور ایک مطلق طور پر واقع نہ ہونے کا ہے۔ ایک موقف متعین اور غیر متعین عمومی طلاق میں فرق کرنے کا ہے۔ بعض نے اس مسئلے میں توقف کیا ہے۔ جمہور علما عدمِ وقوع کے قائل ہیں۔ امام شافعی، ابن مہدی، احمد، اسحاق، داود اور ان کے اَتباع اور جمہور اصحاب الحدیث کا بھی یہی قول ہے]

الحاصل صورتِ مسئلہ میں جواب یہ ہے کہ زید نے جو اپنی بی بی ہندہ کو تین طلاقیں دیں، وہ تینوں طلاقیں ہندہ پر پڑ گئیں، اگرچہ دوسری طلاق شرط والی تھی، جس کی شرط وقوع میں آ گئی، لہٰذا اب زید رجعت نہیں کر سکتا اور نہ ہندہ بغیر حلالہ کے زید کے لیے حلال ہو سکتی ہے۔ كتبه: محمد عبد الله (٢٢/ ربيع الآخر ١٣٣٥ھ)

سوال ایک شخص نے اپنی بی بی کو کہا کہ تمھارے مہرِ دین چھوڑ دینے کی شرط پر تم کو طلاق دیتے ہیں تادیباً اور اس عورت نے منظور نہ کیا، اس صورت میں اس کو طلاق ہوگی یا نہیں؟

جواب اس صورت میں طلاق نہیں ہوئی، کیونکہ جس شرط پر اس شخص نے طلاق دی تھی، وہ شرط پائی نہیں گئی۔ "إذا فات الشرط فات المشروط" والله تعالىٰ أعلم [جب شرط نہ پائی گئی تو مشروط بھی ثابت نہ ہوا]

كتبه: محمد عبد الله (٨/ جنوری ٩٣ء)

سوال زید نے اپنی زوجہ ہندہ سے بحالت ناداِنستگی و نافہمی کہہ دیا کہ تو اگر بغیر میری اجازت لیے والدہ یا ہمشیرہ کے یہاں گئی تو تجھ کو تین طلاق ہے۔ ازاں بعد ہندہ اپنے والدین کے یہاں باجازت زوج (یعنی زید کے) گئی، پھر زید کسی کارضروری سے کہیں چلا گیا تھا۔ بروز شبِ براءت ہندہ اپنی ہمشیرہ کے یہاں جانا چاہتی تھی، لیکن زید چونکہ موجود نہ تھا، زید کے موجود نہ ہونے سے ہندہ جو منکوحہ زید ہے، سخت رنجیدہ اور غمگین ہوئی۔ زید کا برادر جو گھر میں موجود تھا، اس نے ہندہ کو غمگین پا کر ہندہ کو اس کی ہمشیرہ کے یہاں جانے کی اجازت دے دی اور وہ چلی گئی۔ جب زید مکان پر آیا اور اس کے جانے کی خبر معلوم کی کہ بھائی نے اجازت دے دی ہے تو اس نے کہا کہ بھائی کا اجازت دے دینا میری ہی اجازت ہے تو کیا بریں صورت عند الشرع طلاق ہوگئی یا نہیں؟ اگر واقع نہ ہو تو فہو المراد [یہی مقصود ہے] اگر واقع ہو تو پھر نکاح کا کیا طریق ہے؟

جواب زید نے جس وقت الفاظِ طلاق مذکورہ سوال استعمال کیے تھے، لفظ "میری اجازت" سے اگر خاص اپنی اجازت مراد لی ہے تو اس صورت میں ہندہ پر طلاق واقع ہوگئی، مگر صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوئی، جس میں عدت کے اندر زید رجوع کر سکتا ہے اور اگر عدت گزر چکی ہو تو بتراضی طرفین دونوں میں نکاح جدید ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں طلاق رجعی واقع ہونے میں شرط یہ ہے کہ ہندہ نکاح کے بعد زید کی مدخولہ ہو چکی ہو، ورنہ صرف ایک طلاق رجعی

[1] فتح الباري (٩/ ٣٨٦)

ہوئی، جس میں زید رجوع تو نہیں کر سکتا، لیکن بتراضی دونوں میں نکاح جدید ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت میں زید نے لفظ میری اجازت سے اپنی خاص اجازت مراد نہیں لی تھی، بلکہ مجازاً اپنی عام اجازت مراد لی تھی، جو بھائی کو بھی شامل ہے تو اس صورت میں ہندہ پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔ بھائی کی اجازت زید کی اجازت ہوگی، تو ہندہ اس صورت میں بغیر اجازت زید کے اپنی ہمشیرہ کے یہاں نہیں گئی۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبداللہ (۵/ شوال ۱۳۳۱ھ)

مطلقہ عورت کو عدت میں نان ونفقہ دینا:

سوال مسماۃ ہندہ نے حاکم کے پاس استغاثہ کیا کہ شوہر میرا ہم کو کھانے پہننے کو کچھ نہیں دیتا ہے، اس پر حاکم نے اس کے شوہر کو بلا کر اظہار کیا، شوہر نے اظہار کیا کہ ہم اس کو نان ونفقہ کیوں دیں، ہم نے اس کو طلاق دیا ہے، مگر گواہوں سے حاکم کے سامنے طلاق دینا اس کا ثابت نہیں ہوا، تب اس کے شوہر نے کہا: اگر پہلے نہیں دیا تھا تو اب ہم نے اس کو طلاق دیا، طلاق دیا، طلاق دیا، پس موافق کتاب وسنت کے اس پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب یہ طلاق جو شوہر مسماۃ ہندہ نے اس کو رو بروئے حاکم کے دیا ہے، واقع ہوئی اور اب شوہر مسماۃ مذکورہ پر مسماۃ مذکورہ کو ایامِ عدت تک کا نفقہ وسکنی دینا واجب ہے۔

روي عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللهﷺ: «ثلاث جدهن جد، و هزلهن جد: النكاح والطلاق والرجعة»[1] (رواه الخمسة إلا النسائي وقال الترمذي: حديث حسن غريب، نيل الأوطار: ٦/ ١٥٩)

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین باتیں ایسی ہیں، اگر کوئی ان کو حقیقت اور سنجیدگی میں کہے، تو حقیقت ہیں اور ہنسی مزاح میں کہے تو بھی حقیقت ہیں۔ نکاح، طلاق اور (طلاق سے) رجوع]

"وقال علي: وكل الطلاق جائز إلا طلاق المعتوه" (صحيح بخاري: ٢/ ٧٩٤) [علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دیوانے کی طلاق کے سوا ہر طلاق جائز ہے] وقال الله تعالىٰ: ﴿أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ﴾ (الطلاق: ٦) [انھیں وہاں سے رہایش دو جہاں تم رہتے ہو، اپنی طاقت کے مطابق] وقال تعالىٰ: ﴿لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ﴾ (سورۂ طلاق، رکوع: ۲) [لازم ہے کہ وسعت والا اپنی وسعت میں سے خرچ کرے]

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. محمد ضمير الحق۔ عفي عنه. أصاب من أجاب. أبو محمد إبراهيم. الجواب صحيح. والمجيب مصيب. وصيت علي۔ عفا الله عنه. الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب.

سوال ایک شخص نے اپنی عورت کو جس سے صحبت کر چکا تھا، کسی وجہ سے ایک طلاق دے دیا اور طلاق دیے ہوئے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٣٩)

ڈیڑھ برس ہوچکے اور بعد طلاق دینے کے تین حیض بھی عورت کو آچکا، اس صورت میں یہ طلاق بائن ہوگئی یا نہیں اور اب شوہر پر اس کا نان ونفقہ واجب ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں یہ طلاق بائن ہوگئی اور اب شوہر پر اس کا نان ونفقہ واجب نہیں ہے۔

ہدایہ (چھاپہ مصطفائی) میں ہے:

"وإذا طلق الرجل امرأته طلاقا بائنا أو رجعيا أو وقعت الفرقة بينهما بغير طلاق، وهي حرة ممن تحيض، فعدتها ثلاثة أقراء"[1]

[جب اپنی بیوی کو طلاق بائن یا طلاقِ رجعی دے دے یا بغیر طلاق کے ان کے درمیان جدائی واقع ہوجائے اور وہ اس مرد، جس سے وہ حیض والی ہوتی ہے، آزاد ہوچکی ہو تو اس کی عدت تین حیض ہے]

صفحہ (۴۲۳) میں ہے: "وإذا طلق الرجل امرأته فلها النفقة والسكنىٰ في عدتها، رجعيا كان أو بائنا"[2] [جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کی عدت کے دوران میں اسے نان ونفقہ اور سکنیٰ ملے گا، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن] "رد المحتار" (۲/ ۷۲۶) میں ہے: "تلزمه النفقة حتى تحيض ثلاثا" [اس کے تین حیض آنے تک اس کو نفقہ دینا واجب ہے] نیز "رد المحتار" (۲/ ۷۲۶) میں ہے: "النفقة تابعة للعدة" واللّٰه أعلم بالصواب [نفقہ عدت کے تابع ہے (یعنی عدت کے دوران میں عورت نفقے اور سکنے کی حق دار ہوگی)]

کتبہ: محمد عبد اللّٰه

طلاق کے بعد بیوی کہاں رہے؟

سوال زید نے اپنی زوجہ ہندہ کو طلاق دے کر اس کی چھوٹی بہن کو نکاح کیا ہے اور مطلقہ کی گود میں لڑکی شیر خوار ہے، اس لڑکی شیر خوار کو دو برس تک دودھ پلانے کے وسیلے سے مطلقہ مذکورہ کو خورو پوش دے کر اپنے گھر میں رکھا ہے اور شرعی حجاب وحفاظت اٹھا دیا ہے، لیکن جانبین سے خرابے میں مبتلا ہونے کی غالب امید ہے۔ آیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب اگر زید نے ہندہ کو طلاق بائن دی تھی یا طلاق رجعی دی تھی اور عدت گزر چکی ہے تو ان دونوں صورتوں میں زید ہندہ کو اپنے مکان میں نہ رکھے، بلکہ ہندہ کسی دوسری محفوظ جگہ میں رہے۔

عن أبي سلمة بن عبد الرحمن عن فاطمة بنت قيس رضی اللہ عنہا أن أبا عمرو بن حفص طلقها البتة، وهو غائب، فأرسل إليها وكيله بشعير فسخطته فقال: واللّٰه مالك علينا من شيئ، فجاءت رسول اللّٰه ﷺ فذكرت ذلك له، فقال: ليس لكِ عليه نفقة، فأمرها أن تعتد في بيت أم شريك، ثم قال: تلك امرأة، يغشاها أصحابي، اعتدي عند ابن أم مكتوم،

---

[1] الهداية (۲/ ۲۷)

[2] الهداية (۲/ ٤٤)

فإنه رجل أعمى، تضعين ثيابك.[1] الحديث

[ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ابو عمرو بن حفص نے ان کو طلاقِ بتہ (مختلف اوقات میں تین طلاقیں) دے دیں اور وہ خود (گھر میں) موجود نہیں تھے۔ ان کے وکیل نے فاطمہ کی طرف کچھ جَو بھیجے تو وہ اس پر راضی نہ ہوئیں۔ وکیل نے کہا: اللہ کی قسم! تیرے لیے ہم پر کوئی چیز واجب ہی نہیں ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''اس کے ذمے تمھارا کوئی خرچ نہیں ہے''، پھر ان کو حکم دیا کہ وہ ام شریک رضی اللہ عنہا کے ہاں عدت گزارے۔ پھر فرمایا: اس عورت کے ہاں میرے صحابہ آتے رہتے ہیں، تو ابن ام مکتوم کے گھر میں عدت گزارو، وہ نابینا آدمی ہے، تمھیں اپنے کپڑے اتارنے میں بھی آسانی رہے گی] واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

اگر طلاق کے بعد عورت کا حمل ظاہر ہو جائے؟

سوال زید نے ایک عورت کے ساتھ نکاح کیا اور اس بی بی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بعدہ بوجہ نا اتفاقی آپس کے اس بی بی کو طلاق دے دیا اور وہ بی بی بعد طلاق کے حاملہ ظاہر ہوئی تو ایسی حالت میں طلاق واجب ہو کر مطلقہ ہوئی یا نہیں اور بوجہ حمل کیا حکم ہے اور وہ لڑکی کس کی ہوگی؟ زید اتنی مدت تک کوئی مکان جائے پذیر نہیں دیا، بجز مکان کرایہ کے تو اس پر عدت کیا ہے اور دربارہ مکان کیا حکم ہے اور بوجہ نا اتفاقی رجعت کی خواہش نہیں تو عورت مطلقہ کو مکان بنا دے سکتا ہے؟ کیا حکم ہے؟

جواب ایسی حالت میں زید کی بی بی مطلقہ ہوگئی اور وہ حمل جو بعد طلاق کے ظاہر ہوا، اگر طلاق کے قبل کا ہے، تو عدت واجب ہے اور ایسی حالت میں عدت وضع حمل ہے اور زید پر عدت کا نفقہ و سکنی واجب ہے، یعنی زمانہ عدت یعنی وضع حمل تک زید پر واجب ہے کہ اس بی بی کو خرچ اور رہنے کا مکان دے، خواہ وہ مکان زید کے نج کا ہو، خواہ کرایہ کا، خواہ عاریت کا اور زید کو تا انقضائے عدت رجعت کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ حمل طلاق کے بعد اور عدت کے اندر کا زید ہی سے ہے تو اس حمل سے رجعت ہوگئی اور وہ بی بی پھر زید کی بی بی ہوگئی اور ان دونوں صورتوں میں جو اس حمل سے اولاد ہوگی، لڑکا خواہ لڑکی، زید کی اولاد ہوگی، جس طرح وہ پہلی لڑکی جو طلاق کے قبل پیدا ہوئی، زید کی اولاد ہے۔ واللّٰہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللّٰہ (مہر مدرسہ)

کیا شوہر کے ترکے سے بیوی نان ونفقہ کا حق رکھتی ہے؟

سوال زید متوفی کا نکاح ہندہ کے ساتھ بعوضِ اکتالیس ہزار روپیہ اور ایک اشرفی اور علاوہ اس کے نان ونفقہ ہوا تھا تو آیا نان ونفقہ بعد مماتِ زید متوفی مذکور کے ہندہ مذکور کا ذمہ زید متوفی کے باقی رہا یا نہیں اور نان ونفقہ جزوِ معاوضہ نکاح سمجھا جائے گا یا نہیں اور اس وجہ سے زوجہ تا حیاتِ خود مستحق پانے نان ونفقہ کی جائداد سے زید متوفی کے ہے یا نہیں؟

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۸۰)

جواب نان ونفقہ زوجہ کا بعد مماتِ زوج ذمہ زوج باقی نہیں رہا اور زوجہ مستحق پانے نان ونفقہ کی ترکہ زید سے نہیں ہے۔ سنن ابو داود (۱/ ۳۱۵ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

"عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ﴿وَ الَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُونَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾ فنسخ ذلك بآية الميراث بما فرض لهن من الربع والثمن"[1] والله أعلم بالصواب.

[آیتِ کریمہ: "اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں، وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نکالے بغیر سامان دینے کی وصیت کریں۔" کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ حکم آیتِ میراث سے منسوخ ہے اور انھیں چوتھا یا آٹھواں حصہ ملے گا] كتبه: محمد عبد الله

والدہ کی وفات کے بعد لڑکے کے حقوقِ پرورش کون ادا کرے گا؟

سوال ہندہ نے بحالتِ زچگی انتقال کیا اور ایک لڑکا تین یوم کا اور خاوند، ماں اور باپ وارث چھوڑے ہیں۔ تقسیم مہر اور جہیز اور متعلقہ مال متروکہ کی کیونکر ہوگی اور نیز لڑکے کی پرورش کیونکر ہوگی اور اس کے اخراجاتِ پرورش کون دے گا اور لڑکے کا حصہ کس کی تحویل میں رہے گا؟

جواب اس صورت میں بعد تقدیم ما تقدم علی الارث ورفع موانعہ، کل مال متروکہ ہندہ بارہ سہام (حصوں) پر تقسیم ہوگا، اس میں سے تین سہام، یعنی چار آنے خاوند کو اور دو سہام (یعنی دو آنے آٹھ پائی) باپ کو اور اسی قدر ماں کو اور باقی پانچ سہام (یعنی چھ آنے آٹھ پائی) لڑکے کو ملے گا، اس کی دلیل آیات وحدیثِ ذیل ہیں:

۱ ﴿فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ﴾ [النساء: ۱۲]

[پھر اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو تمھارے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے، جو انھوں نے چھوڑا، اس وصیت کے بعد جو وہ کر جائیں یا قرض (کے بعد)]

۲ ﴿وَ لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ۲، پارہ ٤]

[اور اس کے ماں باپ کے لیے، ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے، جو اس نے چھوڑا، اگر اس کی کوئی اولاد ہو]

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: «ألحقوا الفرائض بأهلها، فما بقي فهو لأولىٰ رجل ذكر»[2] (متفق عليه، مشكوة، ص: ٢٥٥)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مستحقین کو ان کے مقررہ حصے دو اور جو

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٩٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٥)

باقی بچے وہ (میت کے) قریب ترین مرد (رشتے دار) کا حصہ ہے]

لڑکے کی پرورش لڑکے کی نانی کے متعلق ہوگی، اگر وہ اس کی پرورش کی خواستگار ہو، ورنہ اس کے باپ کے متعلق ہوگی اور اس کے اخراجات پرورش صرف باپ دے گا اور لڑکے کا حصہ بھی باپ ہی کی تحویل میں رہے گا۔

"ذكر حكم رسول اللهﷺ في الولد من أحق به في الحضانة. روى أبو داود في سننه من حديث عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده عبد الله بن عمرو أن امرأة قالت: يا رسول الله! إن ابني هذا كان بطني له وعاء، وثديي له سقاء، و حجري له حواء، وإن أباه طلقني فأراد أن ينزعه مني؟ فقال لها رسول اللهﷺ: أنت أحق به ما لم تنكحي"[1]
(زاد المعاد: ٢/ ٢٨٩)

[بچے کی نگہداشت اور تربیت کا کون زیادہ حق دار ہے؟ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے حکم اور فیصلے کا ذکر: امام ابوداود نے اپنی سنن میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث بیان کی ہے کہ ایک عورت نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا یہ بیٹا، میرا پیٹ اس کے لیے برتن، میرا سینہ اس کے لیے مشکیزہ اور میرا دامن اس کے لیے پناہ گاہ رہا ہے۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو مجھ سے چھین لے؟ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: تو اس کی زیادہ حق دار ہے جب تک تو نکاح نہ کرے]

"والولاية على الطفل نوعان: نوع يقدم فيه الأب على الأم، ومن في جهتها، وهي ولاية المال والنكاح، ونوع يقدم فيه الأم على الأب، وهي ولاية الحضانة والرضاع (إلى قوله) ولما كان النساء أعرف بالتربية وأقدر عليها وأصبر وأرأف وأفرغ لها، لذلك قدمت الأم فيها على الأب، ولما كان الرجال أقوم بتحصيل مصلحة الولد والاحتياط له في البضع قدم الأب فيها على الأم" (زاد المعاد: ٢/ ٢٩٠)

[بچے کی ولایت کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم میں باپ کو ماں اور اس کی طرف سے جو بھی ہے، پر مقدم رکھا گیا ہے، یہ مال اور نکاح کی ولایت ہے۔ دوسری قسم میں ماں کو باپ پر مقدم کیا گیا ہے اور یہ پرورش و تربیت اور رضاعت کی ولایت ہے...، چوں کہ عورتیں عملی تربیت کو زیادہ جاننے والی ہیں، اس پر زیادہ قدرت رکھتی ہیں، اس پر صبر کرنے والی ہیں، اس کام کے لیے وہ زیادہ فراغت و فرصت رکھتی ہیں اور بچے پر نرمی کرنے والی ہیں، اسی لیے اس میں ماں کو باپ پر مقدم کیا گیا ہے۔ جب کہ مرد بچے کی مصلحت کے حصول اور شہوانی معاملات میں اس کی زیادہ حفاظت کرنے والے ہیں، اس لیے اس کے متعلق ولایت میں باپ کو ماں پر مقدم کیا گیا ہے]

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٧٦)

"وثبت عنهﷺ في الصحيحين أن هندا امرأة أبي سفيان قالت له: إن أبا سفيان رجل شحيح، ليس يعطيني من النفقة ما يكفيني وولدي إلا ما أخذت منه، وهو لا يعلم؟ فقال: «خذي ما يكفيكِ وولدكِ بالمعروف»[1] (زاد المعاد: ٢/ ٣٠٤)

[بخاری و مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ ابو سفیان کی بیوی ہندہ نے آپ ﷺ سے عرض کی: بلاشبہہ ابو سفیان پیسہ سنبھال کر رکھنے والے بخیل آدمی ہیں۔ وہ مجھے اتنا (خرچ) نہیں دیتے جو مجھے اور میرے بچوں کو کافی ہو، سوائے اس کے کہ میں ان کی لاعلمی میں ان کے مال میں سے کچھ لے لوں (تب گزارہ ہوسکتا ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: اتنا لے لو جو تمھیں اور تمھاری اولاد کو مناسب حد تک کافی ہو]

"فيه دليل علىٰ تفرد الأب بنفقة أولاده، ولا تشاركه فيها الأم" (زاد المعاد: ٢/ ٣٠٤)

[اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ باپ اپنی اولاد کے نفقے کا تنہا ذمہ دار ہے، اس فریضے میں ان کی ماں شریک نہیں ہے]

"ونفقة الأولاد الصغار على الأب، لا يشاركه فيها أحد"[2] (هداية، باب النفقة)

[چھوٹے بچوں کا نفقہ باپ کے ذمے ہے، اس میں کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں] واللّٰه تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (١٣/ جمادى الثانى ١٣٣١هـ)

خلع کب واقع ہوتا ہے؟

سوال ایک عورت نے مجلس میں آ کر سردار کے پاس اپنا زیور جو مہر کا تھا اور کچھ روپیہ واپس دیا اور کہا کہ میں اپنے شوہر سے خلع چاہتی ہوں۔ شوہر نے کہا: ہم تم کو خلع نہیں دیں گے، یعنی میں تمھارا خلع منظور نہ کروں گا، تو اس عورت نے کہا کہ تمھارا بھات بھی نہ کھاؤں گی اور نہ جو چیزیں میں نے واپس دی ہیں، پھر لوں گی۔ اتنے میں شوہر مجلس سے اٹھ کر یہ کہتا ہوا کہ میں تمھارا خلع ہرگز نہ کروں گا، چلا گیا اور وہ عورت بھی اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ ایک ماہ بھی نہ گزرا کہ شوہر کا انتقال ہوگیا اور وہ زیور اور روپیہ اب تک سردار کے پاس جمع ہے اور اب وہ عورت اپنا مال مذکور طلب کرتی ہے کہ جب میرا خلع قبول ہی نہیں کیا میرے شوہر نے تو میرا مال واپس دیا جائے تو اب مال مذکور کس کو ملے گا؟ آیا وارثِ شوہر کو یا اس کی بی بی کو؟ بیان کریں۔

جواب اگر عورت مذکورہ نے زیور اور روپے سردار کے پاس بدل خلع میں جمع کیے تھے کہ اگر شوہر خلع اس کو کر دے تو یہ زیور اور روپے خلع کے بدلے میں لے لے تو اس صورت میں کہ شوہر نے عورت مذکورہ کے خلع کو نامنظور کر دیا تھا، مال مذکور (زیور اور روپے) عورت کا ہے، عورت کو واپس دے دیا جائے اور اس صورت میں شوہر کے کسی وارث کو جو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٤)

[2] الهداية (ص: ٢٩١)

عورت مذکورہ کے سوا ہو، اس مال میں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۵/شوال ۱۳۳۰ھ)

کیا شوہر میں کوڑھ پن ظاہر ہونے کے بعد عورت خلع طلب کر سکتی ہے؟

سوال زید نے ہندہ سے شادی کی۔ قبل شادی عارضہ جذام زید کو نمایاں نہ تھا۔ بعد شادی اچھی طرح سے عارضہ جذام ظاہر ہوگیا اور ہندہ نے اپنے شوہر مجذوم سے کنارہ کشی کی۔ اب ہندہ اپنے شوہر زید سے خلع چاہتی ہے، مگر زید راضی نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں ازروئے حکم شرع شریف ہندہ خلع کرا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں جب عورت خلع چاہتی ہے تو شوہر کو اس سے انکار کرنا نہیں چاہیے، خلع کر دینا چاہیے، جیسا کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے انکار نہیں کیا تھا۔ ثابت بن قیس بدصورت آدمی تھے، اس لیے ان کی بی بی کو سخت ناپسند تھے، لہٰذا ان کی بی بی نے خلع چاہا تو حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ خلع کر دو۔ ثابت رضی اللہ عنہ نے بلا انکار خلع کر دیا۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: جاءت امرأة ثابت بن قيس بن شماس إلى رسول الله ﷺ فقالت: يا رسول الله! إني ما أعتب عليه في خلق ولا دين، ولكني أكره الكفر في الإسلام، فقال رسول الله ﷺ: «أتردين عليه حديقته؟» قالت: نعم. فقال رسول الله ﷺ: «اقبل الحديقة، وطلقها تطليقة» (1) (رواه البخاري والنسائي)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے خاوند ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ پر دین یا خلق کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں لگاتی، لیکن میں مسلمان ہو کر کفر کے کام کرنا ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس کا دیا ہوا باغ اسے واپس کرے گی؟'' انھوں نے کہا: جی ہاں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے) فرمایا: باغ واپس لے لو اور اسے طلاق دے دو]

عن ابن عباس أن جميلة بنت سلول أتت رسول الله ﷺ فقالت: والله ما أعتب على ثابت في دين ولا خلق، ولكني أكره الكفر في الإسلام، لا أطيعه بغضا، فقال لها النبي ﷺ: «أتردين عليه حديقته؟» قالت: نعم، فأمره رسول الله ﷺ أن يأخذ منها حديقته ولا يزداد. (2) (رواه ابن ماجه، منتقى الأخبار، مطبوعه فاروقي دهلي، ص: ۲۳۹)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جمیلہ بنت سلول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: اللہ کی قسم! میں ثابت (بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ) کے دین اور اخلاق (کی کسی خرابی) کی وجہ سے

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٦٣)

(2) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥٦)

ناراض نہیں، لیکن مجھے مسلمان ہوتے ہوئے (خاوند کی) نافرمانی کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے وہ اتنے برے لگتے ہیں کہ ان کی بات نہیں مان سکتی، تو نبیِ کریم ﷺ نے اسے فرمایا: ''کیا تم اسے اس کا باغ واپس دے دو گی؟'' انھوں نے کہا: جی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان سے باغ واپس لے لیں اور زائد کچھ نہ لیں]

وفي رواية عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده عند ابن ماجه أن ثابت بن قيس كان دميما، وإن امرأته قالت: لولا مخافة الله إذا دخل علي لبسقت في وجهه.[1] (بلوغ المرام مطبوعه أيضاً، ص: ٧١) والله أعلم بالصواب

[سنن ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت میں ہے کہ بلاشبہہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ خوش شکل آدمی نہ تھے۔ ان کی بیوی نے کہا: اگر اللہ کا ڈر نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آتے ہیں، میں ان کے چہرے پر تھوک دیتی]

كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

سوال زید مجذوم ہے اور اس کے خاندان میں یہ بیماری جذام کی برابر چلی آتی ہے۔ عمرو کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ دھوکے میں آن کر اپنی لڑکی کو، جبکہ وہ صرف تین برس کی تھی، زید کے لڑکے کے، جبکہ وہ چار برس کا تھا، نکاح میں دے دیا اور اس نکاح میں ایجاب و قبول انھیں دونوں کی طرف سے ہوا۔ نکاح ہوجانے کے بعد عمرو کو معلوم ہوا کہ زید مجذوم ہے اور یہ بیماری اس کے خاندان میں برابر چلی آتی ہے اور جب وہ لڑکی ہوشیار ہوئی تو اس کو بھی یہ بات معلوم ہوئی۔ تب سے وہ برابر اس نکاح سے اپنے ناراضی ظاہر کرنے لگی اور کسی طرح اس شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہیں۔ تب اس بارے میں پنچوں نے جمع ہو کر طلاق دلوا دیا۔ زید نے طلاق بھی دے دیا اور طلاق نامہ بھی لکھ دیا۔ جب طلاق نامہ شوہر کے پاس پہنچا، شوہر نے اس طلاق کو نامنظور کیا اور اپنی زوجہ کی رخصتی کرانے کا خواستگار ہوا۔ اب وہ لڑکی بالغہ ہے اور نکاح مذکور سے کسی طرح راضی نہیں ہے اور شوہر بھی اب بالغ ہے اور طلاق دینے پر اب راضی نہیں، اس صورت میں زید، یعنی شوہر کے باپ نے جو طلاق دی ہے، وہ طلاق پڑی یا نہیں؟ اگر نہیں پڑی تو عورت کو اس نکاح کے فسخ کر دینے کا اختیار ہے یا نہیں؟

جواب زید، یعنی شوہر کے باپ نے جو طلاق دی ہے، وہ طلاق نہیں پڑی اور عورت کو نکاح کے فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: «إنما الطلاق لمن أخذ بالساق»[2]

(ابن ماجه، چھاپه دهلی، ص: ٥٢، دارقطني، چھاپه دهلی، ص: ٤٤٠)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طلاق دینا تو اسی کا حق ہے، جس نے پنڈلی کو پکڑا]

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥٧) اس کی سند ضعیف ہے۔ امام بوصیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "في إسناده حجاج بن أرطاة مدلس، وقد عنعنه"

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٨١) إرواء الغليل (٢٠٤١)

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «لا تنكح البكر حتى تستأذن»[1] (متفق عليه)

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کنواری لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے، حتی کہ اس سے اجازت لی جائے]

"وعن ابن عباس قال: إن جارية بكرا أتت رسول الله ﷺ فذكرت أن أباها زوجها، وهي كارهة، فخيرها النبي ﷺ"[2] والله أعلم بالصواب

(رواه أبو داود، مشكوة شريف، چھاپه دهلى، ص: ٢٦٢ و ٢٦٣)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی۔ اس نے بتایا کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کر دی ہے، مگر میں اسے ناپسند کرتی ہوں تو نبیِ مکرم ﷺ نے اسے اختیار دے دیا]

كتبه: محمد عبد الله

بدچلن خاوند سے خلع طلب کرنا:

سوال زید نے اپنی دختر کا عمر کے ساتھ نکاح کر دیا۔ بعد نکاح کے عمر برابر اپنے سسر زید کے مکان میں رہا کرتا ہے، مگر اب چند روز سے عمر زانی اور بے نمازی ہوا اور تین چار بار توبہ کیا، مگر پھر اسی طرح بدکاری میں مصروف ہے۔ توبہ کرنا اور توبہ کا توڑنا۔ پرہیزگار بیوی اس حالت میں اپنے خصم سے خلع کرا سکتی ہے اور عورت کا باپ اس کے طلاق کے واسطے کوشش کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب اس حالت میں عمرو کی بی بی اپنے خصم سے خلع کرا سکتی ہے اور اس عورت کا باپ اس کی طلاق کے واسطے کوشش کر سکتا ہے۔ سورت بقرہ رکوع (۲۹) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٢٩]

[پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں، جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے]

مشکوۃ (ص: ۲۷۵ چھاپہ دہلی) میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: جاءت امرأة ثابت بن قيس بن شماس إلى رسول الله ﷺ فقالت: يا رسول الله! إني ما أعتب عليه في خلق ولا دين، ولكني أكره الكفر في الإسلام، فقال رسول الله ﷺ: «أتردين عليه حديقته؟» قالت: نعم، فقال رسول الله ﷺ: «اِقبل الحديقة، وطلقها تطليقة»[3] (رواه البخاري)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٩٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٦٣)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے خاوند ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ پر دین یا خلق کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں لگاتی، لیکن میں مسلمان ہو کر کفر کے کام کرنا ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس کا دیا ہوا باغ اسے واپس کرے گی؟'' انھوں نے کہا: جی ہاں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے) فرمایا: باغ لے لو اور اسے طلاق دے دو]

كتبه: أبو العلى محمد عبدالرحمن المباركفوري، عفا الله عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله.

اگر نامرد شوہر طلاق نہ دے تو بیوی کیا کرے؟

سوال اگر کسی عورت کا شوہر عنین [نامرد] ہو اور شوہر اس کا طلاق نہیں دیتا ہے اور وہ عورت طلاق چاہتی ہے تو ایسی حالت میں وہ عورت کیا کرے گی؟

جواب اگر کسی عورت کا شوہر عنین ہے اور وہ اس کو طلاق نہیں دیتا ہے اور عورت طلاق چاہتی ہے تو وہ عورت خلع یا کسی دوسری طرح تفریق کرائے گی۔ اگرچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی واقعہ بعینہٖ اس قسم کا نہیں ہوا تھا، جس کو ہم سند میں پیش کر سکیں، مگر آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اس کی نظیر میں موجود ہیں۔ دیکھو: ہدایہ (۱/ ۴۰۰ مطبوعہ مصطفائی) میں ہے:

"وإذا كان الزوج عنينا، أجله الحاكم سنة، فإن وصل إليها فبها وإلا فرق بينهما إذا طلبت المرأة ذلك، هكذا روي عن عمر و علي و ابن مسعود رضي الله عنهم، ولأن الحق ثابت لها في الوطأ، ويحتمل أن يكون الامتناع لعلة معترضة، ويحتمل لآفة أصلية، فلا بد من مدة معرفة لذلك، وقدرناها بالسنة لاشتمالها علىٰ الفصول الأربعة فإذا مضت المدة، ولم يصل إليها، تبين أن العجز بآفة أصلية ففات الإمساك بالمعروف، ووجب عليه التسريح بالإحسان فإذا امتنع ناب القاضي منابه ففرق بينهما، ولا بد من طلبها لأن التفريق حقها"

[جب شوہر نامرد ہو تو حاکمِ وقت اس کو (علاج کے لیے) ایک سال کی مہلت دے گا۔ اس کے بعد اگر وہ اپنی بیوی سے جماع کرنے پر قادر ہو گیا تو ٹھیک! ورنہ ان دونوں کے درمیان جدائی کرا دی جائے گی، جب عورت اس کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ عمر، علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے، کیوں کہ عورت کے لیے وطی کا حق ثابت ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ رکاوٹ کسی پیش آمدہ علت کے سبب سے ہو۔ نیز اس میں آفتِ اصلیہ کا بھی احتمال ہے۔ لہٰذا کچھ مدت کی مہلت دی جانی چاہیے، جس سے صورتِ حال واضح ہو سکے۔ ہم نے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے، کیوں کہ سال چار موسموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پس

جب یہ مدت گزر جائے اور وہ اپنی بیوی سے وطی نہ کر پائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ اس کی یہ عاجزی اور کمزوری آفتِ اصلیہ کی وجہ سے ہے تو اس مرد سے عورت کو معروف طریقے کے ساتھ اپنے پاس روکنے کا حق نہ رہا، لہٰذا اس پر لازم ہے کہ وہ عورت کو بھلے طریقے سے رخصت کر دے۔ پھر اگر وہ ایسا کرنے سے باز رہے تو قاضی اس کا نائب اور قائم مقام بن کر ان دونوں کے درمیان جدائی کرا دے گا۔ مگر اس میں عورت کی طرف سے ایسا کرنے کا مطالبہ ہونا ضروری ہے، کیوں کہ (مذکورہ بالا صورتِ حال میں) جدائی اور تفریق عورت کا حق ہے]

رسولِ خدا ﷺ کے زمانے میں بھی یہ واقعہ ہوا ہے کہ عورت نے کسی دوسرے سبب سے، جو اس سبب کے مقابلے میں نہایت خفیف کہا جا سکتا ہے، طلاق چاہی تو آپ ﷺ نے دونوں کے درمیان تفریق کرا دی۔

عن ابن عباس قال جاءت امرأة ثابت بن قيس بن شماس إلى رسول الله ﷺ فقال: يا رسول الله! إني ما أعتب عليه في خلق ولا دين، ولكني أكره الكفر في الإسلام فقال رسول الله ﷺ: «أتردين عليه حديقته؟» فقالت: نعم، فقال رسول الله ﷺ: «اقبل الحديقة، وطلقها تطليقة» (رواه البخاري والنسائي)[1]

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے خاوند ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ پر دین یا خلق کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں لگاتی، لیکن میں مسلمان ہو کر کفر کے کام کرنا ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تو اس کا دیا ہوا باغ اسے واپس کر دے گی؟ انھوں نے کہا: جی ہاں، رسول اللہ ﷺ نے (ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے) فرمایا: باغ واپس لے لو اور اسے طلاق دے دو]

كتبه: علي أصغر ـ عفا عنه ربه الأكبر. الجواب صحيح. محمد عبد الله

سوال[2] کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ مسماۃ ہندہ کا زید کے ساتھ عقد ہوا۔ جب زید ہندہ کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ وہ نامرد ہے۔ مردوں کی طرح وہ جماع پر قادر نہ ہو سکا۔ بعض مرتبہ اگر دخول ہوگیا تو عضو فوراً مسترخی ہو کر بے کار ہوجاتا تھا اور پھر اس کی حالت نامردی کی اور ترقی کر گئی۔ زید نے بعد شادی علاج بھی کیا، لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوا اور زید نے ہندہ اور اولیائے ہندہ سے یہ بھی کہا کہ فیصلہ کر لو، یعنی طلاق لے لو اور مہر معاف کر دو۔ اولیائے زید نے زید کو سمجھایا کہ گھبراؤ مت اپنا علاج کرو، پھر دیکھا جائے گا، لیکن زید ایسا گھبرایا کہ اس نے نکل جانے کا ارادہ کیا اور ہندہ سے کہا کہ اچھا ہوں گا تو آؤں گا، ورنہ نہیں آؤں گا۔ ہندہ نے کہا: میں کیا کروں گی؟ زید نے کہا: چند دنوں، یعنی تین چار مہینے تک میرا انتظار کرنا، پھر کوئی کسی کے لیے بیٹھا تھوڑا ہی رہتا ہے، نہ میں خوبصورت ہوں نہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٦٣)

[2] فتاویٰ نذیریہ (۲/ ۲۰۲)

مال دار جو مجھ سا تم کو کوئی اور نہ ملے گا۔ پھر بلا اطلاع چل دیا اور پھر آج تک جس کو عرصہ ڈیڑھ برس کا ہوا، اس کا کہیں پتا نہ چلا۔ باوجود تلاش کے اس کی کچھ خبر نہ ملی اور نہ اپنی کچھ خبر ہندہ کو بھیجی۔ اب ہندہ ضروریاتِ بشریہ کی وجہ سے متضرر ہے۔ اب وہ عقدِ ثانی کرنا چاہتی ہے، لہٰذا شرع شریف کا ہندہ کے لیے کیا حکم ہے اور جہاں تک غور کیا جاتا ہے، زید کی واپسی کی کوئی امید نہیں ہے اور زید ایک مسافر غریب الوطن تھا۔

جواب اس صورت میں شرع شریف کا حکم ہندہ کے لیے یہ ہے کہ وہ عقدِ ثانی کر سکتی ہے، اگر عدت گزر چکی ہے اور اگر عدت نہیں گزری ہے تو عدت گزرنے کے بعد کر سکتی ہے، اس لیے کہ ہندہ پر طلاق کنائی واقع ہو چکی ہے۔ وہ عورت انقضائے عدت کے بعد عقد ثانی کر سکتی ہے۔ ہندہ پر اس لیے طلاق کنائی ہو چکی ہے کہ زید نے ہندہ کے پوچھنے پر کہ تمھارے چلے جانے کے بعد میں کیا کروں گی؟ کہا: ''چند دنوں یعنی تین چار مہینے تک میرا انتظار کرنا، پھر کوئی کسی کے لیے بیٹھا تھوڑا ہی رہتا ہے، نہ میں ایسا خوبصورت ہوں نہ مال دار جو مجھ سا تم کو کوئی اور نہ ملے گا۔'' جس کا مطلب بہت صاف ہے کہ زید نے ہندہ سے کہا کہ تم مدتِ مذکورہ، یعنی تین چار مہینے تک میرا انتظار کرنا، پھر دوسرا عقد کر لینا، کیوں کہ کوئی کسی کے لیے بیٹھا تھوڑا ہی رہتا ہے تو تم بھی میرے لیے بیٹھی نہ رہنا، بلکہ دوسرا عقد کر لینا، پس زید کا یہ قول لفظ ''اِبْتَغِي الْأَزْوَاجَ'' (کوئی خاوند تلاش کر لے) سے ایقاعِ طلاق میں زیادہ صاف ہے، بلکہ قریب بتصریح ہے، کیوں کہ لفظ ''اِبْتَغِي الْأَزْوَاجَ'' میں جس قدر غیر طلاق کا احتمال ہے، اس قدر زید کے اس قول میں نہیں ہے اور لفظ ''اِبْتَغِي الْأَزْوَاجَ'' طلاق کنائی ہے، جیسا کہ ہدایہ وغیرہ کتبِ فقہ میں مذکور ہے تو زید کا قول مذکور بالاولیٰ طلاق کنائی ہے۔

ہدایہ (۱/ ۳۵۴) کی عبارت یہ ہے:

''وبقية الكنايات إذا نویٰ بها الطلاق كانت واحدة بائنة، وإن نوى ثلاثا كانت ثلاثا، وإن نوى ثنتين كانت واحدة بائنة، هذا مثل قوله: أنت بائن، وبتة وبتلة وحرام... إلى قوله: وابْتَغِي الْأَزْوَاجَ''

[طلاق کنائی میں اگر نیت ایک طلاق کی ہو تو ایک طلاق واقع ہوگی اور اگر تین کی نیت ہوگی تو تین ہوں گی اور دو کی نیت ہوگی تو ایک بائن ہوگی، جیسے کہے: تو بائن ہے، تو بتہ ہے، تو بتلہ ہے، حرام ہے اور کوئی دوسرا خاوند تلاش کرو]

ایسا ہی ''کنز الدقائق'' میں ہے اور فتاویٰ عالمگیری (۱/ ۵۲۹) میں ہے:

''اِبْتَغِي الأزواج. يقع واحدة بائنة إن نواها أو ثنتان وثلاث إن نواها، هكذا في شرح الوقاية'' اھ

[اگر یہ لفظ کہے کہ کوئی خاوند تلاش کر لے تو اگر نیت ایک طلاق کی ہوگی تو ایک ہوگی، دو کی ہوگی تو دو اور تین کی ہوگی تو تین]

باقی رہا یہ امر کہ زید کی نیت بھی اس قول سے طلاق کی تھی یا نہیں؟ سو واضح رہے کہ ضرور تھی اور یہ بہت ظاہر ہے، اس لیے کہ زید نے جو بات کہی تھی، ہندہ کے پوچھنے پر کہی تھی کہ تمھارے چلے جانے کے بعد میں کیا کروں گی؟ ایسی حالت میں ظاہر ہی ہے کہ زید کی نیت طلاق ہی کی تھی، یہاں تک کہ اگر زید بالفرض اس نیت سے انکار بھی کرے کہ میری نیت اس قول سے طلاق نہ تھی تو اس کا یہ قول اخیر مسموع نہ ہوگا۔ ہدایہ (۱/۳۵۴) میں ہے:

"وفي حال مذاكرة الطلاق لم يصدق فيما يصلح جواباً ولا يصلح رد في القضاء، مثل قوله خلية، وبرية، بائن، بتة، حرام، اعتدي، أمرك بيدك، اختاري، لأن الظاهر أن مراده الطلاق عند سؤال الطلاق" اھ

[اگر طلاق کا تذکرہ ہو رہا ہو اور مرد کوئی ایسی بات کہے، جو سوال کا جواب ہو سکے اور قضا میں ادا کے لیے صالح نہ ہو تو وہ اگر طلاق کا انکار کرے تو اس کو سچا نہ سمجھا جائے گا، جیسے تو خالی ہے تو بری ہے تو بائن ہے تو بتہ ہے، تو حرام ہے، تجھے اختیار ہے، کیوں کہ اس صورت میں ظاہراً طلاق ہی مراد ہے، جب کہ وہ طلاق کا سوال کر رہی ہو]

ظاہر ہے کہ زید کا قولِ مذکور ہندہ کے سوال کا جواب ہے، نہ ہندہ کے سوال کا رد اور نہ وہ رد ہونے کا صالح ہے، الحاصل ہندہ پر طلاق کنائی واقع ہو چکی ہے تو ہندہ کو شرعاً اختیار ہے کہ اگر عدت گزر چکی ہے تو ابھی عقد ثانی کر سکتی ہے، ورنہ بعد انقضائے عدت۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب.

اگر بالفرض زید کا قولِ مذکور طلاق قرار نہ دیا جائے، تو اگر زید نے ہندہ کے لیے نفقہ نہیں چھوڑا ہے، جیسا کہ عبارتِ سوال سے اس کا اشعار ہوتا ہے، تو اگر ایسی حالت میں ہندہ فسخِ نکاح کی طالب ہو تو شرعاً اس کے نکاح کے فسخ کر دینے کا حکم ہے اور جب نکاح فسخ کر دیا جائے تو انقضائے عدت کے بعد ہندہ عقدِ ثانی کر سکتی ہے۔

ردالمحتار (۲/ ۱۰۱۵ چھاپہ مصر) میں فتاویٰ قاری الہدایہ سے منقول ہے:

"حيث سئل عمن غاب زوجها ولم يترك لها نفقة فأجاب: إذا أقامت بينة علىٰ ذلك، وطلبت فسخ النكاح من قاض يراه، ففسخ نفذ، وهو قضاء على الغائب، وفي نفاذ القضاء على الغائب روايتان عندنا، فعلىٰ القول بنفاذه يسوغ للحنفي أن يزوجها من الغير بعد العدة، وإذا حضر الزوج الأول وبرهن علىٰ خلاف ما ادعت من تركها بلا نفقة لا تقبل بينته لأن البينة الأولىٰ ترجحت بالقضاء فلا تبطل بالثانية" اھ

[جب ان سے اس عورت کے بارے میں سوال کیا گیا، جس کا شوہر غائب ہو جائے اور عورت کے لیے خرچ نہ چھوڑ جائے تو انھوں نے جواب دیا: جب عورت اس پر دلائل پیش کر کے ثابت کر دے اور فسخِ نکاح کا مطالبہ کرے تو میرے خیال میں قاضی اگر فسخ کر دے تو یہ فیصلہ نافذ ہوگا۔ یہ قضا علی الغائب کی قبیل سے ہے اور قضاء علی الغیب کے نفاذ میں ہمارے نزدیک دو روایتیں ہیں۔ اس کے نفاذ کی روایت کے مطابق حنفی کو جائز ہے کہ عدت کے بعد اس عورت کا نکاح کسی اور سے کر دے۔ اگر اس کے بعد اس کا

خاوند آ جائے اور کہے کہ اس کے پاس خرچ موجود تھا اور دلائل سے ثابت بھی کر دے تو بھی اس کی دلیل قبول نہ کی جائے گی، کیوں کہ پہلی دلیل فیصلہ کی وجہ سے راجح ہوچکی ہے، وہ دوسری سے باطل نہ ہوگی]

"ویؤیده ما في بلوغ المرام وهو ما أخرجه سعيد بن منصور عن سفيان عن أبي الزناد عن سعيد بن المسيب في الرجل لا يجد ما ينفق على أهله قال: يفرق بينهما. قال أبو الزناد: وقلت لسعيد بن المسيب: سنة؟ قال سنة، وهذا مرسل قوي"[1] اھ

[اس کی تائید بلوغ المرام میں موجود سعید بن میبّب کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی آدمی بیوی کو خرچ نہ دے سکے تو ان میں تفریق کر دی جائے۔ میں نے سعید سے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ کہا: ہاں، اور یہ مرسل قوی ہے]

و في شرحه سبل السلام (٢/ ١٢٧): "و مراسيل سعيد معمول بها لما عرف من أنه لا يرسل إلا عن ثقة، قال الشافعي: والذي يشبه أن يكون قول سعيد سنة سنة رسول الله ﷺ" اھ

[سعید بن میبّب کی مراسیل معمول بہا ہیں، کیوں کہ معلوم ہے کہ وہ ثقہ ہی سے ارسال کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا کہ سعید کے قول کہ "یہ سنت ہے" سے مراد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے]

و فيه أيضاً: وقد أخرج الدارقطني والبيهقي "من حديث أبي هريرة مرفوعاً بلفظه: قال: قال رسول الله ﷺ في الرجل لا يجد ما ينفق على امرأته قال: «يفرق بينهما» اھ

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو آدمی بیوی کو خرچ نہ دے سکے، اس کی عورت کو علاحدہ کر دیا جائے]

وفي بلوغ المرام أيضاً: "عن عمر رضي الله عنه أنه كتب إلى أمراء الأجناد في رجال غابوا عن نسائهم أن يأخذوهم بأن ينفقوا أو يطلقوا. الحديث أخرجه الشافعي، ثم البيهقي بإسناد حسن"[2] اھ

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لشکروں کے سپہ سالاروں کو لکھا تھا کہ جو لوگ اپنی بیویاں چھوڑ کر باہر چلے گئے ہیں، ان سے مطالبہ کرو کہ یا وہ اپنی عورتوں کو خرچ دیں یا طلاق دیں۔ الحدیث۔ امام شافعی نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے اسے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے]

وفي سبل السلام (٢/ ١٢٨): "هذا دليل على أنه يجب أحد الأمرين على الأزواج: الإنفاق أو الطلاق" اھ

[یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خاوندوں پر خرچ یا طلاق میں سے ایک امر واجب ہے]

والله تعالىٰ أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبدالله (مدرسه أحمديه) سيد محمد نذير حسين.

---

[1] بلوغ المرام، رقم الحديث (١١٥٨)

[2] بلوغ المرام، رقم الحديث (١١٥٩)

پاگل خاوند سے بیوی کا خلع طلب کرنا:

سوال ہندہ کا شوہر عرصہ آٹھ برس سے مرضِ جنون میں مبتلا ہے۔ کبھی کبھی دو ایک روز ہوش میں آ جاتا ہے اور اس عرصہ میں علاج بھی بہت ہوا، مگر کچھ صورتِ افاقہ نہیں ہے، بلکہ اور ترقی پر ہے۔ ہندہ بہت چاہتی ہے کہ کسی طور سے طلاق دے دے، اسی لیے اپنا زیور دیتی ہے اور مہر بھی معاف کرتی ہے، مگر وہ طلاق نہیں دیتا اور نہ کسی طور سے نان ونفقہ کا خبر گیراں ہوتا ہے۔ ہندہ اس وقت میں بعمر پچیس سالہ ہے اور اپنے نان ونفقہ سے بہت عاجز و پریشان ہے اور نہ کوئی صورتِ گزران ہے۔ نیز خوف اس بات کا ہے کہ ہندہ سے اس حالتِ پریشانی میں امور خلافِ شرع صادر ہو جائیں، اب ہندہ اپنے گلوخلاصی کے واسطے دوسرا نکاح کرنا چاہتی ہے تو شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں ہندہ کے واسطے دوسرا نکاح کر لینے کے جواز کی یہ صورت ہے کہ ہندہ حاکمِ شرع کے روبرو اس بات کی درخواست کرے کہ میرا شوہر اس قدر مدت سے مرضِ جنون میں مبتلا ہے، کبھی کبھی ہوش میں آ جاتا ہے۔ میں اس سے طلاق چاہتی ہوں۔ اسی لیے اپنا زیور دیتی ہوں اور مہر بھی معاف کرتی ہوں، لیکن وہ نہ مجھے طلاق دیتا ہے نہ کسی طور سے میرے نان ونفقہ کی خبر لیتا ہے، اب میری گزران کی کوئی صورت اس کے نکاح میں رہ کر نہیں ہے، لہٰذا درخواست کرتی ہوں کہ میرا نکاح فسخ کر دیا جائے کہ عدت کا زمانہ کاٹ کر کسی دوسرے سے اپنا نکاح کر لوں۔ حاکم مذکور ہندہ سے اس بات کا ثبوت لے کر کہ اس کا شوہر فی الواقع اس کے نان ونفقہ کی خبر نہیں لیتا، نکاح مذکور فسخ کر کے حکم دے دے اور وہ بعد انقضائے عدت کے دوسرے سے اپنا نکاح کر لے۔

شامی (۲/۷۱۲ چھاپہ مصر) میں فتاویٰ "قارئ الهداية" سے منقول ہے:

"سئل عمن غاب زوجها، ولم يترك لها نفقة؟ فأجاب: إذا أقامت بينة على ذلك، وطلبت فسخ النكاح من قاض يراه ففسخ نفذ" اھ

[اس عورت کے بارے میں سوال کیا گیا جس کا شوہر غائب ہو اور اس کے لیے نفقہ نہ چھوڑ کر گیا ہو تو انھوں نے جواب دیا کہ جب وہ اس پر حجت قائم کر دے اور قاضی سے فسخِ نکاح کا مطالبہ کرے، جو اس معاملے کا بخوبی علم رکھتا ہو تو وہ نکاح فسخ کر دے تو اس کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا]

ہدایہ (ص: ۵۸۵ چھاپہ مصطفائی) میں ہے:

"قال عليه الصلاة والسلام: لا ضرر ولا ضرار في الإسلام"

[آپ ﷺ نے فرمایا: (پہلے پہل) کسی کو نقصان پہنچانا اور تکلیف دینا جائز ہے اور نہ بدلے کے طور پر نقصان پہنچانا اور تکلیف دینا]

"نصب الراية لأحاديث الهداية" (۲/ ۳۸۳) میں ہے:

"قلت: روي من حديث عبادة بن الصامت وابن عباس وأبي سعيد الخدري وأبي هريرة

وأبي لبابة وثعلبة بن مالك و جابر بن عبد الله وعائشة" اهـ

[میں کہتا ہوں کہ اسے عبادہ بن صامت، ابن عباس، ابو سعید خدری، ابو ہریرہ، ابو لبابہ، ثعلبہ بن مالک، جابر بن عبداللہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے]

اور کتاب "ظفر اللاضي بما يجب في القضاء على القاضي" (ص: ١٢٧) میں ہے:

"قد أمر الله سبحانه وتعالىٰ بإحسان عشرة الزوجات، فقال: ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ونهىٰ عن إمساكهن ضرارا، وأمر بالإمساك بالمعروف والتسريح بالإحسان، فقال: ﴿فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ٢٢٩] ونهىٰ عن مضارتهن فقال عزوجل: ﴿وَلَا تُضَارُّوْهُنَّ﴾ فالغائب إن حصل مع زوجته التضرر بغيبته جاز لها أن ترفع أمرها إلى حكام الشريعة، ولهم أن يخلصوها من هذا الضرر القانع، هذا على تقدير أن الغائب ترك لها ما يقوم بنفقتها، وأنها لم تتضرر من هذه الحيثية، بل من حيثية كونها لا مزوجة ولا أيمة، أما إذا كانت متضررة لعدم وجود ما تستنفقه مما تركه الغائب فالفسخ لذلك على انفراده جائز، ولو كان حاضرا فضلا عن أن يكون غائبا، وهذه الآيات التي ذكرناها، تدل على ذلك" انتهى

[اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیویوں کے ساتھ احسان سے رہنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ اس کا فرمان ہے: "ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو" اور انھیں تکلیف دینے کے لیے روکنے سے منع کیا، ان کو اچھے طریقے سے رکھ لینے اور نیکی کے ساتھ چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ اس نے فرمایا: "پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔" نیز ان کو تکلیف دینے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: "اور انھیں تکلیف نہ دو۔" اب جو شخص غائب ہے اور اس کے غیب رہنے کی وجہ سے اس کی بیوی کو تکلیف پہنچتی ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ حکامِ شریعت کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرے اور ان حکام کے لیے جائز ہے کہ وہ اس مسلسل ضرر سے اس کو گلو خلاصی کرائیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب غائب خاوند نے بیوی کے لیے وہ کچھ چھوڑا ہو جو اس کے نفقے کے قائم مقام بن سکے۔ اب اس کو اس اعتبار سے تو تکلیف نہیں ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ شادی شدہ تصور ہوتی ہے نہ بے نکاحی، لیکن جب عورت کو اس اعتبار سے ضرر پہنچے کہ غائب خاوند نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی، جسے وہ بطورِ نفقہ استعمال کر سکے تو خالی اس وجہ سے عورت کے لیے نکاح فسخ کروانا جائز ہے درآنحالیکہ اس کا خاوند حاضر ہو تو اس کے غائب ہونے کی صورت میں کیوں جائز نہیں ہوگا؟ مذکورہ بالا آیات اس پر دلالت کرتی ہیں]

نیز اسی صفحہ میں ہے:

"أما إذا لم يترك لها ما تحتاج إليه فالمسارعة إلى تخليصها وفك أسرها ودفع الضرر عنها واجبة" اھ واللّٰه أعلم بالصواب

[جب شوہر نے اپنی بیوی کے لیے کچھ نہ چھوڑا ہو، جس کی وہ محتاج ہے تو اس کی بیوی کی گلوخلاصی کرانے کے لیے جلدی کرنا اور اس کو آزاد کرا کر اس کی تکلیف کو دور کرنا واجب ہے] کتبہ: محمد عبد اللّٰه

حقوقِ زوجیت پورا نہ کرنے والے خاوند سے خلع طلب کرنا:

سوال زید نے اپنی دختر ہندہ نابالغہ کا نکاح بکر نابالغ سے پڑھا دیا۔ اب بکر بالغ ہوگیا۔ ہندہ ہنوز نابالغہ ہے اور دونوں میں بوجوہات سخت نزاع وخصومت رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بکر کچھ امداد و کفالت ہندہ کی نہیں کرتا، بلکہ ہر وقت درپے ایذا رسانی وتکلیف رہتا ہے، ایسی حالت میں کوئی چھٹکارہ ونجات، یعنی آزادیِ ہندہ کی ہے؟

سائل: عنایت علی خان از قصبہ مئو ناتھ بھنجن۔ محلّہ قاضی پورہ۔ ضلع اعظم گڑھ

جواب جو لوگ حالتِ نابالغی کے نکاح کو جائز بتاتے ہیں، ان کے نزدیک ایسی حالت میں ہندہ کو چھٹکارہ ونجات کی صورت یہ ہے کہ منجاب ہندہ حاکم سے درخواست کی جائے کہ یا تو بکر سے میرے حقوق ادا کرائے جائیں یا اگر بکر میرے حقوق ادا نہ کرسکتا ہو اور ادا کرنے سے عاجز ہو تو میرے اور اس کے درمیان تفریق کر دی جائے۔ واضح ہو کہ اس درخواست کے دینے میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس صورت میں کہ ہندہ نابالغہ ہے، ہندہ کے حقوق بھی زید پر ہیں، کیونکہ فتاویٰ عالمگیریہ (۲/ ۱۶۸) میں مرقوم ہے:

"والأصل في جنس هذه المسائل أنه ينظر إلىٰ المرأة، إن كانت لا تصلح للجماع فلا نفقة لها" اھ واللّٰه تعالىٰ أعلم

[اس قسم کے مسائل میں اصل یہ ہے کہ عورت کو دیکھا جائے گا، اگر وہ جماع کے قابل نہیں ہے تو اس کا نفقہ بھی نہیں ہے] کتبہ: محمد عبد اللّٰه (۲۵/ شوال ۱۳۳۱ھ)

سوال ایک شخص کسی جرم میں ماخوذ ہو کر دائم الحبس ہوگیا اور بوقتِ جلاوطن اس نے اپنی زوجہ کو طلاق بھی نہیں دی۔ اب اس کی زوجہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟ شخص مجرم نے کچھ جائداد یا کوئی ذریعہ جس سے عورت کا نفقہ ادا ہو، نہیں چھوڑا اور نہ خود عورت کو کچھ استطاعت ہے؟

جواب ایسی حالت میں عورت حاکم سے درخواست کرے کہ میرا شوہر اتنی مدت سے دائم الحبس ہے اور اس نے نہ کوئی جائداد اور نہ کوئی ذریعہ چھوڑا ہے، جس سے میرا گزر ہوسکے، لہٰذا متدعی ہوں کہ میرے شوہر سے مجھے طلاق دلوا دی جائے کہ میں اپنا دوسرا نکاح کر کے اپنی اوقات بسر کروں یا جو صورت میرے حق میں مناسب ہو، تجویز فرمائی جائے کہ میں اس تکلیف سے نجات پاؤں۔ کتبہ: محمد عبد اللّٰه

سوال بکر کی ایک عورت ہے، لیکن بکر نان ونفقہ کی ہوتی

ہے، لیکن ہندہ اس پر بھی برابر بکر کے یہاں جاتی ہے۔ جب اس کو تکلیف سخت ہوتی ہے تو اپنے والدین کے یہاں چلی آتی ہے، لیکن اس قدر تکلیف کی ہندہ اب متحمل نہیں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس سے جدائی ہوجائے، اس میں خلع کی کیا صورت ہوگی؟

جواب ہندہ اس حالت میں اپنا کل دینِ مہر بکر کو دے کر موافق اس حدیث کے خلع کرا سکتی ہے:

"عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: جاءت امرأة ثابت بن قيس بن شماس إلىٰ النبي صلی اللہ علیہ وسلم فقالت: يا رسول الله! ما أنقم علىٰ ثابت في دين ولا خلق إلا أني أخاف الكفر، فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: «أفترد ين حديقته؟» فقالت: نعم، فردت عليه و أمره ففارقها"[1]

(بخاري چهاپه نظامي، ص: ۷۹۲، باب الخلع، وكيف الطلاق فيه)

''ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ثابت بن قیس بن شماس کی بی بی آئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس، پس کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ناخوش نہیں ہوں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے ان کے دین میں اور نہ ان کے خلق میں، مگر میں ڈرتی ہوں ان کی ناشکری سے، تو فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: کیا تو واپس کر دے گی ثابت کو وہ باغ جو اس نے تجھ کو مہر میں دیا تھا؟ بولیں: ہاں، میں واپس کر دوں گی۔ پھر واپس کر دیا اور حکم دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت کو، پس ثابت اور ان کی بی بی باہم جدا ہوگئے۔'' والله أعلم بالصواب.

كتبه: عبد النور، عفي عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله

سوال زید نے ایک عورت سے نکاح کیا، اس کے دوسرے روز دوسرے ملک چلا گیا۔ چھ برس انتظار کیا، نہ آیا نہ خرچ روانہ کیا۔ چھ سال کے بعد زید کا پدر زید کے پاس بلانے کی غرض سے گیا، مگر نہ آیا اور نہ خرچ دیا اور نہ طلاق دیا۔ مجبور ہو کر زید کا پدر واپس آیا، جب سے دو برس کا زمانہ اور گزر گیا۔ جملہ آٹھ برس گزرا۔ اب زید کی بی بی کیا کرے؟ نہ آتا ہے اور نہ خرچ بھیجتا ہے نہ طلاق دیتا ہے۔ عورت کہاں اپنی گزر بسر کرے؟ اب دوسرے شوہر سے نکاح کرے یا نہ کرے؟ جواب کتاب اللہ وسنت سے تحریر فرمائیں۔

جواب صورتِ مسؤلہ میں عورت مذکورہ اپنے ضلع کے صاحب جج کے یہاں استغاثہ پیش کرے کہ اس قدر مدت سے میرے شوہر کی یہ حالت ہے کہ نہ میرے حقوق ادا کرتا ہے اور نہ مجھے طلاق دیتا ہے اور میں سخت ضیق میں ہوں، لہٰذا متدعی ہوں کہ یا تو میرے شوہر سے میرے حقوق دلوا دیے جائیں یا مجھے طلاق دلوا دی جائے یا مجھ میں اور اس میں تفریق کر دی جائے۔ اگر صاحب جج اس صورت میں طلاق دلوا دیں یا تفریق کر دیں (جبکہ شوہر حقوق ادا کرنے سے قاصر ہو) تو عورت مذکورہ کی عدت گزر جانے کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کر دیا جائے۔

لقوله تعالىٰ: ﴿وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ [البقرة: ۲۳۱]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۹۷۳)

[اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے، سو بلاشبہہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا]

وعن حكيم بن معاوية القشيري رضی اللہ عنہ عن أبيه قلت: يا رسول الله! ما حق زوج أحدنا عليه؟ قال: «أن تطعمها وتكسوها»[1]

[حکیم بن معاویہ قشیری اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم پر بیوی کے کیا حقوق ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اسے کھلائے اور پہنائے]

قال في ذكر النساء: «ولهن عليكم رزقهن، وكسوتهن بالمعروف»[2] (أخرجه مسلم)

[آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اور تمھارے ذمے ان (عورتوں) کو اچھے طریقے سے کھلانا اور پہنانا ہے]

وعن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: «اليد العليا خير من اليد السفلىٰ ويبدأ أحدكم بمن يعول» تقول المرأة: أطعمني أو طلقني.[3] (رواه الدارقطني، وإسناده حسن)

[اوپر والا ہاتھ (خرچ کرنے والا) نیچے والے ہاتھ (مانگنے والے) سے بہتر ہے، تم میں سے کوئی (خرچ کی) ابتدا اس سے کرے جس کی کفالت کا وہ ذمہ دار ہے۔ اس کی بیوی کہتی ہے: مجھے کھانے پینے کو دو، وگرنہ مجھے طلاق دے دو]

"وعن سعيد بن المسيب في الرجل لا يجد ما ينفق على أهله قال: يفرق بينهما" أخرجه سعيد بن منصور عن سفيان عن أبي الزناد عنه. قال: قلت لسعيد: سنة؟ فقال: سنة، وهذا مرسل قوي. وعن عمر رضی اللہ عنہ أنه كتب إلى أمراء الأجناد في رجال غابوا عن نسائهم أن يأخذوهم بأن ينفقوا أو يطلقوا. الحديث (أخرجه الشافعي، ثم البيهقي بإسناد حسن، بلوغ المرام)[4] والله تعالىٰ أعلم

[سعید بن المسیب سے اس آدمی کے متعلق روایت ہے، جو اپنے اہل پر خرچ کرنے کو مال نہیں پاتا ہے، چناں چہ وہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان جدائی کرا دی جائے گی۔ اس کو سعید بن منصور نے سفیان سے بیان کیا ہے، انھوں نے ابو الزناد سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے سعید بن المسیب سے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں سنت ہے۔ یہ قوی مرسل ہے عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٢)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)
[3] سنن الدارقطني (٣/ ٢٩٥)
[4] بلوغ المرام (١١٥٨) نیز دیکھیں: سنن سعید بن منصور (٢/ ٥٥)

انھوں نے امرائے عساکر کی طرف ان مردوں کے بارے میں لکھا، جو اپنی عورتوں سے غائب ہیں کہ وہ نفقہ دیں یا طلاق دیں]

کتبہ: محمد عبد الله (٢٥/ جمادی الآخرہ ١٣٣٥ھ)

سوال زید کو نکاح کیے ہوئے عرصہ چودہ سال کا ہوا اور اس درمیان میں خرچ ایک پیسہ نہیں دیا اور زید کہتا ہے کہ نہ رکھوں گا، نہ طلاق دوں گا، نہ خرچ دوں گا۔ غرض بیوی رکھنے سے زید کو صاف انکار ہے تو اس صورت میں زید کا نکاح ٹوٹا یا نہیں اور زید کی بیوی دوسرا نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب ان صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی نہ زید کا نکاح ٹوٹا اور نہ زید کی بیوی دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ ہاں اگر زید اسی قدر کہتا ہے کہ میں اپنی بیوی کو نہیں رکھوں گا، تو ممکن تھا کہ زید کا یہ قول بدلالتِ حال یا بقرینۂ دیگر طلاق کنائی سمجھا جاتا، لیکن جب زید اس قول کے ساتھ صاف لفظوں میں طلاق دینے سے انکار کرتا ہے تو اس کا قولِ مذکور طلاق کنائی بھی نہیں ہو سکا۔ اب اس صورت میں یہی ایک چارہ کار ہے کہ زید کی بیوی حاکم سے درخواست کرے کہ ہمارے حقوق زید سے ادا کرائے جائیں، ورنہ اس سے ہم کو طلاق دلوا دی جائے۔ اگر طلاق بھی نہ دے تو مجھ میں اور زید میں تفریق کر دی جائے کہ میں اس ناقابلِ برداشت مصیبت سے نجات پا جاؤں۔

"نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية" (٢/ ٣٦٣) میں ہے:

"حديث: قال عليه السلام: «لا ضرر ولا ضرار في الإسلام» روي من حديث عبادة بن الصامت و ابن عباسؓ و أبي سعيد الخدري وأبي هريرة وأبي لبابة وثعلبة بن مالك و جابر بن عبد الله و عائشة ﷺ" اھ

[آپ ﷺ نے فرمایا: "(پہلے پہل) کسی کو نقصان پہنچانا اور تکلیف دینا جائز ہے اور نہ بدلے کے طور پر نقصان پہنچانا اور تکلیف دینا" اسے عبادہ بن صامت، ابن عباس، ابو سعید خدری، ابو ہریرہ، ابو لبابہ، ثعلبہ بن مالک، جابر بن عبد اللہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے]

"بلوغ المرام مع شرحه سبل السلام" (٢/ ١٢٥) میں ہے:

عن جابر، في حديث الحج بطوله قال في ذكر النساء: «ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف» [1] (أخرجه مسلم)

[آپ ﷺ نے عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اور تمھارے ذمے ان (عورتوں) کو اچھے طریقے سے کھلانا اور پہنانا ہے]

ایضاً (٢/ ١٢٦) میں ہے:

وعن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: «اليد العليا خير من اليد السفلىٰ و يبدأ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢١٨)

أحدكم بمن يعول» تقول المرأة: أطعمني أو طلقني.[1] (رواه الدارقطني، وإسناده حسن)

[اوپر والا ہاتھ (خرچ کرنے والا) نیچے والے ہاتھ (مانگنے والے) سے بہتر ہے۔ تم میں سے کوئی (خرچ کی) ابتدا اس سے کرے جس کی کفالت کا وہ ذمے دار ہے۔ اس کی بیوی کہتی ہے: مجھے کھانے پینے کو دو، نہیں تو مجھے طلاق دے دو]

ایضاً (۲/ ۱۲۷) میں ہے:

"وعن سعيد بن المسيب في الرجل لا يجد ما ينفق قال: يفرق بينهما. أخرجه سعيد بن منصور عن سفيان عن أبي الزناد، وقال: قلت لسعيد بن المسيب: سنة؟ قال: سنة، وهذا مرسل قوي، و مراسيل سعيد معمول بها لما عرف من أنه لا يرسل إلا عن ثقة، وقد أخرج الدارقطني والبيهقي من حديث أبي هريرة مرفوعاً بلفظ: قال رسول اللهﷺ في الرجل لا يجد ما ينفق على امرأته قال: يفرق بينهما"

[سعید بن المسیب سے اس آدمی کے متعلق روایت ہے، جو اپنے اہل پر خرچ کرنے کو مال نہیں پاتا ہے، چناں چہ وہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان جدائی کرا دی جائے گی۔ اس کو سعید بن منصور نے سفیان سے بیان کیا ہے، انھوں نے ابو الزناد سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے سعید بن المسیب سے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں سنت ہے۔ یہ قوی مرسل ہے، اور مراسیلِ سعید معمول بہا ہیں، کیوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ وہ صرف ثقہ سے ہی سے ارسال کرتے ہیں۔ امام دارقطنی اور بیہقی رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ میں روایت کی ہے: رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے متعلق فرمایا، جسے اپنی بیوی پر خرچ کرنے کے لیے مال میسر نہ ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے درمیان جدائی کرا دی جائے]

ایضاً (۲/ ۱۲۸) میں ہے:

"وعن عمر رضي الله عنه أنه كتب إلى أمراء الأجناد في رجال غابوا عن نسائهم أن يأخذوهم بأن ينفقوا أو يطلقوا فإن طلقوا بعثوا بنفقة ما حبسوا. أخرجه الشافعي ثم البيهقي بإسناد حسن" اهـ والله تعالىٰ أعلم

[عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے لشکروں کے امرا کو ان لوگوں کے بارے میں خط لکھا جو اپنی بیویوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہوئے ہیں کہ ان کو پکڑ کر کہیں کہ وہ اپنی بیویوں کو نفقہ بھیجیں یا ان کو طلاق دے دیں۔ اگر وہ ان کو طلاق دیں تو جتنی دیر انھوں نے ان کو روکا ہے، اس مدت کا بھی نفقہ دیں] (کتبہ: ۷/ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ)

[1] سنن الدارقطني (۳/ ۲۹۵)

سوال ایک مرد نے اپنی عورت کو چار برسوں کے قریب سے چھوڑ دیا ہے اور اس کو ماں کہا ہے۔ اس کے پاس آتا ہے اور نہ اس کو کچھ خرچ بھیجتا ہے اور نہ اس کی خبر لیتا ہے۔ تین برسوں سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ سفر میں وہ بہت دور جا بیٹھا ہے اور اس کو خط بھی بھیجا گیا عورت کی طرف والوں کا کہ تم طلاق دے دو یا اس سے میل کرو اور زمانے کے موافق اس کی خبر لو، مگر اس نے اس کا کچھ جواب نہیں بھیجا، اس نے پھر ایک خط رجسٹری کر کے اس کے پاس بھیجا، اس کی رسید سرکاری ضابطہ سے ملی، مگر اس نے کچھ جواب اپنے گھر نہیں بھیجا، پھر اس صورت میں اس عورت کے واسطے اس مرد کے پنجے سے رہائی اور کسی دوسرے سے نکاح کر لینے کی کوئی صورت شرع میں ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں اس عورت کے واسطے اس مرد کے پنجے سے رہائی اور کسی مرد سے نکاح کر لینے کی صورت یہ ہے کہ عورت حاکمِ شرع کے روبرو اس بات کی درخواست کرے کہ میرا شوہر اس قدر مدت سے مجھے اپنی ماں کہہ کر غائب ہے۔ میرے لیے کچھ خرچ چھوڑ گیا ہے، نہ خرچ بھیجتا ہے نہ میرے کسی خط کا جواب دیتا ہے۔ اب میرے گزران کی کوئی صورت اس مرد کے نکاح میں رہ کر نہیں ہے، لہٰذا درخواست کرتی ہوں کہ میرا نکاح اس مرد سے فسخ کر دیا جائے کہ عدت کا زمانہ کاٹ کر کسی دوسرے سے اپنا نکاح کر لوں۔

حاکم مذکور اس عورت سے اس بات کے گواہان لے کر کہ اس کا شوہر فی الواقع اتنی مدت سے غائب ہے نہ خرچ چھوڑ گیا ہے اور نہ خرچ بھیجتا ہے، نکاح مذکور کو فسخ کر کے حکم دے کہ بعد انقضائے عدت کے دوسرے سے اپنا نکاح کر لے۔ شامی (۲/ ۱۲ے چھاپہ مصر) میں فتاویٰ "قارىء الهداية" سے منقول ہے:

"سئل عمن غاب زوجها، ولم يترك لها نفقة؟ فأجاب: إذا أقامت بينة على ذلك وطلبت فسخ النكاح من قاض يراه ففسخ نفذ" اھ

[اس عورت کے بارے میں سوال کیا گیا جس کا شوہر غائب ہو اور اس کے لیے نفقہ نہ چھوڑ کر گیا ہو تو انھوں نے جواب دیا کہ جب وہ حجت قائم کر دے اور قاضی سے فسخِ نکاح کا مطالبہ کرے، جو اس معاملے کا بخوبی علم رکھتا ہو تو وہ نکاح فسخ کر دے تو اس کا یہ فیصلہ نافذ ہوگا]

ہدایہ (۲/ ۵۸۵ چھاپہ مصطفائی) میں ہے: قال عليه السلام: «لا ضرر و لا ضرار في الإسلام»[1] [آپ ﷺ نے فرمایا: (پہلے پہل) کسی کو نقصان پہنچانا اور تکلیف دینا جائز ہے اور نہ بدلے کے طور پر نقصان پہنچانا اور تکلیف دینا] "نصب الراية لأحاديث الهداية" (۲/ ۳۸۳) میں ہے:

"قلت: روي من حديث عبادة بن الصامت وابن عباس وأبي سعيد الخدري وأبي هريرة وأبي لبابة وثعلبة بن مالك وجابر بن عبدالله وعائشة" اھ

[میں کہتا ہوں کہ اسے عبادہ بن صامت، ابن عباس، ابو سعید خدری، ابو ہریرہ، ابولبابہ، ثعلبہ بن مالک،

---

[1] المعجم الأوسط (۵/ ۳۲۸) نیز دیکھیں: مسند أحمد (۱/ ۳۱۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۳۴۰)

جابر بن عبداللہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے]

کتاب "ظفر اللاضي بما يجب في القضاء على القاضي" (ص: ١٢٧) میں ہے:

"قد أمر الله سبحانه وتعالىٰ بإحسان عشرة الزوجات، فقال: ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ونهىٰ عن إمساكهن ضرارا، وأمر بالإمساك بالمعروف والتسريح بالإحسان، فقال: ﴿فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ٢٢٩] ونهى عن مضارتهن فقال عزوجل: ﴿وَلَا تُضَارُوْهُنَّ﴾ فالغائب إن حصل مع زوجته التضرر بغيبته جاز لها أن ترفع أمرها إلى حكام الشريعة، ولهم أن يخلصوها من هذا الضرر القانع، هذا على تقدير أن الغائب ترك لها ما يقوم بنفقتها، وأنها لم تتضرر من هذه الحيثية بل، من حيثية كونها لا مزوجة ولا أيمة، أما إذا كانت متضررة لعدم وجود ما تستنفقه مما تركه الغائب فالفسخ لذلك على انفراده جائز، ولو كان حاضرا فضلا عن أن يكون غائبا، وهذه الآيات التي ذكرناها، تدل على ذلك" انتهى

[اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیویوں کے ساتھ احسان سے رہنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ اس کا فرمان ہے: "ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو" اور انھیں تکلیف دینے کے لیے روکنے سے منع کیا اور ان کو اچھے طریقے سے رکھ لینے اور نیکی کے ساتھ چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ اس نے فرمایا: "پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔" نیز ان کو تکلیف دینے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: "اور انھیں تکلیف نہ دو۔" اب جو شخص غائب ہے اور اس کے غیب رہنے کی وجہ سے اس کی بیوی کو تکلیف پہنچتی ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ حکامِ شریعت کے سامنے اپنے معاملہ پیش کرے اور ان حکام کے لیے جائز ہے کہ وہ اس مسلسل ضرر سے اس کو گلوخلاصی کرائیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب غائب خاوند نے بیوی کے لیے وہ کچھ چھوڑا ہو جو اس کے نفقے کے قائم مقام بن سکے۔ اب اس کو اس اعتبار سے تو تکلیف نہیں ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ نہ شادی شدہ تصور ہوتی ہے نہ بے نکاحی، لیکن جب عورت کو اس اعتبار سے ضرر پہنچے کہ غائب خاوند نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی، جسے وہ بطورِ نفقہ استعمال کر سکے تو خالی اس وجہ سے عورت کے لیے نکاح فسخ کروانا بھی جائز ہے، تو جب اس کا خاوند حاضر ہو تو اس کے غائب ہونے کی صورت میں کیوں جائز نہیں ہوگا؟ مذکورہ بالا آیات اس پر دلالت کرتی ہیں]

اسی صفحہ میں ہے:

"أما إذا لم يترك لها ما تحتاج إليه فالمسارعة إلىٰ تخليصها وفك أسرها ودفع الضرر عنها واجبة" اهـ

[جب شوہر نے اپنی بیوی کے لیے وہ کچھ نہ چھوڑا ہو، جس کی وہ محتاج ہے تو اس کی بیوی کی گلو خلاصی کرانے کے لیے جلدی کرنا اور اس کو آزاد کرا کر اس کی تکلیف کو دور کرنا واجب ہے]

کتبہ: محمد عبد اللّٰہ (مہر مدرسہ)

سوال اس فتوے میں حاکمِ شرع کا لفظ لکھا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے اور اس فتوے کے متعلق کس طرح کارروائی کی جائے؟

جواب اس فتوے کے متعلق اس طرح کارروائی کی جائے کہ اس مقدمہ میں مرد کی جانب سے مرد کے لوگوں میں سے اور عورت کی جانب سے عورت کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص کو جو شرعاً پنچ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں، پنچ مقرر کریں۔ یہ پنچ حاکمِ شرع کا حکم رکھتے ہیں، پھر ان پنچوں کے روبرو اس مقدمہ کو پیش کریں۔ پنچ لوگ حسبِ قانونِ شرع عورت سے گواہان لے کر شرعی فیصلہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ [سورۂ نساء، رکوع ٦]

[اور اگر ان دونوں کے درمیان مخالفت سے ڈرو تو ایک منصف مرد کے گھر والوں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو] والله أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبداللّٰہ

سوال[1] کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ زید کو نکاح کیے ہوئے تقریباً بارہ برس ہوئے، اس نے اپنی بیوی سے اب تک کچھ کلام وغیرہ نہیں کیا اور اس کے نان ونفقہ کی بھی خبر گیری نہیں کرتا، اس سے لوگوں نے بارہا کہا کہ تو اپنی بیوی سے کلام وغیرہ نہیں کرتا اور اس کے نان ونفقہ کی خبر نہیں لیتا تو اس کو طلاق ہی دے دے، اس پر بھی اس نے کچھ توجہ نہیں دی۔ اب اس کی بیوی کے والدین چاہتے ہیں کہ یا تو زید اپنی بیوی سے معاملہ دنیوی رکھے اور نان ونفقہ دے یا طلاق دے دے تو اس پر موافق شرع شریف کے کس طرح عمل کیا جائے۔

جواب اس صورت میں زید کی بیوی حاکم کے یہاں اس مضمون کا استغاثہ دائر کرے کہ میرے خاوند (زید) کو حکم دیا جائے کہ یا تو میرے حقوق ادا کرے یا مجھے طلاق دے دے، تاکہ میں دوسرا عقد کر کے اپنی زندگی بسر کروں اور اگر زید مفت طلاق نہ دے اور معاوضہ طلب کرے اور اس کی بیوی طلاق کا معاوضہ دے سکتی ہو تو حاکم بمعاوضہ طلاق دلوا دے۔ اگر زید اس پر بھی راضی نہ ہو تو اگر ممکن ہو کہ حاکم فریقین کے لوگوں میں سے ثالث مقرر کر کے اس مقدمہ کو ان ثالثوں کے سپرد کر دے تو کر لے، پھر وہ ثالثین نیک نیتی سے دونوں کے حق میں جو فیصلہ بہتر جانیں کر دیں اور اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو حاکم ان دونوں میں تفریق کرا دے اور بعد تفریق اگر عورت چاہے تو اس کا دوسرا نکاح کرا دیا جائے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (سورۂ بقرہ، رکوع: ٢٨)

''عورتوں کے مردوں پر اتنے ہی حقوق ہیں، جتنے مردوں کے عورتوں پر ہے۔''

وقال تعالیٰ: ﴿وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (سورۂ نساء، رکوع: ٣)

''اور ان سے بھلے طریقے سے زندگی گزار دو۔''

---

[1] فتاویٰ نذیریہ (٥٢٣/٢)

"عن حكيم بن معاوية عن أبيه قال: قلت: يا رسول الله! ما حق زوج أحدنا عليه؟ قال: «تطعمها إذا أكلت، وتكسوها إذا اكتسيت»[1] الحديث.

[میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب خود کھاؤ تو ان کو بھی کھلاؤ اور جب خود پہنو تو ان کو بھی پہناؤ]

قال في سبل السلام (٢/ ٧٨): دل الحديث على وجوب نفقة الزوج وكسوتها. اهـ

[سبل السلام (۲/ ۱۲۵) میں ہے کہ یہ دلیل ہے کہ عورت کا روٹی کپڑا مرد کے ذمے واجب ہے]

وعن جابر في حديث الحج بطوله قال في ذكر النساء: ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف"[2] أخرجه مسلم.

[آپ ﷺ نے عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اور تمھارے ذمے ان (عورتوں) کو اچھے طریقے سے کھلانا اور پہنانا ہے]

قال في سبل السلام (٢/ ١٢٥): وهو دليل على وجوب النفقة والكسوة للزوجة كما دلت له الآية. اهـ

[یہ (حدیث) بیوی کے لیے نفقے اور لباس کے وجوب کی دلیل ہے، جس طرح آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے]

وعن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: «اليد العليا خير من اليد السفلى، ويبدأ أحدكم بمن يعول» تقول المرأة: أطعمني أو طلقني. رواه الدارقطني وإسناده حسن.[3]

[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے اور جن کی عیالداری تمھارے ذمہ ہے، ان سے پہلے شروع کرو، ایسا نہ ہو کہ عورت مطالبہ کرے کہ یا مجھے کھانے کو دے یا طلاق دے۔ دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے]

قال: في سبل السلام (٢/ ١٢٦): واستدل على أن للزوجة إذا أعسر زوجها بنفقتها طلب الفراق. اهـ

[اس میں دلیل ہے کہ جب خاوند خرچ نہ دے سکے تو وہ اس سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے]

وعن عمر رضي الله عنه أنه كتب إلى أمراء الأجناد في رجال غابوا عن نسائهم أن يأخذوهم بأن ينفقوا أو يطلقوا إن طلقوا بعثوا بنفقة ما حبسوا.[4] أخرجه الشافعي، ثم البيهقي

[1] أخرجه أحمد (٤/ ٤٤٦) والنسائي وأبو داود وابن ماجه، و علق البخاري بعضه، وصححه ابن حبان. (سبل السلام: ٢/ ٧٨) أبو سعيد محمد شرف الدين.
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)
[3] سنن الدارقطني (٣/ ٢٩٥)
[4] بلوغ المرام، رقم الحديث (١١٥٩)

بإسناد حسن. قال في سبل السلام (٢/ ١٢٨): فيه دليل على أنها عند عمر رضی اللہ عنہ لا يسقط النفقة بالمطل في حق الزوجة، وعلى أنه يجب أحد الأمرين على الأزواج: الإنفاق أو الطلاق" اهـ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوجیوں کے سپہ سالاروں کو ان لوگوں کے متعلق حکم بھیجا، جو عورتوں سے علیحدہ ہو کر باہر چلے گئے تھے کہ ان کو بلا کر کہو کہ یا تو اپنی بیویوں کو خرچ بھیجیں یا طلاق بھیج دیں۔ اگر طلاق دے دیں تو جتنی مدت سے انھوں نے ان عورتوں کو روک رکھا تھا، اتنی مدت کا خرچ بھیج دیں۔ امام شافعی اور دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے، اس میں دلیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک دیر ہو جانے کی وجہ سے بیوی کا خرچ ساقط نہیں ہو جاتا اور خاوند پر فرض ہے کہ یا تو عورت کو خرچ دے یا اسے طلاق دے۔

وقال الله تعالیٰ: ﴿وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ (سورۂ بقرة، رکوع: ٢٩)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کو تکلیف دینے کے لیے روک نہ رکھو اور زیادتی نہ کرو۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن امرأة ثابت بن قيس أتت النبي ﷺ فقالت: يا رسول الله ﷺ! ثابت بن قيس لا أعيب عليه في خلق ولا دين، ولكني أكره الكفر في الإسلام، فقال رسول الله ﷺ «أتردين عليه حديقته؟» فقالت: نعم فقال رسول الله ﷺ: «اقبل الحديقة، وطلقها تطليقة»[1] (رواه البخاري)

[ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول! ثابت بن قیس کے دین اور اخلاق میں مجھے کوئی عیب معلوم نہیں ہوتا، لیکن میں اسلام میں ناشکری کو ناپسند کرتی ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اسے واپس کر دے گی؟ کہنے لگی: ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے ثابت کو فرمایا: تو باغ قبول کر لے اور اس کو طلاق دے دے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا]

قال في سبل السلام (ص: ٩٣): فيه دليل على شرعية الخلع وصحته، وأنه يحل أخذ العوض من المرأة. اهـ

[سبل السلام (ص: ۹۳) میں ہے، اس میں دلیل ہے کہ خلع مشروع اور صحیح ہے اور عورت سے عوضانہ میں مال واپس لے لینا جائز ہے]

وقال الله تعالیٰ: ﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ٦]

[اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم کو ان کی بے اتفاقی کا خطرہ ہو تو مرد و عورت کی طرف سے ایک ایک حاکم مقرر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧١)

کر لو، اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں گے تو اللہ ان میں اتفاق پیدا کر دے گا]

وعن سعيد بن المسيب في الرجل لا يجد ما ينفق على أهله قال: يفرق بينهما. أخرجه سعيد بن منصور عن سفيان عن أبي الزناد قال: قلت لسعيد بن المسيب: سنة؟ قال: سنة، وهذا مرسل قوي.[1]

[سعید بن مسیّب نے اس آدمی کے متعلق فتویٰ دیا، جو اپنی بیوی کو خرچ نہ دے سکے کہ ان کو ایک دوسرے سے علاحدہ کروا دیا جائے، کسی نے سعید سے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ فرمایا: ہاں سنت ہے]

قال في سبل السلام (٢/ ١٢٧): و مراسيل سعيد معمول بها لما عرف من أنه لا يرسل إلا عن ثقة، قال الشافعي والذي يشبه أن يكون قول سعيد سنة، سنة رسول اللهﷺ. اهـ

[سبل السلام (۲/ ۱۲۷) میں ہے کہ سعید کی تمام مرسل حدیثیں مقبول ہیں، کیوں کہ وہ صرف ثقہ لوگوں ہی سے روایت کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا: سعید جب "سنت" کہتے ہیں تو اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہوتی ہے]

وفيه أيضاً (٢/ ١٢٧): وقد أخرج الدارقطني والبيهقي من حديث أبي هريرة مرفوعاً بلفظ: قال رسول اللهﷺ في الرجل لا يجد ما ينفق على امرأته قال: «يفرق بينهما». اهـ
والله أعلم بالصواب

[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنی بیوی کو خرچ نہ دے سکے، اس میں علاحدگی کرا دی جائے۔ اسے دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے] کتبہ: محمد عبداللہ (مہر مدرسہ احمدیہ)

سید محمد ابو الحسن — سید محمد نذیر حسین — سید محمد عبد السلام

خلع لینے والی عورت کی عدت:

سوال زید نے اپنی لڑکی ہندہ کا ایک شخص سے نکاح کر دیا، بعد گزرنے کچھ عرصہ کے ہندہ نے دینِ مہر اپنے شوہر کو واپس دے کر خلع طلاق لے لی ہے۔ اب وہ عورت مختلعہ کتنے دن عدت گزار کر دوسرا نکاح کر سکتی ہے؟

جواب مختلعہ عورت کی عدت صرف ایک حیض ہے۔

"عن الربيع بنت معوذ بن عفراء أنها اختلعت على عهد رسول اللهﷺ فأمرها النبيﷺ أو أمرت أن تعتد بحيضة"[2]

[ربیع بنت معوذ بن عفرا رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے دور میں خلع لیا تو نبی کریم ﷺ

---

① بلوغ المرام (١١٥٨) نیز دیکھیں: سنن سعيد بن منصور (٢/ ٥٥)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٥)

نے ان کو حکم دیا یا انھیں حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض عدت گزاریں]

"عن ابن عباس أن امرأة ثابت بن قيس اختلعت من زوجها على عهد رسول الله ﷺ فأمرها النبي ﷺ أن تعتد بحيضة هذا حديث حسن غريب"[1] (سنن ترمذي، ص: ٢٠٢)

والله أعلم بالصواب

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے خاوند (ثابت رضی اللہ عنہ) سے خلع لیا تو نبیِ مکرم ﷺ نے انھیں ایک حیض عدت گزارنے کا حکم دیا]

كتبه: محمد عبد الله

مفقود الخبر شوہر کے انتظار کی مدت اور اس کی جائیداد کا تصرف:

سوال ① مفقود الخبر کتنے برس کے بعد مردہ متصور ہوگا؟

② بانتظار شخص مفقود الخبر جائداد متوفی کس کے قبضے میں رہے گی؟

جواب ① مفقود سال بھر کے بعد مردہ متصور ہوگا۔ حضرت ابن مسعود و ابن عباس اور سعید بن المسیب رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔ بخاری شریف میں ہے:

باب حكم المفقود في أهله وماله، وقال ابن المسيب: إذا فقد في الصف عند القتال تربص امرأته سنة، واشترى ابن مسعود جارية، والتمس صاحبها سنة، فلم يجده و فقد، فأخذ يعطي الدرهم والدرهمين وقال: اللهم عن فلان، فإن أتى فلي وعليّ، وقال: هكذا فافعلوا باللقطة، وقال ابن عباس نحوه، وعن يزيد مولى المنبعث أن النبي ﷺ سئل عن ضالة الغنم فقال: «خذها فإنما هي لك أو لأخيك أو للذئب» وسئل عن ضالة الإبل فغضب، واحمرت وجنتاه فقال: «مالك ولها؟ معها الحذاء والسقاء، تشرب الماء، وتأكل الشجر حتى يلقاها ربها» وسئل عن اللقطة فقال: «اعرف وكاءها و عفاصها، وعرفها سنة فإن جاء من يعرفها، وإلا فاخلطها بمالك.[2] انتهى

[اس بارے میں باب کہ جب کوئی شخص گم ہوجائے تو اس کے گھر والوں اور جائیداد کا کیا حکم ہوگا۔ ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا کہ جنگ کے وقت صف کے اندر اگر کوئی شخص گم ہوا تو اس کی بیوی کو ایک سال اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ (اس کے بعد دوسرا نکاح کرنا چاہیے)۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کسی سے ایک لونڈی خریدی (اور مالک اس کی قیمت لیے بغیر کہیں چلا گیا اور گم ہوگیا) انھوں نے اس کے پہلے مالک کو

---

① المصدر السابق.

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٦)

ایک سال تک تلاش کیا، پھر جب وہ نہ ملا تو (وہ اس لونڈی کی قیمت سے غریبوں کو) ایک ایک دو دو درہم دینے لگے اور ساتھ یہ دعا کی: اے اللہ! یہ فلاں کی طرف سے ہے (یعنی اس کے پہلے مالک کی طرف سے) پھر اگر وہ (آنے کے بعد) اس صدقے سے انکار کرے گا تو (اس کا ثواب) مجھے ملے گا اور لونڈی کی قیمت ادا کرنا میرے ذمے واجب ہوگی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اسی طرح تم لقطہ کے ساتھ کیا کرو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔ یزید مولیٰ منبعث بیان کرتے ہیں کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گم شدہ بکری سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے پکڑ لو، کیوں کہ یا تو وہ تمھاری ہوگی (ایک سال اعلان کر کے مالک نہ ملنے کی صورت میں) یا تمھارے کسی بھائی کی ہوگی یا پھر بھیڑیے کی ہوگی (اگر یہ انھی جنگلوں میں پھرتی رہی) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گم شدہ اونٹ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں آ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں رخسار سرخ ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھیں اس سے کیا غرض؟ اس کے پاس (مضبوط) کھر ہیں (جس سے اسے چلنے میں دشواری نہ ہوگی) اور اس کے پاس مشکیزہ ہے، جس سے وہ پانی پیتا رہے گا اور درخت کے پتے کھاتا رہے گا، یہاں تک کہ اس کا مالک اسے پا لے گا'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی رسی اور اس کے ظرف کو معلوم کر کے ایک سال تک اس کا اعلان کرو۔ پھر اگر کوئی شخص آ جائے جو اسے پہچانتا ہو (تو اسے دے دو) ورنہ اسے اپنے مال کے ساتھ ملا لو]

حنفی مذہب میں یومِ ولادت سے ایک سو بیس یا ایک سو دس یا ایک سو پانچ یا جب اس کے اَقران و اَمثال میں سے کوئی باقی نہ رہے، یا نوے برس کے بعد علی اختلاف الروایات مردہ متصور ہوگا اور حنفیہ نے نوے برس والی روایت کو مفتی بہ اور مرجح ٹھہرایا ہے۔ واللہ أعلم.

(۲) اگر اس متوفی کے علاوہ مفقود کے دوسرے ورثہ نہ ہوں تو کل جائداد اور بصورت ہونے دوسرے ورثہ کے ان کو دے کر جو حصہ مفقود کا بچ رہے، اسی کے قبضے میں مفقود کی حاضری یا انقضائے مدت تک رہے گا، جس کے قبضے میں ہے، بشرطیکہ اس سے کوئی خیانت ظاہر نہ ہو، فقط۔ واللہ أعلم بالصواب

کتبہ: ابو الفیاض محمد عبد القادر، مدرس مدرسہ احمدیہ آرہ۔ (۸؍ ستمبر ۹۵ء)

اگر عورت کے دوسرے نکاح کے بعد مفقود الخبر شوہر واپس آ جائے؟

سوال جو شخص مفقود الخبر ہو اور بعد انقضائے مدت کے جو شرع شریف سے ثابت ہے، اس کی بی بی نے نکاح کر لیا اور شوہرِ ثانی سے لڑکے بھی پیدا ہوئے اور اب اس کا شوہرِ اول باہر سے آیا تو وہ اپنی بی بی کو پا سکے گا، مع لڑکے کے یا صرف بی بی کو پائے گا یا کسی کو نہیں؟

جواب اس صورت میں شوہر کو اختیار ہے، چاہے بی بی لے لے یا جو مہر بی بی کو دے چکا ہے، وہ مہر واپس کر لے اور

لڑکے نہیں پا سکتا، کیونکہ یہ لڑکے شوہرِ ثانی سے بنکاح صحیح و جائز پیدا ہوئے ہیں، پس یہ لڑکے شوہرِ ثانی کے لڑکے ہیں، نہ کہ شوہرِ اول کے۔ "نصب الراية لأحاديث الهداية" (٢/ ١٦٥) میں ہے:

"عن يحيىٰ بن جعدة أن رجلا انتسفته الجن على عهد عمر بن الخطاب فأتت امرأته عمر فأمرها أن تتربص أربع سنين ثم أمر وليه بعد أربع سنين أن يطلقها، ثم أمرها أن تعتد، فإذا انقضت عدتها تزوجت فإن جاء زوجها خير بين امرأته والصداق"[1]

(رواه ابن أبي شيبة في مصنفه)

[یحییٰ بن جعدہ سے مروی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جنوں نے ایک شخص کو غائب کر دیا۔ اس کی بیوی عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی تو انھوں نے اسے چار سال تک (گم شدہ خاوند کا) انتظار کرنے کا حکم دیا۔ پھر چار سال گزرنے کے بعد (جب اس کا خاوند نہ آیا) عمر رضی اللہ عنہ نے اس (گم شدہ) کے ولی کو حکم دیا کہ وہ اس (عورت) کو طلاق دے دے۔ پھر انھوں نے اس (عورت) کو عدت گزارنے کا حکم دیا، پھر جب اس کی عدت پوری ہو جائے تو وہ شادی کر لے۔ پھر اگر اس کا سابقہ شوہر آ جائے تو اسے اس کی بیوی یا حق مہر لینے کا اختیار دیا جائے]

کیا عورت کے اپنے خاوند کو چچا کہنے پر کفارہ لازم آتا ہے؟

سوال زید اور اس کی منکوحہ ہندہ کے درمیان جھگڑا ہوا۔ زید نے ہندہ کو مارا اور مار کر باہر چلا گیا، اس پر ہندہ نے کہا: اچھا چچا بچ کر نکل گئے، ورنہ بتاتی۔ اب بکر کہتا ہے کہ چچا نہیں، بلکہ ابا کہا اور زید و عمرو کہتے ہیں کہ نہیں چچا ہی کہا ہے۔ کیا اب کفارہ لازم آتا ہے؟ اگر لازم آتا ہے تو کون ادا کرے اور کس کو ادا کیا جائے؟ کیا ایسے کفارے کے مستحق یتیم خانہ کے لڑکے ہو سکتے ہیں؟ حقیر محمد شفیع ملازم نتھا کارخانہ کاٹن ملسن، کانپور۔

جواب عورت کے اپنے خاوند کو چچا یا ابا کہنے سے کفارہ نہیں لازم آتا ہے۔ ہاں یہ جھوٹ بات ہے، جس سے عورت کو توبہ کرنا چاہیے۔ مرد جب اپنی عورت کو محرمات میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دے تو یہ شرعاً ظہار کہلاتا ہے، اس سے مرد پر کفارہ لازم آتا ہے۔ ایسے کفارے کے مستحق مساکین ہوتے ہیں۔ یتیم خانے کے لڑکے مسکین بھی اس کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (٢٩/ جمادى الأول ١٣٣٢هـ)

کیا بیوی کو مائی کہنے پر کفارہ لازم آتا ہے؟

سوال اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو مائی کہہ بیٹھے تو کفارہ دینا لازم آئے گا یا نہیں؟ درصورت اول کیا دینا ہوگا اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب صورتِ مسئولہ میں کفارہ دینا قرآن سے ثابت ہے نہ حدیث سے نہ کسی امام یا اور اکابر دین کے قول سے،

[1] مصنف عبد الرزاق (٧/ ٨٥) سنن سعيد بن منصور (١/ ٤٠١) مصنف ابن أبي شيبة (٣/ ٥٢٢) سنن الدارقطني (٢/ ٤٢١)

کیونکہ کفارہ دینا ظہار کی حالت میں فرض ہے، جیسا کہ باری تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآءِ هِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا﴾ [المجادلة: ٣، ٤]

[اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اس سے رجوع کر لیتے ہیں جو انھوں نے کہا، تو ایک گردن آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، یہ ہے وہ (کفارہ) جس کے ساتھ تم نصیحت کیے جاؤ گے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔ پھر جو شخص نہ پائے تو دو پے در پے مہینوں کا روزہ رکھنا ہے، اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے]

ظہار کہتے ہیں اپنی بیوی کو کسی محرمات کے ایسے عضو سے تشبیہ دینے کہ جس کا دیکھنا اس مرد پر ہمیشہ حرام ہو، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں مرقوم ہے:

"الظهار تشبيه الزوجة أو جزء منها شائع أو معبر به عن الكل بما لا يحل النظر إليه من المحرمة على التأبيد"[1]

[ظہار کا مطلب ہے کہ اپنی بیوی یا اس کے کسی حصے کو محرمات کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دینا جس کا دیکھنا اس مرد پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو]

"عنایہ شرح ہدایہ" میں ظہار کے معنی لغوی اور اصطلاحی کی تحقیق میں لکھا ہے:

"والظهار في اللغة: قول الرجل من امرأته: أنت علي كظهر أمي، وفي اصطلاح الفقهاء: تشبيه المنكوحة بالمحرمة على سبيل التأبيد"[2]

[ظہار کا لغوی معنی یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو کہے: تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں منکوحہ بیوی کو ہمیشہ کے لیے حرام رشتوں سے تشبیہ دینا ہے]

تو کسی شخص کا اپنی بیوی کو ماں کہنا ظہار نہ ہوا، بلکہ قول لغو ہوا، اس سے کفارہ دینا نہیں لازم آئے گا، ہاں بات مکروہ البتہ ہے، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

"لو قال لها: أنت أمي. لا يكون مظاهرا، و ينبغي أن يكون مكروها"[3] والله أعلم بالصواب

---

1. الفتاویٰ الهندية (١/ ٥٠٥)
2. العناية شرح الهداية للبابرتي (٤/ ٢٤٦)
3. الفتاویٰ الهندية (١/ ٥٠٧)

[اگر وہ اس (اپنی بیوی) کو کہے کہ تو میری ماں ہے تو وہ ظہار کرنے والا شمار نہ ہوگا۔ ہاں ایسا کرنا مکروہ ہے]

المجیب محمد ضمیر الحق الآروي، عفا الله عنه. الجواب صحیح. کتبه: محمد عبد الله. إنه لحق. کتبه: أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المبارکفوري.

ایلا کے بعد رجوع کا طریقہ کار:

سوال اگر کوئی شخص حالتِ غصہ میں اپنی بیوی کو کہے کہ اگر ہم تم سے نزدیکی کریں، یعنی تم سے مجامعت کریں تو ہم تمھارے جنے ہوئے ہوں، یا اگر یہ کہے کہ تم ہماری ماں ہو۔ ان دونوں صورتوں میں طلاق ہوگی یا نہیں اور کفارہ لازم ہوگا یا نہیں اور تا ادائے کفارہ مجامعت کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب واضح ہو کہ ان دونوں صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی، بلکہ صورت ایلا کی یہاں قائم ہوگی، اس لیے کہ اس شخص نے اس کلام سے اپنی بیوی سے جماع کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے، اسی کا نام شریعت میں ایلا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر قسم توڑ دے، یعنی وطی کر لے تو کفارۂ قسم لازم ہوگا، جس کی تفصیل سورۃ مائدہ رکوع (۱۲) میں ہے اور اگر چار ماہ تک اس قسم کو نہیں توڑا اور نہ طلاق دیا تو عورت بذریعہ حاکم مطالبہ کر سکتی ہے، پس حاکم جبراً رجوع کرائے گا یا طلاق دلائے گا۔

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [سورۂ بقرہ، رکوع، آیت: ۲۲۵، ۲۲۶]

﴿يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ﴾ [الطلاق، رکوع:۱]

عن ابن عمر إذا مضت أربعة أشهر یوقف حتی یطلق، ولا یقع علیه الطلاق حتی یطلق، ویذکر ذلك عن عثمان وعلي وأبي الدرداء وعائشة واثني عشر من أصحاب النبيﷺ ذکره البخاري في کتاب الطلاق.[1]

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب چار مہینے گزر جائیں تو اسے قاضی کے سامنے پیش کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ طلاق دے دے اور اس وقت تک طلاق واقع نہ ہوگی جب طلاق نہ دی جائے۔ عثمان، علی، ابو الدرداء، عائشہ اور بارہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے۔ اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الطلاق میں ذکر کیا ہے]

کتبه: أبو الفیاض محمد عبدالقادر اعظم گڑھی مئوی، مدرس مدرسه أحمدیه.



[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٩٨٥)

کتاب الحدود

شرعی حدود کے علاوہ خود کسی جرم کی سزا مقرر کرنا:

سوال بعض مسلمانوں میں دستور ہے کہ اگر کسی سے کوئی گناہ یا کوئی کام، مثلاً: زنا چوری وغیرہ ہو تو اس مجرم سے جرمانہ وڈانڈ لگا کر روپیہ لیتے ہیں تو وہ روپیہ مسجد میں صَرف کرنا یا جائے نماز وغیرہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب جس طرح بعض جرائم میں منجاب شارع جسمانی سزا مقرر ہے اور بعض میں عرضی، اسی طرح بعض بعض جرائم میں مالی سزا بھی آئی ہے، لیکن ہر ایک جرم میں سزا دہندگان اسی سزا کے دینے کے مجاز ہیں، جو اس جرم میں منجاب شارع معین ومقرر ہے، اس میں تغییر وتبدیل کا اختیار نہیں ہے۔ زنا اور چوری میں مالی سزا منجانب شارع ثابت نہیں ہے تو ایسے جرائم میں مالی سزا دینا ناجائز ہے اور جو جرمانہ وڈانڈ اس قسم کے جرائم میں برادری والے لیتے ہیں، وہ مال حلال نہیں، اس کو بلا رضا مندی مالک مال کے مسجد میں صَرف کرنا یا جائے نماز وغیرہ بنانا جائز نہیں ہے۔ کتاب "ظفر اللاضي" (ص: ۱۲۳) میں ہے:

"قد شرع الله سبحانه لعباده الشرائع، وحدّ لهم الحدود، وجعل لكل ذنب عقوبة، فالقاتل يقتل أو يسلم الدية إن لم تكمل شروط القصاص أو كملت، و رضي الورثة بالدية، والجاني يقتص منه فيما يجب فيه القصاص، ويسلم الإرش في الجناية التي لا قصاص فيها، والزاني والسارق والقاذف والسكران قد جاءت الشريعة بعقوبات مقدرة في كل واحد منهم، وتارك أركان الإسلام أو بعضها إذا أصر على الترك ولم يتب وجب قتله بحسب الطاقة، و هكذا جاءت الشريعة المطهرة بما يلزم كل من فعل محرما أو ترك واجبا، ولم يأت في شيئ من هذه الأمور الشرعية التأديب بالمال، وإن ورد شيئ من ذلك في الشريعة كتضعيف الغرامة في بعض المسائل، وأخذ شطر مال من لم يسلم الزكاة، وأخذ ثياب من يقطع أشجار حرم المدينة ونحو ذلك فهو مقصور علىٰ محله، لا تجوز مجاوزته إلى غيره، لأن الأصل الأصيل المعلوم بالضرورة الدينية هو تحريم مال المسلم وعصمته وعدم تسويغه إلا بطيبة من نفسه، وإن تلك المواضع التي ورد فيها التأديب بالمال كالمخصصة لهذا العموم فيقتصر عليها، ولا يجوز مجاوزتها إلى غيرها، وإنه لا

يجوز ذلك في هذه المواضع التي وردت إلا لأئمة المسلمين المتبحرين في معرفة أحكام الدين، ولا يجوز لأفرادهم كائنا من كان'' اھ

[اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے شرائع مقرر کیے ہیں، ان کے لیے حدود کا تعین کیا ہے اور ہر گناہ کی سزا متعین فرمائی ہے۔ چنانچہ قاتل کی سزا یہ ہے کہ اسے (قصاصاً) قتل کیا جائے گا یا اگر قصاص کی شرائط مکمل نہ ہو یا شرائط تو مکمل ہوں، لیکن وارث دیت لینے پر رضا مند ہو جائیں تو وہ (قاتل) دیت ادا کرے گا۔ مجرم کے اس جرم کے بدلے اس سے قصاص لیا جائے گا، جس جرم میں قصاص واجب ہوتا ہے اور جس جرم میں قصاص واجب نہیں ہوتا تو وہ دیت ادا کرے گا۔ زانی، چور، (زنا کی) تہمت لگانے والا اور نشہ کرنے والا، ان میں سے ہر ایک کے لیے شریعت میں سزا مقرر ہے۔ اسلام کے تمام یا بعض ارکان چھوڑنے والا، جب ان کے ترک پر اصرار کرے اور توبہ نہ کرے تو حسبِ طاقت اس کا قتل واجب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس نے کسی حرام کام کا ارتکاب کیا یا کسی واجب کو ترک کر دیا، شریعتِ مطہرہ میں ان سے متعلق وضاحت موجود ہے۔ ان شرعی امور میں سے کسی کے بارے میں مال کے ساتھ سزا دینے کا ذکر نہیں ہوا۔ اگر شریعت میں اس قسم کی کوئی سزا مقرر ہوتی ہے، جیسے بعض مسائل میں تاوان کا بڑھ جانا، زکات ادا نہ کرنے والے کا نصف مال چھین لینا اور حرمِ مدینہ کے درخت کاٹنے والے کے کپڑے چھین لینا وغیرہ تو یہ صرف اپنے محل پر مقصور ہے، اس کے غیر کی طرف ان کا تجاوز جائز نہیں ہے، کیوں کہ ضرورتِ دینیہ سے جو قطعاً معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان کے مال کو (اپنے لیے) حرام سمجھنا، اس کی حفاظت کرنا اور اس کی اجازت و رضا کے بغیر اپنے لیے حلال نہ جاننا۔ یقیناً وہ جگہیں جن میں مال کے ساتھ سزا دینے کا ذکر ہوا ہے، وہ اس عموم کو خاص کرنے کی طرح ہوں گی، لہٰذا اس سزا کو صرف انھی جگہوں میں مقصور رکھا جائے گا، ان کے علاوہ کسی جگہ ان کا اطلاق جائز نہ ہوگا، ان جگہوں میں بھی، جن میں مالی سزا کا ذکر ہوا ہے، ان سزاؤں کا اطلاق کرنا صرف ان ائمہ مسلمین کے لیے جائز ہے، جو احکامِ دین میں پوری مہارت رکھتے ہیں، امت کے افراد کے لیے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، ایسا کرنا جائز نہیں ہے]

سوال ایک مرد بیاہا نے اپنی بھاوج سے بدکاری کی تو حمل رہ گیا۔ عورت کا خسر اور لوگ جب اس عورت سے دریافت کرتے کہ یہ حمل کس کا ہے؟ عورت اپنے دیور کو بتلاتی۔ اس کا سسر مار پیٹ کر نکال دیتا۔ وہ اپنے میکے چلی جاتی۔ جب لڑکی کے ماں باپ دریافت کرتے، وہاں بھی وہ اپنے دیور کو بتلاتی، اس کے ماں باپ اپنے یہاں سے نکال دیتے۔ جب وہ میکے سے آتی، یہاں بھی زدو کوب کی نوبت رہتی، اس کا خاوند پلٹن میں سرکاری ملازم تھا۔ جب اس کو خبر ہوئی، مکان آیا، اپنی عورت زانیہ کو بہت کچھ تنبیہ کیا اور اس سے دریافت کیا کہ یہ بدفعل تو نے کس سے کرایا؟ اس نے کہا کہ تمھارے چھوٹے بھائی سے، جو میرا دیور ہوتا ہے۔ چند مسلمان اکٹھے ہو کر ہاتھ پر قرآن

مجید رکھ کر قسم کرانا چاہا، اس وقت اس کا دیور جو ہمیشہ انکار کرتا تھا کہ اس فعل بد کا مرتکب مَیں نہیں ہوں، کلامِ الٰہی کا خوف طاری ہوا اور اقرار کیا کہ یہ فعل شیطانی مجھ سے ہوا ہے۔ مَیں اس فعل بد میں خطا وار ہوں، قسم نہیں کر سکتا۔

بعد وضع حمل ہر دو زانی و زانیہ سے توبہ لی گئی۔ عورت کا خاوند عورت سے رضا مند ہے اور تمام برادری کے لوگ مسلمانان اکل و شرب ترک کیے ہوئے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اب تو کوئی حد شرعی جاری نہیں ہے، ہر شخص ایسے فعلِ بد کا مرتکب ہو کر توبہ کر لیا کرے گا۔ خوف شرعی جاتا رہا۔ کوئی ایسی سزا علمائے دین مقرر فرمائیں جس سے ہر شخص اس فعل کے کرنے سے ڈرے، لہٰذا یہ سوال ہے کہ ایسی حالت میں سوائے حد سنگساری کے جو سزا شرعی مناسب و ممکن ہو، تعزیر و کفارہ کی معین کر کے فتویٰ دیا جائے، تاکہ ہر ایک شخص پر خوف شرعی غالب رہے اور خاوند اس زانیہ کا پھر سے نکاح کر کے اپنی صحبت میں رکھے یا صرف وہی توبہ کافی ہے؟ موافق حکمِ خدا و رسول تحریر فرمائیے۔

جواب جب بندہ اللہ سے ڈر کر اور گناہ پر نادم ہو کر اپنے گناہ سے سچی توبہ کرتا ہے (خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور کفر ہی کیوں نہ ہو) تو اس گناہ سے ایسا پاک ہو جاتا ہے گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔

قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَھُوْا یُغْفَرْ لَھُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ [الأنفال: ٣٨]

[ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے کفر کیا، اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ گزر چکا انھیں بخش دیا جائے گا]

وقال تعالیٰ: ﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ﴾ [الزمر: ٥٣، ٥٤]

[کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ اور اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ اور اس کے مطیع ہو جاؤ]

عن أبي هريرة قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: «إن عبدا أذنب ذنبا فقال: رب أذنبت ذنبا فاغفره فقال ربه: أعلم عبدي أن له ربا، يغفر الذنب، ويأخذ به؟ غفرت لعبدي، ثم مكث ما شاء اللّٰه، ثم أذنب ذنبا فقال: رب أذنبت ذنبا، فاغفره، فقال: أعلم عبدي أن له ربا، يغفر الذنب، ويأخذ به؟ غفرت لعبدي، ثم مكث ما شاء اللّٰه، ثم أذنب ذنبا، فقال: رب أذنبت ذنبا آخر فاغفره لي، فقال: أعلم عبدي أن له ربا، يغفر الذنب، ويأخذ به؟ غفرت لعبدي فليفعل ما شاء»[1] (متفق عليه، مشكوة، ص: ١٩٦)

[ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندہ گناہ کرتا ہے تو کہتا ہے: اے میرے رب! میں گناہ کر بیٹھا ہوں تو اسے بخش دے، تو اس کا رب فرماتا ہے: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٥٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٨)

ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس اس کی وجہ سے مواخذہ بھی کر سکتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، پھر جس قدر اللہ چاہتا ہے وہ شخص گناہ سے باز رہتا ہے، لیکن پھر گناہ کر لیتا ہے اور کہتا ہے: اے میرے رب! میں گناہ کر بیٹھا ہوں، اسے معاف کر دے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے، جو گناہ بخش سکتا ہے اور اس پر مواخذہ بھی کر سکتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، پھر جس قدر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، وہ باز رہتا ہے، لیکن پھر گناہ کر بیٹھتا ہے تو کہتا ہے: اے میرے رب! میں ایک اور گناہ کر بیٹھا ہوں، مجھے معاف فرما دے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور اس پر مواخذہ بھی کر سکتا ہے؟ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا، وہ جو چاہے سو کرے]

وعن ابن مسعود قال: قال رسول اللهﷺ: «التائب من الذنب كمن لا ذنب له»[1]

(رواه ابن ماجه، مشكوة، ص: ١٩٨)

[عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح (ہو جاتا) ہے جس کا کوئی گناہ نہیں]

صورتِ سوال میں جب ہر دو زانی و زانیہ سے توبہ لی گئی، یعنی دونوں نے توبہ کر لی تو وہ دونوں حسبِ آیت و احادیثِ مذکورہ بالا اس گناہ سے پاک ہو گئے اور وہ عورت بدستور اپنے خاوند کی عورت رہی۔ پس مسلمانوں کو چاہیے کہ ان دونوں کو اپنے ساتھ ملا لیں اور اکل و شرب میں اپنے شامل کر لیں۔ جاننا چاہیے کہ علمائے دین کا اور خواہ کسی کا یہ حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے آسمانی دین میں کچھ اپنی طرف سے گھٹائے یا بڑھائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ ﷺ کی نسبت یہ ارشاد فرمایا کہ ﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ﴾ یعنی رسول پر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اللہ کا حکم بلا کم و کاست اللہ کے بندوں تک پہنچا دیں تو اور کوئی کس شمار و قطار میں ہے کہ اپنی طرف سے اللہ کے دین میں کچھ گھٹائے یا بڑھائے؟ مثلاً: کسی جرم کی سزا اپنی طرف سے مقرر کرنا۔ الحاصل علمائے دین اپنی طرف سے کسی تعزیر و کفارے کے مقرر کرنے کے مجاز نہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (٢٨/ جمادى الأولىٰ ١٣٣٢هـ)

نفاذِ حدود کی شرائط:

سوال ایک شخص نے رات کو جس وقت سب سو رہے تھے، اپنی بی بی کو غیر مرد کے شامل گوشہ تنہائی میں دیکھ کر باہر سے دروازہ بند کر دیا اور بہت سے لوگوں کو دکھا دیا۔ عورت کے سامنے اس کی ماں وغیرہ نے کہا کہ اس سے قصور ہوا، معاف کرو۔ شوہر نے کہا کہ یہ قصور معاف نہیں ہوگا اور عورت کو گھر سے نکال دیا۔ عورت نے خاموشی اختیار کیا، کوئی عذر پیش نہ کیا، اس صورت میں اس پر حکم زنا کا دیا جائے گا یا نہیں؟

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥٠)

جواب اس صورت میں اس عورت پر ایسے زنا کا حکم نہیں دیا جائے گا، جس سے حد لازم آتی ہے، کیونکہ عبارتِ سوال سے نہ عورت کا باقاعدہ زنا کا اقرار پایا گیا نہ چار معتبر گواہوں کی باضابطہ شہادت ہے۔

﴿وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ۳]

[اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں، ان پر اپنے میں سے چار مرد گواہ طلب کرو]

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: أتى رجل رسول الله ﷺ، وهو في المسجد، فناداه فقال: يا رسول الله! إني زنيت، فأعرض عنه حتى ردد عليه أربع مرات، فلما شهد علىٰ نفسه أربع شهادات، دعاه النبي ﷺ فقال: «أبك جنون؟» قال: لا. قال: «فهل أحصنت؟» قال: نعم. فقال النبي ﷺ: «اذهبوا به فارجموه»[1] (صحیح بخاري، مطبوعه مصر: ٤/ ١٤٤، ١٤٥)

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب آپ ﷺ مسجد میں تھے، اس نے آپ ﷺ کو پکارا اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا، حتی کہ اس نے چار بار اس بات کو دہرایا، جب وہ اپنے خلاف چار گواہیاں دے چکا تو نبی اکرم ﷺ نے اسے بلایا اور کہا: ''کیا تجھے جنون کی شکایت تو نہیں؟'' اس نے کہا: جی نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم شادی شدہ ہو؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں، نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا: اسے لے جاؤ اور رجم کر دو]

ہاں! عورت سے یہ حرکت بہت بُری وقوع میں آئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی﴾ [الإسراء: ٣٢] [اور زنا کے قریب نہ جاؤ]

یہ عورت زنا سے قریب ہوگئی، اب سچے دل سے ایسی ناشایستہ حرکت سے توبہ کرے، اللہ بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور بندوں کی توبہ سے بہت خوش ہوتا ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ (۸/ جنوری ۹۳ء)



[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٩١)

کتاب الوقف

وقف کرنے والے کی نیت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

سوال ایک موضع میں ایک مسجد کے متعلق کسی قدر جائداد وقف ہے اور کچھ رقم جمع ہوتی تھی۔ چونکہ اس موضع میں کوئی مدرسہ دینیہ وغیرہ ایسا نہ تھا جس میں یہ روپیہ صَرف ہوتا، اس واسطے اس گاؤں سے علیحدہ دوسری جگہ کے مدرسہ میں یہ روپیہ بھیجا جاتا تھا اور اسی مدرسہ میں برابر صَرف ہوتا تھا۔ اب کے اس گاؤں میں بمشورہ یہاں کی جماعت کے ایک مدرسہ دینیہ کھولا گیا ہے اور یہ مشورہ ہوا ہے کہ گاؤں کے غربا کے لڑکوں کو جو دوسری جگہ جا کر تعلیم پانے میں سخت مجبور ہیں، ان کو للہ دینی تعلیم دی جائے، کیونکہ یہاں مدرسہ قائم ہونے سے بخوبی وہ لوگ تعلیم پا سکتے ہیں اور پا رہے ہیں، مگر اس مدرسہ کے اخراجات کے لیے کوئی دوسری صورت نہیں ہے، بجز یہی سب رقم کے۔ پس اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ سب رقم جو دوسری غیر جگہ کے مدرسہ میں دی جاتی تھی، وہ رقم اس مدرسہ میں جہاں سے یہ آمدنی ہے، خرچ کی جائے یا نہیں اور یہ مدرسہ اس رقم آمدنی کا مستحق ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ اس موضع کا مدرسہ جو مذکورہ رقم آمدنی کی جگہ ہے، آیا یہ مدرسہ زیادہ مستحق ہے یا مدرسہ غیر جگہ کا؟

جواب واقف اپنے وقف میں جو شرط کرے، اس کی پابندی لازم ہوتی ہے، بشرطیکہ شرط مذکور خلافِ قانونِ شرع نہ ہو۔ لحدیث «من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد»[1] (رواہ مسلم)

[جس نے ہمارے طریقے کے خلاف کوئی کام کیا تو وہ مردود اور باطل ہے]

ولحدیث «ما كان من شرط ليس في كتاب الله فهو باطل، وإن كان مائة شرط»[2] (رواہ الشیخان)

[جس نے کوئی ایسی شرط لگائی جو کتاب اللہ میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے، اگرچہ وہ سو شرطیں لگائے]

پس صورتِ مسئول عنہا میں جبکہ واقف نے ایک خاص موضع کی مسجد کے متعلق اپنی جائداد وقف کی ہے، جیسا کہ سوال میں درج ہے تو اس مسجد کے سوا اور کسی دوسری جگہ جائداد مذکور کی آمدنی کا خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ اب جو سُکّان موضع مذکور کے مشورہ سے اس موضع میں مدرسہ دینیہ کا قائم کرنا قرار پایا ہے تو اگر مدرسہ مذکور منجملہ مصالح ہے، جس سے مسجد مذکور کی آبادی متصور ہے تو اس مدرسہ میں آمدنی مذکور کا خرچ کرنا جائز ہے، ورنہ نہ اس مدرسہ میں اور نہ کسی دوسری جگہ میں اس کا خرچ کرنا جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم. كتبہ: محمد عبد اللہ (۸/ رمضان مبارك ۱۳۲۷ھ)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۱۸)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۵۷۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵۰٤)

غیر اللہ کے نام پر وقف کی شرعی حیثیت:

سوال ایک زمیندار (بھیلو خندکار) نے، مثلاً: اٹھارہ بیگھہ زمین کو ایک پیر صاحب کی درگاہ کے لیے وقف کیا، اس میں پیر صاحب کی نقلی قبر ہے اور ایک شخص کو (یعنی ملتان شاہ کو) اُس کا متولی بنایا اور اس سے کہا کہ اس زمین سے جو کچھ خزانہ آمدنی ہوگی، اس درگاہ میں خرچ کرنا، یعنی چراغ روشن کرنا، درگاہ کی مرمت کرنا اور شیرینی اور فاتحہ وغیرہ ادا کرنا۔ ان سب کاموں کے ادا کرنے کے بعد جو کچھ روپیہ وغیرہ بچ رہے، سال پورا ہونے پر فقراء اور مسکینوں کو کھلا دینا۔ ملتان شاہ ان سب شرائط کو قبول کر کے درگاہ کی خدمت کرنے چلے آئے، لیکن ملتان شاہ نے لاوارث ہونے کے سبب سے ایک لڑکا پالا تھا بنام اوجل فقیر، لہٰذا ملتان شاہ نے مرتے وقت اپنے لے پالک بیٹا اوجل فقیر کو درگاہ مذکور کا متولی بنایا، بشرائط مذکورہ اوجل فقیر کے پوتا گلاب فقیر نے اسی زمین پر ایک کچی مسجد بنوائی اور وہ مسجد ستر یا اسی برس سے اس زمین پر ہے۔

اب گلاب فقیر کے دونوں پوتوں نے اس مسجد کو پختہ بنوایا اور دس کٹھہ زمین کو ان دونوں بھائیوں نے اس مسجد پر وقف کیا۔ بعد اس کے دونوں بھائیوں نے باقی زمین کو آپس میں بانٹ لیا۔ ایک نے مثلاً آٹھ بیگھہ اور دوسرے نے مثلاً دس بیگھہ۔ اب دونوں بھائیوں کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ جو چیز غیر اللہ کے نام پر پکاری جائے، وہ چیز مطلق حرام ہے، اس سبب سے ایک بھائی نے جس کا حصہ، مثلاً: دس بیگھہ ہے، اس نے اپنے حصہ کی دس بیگھہ زمین کو پیر کے نام کی نیت کو بدل کر کے اللہ تعالیٰ کے نام پر دے دیا، یعنی مسجد مذکور کے لیے وقف کر دیا اور کہا کہ یہ دس بیگھہ زمین غیر کو اجارہ پر دینے سے جو خزانہ سالانہ وصول ہوگا، اتنا روپیہ ہر سال ہم مسجد مذکور میں خرچ کریں گے اور درگاہ کی خدمت اور نیاز اور فاتحہ وغیرہ سے باز رہا اور ایک بھائی نے جس کا حصہ مثلاً آٹھ بیگھہ ہے، اس نے کل زمین کو اپنے قبضہ میں رکھا اور اس کی آمدنی سے اپنی اوقات بسری کرتا ہے اور درگاہ کی مرمت اور تیل بتی وغیرہ دیتا اور جو خدمت ضروری ہے، سب ادا کرتا ہے اور جو جاندار یا بے جان پیر کے نام سے درگاہ میں دی جاتی ہے، وہ سب چیز وہ کھاتا ہے۔ پس اس صورت میں بموجب پٹہ اور قبولیت کے زمین کی آمدنی اپنے کام میں صرف کر سکتا ہے یا نہیں اور جو چیز پیر کے نام میں مشہور کی جائے، یعنی پیر کے نام سے پکار کر درگاہ میں دے تو وہ چیز حرام ہے یا نہیں اور پیر کے نام کی زمین میں جو مسجد ہے، اس پیر کے نام کی نیت کو بدل کر زمین کو اللہ تعالیٰ کے نام پر دیا، یعنی مسجد مذکور میں وقف کیا تو اس مسجد میں نماز جائز ہوگی یا نہیں؟ موافق کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ و اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم و ائمہ مجتہدین و فقہا راسخین کے جواب بالصواب عنایت فرمائیں۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ متولی کے پوتے کے دونوں بیٹوں نے پیر صاحب کے نام پر جو زمین تھی، اس کی نیت کو بدل کر کے اللہ تعالیٰ کے نام پر دیا اور یہ نیت کا بدلنا طبقہ سادس میں واقع ہوا تو ان لوگوں کا نیت کو بدلنا صحیح ہے یا نہیں اور وہ زمین ایک ہو سکتی ہے یا نہیں اور اس مسجد میں نماز جائز ہے یا نہیں؟

جواب یہ وقف شرعاً صحیح نہیں ہے، نہ ازروئے فقہ و نہ ازروئے حدیث۔ یہ وقف ازروئے فقہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ شرائطِ صحتِ وقف میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ وقف قربت فی ذاتہ ہو، یعنی ایسا وقف ہو، جس کو شرع شریف نے قربت قرار دیا ہو۔ درمختار میں ہے: "وشرطه (أي شرط الوقف) شرط سائر التبرعات كحرية وتكليف وأن يكون قربة في ذاته"[1] [اور اس کی، یعنی وقف کی شرط، تمام تبرعات کی شرط کی طرح ہے، جیسے حریت اور تکلیف، نیز یہ کہ وہ فی ذاتہ قربت ہو] "رد المحتار" (٣/ ٣٦) میں ہے:

"قوله: وأن يكون قربة في ذاته أي بأن يكون من حيث النظر إلى ذاته وصورته قربة، والمراد أن يحكم الشرع بأنه لو صدر من المسلم يكون قربة حملًا على أنه قصد القربة" اھ

[ان کے اس قول: "أن يكون قربة في ذاته" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور صورت کے اعتبار سے قربت ہو، اس سے مراد یہ ہے کہ شریعت نے یہ حکم لگایا ہو کہ اگر وہ (وقف) کسی مسلمان کی طرف سے ہوا ہے تو وہ قربت ہو، اس بات پر محمول کرتے ہوئے کہ اس (واقف) نے قربت کی نیت و ارادہ کیا ہے]

یہ وقف جس کو بھیلو خندکار نے پیر صاحب کی درگاہ کے لیے کیا ہے، اس میں پیر صاحب کی نقلی (جھوٹی) قبر ہے۔ جس پر جہلا روشنی کرتے اور شیرینی وغیرہ چڑھاتے اور فاتحہ کرتے ہیں، بھیلو خندکار نے اس وقف کے مصارف یہی ناجائز امور قرار دیے ہیں اور اگر اس درگاہ میں بجائے نقلی قبر کے پیر صاحب کی اصلی قبر ہوتی تو بھی وہاں ان افعال کا کرنا جائز نہ ہوتا، چہ جائیکہ اس درگاہ میں جھوٹی قبر پیر صاحب کی ہے۔ "رد المحتار" (٢/ ٣٣٧) میں ہے:

"أما لو نذر زيتا لإيقاد قنديل فوق ضريح الشيخ أو في المنارة، كما يفعل النساء من نذر الزيت لسيدي عبد القادر، و يوقد في المنارة جهة المشرق فهو باطل" اھ

[اگر اس نے شیخ کے مزار یا منار پر چراغ جلانے کے لیے تیل کی نذر مانی، جیسے عورتیں سیدی عبد القادر رحمہ اللہ کے لیے تیل کی نذر مانتی ہیں اور اسے مشرق کی جانب والے منار میں روشن کیا جاتا ہے تو یہ باطل اور مردود ہے]

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اگر اصلی قبر پر بھی یا اس کے منارہ پر چراغاں کریں تو باطل اور ناجائز ہے، پس جب یہ افعال ناجائز اور معصیت ہیں تو یہ وقف جو درگاہ مذکورہ کے لیے واسطے افعال ناجائز اور معصیت مذکورہ کے کیا گیا ہے، قربت نہیں ہے اور جب وقف مذکور قربت نہیں تو شرعاً صحیح بھی نہیں ہے۔ لفوات شرط صحته وهو كونه قربة كما تقدم.

اگر ذرا بنظر غور دیکھیں تو یہ درگاہ اور یہ نقلی قبر جس پر جہال مذکورہ بالا افعال بجا لاتے ہیں، بیعہ اور کنیسہ یا

[1] الدر المختار مع رد المحتار (٤/ ٣٤١)

بیت النار کے حکم میں ہے، جس پر وقف محض باطل اور ناجائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیری (۳/ ۲۹۹) میں ہے:

"ومنها أن يكون قربة في ذاته وعند التصرف فلا يصح وقف المسلم أو الذمي على البيعة والكنيسة أو على فقراء أهل الحرب كذا في النهر الفائق، ولو وقف الذمي داره على بيعة أو كنيسة أو بيت نار فهو باطل، كذا في المحيط، وكذا على إصلاحها ودهن سراجها"

[ان (شرائط) میں سے ایک یہ ہے کہ وہ (وقف) فی ذاتہ اور عندالتصرف قربت ہو۔ پس مسلمان یا ذمی کا بیعہ، کنیسہ یا اہلِ حرب کے فقرا پر وقف کرنا درست نہیں ہے۔ النہر الفائق میں یوں ہی ہے۔ اگر کوئی ذمی اپنا گھر بیعہ یا کنیسہ یا آتش خانے کے لیے وقف کرے تو یہ باطل ہے۔ المحیط میں بھی ایسے ہی ہے۔ ایسے ہی ان کی تعمیر وترقی اور چراغ کے لیے تیل پر (مال وغیرہ وقف کرنا)]

وقف مذکور ازروئے حدیث اس لیے صحیح نہیں ہے کہ بیان مذکور بالا سے معلوم ہوا کہ وقف مذکور قربت نہیں ہے، بلکہ معصیت ہے۔ پس وقف مذکور خلاف قانونِ شرع شریف ہے اور جو امر کہ خلافِ قانون شرع شریف ہو، وہ امر مردود اور باطل ہے، پس وقف مذکور مردود اور باطل ہے۔ صحیح مسلم میں مرفوعاً مروی ہے: «من عمل عملًا ليس عليه أمرنا فهو رد»[1] یعنی جو شخص کوئی ایسا کام کرے جو ہمارے حکم (قانون) کے خلاف ہو تو وہ کام مردود اور باطل ہے۔ فتح الباری (۲/ ۵۸۰) میں ہے:

"فيحتج به (أي بهذا الحديث) في إبطال جميع العقود المنهية، وعدم وجود ثمراتها المترتبة عليها، وفيه رد المحدثات، وأن النهي يقتضي الفساد، لأن المنهيات كلها ليست من أمر الدين فيجب ردها" اھ

[تمام ممنوع معاہدات کو باطل قرار دینے اور ان پر مرتب ہونے والے ثمرات کے عدمِ وجود کے لیے اس حدیث سے حجت لی جاتی ہے۔ اس میں محدثات کے رد کی بھی دلیل موجود ہے اور وہ اس طرح کہ کسی چیز سے نہی اس کے غلط اور فاسد ہونے کا تقاضا کرتی ہے، کیوں کہ جتنی منہیات ہیں، وہ امر دین نہیں ہیں، لہٰذا ان کا رد کرنا واجب ہے]

نیز جب وقف مذکور قربت نہیں ہے تو لوجہ اللہ بھی نہیں ہے اور جب لوجہ اللہ نہیں ہے تو یہ مثل اس عتاق کے ہوا جو لوجہ اللہ نہ ہو اور عتاق جو لوجہ اللہ نہ ہو، باطل اور مردود ہے، پس اسی طرح وقف مذکور بھی کہ لوجہ اللہ نہیں ہے، مردود اور باطل ہے۔ صحیح بخاری میں ہے: "لا عتاقة إلا لوجه الله"[2] [لوجہ اللہ ہی آزاد کرنا جائز ہے]

---

[1] صحيح البخاري معلقاً، قبل الحديث (٦٩١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

[2] یہ الفاظ صحیح بخاری کے ایک ترجمہ باب سے ماخوذ ہیں۔

فتح الباری (جز ۲/ ۵۰۱) میں ہے:

"وفي الطبراني من حديث ابن عباس رضي الله عنهما مرفوعاً: لا عتاق إلا لوجه الله"[1] اھ

[طبرانی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ صرف لوجہ اللہ ہی آزاد کرنا جائز ہے]

جب ثابت ہوا کہ وقف مذکور شرعاً صحیح نہیں، نہ از روے فقہ و نہ از روے حدیث تو یہ زمین جس کو بھیلو خندکار نے ناجائز وقف کیا تھا، خود خندکار کی ہی ملک رہی، پھر اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کی ملک ہوگئی۔ پس متولی وقف مذکور بلا اجازت مالک زمین کے نہ اس زمین کی آمدنی اپنے کام میں صَرف کر سکتا ہے اور نہ اس زمین میں مسجد بنا سکتا ہے۔ ہاں اگر مالک زمین از سَرِ نو متولی کو اس زمین کا مالک بنائے تو متولی اس صورت میں مسجد بھی بنا سکتا ہے اور دیگر جائز تصرفات بھی کر سکتا ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللّٰہ (۲٦/ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ)

شرعی وقف کے لیے تقربِ الٰہی کی نیت ضروری ہے:

سوال کیا ایسا وقف جو بخیالِ ثوابِ عقبیٰ وحصولِ تقرب خداوندی نہ کیا گیا ہو، بلکہ محض دَین کی ادائیگی سے بچنے کی غرض سے کیا گیا ہو، از روے فقہ حنفی جائز ہے؟ واقف کی نیت وغرض قرائن و حالات و شہادتِ گواہان معتبر سے ثابت ہوگئی ہے، یعنی یہ امر ثابت ہوگیا ہے کہ یہ وقف محض دَین جائز کی ادائیگی سے بچنے کی غرض سے کیا گیا ہے، ایسی صورت میں کیا فقہ حنفی وقف کو جائز قرار دے گی؟

جواب ایسا وقف جو سوال میں مذکور ہے، از روے فقہ حنفی جائز نہیں ہے۔ عدمِ جواز کی وجہ یہ ہے کہ وقفِ مسلم کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ وقف فی نفسہ قربت ہو، یعنی ایسا وقف ہو، جس سے تقرب خداوندی حاصل کیا جائے اور وقف مذکور ایسا نہیں ہے۔ درمختار میں ہے:

"وشرطه شرط سائر التبرعات كحرية و تكليف وأن يكون قربة في ذاته"[2] اھ

[وقف کی شرط جملہ عطیات کی شرط کی طرح ہے، جیسے آزاد کرنا اور پابند کرنا اور پھر یہ کہ وہ فی ذاتہ قربت ہو]

"رد المحتار" (۳/ ۳٦۰ مطبوعہ مصر) میں ہے:

"قوله وأن يكون قربة في ذاته أي بأن يكون من حيث النظر إلى ذاته وصورته قربة، والمراد أن يحكم الشرع بأنه لو صدر من مسلم يكون قربة حملًا على أنه قصد القربة (إلى قوله) فتعين أن هذا شرط في وقف المسلم فقط" اھ، واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

[ان کے اس قول: "أن يكون قربة في ذاته" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور صورت کے اعتبار

---

[1] المعجم الكبير للطبراني (۱۱/ ۳۰) حافظ نور الدین ہیثمی فرماتے ہیں: "رواه الطبراني، وفيه أحمد بن سعيد بن فرقد، وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٤/ ۳۳۵) نیز دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤۸۰۷)

[2] الدر المختار مع رد المحتار (٤/ ۳٤۱)

سے قربت، ہو، اس سے مراد یہ ہے کہ شریعت نے یہ حکم لگایا ہو کہ اگر وہ (وقف) کسی مسلمان کی طرف سے ہوا ہے تو وہ قربت ہو، اس بات پر محمول کرتے ہوئے کہ اس (واقف) نے قربت کی نیت وارادہ کیا ہے...تو یہ بات متعین ہوگئی کہ یہ شرط صرف مسلمان کے وقف کیے ہوئے (مال وغیرہ) میں ہے]

كتبه: محمد عبد الله (٥/ جمادى الثاني ١٣٣٢هـ)

وقف کے متولی کی شروط:

سوال ایک مقدمہ وراثت میں چند اشخاص منصف قرار پائے ہیں، جس میں ترکہ کا چہارم حصہ بوصیتِ مورث وقف کیا جانا واسطے تعلیم علومِ دینیہ کے بشہادتِ ورثہ ثابت ہوا ہے۔ بانی کا بیٹا چاہتا ہے کہ میں ہی اس وقف کا متولی مقرر کیا جاؤں، مگر منصفوں کو اس کے متولی وقف ہونے کی صورت میں شبہہ ہے کہ وہ اچھی طرح اس منصب کو پورا نہیں کرے گا، کیونکہ وہ عالم نہیں ہے اور احکامِ شرعیہ بھی پوری طرح نہیں برتتا۔ اس صورت میں بانی کا لڑکا متولی مقرر کیا جائے یا منصفوں کو اس کا حق ہے کہ اس وقف کا ایسے شخص کو متولی مقرر کریں، جو اس وقف کی پوری حفاظت کرے؟

جواب اس صورت میں بانی کا بیٹا متولی وقف نہیں مقرر کیا جا سکتا کئی وجھوں سے: پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ تولیت کا طالب ہے اور تولیت کا طالب صالحِ تولیت نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ احکامِ شرعی نہیں برتتا اور ایسا شخص فاسق ہے اور فاسق بھی صالح تولیت نہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ متولی ایسے شخص کو ہونا چاہیے، جو اپنے منصبی کام کرنے میں عاجز نہ ہو اور جو شخص کہ عالم نہیں ہے، وہ تعلیمِ علوم کی نگرانی نہیں کر سکتا۔ فتاویٰ عالمگیری (۲/ ۵۰۴ چھاپہ کلکتہ) میں ہے:

"الصالح للنظر من لم يسأل الولاية للوقف، وليس فيه فسق يعرف، هكذا في فتح القدير" اهـ

[وقف شدہ چیز کا نگران وہی شخص مناسب ہے، جو اس کی ولایت کا خود سوال نہیں کرتا اور اس میں معروف ومشہور فسق بھی نہ ہو۔ فتح القدیر میں ایسے ہی ہے]

در مختار (۳/ ۴۱۹ چھاپہ مصر) میں ہے: "قالوا: من طلب التولية على الوقف لا يعطىٰ له" اهـ [انھوں نے کہا ہے کہ جو وقف کی تولیت کا طالب ہے، اسے یہ تولیت نہ سونپی جائے] "در مختار مع رد المحتار" (۳/ ۴۱۹) میں ہے: "(وينزع) وجوبا. بزازيه (لو) الواقف. درر. فغيره بالأولىٰ (غير مأمون) أو عاجزا" اهـ [وجوباً اس سے چھین لیا جائے گا (بزازیہ) اگرچہ وہ واقف ہی ہو (درر) لہٰذا دوسرا کوئی شخص تو زیادہ اس لائق ہے (کہ اس سے یہ منصب چھین لیا جائے) خصوصاً جب وہ غیرِ مامون (اس کو ٹھیک طرح ادا کرنے سے) عاجز ہو]

اس صورت میں منصفوں کو حق ہے، بلکہ ضرور ہے کہ اس وقف کا کسی ایسے شخص کو متولی مقرر کریں، جو عالم اور

دیانت دار ہو اور اس کام کے ادا کرنے کی پوری لیاقت رکھتا ہو اور شرعی احکام پوری طرح برتتا ہو۔ اگر منصف لوگ ایسا نہ کریں گے، یعنی لائق کو متولی مقرر نہ کریں گے اور نالائق مقرر کریں گے تو ان کی یہ کارروائی شرعاً صحیح نہ ہوگی اور گنہگار بھی ہوں گے۔ "رد المحتار" (۳/ ۴۲۱) میں ہے:

"وفي أخر الفن الثالث من الأشباه إذ أولى السلطان مدرسا ليس بأهل لم تصح توليته"

["الأشباه" کے فنِ ثالث کے آخر میں ہے کہ جب سلطان کسی نا اہل مدرس کو متعین کر دے تو اس کی تولیت درست نہ ہوگی]

نیز اسی میں ہے:

"وصرح البزازي بأن السلطان إذا أعطىٰ غير المستحق فقد ظلم بمنع المستحق وإعطاء غير المستحق"[1] اهـ والله أعلم بالصواب

[بزازی نے یہ صراحت کی ہے کہ جب سلطان کسی غیر مستحق کو (عطیہ و منصب وغیرہ) دے تو اس نے مستحق سے روک کر اور غیر مستحق کو دے کر ظلم کیا]

کتبہ: محمد عبد اللہ

سوال ایک شخص نے ایک مسجد خام بنائی چندے سے اور خود متولی رہا۔ بعدہ بزمانہ دراز مسجد کا ایک کونا شکست ہوگیا۔ تب ایک شخص صاحب مقدور نے برضا مندی متولی مسجد پختہ بنائی اور ایک دکان پختہ بنا کر اپنے بیٹے کو متولی اور دستاویز تولیت نامہ لکھ دیا، اب اس وقت دونوں میں مقدمہ فوجداری دائر ہے۔ متولی سابق کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا حق ہے۔ مسجد پختہ بنانے والے کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارا حق ہے۔ از راہِ شریعت کس کا حق ہے؟

جواب متولی ہونے اور متولی کرنے کا حق واقف کے رہتے اور کسی کو نہیں ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جس نے مسجد اور پختہ دکان بنائی ہے، وہی اس مسجد اور دکان کا واقف ہے تو اسے اختیار ہے کہ آپ خود متولی رہے یا جس کو چاہے متولی کرے اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ جس کو متولی کر چکا ہو، اس کو معزول کر کے خود متولی ہو یا جس کو چاہے متولی کر دے۔ درمختار میں ہے: "ولاية نصب القيم إلىٰ الواقف... الخ"[2] [متولی مقرر کرنے کا حق واقف کو ہے... الخ] شامی (۳/ ۴۴۶ چھاپہ مصر) میں ہے:

"(قوله: ولاية نصب القيم إلى الواقف) قال في البحر: قدمنا أن الولاية للواقف ثابتة مدة حياته، وإن لم يشترطها، وإن له عزل المتولي" اهـ

[ان کا یہ قول: "متولی مقرر کرنے کا حق واقف کو ہے"، "البحر" کے مصنف نے اس میں لکھا ہے: پہلے ہم یہ بیان کر چکے کہ ولایت واقف کے لیے زندگی بھر ثابت ہے، اگرچہ اس نے اس کی شرط نہ لگائی ہو اور

[1] الدر المختار (٤/ ٤٢١)

[2] رد المحتار (٤/ ٣٨٠)

اسے ہی متولی کو معزول کرنے کا حق بھی حاصل ہے]

لیکن جو متولی ہو، اس میں یہ شرط ہے کہ امانت دار ہو خائن نہ ہو۔ اگر اس کا خائن ہونا ثابت ہو جائے تو تولیت اس سے منتزع کر لی جائے، یعنی تولیت سے اس کو معزول کر دینا واجب ہے، اگرچہ واقف ہی کیوں نہ ہو اور متولی میں یہ بھی شرط ہے کہ صالح ہو، فاسق نہ ہو، یعنی بدکار نہ ہو۔ اگر فاسق ہو، مثلاً: شرابی ہو یا زنا کار ہو یا بے نمازی ہو تو اس کو بھی متولی کرنا جائز نہیں ہے اور اگر متولی ہو چکا ہو تو اس کو تولیت سے معزول کر دینا واجب ہے، اگرچہ واقف ہی کیوں نہ ہو۔ درمختار مع شامی (چھاپہ مصر جلد: ۳) میں ہے:

"وينزع وجوبا) بزازية (لو) الواقف. درر. فغيره بالأولىٰ (غير مأمون) أو عاجزا أو ظهر به فسق كشرب خمر ونحوه. فتح"[1] اھ

[وجوباً اس سے چھین لیا جائے گا (بزازیہ) اگرچہ وہ واقف ہی ہو (درر) تو دوسرا تو اس کا زیادہ لائق ہے (کہ اس سے یہ منصب چھین لیا جائے) خصوصاً جب وہ غیر مامون یا (اس کو ٹھیک طرح ادا کرنے سے) عاجز ہو یا اس میں فسق آ چکا ہو، جیسے شراب نوشی وغیرہ (فتح)]

اور (۱/ ۲۵۸) میں ہے: "(وتاركها) أي تارك الصلاة (عمدا مجانة) أي تكاسلا فاسق"

[عمداً اور سستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نماز کا ترک کرنے والا فاسق ہے] والله أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

سوال زید نے اپنی ایک جائداد مصرفِ خیر میں وقف کی اور اس کے انتظامِ صرف کی بابت واجب العرض مصدقہ بندوبست میں اور وصیت نامہ میں حسبِ ذیل شرائط کیں اور واجب العرض وثیقہ موخر ہے، جو حیاتِ واقف میں تحریر ہوا۔

"شرط واجب العرض مصدقہ بندوبست میں"

بالفعل میں زید اس موضع کا مہتمم ہوں۔ میرے اختیار سے آمدنی مصرفِ خیر میں صرف ہوتی رہے گی اور بعد فوت مہتمم کے مہتمم کی اولاد سے جو شخص ازقسم ذکور لائق ہو، وہ مہتمم مقرر ہو کر نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن آمدنی صرف کرتا رہے گا، مگر کسی مہتمم کو اختیار انتقالِ جائداد کا نہ ہوگا۔ اگر کوئی مہتمم براہِ بددیانتی یا بے ایمانی آمدنی اس کی مصرفِ خیر میں صرف نہ کرے تو وہ بثبوتِ امور مذکورہ لائقِ موقوفی متصور ہو کر سرکار کو اختیار ہے کہ جس شخص کو لائق اور مناسب خاندان سے سمجھے، مہتمم مقرر کرے۔

"شرط وصیت نامہ"

اقرار یہ ہے کہ میں تاحیات اپنی آمدنی و پیداوار مواضعات مذکورہ کو اپنے ہاتھ اور اختیار سے حسبتاً للہ صرف کرتا

رہوں گا اور بعد میرے میری اولاد سے ایک شخص از قسم ذکور جو لائق ہو، نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن حسبِ دستور و طریقہ مستعملہ مجھ گنہگار کے صرف کرتا رہے، مگر اختیار انتقالِ جائداد کا نہ ہوگا اور نہ یہ حقیت لائق توریث ہوگی۔

چنانچہ بعد وفاتِ زید، زید کا ایک بڑا بیٹا خالد، جو لائق سمجھا گیا، مہتمم مقرر ہو کر بائیس برس تک منتظم رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ بعد وفاتِ خالد، خالد کا بڑا بیٹا جو لائق ہے، اور جنٹ صاحب بہادر اور صاحب کلکٹر بہادر اور صاحب کمشنر بہادر نے بموجب واجب العرض وثیقہ ثانی واقف مہتمم بنایا اور دیگر اولادِ واقف پر ترجیح دی اور پانچ سال سے وقف کا کام دیانت سے انجام کر رہا ہے، وہ یا خالد کا حقیقی یا سوتیلا بھائی حسبِ مضمون واجب العرض و وصیت نامہ بالا و نیز شرعاً ان میں سے کون متولی ہونا چاہیے اور مخفی نہ رہے کہ خالد کے سوتیلے بھائی نے خالد کے مہتمم ہونے کے وقف بھی مقدمات اپنی تولیت کی بابت دائر کیے تھے اور اب پانچ سال سے اپنی تولیت کے واسطے استقرارِ حق کے دعوے کر رکھے ہیں۔ کیا جو شخص مستحق کے مقابلے میں متمنی تولیت ہو، وہ متولی ہو سکتا ہے یا نہیں اور خالد کا بیٹا جس کو حکام نے متولی بنایا ہے، اس کی معزولی بلا خیانت کے ہو سکتی ہے یا نہیں؟

جواب خالد کا بھائی خواہ حقیقی ہو یا سوتیلا، زید کی اولاد بلاواسطہ ہے اور خالد کا بیٹا بھی گو زید کی اولاد ہے، مگر وہ زید کی اولاد بواسطہ ہے، کیونکہ زید کے بیٹے کا بیٹا ہے، یعنی زید کا پوتا ہے اور اولاد بلاواسطہ کو اولاد بواسطہ پر ترجیح ہے، پس خالد کے بھائی کو خالد کے بیٹے پر ترجیح ہے، لیکن چونکہ تولیتِ وقف میں یہ شرط ہے کہ متولی وقف وہ شخص انتخاب کیا جائے جو تولیت کی لیاقت رکھتا ہو، یعنی وہ شخص امانت دار ہو، امانت داری کے ساتھ امورِ وقف کی انجام دہی پر خود یا بذریعہ اپنے نائب کے پورے طور سے قادر ہو، لہٰذا صورتِ سوال میں اگر خالد کا بھائی تولیتِ وقف کی لیاقت رکھتا ہے تو اس کو خالد کے بیٹے پر ترجیح ہے۔ اگر خالد کا بھائی تولیتِ وقف کی لیاقت نہیں رکھتا، خواہ اس وجہ سے کہ امانت دار نہیں یا اس وجہ سے کہ امورِ وقف کی انجام دہی پر پورے طور سے قادر نہیں ہے تو اس صورت میں اگر خالد کا بیٹا تولیت کی لیاقت رکھتا ہے تو وہی متولی منتخب ہو سکتا ہے۔ پس اس صورت میں حکام نے خالد کے بیٹے کو بوجہ اس کی لیاقت کے متولی منتخب کیا ہے تو اب اس کی معزولی بلا سبب موجب نہیں ہو سکتی اور جو شخص متمنی، یعنی طالب تولیت ہو، وہ متولی نہیں ہو سکتا۔

رد المحتار حاشیہ در مختار (۳/ ۴۳۷ چھاپہ مصری) میں ہے:

"في الاختيار شرح المختار: لو قال: على أولادي، يدخل البطون كلها لعموم اسم الأولاد، لكن يقدم البطن الأول فإذا انقرض فالثاني"

[الاختیار شرح المختار میں ہے: اگر وہ (وقف کرنے والا) کہے کہ میری اولاد پر (یہ مال وقف ہے) تو اس میں تمام بطون اور قبائل داخل ہوں گے، کیونکہ اسم اولاد عام ہے، لیکن پہلا بطن مقدم ہوگا اور پہلے بطن کے ختم ہونے کی صورت میں دوسرے بطن کی باری آئے گی]

ایضاً (۳/ ۳۸۵) میں ہے:

"في الإسعاف: ولا يولىٰ إلا أمين قادر بنفسه أو بنائبه، لأن الولاية مقيدة بشرط النظر، وليس من النظر تولية الخائن، لأنه يخل بالمقصود، وكذا تولية العاجز، لأن المقصود لا يحصل به"

[الاسعاف میں ہے کہ (وقف کی) ولایت صرف اسی کو سونپی جائے جو امانت دار ہو اور از خود یا کسی نائب کے ساتھ اس پر قادر ہو، کیوں کہ ولایت نظر وفکر کی شرط کے ساتھ مقید ہے، جب کہ خائن کی تولیت میں نظر وفکر کی صلاحیت نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ (خیانت) مقصود کو پورا کرنے میں خلل انداز ہوتی ہے، ایسے ہی عاجز آدمی کی تولیت ہے، کیونکہ اس سے بھی مقصود حاصل نہیں ہوتا ہے]

ایضاً (۳/ ۳۸۶) میں ہے:

"من جامع الفصولين: إذا كان للوقف متول من جهة الواقف أو من جهة غيره من القضاة، لا يملك القاضي نصب متول آخر بلا سبب موجب لذلك، وهو ظهور الخيانة أو شيئ آخر"

[جامع الفصولین سے (نقل کیا گیا) ہے کہ جب وقف کرنے والے کی طرف سے یا اس کے علاوہ قضاۃ میں سے کسی کی طرف سے وقف پر کوئی نگران وسرپرست مقرر ہو تو قاضی کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ کسی ایسے سبب کے بغیر کوئی اور نگران متعین کرے جو سبب اس تبدیلی کا موجب ہو، جیسے خیانت کا ظاہر ہونا یا اس طرح کی کوئی اور چیز]

فتاویٰ عالمگیری (۳/ ۲۱۹ چھاپہ مصطفائی) میں ہے: "الصالح للنظر من لم يسأل الولاية للوقف" واللّٰه أعلم. [ولایت کے لیے پسندیدہ شخص وہ ہے، جس نے وقف کی ولایت ونگرانی کا نہ مطالبہ کیا]

کیا وقف علی الاولاد جائز ہے؟

سوال وقف علی الاولاد مذہبِ اہلِ حدیث میں جائز ہے یا نہیں؟ زمانہ مبارک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں وقف علی الاولاد وقوع میں آیا یا نہیں؟

جواب ① جائز ہے، اس واسطے کہ حضرت رسولِ کریم ﷺ نے اراضی بنی النضیر کو، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بالخصوص عطا فرمایا تھا، اپنے اہل پر وقف فرمایا تھا، جس میں آپ کی اولاد طاہرہ بھی داخل ہیں اور آپ ان کو اراضی مذکورہ کے غلہ (محاصل و پیداوار) میں سے ہمیشہ دیا کیے۔ پھر حضرت رسول کریم ﷺ کے بعد آپ کے جانشین حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بھی اپنے عہد میں یہی کرتے رہے، پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے عہد میں بھی ایسا ہی کرتے رہے اور باوجود دعویٰ وارثین کے مدعیانِ وراثت کو ان دونوں صاحبوں نے وراثت کی ڈگری نہیں دی اور عذر یہی پیش کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اراضی مذکورہ کو مع دیگر اراضی فدک وخیبر کے وقف فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا:

«لا نورث، ما ترکنا صدقة»[1] [ہماری وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو ہم نے چھوڑا، وہ صدقہ ہے]

پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ وحضرت عباس رضی اللہ عنہ کی درخواست پر ان دونوں صاحبوں کو اراضی مذکورہ موقوفہ کا متولی مقرر کر دیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ تنہا متولی رہے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن، پھر حضرت حسین، پھر حضرت زین العابدین، پھر حضرت حسن بن حسن، پھر حضرت زید بن حسن، پھر حضرت عبداللہ بن حسن رضی اللہ عنہم یکے بعد دیگرے اراضی مذکورہ کے متولی رہے، یہاں تک کہ بنی العباس نے اپنے عہد میں خود اس کی تولیت لی۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

"إن فاطمة رضي الله عنها بنت رسول الله ﷺ سألت أبا بكر بعد وفاة رسول الله ﷺ أن يقسم عليها ميراثها مما ترك رسول الله ﷺ مما أفاء الله عليه، فقال لها أبو بكر إن رسول الله ﷺ قال: «لا نورث، ما تركنا صدقة» ... قالت: وكانت فاطمة تسأل أبا بكر نصيبها مما ترك رسول الله ﷺ من خيبر وفدك وصدقته بالمدينة فأبىٰ أبوبكر عليها ذلك، وقال: لست تاركا شيئا كان رسول الله ﷺ يعمل به إلا عملت به فإني أخشى إن تركت شيئا من أمره أن أزيغ، فأما صدقته بالمدينة فدفعها عمر إلى علي و عباس"[2] الحديث.

[رسول اللہ ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ترکے سے ان کو ان کی میراث کا حصہ دلایا جائے، جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فے کی صورت میں دیا تھا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "ہماری وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو ہم نے چھوڑا، وہ صدقہ ہے..." (عائشہ رضی اللہ عنہا نے) کہا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے خیبر، فدک اور مدینے کے صدقے کی وراثت کا مطالبہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان اس سے انکار کیا تھا۔ انھوں نے کہا: میں کسی بھی ایسے عمل کو نہیں چھوڑ سکتا، جسے رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں کرتے رہے ہوں، میں ایسے ہر عمل کو ضرور کروں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے آپ ﷺ کا کوئی بھی عمل چھوڑا تو میں حق سے منحرف ہو جاؤں گا۔ پھر آپ ﷺ کا مدینے کا صدقہ عمر رضی اللہ عنہ نے علی اور عباس رضی اللہ عنہما کو دے دیا]

نیز صحیح بخاری میں ہے:

"وقال عباس: يا أمير المؤمنين! اقض بيني وبين هذا (يعني عليا) وهما يختصمان فيما أفاء الله على رسوله ﷺ من مال بني النضير... فقال الرهط عثمان و أصحابه: يا أمير المؤمنين اقض بينهما وأرح أحدهما من الآخر، فقال عمر: أنشدكم بالله الذي بإذنه تقوم السماء والأرض، هل تعلمون أن رسول الله ﷺ قال: «لا نورث ما تركنا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥٩)

صدقة » يريد رسول اللهﷺ نفسه؟ قال الرهط: قد قال ذلك، فأقبل عمر على علي وعباس فقال: أنشدكما أتعلمان أن رسول اللهﷺ قد قال ذلك؟ قالا: قد قال ذلك.

"قال عمر: فإني أحدثكم عن هذا الأمر، إن الله قد خصَّ رسولهﷺ في هذا الفئ بشيئ، لم يعطه أحدا غيره، ثم قرأ ﴿وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [الحشر:٦] فكانت هذه خالصة لرسولهﷺ، والله ما احتازها دونكم ولا استأثر بها عليكم، قد أعطاكموه، وبثها فيكم حتى بقي منها هذا المال، فكان رسول اللهﷺ ينفق على أهله نفقة سنتهم من هذا المال، ثم أخذ ما بقي فيجعله مجعل مال الله، فعمل رسول اللهﷺ بذلك حياته، أنشدكم بالله هل تعلمون ذلك؟ قالوا: نعم، ثم قال لعلي و عباس: أنشدكما بالله تعالیٰ أتعلمان ذلك؟ قال عمر: ثم توفى الله نبيهﷺ فقال أبوبكر أنا ولي رسول اللهﷺ فقبضها أبوبكر فعمل فيها بما عمل رسول اللهﷺ، والله يعلم إنه فيها لصادق بارٌّ راشد تابع للحق، ثم توفیٰ الله أبا بكر فكنت أنا ولي أبي بكر فقبضتها سنتين من أمارتي، أعمل فيها بما عمل رسول اللهﷺ وما عمل فيها أبو بكر، والله يعلم إني فيها لصادق بار راشد تابع للحق.

ثم جئتماني تكلماني، وكلمتكما واحدة، وأمركما واحد، جئتني يا عباس، تسألني نصيبك من ابن أخيك، وجاءني هذا، يريد عليا، يريد نصيب امرأته من أبيها فقلت لكما: إن رسول اللهﷺ قال: « لا نورث، ما تركنا صدقة » فلما بدا لي أن ندفعه إليكما قلت: إن شئتما دفعتها إليكما على أن عليكما عهد الله وميثاقه لتعملان فيها بما عمل فيها رسول اللهﷺ وبما عمل فيها أبوبكر: و بما عملت فيها منذ وليتها فقلتما: ادفعها إلينا، فبذلك دفعتها إليكما، فأنشدكم بالله هل دفعتها إليهما بذلك؟ قال الرهط: نعم، ثم أقبل على علي و عباس فقال: أنشدكما بالله هل دفعتها إليكما بذلك؟ قالا: نعم، قال: فتلتمسان مني قضاءا غير ذلك، فو الله الذي بإذنه تقوم السماء والأرض لا أقضي فيها قضاءا غير ذلك فإن عجزتما عنها فادفعاها إلى فإني أكفيكماها"[1]

[عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المومنین! میرے اور ان (علی رضی اللہ عنہ) کے درمیان فیصلہ کر دیجیے، ان دونوں کا جھگڑا اس جائیداد کے بارے میں تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بنونضیر کے اموال میں سے (خمس کے طور پر) عنایت فرمائی تھی۔ اس پر عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ جو دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، کہنے

[1] صحیح البخاري رقم الحديث ([illegible])

لگے: اے امیر المومنین! ان دونوں کے درمیان فیصلہ فرما دیجیے اور ہر ایک کو دوسرے کی طرف سے آرام دیجیے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ لوگوں سے اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں، کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''ہماری وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو ہم نے چھوڑا، وہ صدقہ ہے۔'' اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد خود اپنی ذاتِ گرامی بھی تھی؟ ان لوگوں نے کہا: (جی ہاں!) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا۔ اب عمر رضی اللہ عنہ علی اور عباس رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: میں تم دونوں کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا تم دونوں کو بھی معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے یا نہیں؟ ان دونوں نے بھی کہا: (جی ہاں!) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک ایسا فرمایا ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب میں آپ لوگوں کو اس معاملے کی تفصیل سے آگاہ کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس غنیمت (فے) کا ایک مخصوص حصہ مقرر کر دیا ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی دوسرے کو نہیں دیا تھا۔ پھر انھوں نے اس آیت کی تلاوت کی:

﴿وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [الحشر: ٦]

[اور جو (مال) اللہ نے ان سے اپنے رسول پر لوٹایا تو تم نے اس پر نہ کوئی گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ اور لیکن اللہ اپنے رسولوں کو مسلط کر دیتا ہے، جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے]

تو یہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص رہا۔ اللہ کی قسم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو چھوڑ کر یہ (جائیداد) اپنے لیے جمع کر کے نہ رکھی اور نہ اسے خاص اپنے خرچ میں لائے، بلکہ تم ہی لوگوں کو دے دی اور تمھارے ہی کاموں میں خرچ کی۔ یہ جو جائداد بچ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سے اپنی بیویوں کا سال بھر کا خرچ لیا کرتے، پھر اس کے بعد جو باقی بچتا وہ اللہ کے مال میں شریک کر دیتے (یعنی سامان حرب وضرب میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر ایسا ہی کرتے رہے۔ میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم یہ جانتے ہو؟ انھوں نے کہا: جی ہاں۔ پھر انھوں نے علی و عباس رضی اللہ عنہما کو مخاطب کر کے کہا: میں تم دونوں کو بھی اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو بھی اس کا علم ہے؟

عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے اٹھا لیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔ لہٰذا انھوں نے اس (جائداد) کو لیا اور جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں مصارف کیا کرتے تھے، وہ کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) اپنے اس طرزِ عمل میں سچے، مخلص، نیکوکار اور حق کی پیروی کرنے والے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔

اب میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نائب مقرر ہوں۔ میری خلافت کو دو سال ہوگئے ہیں اور میں نے بھی اس (جائیداد) کو اپنی تحویل میں رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس میں جو مصارف کیا کرتے تھے، ویسے ہی میں بھی کرتا رہا۔ اللہ جانتا ہے کہ میں اپنے اس طرزِ عمل میں سچا، مخلص اور حق کی پیروی کرنے والا ہوں۔

پھر آپ دونوں میرے پاس مجھ سے گفتگو کرنے کے لیے آئے اور بالاتفاق گفتگو کرنے لگے کہ دونوں کا مقصد ایک تھا۔ جناب عباس! آپ تو اس لیے تشریف لائے کہ آپ کو اپنے بھتیجے کی میراث کا دعویٰ میرے سامنے پیش کرنا تھا۔ پھر علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: آپ (اے علی!) اس لیے تشریف لائے کہ آپ کو اپنی بیوی (فاطمہ رضی اللہ عنہا) کا دعویٰ پیش کرنا تھا کہ انھیں والد کی میراث ملنی چاہیے۔ میں نے تم دونوں سے عرض کر دی کہ رسول اللہ ﷺ خود فرما گئے کہ ''ہم (رسولوں) کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔'' پھر مجھے مناسب لگا کہ میں ان (جائیدادوں) کو تمھارے قبضے میں دے دوں تو میں نے تم دونوں سے کہا: دیکھو اگر تم چاہو تو میں یہ تمھارے سپرد کر دیتا ہوں، لیکن اس عہد اور اس اقرار پر کہ تم اس کی آمدنی سے وہ سب کام کرتے رہو گے جو آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت میں کرتے رہے اور جو کام میں اپنی حکومت کے شروع میں کرتا رہا۔ تم نے اس شرط کو قبول کر کے درخواست کی کہ یہ ہم کو دے دو۔ میں نے اس شرط پر دے دی۔ (اے حاضرین عثمان اور ان کے ساتھی وغیرہ!) کہو میں نے یہ اس شرط پر ان کے حوالے کی یا نہیں؟ انھوں نے کہا: جی ہاں۔ پھر انھوں نے علی و عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، میں نے اس شرط پر یہ آپ کے حوالے کی ہیں یا نہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ (عمر رضی اللہ عنہ نے) فرمایا: پھر مجھ سے کس بات کا فیصلہ چاہتے ہو۔ قسم اللہ کی جس کے حکم سے زمین اور آسمان قائم ہیں۔ میں تو اس کے سوا اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ اگر تم سے اس کا انتظام نہیں ہوسکتا تو پھر وہ میرے سپرد کر دو، میں اس کا بھی کام دیکھ لوں گا]

فتح الباری (۱۲/۱۴۴ مطبوعہ انصاری) پر ہے:

”وكانت هذه الصدقة بيد علي منعها عباسا فغلبه عليها، ثم كانت بيد الحسن، ثم بيد الحسين، ثم بيد علي بن الحسين والحسن بن الحسن، ثم بيد زيد بن الحسن، وهي صدقة رسول الله ﷺ حقا، وقال معمر: ثم كانت بيد عبد الله بن الحسن حتى ولي هؤلاء يعني بني العباس فقبضوها“ انتهى، والله تعالىٰ أعلم

[یہ صدقہ (رسول اللہ ﷺ کی وقف شدہ جائیداد) علی رضی اللہ عنہ کے زیرِ تولیت تھا، انھوں نے عباس رضی اللہ عنہ سے اسے روکا اور وہ تنہا اس کے متولی رہے۔ پھر حسن رضی اللہ عنہ، پھر حسین رضی اللہ عنہ، پھر علی بن حسین، پھر حسن بن حسن، پھر زید بن حسن یکے بعد دیگرے اس کے متولی رہے۔ یہ جائیداد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے برحق

صدقہ تھا۔ معمر کا بیان ہے کہ پھر یہ جائیداد عبداللہ بن حسن کی زیر تولیت رہی، حتی کہ بنو عباس نے اپنے عہدِ حکومت میں اس پر قبضہ کر لیا]

④ زمانہ مبارک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں وقف علی الاولاد وقوع میں آیا۔ "نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية" (٢/ ١٦٨) میں ہے:

"وفي الخلافيات للبيهقي قال أبو بكر عبد الله بن الزبير الحميدي: تصدق أبو بكر بداره بمكة علىٰ ولده فهي إلى اليوم، وتصدق عمر بربعه عند المروة، و بالثنية علىٰ ولده فهي إلى اليوم، وتصدق علي بأرضه وداره بمصر وبأمواله بالمدينة على ولده فذلك إلى اليوم، وتصدق سعد بن أبي وقاص بداره بالمدينة، وبداره بمصر على ولده فذلك إلى اليوم، و عثمان برومة فهي إلى اليوم، وعمرو بن العاص بالوهط من الطائف، وداره بمكة والمدينة على ولده فذلك إلى اليوم، قال: وما لا يحضرني كثير" انتهى

[امام بیہقی رحمہ اللہ کی خلافیات میں ہے کہ ابوبکر عبداللہ بن زبیر الحمیدی نے کہا ہے: ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مکے میں اپنا گھر اپنی اولاد پر صدقہ (وقف) کیا، لہٰذا وہ آج تک (وقف) چلا آتا ہے، عمر رضی اللہ عنہ نے مروہ کے پاس اور ثنیہ میں واقع اپنا گھر اپنی اولاد پر صدقہ کیا، پس وہ آج تک چلا آتا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے مصر میں اپنی زمین اور گھر اور مدینے میں اپنے اموال اپنی اولاد پر صدقہ کر دیے، جو آج تک چلے آتے ہیں۔ سعد بن ابی وقاص نے مدینہ اور مصر میں واقع اپنے گھر اپنی اولاد پر صدقہ کر دیے جو آج تک چلے آتے ہیں، عثمان رضی اللہ عنہ نے رومہ (نامی کنواں وقف کیا) جو آج تک چلا آتا ہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے طائف میں اپنی زمین اور مکہ و مدینہ میں اپنے گھر اپنی اولاد پر صدقہ کر دیے، جو آج تک یوں ہی چلے آتے ہیں اور مزید ایسے بہت سے وقف (اموال و اراضی وغیرہ) جن کا اس وقت مجھے استحضار نہیں ہے]

فتح الباری (١١/ ٤١) میں ہے:

"روى الدارمي في مسنده من طريق هشام بن عروة عن أبيه أن الزبير جعل دوره صدقة علىٰ بنيه، لا تباع ولا توهب ولا تورث"[1] انتهى والله تعالىٰ أعلم

[امام دارمی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں ہشام بن عروہ کے واسطے سے روایت کیا ہے، وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بلاشبہہ زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر اپنی اولاد پر صدقہ (وقف) کر دیے، اس شرط پر کہ ان کو بیچا جائے گا، ہبہ کیا جائے گا اور نہ بطورِ وراثت تقسیم کیا جائے گا]

كتبه: محمد عبد الله (بتاريخ ١٨/ ذی الحجه ١٣٣٥ھ)



[1] سنن الدارمي (٢/ ٥١٨)

کتاب البیوع

قرض سے زیادہ لینا جائز نہیں ہے:

سوال ہمارے ملک میں دھان پوس و ماگھ کے مہینے میں اگر ایک من رکھا جائے تو کاتک یا ساون میں سوکھ کر تقریباً ۴ سیر کم ایک من ہوتا ہے، یعنی تقریباً ۴ سیر کم ہوجاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پوس میں دھان کاٹا جاتا ہے، اس وقت کچھ تر ہوتا ہے بوجہ تازگی کے۔ لہٰذا مہاجن لوگ آسن یا کاتک یا ساون میں اگر کسی کو دہان قرض دیتے ہیں تو وعدہ و اقرار کر لیتے ہیں کہ ہم پوس میں وصول کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسان لوگ اگر پوس یا اگھن میں وصول نہ دیں تو پھر وصول کرنا مشکل ہوجاتا ہے اور وصول کرتے وقت فی من ۴ سیر دہان زیادہ لیتے ہیں، کیونکہ سوکھ کر ایک ہی من ہوگا، گویا ایک ہی من وصول کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس طرح سے زیادہ لینا جائز ہے؟ یہ صورتاً زیادہ ہے، ورنہ حقیقت میں بعد سوکھنے کے ایک ہی من رہتا ہے۔ اگر پوس میں ایک من لیں جتنا دیا تھا تو اس میں مہاجن کا نقصان ہے، یعنی ۴ سیر تقریباً کم ہوجاتا ہے، جو کچھ جواب ہو تحریر فرمائیں۔ سائل عبدالرزاق موضع جاگکٹو پور۔ ضلع بردوان۔ پوسٹ بھیدیہ (بنگال)

جواب اس صورت میں اس طرح سے زیادہ لینا شرعاً ہرگز جائز نہیں ہے۔ کسان لوگوں کو چاہیے کہ دہان کو سُکھا کر مہاجن کا قرض ادا کریں اور اسی قدر دیں جس قدر ان سے قرض لیا ہے اور مہاجنوں سے دھان قرض لیتے وقت سکھا کر دینے کا وعدہ و اقرار کرلیں۔ هذا ما عندي والله تعالىٰ أعلم

أملاه محمد عبدالرحمن المباركفوري، عفا الله تعالىٰ عنه.

کتے کی خرید و فروخت:

سوال تجارتِ سگ، یعنی کتے کی خرید و فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب سگ کی تجارت ناجائز ہے۔ "نصب الراية تخريج أحاديث الهداية" (۲/ ۱۹۵) میں ہے:

"أخرج البخاري و مسلم عن أبي مسعود الأنصاري أن رسول اللهﷺ نهىٰ عن ثمن الكلب، ومهر البغي، وحلوان الكاهن"[1] والله أعلم بالصواب

[بخاری و مسلم نے ابو مسعود انصاری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت، بدکار عورت کی کمائی اور کاہن کے نذرانے سے منع فرمایا ہے]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۱۲۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵٦۷)

مچھلی کو فروخت کرنا:

سوال مچھلی کو اپنے تالاب سے نکال کر اس کو بازار میں فروخت کرنا چاہیے یا نہیں؟

جواب اپنے تالاب کی مچھلی نکالی ہوئی اپنی مِلک ہے، جہاں چاہے فروخت کر سکتا ہے۔

دباغت سے قبل چمڑے کی خرید و فروخت کرنا:[1]

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ مردار کا چمڑہ بلا مدبوغ خرید و فروخت کرنا اور منفعت و قیمت کھانے و پینے میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب جائز نہیں ہے، جواز کے لیے دباغت شرط ہے۔ في المنتقی (ص: ٨):

عن ابن عباس قال: تصدق على مولاة لميمونة بشاة فماتت فمر بها رسول اللهﷺ فقال: هلا أخذتم إهابها فدبغتموه فانتفعتم به؟ فقالوا: إنها ميتة؟ فقال: إنما حرم أكلها. رواه الجماعة إلا ابن ماجه، قال فيه عن ميمونة جعلوه من مسبندها، وليس فيه للبخاري والنسائي ذكر الدباغ بحال، وفي لفظ لأحمد: أن داجنا لميمونة ماتت فقال رسول اللهﷺ: ألا انتفعتم بإهابها؟ ألا دبغتموه؟ فإنه ذكاته.[2]

وعن ابن عباس رضي الله عنهما قال: سمعت رسول اللهﷺ يقول: أيما إهاب دبغ فقد طهر.[3] (رواه أحمد ومسلم وابن ماجه والترمذي)

وعن عائشة رضي الله عنها أن النبيﷺ أمر أن ينتفع بجلود الميتة إذا دبغت، رواه الخمسة إلا الترمذي،[4] وللنسائي سئل النبيﷺ عن جلود الميتة فقال: دباغها ذكاتها[5] وللدارقطني عنها عن النبيﷺ قال: طهور كل أديم دباغه. قال الدارقطني: إسناده حسن كلهم ثقات.[6]

وعن ابن عباس رضي الله عنهما قال: ماتت شاة لسودة بنت زمعة فقالت: يا رسول الله! ماتت فلانة، تعني الشاة فقال: لو أخذتم مسكها. قالوا: أناخذ مسك شاة قد ماتت؟ فقال

---

[1] فتاویٰ نذیریہ (۲/ ۱۲۸)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦١٠) مسند أحمد (٣/ ٤٧٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٦) مسند أحمد (١/ ٢١٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٠٩)

[4] مسند أحمد (٦/ ٧٣)

[5] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٤٣)

[6] سنن الدارقطني (١/ ٤٩)

لها رسول اللهﷺ: إنما قال الله تعالىٰ ﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْدَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ﴾ وأنتم لا تطعمونه أن تدبغوه فتنفعوا به فأرسلت إليهم فسلخت مسكها فدبغته فاتخذت منه قربة حتى تخرقت عندها'' رواه أحمد بإسناد صحيح.[1] اهـ

فإن اختلج في صدرك أنه ورد في رواية البخاري ومالك في الموطأ وأحمد في مسنده وبعض طرق النسائي وغيرهم أن النبيﷺ قال في شاة مولاة ميمونةؓ: هلا انتفعتم بإهابها؟ قالوا: إنها ميتة قال: إنما حرم أكلها، ولم يذكر الدباغ فدل ذلك على أن جلد الميتة يحل الانتفاع به من غير حاجة إلى دباغه أزيح ذلك بأنه قد ورد التقييد بالدباغ في روايات أخرى صحيحة، والأخبار تفسر بعض طرقها بعضا فوجب الأخذ به. والله تعالىٰ أعلم بالصواب.

حضرت میمونہ کی ایک لونڈی کو صدقہ میں ایک بکری ملی تو وہ مر گئی، رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا تو آپ نے فرمایا: تم نے اس کا چمڑا کیوں نہ اُتار لیا کہ اس کو رنگ دے کر اس سے فائدہ اُٹھاتے؟ کہنے لگے: یہ تو مر گئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا صرف کھانا حرام ہے۔ بخاری اور نسائی کی روایت میں دباغت (رنگ دینے) کا ذکر نہیں ہے۔ احمد کی روایت میں ہے کہ میمونہ کی ایک بکری مر گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے اس کے چمڑے سے فائدہ کیوں نہ اُٹھایا کہ چمڑے کو رنگ کر دینا جانور کو ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو چمڑا رنگ دیا جائے، وہ پاک ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مردار کا چمڑا جب رنگ دیا جائے تو اس سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے، آپ ﷺ سے مردار کے چمڑے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: چمڑے کو رنگ دینا ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر چمڑے کا رنگ دینا، اس کے لیے پاکیزگی ہے۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں: اس کی سند اچھی ہے اور راوی ثقہ ہیں۔

ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ حضرت سودہ بنت زمعہ کی ایک بکری مر گئی تو انھوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میری بکری مر گئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی کھال اُتار لو۔ کہنے لگیں: مردار کی کھال اُتار لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے فرمایا ہے: ''آپ کہہ دیں جو مجھ پر وحی ہوئی ہے، اس میں تو کوئی چیز کسی کھانے والے پر حرام نہیں ہے سوائے مردار یا بہنے والے خون یا خنزیر کے گوشت کے۔'' اور تم مردار کو کھاؤ گے تو نہیں، تم اس کی کھال کو رنگ لو اور کام میں لاؤ۔ حضرت سودہ نے اس کی کھال اتروائی اور رنگ کر اس کی

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٢٧)

مشک بنالی اور پھر بالآخر وہ مشک پرانی ہوگئی۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اسے روایت کیا ہے۔

اگر کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ بخاری، موطا، مسند امام احمد اور سنن نسائی کے بعض طرق میں حضرت میمونہ کے واقعہ میں مردار کے چمڑے کو رنگ دینے کی شرط نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری تمام روایت میں رنگنے کی شرط موجود ہے اور احادیث کے بعض طرق بعض کی تفسیر کرتے ہیں تو اس شرط کا قبول کرنا ضروری ہے۔ کتبہ: محمد عبداللہ (مدرسہ احمدیہ آرہ) محمد بشیر سید محمد نذیر حسین

سوال سوداگری چمڑے خام کی جو مرداری ہو، جائز ہے یا نہیں؟

جواب سوداگری مردار کے چمڑے کی قبل دباغت جائز نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

قال تصدق علی مولاة لميمونة بشاة فماتت فمر بها رسول اللهﷺ فقال: « هلا أخذتم إهابها فدبغتموه فانتفعتم به؟» فقالوا: إنها ميتة. قال: « إنما حرم أكلها »[1] والله أعلم بالصواب

[سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی باندی کو ایک صدقے کی بکری دی گئی، پھر وہ مرگئی۔ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو فرمایا: تم نے اس کا چمڑا کیوں نہیں اتار لیا؟ اس کو رنگ کیوں نہیں لیا کہ تم اس سے کوئی فائدہ اٹھا لیتے؟" انھوں نے کہا: یہ مردار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حرام تو اس کا کھانا ہے]

فقط. حرره: أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفا الله عنه. الجواب صحيح.

كتبه: محمد عبد الله.

آزاد شخص کی خرید وفروخت:

سوال غلام اور لونڈی کے علاوہ آزاد آدمی کی بیع وشرا جو شرع میں ممنوع ہے، اس کی واضح ادلہ احادیث یا قرآن سے جو ہوں، بیان فرمائیں۔ اس ملک میں بعض لوگ لڑکا لڑکی بیچتے ہیں، جس قدر جلد ہو سکے، جواب کی ضرورت ہے۔

جواب آزاد آدمی کی بیع وشرا کے شرعاً ممنوع ہونے کی حدیثِ ذیل صحیح بخاری (۲/ ۱۹ مصری) "باب إثم من باع حرا" میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: « قال الله تعالیٰ: ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة، رجل أعطى بي، ثم غدر، ورجل باع حرا فأكل ثمنه، ورجل استأجر أجيراً فاستوفیٰ منه، ولم يعطه أجره»[2] والله أعلم

[سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تین

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٥٠)

شخص ایسے ہیں، جن کے خلاف قیامت کے دن میں خود مدعی ہوں گا۔ (ایک) وہ شخص جو میرا نام لے کر عہد کرے، پھر عہد شکنی کرے، (دوسرا) وہ آدمی جو کسی آزاد انسان کو (غلام بنا کر) بیچ ڈالے اور اس کی قیمت کھالے اور (تیسرا) وہ شخص جو کسی کو مزدور رکھے، پھر اس سے پورا کام لے کر اس کو اجرت نہ دے]

کتبہ: محمد عبد اللہ (۲/ ذی الحجۃ ۱۳۳۰ھ)

کیا ہندوستان میں عورتوں کی خرید و فروخت کرنا درست ہے؟

سوال اس ملک، یعنی ہندوستان میں کسی عورت کے وارثان کو اس عورت کی قیمت دے کر خرید لیں تو اس عورت کو اپنے تصرف میں بغیر نکاح کے لا سکتا ہے یا نہیں، جیسا کہ مکہ معظّمہ میں دستور ہے؟ دار الحرب میں یہ مسئلہ جاری ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب جہاں اہلِ اسلام اور کفار میں جہاد ہوتا ہے اور اہلِ اسلام کفار پر غالب آ کر کفار کی عورتوں کو اسیر کر لاتے ہیں، وہی عورتیں مسلمانوں کی مملوکہ اور شرعی لونڈی ہو جاتی ہیں، پھر تقسیم کے بعد جس کے حصے میں جو عورت پڑ جاتی ہے، جب تک وہ شخص اس کو آزاد نہ کر دے، اپنے تصرف میں لا سکتا ہے، اسی طرح وہ شخص بھی ان کو تصرف میں لا سکتا ہے، جو بذریعہ خریداری یا ہبہ یا وصیت یا میراث کے اُن کا مالک ہو جاتا ہے اور ان عورتوں کے بطن سے غیر مالک کے نطفہ سے جس قدر اولاد ہوتی جائے گی، وہ بھی اسی مالک کی مملوکہ اور شرعی غلام اور لونڈی ہو جائے گی۔ اسی طرح جہاں تک یہ سلسلہ نیچے چلا جائے، چونکہ ہندوستان میں جہاد کی صورت جاری نہیں ہے، لہٰذا نہ یہاں کی عورتوں کو خریدنا چاہیے اور نہ خرید کر کے ان کو بغیر نکاح کے اپنے تصرف میں لانا جائز ہے۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

کیا غیر اللہ کے نام پر پالا ہوا جانور خریدنا جائز ہے؟

سوال اگر کسی ہندو نے اپنے بت کے نام سے بکرا پالا تھا، بعد چندے اس ارادے سے باز آیا اور اس کو فروخت کرنا چاہتا ہے تو مسلمانوں کو اس کا خریدنا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ صاف صاف ارقام فرمائیں۔

جواب مسلمانوں کو اس بکرے کا خریدنا جائز ہے۔ واللہ أعلم بالصواب

سوال سانڈ جو ہندوستان میں ہنود لوگ آزاد کرتے ہیں، اس کا دربارہ حلت و حرمت کیا حکم ہے؟

جواب اگرچہ سانڈ کا آزاد کرنا محض ناجائز فعل، بلکہ عین شرک و کفر ہے، مگر سانڈ جو آزاد کیا گیا ہے حلال ہے، بمجرد آزاد کرنے اور غیر اللہ کے نام پر چھوڑنے سے حرام نہیں ہوا۔ ہاں اگر اس سانڈ کے ساتھ کسی کی ملکیت یا حق متعلق ہے تو اس صورت میں دوسرے کے لیے بدوں اس کے اذن کے حرام ہے، لیکن نہ غیر اللہ کے نام پر آزاد کیے جانے سے، بلکہ تعلق حقِ غیر کی جہت سے، جیسا کہ ہر چیز کا یہی حال ہے کہ بوجہ تعلق حق غیر کے بدوں اذن اس کے دوسرے کے حق میں حرام ہوتی ہے، الغرض کسی چیز کے غیر اللہ کے نام پر چھوڑے جانے سے اور آزاد کیے جانے سے اس چیز میں حرمت نہیں آ جاتی۔ تفصیل و تحقیق اس مسئلے کی ''فتویٰ سانڈ'' مصنفہ جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری (مدرس اول

مدرسہ احمدیہ آرہ) میں بہت بسط کے ساتھ کی گئی ہے۔ من أراد الوقوف على الدلائل فليرجع إليه.

حررہ: أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفا الله عنه۔ الجواب صحیح.

کتبه: محمد عبد الله.

ادھار بیع کی ایک صورت:

سوال بعض مسلمان سود پر روپیہ نہیں دیتے، مگر یہ معاملہ کرتے ہیں کہ تجارت پیشہ لوگوں کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ چیز نقد روپیہ کے ساتھ کوٹھی داروں سے خرید کر کے ان تجارت پیشہ لوگوں کو کچھ نفع کے ساتھ وہ چیز اُدھار دیتے ہیں۔ بعض ایسا کرتے ہیں کہ کسی تجارت پیشہ کی معرفت بمبئی یا کلکتہ سے نقد روپیہ کے ساتھ مال منگاتے ہیں، جس وقت مال پہنچتا ہے تو وہی دکاندار وہ مال کچھ نفع دے کر اُدھار پر اُس سے خریدتا ہے، اس قسم کے معاملات کثرت کے ساتھ جاری ہیں اور اکثر علما جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ حدیث: «بع الجمع بالدراهم، ثم ابتع بالدراهم جنيبا»[1] [ردی اور ملی جلی کھجوروں کو رقم کے ساتھ الگ بیچو اور پھر رقم کے ساتھ جنیب (عمدہ) کھجوریں خریدو] سے دلیل پکڑتے ہیں۔ اتحادِ جنس میں سود تھا، آپ نے اختلافِ جنس کی صورت بتلا دی، تاکہ معاملہ صورتِ سود سے نکل جائے۔

یہ بھی واضح رہے کہ تجارت پیشہ لوگوں کا روپیہ والوں سے یہ اقرار بھی ہوتا ہے کہ جس وقت تمھارا مال پہنچے، ہم تم کو کچھ نفع دے کر اُدھار پر خرید لیں گے، غرضکہ ان کی مطلوب چیزیں ان کے لیے اُن ہی کی معرفت طلب کی جاتی ہیں، بعد پہنچنے کے کچھ قلیل نفع دے کر اُدھار پر خریدتے ہیں۔ آپ کا اس میں کیا فتویٰ ہے؟

سائل: عبدالجبار غزنوی از امرتسر محلّہ غزنویہ۔

جواب میری دانست میں بھی یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ ان کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ مجھے معلوم نہیں ہوتی۔ والله تعالىٰ أعلم. کتبه: محمد عبد الله (۱۸/ رمضان المبارك ۱۳۲۹ھ)

تانبے پیتل کے برتنوں کی ادھار خرید و فروخت اور بیع سلم:

سوال ① کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس سودے کے بارے میں اور کیا مطلب ہے اس حدیث کا:

«قال رسول اللهﷺ: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد»[2] (رواه مسلم)

[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی، گندم کے بدلے گندم، جَو کے بدلے جَو، کھجور کے بدلے کھجور اور نمک کے بدلے نمک ایک دوسرے کے برابر ہوں اور نقد بنقد

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۰۸۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵۹۳)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵۸۷)

ہوں، جب یہ اصناف بدل جائیں تو پھر اگر وہ نقد ہو تو جیسے چاہے بیچو]

مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ برتن تانبے و پیتل و کانسی وغیرہ کے بیچتے بھی ہیں اور خریدتے بھی ہیں، اس میں اُدھار لاتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں تو یہ اُدھار خریدنا بیچنا سود ہے یا نہیں؟

② ہم لوگ کبھی اس مال کا پیشگی روپیہ دیتے ہیں اور مال دو یا تین ماہ کے بعد لیتے ہیں۔ غرض وقت مقرر کر لیتے ہیں اور مال بعد میں تلواتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زبانی بھاؤ کر لیتے ہیں اور مال دو ماہ کے بعد تُلواتے ہیں، ان دونوں صورتوں میں کونسی صورت جائز ہے؟

جواب ① اُدھار کی صورت جو سوال میں مذکور ہے، جائز ہے، اس میں سود نہیں ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے تیس صاع جَو خریدا تھا اور اس یہودی کے اطمینان کے لیے اس کے پاس اپنی خاص زرہ رہن رکھ دی تھی کہ جس وقت جَو کا دام ادا کر دیں گے، اپنی زرہ چھڑا لیں گے، حالانکہ جَو اُن چھ چیزوں میں سے ہے، جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث مندرجہ سوال میں مذکور ہیں۔ حدیث مذکور کے یہ الفاظ ہیں:

"عن عائشة رضي الله عنها قالت: اشترى رسول الله ﷺ طعاما من يهودي إلى أجل، ورهنه درعا له من حديد" [1] (متفق عليه)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے غلہ ادھار خریدا اور اپنی زرہ اس کے پاس رہن رکھی]

"وعنها قالت: توفي رسول الله ﷺ، ودرعه مرهونة عند يهودي بثلاثين صاعا من شعير" [2] (رواه البخاري)

[انھیں سے روایت ہے، وہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس حال میں فوت ہوئے کہ آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جَو کے عوض گروی پڑی ہوئی تھی]

"واعلم أنه اتفق العلماء على جواز بيع ربوي بربوي، لا يشاركه في الجنس مؤجلا و متفضلا، كبيع الذهب بالحنطة، والفضة بالشعير، وغيره من المكيل، واتفقوا على أنه لا يجوز بيع الشيئ بجنسه، وأحدهما مؤجل" (سبل السلام: ٢/ ٢٠)

[علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک ربوی چیز کی ادھار اور تفاضل کے ساتھ ایسی ربوی چیز کے ساتھ بیع کرنا جائز ہے جو جنس میں اس کی شریک نہ ہو، جیسے سونے کی گندم کے بدلے اور چاندی کی جَو کے بدلے وغیرہ ماپ والی چیزوں کی بیع کرنا۔ انھوں نے اس پر بھی اتفاق کیا ہے کہ کسی چیز کی اس کی جنس کے ساتھ بیع جائز نہیں، جب کہ ان میں سے ایک ادھار ہو]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٥٩)

اصل یہ ہے کہ اُدھار کی صورت میں سود اُس وقت ہوتا ہے کہ سودا اور دام دونوں ہم جنس ہوں اور قدر (کیل یا وزن) میں دونوں متفق ہوں۔ اگر سودا اور دام دونوں مختلف الجنس ہوں تو بھی قدر میں ضرور متفق ہوں اور اگر دونوں مختلف الجنس ہوں اور قدر میں متفق ہوں تو ایسی صورت میں سود نہیں ہوتا، نہ نقد میں نہ اُدھار میں اور صورت مسئول عنہا میں نہ دونوں ایک جنس ہیں (کیونکہ سودا تانبا پیتل کانسی وغیرہ کی قسم کی چیزوں سے ہے اور دام روپیہ یعنی چاندی ہے) اور نہ دونوں قدر میں متفق ہیں (اس لیے کہ گو چاندی اور تانبا پیتل وغیرہ کا وزن سیر اور پنیری اور من سے ہوتا ہے اور چاندی کا وزن تولہ اور ماشہ سے ہوتا ہے، پس دونوں جس طرح مختلف الجنس ہیں، مختلف القدر بھی ہیں) لہٰذا ایسی صورت میں سود نہیں ہے، نہ نقد میں نہ اُدھار میں اور حنفی مذہب میں بھی اُدھار کی یہ صورت جو مندرجہ سوال ہے، جائز ہے، اس میں سود نہیں ہے۔ ہدایہ (۲/ ۸۱ مطبع یوسفی لکھنوی) میں ہے:

"إذا أسلم النقود في الزعفران ونحوه يجوز، وإن جمعهما الوزن، لأنهما لا يتفقان في صفة الوزن، فإن الزعفران يوزن بالأمناء، وهو ثمن يتعين بالتعيين، والنقود توزن بالسنجات، و هو ثمن لا يتعين بالتعيين" انتهى والله تعالىٰ أعلم.

[اگر اس نے مال نقد کو زعفران وغیرہ کی بیع سلم میں دیا تو جائز ہے، اگر چہ زرِ نقد اور یہ چیزیں دونوں وزنی ہیں، لیکن ان کا جواز اس لیے ہے کہ دونوں کی وزنِ صفت یکساں نہیں ہے، چناں چہ زعفران کو من و سیر سے تولتے ہیں اور وہ ثمن ہے کہ وہ معین کرنے سے متعین ہو جاتا ہے اور نقود کو وزن درم، یعنی مثقال سے تولتے ہیں اور وہ ثمن ہے کہ معین کرنے سے متعین نہیں ہوتا ہے]

② یہ دوسری بیع سلم کی صورت ہے۔ بیع سلم کی بھی صورت جائز ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قدم رسول الله ﷺ المدينة، وهم يسلفون في الثمار السنة والسنتين والثلاث، فقال: ((من أسلف في شيئ فليسلف في كيل معلوم ووزن معلوم إلى أجل معلوم))[1] (متفق عليه، مشكوة، ص: ٢٤٢)

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ دو دو تین تین سال پہلے رقم دے کر کھجوریں خرید لیتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کھجوروں کی بیع سلف کرے تو اسے چاہیے کہ معلوم ماپ اور معلوم تول کے ساتھ معلوم مدت کے لیے بیع سلف کرے]

كتبه: محمد عبد الله (٢٦/ شوال ١٣٢٩هـ)

اتحادِ جنس کی صورت میں غلے کی ادھار خرید و فروخت کرنا:

سوال بیع غلہ کی درصورت اتحادِ جنس میعاد مقرر پر جائز ہے یا نہیں؟ یعنی غلہ کے عوض غلہ میعاد مقرر پر برابر لینا دینا۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠٤)

جواب بیع غلہ کی درصورت اتحادِ جنس میعادِ مقرر پر جائز نہیں۔ مشکاۃ میں ہے:

عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: «الذهب بالذهب و الفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح، مثلًا بمثل سواء بسواء يدا بيد، فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم، إذا كان يدا بيد»[1] (رواه مسلم)

[عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی، گندم کے بدلے گندم، جَو کے بدلے جَو، کھجور کے بدلے کھجور اور نمک کے بدلے نمک ایک دوسرے کے برابر ہوں اور نقد بنقد ہوں، جب یہ اصناف بدل جائیں تو پھر اگر وہ نقد ہو تو جیسے چاہے بیچو]

حرره: أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفا الله عنه۔ الجواب صحيح.

كتبه: محمد عبد الله.

بیع مرابحہ کی ایک صورت:

سوال بعضے لوگ سرکاری رسالے کے گھوڑوں کا دانا اور سواروں کے کھانے کا سامان آٹے دال وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں اور نقد پیسے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بھی ان کو دیتے ہیں اور سرکار سے مقرر کیا ہوا ہے کہ بازار کے نرخ سے مال کا پیسہ ہم لیں گے اور مال تولنے والے اور منشی لکھنے والے وغیرہ ان سب کی تنخواہ اپنے پاس سے دیں گے اور رسالہ تک مال اپنی بوریوں میں بھر کر اور کرایہ دے کر ہم پہنچائیں گے اور عوض اس محنتانہ کے جو بازار کے نرخ سے مال کا روپیہ اور جو نقد دیا گیا ہے، کل روپیوں پر فی روپیہ دو پیسے لیں گے۔ صورت مسئولہ میں یہ دو پیسے فی روپیہ عوض اس محنتانہ کے مقرر کر کے لینا جائز ہے یا نہیں اور یہ بھی واضح رہے کہ مال کا پیسہ جلدی مل جائے تو بھی دو پیسے فی روپیہ ملتے ہیں اور اگر چار پانچ ماہ سے یا زیادہ عرصہ سے ملے تو بھی اسی قدر ملتے ہیں؟ السائل محمد عثمان از جودھپور۔

جواب صورت مسئولہ میں یہ دو پیسے فی روپیہ عوض اس محنتانہ کے مقرر کر کے لینا جائز ہے، اس لیے کہ صورت مسئولہ مرابحہ کی صورت ہے اور مرابحہ کی صورت جائز ہے۔ ہاں صورت مسئولہ کا اس قدر حصہ کہ سواروں کو نقد دے کر اس میں بھی دو پیسے مقرر کر کے لینا، یہ جائز نہیں، اس لیے کہ یہ ربا (سود) ہے اور ربا حرام ہے۔ واللہ اعلم

كتبه: محمد عبد الله (٢٢/ ربيع الأول ١٣٣٢هـ)

ملکیت سے خارج شے کی خرید وفروخت کرنا:

سوال ایک صحابی فرماتے ہیں:

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨٧)

(2) یہ دو احادیث کے الفاظ ہیں۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٣٢، ١٢٣٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٠٣) سنن النسائي، رقم الحديث ([illegible]) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٨٧)

نهاني رسول الله ﷺ عن بيع ما ليس عندي، فقلت: يأتيني الرجل يريد مني البيع، وليس عندي فأبتاع له من السوق؟ فقال: «لا تبع ما ليس عندك»[2] (مشكوة)

[رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس چیز کو بیچنے سے منع کیا جو میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے عرض کی: میرے پاس ایک شخص آتا ہے اور مجھ سے کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے، جب کہ وہ چیز میرے پاس موجود نہیں، پھر میں اسے بازار سے خرید کر دے دیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو چیز تیرے پاس نہیں وہ فروخت نہ کرو]

اس کے بعد اور بھی اسی مضمون کی حدیث ہے اور مشکوۃ میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اب میں چند صورتیں پیش کر کے ان کے جواب کا انتظار کرتا ہوں، کتابیں نہیں ہیں، ورنہ آپ کو ان کے جوابات کی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔

شق اول: بعض خریدار خود دکاندار سے کہتے ہیں کہ تم فلاں کپڑا مجھے دو اور اگر تمھارے پاس نہیں ہے تو دوسری دکان سے مجھے لا دو، اس پر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دکاندار جس دام پر دوسری دکان سے کپڑا لاتا ہے، اسی دام پر خریدار کو دیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دکاندار، مثلاً آٹھ آنہ گز دوسری دکان سے لاتا ہے اور نو آنہ گز خریدار کو دیتا ہے۔ اگر خریدار خود دوسری دکان سے وہ کپڑا لیتا ہے تو اس کو وہاں بھی ۹ آنہ گز ملتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دکاندار، مثلاً: ۸ آنہ گز لا کر ۹ آنہ گز خریدار کو دیتا ہے، لیکن اگر خریدار خود اسی دکان پر جا کر لیتا ہے تو اس کو ۸ آنہ گز ملتا ہے، یعنی اس تیسری صورت میں خریدار کو نقصان پہنچا۔

شق ثانی: بعض خریدار دکاندار سے خود نہیں لیتے، مگر دکاندار اس کو پھنسائے رہنے کے خیال سے دوسری دکانوں سے اس کی فرمایش کو پورا کر دیتا ہے، اس شق میں بھی وہی تینوں صورتیں ہیں، جو شق اول میں مذکور ہوئیں، تو اب کل چھ صورتیں ہیں، ان میں سے ہر ایک صورت میں دو قسمیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ خریدار کو ان سب باتوں کا علم ہے، جن میں دکاندار اس قسم کے معاملات برتتے ہیں، دوسری یہ کہ خریدار کو علم نہیں ہے اور وہ ان باتوں کو نہیں جانتے۔ یہ سب بارہ صورتیں ہیں۔ آیا حدیث کی رو سے یہ سب صورتیں ناجائز ہیں یا بعض جائز اور بعض ناجائز؟ بصورت ثانی جواز ناجواز کی صورتوں کی تعیین کر دی جائے

دوسرے دکاندار اگر میرے پاس سے لے جائیں اپنے خریدار کو دینے کے لیے تو میں ان کو دوں یا نہ دوں؟ یہاں کپڑے کے دو بازار ہیں، ایک خردہ فروشوں کا اور ایک تھوک فروشوں کا، تھوک فروشوں کی دکان مارواڑیوں کی ہے، جتنے خردہ فروش ہیں، بوقت ضرورت مارواڑیوں سے لے کر بیچا کرتے ہیں، بسا اوقات یہ صورت پیش آ جاتی ہے کہ کسی چیز کی فرمایش کی اور وہ موجود نہیں رہی، تو تھوک فروش یعنی مارواڑیوں کے یہاں سے اسی وقت یا دوسرے وقت لاتے اور خردہ فروش کے طور پر بیچتے ہیں۔

اگر خریدار دو چار گز کا خریدار ہے، مارواڑیوں سے لینا چاہے تو نہیں دیں گے، تھان دو تھان یا اس سے زیادہ دیں گے اور اسی نرخ سے خریدار کو دیں گے، جس نرخ سے خردہ فروش دکانداروں کو دیتے ہیں۔ دکاندار لوگ

مارواڑیوں کے یہاں سے لاتے ہیں اور کسی قدر نفع رکھ کر خردہ فروشی کے طور پر بیچتے ہیں۔ پس خریدار کی فرمائش پر مارواڑیوں کے یہاں سے کپڑا لا کر اور اپنا نفع رکھ کر بیچنا درست ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں صحابی مذکور کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا: «لا تبع ما ليس عندك» ان کا یہ مطلب ہے کہ تم نے جو صورت بتائی ہے، وہ میری بیع میں داخل نہیں ہے، اس لیے کہ وہ چیز تمھارے پاس ہے، اگرچہ تم اس کو دوسرے کی دکان سے لاتے ہو۔ میں یہ کہتا ہوں کہ تم اس چیز کو نہ بیچو، جو تمھارے پاس نہیں ہے، جیسے عبدآبق یا مال مسروق۔ یہ مطلب کیسا ہے؟

جواب «لا تبع ما ليس عندك» قابلِ احتجاج معلوم ہوتی ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے اس کی تصحیح بھی کر دی ہے۔ (دیکھو: نیل: ۵/ ۱۵) اس حدیث میں جو «ما ليس عندك» ہے، اس کے معنی نیل (۵/ ۱۵) میں یہ لکھے ہیں:

"أي ما ليس في ملكك وقدرتك، والظاهر أنه يصدق على العبد المغصوب الذي لا يقدر على انتزاعه من هو في يده، وعلى الآبق الذي لا يعرف مكانه، والطير المنفلت الذي لا يعتاد رجوعه، ويدل على ذلك معنى "عند" لغة، قال الرضي: إنها تستعمل في الحاضر القريب، وما هو في حوزتك وإن كان بعيدا" انتهى

[یعنی جو چیز تیری ملکیت اور قدرت میں نہیں ہے۔ ظاہراً یہ حدیث اس غصب شدہ غلام پر بھی صادق آتی ہے جس کو غصب کرنے والے کے ہاتھ سے لینا ممکن نہ ہو اور اس مفرور غلام پر جس کی جائے قرار کا علم ہی نہ ہو اور ایسا چھوٹا ہوا پرندہ جو عادتاً واپس نہیں آتا، جیسا کہ "عند" کا لغوی معنی بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ رضی نے کہا ہے کہ یہ حاضر قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نیز اس چیز کے لیے جو تمھاری سلطنت میں ہو چاہے وہ دور ہی ہو]

"فيخرج عن هذا ما كان غائبا خارجا عن الملك أو داخلا فيه خارجا عن الحوزة، وظاهره أنه يقال لما كان حاضرا وإن كان خارجا عن الملك فمعنى قوله ﷺ: «لا تبع ما ليس عندك» أي ما ليس حاضرا عندك، ولا غائبا في ملكك، وتحت حوزتك، قال البغوي: النهي في هذا الحديث عند بيوع الأعيان التي لا يملكها أما بيع شيئ موصوف في ذمته فيجوز فيه السلم بشروطه... إلى قوله: وظاهر النهي تحريم ما لم يكن في ملك الإنسان، ولا داخلا تحت مقدرته، واستثني من ذلك السلم، فتكون أدلة جوازه مخصصة لهذا العموم، وكذلك إذا كان المبيع في ذمة المشتري إذ هو كالحاضر المقبوض" انتهى

[پس اس سے وہ چیز خارج ہے جو غائب ہو اور ملکیت سے باہر ہو یا ملکیت میں داخل ہو۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ (عند) اس چیز پر بولا جاتا ہے جو حاضر ہو، اگرچہ وہ ملکیت سے خارج ہو۔ لہٰذا آپ ﷺ کے فرمان: "جو چیز تیرے پاس نہیں، وہ فروخت نہ کر" کا مطلب ہے کہ وہ چیز فروخت نہ

کر جو تیرے پاس حاضر نہیں اور نہ وہ چیز جو تیری ملکیت سے خارج ہے اور تیرے زیرِ اثر نہیں۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں جو نہی اور ممانعت ہے، وہ بعینہٖ ان چیزوں سے ہے، جن کا فروخت کنندہ مالک نہ ہو۔ لیکن وہ چیز جو اس کی ذمہ داری میں ہے تو اس میں مع شروط بیع سلم کرنا جائز ہے... اس نہی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو چیز انسان کی ملکیت و قدرت میں نہ ہو، اس کو فروخت کرنا حرام ہے، نہ کہ وہ چیز جو اس کی قدرت اور اختیار میں ہو۔ بیع سلم اس سے مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا اس کے جواز کے دلائل اس عموم کو خاص کرنے والے ہوں گے۔ اسی طرح جو بیچی جانے والی چیز خریدار کے ذمے ہو، کیوں کہ وہ حاضر اور قبضے کے حکم میں ہے]

«ما ليس عندك» سے صاف مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیع (بعد اس کے کہ بائع وقتِ بیع خود اس کا مالک ہو یا منجانب مالک اس کی بیع کرنے کا مجاز ہو اور اس کی دلیل وہی عدمِ جواز تصرف در ملک غیر بلا اذن ہے، باستثناءِ سلم) مبیع بوقتِ بیع بائع کے قابو و قدرت میں ہو کہ خریدار کو بعد بیع کے تسلیم کر سکے۔ صورت مسئولہ میں خواہ خریدار خود بائع سے کہے کہ مجھے دوسری دکان سے لا دو یا منگا دو اور بائع خود دوسری دکان سے لائے یا منگائے، خریدار کے ہاتھ جتنے دام کو چاہے بیچے، بشرطیکہ کسی قسم کی دغا کو اس میں دخل نہ ہونے پائے تو یہ بیع مالیس عندک میں داخل نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (٥/ جمادى الثاني ١٣٣٢ھ)

قرض میں شرط اور چمڑے کی تجارت:

سوال اس شہر کے چمار جو تھوڑی پونجی سے دیہات سے چمڑا خرید کر شہری کو کم نفع پر فروخت کیا کرتے تھے اور اس تجارت سے یہ لوگ فائدہ اٹھاتے تھے، پس زید نے اللہ پر بھروسا کر کے چند نفوس کو ایک ایک سو روپیہ باہم پیشگی اس شرط پر دیا کہ اس روپیہ سے دیہات کا چمڑا خرید کر لاؤ، ہم تمھارا لایا ہوا چمڑا دساور جا کر یا دساور سے خریدار کو بلوا کر معقول نفع کے ساتھ فروخت کرا دیں گے اور بعد فروختگی اپنا حق المحنت ایک روپیہ ۴ آنے لے لیں گے۔[1]

جواب ① عبارتِ سوال سے جو سوال کا مطلب ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ زید نے جو روپیہ چاروں کو دیا، بطورِ قرض کے دیا، پس چمار اس صورت میں اس روپے کے مالک ہوگئے اور زید کو ان سے صرف اپنے روپے کے مطالبہ کا حق باقی رہا، پھر جب چماروں نے اس روپے سے جو چمڑے خریدے، وہ چمڑے بھی انھیں کے ملک ہوگئے اور زید نے جو ان چمڑوں کو دساور جا کر یا دساور سے خریدار کو بلوا کر معقول نفع کے ساتھ فروخت کر دیا، زید اس صورت میں ان کا دلال ہوگیا اور جو زید نے ایک روپیہ چار آنہ حق المحنت ان سے لیا، وہ زید کی دلالی ہوئی، ایسے معاملے کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ بجز اس کے معلوم نہیں ہوتی کہ زید نے جو روپیہ چماروں کو قرض دیا، وہ ایک شرط پر دیا، جو سوال میں مذکور ہے اور یہ شرط اس معاملے کے جواز کو مشتبہ کر دیتی ہے، لہٰذا یہ شرط اگر اس معاملے سے ساقط کر دی جائے

[1] اصل مسودے میں ایک ہی سوال مذکور ہے۔ اور بقیہ چار سوال ساقط ہیں۔

اور چماروں سے یوں کہہ دیا جائے کہ اگر اس روپے سے دیہات کا چمڑا خرید کر لاؤ گے اور ہم سے فروخت کرانے کو کہو گے تو ہم تمھارا چمڑا دساور جا کر یا دساور سے خریدار کو بلوا کر معقول نفع کے ساتھ فروخت کرا دیں گے اور ایک روپیہ ۴ آنے حق المحنت لے لیں گے تو یہ معاملہ بلاشبہہ جائز ہو جائے گا۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

(۲) مرداری چمڑے کی بغیر دباغت کے نہ تو تجارت جائز ہے اور نہ جاے نماز بنانا جائز ہے۔ مشکوۃ میں ہے:

"عن عبداللہ بن عباس قال: تصدق علی مولاۃ لمیمونۃ بشاۃ فماتت فمر بھا رسول اللہ ﷺ فقال: «ھلا أخذتم إھابھا فدبغتموہ فانتفعتم بہ؟»"[1] (متفق علیہ) واللہ أعلم.

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی باندی کو ایک صدقے کی بکری دی گئی، پھر وہ مرگئی۔ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو فرمایا: تم نے اس کا چمڑا کیوں نہیں اتار لیا پھر اس کو رنگ کیوں نہیں لیا کہ تم اس سے کوئی فائدہ اٹھا لیتے؟]

(۳) یہ طریقہ اسلامی طریقہ نہیں ہے، بلکہ غیر اہلِ ملت کا ہے اور تشبہ غیر اہلِ ملت کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ لحدیث: «من تشبہ بقوم فھو منھم»[2] [جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی تو وہ انھی میں سے ہوا]

(۴) ایسی تجارت ناجائز ہے، زید جو بکر سے ہر مہینے میں روپے کے معارضہ میں فی من ایک روپیہ لیتا ہے، سود میں داخل ہے اور سود حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ [البقرۃ: ۲۷۵] واللہ تعالیٰ أعلم

(۵) زید کے بیان مندرجہ سوال کی درستی مجھے معلوم نہیں ہے۔ اگر زید اپنے درستی بیان کے ثبوت میں کوئی حدیث مع سند پیش کرے تو اس حدیث مع سند کو بھیج دیجیے گا، اس پر غور کر لیا جائے گا۔ اگر حدیث مذکور بیان مذکور کے ثبوت میں سچ ثابت ہوئی تو آپ کو اطلاع دی جائے گی۔ واللہ تعالیٰ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۵/ شعبان)

کفار کے میلوں میں سامان بیچنے کے لیے جانا:

سوال (۱) اکثر مسلمان تجار اپنا مالِ تجارت واسطے فروخت کرنے کے کفار کے میلوں میں و نیز مسلمانوں کے میلوں میں جو پرستش گاہیں مقرر ہیں، لے جاتے ہیں اور نیت ان کی صرف فروخت کرنے مال ہے نہ اور کام سے۔ آیا ان کا مال لے جانا درست ہے یا نہیں؟

(۲) اکثر تجارتوں میں دستور ہے، مثلاً: کپڑا جوتا وغیرہ کی بیع ہو جانے کے بعد مشتری بائع سے ایک پیسہ تھان یا پیسہ جوڑا کاٹ لیا کرتا ہے اور بائع جانتا ہے کہ جس قدر پر بیع ہوئی ہے، اس سے ایک پیسہ مجھ کو کم ملے گا اور بائع و مشتری سے یہاں مراد کاریگر و سوداگر ہیں، یعنی مشتری سوداگر اور بائع بننے والا تھان کا یا جوتا بنانے والا نہ کہ عام بائع اور مشتری، کیونکہ عام لوگوں میں پیسہ نہیں کٹتا۔ آیا یہ کاٹنا پیسہ کا درست ہے یا نہیں؟

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۶۳)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۰۳۱)

جواب 1 ایسے ناجائز میلوں میں سوائے وعظ ونصیحت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کے اور کسی غرض سے جانا درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَ مَا عَلَى الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ﴾ [سورۂ أنعام، رکوع: ۸]

یعنی اور جب تو اُن لوگوں کو دیکھے، جو ہماری آیتوں میں خوض کرتے ہیں تو تُو ان سے منہ پھیر لے، یعنی ان کے ساتھ نہ بیٹھ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں خوض کریں اور اگر شیطان تجھ کو (ان سے منہ پھیرنا) بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد ان کے ساتھ نہ بیٹھ اور جو لوگ کہ ہماری آیتوں میں خوض کرنے والوں ظالموں کے ساتھ بیٹھنے سے پرہیز کرتے ہیں، ان پر ان ظالموں کے محاسبہ میں سے کچھ نہیں ہے، لیکن ان پر ان ظالموں کو نصیحت کر دینا ہے تا کہ وہ بچیں۔

﴿وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا وَ یُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖۤ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ۲۰]

یعنی اللہ تعالیٰ تم پر اس کتاب میں اتار چکا ہے کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ ان کا انکار کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ٹھٹھا کیا جاتا ہے تو اُن (انکار کرنے والے اور ٹھٹھا کرنے والے) کے ساتھ نہ بیٹھ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں خوض کرنے لگیں، یقیناً تم انھیں کے مثل ہو، جب تم ان کے ساتھ بیٹھے رہ گئے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

«من كثر سواد قوم فهو منهم»[1]

(رواه أبو يعلى الموصلي في مسنده، و رواه علي بن معبد في كتاب الطاعة والمعصية، نقله الزيلعي في نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية: ۲/ ۳۴۳)

یعنی جو کسی قوم کی جماعت کو بڑھائے، وہ انھیں میں سے ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

2 یہ کاٹا پیسہ کا درست ہے، جبکہ سوداگروں میں اس کا دستور ہے اور بائع پھر اس کو جانتا ہے اور اس پر راضی ہے، کیونکہ ایسے امور میں عرف و دستور پر عمل کرنا شرعاً درست ہے۔

«المسلمون علىٰ شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما»[2]

(بلوغ المرام، باب الصلح، مطبوعه فاروقي دهلي، ص: ۵۷)

[مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہوتے ہیں، اس شرط کے سوا جو حلال کو حرام کر دے یا حرام کو حلال کر دے]

---

[1] نصب الراية (٤/ ٤٠٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٥٢)

بیع سلم جائز ہے:

سوال ایک شخص نے ایک شخص سے بماہ بھادوں ایک روپیہ اس شرط پر لیا کہ ماہِ چیت میں چار پنجیری یعنی بیس سیر دوں گا، حالانکہ ماہِ بھادوں میں گیہوں تیرہ سیر بکتی تھی اور ماہِ چیت، جس کا وعدہ انھوں نے کیا ہے، اس مہینے میں وہی تیرہ سیر بکتی ہے تو اس صورت میں بیس سیر مطابق وعدہ کے لینا درست ہے یا نہیں؟ بینوا تؤجروا.

جواب اس صورت میں بیس سیر مطابق وعدہ کے لینا درست ہے، اس معاملے کا نام شرع شریف میں سَلَم ہے۔ سلم کو سلف بھی کہتے ہیں۔ سلم میں جو چیز مدت پر لی جائے، اس کا کیل یا وزن اور مدت معلوم ہوجانا شرط ہے اور اس صورت میں یہ شرط پائی جاتی ہے۔

مشکوۃ شریف (ص: ۲۴۲ چھاپہ انصاری دہلی) میں ہے:

«من أسلف في شيء فليسلف في كيل معلوم و وزن معلوم إلیٰ أجل معلوم»[1] (متفق عليه) والله أعلم بالصواب

[جو شخص کسی شے میں بیع سلف کرے تو اسے چاہیے کہ معلوم ماپ اور معلوم تول کے ساتھ معلوم مدت کے لیے بیع سلف کرے]

كتبه: محمد عبد الله

سوال کیا جناب رسول اللہ ﷺ کھانے کی چیزوں پر پیشگی بھاؤ مقرر کر کے روپیہ دیتے تھے اور وقت معین پر وہ جنس اسی بھاؤ کے بموجب لیتے تھے؟ ایسا خریدنا حدیثوں سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب ایسا خریدنا حدیث سے ثابت ہے اور اس کو سلم اور سلف کہتے ہیں۔ مشکوۃ شریف (۲۴۲ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قدم رسول الله ﷺ المدينة، وهم يسلفون في الثمار السنة والسنتين والثلاث، فقال: «من أسلف في شيء فليسلف في كيل معلوم و وزن معلوم إلى أجل معلوم»[2] (متفق عليه) والله أعلم بالصواب

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ دو دو تین تین سال پہلے رقم دے کر پھل خرید لیتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی شے میں بیع سلف کرے تو اسے چاہیے کہ معلوم ماپ اور معلوم تول کے ساتھ معلوم مدت کے لیے بیع سلف کرے]

كتبه: محمد عبد الله

سوال اگر کوئی شخص پانچ پسیری مکئی یا جو کسی کو دے اور چار ماہ کے بعد چار پسیری چاول لے تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب اگر کوئی پانچ پسیری مکئی یا جو کسی کو دے اور چار مہینے کی مدت پر جو بوقت دینے کے قرار پا چکی ہے، چار پسیری

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠٤)

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠٤)

چاول لے تو ایسا لین دین جائز ہے۔ یہ ایک قسم کی بیع ہے جس کو شرع شریف میں بیع سَلَم یا بیع سَلَف کہتے ہیں۔ بخاری شریف کی ''کتاب السلم'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

«من أسلف في شيئ فليسلف في كيل معلوم ووزن معلوم إلى أجل معلوم»[1] واللّٰه أعلم بالصواب

[جو شخص کسی شے میں بیع سلف کرے تو اسے چاہیے کہ معلوم ماپ اور معلوم تول کے ساتھ معلوم مدت کے لیے بیع سلف کرے]

کیا گروی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے؟

سوال اشیاے مرہونہ سے مرتہن کو کسی صورت میں فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب اشیاے مرہونہ سے مرتہن کو کچھ بھی فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اشیاے مرہونہ سے مرتہن جو کچھ فائدہ اٹھائے، وہ سب داخلِ ربا ہے، جو قطعاً حرام ہے۔ قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرة: ٢٧٥) [حالاں کہ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا]

وعن أنس قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: «إذا أقرض أحدكم قرضا فأهدى إليه أو حمله على الدابة فلا يركبه، ولا يقبلها إلا أن يكون جرى بينه وبينه قبل ذلك»[2]

(رواه ابن ماجه والبيهقي في شعب الإيمان)

[انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص جب (کسی کو) قرض دے، پھر وہ (مقروض) اسے کوئی تحفہ دے یا سواری کے لیے جانور پیش کرے تو (قرض خواہ کو چاہیے کہ) وہ اس پر سواری نہ کرے اور نہ وہ (تحفہ) قبول کرے، سوائے اس کے کہ ان دونوں میں پہلے سے (تحائف کا) یہ سلسلہ جاری ہو]

وعنه عن النبي ﷺ قال: «إذا أقرض الرجل الرجل فلا يأخذ هديته»[3]

(رواه البخاري في تاريخه، هكذا في المنتقیٰ)

[انس رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص جب کسی شخص کو قرض دے تو وہ (قرض خواہ) اس (مقروض) سے تحفہ نہ لے]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠٤)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٣٢) اس کی سند متعدد علل کی بنا پر ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١٦٢)

[3] منتقیٰ الأخبار (٢٧٩٠) مشكاة المصابيح (٢/ ١٤٠) تاریخ کبیر میں یہ حدیث نہیں مل سکی اور نہ اس کی سند ہی معلوم ہو سکی ہے۔ یہ گذشتہ حدیث ہی کا اختصار معلوم ہوتا ہے۔

وعن أبي بردة بن أبي موسىٰ قال: قدمت المدينة فلقيت عبد الله بن سلام، فقال: إنك بأرض فيها الربا فاش، فإذا كان لك على رجل حق فأهدى إليك حمل تبن أو حمل شعير أو حبل قت فلا تأخذه فإنه ربا» [1] (رواه البخاري، مشكوة، ص: ٢٣٨)

[ابو بردہ بن ابو موسیٰ بیان کرتے ہیں، میں مدینے گیا تو میں نے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی تو انھوں نے فرمایا: تم ایسے ملک میں رہتے ہو، جہاں سود عام ہے، جب تمھارا کسی پر کوئی حق ہو اور وہ گھاس کا ایک گٹھا یا جَو یا جنگلی ہرے چارے کا ایک گٹھا بطورِ ہدیہ بھیجے تو اسے نہ لو، کیوں کہ وہ سود ہے]

کتبہ: محمد عبد اللہ

بلاشک مرتہن کو شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانا ناجائز اور سود میں داخل ہے، لیکن سواری یا دودھ والا جانور اگر مرہون ہو تو اس شرط کے ساتھ کہ اس کا نفقہ مرتہن کے ذمہ ہوئے تو مرتہن کو فائدہ اٹھانا جائز ہے، جیسا کہ حدیث مذکور بجواب صاف دلالت کرتی ہے۔ اس پر مکان مرہون کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ جانور کی زندگی کا دارومدار کھلانے پلانے پر ہے، اگر یہ بات نہ ہوگی تو وہ ضائع ہو جائے گا، مکان کی یہ کیفیت نہیں۔ کما لا يخفى والله أعلم.

کتبہ: محمد عبد الجبار عمر پوری

سوال ایک شخص نے اپنی اراضی بعوض مبلغ سو روپیہ پر ایک شخص کے پاس رہن رکھ دی، اس شرط پر کہ تم میری اراضی قبضہ میں رکھ کر نفع حاصل کرو، جب میں سو روپیہ تمھارا دے دوں تو میری اراضی تم چھوڑ دو، نفع اراضی کا میں کچھ حساب تم سے نہیں لوں گا۔ ایسا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب ایسا معاملہ کرنا درست نہیں ہے، اس پر ربا کی صریحاً تعریف صادق آتی ہے اور ربا حقیقتاً حرام ہے، لقولہ تعالیٰ: ﴿ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ [البقرة: ٢٧٥] والله أعلم بالصواب

سوال زید نے بکر سے ایک قطعہ زمین رہن لیا اور اراضی رہن کی مالگزاری مرتہن (زید) ادا کرتا ہے اور تا ادائے روپیہ کے اس رہن داری میں شرط ہے کہ اس رہن کی پیدا وار، زید اپنے مَصرف میں لائے تو ایسی حالت میں شرعاً بہ قرآن و حدیث اس زمین کی فصل کھانا زید کو جائز ہے یا ناجائز؟

جواب ایسی حالت میں زید کو اس زمین کی فصل (پیداوار) میں سے بقدر مال گزاری (جس قدر زید کو اُس میں مال گزاری ادا کرنی پڑتی ہے) کھانا جائز ہے اور اس قدر سے زائد زید کو کھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس قدر سے زائد پر ربا کی تعریف صادق آتی ہے۔

كما في حديث أبي سعيد من قولهﷺ: «فمن زاد أو استزاد فقد أربىٰ» [2]

(رواه أحمد و مسلم، المنتقى باب ما يجري فيه من الربا)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٠٣)

[2] مسند أحمد (٣/ ٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨٤)

[جس طرح ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان ہے: جو زیادہ دے یا زیادہ لے تو اس نے سود کا لین دین کیا]

اور ربا حرام ہے: لقوله تعالیٰ: ﴿وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ [البقرة: ۲۷۵] [اور سود کو حرام کیا]

وقولهﷺ: «درهم ربا يأكله الرجل، وهو يعلم أشد من ست و ثلاثين زنية»[1] (المنتقى، باب التشديد فيه) والله تعالیٰ أعلم

[آپ ﷺ کا فرمان ہے: جو شخص جانتے ہوئے ایک درہم سود کھاتا ہے تو یہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سنگین ہے]

کتبہ: محمد عبد الله (ذی الحجه ۱۳۳۱ھ)

توبہ کے بعد سودی مال کی حلت اور گروی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا:

سوال ① زید نے ایک زمانے تک سود لیا، بعدہ اس نے سود سے توبہ کیا۔ اب وہ سودی مال بعد توبہ کرنے کے پاک ہوگا یا نہیں اور اس کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے یا نہیں اور غیر شخص سود خوار کے یہاں کھا سکتا ہے یا نہیں؟

② زید کاشتکاری کرتا ہے، اُسی کاشت میں سے سرکار کی مال گزاری دیتا ہے یا جس زمیندار کی زمین ہے، اس کو نصف غلہ بانٹ دیتا ہے۔ آیا اس کے اوپر عشر واجب ہے یا نہیں اور سرکار کی مال گزاری کچھ کسی شمار میں ہوگی یا نہیں؟

③ زید، جو مرتہن ہے، اشیاے مرہونہ ذوی العقول و غیر ذوی العقول، یعنی اراضیات وغیرہ سے نفع اُٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اٹھا سکتا ہے تو کس دلیل سے اور ذوی العقول میں تو صراحت ہے کہ بعوض نفقہ کے، لیکن غیر ذوی العقول میں کس کے عوض میں نفع اٹھا سکتا ہے؟

جواب ① زید نے جو سودی مال حاصل کیا تھا، بعد توبہ کے وہ سودی مال پاک ہوگیا، اس کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ [سورۂ بقرہ، رکوع: ۳۸]

[پھر جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت آئے، پس وہ باز آجائے تو جو پہلے ہو چکا، وہ اسی کا ہے]

﴿مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾

[سورۂ فرقان، رکوع آخر]

[جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا، نیک عمل تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا]

جو شخص سودی مال حاصل کرے، وہ مال اس کے حق میں حرام ہے، کیونکہ اس نے اس مال کو باطل اور ناجائز طور سے حاصل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (سورۂ بقرہ، رکوع: ۲۳ و سورۂ نساء، رکوع: ۵) [اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ] لیکن دوسرے شخص کو، جس کو وہ مال زید کے ہاتھ سے مشروع اور جائز طور سے حاصل ہوا ہو، اس کے حق میں وہ مال حرام نہیں ہے، کیونکہ اس دوسرے شخص

[1] مسند أحمد (۵/ ۲۲۵) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۰۳۳)

نے اس مال کو باطل اور ناجائز طور سے حاصل نہیں کیا ہے۔

(۲) اس صورت میں بھی زید کاشت کار پر عشر یا نصف عشر (جیسی صورت ہو) واجب ہے، بشرطیکہ جس قدر غلہ اس کی ملک میں حاصل ہو، وہ پانچ وسق سے کم نہ ہو اور اگر کم ہو تو واجب نہیں ہے۔

(۳) مرتہن اشیائے مرہونہ سے نفع نہیں اُٹھا سکتا، کیونکہ یہ ربا ہے، لیکن جس صورت میں اشیائے مرہونہ از قسم سواری یا دودھ کے جانور مرہون ہوں اور مرتہن ہی پر اُس کا نفقہ ہو تو مرتہن بقدر اپنے نفقہ کے ان جانوروں کی سواری اور دودھ سے نفع اٹھا سکتا ہے، قدر نفقہ سے زائد نفع نہیں اٹھا سکتا۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

نقد اور ادھار بیع میں فرق کرنا[1]:

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ، مثلاً: دھان نقد بارہ پنسیری کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ اگر اسی دھان کو اُدھار، یعنی قرض ایک من کے حساب سے فروخت کرے تو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا!

جواب ایسی بیع جائز ہے، کیوں کہ عمومی دلائل اس کے جواز پر دلالت کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ وقوله تعالیٰ: ﴿لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ وغير ذلك من النصوص. قال في النيل: (٥/ ١٣٧) وهو مذهب الشافعية والحنفية والجمهور. ومن قال: يحرم بيع الشيئ بأكثر من سعر يومه لأجل النسآء، تمسك بحديث أبي هريرة رضی اللہ عنہ مرفوعاً: من باع بيعتين في بيعة فله أوكسهما أو الربا، رواه أبو داود.[2] وفيه أن في إسناده محمد بن عمرو بن علقمة. قال في النيل (٥/ ١٢): وقد تكلم فيه غير واحد، قال المنذري والمشهور عنه من رواية الدراوردي، و محمد بن عبد الله الأنصاري أنه صلی اللہ علیہ وسلم نهى عن بيعتين في بيعة. قال (٥/ ١٣): ولا حجة فيه على المطلوب، ولو سلمنا أن تلك الرواية التي تفرد بها ذلك الراوي صالحة للاحتجاج لكان احتمالها لتفسير خارج عن محل النزاع كما سلف عن ابن رسلان (وهو أن يسلفه دينارا في قفيز حنطة إلى شهر، فلما حل الأجل طالبه بالحنطة قال يعني القفيز الذي لك علي إلى شهرين بقفيزين فصار ذلك بيعتين في بيعة، لأن البيع الثاني قد دخل على الأول فيرد إليه أوكسهما، وهو الأول كذا في شرح السنن لابن رسلان) قادحا في الاستدلال بها علىٰ المتنازع فيه علىٰ أن غاية ما فيها الدلالة علىٰ المنع من البيع إذا وقع على هذه الصورة، وهي أن يقول نقدا بكذا ونسيئة

---

(1) فتاویٰ نذیریہ (۲۰/۱۶۲)

(2) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٦١)

بكذا إلا إذا قال من أول الأمر نسيئة بكذا فقط، وكان أكثر من سعر يومه مع أن المتمسكين بهذه الرواية يمنعون من هذه الصورة، ولا يدل الحديث على ذلك فالدليل أخص من الدعوىٰ، وقد جمعنا رسالة في هذه المسئلة وسميناها شفاء الغلل في حكم زيادة الثمن لمجرد الأجل، وحققناها تحقيقا لم نسبق إليه"[1] والله أعلم بالصواب.

[اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام" نیز فرمایا: "ایماندارو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھایا کرو۔" ہاں اگر رضا مندی سے تجارت ہو تو درست ہے۔ نیل الاوطار (۵/۱۳) میں شافعیہ، حنفیہ اور جمہور کا یہی مذہب مذکور ہے۔

جو لوگ ادھار کی وجہ سے وقتی نرخ سے زیادہ لینا حرام سمجھتے ہیں، ان کی دلیل ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ایک بیع میں دو بیع کرے، اسے چاہیے کہ یا تو کم لے لے یا پھر سود کھائے۔ اس حدیث کی سند میں محمد بن عمرو بن علقمہ ضعیف ہے،[2] پھر اس کا جواب یہ بھی ہے کہ اس کے معنی اور بھی تو ہو سکتے ہیں، مثلاً: ایک آدمی ایک ٹوپہ گندم ایک روپیہ میں ایک مہینے کی میعاد پر لیتا ہے، ایک مہینے کے بعد گندم لینے والا مطالبہ کرے تو دینے والا کہے کہ میرے پاس اس وقت گندم نہیں ہے تو دو مہینے کے بعد مجھ سے دو ٹوپہ گندم لے لینا۔ ایک بیع میں دو بیع کرنے کا یہ مطلب ہے، اس صورت میں کم قیمت پر بیع کرنا ضرور ہوگا، ورنہ زیادتی، جو دوسری بیع میں کی جا رہی ہے، وہ سود شمار ہوگی۔ ابن رسلان کی شرح السنن میں ایسا ہی ہے۔ اگر ایک چیز کی دو قیمتیں بتائے نقد کی اور، اور ادھار کی اور تو اس صورت کو مانعین نے ناجائز کہا ہے، لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور اگر ادھار کی قیمت وقتی نرخ سے زیادہ بتائے اور وقتی نرخ بتائے تو اس صورت میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ ہم نے اس کی تفصیل ایک مستقل رسالے میں بیان کی ہے، جس کا نام "شفاء الغلل في حكم زيادة الثمن لمجرد الأجل" ہے]

كتبه: محمد عبدالله، عفي عنه. سيد محمد نذير حسين

سودی بیع اور نقد ادھار خرید و فروخت میں فرق کرنا:

سوال ① ایک شخص نے ایک شخص سے مبلغ دس روپیہ لیا، اس شرط پر کہ آیندہ پوس مہینے میں فی روپیہ ایک من غلہ دوں گا۔ بائع یعنی روپیہ دینے والے نے بھی اس شرط کو قبول کر لیا۔ جب یوم معہود پہنچا تو بائع نے غلہ طلب کیا۔ مشتری نے عذر پیش کیا کہ امسال غلہ تو ہوا ہی نہیں، بائع نے زجر و توبیخ کا آغاز کیا کہ مجھ کو ایک من غلہ دے دو، اس وقت ازروے نرخ خرید و فروخت کے دس من غلہ کے یہ نرخ تین روپیہ من کے حساب سے مبلغ تیس روپیہ ہوتے

[1] نيل الأوطار (٥/ ٢١٤)

[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "صدوق له أوهام" (تقريب التهذيب، ص: ٤٩٩)

ہیں۔ آیا دس من غلہ دیتے ہو یا تیس روپیہ؟ مشتری بوجہ عدم دستیاب غلہ آیندہ تیس من غلہ دینے کا وعدہ کیا۔ تب بائع نے مشتری سے کہا کہ روپیہ بلا شرط آیندہ کے وعدہ پر نہیں چھوڑوں گا، آیندہ فی روپیہ کیا حساب غلہ دو گے؟ مشتری نے پھر روپیہ من غلہ دینے کا وعدہ کیا۔ اب یہ بیع و شراء شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جو دس سے بیس روپیہ انتفاع حاصل ہوئے، سود ہے یا نہیں؟

② آنکہ مشتری باستدعائے غلہ نزدیک بائع کے گیا، بائع نے کہا کہ نقد لو گے یا ادھار؟ مشتری نے کہا: ادھار لوں گا۔ تب بائع نے کہا کہ نقد دو روپیہ کے حساب سے فروخت کرتا ہوں اور ادھار بحساب تین روپیہ من۔ مشتری فی من تین روپیہ دینے کا وعدہ پر دس من غلہ لیا۔ یہ بیع شرعا جائز ہے یا نہیں؟

③ آنکہ ایک شخص نزدیک ایک شخص کے دس بیگہہ زمین رہن رکھ کر مبلغ سو روپیہ قرض لیا، اس وعدہ پر کہ جس وقت روپیہ ادا کر دوں گا، زمین واپس لوں گا۔ تم مال گزاری زمیندار کو دیجیو اور جائداد وغیرہ اپنے تصرف میں لائیو، پس اثنائے رہن رکھنے راہن اور واپس لینے شے مرہون تک جو انتفاع مرتہن تصرف میں لاتا ہے، وہ منفعت مقبوضہ متصرفہ شرعاً سود ہے یا نہیں؟

جواب ① ایسی بیع شرعاً ناجائز ہے اور جو دس روپیہ سے بیس روپیہ انتفاع حاصل ہوئے، وہ سود ہیں۔ مشکوۃ شریف (ص: ۲۴۳ چھاپہ دہلی) میں ہے:

عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «من أسلف في شيئ فلا يصرفه إلىٰ غيره قبل أن يقبضه»[1] (رواه أبو داود و ابن ماجه)

[ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی چیز میں بیع سلف کرے تو وہ اسے قبضے میں لیے بغیر دوسری چیز (کی بیع) سے تبدیلی نہ کرے]

② یہ بیع شرعاً جائز ہے۔ مشکوۃ شریف (ص: ۲۴۰) میں ہے:

"عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة"[2]

(رواه مالك والترمذي وأبو داود والنسائي)

[سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع فرمایا]

سنن ترمذی (ص: ۱۵۷ چھاپہ دہلی) میں ہے:

حديث أبي هريرة حديث حسن صحيح، والعمل على هذا عند أهل العلم، وقد فسر بعض أهل العلم قالوا: بيعتين في بيعة أن يقول: أبيعك هذا الثوب بنقد بعشرة،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳٤٦۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۲۸۳) اس کی سند میں "عطية العوفي" ضعیف ہے۔

[2] موطأ الإمام مالك (۱۳٤۲) سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۳۷۷) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۲۳۱) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦۳۲)

وبنسيئة بعشرين، ولا يفارقه على أحد البيعين، فإذا فارقه على أحدهما فلا بأس إذا كانت العقدة على واحد منهما" انتهى

[ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی (مذکورہ بالا) حدیث، حسن صحیح ہے۔ اہلِ علم کے ہاں اسی پر عمل ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے: ایک سودے میں دو سودے اس طرح ہوتے ہیں کہ وہ کہے: میں تمھیں یہ کپڑا نقد دس (درہم وغیرہ) میں فروخت کرتا ہوں اور ادھار بیس کا اور وہ ان دونوں میں سے کوئی ایک سودا قبول کیے بغیر جدا ہو جائے۔ پس اگر وہ کوئی ایک سودا قبول کر کے جدا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ ان میں سے کوئی ایک سودا طے ہو جائے]

③ زمیندار کو مال گزاری دے کر جو منفعت مرتہن کو اس زمین سے حاصل ہوگی، وہ سب سود ہے۔

مشکوۃ شریف (ص: ۲۴۶) میں ہے:

عن عبادة بن الصامت رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد»[1] (رواہ مسلم) والله أعلم بالصواب.

[عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی، گندم کے بدلے گندم، جَو کے بدلے جَو، کھجور کے بدلے کھجور اور نمک کے بدلے نمک ایک دوسرے کے برابر ہوں اور نقد بنقد ہوں، جب یہ اصناف بدل جائیں تو پھر اگر وہ نقد ہو تو جیسے چاہے بیچو]

كتبه: محمد عبد الله

کافر یا نصاریٰ سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

سوال کافر یا نصاریٰ سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب سود کے بارے میں جس قدر آیات و احادیثِ صحیحہ وارد ہیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ کافر یا نصاریٰ سے سود لینا جائز ہے، بلکہ ان سب میں یہی ہے کہ سود لینا مطلقاً ناجائز اور حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾[2] [البقرة: ۲۷۵] [اور سود کو حرام کیا] اور یہ حدیث کہ «لا ربا بين المسلم والحربي في دار الحرب» [دار الحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے] محض بے ثبوت ہے، اس پر کسی حکم شرعی کی بنا نہیں ہو سکتی۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله في دهلي (۱۳/ صفر ۱۳۳۰ھ)

---

① صحیح مسلم، رقم الحديث (۱۵۸۷)

② دیکھیں: نصب الراية (٤/ ٥٣)

جائز حق کو ناجائز طریقے سے وصول کرنا:

سوال اگر کسی شخص کا حق جائز ہو، مگر وہ کسی وجہ سے نہ وصول کر سکے۔ آیا اس جائز حق کو کسی ناجائز طریقے سے وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟ مثلاً: زید کا لگان بذمہ بکر عرصہ تیس سال سے باقی ہے، مگر قانوناً علتِ تمادی سے زید کو اُس کا روپیہ نہیں مل سکتا اور بکر دینے سے منکر ہے۔ کیا زید اتنی مدت کا روپیہ جس پر تمادی عارض نہیں ہوتی، مع سود نالش کر سکتا ہے یا نہیں جس سے تمام روپیہ اپنا وصول کر سکے؟ اس حیلے سے وصول کرنے والا آکلِ ربا ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب اگر زید ایسی صورت میں اتنی مدت کے روپے کی جس پر تمادی قانونی عارضی نہیں ہوئی ہے، نالش کرے اور اُس مدت کے روپے کو جس پر تمادی قانونی عارض ہو چکی ہے، سود کے لفظ سے تعبیر کر کے اپنی عرضی نالش مع سود کا لفظ لکھ دے، جس سے وہ قانوناً اپنا تمام روپیہ وصول کر سکے نہ زائد تو اس تعبیر سے اس قدر روپے پر، جس کو بلفظ سود تعبیر کیا ہے، ربائے شرعی کی تعریف صادق نہیں آتی، اس لیے کہ روپیہ مذکور زید کا حق جائز ہے، جو بکر پر واجب الادا ہے اور ربائے شرعی کوئی حق جائز نہیں ہے، بلکہ محض ناجائز اور قطعاً حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ [البقرۃ: ۲۷۵] [اور سود کو حرام کیا]

جب روپے مذکورہ پر ربائے شرعی کی تعریف صادق نہیں آتی تو اس روپے کا وصول کرنے والا نہ آکل رِبا ہے نہ اُس کو آکل رِبا کہنا جائز ہے اور بوجہ زید کی تاخیر نالش کے تمادی قانونی عارض ہو جانے سے زید کا حق جائز ذمہ بکر سے شرعاً ساقط نہیں ہوا، بلکہ حق مذکور عروض تمادی کے بعد بھی بکر کے ذمہ ویسا ہی واجب الادا ہے، جیسا کہ قبل عروض تمادی کے واجب الادا تھا۔ ہدایہ (۲/ ۱۴۱، مطبع یوسفی انصاری لکھنوی) کے حاشیہ ''عنایہ شرح ہدایہ'' سے منقول ہے:

''أو يكون قولا لا دليل عليه، كما إذا مضى على الدين سنون، فحكم بسقوط الدين عمن عليه، لتأخير المطالبة، فإنه لا دليل شرعي يدل على ذلك، كذا في العناية''[1] انتهى، والله تعالىٰ أعلم

[یا وہ کوئی ایسا قول ہو جس پر کوئی دلیل نہ ہو، جیسے قرض کو کئی سال گزر چکے ہوں تو مقروض سے قرض کو ساقط کرنے کا فیصلہ دے دیا جائے، کیونکہ مطالبے میں تاخیر واقع ہوئی ہے۔ پس بلاشبہہ اس پر کوئی شرعی دلیل وارد نہیں ہوئی ہے۔ عنایہ میں ایسے ہی ہے] کتبہ: محمد عبد الله (۱۳/ ربيع الاول ۱۳۳۰ھ)

آڑھت کی آمدنی:

سوال زید آڑھت کا کام کرتا ہے اور بکر کا مال اپنی آڑھت میں فروخت کرتا ہے تو بکر کے پاس مال کے آنے پر یا بدون مال کے فروخت ہوئے یا بدون روپیہ خریدار سے وصول ہوئے زید کا روپیہ بکر کو اور آڑھت لینا، یہ آمدنی آڑھت کی سود ہوگی یا نہیں؟

---

[1] العناية شرح الهداية (۷/ ۱۳)

جواب اگر آڑھت کے کام میں پیشگی روپیہ دینے کی شرط نہیں ہے، بلکہ پیشگی روپیہ دینا بطورِ احسان ہے تو اس صورت میں آڑھت کی آمدنی سود میں داخل نہیں ہے، بلکہ آڑھت والے کا حق المحنت ہے اور اگر پیشگی روپیہ دینے کی شرط ہے تو ایک حصہ آمدنی مذکور کا داخل سود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

خرید وفروخت میں ناجائز شرط کو پورا کرنا:

سوال بعض ریاستِ ہنود میں یہ دستور ہے کہ جس قدر آمدنی سالانہ ریاست کی ہوتی ہے، تفصیل وار خرچ ریاست اور پوجا پاٹ وغیرہ کاغذات میں درج ہوتا ہے، مثلاً فی ایک روپیہ ۴ر خرچ خاص اور ۴ر تنخواہ ملازمان اور ۴ر پوجا پاٹ دیوتا بھیرو وغیرہ اور ۴ر داخل خزانہ۔ بایں طور اس ریاست میں جب گاؤں یا زمین ٹھیکہ اور زمینداری کے طور پر کسی کے ساتھ بندوبست کرتے ہیں تو پٹہ زمینداری اور رسیدات سالانہ میں تصریح امورات مذکورہ کی ہوا کرتی ہے، مثلاً: اگر رسید مبلغ ایک سو روپیہ کی ہے تو اس میں لکھا ہوتا ہے کہ مبلغ ۲۱ آنے خرچ خاص اور مبلغ ۲۱ آنے تنخواہِ ملازمان اور مبلغ ۲۱ آنے بغرض پوجا بھیرو ناتھ، جو ان کے یہاں ایک بڑا بت ہے اور مبلغ ۲۱ آنے داخل خزانہ سرکاری اور بعض ریاستوں میں رسوم ناجائز یا جائز کے لیے بحساب فی روپیہ ایک آنہ یا دو آنے علی التفصیل مصارف بڑھاتے ہیں اور کل مجموعہ کو محصول زمین یا گاؤں قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس کی تفصیل بھی رسیدات اور کاغذات وغیرہ میں کر دیتے ہیں۔ بہر حال کوئی بھی ریاست غیر اسلامی ایسی نہیں ہے جس میں بعض مصارف شرکیہ نہ ہوں، البتہ اجمال اور تفصیل کا کہیں کہیں فرق ضرور ہے۔ پس از روے شرع شریف ایسی ریاستوں میں ٹھیکہ یا زمینداری لکھانا درست ہے یا نہیں اور جن مسلمانوں نے ایسا کیا ہے، یعنی زمینداری یا ٹھیکہ ایسی ریاستوں میں لیا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب اگرچہ سوال میں فی الجملہ تفصیل ہے، مگر چونکہ میں پوری طور پر ایسی ریاستوں کے ٹھیکہ یا زمینداری سے واقف نہیں ہوں، لہٰذا صرف ایک اصولی بات لکھتا ہوں جو یہ ہے: ﴿لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ [المائدة: ٢] [اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو] پس اگر ریاستہائے مذکورہ کا ٹھیکہ یا زمینداری اس اصول کے تحت میں آتا ہو تو ناجائز ہے، ورنہ جائز ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

تعلیمِ قرآن شریف پر اجرت لینی جائز ہے یا نہیں؟

سوال تعلیمِ قرآن شریف پر اجرت لینی جائز ہے یا نہیں؟ آپ کا خادم: عبدالرحمٰن، وارد حال مدرسہ اسلامیہ بلرام پور۔ محلہ چکنی۔ ضلع گونڈہ

جواب تعلیمِ قرآن شریف پر اُجرت لینی جائز ہے یا نہیں؟ اس باب میں دلائلِ فریقین مع ماله وما علیه کتاب فتح الباری (۴/ ۳۷۲ و ۹/ ۱۹۳ مصری) و ہدایہ "باب الإجارة الفاسدة"[1] وتفسیر زیر آیتِ کریمہ: ﴿وَ لَا تَشْتَرُوْا

[1] الهداية (٣/ ٢٣٨)

بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ [اور میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت مت لو] ملاحظہ ہو، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ متقدمین حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہے اور جمہور علما و نیز متاخرین حنفیہ کے نزدیک جائز ہے، خصوصاً جبکہ یہ اجارہ بقید زمان و مکان ہو۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تا امکان احتراز اس سے اَحوط و بہتر ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔ عباراتِ کتب محولہ بوجہ قلتِ فرصت نقل نہ ہو سکیں۔ کتبہ: محمد عبد اللہ (۳/ محرم ۱۳۳۵ھ)

اجارہ کب فسخ ہوتا ہے؟

سوال زید کی دو بیویاں ہیں، ایک زبیدہ محلِ اولیٰ، دوسری ہندہ محلِ ثانیہ۔ زید نے دونوں کا مہر اپنی زندگی میں ادا کر دیا۔ بعد اس کے ایک جائداد اپنی مقرری تاحیاتی ہندہ کو لکھ دیا، یعنی اجارہ تاحیات مستاجرہ باجر اقل قلیل برعایت حال و نفع رسانی زوجہ ثانیہ کے دیا، یعنی وثیقہ اس کا لکھ کر رجسٹری کرا دی، جس کو غالباً بارہ برس گزر گئے، مگر اس جائداد و اراضی کو زید نے تاحیات اپنے ہی قبضہ میں رکھا اور نگارش وثیقہ سے غرض اور مقصود زید کا یہ تھا کہ بعد اس کے زوجہ ثانیہ تاحیات اپنی اس معاش سے متمتع رہے، اس اثنا میں زید نے اس زوجہ ثانیہ کو کسی وجہ سے طلاق دے دی، جس کو بھی سالہاے چند ہوئے، بعدہ زید نے جملہ جائداد اپنے وارثوں کو تقسیم کر دی، سوائے مسماۃ زبیدہ مذکورہ زوجہ محلِ اولیٰ کے جو تاحیات زید کی بیوی رہی، اس کو زید نے کچھ نہیں دیا اور نہ کچھ متروکہ علاوہ چھوڑا جو مسماۃ زبیدہ مذکورہ کو حق زوجیت میں ملے۔ چند روز ہوئے کہ زید مر گیا اور اس جائداد کی، جس کا ذکر اوپر ہوا، مسماۃ ہندہ زن مطلقہ زید کی دعویدار ہے کہ حسبِ نوشتہ زید کے بعد وفات اس کی وہ جائداد اس کے تصرف میں آئے اور مسماۃ زبیدہ زوجہ محلِ اولیٰ دعویٰ کرتی ہے کہ مجھ کو میراثِ زوجیت ملنی چاہیے۔ پس علما سے استفسار ہے کہ آیا وہ جائداد حسبِ نوشتہ زید پائے گی یا مسماۃ زبیدہ، شرعاً کیا حکم ہے اور اگر وہ زنِ مطلقہ حسبِ نوشتہ زید تو کس بنا پر؟ وراثت تو بوجہ طلاق رہی نہیں۔ دوسری صورت انحاءِ تملیک شرعیہ میں سے کون ہے جو بمقابلہ حق میراث زن اولیٰ نافذ ہوگی؟ ظاہراً یہ صورت تو اجارہ مضاف بعد الموت کی ہے تو اس قسم کی اجارہ کی کیا وجہ ہے؟

جواب یہ اجارہ بعد مرجانے زید آجر کے فسخ ہوگیا، اس لیے کہ اجارہ احد العاقدین کے مرجانے سے فسخ ہوجاتا ہے۔

"تنفسخ بلا حاجة إلى الفسخ بموت أحد العاقدين"

(دیکھو: در مختار مع رد المحتار، چھاپہ مصر: ۵/ ۵٦)

[وہ (اجارہ) فسخ کی حاجت کے بغیر احد العاقدین کی موت کے ساتھ فسخ ہوجاتا ہے]

پس اس صورت میں وہ جائداد جس کو زید نے مسماۃ ہندہ زن مطلقہ اپنی کو اجارہ دیا تھا، مسماۃ زبیدہ زوجہ زید کو جو تاحیاتِ زید زوجیت میں رہی ہے، حق زوجیت میں ملے گی، بشرطیکہ جائداد مذکورہ اس کی حق زوجیت سے زائد نہ ہو اور اگر زائد ہو تو جس قدر زائد ہو، دیگر وارثانِ زید کو بحصص رسدی ان کے ملے گی۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ

اجارہ مضافہ بیع کے بعد باطل ہو جاتا ہے:

سوال زید نے اپنی مملوک اراضی ایک شخص کو اجارہ دیا کہ بعد وفات زید کے وہ شخص تاحیات اپنی اس اراضی پر قابض و دخیل ہوگا اور بعد اجارہ کے زید نے اس زمین کو بیع کر دیا اور قبالہ بیع میں یہ لکھا کہ تاحیات اس شخص مستاجر کے اراضی مبیعہ قبضہ میں اسی کے رہے گی اور مشتری صرف اجری (جو محض اقل قلیل ہے) پائے گا، پس اس قسم کا اجارہ صحیح اور نافذ ہوگا یا نہیں؟

جواب یہ اجارہ اولاً صحیح تھا، لیکن جب زید آجر نے اس اراضی کو جس کو اجارہ دیا تھا، بعد اجارہ کے بیع کر دیا تو اجارہ مذکورہ باطل ہوگیا، اب نافذ نہ ہوگا۔ یہ اجارہ پہلے اس لیے صحیح تھا کہ یہ اجارہ مضافہ ہے، کیونکہ زمانہ مستقبل کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور ایسا ہی اجارہ، اجارہ مضافہ ہے اور اجارہ مضافہ صحیح ہے: "تصح الإجارة مضافا إلى الزمان المستقبل بالإجماع" اھ (دیکھو: در مختار مع رد المحتار، چھاپہ مصر: ٥/ ٦٢) [زمانہ مستقبل کی طرف مضاف کیا ہوا اجارہ بالاجماع درست ہے] اجارہ مذکورہ بعد بیع اراضی مذکورہ اس لیے باطل ہوگیا کہ اجارہ مضافہ بعد بیع شے مستاجرہ کے باطل ہوجاتا ہے:

"ولو مضافة كآجرتكها غدا، وللمؤجر بيعها اليوم وتبطل الإجارة، به يفتىٰ. خانية" (در مختار: ٥/ ٤) والله أعلم بالصواب

[اگر وہ اجارہ مضافہ ہو، جیسے میں کل تمھیں یہ اجارہ دوں گا اور اجارہ دینے والے کو آج اسے بیچنے کا حق حاصل ہے اور (اگر وہ اسے بیچ دے تو) اجارہ باطل ہوجائے گا...اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے]

كتبه: محمد عبد الله

سوال زید نے اپنی مملوک اراضی ایک شخص کو اجارہ اس طور پر دیا کہ بعد وفات زید کے وہ شخص تاحیات اپنی اس اراضی پر قابض و دخیل ہوگا اور بعد اجارہ کے زید نے اس زمین کو بیع کر دیا اور قبالہ بیع میں یہ لکھا کہ تاحیات اس شخص مستاجر کے اراضی مبیعہ قبض و تصرف میں اسی کے رہے گی اور مشتری صرف اجری (جو محض اقل قلیل ہے) کے پانے کا مستحق رہے گا۔ اس قسم کا اجارہ صحیح اور نافذ ہوگا یا نہیں؟

جواب صورتِ مندرجہ سوال ہذا گو بظاہر صورتِ اجارہ ہے، مگر درحقیقت وصیت بالاجارہ ہے، لیکن جب زید موصی (وصیت کنندہ) اس اراضی کو جس کے اجارہ کی وصیت کی تھی، بیع کر دیا تو یہ فعل زید کا وصیت مذکورہ سے رجوع ہوگیا، یعنی زید موصی نے اس فعل سے وصیت مذکورہ کو فسخ کر دیا اور موصی کو ایسا کرنا، یعنی وصیت سے رجوع کرنا جائز ہے اور وصیت مذکورہ فسخ ہوگئی تو نافذ نہ ہوگی۔ صورتِ مندرجہ سوال اس لیے از قبیل وصیت ہے کہ وصیت اس کا نام ہے کہ ایک شخص کو کسی چیز کا اس طرح پر مالک کر دے کہ وہ تملیک اس مالک کنندہ کی موت کی طرف مضاف ہو، یعنی وہ دوسرا شخص اس چیز کا مالک بعد موت مالک کنندہ کے ہو۔ صورت ہذا میں زید نے ایسا ہی کیا کہ اس دوسرے شخص کو اپنی

اراضی مملوکہ کے منافع کا بعد اپنی وفات کے مالک بنایا۔ "هي تمليك مضاف إلى ما بعد الموت" (دیکھو: تنوير الأبصار، متن در مختار، چھاپہ: ٥/ ٤٥١) [وہ تملیک ہے جو (مالک کنندہ کی) موت کے بعد کی طرف مضاف ہے]

زید کا اراضی مذکورہ کو بعد وصیت کے بیع کر دینا اس کی وصیت مذکورہ سے رجوع ہو گیا کہ بعد وصیت کے موصی کی ایسی کوئی کارروائی جس سے موصی بہ اس کے ملک سے نکل جائے، رجوع عن الوصیۃ سمجھی جاتی ہے اور بیع اسی قسم کی کارروائی ہے۔ "وكل تصرف أوجب زوال ملك الموصي فهو رجوع كما إذا باع العين الموصى به ثم اشتراه" (دیکھو: هدايه جلدين أخيرين، چھاپه مصطفائي، ص: ٦٤٤) [ہر ایسا تصرف اور کارروائی جس سے وہ موصی کی ملک سے نکل جائے، وہ رجوع تصور ہوگی، مثلاً: جب وہ موصی بہ کو فروخت کر کے پھر اسے خرید لے]

موصی کو وصیت سے رجوع کرنا اس لیے جائز ہے کہ وصیت ایک قسم کا ناتمام تبرع ہے اور ایسے تبرع سے رجوع کرنا جائز ہے۔ "ويجوز للموصي الرجوع عن الوصية لأنه تبرع لم يتم فجاز الرجوع عنه" (دیکھو: هدایه، صفحه مذکوره) [وصیت کنندہ کے لیے وصیت سے رجوع کرنا جائز ہے، کیوں کہ یہ غیر مکمل تبرع ہے، لہٰذا اس (تبرع) سے رجوع کرنا جائز ہے]

كتبه: محمد عبد الله

اگر وکیل شروطِ بیع کی مخالفت کرے تو وہ ضامن ہے:

سوال زید اپنا روپیہ عمرو کو واسطے تجارت کے اس شرط پر دے کر سفرِ حج کو چلا گیا کہ اس روپے سے اسی شہر میں خرید و فروخت کرنا، دوسرے شہر میں ہرگز نہ کرنا، اس میں جو نفع ہوگا، نصف تمھارا اور نصف ہمارا ہوگا، لیکن عمرو نے زید کے کہنے کے خلاف دوسرے شہر میں تجارت کیا۔ جب زید سفرِ حج سے واپس آیا، عمرو نے زید سے کہا کہ تمھارا کل روپیہ نقصان ہو گیا، چونکہ عمرو اس وقت محض مفلس شخص تھا، زید اس سے کیا لیتا، مگر اب زمانہ بتیس سال پر عمرو بہت مالدار ہو گیا ہے، اس صورت میں زید عمرو سے اپنا وہ روپیہ لینے کا مستحق ہے یا نہیں؟

جواب اس صورت میں زید عمرو سے اپنا وہ روپیہ لینے کا مستحق ہے:

"وإن خص له رب المال التصرف في بلد بعينه أو في سلعة بعينها لم يجز له أن يتجاوزها (إلى قوله) فإن خرج إلى غير تلك البلدة فاشترى ضمن.. الخ"[1] كذا في الهداية

[اگر مال والا کسی خاص شہر اور خاص قسم کے سامان میں تجارت کرنے کی قید لگائے تو (تاجر کو) اس سے تجاوز کرنا جائز نہ ہوگا... پس اگر وہ اس شہر سے کسی اور شہر میں (بغرض تجارت) جائے اور من جملہ سامان کے خریداری کرے تو ضامن ہوگا]

وفي المنتقیٰ: "وعن حكيم بن حزام صاحب رسول اللهﷺ أنه كان يشترط على

[1] الهداية (٣/ ٢٠٤)

الرجل إذا أعطاه مالا مقارضة، يضرب له به أن لا تجعل مالي في كبد رطبة، ولا تحمله في بحر، ولا تنزل به بطن سيل، فإن فعلت شيئا من ذلك فقد ضمنت مالي. رواه الدارقطني" انتهى وفي نيل الأوطار: "الأثر أخرجه أيضاً البيهقي، وقوىٰ الحافظ إسناده"[1] والله أعلم بالصواب

[منتقیٰ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابی حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ کسی آدمی کو تجارت کے لیے مال دیتے تو اس پر یہ شرط عائد کرتے کہ تم میرے مال سے جاندار چیزوں کی تجارت نہیں کرو گے، نہ تم اسے سمندری سفر پر لے جاؤ گے نہ سیلابی زمین میں جاؤ گے۔ اگر تم نے ان کاموں میں سے کوئی کام کیا تو تم میرے مال کے ضامن ہوگے۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور نیل الاوطار میں ہے کہ اس اثر کو بیہقی نے بھی بیان کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے]

كتبه: محمد عبد الله. أصاب من أجاب. محمد ضمير الحق عفي عنه، الجواب صحيح. ألفت حسين. أصاب من أجاب. أبو محمد إبراهيم. الجواب صحيح. كتبه: محمود، عفي عنه. الجواب صحيح. وصيت على، مدرس دوم مدرسه أحمديه. الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن.

معین نفع کے ساتھ کاروبار میں پیسا لگانا:

سوال ایک کمپنی جس کے شرکا ہنود ہیں اور اس کمپنی میں سودی معاملات بھی جاری ہیں اور تجارت کا کام بھی ہے۔ ہر ایک کی شاخ جداگانہ ہے۔ اس کمپنی میں جو شخص جس شاخ میں روپیہ دے، اس کو کمپنی مذکور منافع معین ایک خاص شرح سے دیتی ہے اور باقی منافع اس روپیہ کا حق المحنت میں کمپنی لیتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان تجارتی شاخ کمپنی مذکور میں دے اور منافع کا بشرح معین حصہ شش ماہی یا سالانہ لیتا رہے تو شرعاً درست ہے یا نہیں؟ جواب مدلل بہ آیت و حدیث یا بہ سند فقہ کے ہونا ضروری ہے۔

جواب صورتِ مسئول عنہا شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ جب کمپنی مذکور روپیہ دینے والے کو منافع معین ایک خاص شرح سے دیتی ہے تو یہ صورت شرکت فی التجارۃ کی نہیں ہوئی، بلکہ قرض کی صورت ہوگی کہ کمپنی مذکور روپیہ لے کر شش ماہی یا سالانہ ایک خاص شرح سے سود دیتی ہے۔ روپیہ دینے والے کو نفع و نقصان سے کوئی غرض متعلق نہیں۔ الغرض یہ صورت ربا کی صورتوں میں داخل ہے، جو شرعاً قطعی حرام ہے۔ لقوله تعالىٰ: ﴿ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ [البقرة: ٢٧٥]
[اور سود کو حرام کیا]

(هداية كتاب الشركة): "ولا تجوز الشركة إذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من

---

[1] نیل الأوطار (٥/ ٣١٨) نیز دیکھیں: نیل الأوطار (٣/ ٦٣)

الربح، لأنه شرط يوجب انقطاع الشركة فعساه لا يخرج إلا قدر المسمى لأحدهما، ونظيره في المزارعة“[1] انتهى

[ہدایہ کی کتاب الشرکہ میں ہے کہ جب دونوں میں سے ایک کے لیے نفع سے معلوم دراہم کی شرط لگائی جائے تو شرکت جائز نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایسی شرط ہے جو انقطاعِ شرکت کو واجب کرتی ہے، اس لیے کہ شاید اس (شراکت والی تجارت) سے اتنا ہی نفع ہو، جتنا ان میں سے ایک کے لیے مختص کر دیا گیا ہے اور اسی طرح مزارعت میں ہوتا ہے]

(هدايه كتاب المزارعة): ”ولا تصح المزارعة إلا أن يكون الخارج شائعا بينهما تحقيقا لمعنى الشركة، فإن شرط لأحدهما قفزانا مسماة فهي باطلة، لأن به تنقطع الشركة، لأن الأرض عساها لا تخرج إلا هذا القدر، وصار كاشتراط دراهم معدودة لأحدهما في المضاربة“[2] انتهى

[ہدایہ کی کتاب المزارعہ میں ہے کہ مزارعت صحیح نہیں ہوتی مگر اس طور پر کہ پیداوار دونوں میں معروف ہو، تاکہ شرکت کے معنی متحقق ہوں۔ پس اگر دونوں نے متفق ہو کر ایک کے لیے کچھ معلوم قفیز شرط لگائے تو مزارعت باطل ہے، کیوں کہ ایسی شرط کے ساتھ شرکتِ پیداوار منقطع ہو جائے گی، اس لیے کہ شاید زمین کی پیداوار اسی قدر ہو اور یہ ایسا ہو گیا جیسے مضاربت میں کسی ایک کے لیے معدود درہموں کی شرط لگائی گئی]

(هداية كتاب المضاربة): ”ومن شرطها أن يكون الربح بينهما مشاعا لا يستحق أحدهما دراهم مسماة من الربح، لأن شرط ذلك يقطع الشركة بينهما، ولا بد منها كما في عقد الشركة“[3] انتهى والله تعالىٰ أعلم

[ہدایہ کی کتاب المضاربہ میں ہے کہ مضاربت کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ نفع ان دونوں میں مشترک ہو، ان میں سے کوئی بھی نفع میں سے دراہم معلومہ کا مستحق نہ ہو، کیوں کہ ایسی شرط لگانا دونوں میں شرکت کو قطع کر دیتا ہے، حالاں کہ شرکت لازمی ہے، جیسا کہ عقدِ شرکت میں ہوتا ہے]

كتبه: محمد عبد الله (٨/ ربيع الأول ١٣٢٧هـ)

مضاربت اور اس کی شروط:

سوال ① کیا ایک ہی شخص مضارب اور رب المال بھی ہو سکتا ہے؟

---

① الهداية (٣/ ٩)

② الهداية (٤/ ٥٥)

③ الهداية (٣/ ٢٠٢)

② کیا مضارب کو اختیار ہے کہ خود تجارت میں محنت نہ کرے اور کسی نوکر پر کارخانہ کو چھوڑ دے اور جو شرط یا سمجھوتہ پہلے تھا، اسی کے موافق منافع لینے کا بھی مستحق ہوگا؟

③ کیا مضارب پر واجب ہے کہ جو مال ادھار بیچا ہے، اس کو وصول کرے اور وصول نہ کر سکے یا نہ کرائے تو اپنے پاس سے ادا کرے یا اس کو ادھار کا صرف حساب بتا دینا کافی ہے اور رب المال کو واجب ہوگا کہ دام وصول کرتا پھرے؟

④ اگر مضارب نے سارا مال فروخت کر ڈالا، اس طور پر کہ جو رقم نقد آتی رہی، اس کو کھا لیا کرتا تھا اور جو ادھار بیچتا تھا، اس کو وصول نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ سارا راس المال غائب ہوگیا تو ایسی صورت میں رب المال اپنی رقم کس سے وصول کرے گا؟

⑤ اگر مضارب نے بجائے اس کے کہ خود دیکھ بھال کیا کرتا اور تجارت میں کوشش کرتا، کسی آدمی کو مقرر کر دیا، جس نے سارا مال بیع کر کے کھا لیا یا ادھار پر فروخت کر ڈالا تو ایسی صورت میں تاوان شرع شریف دلواتی ہے یا نہیں؟

⑥ کیا مضارب کا یہ کہہ دینا کہ کچھ نفع نہیں ہوتا ہے اور لہنا، یعنی بقایا بہت پڑ گیا ہے۔ رب المال اگر چاہے تو مال موجود اور لہنا وغیرہ کا حساب لے لے۔ اس کی براءت کے لیے کافی ہے اور اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوسکتی؟

⑦ کیا اگر مضارب کبھی نفع نہ دے اور خود برابر لیتا رہے اور بعد چند سال کے جب مالک اپنے مال اور منافع کا مطالبہ کرے تو یہ کہہ دے کہ دکان میں مال بہت کم اور بے میل رہ گیا ہے اور بہت لہنا پڑ گیا ہے تو اس سے اس کی براءت ہوسکتی ہے یا شرع شریف اس سے اصل منافع دلوائے گی؟

جواب ① ایک ہی شخص مضارب اور رب المال نہیں ہوسکتا۔

”لأن المضاربة تنعقد شركة على مال رب المال وعمل المضارب، ولا مال ههنا للمضارب، فلو جوزناه يؤدي إلى قلب الموضوع“ واللّٰه تعالىٰ أعلم

(هدايه: ٣/ ٢٦٦ مطبع يوسفي)

[کیوں کہ مضاربت میں شرکت اسی وقت منعقد ہوتی ہے، جب مال والے کی طرف سے مال ہو اور مضارب کی طرف سے کام ہو اور یہاں مضارب کی طرف سے کچھ مال نہیں ہے۔ پس اگر ہم اس کو جائز قرار دیں تو لازم آئے گا کہ مضاربت جس معنی کے لیے موضوع ہے وہ اُلٹ گیا]

② مضارب کو اختیار ہے کہ خود تجارت میں محنت نہ کرے اور کسی نوکر پر کارخانہ کو چھوڑ دے اور جو شرط اور سمجھوتہ پہلے تھا، اُسی کے موافق منافع لینے کا بھی مستحق ہوگا، بشرطیکہ عقدِ مضاربت میں یہ قید نہ ہو کہ مضارب خود تجارت میں محنت کرے اور کسی نوکر پر کارخانہ کو نہ چھوڑ دے۔

”وإذا صحت المضاربة مطلقة جاز للمضارب أن يبيع ويشتري ويوكل ويسافر ويودع لإطلاق العقد المقصود منه الاسترباح ولا يتحصل إلا بالتجارة فينتظم

صنوف التجار وما هو من صنيع التجار والتوكيل من صنيعهم" (هدايه: ٣/ ٢٥٧)

[جب مضاربتِ مطلقہ صحیح ہے تو مضارب کے لیے جائز ہے کہ وہ فروخت کرے، خریدے، کسی کو اس کام کا وکیل بنائے، مال ساتھ لے کر سفر کرے اور مال کسی کے پاس ودیعت رکھے، کیوں کہ عقدِ مضاربت تو مطلق ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ نفع حاصل کیا جائے اور نفع تو تجارت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ عقد تجارت کی تمام اقسام کو شامل ہے اور تجارت جو کچھ کیا کرتے ہیں، یہ ان کی تجارت ہوگی اور حال یہ ہے کہ خرید وفروخت کے لیے وکیل کرنا بھی تاجروں کے کاموں سے ہے]

"ويملك المضارب في المطلقة البيع (إلى قوله) و الإيداع والرهن والارتهان و الإجارة والاستيجار"[1] (تنوير الأبصار)

[اور مضارب، مضاربتِ مطلقہ میں بیع کرنے، ایداع، رہن، دینے لینے، اجارہ اور استیجار کا مالک ہے]

"والأصل أن التصرفات في المضاربة ثلاثة أقسام: قسم هو من باب المضاربة وتوابعها فيملكه من غير أن يقول له: اعمل ما بدا لك، كالتوكيل بالبيع والشراء والرهن والارتهان والاستيجار" (رد المحتار: ٤/ ٤٨٥)

[اصل یہ ہے کہ مضاربت میں تصرفات کی تین قسمیں ہیں: جن میں سے ایک قسم مضاربت اور اس کے توابع کے باب سے ہے، لہٰذا وہ مال والے کے یہ کہے بغیر "(اس مال کے ساتھ) جو مرضی کرو" اس میں تجارت کرنے کا مالک ہوگا، جیسے توکیل، بیع وشراء، رہن، ارتہان اور استیجار ہے]

اس مسئلے کی ایک نظیر اجارہ کا یہ مسئلہ ہے:

"وإذا شرط على الصانع أن يعمل بنفسه فليس له أن يستعمل غيره (إلى) وإن أطلق له العمل فله أن يستأجر من يعمل، لأن المستحق عمل في ذمته، ويمكن استيفاءه بنفسه و بالاستعانة بغيره بمنزلة إيفاء الدين" (هداية: ٣/ ٢٩٤)

[اگر مستاجر نے کاری گر کے ذمے یہ شرط عائد کی ہو کہ وہ بذاتِ خود کام کرے تو کاری گر کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ دوسرے سے یہ کام لے... اگر مستاجر نے اس کو کام کے لیے مطلقاً اجارہ دیا تو اسے اختیار ہے کہ وہ کسی اور سے کام کروا دے، کیونکہ اس کے ذمے کام کا استحقاق ہے اور اس کو پورا کرنا اس طرح بھی ممکن ہے کہ وہ بذاتِ خود یہ کام کرے اور اس طرح بھی کہ وہ کسی دوسرے کے ذریعے سے کرے اور یہ قرض ادا کرنے کی طرح ہے]

③ اگر مضارب اور رب المال عقدِ مضاربت فسخ کر دیں اور مضارب اس مضاربت میں (ربح) نفع حاصل کر چکا ہو تو اس صورت میں مضارب پر واجب ہے کہ جو مال ادھار بیچا ہے، اُس کا دام وصول کرے اور اگر وصول نہ

[1] الدر المختار (٥/ ٦٤٩)

کرے تو حاکم اس کو وصول کرنے پر مجبور کرے اور اگر مضارب نے اس مضاربت میں ہنوز ربح حاصل نہیں کیا ہے تو اس پر وصول کرنا واجب نہیں ہے۔ ہاں اس پر واجب ہے کہ رب المال کو دام وصول کرنے میں اپنا وکیل کر دے کہ رب المال خود وصول کر لے۔

"وإذا افترقا، وفي المال ديون، وقد ربح المضارب فيه، أجبره الحاكم على اقتضاء الديون، لأنه بمنزلة الأجير، والربح كالأجر له، وإن لم يكن له ربح لم يلزمه الاقتضاء، لأنه وكيل محض، والمتبرع لا يجبر على إيفاء ما يتبرع به، ويقال له: وكل رب المال في الاقتضاء، لأن حقوق العقد ترجع إلى العاقد فلا بد من توكيله وتوكله كيلا يضيع حقه" (هدایہ: ۳/ ۲۹۴)

[اگر وہ جدا ہوئے، حالاں کہ مضاربت میں لوگوں پر قرضے ہیں اور مضارب نے اس میں نفع بھی کمایا ہے تو حاکم اس کو ان قرضوں کے تقاضے پر مجبور کرے گا، کیوں کہ وہ (مضارب) بمنزلہ اجیر کے ہے اور نفع اس کی اجرت کے مثل ہے۔ اگر مضارب کے لیے نفع نہ ہو تو لوگوں سے قرضے کا تقاضا کرنا اس پر لازم نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو محض وکیل بلا اجرت ہے اور جس نے بطورِ احسان کوئی کام کیا، اس پر اس کے پورا کرنے کے لیے جبر نہیں ہوسکتا ہے۔ لیکن مضارب کو یہ حکم دیا جائے گا کہ وہ مال والے کو تقاضے کے لیے وکیل کر دے، کیوں کہ جو شخص جس معاملے کا عقد کرے تو اس معاملے کے حقوق اسی عاقد کی طرف لوٹتے ہیں تو اس کا وکیل کرنا یا وکالت قبول کرنا لازم ہے، تاکہ مالک کا حق ضائع نہ ہو]

4 ایسی صورت میں رب المال اپنی اس رقم کو جو مضارب کھا لیا کرتا تھا، بقدر اصل و نفع رسدی کے بطور تاوان مضارب سے وصول کرے، کیونکہ مضارب اس صورت میں غاصب ہے اور غاصب پر تاوان واجب ہے۔

"وإذا خالف (المضارب) كان غاصبا لوجود التعدي منه على مال غيره" (هدایہ: ۳/ ۲۵۰)

[اگر اس (مضارب) نے مال والے کے حکم کی مخالفت کی تو وہ غاصب شمار ہوگا، کیوں کہ اس کی طرف سے غیر کے مال پر تعدی پائی گئی]

"ثم إن كان (الغصب) مع العلم فحكمه المأثم والمغرم، وإن كان بدونه فالضمان، لأنه حق العبد فلا يتوقف على قصده، ولا إثم لأن الخطأ موضوع" (هدایہ: ۳/ ۳۷۰)

[پھر اگر اس نے جان بوجھ کر یہ (غصب) کیا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ غاصب گناہ گار اور ضامن ہوگا اور اگر بغیر جانے ہو تو حکم یہ ہے کہ ضامن ہوگا، کیوں کہ یہ بندے کا حق ہے تو اس کے قصد پر موقوف نہیں ہے اور اس پر گناہ نہیں ہوگا، اس لیے غلطی سے جو فعل سرزد ہو اس کا گناہ اٹھا دیا گیا ہے]

اگر مضاربت فسخ ہو چکی ہے اور مضارب اس مضاربت میں ربح حاصل کر چکا تھا تو مضارب پر واجب ہے کہ

جو مال ادھار بیچا ہے، اس کا دام وصول کر دے اور اگر وصول نہ کرے تو حاکم اس کو وصول کر دینے پر مجبور کرے۔ اگر مضارب نے اس مضاربت میں ہنوز ربح حاصل نہیں کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ رب المال کو وصول کرنے میں اپنا وکیل کر دے کہ رب المال خود وصول کر لے۔ جیسا کہ جواب نمبر ③ میں گزرا ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

⑤ ایسی صورت میں مضارب سے تاوان شرع شریف دلواتی ہے، بشرطیکہ عقدِ مضاربت میں یہ قید ہو کہ مضارب اس صورت میں غاصب ہے اور غاصب پر تاوان واجب ہے۔ جیسا کہ جواب ④ میں گزرا ہے۔

اگر عقدِ مضاربت میں قید مذکور نہ ہو تو ایسی صورت میں مضارب سے تاوان شرع شریف نہیں دلواتی، کیونکہ مضارب اس صورت میں امین ہے اور امین پر ضمان (تاوان) نہیں ہے۔ ”الوديعة أمانة في يد المودع، إذا هلكت لم يضمنها“ (هداية: ٣/ ٢٧١) [ودیعت مستودع کے پاس ایک امانت ہوتی ہے کہ اگر وہ تلف ہو جائے تو مستودع اس کا ضامن نہیں ہوتا ہے] واللہ تعالیٰ أعلم.

⑥ اگر رب المال اور مضارب عقدِ مضاربت فسخ کر دیں اور مضارب اس مضاربت میں ربح حاصل کر چکا ہو تو اس صورت میں مضارب کا صرف اس قدر کہہ دینا جو مندرجہ سوال ہے، اس کی براء ت کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس پر ذمہ داری عائد ہوگی۔ وہ یہ کہ جو لہنا پڑ گیا ہے، اس کو وصول کرے اور اگر وہ وصول نہ کرے تو حاکم اس کو وصول کرنے پر مجبور کرے۔ اگر مضارب نے اس مضاربت میں ربح حاصل نہیں کیا ہے، تو اس پر وصول کر دینا واجب نہیں ہے، ہاں اس پر یہ واجب ہے کہ رب المال کو لہنا وصول کرنے میں اپنا وکیل کر دے کہ رب المال خود وصول کر لے۔ جیسا کہ جواب ③ میں گزرا ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

⑦ اس نمبر کا جواب نمبر ④ کے جواب میں ادا ہو چکا ہے، ملاحظہ ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (١٦/ جمادى الأولى ١٣٣١هـ)

لگان اراضی کی شرعی حیثیت:

سوال افزایش زرِ لگان بابت جوت اراضی رعایا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب جائز ہے۔ اگر تحمل سے زائد نہ ہو اور بھی خلاف اس کے معاہدہ نہ ہوا ہو۔

كتبه: محمد عبدالله، مدرس أول مدرسه أحمديه آره.

غلے کے بدلے زمین کاشت کے لیے دینا:

سوال کھیت کسی مرد مسلمان یا ہنود وغیرہ کو غلہ بروزن مقرر کر کے دینا، مثلاً: یہ شرط کر لے کہ ہم پانچ من فی بیگہہ لیں گے اور کوئی مدت مقرر نہ کرے یا مدت متعین کر دے، بہر نوع شرعاً کیسا ہے؟

جواب کھیت کسی کو بونے کے لیے غلہ معین بروزن مقرر کر کے دینا خواہ کوئی مدت بھی مقرر کرے یا نہ کرے، یعنی

خواہ یہ کہے کہ مثلاً: دو برس یا چار برس کے لیے دیا یا نہ کہے، صرف اس قدر شرط ہو کہ اس قدر فلاں غلہ ہر سال میں لیا کریں گے، یہ صورت شرعاً درست ہے۔

صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: "عامل النبي ﷺ خيبر بشطر ما يخرج منها من ثمر أو زرع"[1] [نبی کریم ﷺ نے خیبر والوں سے پھلوں اور غلے کی نصف پیداوار کے عوض (کاشت کاری کا) معاہدہ فرمایا] جب زمین بونے یا باغ لگانے کے لیے جزوِ پیداوار پر دینا اس حدیث سے جائز ثابت ہوا، حالانکہ جزوِ پیداوار کی مقدار معین نہیں تو بصورتِ تعیینِ مقدار کے بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

کاروبار میں شراکت اور اس کی اقسام:

سوال زید متوفی کا پسر کلاں مالِ تجارت نفع ونقصان میں نصف کا شریک ہے اور شروع میں اصل مال تخمینا پانسو روپیہ کا تھا اور یہ مال مذکور بھی بطورِ قرض دونوں کے نام ذمہ تھا۔ بفضلہ تعالیٰ اس مال مذکور سے بکوشش پسر کلاں اس قدر ترقی ہوئی کہ ہزاروں تک نوبت پہنچی، کیونکہ باپ عرصہ دراز سے بے تعلق رہا کرتا تھا اور پسر کلاں کے بھروسے پر کاروبارِ تجارت چھوڑ رکھا تھا اور بعد ہونے ترقی اموال وہ قرض بھی ادا کیا گیا اور جائداد بھی دونوں کے نام سے خریدی گئی اور لایسنس بھی دونوں کے نام سے ہوا۔ کاغذات بھی دونوں کے نام سے موجود ہیں۔ سرکار میں دونوں کے نام موجود ہیں۔ ایک بار کسی غفلت سے دوبارہ لایسنس جرمانہ ہوا تو دونوں پر علیحدہ علیحدہ ہوا اور کاروبارِ تجارت دونوں کے نام سے جاری ہیں اور جہاں کہیں مال جاتا ہے یا کہیں سے آتا ہے تو دونوں کے نام سے جمع خرچ ہوتا ہے۔

اگر خدانخواستہ اس وقت کچھ قرض ہوتا تو پسر کلاں کی گردن پھنستی، کیونکہ کاروبار عرصہ دراز سے پسر کلاں کر رہا ہے اور خط کتابت حساب کتاب وغیرہ سب پسر کلاں اپنے آپ خود کرتا ہے اور زید متوفی اپنی حیات میں بخیال اس کے کہ پسر کلاں میرا شریک ہے، جو اشیاء متعلق حوائجِ اکل وشرب وغیرہ دکان سے جاتی تھی، نصف اپنے یہاں رکھتا تھا اور نصف پسر کلاں کو دیتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق بھی ہوا کہ مصارف روز مرہ کے واسطے تنخواہ مقرر ہوئی، وہ بھی نصفا نصف، یعنی ۲۲ روپے ماہ وار اپنی اور ۲۲ روپے ماہ وار پسر کلاں کی آمدنی دکان سے مقرر ہوئی۔ اب پسر کلاں مدعی ہے کہ نصف مال جائداد میرا ہے، لہٰذا علمائے دین سے سوال ہے، آیا پسر کلاں کا دعوی درست ہے؟

جواب صورت مسئولہ میں پسر کلاں کا دعویٰ کہ نصف مال جائداد میرا ہے، درست ہے، اس لیے کہ یہ شرکت جو مابین باپ بیٹے کے تھی، ابتداءً تو شرکتِ ملک تھی، کیونکہ اس اصل مال کے دونوں مالک تھے، جس کو دونوں نے بطور قرض کے حاصل کیا تھا، چنانچہ درمختار مع ردالمحتار (۳/۳۴۳ چھاپہ دہلی) میں ہے:

"شركة ملك، وهي أن يملك متعدد اثنان فأكثر عينا (إلى قوله) بإرث أو بيع أو غيرهما بأي سبب كان... الخ"

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٥١)

[شرکت ملک ہے، یہ کہ متعدد افراد دو یا اس سے زیادہ اصل مال کے مالک ہوں... وراثت کے ذریعے یا بیع کے ذریعے یا ان کے علاوہ کسی بھی سبب کے ذریعے]

لیکن اس کے بعد جب دونوں نفع ونقصان تجارت میں نصفا نصف کے شریک ہوگئے اور اسی کے مطابق تاحیات زید متوفی برابر کارروائی کرتے آئے، جیسا کہ عبارتِ سوال میں مصرح ہے تو یہ شرکت شرکتِ عقد ہوگئی اور شرکتِ عقد تین طرح کی ہوتی ہے: شرکت بالمال۔ شرکت بالوجود۔ شرکت بالاعمال۔ فتاویٰ عالمگیری (۲/ ۴۰۷ چھاپہ کلکتہ) میں ذخیرہ سے منقول ہے: "أما شركة العقود فأنواع ثلاثة: شركة بالمال، وشركة بالوجود، و شركة بالأعمال" اھ [رہی شرکتِ عقود تو اس کی تین قسمیں ہیں: ① شرکت بالمال ② شرکت بالوجود ③ شرکت بالاعمال]

یہ شرکت اقسام ثلاثہ مذکورہ میں سے پہلی قسم (شرکت بالمال) ہے اور یہ ظاہر ہے، پھر شرکت بالمال کی بھی دو قسمیں ہیں: ① مفاوضہ و ② عنان۔ اگر شرکت بالمال میں شریکوں کا مالاً و ربحاً وتصرفاً ونفعاً وضرراً مساوی ہونا شرط ہو تو شرکت مفاوضہ ہے، ورنہ عنان ہے۔ فتح القدیر (۲/ ۸۱۳ چھاپہ نول کشور) میں ہے:

"العقد إما أن يذكر فيه مال أو لا، وفي الذكر إما أن تذكر المساواة في المال وربحه وتصرفه ونفعه وضرره أو لا، فإن شرطا ذلك فهو المفاوضة وإلا فهو العنان" اھ

[عقد میں مال کا ذکر ہوگا یا نہیں، ذکر کی صورت میں مالاً و ربحاً وتصرفاً ونفعاً وضراً مساوی ہونا شرط ہوگیا یا نہیں، اگر شرط ہو تو یہ شرکت مفاوضہ ہے ورنہ عنان]

تو اس شرکت میں بھی اگر امور مذکورہ میں مساوات شرط تھی تو مفاوضہ ہوگی، ورنہ عنان ہوگی اور دونوں صورتوں میں یعنی خواہ یہ شرکت مفاوضہ ہو یا عنان ہو، پسر کلاں کا دعویٰ مذکورہ درست ہے۔ مفاوضہ کی صورت میں تو درست ہونا ظاہر ہے، اس لیے کہ مفاوضہ میں مالاً و ربحاً مساوات شرط ہی ہے، جیسا کہ فتح القدیر سے معلوم ہوا۔ نیز فتاویٰ قاضی خان (۴/ ۴۹۴ چھاپہ نولکشور) میں ہے: "ويتساويان في رأس المال (إلى قوله) ويشترط التساوي في الربح أيضاً" اھ [اصل مال میں وہ مساوی ہوں گے... نفع میں بھی برابری کی شرط ہوگی] درمختار (۳/ ۳۴۷) میں ہے: "وتساويا مالا تصح به الشركة، وكذا ربحا كما حققه الوالي" اھ [مال اور نفع میں برابری کی بنیاد پر شرکت درست ہے جیسا کہ والی نے اس بات کو ثابت کیا ہے]

عنان کی صورت میں اس لیے درست ہے کہ عنان میں اگرچہ مساوات مذکورہ شرط نہیں ہے، بلکہ جائز ہے کہ دونوں شریک اصل مال میں برابر نہ ہوں اور نفع میں برابر ہوں یا اصل مال میں برابر ہوں اور نفع میں برابر نہ ہوں، بلکہ جو شریک تجارت کے کاروبار کو تنہا انجام دیتا ہو یا اور شریک سے زیادہ تجارت کا کام کرتا ہو، اس کو نفع میں زیادہ حصے کا مستحق ٹھہرانا بھی جائز ہے اور اس صورت میں وہ زیادہ حصہ کا مستحق ہوگا اور جب وہ زیادہ حصے کا مستحق ہوا تو نصف کا تو بطریق اولیٰ مستحق ہے۔

"رد المحتار" (۲/ ۳٤۱) میں ہے:

"قوله: مع التفاضل في المال (دون الربح) أي بأن يكون لأحدهما ألف وللآخر ألفان مثلًا، و اشترطا التساوي في الربح. وقوله: و عكسه أي بأن يتساوى المالان، ويتفاضلا في الربح، لكن هذا مقيد بأن يشترطا الأكثر للعامل منهما أو لأكثرهما عملًا... الخ"

[اس کا قول: مال میں برابر نہ ہونے کے ساتھ (نفع کے سوا) یعنی مثلاً: ایک کا مال ایک ہزار اور دوسرے کا دو ہزار ہو اور ان دونوں نے نفع میں برابری کی شرط لگائی ہو اور اس کا یہ قول: اور اس کے برعکس "یعنی مال میں وہ دونوں برابر ہوں اور نفع میں برابر نہ ہوں، لیکن یہ اس بات کے ساتھ مقید ہے کہ وہ عامل کے لیے زیادہ (نفع) کی شرط لگائیں یا اس کے لیے جو کام زیادہ کرنے والا ہو ...الخ]

اور اگر اس شرکت میں ابتدائے حالت کا لحاظ کیا جائے، یعنی صرف شرکتِ ملک کا اعتبار کیا جائے اور شرکتِ عقد سے قطع نظر کیا جائے، تب بھی پسرِ کلاں کا دعویٰ مذکورہ درست ہے، کیونکہ شرکتِ ملک میں اصول یہ ہے کہ جس قدر مال میں ترقی ہوتی ہے، ہر ایک شریک بقدر اپنی اپنی ملک کے اس کا مالک ہوتا ہے اور جب صورتِ مسئولہ میں دونوں (باپ بیٹے) اصل مال میں برابر کے شریک ہیں، تو جس قدر ترقی ہوئی ہے، اس میں بھی دونوں برابر کے مالک ہوں گے۔ فتاویٰ عالمگیری (۲/ ٤٠٦) میں ہے: "وحكمها أي حكم شركة الملك على قدر الملك" اھ [اور ان دونوں کا حکم، یعنی شرکتِ ملک کا حکم ملک کی مقدار کی بنیاد پر ہے]

الحاصل صورتِ مسئولہ میں پسرِ کلاں کا دعویٰ مذکورہ ہر طرح درست ہے۔ اگر یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ جب باپ بیٹے مل کر کوئی پیشہ کریں تو ایسی صورت میں کل کمائی باپ ہی کی قرار دی جاتی ہے اور بیٹا صرف معین سمجھا جاتا ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری (۲/ ۳۳۶) اور درمختار (۳/ ۳٤۹) میں ہے:

"الأب والابن يكتسبان في صنعة واحدة، ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله لكونه معينا له" اھ

[باپ اور بیٹا ایک ہی پیشے میں کام کرتے ہوں اور دونوں کے پاس کچھ نہ ہو تو تمام آمدنی باپ کی ہوگی بشرطیکہ بیٹا اس کے عیال میں ہو، اس لیے کہ وہ اس کا معین شمار ہوگا]

تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں صحیح ہے کہ باپ بیٹے دونوں مل کر کوئی پیشہ کریں اور دونوں خالی ہاتھ ہوں، یعنی کچھ نہ رکھتے ہوں اور بیٹا باپ کے عیال میں بھی ہو، یعنی بیٹے کا باپ پر بوجہ اس بیٹے کے نابالغ ہونے کے یا کسی اور وجہ سے نفقہ واجب ہو، چنانچہ ان دونوں شرطوں کی تصریح خودعبارت منقولہ اعتراض میں موجود ہے۔ یعنی قوله: يعني قوله: "ولم يكن لهما شيئ" وقوله: "إن كان الابن في عياله" [اس کا یہ قول کہ ان دونوں کے پاس کچھ نہ ہو اور اس کا یہ قول کہ بیٹا اس کے عیال میں ہو]

مانحن فیہ میں یہ دونوں شرطیں مفقود ہیں۔ اول تو اس لیے کہ جب دونوں نے مال بطورِ قرض حاصل کر لیا تو دونوں مال کے مالک ہو گئے تو خالی ہاتھ باقی نہ رہے اور ثانی کا فقدان عبارتِ سوال سے متبادر ہے اور مسئلہ مذکورہ اعتراض کے علی الاطلاق صحیح نہ ہونے کی تائید مسئلہ ذیل سے بھی بخوبی ہوتی ہے، جو فتاویٰ عالمگیری (۲/ ۴۵۱) میں مندرج ہے:

"قال الخجندي: ويجوز للأب والوصي أن يشتركا بمال أنفسهما مع مال الصغير، ولو كان رأس مال الصغير أكثر من مال رأس مالهما، فإن أشهدا يكون الربح على الشرط، وإن لم يشهدا يحل فيما بينهما وبين الله تعالىٰ، لكن القاضي لا يصدقهما، ويجعل الربح على قدر رأس المال، كذا في السراج الوهاج" اھ

[خجندی نے کہا ہے: باپ اور وصی کے لیے جائز ہے کہ وہ صغیر کے مال کے ساتھ اپنے مالوں کے ساتھ شرکت کریں۔ اگرچہ صغیر کا اصل مال ان دونوں کے اصل مال سے زیادہ ہو، پس اگر ان دونوں کو گواہ بنایا جائے تو نفع شرط کی بنیاد پر ہوگا اور اگر ان کی گواہی نہ دلوائی جائے تو یہ معاملہ ان دونوں اور اللہ کے درمیان ہوگا، لیکن قاضی ان کی تصدیق نہیں کرے گا اور نفع اصل مال کی مقدار کی بنیاد پر تقسیم کرے گا۔ "السراج الوهاج" میں بھی ایسے ہی ہے]

وجہ تائید یہ ہے کہ اس مسئلے میں طفل صغیر جو تجارت میں باپ کا شریک ہے، نفع میں بھی باپ کا شریک مانا گیا ہے اور اگر مسئلہ مذکورہ اعتراض علی الاطلاق صحیح ہوتا تو اس مسئلے میں بھی طفل مذکور نفع میں شریک نہ مانا جاتا۔ وإذ ليس فليس، والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

اپنے خاص پیداواری مال میں دوسرے بھائیوں کی شرکت:

سوال زید زمانہ دراز تک ملازمت کرتا رہا اور کل آمدنی اپنی ہمیشہ اپنے والدین و بھائی کار پردازان کو دیتا چلا آیا، جس کے ذریعے سے جائداد جدید و مال و اسباب وغیرہ میں علاوہ توروثی کے بفضلہ بہت ترقی ہوئی ہے۔ دورانِ ملازمت میں زید شروع سے اخیر تک اپنے ذاتی اخراجات وغیرہ کا ایک مقررہ حصہ بطورِ تنخواہ وصول کر لیتا تھا، جس میں سے بھی کفایت و انتظام وغیرہ کی وجہ سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ بچت ہوتی گئی اور وہ بچت ہمیشہ علیحدہ ہوتی رہی۔ غرض عرصہ بائیس سال کی بچت ایک تھوڑی رقم ہوگئی۔ زید عرصہ دو برس کا ہوا، ملازمت چھوڑ کر اسی بچت بائیس سال کے روپیوں سے جو خاص پیدا کردہ زید کا ہے، جمیع ورثاء سے قطع تعلق کر کے علاوہ کاروبار موروثی مشترکہ کے کچھ کاروبار دیگر، یعنی تجارت کر رہا ہے، زید کے مورث کو انتقال کیے ہوئے بھی عرصہ دو برس کا ہوا۔ بوقت تقسیم مال موروثی جمیع ورثا کا حصہ ازروئے شرع برابر ہوگا یا وہ پیدا کردہ جائداد مال اسباب خاص ملازم زید کی سمجھی جائے گی اور صرف موروثی اموال میں تقسیم ہوگی؟

جواب اگر صورت مذکورہ سوال میں زید اور اس کے والدین اور بھائی کارپردازان مکان کے درمیان اس امر کا معاہدہ

رہا ہو کہ ہم شرکا میں سے جو کچھ کوئی پیدا کرے، وہ سب میں مشترک سمجھا جائے تو اس صورت میں زید کا وہ پیدا کردہ مال واسباب و جائداد جس کو وہ علیحدہ جمع کرتا رہا، سب میں مشترک سمجھا جائے گا اور بوقت تقسیم وہ بھی اور مالوں کے ساتھ ملا کر سب میں تقسیم ہوگا۔ اگر زید اور دیگر مذکورہ بالا لوگوں کے درمیان معاہدہ مذکور نہ رہا ہو، تو اس صورت میں زید کا وہ پیدا کردہ مال واسباب و جائداد مذکورہ خاص زید کا سمجھا جائے گا، وہ سب میں مشترک نہیں سمجھا جائے گا اور نہ وہ بوقت تقسیم اور مالوں کے ساتھ ملا کر سب میں تقسیم ہوگا، بلکہ صرف دیگر اموال میں تقسیم ہوگی۔

(کتبہ: ۲۱/ شوال ۱۳۳۱ھ)

دھوکے سے حق دار کو شفعہ سے محروم کرنا:

سوال زید نے کچھ زمین بکر سے اس طرح لی کہ زبانی تو اقرار بیع کا کیا اور کاغذ میں رہن لکھا، اس لیے کہ جب بکر کو موقع ہوگا تو زید سے واپس کر لے گا اور بیع کرنے سے بکر کا یہ نقصان ہوتا ہے کہ اُس کے شرکاء قانونی برتاؤ کا عمل کر کے یعنی شفعہ کر کے زمین کو زید سے نکال لیں گے تو پھر بکر نہیں پا سکتا اور زید سے بکر کو اطمینان ہے، جب چاہے گا روپیہ دے کر زمین لے لے گا اور زید اس زمین کی لگان سرکاری سال بہ سال بکر کو ادا کرتا رہتا ہے اور اُس زمین کے محاصل بعد ادائے مال گزاری سرکار اپنے تصرف میں لاتا ہے، لیکن اگر یہ زمین بکر کے پاس رہتی تو اس کو محاصل زیادہ ملتا، اُس سے جتنا زید دیتا ہے، کیونکہ صرف لگان سرکاری بغرض اس کے کہ زبانی تو بیع لے چکا ہے، دیتا ہے، جتنا کہ بکر سرکار کو دیتا ہے، اسی قدر زید سے پاتا ہے تو ایسی صورت میں اُس زمین کا محاصل بعد ادائے لگان سرکاری زید کو اپنے تصرف میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب صورت مسئولہ میں اگرچہ جب زید و بکر میں زمین مذکور کی لین دین بطور بیع قرار پائی تو یہ لین دین ایک قسم کی بیع ہوگئی اور زید کو اس زمین کا محاصل اپنے تصرف میں لانا جائز ہوگیا، لیکن یہ فریب وحیلہ و دروغ ہے جو اس صورت میں عمل میں لایا گیا، جس سے حق داروں شفیعوں کا حق مارنا قصد کیا گیا، ناجائز ہے۔ صحیح بخاری (چھاپہ مصر ربع رابع، ص: ۱۶۹) میں ہے:

"عن أبي رافع أن سعدا ساومه بيتا بأربع مائة مثقال فقال: لو لا أني سمعت رسول الله ﷺ يقول: «الجار أحق بسقبه» لما أعطيتك" [1] والله أعلم بالصواب.

[ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ نے چار سو مثقال کے عوض ایک گھر کا ان سے سودا کیا، پھر انھوں نے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا: "پڑوسی اپنے قرب کی وجہ سے (شفع کا) زیادہ حق دار ہے۔" تو میں تمھیں یہ گھر ہرگز نہ دیتا]

کتبہ: محمد عبد اللہ

سوال زید علوی ہاشمی نے اپنی زمین مزروعہ و غیر مزروعہ واسطے بطلانِ شفعہ دو چند قیمت سے زیادہ پر خالد کے ہاتھ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٧٧)

فروخت کر دی، جو قوم کا حجام دوسری پٹی اور محلّہ کا باشندہ ہے اور بستی میں کسی قسم کی شراکت اور ملکیت نہیں رکھتا۔ اب عمرو زید کا ہم قوم ہمسایہ محلّہ دار جس کی زمین کے بعض قطعے زید کی زمین بیع شدہ سے ملصق اور اکثر متفرق سو سو قدم یا کم وبیش کے فاصلہ پر ہیں۔ زمین مبیعہ میں سے کچھ زمین ایسی بھی ہے، جو اب تک عمرو کی زمین سے مشترک غیر مقسومہ ہے۔ شرعاً استحقاقِ شفعہ بہ قیمت اصلی بازاری رکھتا ہے یا نہیں؟ یعنی جو قیمت بدنیتی سے زیادہ کی گئی ہے، اس کو کم کرا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا.

جواب اگر زید نے زمین مذکور اصلی قیمت سے زیادہ پر ایک اجنبی شخص (خالد) کے ہاتھ بہ نیت اسقاطِ حق شفعہ فروخت کی ہے تو زید کا یہ حیلہ ناجائز ہے اور عمرو اس صورت میں استحقاقِ شفعہ قیمت اصلی بازاری سے رکھتا ہے، یعنی جس زمین میں وہ استحقاق شفعہ رکھتا ہے، اس زمین کو بذریعہ شفعہ اصلی بازاری قیمت سے لے سکتا ہے۔ صحیح بخاری مع فتح الباری (۲/ ۴۰۷ چھاپہ دہلی) میں ہے:

”قال أبو رافع (لسعد بن أبي وقاص) لو لا أني سمعت رسول اللهﷺ يقول: «الجار أحق بسقبه» ما أعطيتكها بأربعة آلاف، وإنما أُعطىٰ بها خمس مائة دينار فأعطاها إياه“[1]

[ابو رافع نے سعد بن ابی وقاص کو کہا: اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا: ”پڑوسی اپنے قرب کی وجہ سے (شفعے کا) زیادہ حق دار ہے“ تو میں تمھیں چار ہزار کے عوض ہرگز یہ گھر نہ دیتا، جب کہ مجھے اس گھر کے پانچ سو دینار مل رہے ہیں، چناں چہ انھوں (ابو رافع) نے وہ گھر ان (سعد بن ابی وقاص) کو دے دیا]

صفحہ (۳۶۷) میں ہے: قال النبيﷺ: «من عمل عملًا ليس عليه أمرنا فهو رد»[2] [جس نے ہمارے طریقے سے ہٹ کر کوئی کام کیا تو وہ مردود ہے] اگر زید نے بیع مذکور نیک نیتی سے کی ہے اور بہ نیتِ اسقاط حق شفعہ نہیں کی ہے تو اگر بیع مذکور اولاً اصلی قیمت سے ہوئی تھی، پھر بعد کو اس پر قیمت زیادہ کی گئی تو اس صورت میں بھی عمرو استحقاقِ شفعہ اسی اصلی بازاری قیمت سے رکھتا ہے، کیونکہ جس وقت بیع مذکور اصلی قیمت سے ہوئی تھی، اسی وقت عمرو کو اسی اصلی قیمت سے استحقاقِ شفعہ حاصل ہو چکا تھا۔ پھر بعد کو قیمت بڑھا کر عمرو کے اس استحقاق ثابت کو باطل کر دینا عمرو کو ضرر پہنچانا ہے اور یہ امر ناجائز ہے۔ ہدایہ (۲/ ۳۸۲ چھاپہ مصطفائی) میں ہے:

”وإن زاد المشتري للبائع، لم يلزم الزيادة في حق الشفيع، لأن في اعتبار الزيادة ضررا بالشفيع لاستحقاقه الأخذ بما دونها“ اهـ

[اگر خریدار فروخت کنندہ کو کچھ زائد قیمت دے تو شفعہ کرنے والے کے حق میں یہ زائد رقم لازم نہیں ہوگی، کیوں کہ زائد رقم کے اعتبار کے ساتھ شفعہ کرنے والے کو اس سے کم قیمت پر اپنا حق وصول کرنے

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۱۳۹)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۵۵۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۱۸)

میں ضرر رسانی ہے]

صفحہ (۵۸۵) میں ہے: لقولهﷺ: «لا ضرر ولا ضرار في الإسلام»[1] اھ [آپ ﷺ نے فرمایا: (پہلے پہل) کسی کو نقصان پہنچانا اور تکلیف دینا جائز ہے اور نہ بدلے کے طور پر نقصان پہنچانا اور تکلیف دینا]

"نصب الراية لأحاديث الهداية" (۲/۳۶۳) میں ہے:

"حديث: قال ﷺ: «لا ضرر ولا ضرار في الإسلام» قلت: روي من حديث عبادة بن الصامت وابن عباس وأبي سعيد الخدري وأبي هريرة وأبي لبابة و ثعلبة بن مالك و جابر بن عبدالله و عائشة" اھ

[حدیث کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «لا ضرر ولا ضرار في الإسلام» میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث عبادہ بن صامت، ابن عباس، ابو سعید خدری، ابو ہریرہ، ابو لبابہ، ثعلبہ بن مالک، جابر بن عبد اللہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے]

اگر بیع مذکور ابتداءً ہی اصلی قیمت سے زیادہ پر ہوئی تھی، بعد کو قیمت پر زیادت نہیں ہوئی تو اس صورت میں عمرو استحقاق شفعہ اس زمین کا اصلی بازاری قیمت سے نہیں رکھتا۔ واضح رہے کہ عمرو استحقاقِ شفعہ زید کی صرف اسی زمین میں رکھتا ہے، جو عمرو کی زمین سے مشترک غیر مقسوم ہے یا گو مقسوم ہے، لیکن راستہ مشترک ہے، اس کے سوا اور زمین میں استحقاقِ شفعہ نہیں رکھتا۔ صحیح بخاری مع فتح الباری (۲/ ۷۰۶) میں ہے:

"عن جابر بن عبد الله قال: قضى النبيﷺ بالشفعة في كل ما لم يقسم، فإذا وقعت الحدود و صرفت الطرق فلا شفعة"[2]

[جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ہر اس چیز میں شفعے کا فیصلہ فرمایا جو تقسیم نہ کی گئی ہو۔ جب حد بندی ہو جائے اور راستے الگ الگ ہو جائیں تو پھر کوئی شفعہ نہیں]

ہاں حسبِ مذہب حنفی عمرو اس زمین میں استحقاقِ شفعہ رکھتا ہے، جو گو مقسوم ہے اور راستہ بھی مشترک نہیں ہے، لیکن وہ زمین عمرو کی زمین سے ملصق ہے۔ ہدایہ (۲/۳۷۳) میں ہے:

"الشفعة واجبة للخليط في نفس المبيع، ثم للخليط في حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار" اھ

[شفعہ ایسے خلیط کے لیے واجب ہوتا ہے، جس کی نفس مبیع میں شرکت ہو، پھر ایسے خلیط کے لیے جس کی حقِ مبیع میں شرکت ہو، جیسے شرب اور راستہ، پھر پڑوسی کے لیے شفعہ واجب ہوتا ہے]

---

[1] المعجم الأوسط (۵/ ۳۲۸) نیز دیکھیں: مسند أحمد (۱/ ۳۱۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۳۴۰)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۰۹۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۶۰۸)

صفحہ (۳۷۴) میں ہے: "والمراد بهذا الجار الملاصق... الخ" والله أعلم بالصواب [اور اس پڑوسی سے مراد وہ ہے جو بالکل متصل ہو... الخ]
کتبہ: محمد عبد الله

شفعہ کا حق دار کون ہے؟

سوال زید نے اپنی زمین، جس کے قطعات متعددہ ہیں، بعض عمرو کی زمین سے متصل ہیں اور بعض بکر وغیرہ کی زمین سے، خالد کے ہاتھ فروخت کر دی، جو قوم کا حجام دوسرے محلّہ کا باشندہ ہے۔ اب عمرو نے بکر وغیرہ دیگر شرکائے شفعہ کی اجازت اور رضا مندی سے دعویٰ حقِ شفعہ کیا، بلکہ بکر وغیرہ اس امر میں عمرو کی امداد شفعہ دلانے میں کرتے ہیں۔ اب شفیع کا شفیع بن کر مستحق شفعہ اس زمین مبیعہ غیر اتصالی کا، جس کا شفعہ بکر عمرو کو دے چکا ہے، ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بينوا تؤجروا.

جواب حقِ شفعہ اسی شخص کو پہنچتا ہے جو زمین مبیعہ میں یا اس کے کسی حق (راستہ وغیرہ) میں شرکت رکھتا ہو اور جو شخص ان دونوں میں سے کسی میں شرکت نہ رکھتا ہو، اس کو حق شفعہ نہیں پہنچتا۔ «فإذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة»[1] (صحيح بخاري) [پھر جب حد بندی ہو جائے اور راستے الگ الگ ہو جائیں تو پھر کوئی شفعہ نہیں ہے]

حنفی مذہب میں اس شخص کو بھی حق شفعہ پہنچتا ہے، جو نہ نفس مبیع میں شریک ہو اور نہ اس کے کسی حق میں، لیکن زمین مبیعہ کا جار ملاصق ہو، جب یہ بات معلوم ہوئی تو اب جاننا چاہیے کہ بکر وغیرہ جو زمین مبیعہ کے بعض قطعات کے جار ملاصق ہیں، ان کو ازروئے مذہب حنفی صرف انھیں بعض قطعات میں جو ان کی زمین کے متصل ہیں، حق شفعہ پہنچتا ہے، نہ عمرو کو جس کی زمین کو ان قطعات سے اتصال تک نہیں ہے، تو اس صورت میں عمرو ان قطعات مذکورہ میں اصالتاً مدعی شفعہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر بکر وغیرہ اصالتاً مدعی شفعہ ہوں اور عمرو کو اس مقدمہ شفعہ کا وکیل بنائیں تو عمرو صرف وکالتاً اس مقدمہ کی پیروی کر سکتا ہے وبس۔ والله أعلم بالصواب.
کتبہ: محمد عبد الله

وکالت کی شرعی حیثیت:

سوال وکالت و بیرسٹری جو محکمہ جات عدالت و فوجداری میں مروج ہے، کیا گورنمنٹ انگریزی کیا ریاست حیدر آباد وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب وکالت کی تین صورتیں ہیں:

1. وکالت امور معلوم الجواز والحقیۃ میں، یعنی ایسے امور میں جن کو وکیل جانتا ہو کہ یہ امور شرعاً جائز و حق ہیں۔
2. وکالت امور معلوم عدم الجواز والبطلان میں، یعنی ایسے امور میں جن کو وکیل جانتا ہو کہ یہ امور شرعاً باطل و ناجائز ہیں۔
3. وکالت امور غیر معلوم الجواز والبطلان میں، یعنی ایسے امور میں جن کو وکیل نہیں جانتا کہ یہ امور شرعاً جائز و حق ہیں یا ناجائز و ناحق۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۰۹۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱٦۰۸)

اول صورت جائز ہے اور دوسری و تیسری صورت ناجائز۔ پہلی صورت کے جواز کی دلیل ہے: قولہ تعالیٰ: ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى﴾ (سورۂ مائدۃ، رکوع: ۱) [اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو] وقولہ تعالیٰ: ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا﴾ (سورۂ نساء، رکوع: ۱۱) [جو کوئی سفارش کرے گا، اچھی سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہوگا]

وما رواه أحمد و أبو داود عن عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً: «من خاصم في باطل، وهو يعلمه، لم يزل في سخط الله تعالىٰ حتى ينزع»[1]

[نیز جو امام احمد اور ابو داود رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے: جس نے جانتے بوجھتے ہوئے باطل (کی حمایت) میں جھگڑا کیا تو وہ اللہ کی ناراضی میں رہے گا، حتی کہ اس سے باز آجائے]

وما رواه أبو داود عن واثلة بن الأسقع رضی اللہ عنہ قال: قلت: يا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم! ما العصبية؟ قال: «أن تعين قومك على الظلم»[2]

[نیز جو امام ابو داود رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! عصبیت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کہ تو اپنی قوم کے لوگوں کی مدد کرے، حالانکہ وہ ظلم پر ہوں]

وعن سراقة بن مالك بن جعشم رضی اللہ عنہ قال: خطبنا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فقال: «خيركم المدافع عن عشيرته ما لم يأثم»[3]

[سراقہ بن مالک بن جعشم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: تم میں بہتر وہ شخص ہے جو اپنے قبیلے کا دفاع کرے، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو]

وما رواه أحمد و ابن ماجه عن عبادة بن كثير الشامي عن أهل فلسطين عن امرأة منهم يقال لها: فَسِيْلَةُ، إنها قالت: سمعت أبي يقول: سألت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فقلت: يا رسول الله! أمن العصبية أن يحب الرجل قومه؟ قال: «لا، ولكن من العصبية أن ينصر الرجل على الظلم»[4] (مشكوة شريف باب الشفاعة في الحدود فصل ثاني و باب المفاخرة والعصبية فصل ثاني و ثالث)[5]

---

[1] مسند أحمد (۲/ ۷۰) سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۵۹۷)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۱۱۹) اس کی سند میں "سلمة بن كثير الدمشقي" راوی ضعیف ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۱۲۰) یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد امام ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "أيوب بن سويد ضعيف"

[4] مسند أحمد (٤/ ۱۰۷) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۹٤۹) اس کی سند میں "عباد بن كثير" راوی متروک ہے۔ درحقیقت یہ وہی حدیث ہے، جو اوپر واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کے حوالے سے گزری ہے۔

[5] مشكاة المصابيح (۳/ ٦٤)

[نیز جو امام احمد اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ عبادہ بن کثیر الشامی اہلِ فلسطین سے روایت کرتے ہیں، وہ فسیلہ نامی اپنی ایک عورت سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا یہ بھی عصبیت ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت رکھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، عصبیت تو یہ ہے کہ آدمی ظلم میں (اپنی قوم کی) مدد کرے]

تیسری صورت کی ناجوازی کی دلیل ہے: قوله تعالىٰ: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ (بني إسرائيل، رکوع: ٤) [اور اس چیز کا پیچھا نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں]

وما رواه أبو داود و ابن ماجه عن بريدة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «القضاة ثلاثة، واحد في الجنة، واثنان في النار، فأما الذي في الجنة فرجل عرف الحق فقضىٰ به، ورجل عرف الحق فجار في الحكم فهو في النار، ورجل قضى للناس على جهل فهو في النار»[1] (مشكوة شريف، باب العمل في القضاء والخوف منه، فصل ثاني)

[نیز جو امام ابو داود اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حاکم تین طرح کے ہیں: دو دوزخی اور ایک جنتی، جس حاکم نے حق والے کا حق پہچان لیا اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی کیا، وہ حاکم جنتی ہے اور جس حاکم نے حق والے کا حق تو پہچان لیا، لیکن فیصلہ اس کے مطابق نہیں کیا، بلکہ جان بوجھ کر حق کے خلاف فیصلہ کیا، وہ حاکم دوزخی ہے اور جس حاکم نے حق والے کا حق تک بھی دریافت نہیں کیا اور یوں ہی بے سمجھے بوجھے فیصلہ سنا دیا، وہ حاکم بھی دوزخی ہے]

اس حدیث میں جو وعید ہے، اگرچہ قضا علی جہل میں وارد ہے، یعنی اس قاضی کے بارے میں جو حق و ناحق کی تحقیق نہیں کرتا اور یوں ہی انڈ کا سنڈ فیصلہ کر دیا کرتا ہے، لیکن اصل معصیت جو مناط وعید ہے، یعنی بلا تحقیق حق و ناحق کے ایک جانب کا طرفدار ہوجانا، یہ امر اس قضا اور صورت ثالثہ وکالت دونوں میں مشترک ہے تو ناجوازی کا حکم بھی دونوں میں مشترک ہوگا اور روایتِ بیہقی: «من أعان على خصومة لا يدري أحق أم باطل، فهو في سخط الله حتى ينزع»[2] (مشكوة شريف باب الحدود فصل ثاني) [جس نے کسی جھگڑے پر اعانت کی جب کہ وہ نہیں جانتا کہ وہ حق ہے یا باطل تو وہ اللہ کی ناراضی میں رہتا ہے، حتی کہ وہ اس سے دست کش ہوجائے] کی بالخصوص صحت یا عدمِ صحت معلوم نہیں، کیونکہ بیہقی یہاں موجود نہیں ہے کہ اس میں اس کی سند دیکھ کر کچھ حکم لگایا جائے، لیکن اس کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٧٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣١٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ٤٦١) المستدرك (٤/ ٩٠) بلوغ المرام (١٣٩٧)

[2] شعب الإيمان (٧/ ٥١٠) یہ حدیث صحیح ہے۔

مضمون کی تائید دوسرے اور دلائل سے بخوبی ہوجاتی ہے اور جس صورت میں کہ وکیل نے اولاً حتی الوسع اس امر کی تحقیقات کر لی کہ مدعی و مدعا علیہ میں سے کون شرعاً برسرِ حق ہے، تب اس کی وکالت قبول کی تو یہ وکالت پہلی قسم میں داخل ہوگی، یعنی یہ صورت وکالت کی جائز ہے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللّٰہ. الجواب صحیح. کتبہ: أبو العلی محمد عبد الرحمن المبارکفوري۔

مہر مدرسہ۔ (۵/ دسمبر ۹۳ھ)

مدعی اور مدعا علیہ جھگڑے کے وقت کیا کریں؟

سوال زید کا عمرو دین دار ہے۔ جب زید اپنا روپیہ عمرو سے طلب کرتا ہے، عمرو کہتا ہے کہ تم نے ہم کو معاف کر دیا ہے اور زید کہتا ہے کہ ہم نے معاف نہیں کیا ہے۔ کوئی دوسرا شخص معاف کرنے یا نہ کرنے کا گواہ نہیں ہے۔ اس حالت میں عند اللہ وعند الرسول وعند الناس زید اپنا روپیہ عمرو سے لینے کا مستحق ہے یا نہیں اور عمرو زید کا دین دار ہے یا نہیں؟

جواب قانونِ شریعتِ اسلام یہ ہے کہ جب مدعا علیہ مدعی کے دعوے کا انکار کرے تو مدعی اگر اپنا دعویٰ ثابت کرنا چاہے تو اس پر لازم ہے کہ گواہوں سے ثابت کرے اور جب گواہوں سے ثابت نہ کر سکے، اس سبب سے کہ گواہ موجود نہیں ہیں اور مدعا علیہ سے انکارِ دعویٰ پر حلف چاہے تو مدعا علیہ پر حلف لازم ہے تو اگر مدعا علیہ انکارِ دعویٰ میں سچا ہے تو حلف لے لے اور جب حلف لے لے گا تو مدعی کا دعویٰ ساقط ہو جائے گا اور اگر حلف نہ لے گا تو دعویٰ ساقط نہ ہوگا۔

صورتِ مسئولہ میں جب عمرو کو تسلیم ہے کہ وہ زید کا دین دار ہے تو عمرو کا بر وقت تقاضا کرنے زید کے یہ کہنا کہ تم نے ہم کو معاف کر دیا ہے، یہ عمرو کا زید پر ایک دعویٰ ہے اور زید کا یہ کہنا کہ ہم نے معاف نہیں کیا ہے، اس کے دعویٰ کا انکار ہے اور جب اس صورت میں عمرو کا کوئی گواہ نہیں ہے، اگر زید سے انکارِ دعویٰ پر حلف چاہے اور زید حلف لے لے یعنی قسم کھا جائے کہ میں نے اپنا دین جو عمرو پر ہے، معاف نہیں کیا ہے تو عمرو کا دعویٰ کہ زید نے اپنا دین معاف کر دیا ہے، ساقط ہوجائے گا اور عمرو زید کا دَین دار اور زید اپنا روپیہ عمرو سے پانے کا مستحق ہوگا اور درصورت حلف نہ لینے زید کے عمرو کا دعویٰ ساقط نہ ہوگا۔

أخرج مسلم عن وائل بن حجر رضی اللہ عنہ قال: جاء رجل من حضر موت، ورجل من كندة، إلى النبي ﷺ فقال الحضرمي: يا رسول الله! إن هذا غلبني على أرض، كانت لأبي، فقال الكندي: هي أرضي في يدي، أزرعها ليس له فيها حق، فقال ﷺ للحضرمي: «ألك بينة؟» قال: لا. قال: «فلك يمينه» قال: يا رسول الله! الرجل فاجر، لا يبالي على ما حلف عليه، وليس يتورع عن شيئ، فقال: «ليس لك منه إلا ذلك» فانطلق ليحلف فقال ﷺ لما أدبر: «أما لئن حلف على ماله ليأكله ظلما، ليلقين الله وهو عنه معرض»[1]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩) یہ تمام عبارت "نصب الراية" سے منقول ہے۔

[امام مسلم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضر موت (قبیلہ) کندہ کے دو آدمی نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو حضرمی نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ شخص میرے باپ کی زمین پر قابض ہوگیا ہے۔ کندی نے کہا: یہ میری زمین ہے اور میرے قبضے میں ہے، میں ہی اسے کاشت کرتا ہوں، اس کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرمی سے کہا: کیا تیرے پاس کوئی دلیل (وگواہی) ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو تمھیں اس کی قسم قبول کرنی ہوگی۔'' اس نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ فاجر آدمی ہے، اسے کوئی پروا نہیں کہ کیا قسم کھا رہا ہے، یہ کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے لیے اس کی طرف سے بس یہی ہے (کہ وہ قسم کھائے)۔'' چنانچہ وہ قسم کھانے کے لیے تیار ہوگیا۔ جب اس نے پشت پھیری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اس نے قسم کھالی کہ ظلم سے اس کا مال کھالے تو یہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس سے رخ پھیرے ہوئے ہوگا]

حديث آخر: أخرجه الأئمة الستة في كتبهم عن الأشعث بن قيس قال: كان بيني وبين رجل من اليهود أرضٌ فجحدني فقدمته إلى النبيﷺ فقال ليﷺ: «ألك بينة؟» قلت: لا فقالﷺ لليهودي: «احلف» قلت: يا رسول الله! إذا يحلف ويذهب بمالي، فأنزل الله تعالىٰ: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ [آل عمران: ٧٧] إلى آخر الآية.[1]

[ائمہ ستہ نے اپنی کتابوں میں اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت بیان کی ہے، انھوں نے فرمایا: زمین کا ایک ٹکڑا میری اور یہودی کی مشترکہ ملکیت تھا۔ اس نے میرا حصہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: ''کیا تیرے پاس کوئی گواہ ہے؟'' میں نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی سے کہا: ''قسم کھا۔'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! وہ تو (جھوٹی قسم کھا کر) میرا مال لے لے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ (بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت لیتے ہیں)]

وأخرج البيهقي في سننه عن ابن عباس قال: قال رسول اللهﷺ: «لو يعطى الناس بدعواهم لادعى رجال أموال قوم و دمائهم لكن البينة على المدعي واليمين على من أنكر»[2] (تخريج الهداية للزيلعي: ٢/ ٢١٦)

[امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٤٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٦٩)

[2] سنن البيهقي (١٠/ ٢٥٢)

''اگر لوگوں کو محض ان کے دعوے کی بنا پر چیز دے دی جائے تو لوگ دوسرے افراد کے مالوں اور خونوں پہ دعوے کر دیں، لیکن گواہی پیش کرنا مدعی کا فرض ہے اور اس کا انکار کرنے والے (مدعا علیہ) کے ذمے قسم کھانا ہے]

"قد أخرج البيهقي الحديث بإسناد صحيح، كما قال الحافظ بلفظ: البينة على المدعي، واليمين على من أنكر"[1] (نيل الأوطار: ٨/ ٥٧٤)

[امام بیہقی رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے، جس طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے کہ گواہی پیش کرنا مدعی کا فرض ہے اور اس کا انکار کرنے والے (مدعا علیہ) کے ذمے قسم کھانا ہے]

"وجاء في رواية البيهقي وغيره بإسناد حسن أو صحيح، عن ابن عباس عن النبيﷺ قال: لو يعطى الناس بدعواهم لادعىٰ قوم دماء قوم و أموالهم، لكن البينة على المدعي، واليمين على من أنكر" انتهى (نووي شرح مسلم: ٢/ ٧٤) واللّٰه تعالىٰ أعلم بالصواب

[بیہقی وغیرہ میں حسن یا صحیح سند کے ساتھ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ نبیِ اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر لوگوں کو محض ان کے دعوے کی بنا پر ہر چیز دے دی جائے تو لوگ دوسرے افراد کے خونوں اور مالوں پر دعوے کر دیں، لیکن گواہی پیش کرنا مدعی کا فرض ہے اور اس کا انکار کرنے والے (مدعا علیہ) کے ذمے قسم کھانا ہے]

كتبه: محمد عبد اللّٰه. مهر مدرسه أحمديه. الجواب صحيح. وصيت على. الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب. الجواب صحيح. ألفت حسين مدرس سوم مدرسه أحمديه. الجواب صحيح و المجيب مصيب. محمد أصغر. مدرسه أحمديه آره. هذا الجواب صحيح عندي. محمد ضمير الحق، عفي عنه.

ہبہ کا جواز اور لڑکی کو وراثت سے محروم کرنا[2]:

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ زید باحیات ہے، اس کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہے۔ زید اپنی جائداد منقولہ و غیر منقولہ کو اپنے لڑکے یا پوتے کے نام ہبہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس حیلے سے اپنے بعد وفات لڑکی کو ترکہ سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ آیا یہ ہبہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس ہبہ ہو جانے کے بعد جب کہ زید انتقال کرے تو اس کی لڑکی شرعاً ترکہ لے سکتی ہے یا نہیں؟ ہبہ کے جواز یا عدمِ جواز کو اور نیز شرعاً ترکہ پانے کو مدلل بقرآن

---

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ٢٥٢)

[2] فتاویٰ نذیریہ (۲/۲۹۲)

وحدیث تحریر فرمائیے۔ بينوا بالكتاب تؤجروا يوم الحساب.

جواب یہ ہبہ شرعاً ناجائز ہے، اس لیے کہ یہ ہبہ لڑکی کے اضرار کو مستلزم ہے اور اضرار شرعاً ناجائز ہے۔

قال العلامة الزيلعي في نصب الراية (٢/ ٣٦٣):

"روىٰ الحاكم في المستدرك في البيوع من حديث عثمان بن محمد بن عثمان بن ربيعة بن أبي عبد الرحمن حدثني عبد العزيز بن محمد الدراوردي عن عمرو بن يحيىٰ المازني عن أبيه عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: «لا ضَرر ولا ضِرار، من ضر ضره الله، ومن شق شق الله عليه» وقال: صحيح الإسناد ولم يخرجاه. اهـ وقال العلامة: وروي هذا الحديث عن عبادة بن الصامت و ابن عباس وأبي لبابة وثعلبة بن مالك و جابر بن عبدالله و عائشة أيضاً، انتهى. وهذه الأحاديث وإن كان في طرق بعضها أو أكثرها كلام، لكنها بتعدد طرقها تتقوى"

[امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی مستدرک کی کتاب البیوع میں عثمان بن محمد بن عثمان بن ربیعہ بن ابو عبدالرحمٰن کے واسطے سے روایت بیان کی ہے، انھوں نے کہا کہ مجھے عبدالعزیز بن محمد دراوردی نے عمرو بن یحییٰ مازنی سے، انھوں نے اپنے باپ سے اور انھوں نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہ خود نقصان اُٹھاؤ نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ، جو کسی کو تکلیف دے گا، اللہ اس کو تکلیف دے گا اور جو کسی پر سختی کرے گا، اللہ اس پر سختی کرے گا" پھر انھوں نے کہا ہے کہ اگرچہ اس کو بخاری و مسلم نے روایت نہیں کیا، مگر یہ صحیح الاسناد ہے... الخ۔ علامہ (زیلعی) نے کہا ہے: یہ حدیث عبادہ بن صامت، ابن عباس، ابو لبابہ، ثعلبہ بن مالک، جابر بن عبداللہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے، انتہی۔ ان احادیث کے بعض یا اکثر طرق میں کلام ہونے کے باوجود یہ تعدد طرق کی وجہ سے قوی ہو جاتی ہے]

یہ ہبہ لڑکی کے عقوق کو مؤدی ہے اور عقوق گناہ کبیرہ و ناجائز ہے۔

قال في المشكاة (ص: ٩٠): عن عبدالله بن عمرو قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: «الكبائر؛ الإشراك بالله وعقوق الوالدين» الحديث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بڑے گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔"

نیز یہ ہبہ لڑکی کو میراث سے محروم کرنے کو متضمن ہے اور عورتوں کو میراث سے محروم کرنا جاہلی طریقہ ہے، جس کو اسلام نے باطل و ناجائز قرار دیا ہے۔

قال في الجلالين (ص: ٨٦): نزل ردا لما كان عليه الجاهلية من عدم توريث النساء والصغار: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ

الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ اھ

''یہ آیت جاہلیت کے اس رواج کی تردید کے لیے نازل ہوئی کہ وہ عورتوں اور چھوٹے بچوں کو وراثت میں سے حصہ نہیں دیا کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی: مردوں کے لیے حصہ ہے اس چیز سے، جو ماں باپ چھوڑ جائیں اور قرابت دار اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس سے جو قرابت دار اور ماں باپ چھوڑ جائیں، خواہ کم ہو یا زیادہ، ہر ایک حصہ مقرر ہے۔''

جب یہ ہبہ شرعاً جائز ہے تو شرعاً باطل و کالعدم ہے، کیوں کہ حدیث ہے: «من عمل عملًا ليس عليه أمرنا فهو رد» (رواہ مسلم: ۲/ ۷۷) [جس نے ایسا عمل کیا، جو ہمارا طریقہ نہیں ہے تو وہ مردود ہے]

جب یہ شرط باطل و کالعدم ہو تو لڑکی بعد انتقال زید اس کے مال سے شرعاً ترکہ لے سکتی ہے۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبداللہ (مدرسہ احمدیہ آرہ)

الجواب صحیح۔ کتبہ: محمد حامد غفرلہ — المجیب مصیب۔ کتبہ: احمد علی

طابق الجواب بالکتاب کتبہ: محمد نعمان عفی عنہ — الجواب صحیح۔ محمد نجم الدین عفی عنہ

الجواب صحیح۔ کتبہ: محمد عبدالعزیز عفی عنہ — اصاب من اجاب واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح۔ کتبہ: عبدالوہاب عفی عنہ — محمد ضمیر الحق عفی عنہ

الجواب صحیح۔ عبدالنور، المظفر پوری — الجواب صحیح۔ یوسف، المرشد عفی عنہ

الجواب صحیح والمجیب نجیح، کتبہ: محمد ہاشم عفی عنہ — المجیب مصیب، واللہ تعالیٰ اعلم

من أجاب فقد أصاب. فضل رب بہاری — ابو صالح محمد عبدالوہاب عفی عنہ

سید محمد نذیر حسین

صحتِ ہبہ کے لیے تملیک کا لفظ ضروری نہیں ہے:

سوال مورثِ اعلیٰ کے چند بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹے نے مورثِ اعلیٰ کے سامنے انتقال کیا اور چھوڑا اپنے وارثوں کو۔ تب مورث اعلیٰ نے ساڑھے آٹھ مہینے پہلے بحالت صحت ذات و درستگی ہوش و حواس خوشی سے اپنے بڑے بیٹے منتظم سے روبروے سب وارثان اپنے کے یہ کہا کہ ہماری حیات میں سب وارثان کو ہمارے اور سب وارثان پسر متوفی کو ہماری کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ کو تقسیم کر کے مالک و قابض کر دو، تاکہ بعد مماتِ میرے باخود ہا میں تم لوگوں کے اور وارثان پسر متوفی مذکور کے نزاع نہ رہے، چنانچہ بڑے بیٹے منتظم نے بحکمِ مورثِ اعلیٰ بمشورہ جملہ برادران اپنے ایک تحریر کہ جس کی عبارت ذیل میں نقل ہے، تحریر کر کے ازروے قرعہ وثبت مہر مورثِ اعلیٰ کے تقسیم کیا اور سب موہوب لہم کو اپنے اپنے حصہ پر مالک کر کے قبضہ دے دیا اور ہر ایک موہوب لہم نے اس تقسیم کو بخوشی و رضا اپنی قبول کر کے العبد و دستخط اپنا اپنا اس تحریر پر کر دیا اور اس تاریخ سے اپنی اپنی جائداد موسومہ پر قابض ہو کر متصرف جائداد ہوئے اور اس وقت تک ہیں اور ہر موہوب

لہم سے واسطے مورثِ اعلیٰ کے بقدر خرچ ذاتی مورثِ اعلیٰ موافق آیت: ﴿وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ کے مقرر کرا لیا۔

چونکہ مورثِ اعلیٰ ایک عورت بے پڑھی ہوئی تھی اور منتظم بھی عالم و قانون دان نہ تھا، تحریر میں لفظ قابض و دخیل کا لکھا گیا، مالک کر دینے کا لفظ نہیں لکھا، لیکن مقصود اور بیان اور حکمِ مورثِ اعلیٰ اور مقصودِ منتظم اور موہوب لہم یہی تھا کہ سب کو مالک بنا دیا، چنانچہ اسی تاریخ سے سب موہوب لہم اپنے اپنے حصے پر مالک و قابض بطورِ ملکیت ہوئے اور کسی نے تاحیاتِ مورثِ اعلیٰ کچھ چوں و چرا نہیں کیا اور ہر ہر شخص اپنے اپنے حصے پر بطورِ ملکیت قابض رہ کر متصرف جائداد کا اپنی رہا، چنانچہ اس بات کے شاہد سب موہوب لہم اور جمیع اقران و برادران نسبتی و جوار و اطراف کے ہیں کہ مقصود اور بیان اور حکمِ مورثِ اعلیٰ اور مقصود اور بیان موہوب لہم یہی تھا کہ سب موہوب لہم مالک ہوں گے، لیکن بعد ممات مورثِ اعلیٰ کے منجملہ موہوب لہم کے ایک موہوب لہ کہتا ہے کہ یہ تحریر و تقسیم صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس تحریر میں لفظ مالک کر دینے کا نہیں لکھا ہے، پس موافق مقصود مورثِ اعلیٰ اور موہوب لہم کے عند اللہ یہ ہبہ و تقسیم صحیح ہوا یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہوا تو یہ بیان اور مقصود مورثِ اعلیٰ اور تحریر ہبہ نامہ و قرعہ کیا تصور کیا جائے گا بیٹوں کے حق میں اور وارثان بیٹے متوفی کے حق میں؟ فقط

نقل عبارت تحریری مورث اعلیٰ:

چونکہ تقسیم کرنا جملہ جائداد کا جملہ ورثائے شرعی پر مقصود ہے، لیکن حافظ محمد حسن مرحوم یکے از پسران و وارثان نے من مسماۃ بی بی شرفن مالک و قابضہ جملہ جائداد کے بگذاشت محمد موسیٰ و محمد عیسیٰ وغیرہ وارثان اپنے بقضائے الٰہی فوت کیا، چونکہ وارثان پسر مرحوم مذکور کے قانوناً ترکہ سے مجحوب ہوئے، من مسماۃ بی بی شرفن مذکورہ حاجب کرنا اُن لوگوں کا ضرور و بدل منظور ہے، مگر حال یہ ہے کہ کل دیہات کا کاغذ نا تیار ہے، اس واسطے بالفعل جایداد مفصلہ ذیل کو جس کا کاغذ درست و مرتب حسب سہام شرعی بنام مسماۃ طوفن دختر و مولوی محمد احسن پسر و محمد موسیٰ و محمد عیسیٰ و محمد یحییٰ و محمد اسحاق و محمد زکریا پسران و مسماۃ امین و مسماۃ انیسہ دختران وارثان حافظ محمد حسن مرحوم مذکور و مولوی محمد وحید و مولوی نور احمد و حافظ علی اکبر و حافظ علی اصغر و مولوی علی احمد پسران ۱۲۹۷ فصلی سے تقسیم کر کے قبضہ میں اُن لوگوں کے دیا و قابض و دخیل کر دیا، اب جملہ ورثائے مذکورین اپنے اپنے مواضعات پر حسبِ تقسیم نامہ ہذا قابض و دخیل ہو کر بعد ادائے مالگزاری کلکٹری و پبلک وغیرہ متعلقہ اخراجات دیہی و تعمیل احکام حاکم وقت کے کل محاصل پر متصرف ہو کر زرِ معینہ سالانہ ہمارا ارسال کیا کریں اور جملہ مواضعات مفصلہ ذیل ساڑھے سات سہم پر تقسیم کیا کہ جو از روئے نشست کے فی سہم ۷/۴ ہوا ہے اور نصف اس کا ۲/۳ ہوتا ہے۔ فقط

مطابق اس قرعہ کے ہر یک یکم اس ۱۲۹۷ فصلی سے قبضہ و دخل کریں اور اللہ ان لوگوں کو مبارک کرے۔ فقط

(مہر مورثِ اعلیٰ) العبد فلاں منظور ہے۔ العبد فلاں قبول و منظور ہے۔ العبد فلاں بسر و چشم منظور۔

جواب یہ ہبہ و تقسیم صحیح ہے۔ صحتِ ہبہ کے لیے لفظِ تملیک لکھنا شرط نہیں ہے، نفسِ تملیک کا پایا جانا کافی و بس ہے اور جب مسماۃ شرفن بی بی نے منتظم کو واسطے تکمیل کرا دینے ہبہ کے وکیل کر دیا یعنی ان سے کہہ دیا کہ ہماری

حیات میں سب وارثانِ پسر متوفی کو ہماری کل جائداد و منقولہ و غیر منقولہ کو تقسیم کر کے مالک و قابض کر دو، تا کہ بعد ممات ہماری یا خود ہا تم لوگوں کے اور وارثان پسر متوفی مذکور کے نزاع نہ رہے اور اس بڑے بیٹے منتظم یعنی وکیل مذکور نے بحیثیت وکالت اپنی حکم مذکور کی تعمیل کر دی، یعنی جائداد مذکورہ کو تقسیم کر کے ہر ایک موہوب لہ کو اس کے حصہ کا مالک و قابض کر دیا اور ہر ایک موہوب لہ نے اس کی کارروائی کو بخوشی و رضا اپنی قبول و منظور کر لیا اور اس تاریخ سے ہر ایک موہوب لہ اپنی اپنی جائداد موسومہ پر مالکانہ قابض ہو کر اس میں متصرف ہو گیا اور اب تک ہے تو اب تملیک کے پائے جانے میں کیا شک باقی رہا؟ پس یہ ہبہ و تقسیم صحیح ہے اور ایک موہوب لہ کا یہ عذر کہ اس تحریر میں لفظ مالک کر دینے کا نہیں لکھا ہے، صحیح نہیں ہے۔

"عن أنس رضی اللہ عنہ قال: أتانا رسول اللهﷺ في دارنا هذه فاستسقیٰ فحلبنا شاة لنا ثم شبته من ماء ببئرنا هذه فأعطيته، وأبو بكر عن يساره، و عمر تجاهه، و أعرابي عن يمينه، فلما فرغ قال عمر: هذا أبو بكر، فأعطى الأعرابي فضله ثم قال: «الأيمنون الأيمنون ألا فيمنوا» قال أنس: فهي سنة، فهي سنة"[1] والله أعلم بالصواب

[انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے اس گھر میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے پانی طلب کیا۔ ہم نے آپ ﷺ کے لیے اپنی ایک بکری کا دودھ دھویا، پھر میں نے اس میں اپنے اس کنویں کا پانی ملایا۔ پھر میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں وہ پیش کر دیا۔ (اس وقت) ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی بائیں جانب تھے، عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سامنے اور دائیں جانب ایک اعرابی تھا۔ پھر جب آپ ﷺ (پی کر) فارغ ہوئے تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں (گویا وہ آپ ﷺ کو انھیں دودھ دینے کا کہہ رہے تھے) آپ ﷺ نے اپنا بچا ہوا اس اعرابی کو دیا (جو آپ ﷺ کی دائیں طرف تھا) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: دائیں طرف والے (زیادہ حق دار ہیں) پھر ان کے بعد کے دائیں طرف والے۔ آگاہ رہو! پہلے دائیں طرف والوں کو دو۔" انس رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ سنت ہے، یہ سنت ہے]

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح، و المجيب نجيح. عبد الغني نور پوري عفا الله عنه. الجواب هكذا. وصيت على عفا الله عنه. المجيب مصيب عندي، والله أعلم بالصواب. أبو محمد إبراهيم- الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب. تاریخ ۵/ شعبان ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۶/ مارچ ۱۸۹۱ء۔

جواب دیگر صورت مسئولہ میں ہبہ و تقسم بلا شبہہ صحیح ہے، اس میں شک سراسر بے وجہ ہے۔ کسی خیال صحیح پر مبنی نہیں ہے۔ شک کی بنا صرف اس خیال پر ہے کہ جب تک لفظِ مالک کر دینے کا نہ لکھا جائے، ہبہ صحیح نہیں ہوتا اور اس تحریر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢٩)

میں لفظ مالک کر دینے کا نہیں لکھا ہے، حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہبہ کی صحت کسی لفظ کے لکھنے پر موقوف نہیں ہے اور کسی لفظ کا لکھنا صحتِ ہبہ کی شرط نہیں ہے۔ صرف زبان سے لفظِ ہبہ یا لفظِ تملیک یا ایسا لفظ جو اس معنی کو مفید ہو، کہہ دینا کافی ہے، خواہ واہب اس کو لکھ بھی دے یا نہ لکھے۔ ہدایہ میں ہے:

"وينعقد الهبة بقوله: وهبت، ونحلت، وأعطيت... الخ"[1]

[ہبہ اس کے یہ کہنے سے واقع ہوجاتا ہے: "وهبت" (میں نے ہبہ کر دیا)، "نحلت" (میں نے دے دیا) اور "أعطيت" (میں نے عطا کر دیا)]

درمختار و کنز الدقائق میں ہے: "وتصح بإيجاب كوهبت و نحلت... الخ"[2] [ہبہ ایجاب کے ساتھ صحیح ہے جیسے کہنا: "وهبت " میں نے ہبہ کر دیا اور "نحلت" میں نے عطا کر دیا] شرح وقایہ میں ہے: "وتصح بوهبته ونحلته وأعطيته.. الخ"[3] [ہبہ "وهبته" ، نحلته" اور "أعطيته" کے الفاظ کے ساتھ واقع ہوجاتا ہے] درمختار میں ہے:

"وشرائط صحتها في الواهب العقل والبلوغ والملك (إلى قوله) وشرائط صحتها في الموهوب بأن يكون مقبوضا غير مشاع مميزا غير مشغول، كما سيتضح، وركنها هو الإيجاب والقبول"[4]

[ہبہ کے صحیح ہونے کے لیے ہبہ کرنے والے میں ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے کہ عاقل ہو، بالغ ہو اور (موہوبہ چیز کا) مالک ہو... موہوب کے لیے ہبہ صحیح ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ وہ (موہوبہ چیز) مقبوض ہو، غیر مشترک ہو، ممیّز ہو، غیر مشغول ہو، جیسے کہ عنقریب اس کی وضاحت ہوگی اور اس (ہبہ) کے رکن ایجاب وقبول ہیں]

عبارات منقولہ بالا باعلیٰ صوت منادی ہیں کہ صحتِ ہبہ کے لیے صرف زبان سے لفظِ ہبہ کا یا ایسے لفظ کا کہہ دینا کافی ہے، جو مفید تملیک ہو، لکھنا کچھ شرط نہیں ہے۔ لکھے خواہ نہ لکھے، دونوں صورتوں میں ہبہ صحیح ہوجاتا ہے۔ اب فرض کرلو کہ صورت مسئولہ میں مساۃ بی بی شرفن واہبہ نے نہ اصالتاً نہ نیابتاً کچھ نہیں لکھا، لیکن جب مساۃ موصوفہ نے اپنے بڑے بیٹے کو اپنا نائب بنا کر ان سے کہہ دیا کہ ہماری حیات میں سب وارثان کو ہمارے اور سب وارثانِ پسر متوفی کو ہماری کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ کو تقسیم کر کے مالک و قابض کر دو اور اس بڑے بیٹے، یعنی نائب مذکور نے

---

① الهداية (٣/ ٢٢٤)

② شرح كنز الدقائق (٥/ ٩٢)

③ شرح الوقاية (٢/ ٢٦٤)

④ الدر المختار مع رد المحتار (٥/ ٦٨٨)

نیابتاً حکم مذکور کی تعمیل کر دی، یعنی جائداد مذکورہ بالا کو تقسیم کر کے ہر ایک موہوب لہ کو اس کے حصے کا مالک و قابض کر دیا اور ہر ایک موہوب لہ نے اس کی اس کارروائی کو بخوشی و رضا اپنی قبول و منظور کر لیا اور اس تاریخ سے ہر ایک موہوب لہ اپنی اپنی جائداد موہوبہ پر مالکانہ قابض ہو کر اس میں متصرف ہو گیا اور اب تک ہے تو اب تملیک کے پائے جانے میں کیا شک باقی رہا اور مسماۃ موصوفہ کا بڑے بیٹے سے یہ کہنا کہ کل جائداد کو ہماری تقسیم کر کے سب کو مالک و قابض کر دو، تاکہ بعد ممات ہماری تم لوگوں میں نزاع نہ رہے اور بڑے بیٹے کا حسب الحکم اپنی مادر موصوفہ کے بمشورہا جملہ برادران اپنے تحریر مذکور لکھنا، پھر از روے قرعہ کے باخودہا میں تقسیم کرنا اور اس تقسیم کو ہر ایک کا بخوشی و رضا اپنی قبول کر کے العبد و دستخط اپنا اپنا اس تحریر پر کر دینا اور اسی تاریخ سے اپنی اپنی جائداد موہوبہ پر قابض و متصرف ہو جانا اور تاحیات مسماۃ موصوفہ کسی کا اس میں کچھ چوں و چرا نہ کرنا صاف طور سے بتا رہا ہے کہ مقصود مسماۃ موصوفہ اور مقصود منتظم اور ان کے سائر برادران کا ان جملہ کارروائیوں سے تملیک و تملک تھا، نہ اور کچھ۔ پس موافق مقصود جملہ کسان مذکورہ بالا کے یہ ہبہ و تقسیم بالیقین صحیح ہے۔ گنجایش شک و شبہہ کی اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ واللّٰه أعلم بالصواب.

ہبہ بالعوض:

سوال (۱) ایک شخص نے مرض الموت میں اپنے وثیقہ ہبہ بالعوض اپنی بعض اولاد کے نام سے لکھا اور بعض اولاد کو بالکل محروم کیا۔ پس یہ ہبہ بالعوض بنام بعض اولاد کے صحیح ہوا یا نہیں؟

(۲) اگر کسی شخص نے حالتِ مرض الموت میں بعض اولاد کو اپنی یا کسی غیر کو ہبہ بالعوض کیا تو یہ ہبہ اس واہب کے کل مال میں جاری ہوگا یا واہب کے ثلث مال سے؟ واہب نے اپنے کل مال کو بعض ورثا کو اپنے ہبہ کر دیا اور بعض کو بالکل محروم کیا ہے۔

(۳) ہبہ بالعوض میں قرآن مجید کا ہبہ کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟

جواب ان تینوں سوالوں کا کتبِ فقہ حنفیہ سے بقید مطبع و صفحہ کتاب کے دیا جائے۔

جواب (۱) اگر یہ ہبہ باجازت باقی ورثہ کے ہوا ہے تو صحیح ہوا، ورنہ صحیح نہیں ہوا، اس لیے کہ ہبہ بالعوض ایک فرد ہبہ ہے، جو مرض الموت میں واقع ہوا ہے اور ہبہ جو مرض الموت میں واقع ہو حکماً وصیت ہے، بس ہبہ مذکورہ حکماً وصیت ہے اور وصیت وارث کے لیے بلا اجازتِ ورثہ صحیح نہیں ہے اور اولاد وارث ہے، پس ہبہ مذکور بغیر اجازت باقی اولاد کے (اور اگر واہب کا کوئی اور بھی وارث ہو تو بغیر اجازت اُس وارث کے بھی) صحیح نہیں ہے۔ فتاویٰ قاضی خاں (۴/ ۵۰۶ مطبوعہ کلکتہ) میں ہے: ”لا یجوز الوصیة للوارث عندنا إلا أن یجیزھا الورثة“

”لو وھب شیئاً لوارثه في مرضه أو أوصیٰ له بشيء و أمر بتنفیذه، قال الشیخ الإمام أبو بکر محمد بن الفضل رحمه الله: کلاھما باطلان، فإن أجاز بقیة الورثة ما فعل، وقالوا:

أجزنا ما أمر به الميت، ينصرف الإجازة إلى الوصية، لأنها مأمورة، لا إلى الهبة، ولو قال الورثة: أجزنا ما فعله الميت، صحت الإجازة في الهبة والوصية جميعا"
(أيضاً، ص: ٥١٣)

[ہمارے نزدیک وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ دوسرے وارث اس کی اجازت دیں۔ اگر وہ اپنے مرض میں وارث کو کوئی چیز ہبہ کرے یا اس کے حق میں کسی چیز کی وصیت کرے اور اس کے نفاذ کا حکم دے تو شیخ امام ابوبکر محمد بن الفضل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں (ہبہ و وصیت) باطل ہوں گی۔ پھر اگر باقی وارث اس کے اس فعل کی اجازت دے دیں اور کہیں کہ میت نے جو حکم دیا ہے، ہم نے اس کی اجازت دے دی تو یہ اجازت وصیت کی طرف لوٹے گی، کیوں کہ وہی مامور ہے، نہ کہ ہبہ کی طرف اور اگر وارث کہیں کہ میت نے جو کیا ہے ہم نے اس کی اجازت دے دی تو پھر یہ ہبہ اور وصیت دونوں میں اجازت صحیح ہوگی]

ایضاً فتاویٰ عالمگیری (٦/ ١٦٨مطبوعہ کلکتہ) میں ہے:

"إذا أقر مريض لامرأة بدين أو أوصىٰ لها بوصية أو وهب لها هبة، ثم تزوجها، ثم مات، جاز الإقرار عندنا، وبطلت الوصية والهبة"

[جب کوئی مریض کسی عورت کے لیے قرض کا اقرار کرے یا اس کے حق میں کوئی وصیت کرے یا اسے کوئی ہبہ دے، پھر وہ اس عورت سے شادی کرے اور پھر فوت ہوجائے تو ہمارے نزدیک اس کا (قرض کا) اقرار تو درست ہوگا، جب کہ ہبہ اور وصیت باطل ہوگی]

"الدر المختار" بر حاشیہ طحطاوی (٤/ ٢١٨مطبوعہ مصر) میں ہے:

"وتبطل هبة المريض ووصيته لمن نكحها بعدهما أي بعد الهبة والوصية، لما تقرر أنه يعتبر لجواز الوصية كون الموصىٰ له وارثا أو غير وارث وقت الموت، لا وقت الوصية... فلأنها إيجاب مضاف إلى ما بعد الموت، وهي وارثة حينئذ، والوصية للوارث باطلة بغير إجازة، وأما الهبة وإن كانت منجزة صورة فهي كالمضافة إلى ما بعد الموت حكما، لأنها وقعت موقع الوصايا، لأنها تبرع يتقرر حكمه عند الموت" والله تعالىٰ أعلم

[ایسے مریض کا ہبہ اور وصیت اس عورت کے حق میں باطل ہوں گے جس سے اس نے ہبہ اور وصیت کے بعد شادی کر لی ہو، کیوں کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ وصیت کے جواز کے لیے موصی لہ کا وارث ہونا یا وارث نہ ہونا موت کے وقت معتبر ہے نہ کہ وصیت کے وقت۔ کیوں کہ وہ ایک ایسی چیز کو واجب کرتا

ہے، جس کی نسبت موت کے بعد کی طرف ہے اور اس وقت وہ وارث ہوگی۔ وارث کے حق میں وصیت بغیر (دیگر وارثوں کی) اجازت کے، باطل ہے۔ رہا ہبہ تو اگرچہ بظاہر اس کی اجازت ہے، لیکن حکماً وہ اس چیز کی طرح ہے، جس کی نسبت موت کے بعد کی طرف ہے، کیوں کہ وہ وصیتوں کے قائم مقام ہے، اس لیے کہ وہ ایسا تبرع ہے، جس کا حکم موت کے وقت لاگو ہوتا ہے]

(۲) اگر واہب نے یہ ہبہ اپنی بعض اولاد کو یا کسی دیگر وارث کو کیا ہے تو ہبہ مذکور بغیر اجازت بقیہ ورثہ باطل و ناجائز ہے، نہ یہ واہب کے کل مال میں جاری ہوگا اور نہ ثلث مال میں، جیسا کہ جواب اول سے ظاہر ہوا اور اگر واہب نے یہ ہبہ کسی غیر وارث کو کیا ہے تو درصورت عدم اجازت ورثہ کے اس ہبہ کو یہ ہبہ واہب کے صرف ثلث مال میں جاری ہوگا، نہ کہ کل مال میں، اس لیے کہ ہبہ مذکور حکماً وصیت ہے، جیسا کہ جواب سوال اول میں مذکور ہوا اور وصیت بلا اجازتِ ورثہ صرف ثلث مال میں جاری ہوتی ہے، نہ کہ کل مال میں اور نہ زائد از ثلث مال میں۔ فتاویٰ عالمگیری (۶/ ۱۳۹ مطبوعہ کلکتہ) میں ہے:

"تصح الوصية لأجنبي من غير إجازة الورثة كذا في التبيين، ولا تجوز بما زاد علىٰ الثلث إلا أن يجيزه الورثة بعد موته وهم كبار... كذا في الهداية"[1]

[وارثوں کی اجازت کے بغیر اجنبی کے لیے وصیت کرنا صحیح ہے۔ تبیین میں ایسے ہی ہے۔ یہ وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی جائز نہیں ہے الا یہ کہ اس کے وارث اس کی موت کے بعد اجازت دیں، اس حال میں کہ وہ بڑے ہوں ...الخ ہدایہ میں ایسے ہی ہے]

"الدر المختار" برحاشیہ طحطاوی (۴/ ۳۱۵ مطبوعہ مصر) میں ہے:

"وتجوز بالثلث للأجنبي عند عدم المانع، وإن لم يجز الوارث ذلك لا الزيادة عليه إلا أن يجيز ورثته بعد موته" والله تعالىٰ أعلم

[مانع نہ ہونے کی صورت میں اجنبی کے لیے تہائی مال کی وصیت کرنا جائز ہے، اس سے زیادہ کی نہیں، اگرچہ وارث اس کی اجازت نہ دیں، ہاں اگر وارث اس کی موت کے بعد اس (تہائی سے زیادہ وصیت) کی اجازت دے دیں (تو جائز ہے)]

(۳) ہبہ بالعوض میں بالخصوص قرآن مجید کو عوض میں دینا تو کتبِ فقہ حنفیہ میں میری نظر سے نہیں گزرا ہے، لیکن کتبِ فقہ حنفیہ میں یہ امر مصرح ہے کہ ہبہ بالعوض میں عوض شے یسیر بھی کافی ہے اور شے یسیر میں قرآن مجید بھی داخل ہے۔ فتاویٰ قاضی خان (۴/ ۱۸۷ مطبوعہ کلکتہ) میں ہے: "يصح التعويض بشيء يسير أو كثير" [عوض میں تھوڑی یا زیادہ شے درست ہے] فتاویٰ عالمگیری (۴/ ۵۵۱ مطبوعہ کلکتہ) میں ہے:

---

[1] الهداية (٤/ ٢٣٢)

"ولو عوض عن جميع الهبة قليلًا كان العوض أو كثيراً، فإنه يمنع الرجوع"
واللہ تعالیٰ أعلم

[اگر وہ تمام ہبہ کے عوض دے دے، وہ عوض تھوڑا ہو یا زیادہ تو وہ رجوع کو روک دیتا ہے]

کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۱/ شعبان ۱۳۲۷ھ)

سوال چہ مے فرمایند علماے دین و مفتیانِ شرع متین اندریں مسئلہ شخصی معین الحق نامی کہ ابن الابن مسمی خوشحال منڈل است مدتے شد پدرش کہ بیان الدین منڈل بود رو بروے جد شاں خوشحال منڈل بوقتِ طفولیت معین الحق فوت کردہ پس جد شاں خوشحال منڈل معین الحق را پرورش کردہ و تعلیم و تعلم ہم نمودہ ہر گاہ کہ بسن بلوغ رسیدہ ہمہ اشیاء منقولہ و غیر منقولہ میان ایشاں و عم ایشاں عبد الغفور منڈل کہ پسر دیگر خوشحال منڈل است مساوات و نصف نصف تقسیم نمودہ و قابض گردانیدہ تخمینا تامدت شانزدہ سال بحیات ماندہ و اکثر اوقات خورد و نوش و نشست و برخاست با ینجانب و استدعاے خدمت ہم از ینجانب نمودہ حتی کہ قبل وفات خوشحال منڈل بسلامتی ہوش خود اکابر و اصاغر موضع خود را طلبیدہ حاضران مجلس را گفتہ کہ شمایاں خوب میدانید کہ من معین الحق را کہ ابن الابن من است نصف و پسر دیگرم عبد الغفور را نصف و مساوات اشیاء منقولہ و غیر منقولہ خود تقسیم کردہ دادہ ام و ہم بنا بر آئندہ اینک گواہ باشند کہ معین الحق را باعث حضوری خدمت من و شریک در یسر و عسر و دبون من نصف ہمہ اشیاء منقولہ و غیر منقولہ خود دادم و نصف بعبد الغفور دادم پس در چنیں صورت ایں ہبہ ہبۂ بلا عوض ست یا بالعوض و اگر شق ثانی باشد معین الحق مذکور مستحق نصف میتواند شد یا نہ و اگر وصیت است مستحق چہ قدر خواہد شد و مخفی نماند کہ ہر دو حسب تقسیم پدر و جد خود در ہمہ اشیاء متصرف و قابض است.

[کیا فرماتے ہیں علماے دین اور مفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ معین الحق نامی ایک شخص خوشحال منڈل نامی شخص کا پوتا ہے۔ مدت ہوئی ہے کہ معین الحق کا والد بیان الحق منڈل اس کی صغر سنی میں اس کے دادے خوشحال منڈل کے سامنے فوت ہوگیا۔ پس معین الحق کے دادے خوشحال منڈل نے اس کی پرورش کی اور اس کے تعلیم و تعلم کا بندوبست کیا، حتی کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ گیا۔ خوشحال منڈل نے منقولہ اور غیر منقولہ تمام اشیا معین الدین اور معین الحق کے چچا اپنے دوسرے بیٹے عبد الغفور منڈل کے درمیان برابر برابر نصف نصف تقسیم کر کے ان کو ان اشیا کا مالک بنا دیا۔ وہ اس واقعے کے تقریباً سولہ سال بعد تک زندہ رہا۔ اس دوران میں خورونوش اور نشست برخاست کے اکثر اوقات میں معین الدین ہی اپنے دادے کی خدمت بجا لاتا رہا، حتی کہ خوشحال منڈل نے اپنی موت سے قبل اپنے ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ اپنے علاقے کے تمام چھوٹے بڑوں کو جمع کیا اور حاضرینِ مجلس سے کہا: تم لوگ خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے اپنے پوتے معین الحق اور اپنے دوسرے بیٹے عبد الغفور کو اپنی منقولہ اور غیر منقولہ تمام اشیا نصف نصف برابر تقسیم کر کے دے دی ہیں، لہٰذا تم اس پر آیندہ کے لیے

گواہ رہنا کہ میں نے معین الحق کو اپنی خدمت کے باعث اور میری تنگی و آسانی کا ساتھی ہونے کے عوض اپنی منقولہ اور غیر منقولہ اشیا میں سے نصف اس کو دے دی ہیں اور باقی نصف عبد الغفور کو۔ پس اس صورت میں یہ ہبہ، ہبہ بلاعوض ہوگا یا ہبہ بالعوض۔ اگر یہ ہبہ بالعوض ہے تو کیا معین الحق مذکور نصف کا مستحق بن سکتا ہے یا نہیں؟ اگر یہ وصیت ہے تو وہ کتنے حصے کا مستحق ہوگا؟ یہ بھی مخفی نہ رہے کہ دونوں فریق اپنے باپ اور دادے کی تمام اشیا میں متصرف و قابض ہیں]

جواب ایں ہبہ خواہ بلاعوض باشد یا بالعوض در ہر دوصورت ہبہ لازم است وحق رجوع ازاں ساقط و معین الحق مستحق آں نصف است کہ جدش خوشحال منڈل باو بخشیدہ و قابض برآں گردانیدہ رفتہ است و ایں ہمہ کہ گفتہ شد ہم موافق حدیث و ہم موافق فقہ حنفیہ است، موافقت حدیث پس ازاں جہت کہ رجوع از ہبہ جائز نیست مگر والد کہ از ہبہ کہ بولد خود کردہ است رجوع کند پس خوشحال منڈل را در حیات خود جائز بود کہ ازاں ہبہ کہ بمعین الحق کردہ بود رجوع میکرد و چون او در حیات خود رجوع نکرد پس دیگر را حق رجوع باقی نماند در مشکوۃ شریف مطبوعہ مجتبائی دہلی (ص:۲۰۶) است۔

[یہ ہبہ بلاعوض ہو یا بالعوض دونوں صورتوں میں ہبہ لازم ہے اور اس سے رجوع کا حق ساقط ہو چکا ہے۔ لہٰذا معین الحق اس نصف کا مستحق ہے جو اس کے دادے خوشحال منڈل نے اس کو عطا کیا ہے اور اس پر اسے قابض بنا کر دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، یہ حدیث کے موافق ہے اور فقہ حنفی کے بھی موافق ہے، جہاں تک حدیث کی موافقت کا تعلق ہے تو وہ اس لحاظ سے کہ ہبہ میں رجوع کرنا صرف باپ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو دیے ہوئے ہبے میں رجوع کر لے۔ چناں چہ خوشحال منڈل کو اپنی زندگی میں اس ہبے سے رجوع کرنے کی اجازت تھی کہ وہ معین الحق کو دیے ہوئے ہبے کو واپس لے لیتا۔ پس جب اس نے اپنی زندگی میں اس سے رجوع نہ کیا تو کسی اور کو یہ ہبہ واپس کرنے کا حق نہیں رہا مشکوۃ شریف (ص:۲۰۶ مطبوعہ مجتبائی دہلی) پر ہے]

عن عبداللہ بن عمرو قال: قال رسول اللهﷺ: «لا يرجع أحد في هبته إلا الوالد من ولده»[1] (رواه النسائي و ابن ماجه)

[عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے ہبے سے رجوع نہ کرے، مگر والد اپنی اولاد سے (واپس لے سکتا ہے)]

و عن ابن عمر و ابن عباس أن النبيﷺ قال: «لا يحل للرجل أن يعطي عطية ثم يرجع فيها إلا الوالد فيما يعطي ولده، و مثل الذي يعطي العطية ثم يرجع فيها كمثل الكلب، أكل

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٧٨)

حتی إذا شبع قاء، ثم عاد في قيئه» (رواه أبو داود والترمذي و النسائي و ابن ماجه، و صححه الترمذي) [1]

[عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ بلاشبہہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے لیے جائز نہیں ہے کہ (کسی کو) کوئی چیز دے کر واپس لے لے، سوائے والد کے، جو کچھ وہ اپنی اولاد کو دیتا ہے (اسے واپس لے سکتا ہے) اور جو شخص تحفہ دے کر واپس لیتا ہے، وہ کتے کی طرح ہے جو کھاتا ہے حتی کہ جب ضرورت سے زیادہ سیر ہو جاتا ہے تو قے کرتا ہے، پھر اپنی قے کو چاٹنے لگتا ہے]

واما موافقت فقہ حنفیہ پس بدو جہت یکی آنکہ ایں ہبہ بذی رحم محرم خوشحال منڈل است و ہبہ بذی رحم محرم بر وفق فقہ حنفیہ لازم میگردد وحق رجوع ازاں ساقط میشود۔ دوم آنکہ واہب یعنی خوشحال منڈل بعد ہبہ بمرد و چوں واہب بعد ہبہ بمیرد ہبہ او لازم میگردد وحق رجوع ازاں سقوط می پذیرد.

[رہی فقہ حنفی کے ساتھ اس کی موافقت تو وہ دو طرح ہے: ایک تو ایسے کہ یہ ذی رحم رشتے دار خوشحال منڈل کا ہبہ ہے اور ذی رحم رشتے کا ہبہ فقہ حنفی کے مطابق لازم ہو جاتا ہے، اس سے رجوع کرنے کا حق ساقط ہو جاتا ہے اور دوسرا اس لحاظ سے کہ ہبہ کرنے والا خوشحال منڈل ہبہ کرنے کے بعد فوت ہو گیا اور جب ہبہ کرنے والا ہبہ کرنے کے بعد فوت ہوا تو اس کا ہبہ لازم ہو جاتا ہے اور اس سے رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے]

در ہدایہ مع الکفایہ (۳/۴/۱۷ مطبوعہ دہلی) میگوید:

"و إن وهب هبة لذي رحم محرم منه لم يرجع فيها لقوله ﷺ إذا كانت الهبة لذي رحم محرم منه لم يرجع فيها، ولأن المقصود صلة الرحم وقد حصل" اھ

[ہدایہ میں ہے: اگر وہ (واہب) کسی محرم رشتے دار کے لیے ہبہ کرے تو وہ اسے واپس نہیں لے سکتا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب ہبہ محرم رشتے دار کے لیے ہو تو وہ اس میں رجوع نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس ہبہ کا مقصود صلہ رحمی ہے تو وہ اس ہبے کے ساتھ حاصل ہو چکا ہے]

و نیز درآں میگوید:

"وإذا وهب هبة لأجنبي فله الرجوع فيها (إلى قوله) إلا أن يعوّضه عنها... إلى قوله: ...... يموت أحد المتعاقدين لأن بموت الموهوب له ينتقل الملك إلى الورثة فصار كما إذا انتقل في حال حياته وإذا مات الواهب فوارثه أجنبي عن العقد إذ هو ما أوجبه" انتهى

[نیز ہدایہ کے مولف کہتے ہیں: جب وہ کسی اجنبی (غیر محرم رشتے دار) کو ہبہ کرے تو اسے واپس لینا جائز ہے... الا یہ کہ وہ اس کا عوض دے... متعاقدین (واہب و موہوب لہ) میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے،

[1] سنن أبي داود (۳۵۳۹) سنن الترمذي (۲۱۳۲) سنن النسائي (۳۶۹۰) سنن ابن ماجه (۲۳۷۷)

کیوں کہ موہوب لہ کی موت کے ساتھ ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، تو وہ ایسے ہی ہو جاتا ہے جیسے اس (موہوب لہ) کی حیات میں یہ انتقالِ ملکیت ہوا ہے اور اگر واہب مر گیا تو اس کے وارث کو عقد ہبہ سے کچھ تعلق نہیں ہے، کیوں کہ اس نے عقد ہبہ نہیں کیا تھا]

و ایں ہبہ ہبہ حقیقتاً است نہ در حکم وصیت کہ نفاذش در ثلث ترکہ (بعد تقدیم ما تقدم علی الوصیۃ) میشود زیرا کہ ہبہ در حکم وصیت در آنوقت میشود کہ واہب در مرض الموت خود ہبہ کردہ باشد نہ آنچنیں ہبہ کہ واہب بعد ہبہ تا مدت شانزدہ سال زندہ ماندہ وفات یافتہ باشد.

[نیز یہ ہبہ حقیقی ہے نہ کہ وصیت کے حکم میں جس کو (بعد تقدیم ما تقدم علی الوصیۃ) ترکے کے تہائی میں نافذ کیا جائے، کیوں کہ ہبہ اس وقت وصیت کے حکم میں ہوتا ہے، جب ہبہ کرنے والے نے اپنی مرض الموت میں ہبہ کیا ہو نہ کہ سوال میں مذکور ہبہ میں، اس لیے کہ اس صورت میں تو واہب ہبے کے بعد سولہ سال تک زندہ رہا اور پھر اس نے وفات پائی]

در مشکوۃ شریف (ص: ۲۳۴) است:

"عن عمران بن حصين أن رجلا أعتق ستة مملوكين له عند موته، لم يكن له مال غيرهم، فدعا بهم رسول اللهﷺ فجزأهم أثلاثا ثم أقرع بينهم فأعتق اثنين وأرق أربعة، وقال له قولا شديداً"[1] (رواه مسلم)

[عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی موت کے قریب اپنے چھے غلام آزاد کر دیے اور اس کے پاس ان کے علاوہ اور کوئی مال نہیں تھا۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کو بلایا اور انھیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا، پھر ان کے مابین قرعہ اندازی کی تو دو کو آزاد کر دیا اور چار کو غلام رکھا اور آپ ﷺ نے اس کے متعلق سخت الفاظ فرمائے]

و در ہدایہ مع الکفایہ (۴/ ۱۳۸) مرقوم است:

"والمقعد والمفلوج والأشل والمسلول إذا تطاول ذلك فلم يخف منه الموت فهبته من جميع المال، لأنه إذا تقادم العهد صار طبعا من طباعه ولهذا لا يشتغل بالتداوي، ولو صار صاحب فراش بعد ذلك فهو كمرض حادث، وإن وهب عند ما أصابه ذلك، ومات من أيامه فهو من الثلث، إذا صار صاحب فراش لأنه يخاف منه الموت، ولهذا يتداوى فيكون مرض الموت" والله أعلم

[نیز ہدایہ میں ہے: مقعد (جو اُٹھ نہیں سکتا) مفلوج (جو فالج زدہ ہو)، اشل (جو شل ہو گیا ہو) اور مسلول (جو سل کے مریض میں مبتلا ہو) کو جب ان امراض میں ایک لمبی مدت ہو چکی ہو اور فی الحال اس کے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٦٨)

مرجانے کا خوف نہ ہو تو اس کا ہبہ پورے مال سے معتبر ہے، کیوں کہ جب زمانہ دراز ہوا تو یہ مرض من جملہ اس کی طبائع کے ایک طبیعت بن گیا، اسی وجہ سے وہ اس کے دوا و علاج میں مشغول نہیں ہوتا ہے اور اگر وہ اس ہبے کے بعد صاحبِ فراش بن گیا تو وہ مرض حادث کے مانند سمجھا جائے گا اور اگر اس نے اس مرض (گٹھیا اور فالج وغیرہ) کے لاحق ہونے کے وقت ہبہ کیا اور انھیں ایام میں مر گیا (یعنی مرض میں زمانہ دراز نہیں ہوا) تو تہائی سے اس کا اعتبار ہوگا، بشرطیکہ وہ صاحبِ فراش بن چکا ہو، کیوں کہ یہ ایسا مرض ہوا جس سے موت کا خوف ہے، اسی وجہ سے وہ دوا کرنے میں مشغول ہوتا ہے تو یہ مرض الموت کے افراد میں سے ہے] کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ احمدیہ)

والد کا مشترکہ کمائی سے بنی ہوئی جگہ کو ہبہ کرنا:

سوال زید کے والد کو موروثی مکان صرف ایک قطعہ ملا تھا۔ زید قریب پچیس سال سے اپنے والد کے ساتھ تجارت کیا کرتا ہے، بلکہ تجارت کا اکثر کام خرید و فروخت، مہاجن کا لین دین اپنے ذمہ لے لیا، والد برائے نام دکان پر بیٹھتے ہیں، اسی آمدنی سے دوسرا قطعہ مکان و دیگر جائداد خریدی گئی۔ زید کے والد نے اپنی بہو (دوسرے لڑکے مرحوم کی بیوی) کو دونوں قطعے ہبہ کر دیے۔ سوال یہ ہے کہ زید کے والد اپنے موروثی مکان، جو ان کے باپ کی میراث سے ملا ہے، اس کے علاوہ دوسرا مکان جو زید کی مشترک کمائی سے حاصل کیا گیا ہے، ہبہ کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر ہبہ کر دیا تو جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب زید جو قریب پچیس سال سے اپنے والد کے ساتھ تجارت کرتا ہے۔ اگر اس تجارت میں زید اور اس کے والد دونوں کے روپے لگے ہیں، یعنی زید کے والد اور زید دونوں اس تجارت میں روپیہ سے شریک ہیں تو اس صورت میں دوسرے مکان کو زید کے والد کسی شخص کو بلا اجازتِ زید ہبہ نہیں کر سکتے ہیں اور اگر ہبہ کر دیا تو ہبہ ناجائز ہوا۔ اگر اس تجارت میں صرف زید ہی کے روپے لگے تو اس صورت میں بھی یہی حکم ہے، جو پہلی صورت میں مذکور ہوا اور اگر اس تجارت میں صرف والدِ زید کے روپے لگے ہیں تو اگر زید کے والد نے زید کو اس تجارت کے نفع میں شریک نہیں کیا ہے، بلکہ زید اپنے والد کے ساتھ بطریق تبرع اس تجارت کا کام کرتا ہے تو اس صورت میں زید کے والد دوسرے مکان کو ہبہ کر سکتے ہیں اور اگر ہبہ کر دیا تو جائز ہوا، کیونکہ اس صورت میں اصل روپیہ اور اس کا نفع زید کے والد کا ہے، پس زید کے والد کو اختیار ہے، جس کو چاہیں دے دیں۔ واللہ أعلم. کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۲/ شوال ۱۳۳٤ھ)

اولاد کو ہبہ کرنے میں برابری کرنا ضروری ہے:

سوال زید کی چند اولاد ہیں اور سب کو اس نے زیورات و جہیز وغیرہ دے کر شادی کر دی۔ ایک لڑکی باقی ہے اور اب زید کی ملک میں بجز ایک مکان کے جو تخمیناً قیمت میں اول اولاد کے زیورات اور جہیز کے برابر بھی نہ ہوگا، کچھ نہیں ہے، اس صورت میں زید اگر اس مکان کو اس لڑکی کو ہبہ کرنا چاہے، جواب تک ناکدخدا [کنواری] ہے تو اور اولاد کو روکنے کا حق ہے یا نہیں؟

جواب ایسی صورت میں کہ وہ مکان اس سے کم قیمت ہے، جو زیور کسی اولاد کو دے چکا ہے تو یہ چاہیے کہ وہ مکان اسی ناکتخدا لڑکی کو دے۔ اس لیے کہ از روے شرع شریف کے اولاد کو دینے میں تسویہ [برابری] کا لحاظ رکھنا چاہیے، تو اگر یہ مکان اس کے برابر ہوتا جو کچھ اور اولاد کو دے چکا ہے، تب بھی زید کو اس ناکتخدا لڑکی کو یہ مکان دینا تھا اور درحالیکہ کم ہے تو بدرجہ اولیٰ دے سکتا ہے، علاوہ اور کچھ بھی اگر اس کے پاس ہو اور دے تاکہ برابر ہو جائے تو بہتر ہے، اس سے روکنے والا ''مناع للخیر'' ہے۔

عن النعمان بن بشير أن أباه أتىٰ به إلى رسول اللهﷺ فقال: إني نحلت ابني هذا غلاما فقال: «أكل ولدك نحلت مثله؟» قال: لا، قال: «فارجعه» [1] (رواه البخاري في صحيحه)

[نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان کا باپ انھیں اپنے ہمراہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام ہبہ کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے اپنی ساری اولاد کو (برابر) اس طرح کا ہبہ دیا ہے؟'' انھوں نے عرض کی: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے واپس لے لو]

"وعن عامر قال: سمعت النعمان بن بشير، وهو على المنبر يقول: أعطاني أبي عطية فقالت عمرة بنت رواحة: لا أرضىٰ حتى تشهد رسول اللهﷺ فأتىٰ رسول اللهﷺ فقال: إني أعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية فأمرتني أن أشهدك يا رسول الله! قال: «أعطيت سائر ولدك مثل هذا؟» قال: لا، قال: «فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم» قال: فرجع فرد عطيته" [2] (رواه البخاري في صحيحه)

[عامر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کو منبر پر کھڑے ہو کر یہ کہتے ہوئے سنا: میرے باپ نے مجھے ایک عطیہ دیا تو عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا (میری والدہ) نے کہا: میں راضی نہیں، حتی کہ تم رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنا لو۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: میں نے عمرہ بنت رواحہ سے اپنے بیٹے کو ایک عطیہ دیا ہے اور اے اللہ کے رسول ﷺ! اس نے کہا ہے کہ میں آپ کو گواہ بناؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے اپنی باقی اولاد کو بھی اسی طرح کا عطیہ دیا ہے؟'' انھوں نے عرض کی: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو۔'' راوی بیان کرتے ہیں: وہ واپس آئے اور اپنا عطیہ واپس لے لیا]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٤٧)

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما رفعه: «سووا بين أولادكم في العطية، فلو كنت مفضلا أحدا لفضلت النساء» [1] (أخرجه سعيد بن منصور والبيهقي من طريقه، وإسناده حسن، فتح الباري: ١٠/ ٥٣٦ مطبوعه أنصاري)

[سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے: عطیہ دینے میں اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو، اگر میں کسی کو فضیلت و ترجیح دینے والا ہوتا تو عورتوں کو ترجیح دیتا]

كتبه: أضعف عباد الرحمن: أبو عبد المنان محمد سليمان بوأه بحبوحة الجنان.

الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله۔ جواب صحیح ہے۔ محمد عين الحق، عفي عنه. المجيب مصيب عندي، والله أعلم بالصواب. أبو محمد إبراهيم غفر له ولوالديه.

ہبہ اور اِبراء:

سوال ① ہبہ اور ابراء میں کچھ فرق ہے یا دونوں ایک چیز ہے؟

② معافی دین از قسم ہبہ ہے یا مجرد ابراء و اسقاطِ حق ہے؟

③ درصورت فرق ہونے درمیان ہبہ اور ابراء کے، اگر ہبہ دین کا لفظ میت کی نسبت استعمال کیا جائے، یعنی یوں کہا جائے کہ میں نے یا فلاں شخص نے اپنا دین میت کو ہبہ کر دیا تو اس صورت میں ہبہ کے حقیقی معنی مراد ہوں گے یا اس ہبہ سے ابراء و اسقاطِ حق مراد ہوگا؟

ان سوالوں کا جواب مطابق فقہ حنفی کے ارقام فرمایا جائے۔

جواب ① و ② ہبہ اور ابراء میں اصلی معنی کے اعتبار سے فرق ہے۔ ہبہ کے اصلی معنی ہیں تملیک اور ابراء کے اصلی معنی ہیں اسقاطِ حق۔ اسی وجہ سے دونوں کے بعض بعض شرائط اور احکام بھی مختلف ہیں:

① ہبہ میں قبول شرط ہے، ابراء میں نہیں۔

② ہبہ میں حق رجوع حاصل ہے، بشرطیکہ کوئی مانع، موانعِ رجوع میں سے موجود نہ ہو اور ابراء میں حقِ رجوع اصلاً حاصل نہیں۔ حموی شرح اشباہ و نظائر (ص: ۲۶۹ چھاپہ مصطفائی دہلی) میں ہے: "الإبراء إسقاط، والهبة تمليك" اھ [ابراء اسقاطِ (حق) ہے اور ہبہ تملیک] "اشباہ و نظائر" صفحہ مذکور میں ہے:

"ما افترق فيه الهبة والإبراء. يشترط لها القبول بخلافه، وله الرجوع فيها عند عدم المانع بخلافه مطلقا" اھ

[ہبہ اور ابراء میں فرق یہ ہے کہ ہبہ میں قبول شرط ہے، برخلاف ابراء کے، ہبہ میں کوئی مانع نہ ہونے کی صورت میں حقِ رجوع حاصل ہے، جب کہ ابراء میں اصلاً یہ حق حاصل نہیں ہے]

لیکن کبھی کبھی ابراء پر بھی لفظِ ہبہ کا اطلاق مجازاً کیا جاتا ہے، چنانچہ دین کے معاف کر دینے کو کہ یہ ابراء و اسقاطِ حق

[1] المعجم الكبير للطبراني (١١/ ٣٥٤) سنن البيهقي (٦/ ١٧٧) اس کی سند میں "سعيد بن يوسف الرحبي" ضعیف ہے۔

ہے، ہبہ دین کہا جاتا ہے اور دونوں سے ایک ہی مطلب سمجھا جاتا ہے۔ دیکھیے معافی دین مہر کے مقدمہ میں اگر ایک گواہ ابراءِ دین کا لفظ کہے اور دوسرا گواہ ہبہ دین کا لفظ تو دونوں کے بیان گو لفظاً مختلف ہیں، مگر معناً مختلف نہیں، مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ ابراءِ دین کا مطلب دین کا مدیون کے ذمہ سے ساقط کر دینا ہے اور ہبہ دین کا مطلب بھی یہی ہے۔ اشباہ و نظائر میں ہے: "هبة الدين كالإبراء منه ... الخ" [ہبہ دین اس سے ابراء کی مانند ہے...الخ] حموی صفحہ مذکورہ میں "جامع الفصولین" سے منقول ہے:

"ادعى الزوج إنها وهبتني المهر وبرهن فشهد أحدهما أنها أبرأته، والآخر أنها وهبته تقبل للموافقة لأن حكم هبة الدين سقوطه، وكذا حكم البراءة" اهـ والله أعلم

[خاوند نے یہ دعویٰ کیا کہ اس (میری بیوی) نے اپنا مہر مجھے ہبہ کر دیا ہے اور اس دعوے کی دلیل بھی پیش کر دی، ایک گواہ نے یہ گواہی دی کہ اس کی بیوی نے اس سے ابراء کر دیا تھا اور دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے اس کو ہبہ کر دیا تھا، تو موافقت کی وجہ سے اس گواہی کو قبول کیا جائے گا، کیوں کہ قرض کا ہبہ اس کا ساقط کرنا ہے اور ابراء کا بھی یہی حکم ہوگا]

③ اس صورت میں ہبہ کے حقیقی معنی (تملیک) مراد نہ ہوں گے اور نہ مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ میت میں کسی چیز کے مالک بننے کی صلاحیت ہی نہیں، بلکہ جن چیزوں کا وہ بحالتِ حیات مالک تھا، اب بعد ممات ان چیزوں کا بھی مالک نہیں رہا، بلکہ وہ چیزیں اس کے مِلک سے نکل کر دوسروں کے ملک میں چلی گئیں۔ ہاں اس صورت میں ہبہ سے مجازاً ابراء و اسقاطِ حق مراد ہوگا، کیونکہ میت میں اس بات کی صلاحیت ضرور ہے کہ اگر اُس پر کسی شخص کا کوئی حق آتا ہو اور وہ شخص اس حق کو میت کے ذمہ سے ساقط کر دے تو وہ حق میت کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ فتاویٰ عالمگیری (۱/ ۴۴۶ مطبوعہ ہوگلی) "فصل عاشر في هبة المهر" میں ہے:

"امرأة الميت إذا وهبت المهر من الميت جاز كذا في السراجية" والله أعلم بالصواب

[میت کی بیوی اگر مہر ہبہ کر دے تو یہ جائز ہوگا، سراجیہ میں ایسے ہی بیان ہوا ہے]

کتبہ: محمد عبد اللہ (مدرسہ احمدیہ آرہ)

ہندو مہاجن کا عطیہ مسلمان یتیموں پر خرچ کرنا:

سوال غازی پور کے مسلمانوں نے ایک یتیم خانہ کھولا ہے، جس میں سات یتیم پرورش پاتے ہیں۔ بابو موتی چند رئیس و مہاجن بنارس نے ایک رقم عطیہ کی یتیم خانہ میں بھیجی۔ ایک صاحب نے اس کے لینے میں اس بنا پر اعتراض کیا کہ وہ مہاجنی میں سود لیتے ہیں، ان کا مال حرام ہے، یتیم خانہ میں اس کو قبول کرنا نہیں چاہیے۔ لوگوں کی عموماً یہ رائے ہے کہ اُس مال کا قبول کر لینا جائز ہے، اس بارے میں صحیح رائے کیا ہے؟ از غازیپور۔

جواب اس بارے میں صحیح رائے یہی ہے کہ اُس مال کا قبول کر لینا جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ

کے عہدِ سعادت مہد میں یہود و نصاریٰ و مشرکین سب تھے اور سب سے داد و ستد کے معاملات جاری تھے۔ اُن کے ہدایا قبول کیے جاتے تھے، ان کے پاس ہدایا بھیجے جاتے تھے اور جزیہ وخراج اُن سے وصول کیا جاتا تھا، اُن کے ساتھ بیع وشراء جاری تھا، حالانکہ سود بھی وہ کھاتے تھے، رشوت بھی لیتے تھے اور جس طرح ہمارے زمانے کے بہتیرے علما و مشائخ اپنے معتقدین و مریدین کے اموال کو ناجائز طور سے کھاتے اور ان کو گمراہ بھی کرتے ہیں، اسی طرح اُن کے بہتیرے علما و مشائخ بھی ناجائز طور سے اپنے معتقدین و مریدین کے اموال کھاتے اور ان کو گمراہ کرتے تھے۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [سورۂ توبۃ، رکوع: ۵]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں]

وقال تعالیٰ: ﴿وَ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع: ۲۲]

[اور ان کے سود لینے کی وجہ سے، حالاں کہ یقیناً انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور ان کے لوگوں کے اموال باطل طریقے کے ساتھ کھانے کی وجہ سے]

وقال تعالیٰ: ﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ [سورۂ مائدۃ، رکوع: ٦]

[بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو، بہت کھانے والے حرام کو]

وقال تعالیٰ: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ [سورۂ بقرۃ، رکوع: ۹]

[پس ان لوگوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی قیمت حاصل کریں]

وقال تعالیٰ: ﴿يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾ [سورۂ اعراف، رکوع: ۲۱]

[وہ اس حقیر دنیا کا سامان لیتے ہیں اور کہتے ہیں، ہمیں ضرور بخش دیا جائے گا اور اگر ان کے پاس اس جیسا اور سامان آجائے تو اسے بھی لے لیں گے، کیا ان پر کتاب کا عہد نہیں لیا گیا کہ اللہ پر حق کے سوا کچھ نہ کہیں گے]

﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ [سورۂ بقرہ، رکوع: ۳۸]

[وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، کھڑے نہیں ہوں گے، مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا بیع تو سود ہی کی طرح ہے]

"عن عائشة رضي الله عنها قالت: اشترى رسول الله ﷺ طعاما من يهودي إلى أجل ورهنه درعا من حديد" [1] (متفق عليه، مشكوة، ص: ٢٤٢)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے ایک مدت کے لیے غلہ لیا اور آپ ﷺ نے اپنی لوہے کی زرہ اس کے پاس گروی رکھی]

"وعن عبدالله ابن عمر رضي الله عنهما قال: جاءت حلل فأعطى رسول الله ﷺ عمر منها حلة ... فكسا عمر أخا له بمكة مشركا" [2]

[سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ (رسول اللہ ﷺ کے پاس) کچھ پوشاکیں آئیں تو آپ ﷺ نے ان میں سے ایک پوشاک عمر رضی اللہ عنہ کو عطا کر دی...عمر رضی اللہ عنہ نے مکے میں اپنے ایک شریک بھائی کو وہ پوشاک عطیہ کر دی]

وقال أبو هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ: «هاجر إبراهيم بسارة فدخل قرية فيها ملك أو جبار فقال: أعطوها آجر، وقال أبو حميد: أهدى ملك أيلة للنبي ﷺ بغلة بيضاء» [3]

[سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی مکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے (اپنی بیوی) سارہ کے ساتھ ہجرت کی تو وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں پر ایک بادشاہ یا جبار تھا۔ اس نے کہا: اس (سارہ) کو ایک آجر (خدمت گزار ہاجرہ) دے دو۔ ابوحمید نے کہا کہ ایلہ کے بادشاہ نے نبی کریم ﷺ کو ایک سفید خچر کا عطیہ دیا]

"وعن أنس رضي الله عنه أن أكيدر دومة أهدى إلى النبي ﷺ" [4]

[انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اکیدر دومہ نے نبی مکرم ﷺ کی خدمت میں ایک ہدیہ ارسال کیا]

وعن أنس أيضاً أن يهودية أتت النبي ﷺ بشاة مسمومة فأكل منها" [5]

[انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ایک یہودیہ نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک زہر آلود بکری (کا گوشت) پیش کیا تو آپ ﷺ نے اس سے (گوشت) کھایا]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٨)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٩٢٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٦٩)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٩٠)

''وعن عبد الرحمن بن أبي بكر رضی اللہ عنہ قال: كنا مع النبي ﷺ ثلاثين ومائة ثم جاء رجل مشرك مشعان طويل بغنم يسوقها، فقال النبي ﷺ: «بيعا أم عطية؟» أو قال: «أم هبة» قال: لا بل بيع، فاشترى منه شاة فصنعت'' [1] الحديث

(بخاري شريف، كتاب الهبه، مطبوعه مصر: ٢/ ٢٩ و ٦٠)

[عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سوتیس (۱۳۰) آدمی نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ (ایک سفر پر) تھے، پھر ایک لمبا دھڑنگا مشرک شخص اپنی بکریوں کو ہانکتا ہوا آیا تو نبیِ کریم ﷺ نے پوچھا: ''بیچ رہے ہو یا عطیہ دے رہے ہو؟'' یا آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہبہ دے رہے ہو؟'' اس نے کہا: نہیں، بلکہ یہ فروخت کے لیے ہیں۔ پس آپ ﷺ نے اس سے ایک بکری خریدی جو بنائی گئی]

فتح الباری (پارہ: ۲/۲/ ۵۰ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

''وجاء رسول ابن العلماء صاحب إيلة إلى رسول الله ﷺ بكتاب وأهدى بغلة بيضاء، ولما انتهى رسول الله ﷺ تبوك أتاه يوحنا بن روبة صاحب أيلة فصالح رسول الله ﷺ وأعطاه الجزية'' انتهى

[صاحبِ اَیلہ ابن العلماء کا ایلچی رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک خط لایا اور آپ ﷺ کو ایک سفید رنگ کا خچر بھی ہدیہ دیا۔ (محمد بن اسحاق کی مغازی میں ہے) جب رسول اللہ ﷺ تبوک پہنچے تو صاحبِ اَیلہ یوحنا بن روبہ آپ ﷺ کے پاس آیا، پھر اس نے رسول اللہ ﷺ سے صلح کر لی اور آپ ﷺ کو جزیہ عطا کیا]

نیز فتح الباری (۲/ ۵۴۵ مطبوعہ دہلی) میں ہے:

''وفي حديث علي عند مسلم أن أكيدر دومة أهدى للنبي ﷺ ثوب حرير فأعطاه عليا فقال: شققه خمرا بين الفواطم'' [2]

[صحیح مسلم میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ اُکیدر دومہ نے نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ریشمی کپڑا بطورِ ہدیہ بھیجا۔ آپ ﷺ نے وہ کپڑا علی رضی اللہ عنہ کو عنایت فرما دیا اور فرمایا: اس کو پھاڑ کر فاطموں (فاطمہ بنت رسول ﷺ، ام علی فاطمہ اور فاطمہ بنت حمزہ بن عبد المطلب) کو اوڑھنیاں بنا دو]

اس مذکورہ بالا بیان سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ سودی مال حرام نہیں ہے۔ سود اور سودی مال دونوں قطعی حرام ہیں۔ ہاں یہ سمجھنا بھی چاہیے کہ سودی مال جو حرام ہے، سود لینے والے کے حق میں حرام ہے اور اس کی جواب دہی آخرت میں اسی کے ذمہ ہے اور اس شخص کے حق میں حرام نہیں ہے، جو اس سود لینے والے سے جائز وجہ سے حاصل کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اس قسم کے اموال ویسے لوگوں سے جائز وجہوں سے حاصل کیے جاتے تھے،

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٥٦)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث ([illegible])

جیسا کہ آیات و احادیثِ مذکورہ بالا سے واضح ہے اور یہ بھی جان لینا چاہیے کہ غیر اہلِ ملت سے جو استعانت و استمداد ناجائز ہے تو وہ امور مذہبی میں ناجائز ہے، جن میں اشتراک نہیں ہے، نہ کہ ہر قسم کے امور میں۔ ترمذی (ص:۲۰۱) میں ہے:

عن عائشة أن رسول اللهﷺ خرج إلى بدر حتى إذا كان بحرة الوبرة لحق رجل من المشركين يذكر منه جراءة ونجدة فقال له النبيﷺ: «تؤمن بالله ورسوله؟» قال: لا. قال: «ارجع فلن أستعين بمشرك»[1] والله أعلم

[سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بدر کی طرف نکلے تو جب وہ وبرہ کی پتھریلی زمین میں پہنچے تو آپ ﷺ کو ایک مشرک آدمی ملا جو اپنی بہادری اور جرأت میں مشہور تھا، (اس نے لڑائی میں شرکت کی اجازت طلب کی) تو نبیِ کریم ﷺ نے اسے فرمایا: ''تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے؟'' وہ کہنے لگا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لوٹ جا، میں کسی مشرک سے مدد نہیں لیتا]

كتبه: محمد عبد الله (٥/ شعبان ١٣٣٠هـ)

وفات کے بعد قرض ورثا کو ادا کرنا ضروری ہے:

سوال زید نے عمرو سے مبلغ سو روپیہ قرض لیا اور عمرو اب مر گیا، اس کا وارث اب موجود ہے اور یہ لوگوں میں عام مشہور ہو چکا ہے کہ عمرو کے پاس بکر کا یک صد روپیہ امانت رکھا ہوا تھا، مگر عمرو نے زید سے روپیہ دیتے وقت یہ نہیں کہا کہ یہ روپیہ ایک کا امانت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زید مبلغ سو روپیہ قرض گرفتہ شدہ عمرو کے وارث کو دے یا بکر کے وارث کو دے؟ بکر جس نے روپیہ امانت رکھا تھا، وہ بھی مر گیا، اس کا بھی بھائی موجود ہے۔ جواب سے مشرف فرمایئے۔

جواب اس صورت میں زید مبلغ یک صدر روپیہ جو عمرو سے قرض لیے تھے، عمرو کے وارثوں کو دے، کیونکہ وہ روپے بعد مر جانے عمرو کے عمرو کے وارثوں کے ہو گئے۔ ہاں بکر کے وارثوں کو اگر زرِ امانت کی بابت کچھ مطالبہ کرنا ہو تو وہ عمرو کے وارثوں سے مطالبہ کر سکتے ہیں۔ والله أعلم. كتبه: محمد عبد الله (١٦/ صفر ١٣٣٣هـ)

کیا کافر کا حرام مال جائز طریقے سے لینا درست ہے؟

سوال کافر کا کسی طرح کا مال جیسے رشوت یا اور کسی طرح کا ہو، مسلمان کو لینا درست ہے یا نہیں؟ مگر مسلمان مال کا حال جانتا ہے کہ کس طرح کا ہے؟

جواب اس صورت میں کافر کا مال بطورِ جائز لینا درست ہے، اگرچہ اس کافر نے جس وجہ سے مالِ مذکور حاصل کیا ہو، محض ناجائز و نامشروع ہو، بشرطیکہ جس شخص سے کافر نے مالِ مذکور حاصل کیا ہے، اس شخص کا کوئی حق اس مال سے متعلق نہ ہو، یعنی اس کافر نے جس شخص سے اس مال کو حاصل کیا ہو، برضا و رغبت اس شخص کے حاصل کیا ہو، غصب یا سرقہ یا اس کے مثل دوسرے وسائل سے، جس سے اس شخص کی رضا مندی ثابت نہیں ہوتی، نہ کیا ہو۔

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٥٨)

کتاب الصید و الذبائح

مشرک اور رافضی کا ذبیحہ:

سوال مشرک کا ذبیحہ اور رافضی کا ذبیحہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جائز ہے تو جو مسلمان تعزیہ پرستی اور قبر پرستی کرتا ہو اور انبیا علیہم السلام کو اور اولیاے کرام کو حاضر و ناظر، حاجت روا جانتا ہو، وہ مشرک ہے یا نہیں اور ذبیحہ اس کا جائز ہے یا نہیں؟ جواب مدلل بہ آیت و حدیث تحریر فرمایئے۔

جواب مشرک کا ذبیحہ جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی آسمانی کتاب کے ماننے کا مدعی ہو، جیسے یہودی یا نصرانی، اس کا ذبیحہ جائز ہے، اس سے شیعہ اور تعزیہ پرست اور قبر پرست اور انبیا علیہم السلام و اولیاے کرام رحمہم اللہ کو حاضر و ناظر و حاجت روا جاننے والے مسلمانان کے ذبیحہ کا حکم بھی نکل آیا، کیونکہ یہ سب لوگ بھی آسمانی کتاب (قرآن مجید) کے ماننے کے مدعی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہودی و نصرانی کی طرف متعدد آیات میں اشراک کی نسبت کی ہے۔ ازاں جملہ یہ آیت (سورۂ براءۃ، رکوع: ۵) ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾

[انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالاں کہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں]

و باایں ہمہ ان کا ذبیحہ حلال فرمایا۔ سورت مائدہ رکوع اول میں ہے: ﴿وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ﴾ [المائدۃ: ۵] واللہ اعلم بالصواب۔ [اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے جنھیں کتاب دی گئی]

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

نو مسلم کا ذبیحہ:

سوال موضع دہڈسہ کے مسلمانوں میں ایک مسئلے میں اختلاف پڑ گیا ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق کو کہتا ہے کہ ہم تمھارا ذبیحہ اس وجہ سے نہیں کھا سکتے کہ تمھارے باپ دادے ذبح نہیں کرتے تھے اور ہمارے باپ دادے ذبح کرتے تھے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ اس بات کو جانے دو،

اب ہم تم دونوں فریق مسلمان ہیں۔ "لا إلٰه إلا الله محمد رسول الله" ہم دونوں پڑھتے ہیں، اللہ و رسول کی باتوں کو ہم دونوں مانتے ہیں، نماز روزہ میں اور اسلام کی ساری باتوں میں ہم تم دونوں برابر ہیں تو اب ہمارا ذبیحہ تم کو کھانا چاہیے۔ اس صورت میں کس فریق کی بات صحیح اور درست ہے؟ بینوا تؤجروا.

جواب اس صورت میں دوسرے فریق کی بات صحیح ہے، کیونکہ جب دونوں فریق کلمہ گو اور مسلمان ہیں اور اللہ و رسول ﷺ کی ساری باتوں کو یکساں ماننے والے ہیں تو ہر ایک فریق کا ذبیحہ دوسرے فریق کو کھانا درست ہے، کیونکہ ہر ایک مسلمان کا ذبیحہ دوسرے مسلمان کے حق میں درست ہے اور جب دونوں فریق مسلمان ہیں اور بموجب حکم اللہ و رسول کے ہر ایک مسلمان کا ذبیحہ دوسرے مسلمان کو درست ہے تو بعد معلوم ہو جانے اس مسئلے کے کسی مسلمان کے ذبیحہ کو نادرست کہنے پر ہٹ نہ کرے۔ اللہ و رسول کی حلال کی ہوئی چیز کو جان بوجھ کر حرام کہنے پر ہٹ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ مسلمان آدمی کو جب اللہ و رسول کی بات معلوم ہو جائے تو مان لے اور اپنی بات پر ہٹ نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ [الأحزاب: ٣٦]

[اور کبھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو]

باپ دادے کسی کے کیسے ہی رہے ہوں، باپ دادوں کے چال چلن کو اس مسئلے میں کچھ دخل نہیں ہے۔

والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

شکار میں شراکت داری اور چھوٹے دریاؤں اور ندیوں کا شکار:

سوال ① شکار کرنا عام ازیں کہ دریائی ہو یا صحرائی، جیسا کہ فی زمانہ رائج ہے کہ چند اشخاص مل کر باہم مشترک طور پر شکار کیا کرتے ہیں اور اس میں بقدر حصہ رسدی و مساوی تقسیم کر لیتے ہیں، آیا صورت متذکرہ صدر شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

② قولہ تعالیٰ: ﴿صَيْدُ الْبَحْرِ﴾ و قولہ تعالیٰ: ﴿صَيْدُ الْبَرِّ﴾ کا اطلاق اس دیار کے چھوٹے چھوٹے دریاؤں پر صحیح ہے یا نہیں؟ نیز ان ندیوں میں شرعاً شکار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب ① صورتِ متذکرہ بالا شرعاً جائز ہے، مثل غنائم کے۔ "منتقى الأخبار" میں ہے:

"باب التسوية بين القوي والضعيف ومن قاتل ومن لم يقاتل. عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ يوم بدر... الحديث، وفيه: فقسمها رسول الله ﷺ بالسواء"[1] (رواه أبو داود، إلى آخر الباب)

[طاقتور اور کمزور، لڑنے والے اور نہ لڑنے والے کے درمیان برابری کرنے کا باب۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٣٩) نيل الأوطار (٨/ ٧٢)

بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن فرمایا:... اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس (مالِ غنیمت) کو ان کے درمیان برابر تقسیم کیا]

۲ بحر ضد ہے بر کا۔ بحر کا اطلاق ہر آبِ کثیر پر ہوتا ہے، میٹھا ہو یا کھاری، بستہ ہو یا جاری، ندی ہو یا تالاب یا پکھرا پکھری۔ پس بحر کا اطلاق اس دیار کے، بلکہ ہر ایک دیار کے چھوٹے دریاؤں پر صحیح ہے اور بحکم آیتِ کریمہ ﴿اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ﴾ ان ندیوں میں، بلکہ تمام دنیا کی ندیوں میں شرعاً شکار کیا جا سکتا ہے۔ "مختار الصحاح" میں ہے: "البحر ضد البر"[1] اھ [بحر بر کی ضد ہے]

"لسان العرب" میں ہے: "البحر الماء الكثير، ملحا كان أو عذبا، وهو خلاف البر"[2] اھ

[بحر بہت زیادہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے وہ کھارا ہو یا میٹھا اور وہ بر کی ضد ہے] خازن میں زیرِ آیتِ کریمہ ﴿اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ﴾ ہے: "المراد به جميع المياه العذبة والملحة بحرا كان أو نهرا أو غديرا"[3] اھ [اس (البحر) سے مراد تمام پانی ہیں، میٹھے ہوں یا کھارے، بحر کے ہوں یا نہر کے یا غدیر (جوہڑ) کے] "فتح البیان" میں ہے:

"المراد بالبحر هنا كل ما يوجد فيه صيد بحري وإن كان نهرا أو غديراً، فالمراد بالبحر جميع المياه العذبة والمالحة"[4] اھ

[یہاں بحر سے مراد ہر وہ (پانی) ہے جس میں بحری شکار پایا جائے، اگرچہ وہ نہر یا جوہڑ ہو، پس بحر سے مراد تمام پانی ہیں وہ کھارے ہوں یا میٹھے]

تفسیر ابو السعود میں ہے:

"(صيد البحر) أي ما يصاد في المياه كلها، بحرا كان أو نهرا أو غديرا"[5] والله تعالىٰ أعلم

[(صید البحر) یعنی جو تمام پانیوں سے شکار کیا جاتا ہے، وہ پانی بحر میں ہو یا نہر میں یا جوہڑ میں]

كتبه: محمد عبد الله (٢٨/ ذي القعدة ١٣٣١هـ)



---

① مختار الصحاح للرازي (ص: ٧٣)

② لسان العرب (٤/ ٤١)

③ تفسير الخازن (٢/ ٩٥)

④ فتح البيان (٤/ ٥٥)

⑤ تفسير أبي السعود ([illegible])



کتاب الأطعمة

جلالہ کا اطلاق کس جانور پر ہوتا ہے؟

سوال اقوام اہیر جن کو گوالا بھی کہتے ہیں، پیشہ دودھ و دہی فروشی کا کرتے ہیں اور قوم ہنود ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے جانور گائے بھینس کو صرف چارہ گھانس اور تل کا فضلہ یعنی کھلی و بھوسہ کھلاتے تھے اور دودھ بھی عمدہ ہوتا تھا، بعد جس قدر سلسلہ گرانی کا شروع ہوا، تب سے گھوڑوں کی لید مسل کیچڑ کے کندل کر کے بمقدار کثیر ٹوکروں میں بھر کر اس پر کسی قدر ڈال کر کھلاتے ہیں اور اسی حالت میں ان کا دودھ نچوڑتے ہیں، چونکہ یہاں بکثرت گھوڑے ہیں، اس وجہ سے بکثرت مل بھی جاتی ہے اور گل مہوا کو سڑا کر اس کی شراب اتارتے ہیں، اس کا فضلہ جس میں عفونت ہوتی ہے، وہ بھی بھینسوں کو کھلاتے ہیں۔ اب دریافت طلب یہ ہے کہ وہ جانور جلالہ کے حکم میں ہو کر اس کے دودھ کا کھانا پینا ناجائز ہوگا یا جائز؟ تحریر فرمایئے۔

جواب اگر جانور مذکور کے دودھ وغیرہ میں نجس چارہ کی بو یا رنگ یا مزہ باقی ہو تو استعمال سے پرہیز کریں۔ جانور مذکو پر ایسی حالت میں جلالہ کا حکم جاری ہوگا اور اگر بو یا رنگ یا مزہ باقی نہ ہو تو استعمال میں لائیں (جانور مذکور پر ایسی حالت میں جلالہ کا حکم جاری نہ ہوگا) حنفی مذہب کی معتبر کتابوں کا یہی خلاصہ ہے۔ لغت کی معتبر کتاب ''لسان العرب'' میں ہے:

''إبل جلالة تأكل العذرة، وقد نهي عن لحومها و ألبانها، والجلالة البقر التي تتبع النجاسات، ونهى النبيﷺ عن أكل الجلالة وركوبها، والجلالة من الحيوان التي تأكل الجِلّة والعذرة، والجلة البعر (إلى قوله) فأما أكل الجلالة فحلال إن لم يظهر النتن في لحمها''[1] اھ

[''إبل جلالۃ'' اس اونٹ کو کہتے ہیں جو گندگی کھاتا ہے، چناں چہ ایسے اونٹوں کے گوشت کھانے اور دودھ پینے سے منع کیا گیا اور ''بقر جلالہ'' وہ گائے ہے جو نجاستوں کے درپے ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جلالہ (جانور کوئی بھی ہو) کھانے اور اس پر سواری کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حیوانات میں سے جلالہ وہ ہے جو مینگنیاں اور پاخانہ کھاتا ہے۔ ''جلہ'' مینگنی (اور لید) کو کہتے ہیں ... پس جلالہ جانور کو کھانا حلال ہے بشرطیکہ اس کے گوشت میں گندگی کے اثرات نہ پائے جائیں]

ایسا ہی عون المعبود حاشیہ سنن ابی داود (۳/۴۱۲) میں ہے اور رد المحتار حاشیہ در مختار میں ہے:

---

[1] لسان العرب (١/ ٦٦٤)

”وفي التجنيس إذا كان علفها نجاسة تحبس الدجاجة ثلاثة أيام، والشاة أربعة، والإبل والبقر عشرة، وهو المختار على الظاهر، وقال السرخسي: الأصح عدم التقدير، و تحبس حتى تزول الرائحة المنتنة، وفي الملتقى: المكروه الجلالة التي إذا قربت وجد منها رائحة فلا تؤكل ولا يشرب لبنها... الخ“[1]

[تجنیس میں ہے کہ جب اس کا چارہ اور کھانا نجاست و گندگی بن جائے تو ان کو بند کر دیا جائے، چناں چہ مرغی کو تین دن کے لیے، بکری کو چار دن اور اونٹ و گائے کو دس دن کے لیے بند کر دیا جائے، بہ ظاہر یہی مختار مذہب ہے۔ سرخسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح مذہب یہ ہے کہ ان جانوروں کے لیے الگ الگ مدت کا تعین نہ ہو۔ بلکہ ہر ایسے جانور کو اس وقت تک بند رکھا جائے، جب تک اس کی بدبو وغیرہ دور نہ ہو جائے۔ ”ملتقی“ میں ہے کہ مکروہ جلالہ وہ جانور ہے کہ جب اسے قریب کیا جائے تو اس سے بدبو آئے، لہٰذا ایسے جانور کا گوشت کھایا جائے نہ اس کا دودھ پیا جائے]

نجاست خوار مرغیاں جلالہ میں داخل ہیں یا نہیں؟[2]

سوال نجاست خوار مرغیاں جلالہ میں داخل ہیں یا نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله محمد آله وأصحابه أجمعين.

أما بعد!

اس مسئلہ میں کہ ”مرغیاں بھی جلالہ ہوتی ہیں یا نہیں؟“ دو باتیں تنقیح طلب ہیں:

1. جلالہ کے کیا معنی ہیں؟
2. مرغیوں میں بھی جلالہ کے وہ معنی پائے جاتے ہیں یا نہیں؟

تنقیح نمبر اول:

لفظ جلالہ یا تو صیغہ اسم فاعل برائے مبالغہ ہے اور حرف ”ۃ“ اس میں زیادت مبالغہ کے لیے ہے جیسے: علامۃ فھامۃ. یا لفظِ جلالہ صیغہ نسبت ہے، جیسے: بزاز، صراف، غنام۔

اول شق پر اس کے معنی ہیں: بہت بہت جلہ خوار یعنی بہت بڑا نجاست خوار اور دوسری شق پر اس کے معنی ہیں: جلہ خواری پیشہ، یعنی پیشہ نجاست خواری ہو اور یہ بہت صاف بات ہے کہ جس کا پیشہ نجاست خواری ہوگا، ضرور اس میں نجاست خواری بکثرت تمام پائی جاتی ہوگی اور جس میں نجاست خواری بکثرت تمام پائی جاتی ہوگی، ضرور وہ بہت بڑا نجاست خوار ہوگا۔ اسی طرح جو بہت بڑا نجاست خوار ہوگا، ضرور اس میں نجاست خواری بکثرت تمام پائی جاتی ہوگی

[1] رد المحتار (٦/ ٣٠٦)

[2] یہ فتو[illegible]انا ابو المعالی محمد علی فیضی کی کتاب ”البيان في تحقيق الجلالة و دعوة الختان“ (ص: ٢٠، قلمی) سے ماخوذ ہے۔

اور جس میں نجاست خواری بکثرت تمام پائی جاتی ہوگی، ضرور وہ نجاست خواری پیشہ ہوگا۔

اس بیان سے ظاہر ہوگیا کہ مآل دونوں شقوں کا واحد ہے کہ جلالہ وہ ہے جو بہت بڑا نجاست خوار ہو اور بعض علما یہ فرماتے ہیں کہ جلالہ ہونے کے لیے اسی قدر کہ بہت بڑا نجاست خوار ہو، کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے گوشت یا دودھ یا پسینے میں بھی اس نجاست کا اثر (رنگ یا بو یا مزہ) ظاہر ہوجائے، ورنہ جلالہ نہیں ہے۔ تعمقِ نظر کے بعد یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ گوشت یا دودھ یا پسینے میں نجاست کے اثر کا ظاہر ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ وہ نجاست ہنوز پورے طور سے مستحیل نہیں ہوئی ہے، ورنہ اگر نجاست پورے طور سے مستحیل ہوگئی ہوتی تو اس کا اثر گوشت وغیرہ میں ظاہر نہ ہوتا اور شریعت غرا میں اس کے گوشت اور دودھ کھانے اور اس پر سواری کرنے سے ممانعت ہو جاتی، کیونکہ شَے کے مستحیل ہوجانے کے بعد اس کا سابق حکم باقی نہیں رہتا۔ دیکھو گدھا جب نمکسار میں پڑ کر نمک بن جاتا ہے تو اس کا سابق حکم حرمت باقی نہیں رہتا، بلکہ حلال ہوجاتا ہے، اسی طرح منی جب نطفہ بن جاتی ہے یا نطفہ جب علقہ ہوجاتا ہے یا علقہ جب مضغہ بن جاتا ہے یا مضغہ جب عظام کی شکل میں آجاتا ہے یا عظام کے بعد جب گوشت چڑھ کر اور جان پڑ کر آدمی بن جاتا ہے تو ہر ایک حالت لاحقہ پر حالتِ سابقہ کا حکم باقی نہیں رہتا۔

اسی طرح جب مَیلا [فضلہ] کھیتوں میں پڑ کر مٹی ہوجاتا ہے یا مٹی ہو کر نباتی شکل اختیار کرتا ہے تو اس کا سابق حکمِ نجاست اور حرمت باقی نہیں رہتا، بلکہ پاک اور حلال ہوجاتا ہے۔ اسی طرح آدمی کی غذا جب براز بن جاتی ہے تو اس کا سابق حکم پاکی اور حلت باقی نہیں رہتا، بلکہ براز بن جانے کے بعد ناپاک اور حرام ہوجاتی ہے۔ اسی طرح پاک پانی میں جب نجاست پڑ جاتی ہے، جس سے اس کا رنگ یا بو یا مزہ بدل جاتا ہے تو ناپاک ہوجاتا ہے اور دریا یا آبِ کثیر کہ ان میں کس قدر نجاست پڑتی ہے، لیکن چونکہ وہ نجاست مستحیل ہوجاتی ہے، اس لیے دریا یا آبِ کثیر ناپاک نہیں ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس لاکھوں کیا کروڑوں، بلکہ بے حد اس کی مثالیں پیش ہوسکتی ہیں۔

الحاصل شریعتِ بیضا نے استحالہ کا وجوداً اور عدماً دونوں طرح سے اعتبار کیا ہے کہ اگر استحالہ پایا گیا تو حکم سابق جاتا رہا اور استحالہ نہیں پایا گیا تو حکم سابق باقی رہا۔

اس تقریر سے ثابت ہوگیا کہ جو بعض علما نے جلالہ ہونے کے لیے گوشت وغیرہ میں نجاست کا اثر ظاہر ہونا بھی شرط فرمایا ہے، یہی قول صحیح اور اصولِ شریعت کے موافق ہے، پس اس صحیح قول کے موافق جلالہ وہ نجاست خوار جانور ہے، جس کے گوشت یا دودھ یا پسینے میں اس نجاست کا اثر رنگ یا بو یا مزہ ظاہر ہو، جو اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ وہ نجاست ہنوز پورے طور سے مستحیل نہیں ہوئی ہے اور جو حدیث شریف میں اس کے گوشت اور دودھ کھانے اور اس پر سواری کرنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے، اس کی یہی وجہ ہے کہ اُس کا گوشت اور دودھ اور پسینہ ہنوز بوجہ نجاست کے مستحیل نہ ہوجانے کے نجس اور ناپاک ہے، پس اس کا گوشت اور دودھ کھانا درحقیقت نجاست کھانا ہے اور اس پر سواری کرنا اپنے بدن اور کپڑے کو اس کے نجس پسینے سے آلودہ کرنا ہے۔

تنقیح نمبر دوم:

میں اس دوسری تنقیح کے متعلق کوئی قطعی بات اثباتاً یا نفیاً تحریر نہیں کر سکتا، کیونکہ میں خود نہیں جانتا کہ آیا مرغیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کے گوشت یا پسینے میں بوجہ بکثرت نجاست خواری کے نجاست کا اثر رنگ یا بو یا مزہ ظاہر ہو جاتا ہے یا ایسی نہیں ہوتی ہیں؟ ہاں بطورِ تعلیق اس قدر البتہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر مرغیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کا ابھی مذکور ہوا ہے تو جو ایسی ہوں، ان کے جلالہ ہونے میں کوئی شک نہیں وگرنہ نہیں، کیونکہ مناط نہی حدیث شریف میں صرف جلالہ ہونے کا وصف ہے تو جس جانور میں یہ وصف پایا جائے، وہ جلالہ ہے، جس کا گوشت کھانا اور دودھ والا ہو تو اس کا دودھ پینا اور سواری کے قابل ہو تو اس پر سواری کرنا، یہ سب داخل نہی ہے اور جس جانور میں یہ وصف نہ پایا جائے، نہ وہ جلالہ ہے اور نہ اس پر احکامِ مذکورہ جاری ہوں گے اور جو روایت کہ بزازیہ سے بحوالہ غایۃ الکلام بدیں عبارت نقل کی گئی ہے:

"روي عن النبي ﷺ أنه يحبس الدجاج ثلاثة أيام"[1]

[نبیِ مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ مرغی کو تین دن تک بند کر دیا جائے]

اگر یہ روایت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو یہ بلاشبہہ قاطع نزاع ہے، لیکن اس کا ثبوت معلوم نہیں۔ مرغیوں کے قطعاً جلالہ نہ ہونے کی یہ دلیل کہ رسول اللہ ﷺ نے مرغی کا گوشت کھایا ہے، کافی دلیل نہیں ہے، ورنہ شتر اور گاؤ بھی قطعاً جلالہ نہ ٹھہریں گے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے شتر اور گاؤ کا گوشت بھی کھایا کھلایا ہے۔ ہاں اگر کسی کا ایجاب کلی کا دعویٰ ہو کہ کل مرغیاں جلالہ ہوتی ہیں تو اس دعوے کے ابطال کے لیے یہ دلیل البتہ کافی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جس مرغی کا گوشت تناول فرمایا تھا، وہ قطعاً جلالہ نہ تھی۔

پس اس دلیل سے یہ سلب جزئی کہ بعض مرغیاں جلالہ نہیں ہیں، ثابت ہو گیا اور اس سلب جزئی کے ثبوت سے ایجاب کلی کا دعوی جو سلب جزئی کا نقیض ہے، باطل ہو گیا، کیونکہ احد النقیضین کے ثبوت سے دوسرے نقیض کا ثبوت ممتنع ہو جاتا ہے، وإلا لزم اجتماع النقيضين، وهو كما ترى۔ لیکن کسی کا دعویٰ ایجاب کلی کا نہیں۔

دعوتِ ختنہ بدعت ہے یا نہیں؟[2]

سوال دعوتِ ختنہ بدعت ہے یا نہیں؟

جواب دعوتِ ختنہ کے متعلق سوال صرف اس قدر ہے کہ یہ دعوت بدعت ہے یا نہیں؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو ایک مرفوع حدیث: "من طريق مجاهد عن أبي هريرة" جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

«والخرس والإعذار والتوكير أنت فيه بالخيار»[3] (فتح الباري، ص: ۹۲ پ: ۲۱)

---

[1] یہ روایت مرفوعاً نہیں ملی، البتہ اس سلسلے میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک موقوف اثر مصنف ابن ابی شیبہ (۵/ ۱۴۸) میں مروی ہے۔

[2] یہ فتویٰ مولانا ابو المعالی محمد علی فیضی کی کتاب "البيان في تحقيق الجلالة و دعوة الختان" (ص: ۲۰، قلمی) سے ماخوذ ہے۔

[3] المعجم الأوسط (٤/ ١٩٣) اس کی سند میں "یحییٰ بن عثمان" راوی ضعیف ہے۔ (تقريب التهذيب، ص: ٥٩٤)

[ولادت، ختنے اور نوتعمیر گھر والی دعوت میں تمھیں اختیار ہے]

نقل کر کے اس پر سکوت فرما دیا اور اس کی سند پر کوئی بحث نہیں کی، جس سے حدیث مذکور کا صحیح یا حسن ہونا ثابت ہوگیا، جب کہ خود حافظ رحمہ اللہ نے مقدمہ فتح الباری کے اوائل میں اس کی تصریح فرما دی ہے۔[1] اس حدیث سے دو امر ثابت ہوئے:

① ایک یہ کہ دعوتِ ختنہ جائز ہے، کیونکہ اس حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اِعذار کی اجابت کا اختیار دیا اور اِعذار دعوتِ ختنہ کا نام ہے، تو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ ختنہ کی اجابت کا اختیار دیا۔ پس اس سے اس دعوت کا جواز ثابت ہوگیا، ورنہ اگر یہ دعوت ناجائز ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ناجائز کی اجابت کا اختیار ہرگز نہ دیتے۔

② دوسرے یہ کہ زمانہ رسالتِ مآب میں دعوتِ ختنہ کا دستور جاری تھا اور اس دعوت کا نام مثل دیگر دعوتوں کے ناموں کے اِعذار مشہور تھا، ورنہ اگر اس دعوت کا دستور جاری نہ ہوتا تو آپ ﷺ یہ کس طرح فرماتے کہ اِعذار کی اجابت میں تم کو اختیار ہے اور جب اس مرفوع حدیث سے دعوتِ ختنہ کا جواز اور اس کا زمانہ رسالت میں دستور و رواج ثابت ہوا تو یہ دعوت بدعت کس طرح ہوسکتی ہے اور یہ قول کہ محدثین کی تبویب و فہمِ معانی و مطالبِ احادیث حجت ہے، صحیح نہیں۔ فہمِ معانیِ احادیث درایت ہے، ثقہ کی روایت حجت ہے۔ مجرد اس کی درایت حجت نہیں، کیونکہ یہی تو عین تقلید ہے، جو شریعت میں حجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

کتبہ محمد عبداللہ (۱۳/ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ از لکھنؤ شاہی شفاخانہ وکٹوریا گنج)

سودی اور حلال دونوں کاروبار کرنے والے کی دعوت قبول کرنا[2]:

سوال کیا فرماتے ہیں علماے دین اس مسئلے میں کہ دعوت قبول کرنا اس شخص کے یہاں، جو مال سود کا بھی کسب کرتا ہے اور مالِ تجارت وغیرہ سے بھی کسب کرتا ہے، درست ہے یا نہیں؟

جواب صورتِ مسؤلہ میں دعوت قبول کرنا ایسے شخص کے یہاں ہرگز جائز نہیں، خاص کر عالم دیندار کو کئی وجہ سے۔ ایک تو یہ کہ ایسے لوگ بدلیل شرعی فاسق ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے دعوت قبول کرنے فاسقوں کے یہاں سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ مشکاۃ میں بروایت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کے ثابت ہوا: "عن عمران بن حصين قال: نهى

[1] مقدمہ فتح الباری میں ہے: "افتتحت شرح الكتاب مستعينا بالفتاح الوهاب فأسوق إن شاء الله تعالىٰ الباب و حديثه أولا، ثم أذكر وجه المناسبة بينهما إن كانت خفية، ثم أستخرج ثانياً ما يتعلق به غرض صحيح في ذلك الحديث من الفوائد المتنية والإسنادية... إلى قوله: منتزعا كل ذلك من أمهات المسانيد والجوامع والمستخرجات والأجزاء والفوائد بشرط الصحة والحسن فيما أورده من ذلك" (أبو المعالي محمد علي غفرله ولوالديه)

[2] فتاویٰ مولانا ابو المکارم مئوی (ص: ۳۹)

رسول الله ﷺ عن إجابة طعام الفاسقين" اھ [عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے فاسقوں کے کھانے کی دعوت قبول کرنے سے منع فرمایا ہے] دوسرے یہ کہ اس کا مال مشتبہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے جیسا کہ حرام سے بچنے کی تاکید فرمائی، ویسا ہی مشتبہات سے بھی بچنے کی تاکید فرمائی، جیسا کہ امام بخاری نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

عن النعمان بن بشير قال: قال رسول الله ﷺ: «الحلال بين، والحرام بين، وبينهما مشتبهات، لا يعلمهن كثير من الناس، فمن اتقىٰ الشبهات استبرأ لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام، كالراعي يرعىٰ حول الحمى يوشك أن يقع فيه. ألا إن لكل ملك حمىً، ألا و إن حمى الله محارمه، ألا و إن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب»[2] انتهى

[نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حلال واضح ہے اور حرام (بھی) واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ شبہے والی چیزیں ہیں، جن سے اکثر لوگ واقف نہیں ہیں تو جس نے شبہے والے چیزوں سے اجتناب کیا، اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا اور جو کوئی شبہے والی چیزوں میں مبتلا ہوگیا، وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا، جیسے ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد بکریاں چرانے والا، ہوسکتا ہے کہ (نادانستہ طور پر) اس کے اندر (جانور) چرا لے (اور اس طرح مجرم قرار پائے) خبردار! ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے (جس میں عام لوگوں کے جانوروں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے) خبردار! اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چراگاہ سے مراد اس کی حرام کردہ چیزیں (اور کام) ہیں۔ سن لو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ صحیح ہو تو سارا جسم صحیح ہوتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ دل ہے]

امام بخاری اس کی تفسیر میں حدیث عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی لایا ہے اور وہ یہ ہے:

"عن عدي بن حاتم قال: سألت النبي ﷺ عن المعراض فقال: إذا أصاب بحده فكل، وإذا أصاب بعرضه فلا تأكل، فإنه وقيذ، قلت: يا رسول الله! أرسل كلبي وأسمي فأجد معه على الصيد كلبا آخر لم أسم عليه ولا أدري أيهما أخذ؟ قال: لا تأكل إنما سميت على كلبك، ولم تسم على الآخر"[3] انتهى

---

① المعجم الكبير (١٨/ ١٦٨) شعب الإيمان (٥/ ٦٨) مشكاة المصابيح (٢/ ٢٣٢) اس کی سند سخت ضعیف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٢٢٩)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٩)

[عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھالے سے شکار کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر وہ دھار کی طرف سے لگا ہو تو کھا لو اور اگر موٹائی کی طرف سے لگا ہو تو مت کھاؤ، بلاشبہہ وہ چوٹ زدہ ہوگا۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنا کتا چھوڑتا ہوں اور اللہ کا نام لیتا ہوں تو پھر میں شکار پر اس کے ساتھ ایک اور کتا بھی دیکھتا ہوں، جس پر میں نے اللہ کا نام نہیں لیا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان دونوں میں سے کس نے شکار کو پکڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مت کھاؤ، کیونکہ تم نے اپنے کتے پر اللہ کا نام لیا ہے، دوسرے کتے پر اللہ کا نام نہیں لیا]

امام ترمذی نے حسن بن علی سے روایت کیا ہے:

عن الحسن بن علي قال: حفظت من رسول الله ﷺ: «دع ما يريبك إلىٰ ما لا يريبك»[1] هكذا في البخاري تعليقاً.

[حسن بن علی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ یاد کیے: جو چیز تجھے شک میں ڈال دے، اسے چھوڑ دو اور شک سے پاک چیز اختیار کرو]

امام نووی ریاض الصالحین میں فرماتے ہیں: "معناه: اترك ما تشك فيه، واعدل إلى ما لا تشك فيه"[2] انتهى [اس کا معنی یہ ہے کہ جس چیز میں تمھیں شک ہو، اس کو چھوڑ دو اور اس چیز کو اختیار کر لو، جس میں تمھیں شک نہ ہو] نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

"عن أنس قال مر النبي ﷺ بتمر مسقوطة فقال: «لو لا أن يكون صدقة لأكلتها» وقال همام عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: «أجد تمرة ساقطة على فراشي»[3] انتهى

[انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گری ہوئی کھجور کے پاس سے گزر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر (مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ) یہ صدقے کی ہوگی تو میں اسے کھا لیتا۔ ہمام نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، انھوں نے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: میں اپنے بستر پر ایک کھجور گری ہوئی پاتا ہوں تو کھانے لگتا ہوں، لیکن پھر یہ سوچ کر چھوڑ دیتا ہوں کہ کہیں وہ صدقہ نہ ہو]

حاصل ان عباراتِ مذکورہ کا یہ ہے کہ دعوتِ مسئولہ جائز نہیں، اس لیے کہ مشتبہات سے بچنے کی کمال تاکید آئی ہے، جیسا کہ احادیثِ مذکورہ دلالت کرتی ہیں اس پر، پس مشتبہات سے بچنا اور دوسروں کو بچانا ہر مسلمان پر فرض اور واجب ہے، اس واسطے کہ جب آدمی مشتبہات میں واقع ہوا، لامحالہ حرام میں واقع ہوا، جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث دلالت کرتی ہے اور انھیں شبہات سے بچنے کا نام زہد و ورع ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٨)

[2] رياض الصالحين (ص: ٦٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧٠)

"الورع ترك الحلال خوفاً من الوقوع في الشبهات، والزهد ترك الشبهات خوفا من الحرام، وقد يقال: الزهد الإعراض عن الدنيا"[1] والتفصيل في إحياء العلوم

[شبہے والی چیزوں میں ملوث ہونے کے ڈر سے حلال کو ترک کرنا ورع اور حرام میں واقع ہونے کے خوف سے شبہات کا چھوڑنا زہد کہلاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا سے اعراض و اجتناب کرنے کا نام زہد ہے۔ اس کی تفصیل "إحياء العلوم" میں ہے]

اس زمانے میں کسب سود کا اس کثرت سے درمیان مسلمانوں کے پھیل رہا ہے کہ جس (کی) انتہا نہیں الا بعض شخص، ورنہ ہر شخص کسی نہ کسی طرح سے مبتلا ہے۔ کیونکر نہ ہو خود رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

«ليأتين على الناس زمان، لا يبقىٰ أحد إلا أكل الربا، وإن لم يأكله أصابه من بخاره، ويروي من غباره»[2] أخرجه أبو داود وغيره.

[لوگوں پر ضرور ایسا زمانہ آئے گا، جس میں کوئی شخص سود کھائے بغیر نہیں رہے گا، جو شخص سود نہیں کھائے گا، اسے بھی اس کا گرد و غبار تو پہنچ ہی جائے گا]

ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکاۃ میں "من بخاره" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"والمراد من بخاره أثره، وذلك بأن يكون مؤكلا أو شاهدا أو كاتبا أو ساعيا أو أكل من ضيافته أو هديته"[3] هكذا في اللمعات للشيخ عبد الحق محدث الدهلوي.

[اس کے گرد و غبار سے مراد اس کا اثر ہے۔ وہ ایسے کہ وہ کھلانے والا یا گواہی دینے والا یا لکھنے والا یا کوشش کرنے والا یا اس کی ضیافت سے یا اس کے ہدیے سے کھانے والا ہوگا]

جو فقہ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ جب مال اس کا اکثر حلال کا ہو اور کم حرام کا ہو تو دعوت کھانا جائز ہے، اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ جب ہم سب مامور ہیں کہ مشتبہات سے اجتناب کریں تو خواہ مال اس کا حرام کا زیادہ ہو یا نہ ہو تو ہر طرح سے مشتبہ رہے گا۔ ہاں اس قدر البتہ ہے کہ جب مال حرام کا اکثر ہوگا تو زیادہ تر مشتبہ رہے گا اور رسول اللہ ﷺ نے بدوں قید اس کی مشتبہات سے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔ کہیں حدیث شریف میں اس کی تصریح نہیں آئی ہے کہ جب مال حرام کا زیادہ نہ ہو تو دعوت قبول کرنا جائز ہے۔ وإذ ليس فليس۔ پس یہ قول مقابل ان نصوص کے متروک ہوا اور اگر مان بھی لیا جائے، تب بھی اجتناب اس دعوت سے افضل ہے اجابت سے اور اسی کا نام تقویٰ ہے، چنانچہ صراحتاً اس باب میں حدیث وارد ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

---

[1] إحياء علوم الدين (٤/ ٢١٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٣١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٥٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔

[3] مرقاة المفاتيح (٥/ ١٩٢٢)

«لا يبلغ العبد أن يكون من المتقين حتى يدع ما لا بأس به حذراً لما به بأس»[1] رواه الترمذي عن عطية السعدي الصحابي، وقال: حديث حسن.

[بندہ تقوے کے (بلند) مقام تک نہیں پہنچتا، حتی کہ حرج والی چیز سے بچنے کے لیے وہ چیز بھی چھوڑ دے، جس میں حرج نہیں ہے (لیکن شک ہے کہ شاید منع ہو)]

تیسرے یہ کہ شرک و بدعت کے بعد سود کا لینا اور دینا سب گناہوں سے زیادہ تر قبیح اور بد ہے، حتی کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ لڑائی کرنے کا وعدہ فرماتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ [البقرة: ٢٧٩]

[پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کا اعلان سن لو]

نیز رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: «الربا سبعون حوبا أيسرها مثل أن ينكح الرجل أمه»[2] [سود کے ستر گناہ ہیں، جن میں سے سب سے ہلکا (درجہ) اس قدر ہے، جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے نکاح کرے] نیز ارشاد فرماتے ہیں: «لعن رسول اللهﷺ على أكله وموكله وشاهده وكاتبه»[3] [رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہ بننے والے اور اس کی تحریر لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے]

غرض کہ سود سے بڑھ کر کوئی گناہ بعد شرک و بدعت کے نہیں معلوم ہوتا اور انواع و اقسام کے عذاب اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لیے مقرر رکھا ہے، پس ایسے لوگوں سے محبت رکھنا ہرگز نہ چاہیے اور دعوت قبول نہ کرنا چاہیے۔ قال النبيﷺ: «المرء مع من أحب»[4] [آدمی اس کے ساتھ ہوگا، جس سے اسے محبت ہوگی] نیز فرمایا ہے:

«من أحب لله و أبغض لله وأعطىٰ لله ومنع لله فقد استكمل الإيمان»[5]

[جس شخص نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کی خاطر بغض رکھا، اللہ کی رضا کی خاطر عطا کیا اور اللہ کے لیے روک لیا تو اس نے ایمان مکمل کر لیا]

پس مسلمانوں پر لازم ہے کہ دعوت کھانی ایسے لوگوں کے یہاں سے پرہیز کریں۔ خاص کر عالم دین ہرگز ایسی دعوت قبول نہ کرے۔ لأن ذلك شين الدين و فتح باب المعصية على المسلمين. [اس لیے کہ یہ دین میں ایک عیب ہے اور اس سے مسلمانوں پر معصیت و نافرمانی کا دروازہ کھل جاتا ہے] بلکہ عالم کو چاہیے کہ اس شخص کو ایسے فعل سے روکے اور اگر مان جائے تو بہتر، ورنہ اس سے اجتناب اور کنارہ کشی کرے اور باہم کھانا اور پینا چھوڑ دے:

---

1. سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢١٥) اس کی سند میں عبداللہ بن یزید ضعیف ہے۔ دیکھیں: ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦٣٢٠)
2. سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٧٤)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٧٧)
4. صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)
5. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٨١)

لما روي عن ابن مسعود رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «أول ما دخل النقص على بني إسرائيل أنه كان الرجل يلقىٰ الرجل فيقول: ما هذا؟ اتق الله، ودع ما تصنع، فإنه لا يحل لك، ثم يلقاه من الغد، وهو على حاله فلا يمنعه ذلك أن يكون أكيله وشريبه وقعيده، فلما فعلوا ذلك ضرب الله على قلوب بعضهم ببعض، ثم قال: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ [المائدة: ٧٨۔ ٨١]، ثم قال: والله لتأمرن بالمعروف، ولتنهون عن المنكر ولتأخذن على يد الظالم، ولتأطرنه على الحق أطراً ولتقصرنه على الحق قصرا أو ليضربن الله قلوب بعضكم على بعض ثم ليلعننكم كما لعنهم»[1]

[عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پہلا پہلا نقص اور عیب جو بنو اسرائیل میں داخل ہوا، یہ تھا کہ ان میں سے کوئی دوسرے سے ملتا تو اسے کہتا تھا: ارے! اللہ سے ڈرو اور جو کر رہے ہو، اس سے باز آ جاؤ، یہ تمھارے لیے حلال نہیں۔ پھر اگلے دن ملتا اور وہ اپنی حالت پر ہی ہوتا تو یہ اس کے لیے اس کا ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہم مجلس ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تھی۔ جب ان کا یہ حال ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے پر دے مارا، پھر آپ ﷺ نے یہ آیات پڑھیں: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ ''وہ لوگ جنھوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا، ان پر داود اور مسیح ابن مریم کی زبان پر لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو کسی برائی سے، جو انھوں نے کی ہوتی، روکتے نہ تھے، بے شک برا ہے، جو وہ کیا کرتے تھے۔ تو ان میں سے بہت سوں کو دیکھے گا، وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں، جنھوں نے کفر کیا۔ یقیناً برا ہے، جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا کہ اللہ ان پر غصے ہوگیا اور عذاب ہی میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٦) اس کی سند میں انقطاع ہے، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث

اور اگر وہ اللہ اور نبی پر اور اس پر ایمان رکھتے ہوتے، جو اس کی طرف نازل کیا گیا ہے تو انھیں دوست نہ بناتے اور لیکن ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: خبردار! اللہ کی قسم! تمھیں بالضرور نیکی کا حکم کرنا ہوگا، برائی سے روکنا ہوگا، ظالم کا ہاتھ پکڑنا ہوگا اور اسے حق پر لوٹانا اور حق کا پابند کرنا ہوگا یا پھر ضرور اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں کو ایک دوسرے پر دے مارے گا، پھر تم پر ویسے ہی لعنت کرے گا، جس طرح اس نے ان پر لعنت کی]

اس حدیث کو ابو داود اور ترمذی نے روایت کیا اور یہ لفظ ابو داود کا ہے اور لفظ ترمذی کے یہ ہیں:

"قال رسول اللهﷺ: «لما وقعت بنو إسرائيل في المعاصي نهتهم علماؤهم فلم ينتهوا فجالسوهم في مجالسهم وآكلوهم وشاربوهم فضرب الله قلوبهم بعضهم ببعض، ولعنهم على لسان داود وعيسىٰ ابن مريم ذلك بما عصوا وكانوا يعتدون» فجلس رسول اللهﷺ وكان متكئاً فقال: «لا والذي نفسي بيده حتى تأطروهم على الحق أطراً»[1] انتهى. والله أعلم بالصواب

[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب بنو اسرائیل نافرمانیوں میں مبتلا ہوئے تو ان کو ان کے علما نے منع کیا، مگر وہ باز نہ آئے تو پھر وہ (علما) خود بھی ان کے ہم مجلس، ہم نوالہ اور ہم پیالہ بن گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے کے اوپر دے مارا اور داود علیہ السلام اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی زبان پر لعنت کی، اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ یہ ارشاد فرماتے وقت تک ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پھر آپ ﷺ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: نہیں، قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! (تم بھی ان کی طرح ہونے سے نہیں بچ سکو گے) حتی کہ تم ان کو حق پر لوٹاؤ اور ان کو اس کا پابند کرو]

حرره الراجي إلى رحمة ربه الغني أبو المكارم محمد علی صانه الله عن شر كل غبي وغوي.

ابو المکارم محمد علی (۱۲۹۹ھ) — زشرف سید کونین شد شریف حسین (۱۲۹۳ھ)

خادم شریعتِ رسول الثقلین محمد حسین (۱۲۹۲ھ) — محمد نذیر حسین (۱۲۸۱ھ)

محمد بن محمد عبداللہ (۱۲۹۸ھ) — محمد عبداللہ (۱۲۹۱ھ) — محمد عبدالحمید (۱۲۹۲ھ)

سید احمد حسن (۱۲۸۹ھ) — المعتصم بحبل اللہ الاحد ابو البرکات حافظ محمد (۱۲۹۲ھ)

شیعہ کی دعوت قبول کرنا:

سوال طعامِ دعوت یا عام پختہ کیا ہوا کھانا فریقِ شیعہ کا فرقہ اہلِ حدیث یا اہلِ سنت کو جائز ہے اور ایسا طعام یا مثل

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰٤۷) اس حدیث کی سند بھی ضعیف ہے، کیوں کہ اس میں انقطاع ہے۔

اس کے پاک اور طیب ہے یا کس طرح پر شرع میں اس کا حکم ہے؟

جواب طعام دعوت یا پختہ کیا ہوا کھانا فریقِ شیعہ کا فرقہ اہلِ حدیث یا اہلِ سنت کو کھانا جائز ہے اور ایسا کھانا پاک اور طیب ہے، بشرطیکہ طعام مذکور محرماتِ شرعیہ (مثل میت یا دم مسفوح یا لحم خنزیر یا ما اہل بہ لغیر اللہ) میں سے نہ ہو اور بشرطیکہ کسی قسم کی نجاست کے ساتھ مخلوط نہ ہو اور بشرطیکہ کسی ناجائز وجہ (جیسے سرقہ وغصب وغیرہ) سے کمایا ہوا نہ ہو اور اس حکم میں فریقِ شیعہ یا دوسرے کسی فریق کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ ہر فریق کا یہی حکم ہے، یہاں تک کہ اگر فرقہ اہلِ حدیث یا اہلِ سنت کا بھی طعام دعوت یا پختہ کیا ہوا کھانا ہو اور اس میں شروطِ مذکورہ میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو اس کا کھانا بھی کسی کو جائز نہیں ہے اور نہ ایسا کھانا پاک اور طیب ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (٢٢/ صفر ١٣٣٥هـ)

کیا توبہ کے بعد حرام آمدن حلال ہو جاتی ہے؟

سوال مال زن فاحشہ کا جو زنا کی اجرت سے زیور ونقد جمع کیا ہے، آیا یہ مال بعد توبہ اور اسلام لانے اس کے حلال و پاک ہوگا یا دوام کے واسطے حرام و ناپاک رہے گا اور بھی جو اس کے شوہر نے زیور وغیرہ بعد نکاح دیا ہے، وہ بھی کوئی اچھی کمائی حلال طور سے نہیں، نیز بعد مرنے اس کے شوہر کے جو اس کے شوہر کے وارثان نے اس کا مشاہرہ مقرر کر دیا ہے، وہ بھی ایسا حلال مال نہیں ہے، پس اب عورت ان سب مال کو کیا کرے اور اس کی ماں بہن بھی اسی قسم کی ہیں، ان کی بھیجی ہوئی چیزوں کو کھالے یا نہیں؟

جواب جس شخص نے حرام پیشہ سے کچھ کمایا ہو، اگر اس کمائی سے کوئی حق العباد متعلق نہ ہو تو وہ کمائی خود اسی کھانے والے کے حق میں حرام ہے، نہ کہ دوسروں کے حق میں، یعنی اگر وہ کھانے والا اس کمائی میں سے کسی دوسرے کو کچھ بعوض یا بلا عوض دے تو اس دوسرے کے حق میں بھی وہ سب حلال ہو جاتا ہے۔

﴿ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ [سورۂ بقرۃ، رکوع: ٣٨]

[پھر جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت آئے، پس وہ باز آ جائے تو اسی کے لیے جو ہو چکا]

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾

[سورۂ فرقان، رکوع آخر]

[مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا نیک عمل تو یہ لوگ ہیں، جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے]

تو جو زیور اس عورت کے پاس حرام پیشہ سے حاصل کیا ہوا ہے، چونکہ وہ سچے طور سے اس پیشے سے تائب ہو چکی ہے، اب وہ سب اس کو حلال ہو گیا۔ اس کو جس اچھے مصرف میں چاہے صَرف کرے، اسی طرح وہ زیور جو اس کے شوہر نے اسے دیا ہے بعوض ... شوہر کے وارثوں ... مشاہرہ مقرر کر دیا جو اس کی ماں

بہن اس کے پاس بھیج دیں، وہ سب اس کو حلال ہے، بشرطیکہ یہ اس کو معلوم نہ ہو کہ کوئی حق العباد اس مال سے متعلق ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

کیا مریض کے لیے کھجور کی تاڑی پینا درست ہے؟

سوال ایک شخص بیمار ہے، اس کے عارضہ کے لیے حکما تجویز کرتے ہیں کہ تاڑی کھجور کی صبح کے وقت تازی پیے تو اس کے عارضہ کے لیے نافع ہوگا تو ایسی حالت میں آیا اس کے لیے جائز ہے یا عام طور پر بھی بہ تبدیل ظرف یومیہ کے لوگ پی سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب اگر کھجور کی تاڑی میں جو صبح کو پی جائے، خواہ تھوڑی، خواہ بہت، نشہ نہ ہو تو اس کا پینا جائز ہے، بیمار آدمی کے لیے بھی اور صحیح آدمی کے لیے بھی اور اگر اس میں نشہ ہو، اگرچہ تھوڑی پینے میں نہ ہو، بلکہ زیادہ پینے میں ہو تو اس کا پینا ناجائز ہے۔ صحیح کے لیے بھی اور مریض کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ تبدیل ظرف یومیہ کی صورت میں، یعنی اگر نشہ نہ ہو تو عموماً جائز، ورنہ عموماً ناجائز ہے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبي ﷺ قال: «كل مسكر خمر، و كل مسكر حرام»[1]

(أخرجه أحمد و الأربعة، وصححه ابن حبان)

[سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبیِ اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر نشہ آور شے خمر (شراب) ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے]

وعن وائل الحضرمي أن طارق بن سويد سأل النبي ﷺ عن الخمر يصنعها للدواء، فقال: «إنها ليست بدواء، ولكنها داء»[2] (أخرجه مسلم و أبو داود وغيرهما، بلوغ المرام)

[وائل حضرمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ طارق بن سوید رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم ﷺ سے اس خمر (شراب) کے بارے میں سوال کیا جو دوائی کے لیے تیار کی جاتی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ دوائی نہیں ہے وہ بیماری ہے] واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: أبو العلی محمد عبد الرحمن المبارکفوري الأعظم گڑھی، عفي عنه. الجواب صحيح. کتبہ: محمد عبد اللہ.

کیا مسکر کی طرح مفتر بھی حرام ہے؟

سوال مسکر کی نسبت وارد ہے: «ما أسكر كثيره فقليله حرام» کیا مفتر کی نسبت بھی ایسا وارد ہوا ہے؟

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٣) مسند أحمد (٢/ ١٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٦١) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٥٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٩٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٨٤) مسند أحمد (٤/ ٣١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٤٦)

جواب جس طرح مسکر کی نسبت وارد ہے، «ما أسكر كثيره فقليله حرام»[1] یعنی جو چیز مسکر ہے، اس کا جزو بھی حرام ہے۔ مفتر کی نسبت ایسا وارد نہیں ہے اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ مفتر کے معنی ہیں بدن کو سست اور ضعیف کرنی والی چیز اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یہی ماکول جس کو آدمی روز مرہ استعمال کرتا رہتا ہے، اگر قدرِ ہضم سے زیادہ تناول کرے تو قویٰ اس کے ہضم سے عاجز ہو کر ضرور تھک جائیں گے اور ہضم میں فتور ہو جائے گا اور ضعف و سستی اس کو لازم ہے۔ الحاصل قدرِ ہضم سے زائد مفتر ہے، تاہم اس کا جزو، یعنی قدرِ ہضم حرام نہیں۔ واللہ أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله ۔ مہر مدرسہ احمدیہ۔ الجواب صحيح. محمد عبد الرحمن. الجواب صحيح. وصيت علي. الجواب صحيح. محمد ضمير الحق، عفي عنه.

کیا شراب اور تاڑی کا سرکہ اور حرام پیسا تبدیل کرنے کے بعد حلال ہے؟

سوال ① اگر شراب یا تاڑی کا سرکہ بنایا جائے تو وہ حلال ہے یا حرام اور اگر حلال ہے تو کس طرح پر بنایا جائے؟

② اگر روپیہ رشوت کا ملے اور وہ روپیہ دے کر اس کا پیسہ بدلا لیا جائے تو وہ رشوت ہے یا نہیں؟ پیسہ بدلا لینے سے اس کی شکل تبدیل ہو جاتی ہے یا نہیں؟

جواب ① اگر شراب یا تاڑی خود بخود سرکہ بن جائیں تو اس سرکہ کا کھانا حلال ہے، لیکن تاڑی یا شراب کا سرکہ بنانا جائز نہیں ہے۔ صحیح مسلم (۲/ ۱۶۳) میں ہے: عن أنس أن النبيﷺ سئل عن الخمر تتخذ خلا؟ فقال: «لا»[2] یعنی انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے شراب کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس کا سرکہ بنایا جائے؟ فرمایا کہ نہیں۔

② حرام چیز، روپیہ ہو یا کوئی دوسری چیز ہو، تبدیل سے حلال نہیں ہو جاتی ہے، یعنی جیسے اصل چیز حرام تھی، ویسے ہی اس کا بدل بھی حرام ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ صحیح بخاری مع فتح الباری (۲/ ۳۹۶) اور صحیح مسلم (۲/ ۲۳) میں ہے: «قاتل الله اليهود، حرم الله عليهم الشحوم فباعوها وأكلوا أثمانها»[3] یعنی اللہ لعنت کرے یہودیوں پر۔ اللہ نے ان پر چربی حرام کر دی تھی، انھوں نے اس کو بیچ کر اس کا دام کھایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز حرام ہوتی ہے تو اس کا بدل بھی حرام ہو جاتا ہے۔ سنن ابی داود کی حدیث سے یہ امر اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ سنن ابی داود (۲/ ۱۳۷) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث مذکور کے بعد یہ فرمایا:

«وإن الله تعالىٰ إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليهم ثمنه»[4]

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨١)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٨٣)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨٣)

④ سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٨٨)

یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر کسی چیز کا کھانا حرام کر دیتا ہے تو ان پر اس کا ثمن، یعنی بدل بھی حرام کر دیتا ہے۔ واللہ أعلم بالصواب کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۲/ صفر ۱۳۱۴ھ)

نومسلم کے ساتھ کھانا پینا:

سوال بادیہ قوم کو، جو ملکِ بنگال میں آباد ہیں، مسلمان بنا کر ان کے ساتھ کھانا پینا کیسا ہے اور مسلمان بنانے والا اسلام سے خارج ہو جائے گا یا مستحقِ ثواب ہوگا؟

جواب بادیہ قوم کو مسلمان کرنے کی وجہ سے مسلمان کرنے والے اور اُن نومسلموں کے ساتھ کھانے پینے والے ازروے شرع شریف پکے اور عمدہ مسلمان ہیں اور وہ اس وجہ سے دین مسلمانی سے نکل تو کیا جائیں گے، بلکہ اسلام میں بہت کچھ ترقی کر گئے۔ اس لیے کہ شرع شریف کا یہ قانون ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو کسی اچھے کام کی ہدایت کرتا ہے تو جتنے لوگ اس ہدایت کی پیروی کرتے ہیں، ان سب کے ثواب کے برابر اس ہدایت کرنے والے کو ثواب ملتا ہے اور ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم نہیں کیا جاتا۔ (دیکھو: مشکوۃ شریف، چھاپہ دہلی انصاری، ص: ۲۱)[1]

تو اس قانون کی رُو سے جن مسلمانوں نے بادیہ قوم کو اسلام کی ہدایت کی اور وہ قوم ان کی ہدایت سے مسلمان ہوگئی اور اپنے ان ناجائز افعال سے جو قبل اسلام کے کرتے تھے، تائب ہوگئی اور ان افعال کو ترک کر دیا، اس قوم کے مسلمان ہو جانے اور ناجائز افعال سے تائب ہو جانے کا جس قدر ثواب ہوا، ان سب کے ثواب کے برابر ان مسلمان کرنے والوں کو ثواب ملا تو ان مسلمان کرنے والوں نے مسلمان کرنے کی وجہ سے اپنے اسلام میں بہت کچھ ترقی کی۔ قومِ بادیہ یا اور کسی قوم کو مسلمان کرنے سے دینِ اسلام میں کسی قسم کے عیب ونقص کا داغ نہیں لگ سکتا، بلکہ قرآن مجید میں خدائے پاک نے ہمارے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو دینِ اسلام کی طرف کل آدمیوں کو بلانے اور اس کی منادی کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ (دیکھو: قرآن مجید، سورت اعراف، رکوع: ۱۹، پارہ: ۹)[2]

از روئے قانونِ اسلام کے درباب مسلمان کرنے کے کسی قوم کی تخصیص نہیں ہے۔ قانونِ اسلام کی رو سے ہر قوم اور ہر شخص اسلام میں داخل ہوسکتا ہے اور اسلام کی نعمتوں اور برکتوں کو پا سکتا ہے۔ (دیکھو: قرآن مجید، سورت بقرہ، رکوع: ۸، پارہ: ۱)[3] اور بھی قرآن میں یہ فرمایا ہے کہ کل آدمی ایک مرد اور ایک عورت سے بنائے گئے ہیں اور یہ فرمایا ہے

---

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٦٧٤) نیز دیکھیں: مشكاة المصابيح (۱/ ۳٤)

② ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ [الأعراف: ۱۵۸]

[کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، وہ (اللہ) کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اس کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، پس تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر ایمان لاؤ، جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت پاؤ]

③ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

کہ ان میں سے جو جتنا ہی خدائے پاک سے ڈرے گا، اتنا ہی خدائے پاک کے نزدیک وہ عزت پائے گا۔ (دیکھو قرآن مجید، سورت حجرات، رکوع: ۲، پارہ: ۲۶)[1]

جو لوگ قومِ بادیہ کو مسلمان کرنے والوں اور ان کے ساتھ کھانے پینے والوں کو اس وجہ سے ستاتے اور ایذا پہنچاتے ہیں اور ان کو دینِ اسلام میں عیب لگانے والا اور اسلام کو نقصان پہنچانے والا کہتے ہیں، قانونِ اسلام کے سراسر خلاف کرتے ہیں اور دائرہ اسلام کو، جو نہایت وسیع ہے، تنگ بنانا چاہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بادیہ قوم کو مسلمان کرنے والوں نے تو ان کے مسلمان ہونے کے بعد ان کا کھانا پانی کھایا پیا ہے، جبکہ حنفی مذہب میں تو چمار، ڈوم، مُسہر وغیرہ جو مردار اور حرام خور قومیں ہیں، ان کے ہاتھ کا کھانا پینا عین ان کے کفر کی حالت میں جائز ہے اور علمائے حنفیہ نے اس کا فتویٰ دیا ہے، جیسا کہ مجموعہ فتاویٰ (جلد اول، صفحہ: ۱۸۰، مطبوعہ شوکۃ الاسلام) میں مولوی عبدالحی لکھنوی مرحوم نے لکھا ہے، چنانچہ اس کی عبارت بعینہٖ ناظرین کے واسطے پیش کی جاتی ہے:

''کیا فرماتے ہیں علمائے شریعت محمدیہ اس صورت میں کہ قوم مُسہر یا ڈوم یا چمار یا دوساد جو ہندو کافر مردار خوار ہوتی ہیں اور اکثر چیزیں حرام مثل چوہا اور ملا اور ضب اور گوہ اور کیکڑا وغیرہ کو کھایا کرتے ہیں، ان کے یہاں کی چیزیں از قسم حلال پکی ہوئی کھانا یا ان کے ہاتھ کا پانی کنویں یا دریا سے نکالا ہوا پینا کہ جس میں کوئی شبہہ تلویث اشیاے حرام یا نجاست وغیرہا کا نہ ہو، شرعاً ممنوع ہے یا جائز اور ان کے ہاتھ سے چھوئی ہوئی روٹی مسلمانوں کو کھانا روا ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

''ھو المصوب: جب تک کوئی نجاست ظاہری یقیناً اعضائے ظاہرہ کافر پر نہ ہو، اس کے ہاتھ سے کھانا پکوانا یا پانی نکلوانا، یہ سب درست ہے، بوجہ اس کے کہ نجاست کافر کی صرف اعتقادی ہے، نہ ظاہری، جیسا کہ بحر رائق میں ہے:

''لما أنزل النبي ﷺ بعض المشركين في المسجد، وأمكن من المبيت فيه، على ما

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرة: ٦٢]

[بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور نصاریٰ اور صابی، جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے]

[1] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ [الحجرات: ١٣]

[اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادے سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقوے والا ہے، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے]

في الصحيحين، علم أن المراد بقوله تعالىٰ: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ النجاسة في اعتقادهم"[1]

[چوں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بعض مشرکین کو مسجد میں رکھا اور انھیں وہاں رات گزارنے کی اجازت دی، جیسا کہ صحیحین میں مذکور ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ میں مشرکین کی اعتقادی نجاست مراد ہے]

اور بھی اس میں ہے:

"سؤر الآدمي... طاهر...، لا فرق بين الجنب والطاهر، والحائض والنفساء، والصغير والكبير، و المسلم و الكافر، و الذكر و الأنثى... يعني أن الكل طاهر وطهور من غير كراهة"[2] انتهى

[انسان کا جھوٹا پاک ہے، اس سلسلے میں جنبی اور غیر جنبی، حیض اور نفاس والی عورت، بڑا اور چھوٹا، مسلمان اور کافر اور مرد وعورت میں کوئی فرق نہیں ہے، یعنی سارے کا سارا کسی کراہت کے بغیر پاک اور پاک کرنے والا ہے]

حرره الراجي عفو ربه القوي أبو الحسنات محمد عبد الحي، تجاوز الله عن ذنبه الخفي والجلي.

پس اس فتوے سے صاف واضح ہوگیا کہ حنفیہ کے نزدیک ہنود کا کھانا، خواہ وہ کسی قوم کا ہو، حالتِ کفر میں جائز ہے، پھر جب اس حالت میں جائز ہوا تو بعد اسلام کے اس کے جواز میں کس ذی شعور کو کلام ہوگا؟ اگر خوف طوالت کا نہ ہوتا تو بہت سی عبارتیں فقہائے احناف کی پیش کی جاتیں۔

فقط: المجیب ابو الفیاض محمد عبد القادر اعظم گڑھی مولوی مدرس مدرسہ احمدیہ آرہ۔



[1] البحر الرائق (١/ ١٣٣)

[2] المصدر السابق.

كتاب اللباس والزينة

کیا بے پردہ محرم عورتوں کی تیمار داری کرنا درست ہے؟

سوال کیا ایسی محرم عورتوں کی تیمار داری کرنا درست ہے، جو مکمل حجاب نہیں کرتیں؟

جواب ماں بہن یا عزیزوں کی عورتیں اگر ایسا لباس پہنتی ہوں، جس سے ان کے وہی اعضا کھلے رہتے ہوں، جن کا دیکھنا اس شخص کو جائز ہے تو خدمت یا مزاج پرسی کے لیے ان کے پاس جائے۔ اگر ایسے اعضا بھی کھلے رہتے ہوں، جن کا دیکھنا اس شخص کو ناجائز ہے تو اگر خدمت یا مزاج پرسی بغیر اُن کے پاس گئے ہوئے یا پاس جا کر بغیر ان کے اعضا کے دیکھے ہوئے کرسکتا ہے تو بھی ان کی خدمت یا مزاج پرسی کرنی جائز ہے اور اگر بغیر ان اعضا کے دیکھے ہوئے نہیں کرسکتا تو ناجائز ہے۔

محرم اور غیر محرم کون کون سے افراد ہیں؟

سوال ہند میں عام طور سے یہ رواج ہے کہ بہن حقیقی یا بیٹی سگی یا سگی پتوہ یعنی سگے بیٹے کی جورو یا سوتیلی ماں اپنے بھائی یا اپنے باپ اپنے یا خسر یا اپنے بیٹے کے سامنے ہوتے ہیں اور وہ ان کو کھانا کھلاتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں، یہ شرعاً درست ہے یا نہیں اور محرم عورتوں کے کون لوگ ہیں اور غیر محرم کون ہیں اور احتیاطاً اگر محرم کے سامنے بھی نہ ہوں تو شرعاً کیسا ہے؟ بخاری شریف میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

إن رسول الله ﷺ قال: «إياكم والدخول علىٰ النساء» فقال رجل من القوم: يا رسول الله ﷺ! أفرأيت الحمو؟ قال: «الحمو الموت»

[بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورتوں کے پاس جانے سے بچو۔'' لوگوں میں سے کسی آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! دیور کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دیور موت ہے]

اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ از روئے لغت کے زوج کا باپ بھی داخل ہے اور قرآن شریف میں زوج کا باپ داخل محارم ہے تو حدیث و آیت میں کیا مطابقت ہوگی؟

جواب بہن حقیقی اور سگی بیٹی اور سگی پتوہ اور سوتیلی ماں کو اپنے بھائی اور باپ اور خسر اور سوتیلے بیٹے کے سامنے ہونا شرعاً درست ہے۔

لقوله تعالىٰ: ﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ﴾ الآية [سورۂ نور، رکوع: ٤]

[اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں، مگر اپنے خاوندوں کے لیے، یا اپنے باپوں، یا اپنے خاوندوں کے باپوں، یا اپنے

بیٹوں، یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں (کے لیے)]

جس چیز کا جواز و اباحت شرع شریف سے بلا اشتباہ ثابت ہو اور شارع کی طرف سے اس میں احتیاط کرنے کو نہ فرمایا گیا ہو، اس سے احتیاط کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

عن عائشة رضي الله عنها قالت: صنع رسول الله ﷺ شيئاً فرخص فيه فتنزه عنه قوم، فبلغ ذلك رسول الله ﷺ فخطب، فحمد الله ثم قال: «ما بال أقوام يتنزهون عن الشيئ أصنعه، فو الله إني أعلمهم بالله وأشدهم له خشية»[1] (متفق علیه، مشکوة شریف، ص: ۲۷)

[سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی کام کیا، پھر آپ ﷺ نے اس میں رخصت دے دی تو کچھ لوگوں نے رخصت کو قبول کرنے سے اجتناب کیا، پس رسول اللہ ﷺ کو اس بارے میں پتا چلا تو آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی، پھر فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں، وہ اس سے دور رہتے ہیں، اللہ کی قسم! میں اللہ کے متعلق ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں]

عورتوں کے محرم وہ لوگ ہیں، جن سے ان عورتوں کا نکاح کبھی حلال نہیں۔ ''المحرم من لا يحل له نكاحها''[2] (مجمع البحار) [اور (عورتوں کے) محرم وہ ہیں، جن سے ان عورتوں کا نکاح کبھی حلال نہیں] لفظ ''حمو'' میں ازروئے لغت کے زوج کا باپ بھی داخل ہے اور سورہ نور کی آیتِ مذکورہ بالا سے حکمِ حدیث وہ مخصوص ہے۔ یہی آیت و حدیث میں مطابقت ہے۔

ٹوپی پر محمڈن برادر لکھنا اور اسے پہن کر بیت الخلاء جانا:

سوال ① ٹوپی پر محمڈن برادر لکھنا جائز ہے یا نہیں؟

② جس ٹوپی پر محمڈن برادر لکھا ہو، اس ٹوپی کو پہن کر پاخانہ جانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب ① ٹوپی پر محمڈن برادر لکھنے کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ ہاں صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ جو دعوت نامے اسلام کے کافر بادشاہوں کے پاس بھیجتے تھے، اُن پر مہر کر کے بھیجتے تھے، جس پر ''محمد رسول اللہ'' منقوش تھا نیز ان نامہ جات میں بسم الله الرحمن الرحيم اور قرآن مجید کی آیت لکھی ہوتی تھی۔ مشکوۃ (ص: ۳۷۰) میں ہے:

''عن أنس أن النبي ﷺ أراد أن يكتب إلى كسرى وقيصر والنجاشي فقيل: إنهم لا يقبلون كتابا إلا بخاتم فصاغ رسول الله ﷺ خاتما حلقة فضة نقش فيه محمد رسول الله»[3] (رواه مسلم)

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٦)

② مجمع بحار الأنوار للفتني (١/ ٢٥٧) طبع نول كشور.

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٩٢)

[انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے کسریٰ و قیصر و نجاشی کے نام خط لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ سے عرض کی گئی کہ وہ صرف سربمہر خط ہی وصول کرتے ہیں، تب رسول اللہ ﷺ نے چاندی کے حلقے کی انگوٹھی بنوائی، اس میں ''محمد رسول اللہ'' نقش کیا گیا]

صحیح بخاری (۱/۲۴ مصری) میں ہے:

''عن ابن عباس أن رسول اللهﷺ بعث بكتابه رجلا، وأمره أن يدفعه إلى عظيم البحرين فدفعه عظيم البحرين إلى كسرى فلما قرأه مزقه''[1]

[سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو خط دے کر روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ اسے سربراہ بحرین کے حوالے کر دے، چناں چہ سربراہ بحرین نے یہ خط کسریٰ کے حوالے کیا، جب اس نے پڑھا تو اس نے اسے چاق کر دیا]

خلیفہ عبدالملک نے خیر القرون خصوصاً قرنِ صحابہ کرام میں اشرفیاں جاری کی تھیں، ان پر قرآن مجید اور کلمہ طیبہ لکھا تھا اور خلیفہ مذکور کے اس فعل پر کسی صحابی یا تابعی کا انکار ثابت نہیں۔ ''تاريخ الخلفاء'' (ص: ۱۲۸) میں ہے:

''وقال يحيىٰ بن بكير: سمعت مالكا يقول: أول من ضرب الدنانير عبد الملك، وكتب عليها القرآن، وقال مصعب: كتب عبد الملك على الدنانير قل هو الله أحد، وفي الوجه الآخر: لا إلٰه إلا الله، وطوقه بطوق فضة، وكتب فيه: ضرب بمدينة كذا، وكتب خارج الطوق: محمد رسول الله، أرسله بالهدى ودين الحق''

[یحییٰ بن بکیر نے کہا ہے کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ سب سے پہلے عبدالملک رحمہ اللہ نے اشرفیاں جاری کی تھیں، ان پر قرآن مجید لکھا تھا۔ مصعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبدالملک رحمہ اللہ نے اشرفیوں کی ایک جانب ''قل هو الله أحد'' اور دوسری جانب ''لا إلٰه إلا الله'' لکھوایا تھا۔ اس کے گرد چاندی کا ایک حلقہ ہوتا تھا اور اس حلقے پر ٹکسال کے شہر کا نام اور حلقے سے خارج میں ''محمد رسول الله أرسله بالهدىٰ و دين الحق'' لکھا ہوتا تھا]

ٹوپیوں اور اشرفیوں میں جو ایک بہت بڑا فرق ہے، قابلِ لحاظ ہے، وہ یہ کہ ٹوپیاں صرف سر ہی پر رکھی جاتی ہیں اور اشرفیوں میں یہ قید نہیں ہے، بلکہ جہاں چاہے رکھے اور خلیفہ مذکور نے صدور طوامیر میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اور نبیِ کریم ﷺ کا ذکر مع تاریخ لکھنا جاری کیا تھا تو سلطانِ روم نے خلیفہ مذکور کو لکھ بھیجا تھا کہ اس فعل کو ترک کر دو، ورنہ ہم اپنی اشرفیوں پر بھی ایسی بات لکھیں گے، جو تم کو ناگوار ہوگی، مگر خلیفہ مذکور نے اس کو ترک نہ کیا، بلکہ بدستور جاری رکھا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤)

"تاريخ الخلفاء" (ص: ١٤٨) میں ہے:

"وفي الأوائل للعسكري بسنده كان عبد الملك أول من كتب في صدور الطوامير قل هو الله أحد، وذكر النبيﷺ مع التاريخ، فكتب ملك الروم إنكم قد أحدثتم في طواميركم شيئاً من ذكركم نبيكم فاتركوه وإلا أتاكم من دنانيرنا ذكر ما تكرهون، فعظم ذلك على عبد الملك فأرسل إلى خالد بن يزيد بن معاوية فشاوره فقال: حرم دنانيرهم، واضرب للناس سككا فيها ذكر الله وذكر رسوله، ولا تعفهم مما يكرهون في الطوامير، فضرب الدنانير للناس سنة خمس وسبعين" والله تعالىٰ أعلم

[عسکری کی "الأوائل" میں سند کے ساتھ روایت ہے کہ خلیفہ عبد الملک رحمہ اللہ وہ پہلا شخص ہے، جس نے صدور طوامیر پر "قل هو الله أحد" اور نبیِ کریم ﷺ کا ذکر مع تاریخ لکھنا شروع کیا تھا۔ سلطانِ روم نے خلیفہ مذکور کو لکھ بھیجا تھا کہ تم نے اپنی اشرفیوں پر اپنے نبی کا ذکر وغیرہ کیا ہے، لہٰذا تم اس فعل کو ترک کر دو، ورنہ تمھارے پاس ہماری اشرفیاں آئیں گی، جن پر اس چیز کا ذکر ہوگا جو تمھیں ناگوار گزرے گی۔ خلیفہ عبد الملک پر یہ بات بہت گراں گزری۔ اس نے خالد بن یزید بن معاویہ سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ ان کی اشرفیوں کو اپنے پاس آنے سے بند کر دو اور لوگوں کے لیے ایسے سکے جاری کرو، جن میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر ہو اور جن طوامیر کو وہ ناپسند کرتے ہیں ان کو بند نہ کرو۔ چناں چہ سنہ پچھتر (۷۵) ہجری میں لوگوں کے لیے اشرفیاں جاری کی گئیں]

② جس ٹوپی پر محمڈن برادر لکھا ہو، اس ٹوپی کو پہن کر پائخانہ میں جانے کے ناجائز ہونے کی کوئی صحیح وجہ معلوم نہیں ہوتی اور یہ جو حدیث ہے کہ "كان النبيﷺ إذا دخل الخلاء نزع خاتمه"[1] یعنی جب نبی ﷺ پاخانہ جاتے تو اپنی انگشتری مبارک کو (جس میں محمد رسول اللہ ﷺ منقوش تھا) اتار دیتے تھے۔ سو اس حدیث سے ٹوپی مذکور کو پہن کر پاخانہ میں جانے کی ناجوازی پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

اولاً: اس وجہ سے کہ اس کو ابو داود نے منکر اور نسائی نے غیر محفوظ کہا ہے اور حدیث منکر اور غیر محفوظ مقبول حدیثوں میں نہیں اور جن ائمہ حدیث نے اس کی تصحیح کی ہے، جیسے ترمذی اور حاکم وہ لوگ بابِ تصحیحِ احادیث میں تساہل مشہور ہیں۔

ثانیاً: اس وجہ سے کہ اس حدیث کی اسناد میں ایک راوی "ابن جریج" مدلس ہیں اور انھوں نے اس حدیث کو زہری سے عن کے ساتھ روایت کیا ہے اور راوی مدلس کی معنعن حدیث حجت نہیں۔ "نزهة النظر" میں ہے:

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٤٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٢١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٣)

"وحكم من ثبت عنه التدليس إذا كان عدلا أن لا يقبل منه إلا ما صرح فيه بالتحديث على الأصح"[1]

[صحیح قول کے مطابق مدلس راوی جب عادل ہو تو اس کی صرف وہی روایت مقبول ہوگی جس میں وہ "حدثنا" وغیرہ کے ساتھ (اپنے سماع کی) تصریح کرے]

ثالثاً: اس وجہ سے کہ نام کی عظمت مسمی کی عظمت کی فرع ہے اور جب نبیِ کریم ﷺ بنفس نفیس پاخانہ میں تشریف لے جاتے تھے اور اس سے آپ کی عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا تھا تو اس انگشتری کے پاخانہ میں لے جانے سے، جس میں آپ کا نام مبارک منقوش تھا، عظمت میں کیا فرق آ سکتا ہے؟ ان وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حدیث کی صحت محلِ نظر ہے۔ كتبه: محمد عبد الله (٢/ جمادي الثاني ١٣٣٢هـ)

ڈاڑھی کی شرعی حیثیت:

سوال ڈاڑھی رکھنا سنت ہے یا فرض؟ اگر سنت ہے تو موکدہ یا غیر موکدہ اور ڈاڑھی مونڈانا کس حدیث سے آپ ناجائز ٹھہراتے ہیں اور ڈاڑھی رکھنا کس حدیث سے یا قرآن کی آیت سے اور ڈاڑھی مونڈانے والا کیا ہوا: بدعتی ہے یا فاسق؟ اس کا جواب حضور بہت جلد مدلل اور مع ثبوت اور ساتھ زور آور تقریر کے بہت جلد روانہ فرمائیں۔ آپ کی شفقت سے امید ہے کہ اس میں اغماض نہ کیجیے گا۔

جواب ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور ڈاڑھی منڈانا حرام ہے۔ حدیث متفق علیہ میں ڈاڑھی رکھنے کے بارے میں امر کا صیغہ وارد ہے۔ مشکوۃ شریف (ص: ۳۷۲ چھاپہ دہلی) میں ہے:

عن ابن عمر قال: قال رسول اللهﷺ: « خالفوا المشركين، وفروا اللحىٰ وأحفوا الشوارب»[2] (متفق عليه)

"ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مشرکین کی مخالفت کرو، ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں ترشواؤ۔"

اس مضمون کی حدیثیں اور بھی آئی ہیں اور امر کا صیغہ وجوب کے لیے آتا ہے اور وجوب ہی اس کے حقیقی معنی ہیں۔ جس لفظ کے جو حقیقی معنی ہیں، اس کو چھوڑ کر بلا قرینہ دوسرے معنی جو غیر حقیقی ہیں، مراد لینا جائز نہیں ہے۔ كما تقرر في الأصول. تو ثابت ہوا کہ ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور جو فعل واجب ہو، اس کا خلاف حرام ہوتا ہے۔ كما تقرر في الأصول أيضاً. تو ڈاڑھی منڈانا جو فعل واجب، یعنی ڈاڑھی رکھنے کے خلاف ہے، حرام ہے اور حرام کا مرتکب فاسق ہوتا ہے تو ڈاڑھی منڈانے والا فاسق ہے۔ والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

---

[1] نزهة النظر (ص: ١٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥)

عورتوں کا پاؤں میں پھول کا کڑا پہننا:

سوال دونوں پاؤں میں پھول کا کڑا پہننا عورتوں کو جائز ہے یا نہیں اور حدیث شریف سے اس کا وجود ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کون سی روایت وحدیث سے ثابت ہے؟

جواب عورتوں کو پھول کا کڑا پہننا، اس کے منع کے بارے میں کوئی آیت یا صحیح حدیث وارد نہیں ہے تو حسبِ آیت کریمہ: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ﴾ [سورۂ أعراف، رکوع: ٤][تو کہہ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی] اس کا پہننا جائز ہوگا۔ واللّٰه أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللّٰه

سدل کیا ہے؟

سوال زید ایک ڈوپٹہ اس طرح ڈالتا ہے کہ ایک سرا آگے لٹکا تا ہے اور دوسرا سرا بائیں ہاتھ کے نیچے سے لے جا کر داہنے شانہ پر پیچھے کی جانب لٹکا لیتا ہے۔ نماز بھی اسی طرح پڑھتا ہے۔ عمرو کہتا ہے کہ یہ سدلِ ثوب ہے، جو مکروہ ہے۔ زید کا قول ہے کہ اس پر سدلِ ثوب کی تعریف صادق نہیں آتی ہے اور احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ حضور ﷺ نے ملتحفاً نماز پڑھی ہے۔ شمائل میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث چادر اوڑھنے میں جو مروی ہے، نفس اس امر کو کہ ایک سرا آگے کی جانب اور دوسرا پیچھے کی جانب لٹکانے میں شامل ہے۔ پس امر استفسار طلب یہ ہے کہ سدل کی عند الفقہاء کیا تعریف ہے اور یہ امر سدل ہے یا نہیں؟

جواب ① سدل کی تعریف عند الفقہاء حسبِ ذیل ہے:

في الهداية: "هو أن يجعل ثوبه على رأسه أو كتفيه، ثم يرسل أطرافه من جوانبه"[1] اهـ

[ہدایہ میں ہے: (سدل یہ ہے کہ) وہ اپنا کپڑا اپنے سر یا کندھوں پر رکھے، پھر اس کے کناروں کو (بغیر ملائے) چھوڑ دے]

وفي شرح الوقاية نقلًا عن المغرب: "هو أن يرسله من غير أن يضم جانبيه"[2] اهـ

[شرح وقایہ میں مغرب سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ (سدل) یہ ہے کہ اس کے کناروں کو ملائے بغیر چھوڑ دے]

وفي العالمگيرية: "هو أن يجعل ثوبه على رأسه أو كتفيه فيرسل جوانبه"[3] اهـ

[فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (سدل یہ ہے کہ) وہ اپنا کپڑا اپنے سر یا اپنے کندھوں پر اس طرح رکھے کہ اس کے کناروں کو کھلا چھوڑ دے]

وفي رد المحتار نقلًا عن البحر الرائق: "وفسره الكرخي بأن يجعل ثوبه على رأسه

---

[1] الهداية (١/ ٦٤)
[2] شرح الوقاية (١/ ١٤٣)
[3] الفتاوىٰ الهندية (١/ ١٠٦)

أو على كتفيه، ويرسل أطرافه من جانبيه إذا لم يكن عليه سراويل" [1] اهـ

[ردالمحتار میں البحر الرائق سے نقل کیا گیا ہے: کرخی نے اس (سدل) کی تفسیر یہ کی ہے کہ وہ کپڑا اپنے سر یا اپنے کندھوں پر رکھے اور اس کے کناروں کو (ملائے بغیر) چھوڑ دے اور وہ پائجامہ نہ پہنے ہوئے ہو]

حاصل ان عبارات کا یہ ہے کہ سدل یہ ہے کہ چادر یا ڈوپٹہ یا دوسرا کپڑا سر یا شانے پر رکھ کر اس کے اطراف کو بغیر ملائے ہوئے چھوڑ دیں۔ کرخی نے سدل کی تعریف میں ایک قید اور بڑھائی ہے، وہ یہ ہے کہ پائجامہ نہ پہنے ہوں، تب امر مذکورہ بالا سدل ہوگا اور اگر پائجامہ پہنے ہوئے ہوں تو امر مذکورہ بالا سدل نہ ہوگا۔

2 صورتِ مذکورہ سوال سدل میں داخل نہیں ہے۔ سدل میں کپڑے کے اطراف کا نہ ملانا بھی شرط ہے، جیسا کہ تعریفِ سدل سے، جو بالا مذکور ہوئی، واضح ہوا اور صورتِ مسئولہ میں جب ڈوپٹہ کا ایک سرا آگے لٹکایا گیا اور دوسرا سرا بائیں ہاتھ کے نیچے سے لے جا کر داہنے شانہ پر پیچھے کی جانب لٹکایا گیا تو دونوں طرف اس کے مل جائیں گے۔ واللّٰہ أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

سوال أيكره للمصلي أن يجعل الثوب تحت إبطه الأيمن، ويطرح جانبيه على عاتقه الأيسر أم لا؟

[کیا نمازی کے لیے اپنا کپڑا دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر اس کے کنارے کو بائیں کندھے پر ڈالنا مکروہ ہے یا نہیں؟ [2]]

جواب لا يكره ذلك، لأنه ليس مما عد مما يكره في الصلاة وأما القول بأنه من قبيل سدل الثوب فليس بصحيح، لأن سدل الثوب يشترط فيه عدم ضم جانبيه، وفي الصورة المذكورة في السؤال ليس كذلك، فإن المصلي لما جعل ثوبه تحت إبطه الأيمن، وطرح جانبيه على عاتقه الأيسر فقد ضم جانبيه لا محالة. قال في شرح الوقاية نقلا عن المغرب هو (أي سدل الثوب) أن يرسله من غير أن يضم جانبيه. [3] اهـ والله أعلم بالصواب.

[یہ مکروہ نہیں ہے، کیوں کہ اس عمل کو نماز کے مکروہات سے شمار نہیں کیا گیا، رہا اس عمل کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ سدلِ ثوب کے مفہوم میں ہے تو یہ درست نہیں ہے، کیوں کہ سدل میں شرط یہ ہے کہ اس کے کناروں کو ملائے بغیر چھوڑ دیا گیا ہو، جب کہ مذکورہ بالا سوال میں ایسی صورت نہیں ہے۔ نمازی نے جب اپنا کپڑا اپنی دائیں بغل کے نیچے رکھا اور اس کا کنارا بائیں کندھے پر ڈال دیا تو لازمی طور پر اس نے کپڑے کے کناروں کو ملا دیا۔ شرح وقایہ میں مغرب سے نقل کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ سدلِ ثواب یہ ہے کہ کپڑے کو اس کے کناروں کو ملائے بغیر لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جائے] كتبه: محمد عبد الله

---

1 رد المحتار (۱/ ٦٣٩)

2 اس صورت میں اگر دایاں کندھا ننگا رہے تو ایسی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے کہ نمازی کے کندھے پر کوئی کپڑا نہ ہو۔ دیکھیں: سنن النسائي، رقم الحديث (٧٦٩)

3 شرح الوقاية (١/ ١٤٣)

کتاب الأدب

ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا:

سوال مصافحہ کرنا آنحضرت ﷺ سے یا کسی صحابی سے ایک ہاتھ سے ثابت ہے یا دونوں ہاتھ سے؟

جواب مصافحہ کے اصلی معنی صرف ہاتھ سے ہاتھ ملانے کے ہیں اور لغت کی کسی کتاب سے ثابت نہیں ہے کہ مصافحہ کے اصلی معنی میں ہر ایک جانب سے دونوں ہاتھوں کا ملانا بھی شرط ہے اور نہ کسی آیت یا حدیث سے یہ شرط ثابت ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص اس کا مدعی ہے کہ مصافحہ شرعی میں یہ شرط معتبر ہے، وہ اس امر کا مدعی ہے کہ شارع نے اس لفظ کو اس کے اصلی معنی سے دوسرے معنی کی طرف نقل کیا ہے اور اصل معنی پر یہ شرط اضافہ کیا ہے اور نقل خلافِ اصل ہے اور مدعی خلافِ اصل پر بارِ ثبوت ہوتا ہے تو مدعی مذکور پر اس شرط کا بارِ ثبوت ہے۔

یعنی جو شخص اس امر کا مدعی ہے کہ مصافحہ شرعی میں شرط مذکور معتبر ہے، اس پر اس شرط کا اِثبات کسی آیت یا حدیث سے واجب ہے۔ ورنہ اس کا دعویٰ غیر ثابت رہے گا اور اس شرط کے منکر کو اس سے زیادہ کچھ کہنا ضرور نہیں کہ کتبِ لغت، جو الفاظ کے اصلی معنی بتانے کے لیے موضوع ہیں، وہ کل اس شرط کے ذکر سے خالی ہیں اور شارع سے یہ شرط ثابت نہیں اور اصول میں یہ مقرر ہے کہ جب تک نقل ثابت نہ ہو، لفظ اپنے اصلی معنی پر محمول ہوگا تو حسبِ اصول لفظِ مصافحہ جو احادیث میں وارد ہے، اپنے اصل معنی پر محمول ہوگا اور اس صورت میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا مصافحہ بمعنی اصلی ثابت ہوگا، جس میں دونوں ہاتھوں کے ملانے کی شرط نہیں ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

سوال مصافحہ میں دونوں ہاتھوں کا شمول ضرور ہے یا نہیں اور نہیں ہے تو ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے کی کیا دلیل ہے؟

جواب مصافحہ ایک ہاتھ سے، بلکہ دائیں ہاتھ سے تو متفق علیہ ہی ہے، اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف ہے تو صرف اس میں ہے کہ مصافحہ میں بائیں ہاتھ کا شمول بھی ضرور ہے یا نہیں؟ جو کہتا ہے کہ ضرور ہے، وہی مدعی ہے، اس دعویٰ کا بارِ ثبوت اسی کے ذمہ ہے اور جو کہتا ہے ضرور نہیں ہے۔ وہ منکر ہے اور منکر کے ذمہ بارِ ثبوت نہیں ہوتا۔ تاہم منکر کی طرف سے دلیل حسبِ ذیل ہے:

1 شرع شریف کا یہ ایک مستمر قانون ہے کہ جو امور کہ از بابِ تکریم وتشریف ہوں، وہ دائیں ہاتھ سے کیے جائیں اور جو امور کہ تکریم وتشریف کے خلاف ہوں، وہ بائیں سے کیے جائیں اور مصافحہ از قسم اول ہے، پس مصافحہ بحکم قانون مذکور دائیں ہاتھ سے کیا جائے۔

قانونِ مذکور کو امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں زیرِ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا: «إن كان رسول الله ﷺ ليحب التيمن في طهوره إذا تطهر، وفي ترجله إذا ترجل، وفي انتعاله إذا انتعل» وفي رواية: «يحب التيمن في شأنه كله»[1] الحديث. [بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات پسند تھی کہ جب وضو کریں تو دائیں طرف سے شروع کریں اور جب کنگھی کریں تو دائیں طرف سے کنگھی کرنا شروع کریں اور جوتا پہنیں تو پہلے دایاں جوتا پہنیں۔" اور ایک روایت میں ہے کہ "آپ ﷺ دوسرے تمام کاموں میں بھی دائیں طرف سے شروع کرنا پسند فرماتے تھے] بوضاحتِ تمام تحریر فرمایا ہے۔ عبارت شرح صحیح مسلم کی یہ ہے:

"هذه قاعدة مستمرة في الشرع، وهي إن ما كان من باب التكريم والتشريف كلبس الثوب والسراويل والخف، ودخول المسجد، والسواك، والاكتحال، وتقليم الأظفار، وقص الشارب، وترجيل الشعر، وهو مشطه، ونتف الإبط، وحلق الرأس، والسلام من الصلاة، وغسل أعضاء الطهارة، والخروج من الخلاء، والأكل، والشرب، والمصافحة، واستلام الحجر الأسود، وغير ذلك مما هو في معناه، يستحب التيامن فيه، وأما ما كان بضده كدخول الخلاء، والخروج من المسجد، و الامتخاط والاستنجاء، وخلع الثوب والسراويل والخف، وما أشبه ذلك فيستحب التياسر فيه، وذلك كله لكرامة اليمين وشرفها"[2] انتهى

[یہ شرع میں ایک مستقل قاعدہ ہے کہ جو کام تکریم و تشریف کے باب سے ہوں، جیسے شلوار، قمیص اور موزے پہننا، مسجد میں داخل ہونا، مسواک کرنا، سرمہ لگانا، ناخن تراشنا، مونچھیں کاٹنا، بالوں میں کنگھی کرنا، بغلوں کے بال اُکھاڑنا، سر مونڈھنا، نماز میں سلام پھیرنا، اعضاے وضو کو دھونا، بیت الخلا سے نکلنا، کھانا، پینا، مصافحہ کرنا، حجرِ اسود کا استلام کرنا اور ان کے علاوہ کام جو اس قسم کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں، ان میں دائیں طرف سے شروع کرنا پسندیدہ ہے اور جو کام ان کے برعکس ہوں، جیسے بیت الخلا میں داخل ہونا، مسجد سے نکلنا، ناک صاف کرنا، استنجا کرنا، شلوار، قمیص اور موزے اتارنا اور جو اس قسم کے دیگر کام ہیں، ان کو بائیں ہاتھ (اور جانب) سے کرنا مستحب ہے۔ یہ سب کچھ دائیں ہاتھ (اور جانب) کی کرامت و شرف کے سبب سے ہے]

اس قانونِ شرع کو حضرت سیدی شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ نے بھی "غنية الطالبين" میں ذکر فرمایا ہے۔ "غنية الطالبين" کی عبارت یہ ہے:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ١٦٠)

"فصل فيما يستحب فعله بيمينه، وما يستحب فعله بشماله، يستحب له تناول الأشياء بيمينه، والأكل، والشرب، والمصافحة (إلى قوله) وأما الشمال فلفعل الأشياء المستقذرة وإزالة الدرن كالاستنثار والاستنجاء وتنقية الأنف، وغسل النجاسات كلها" (ص: ٥٢)

[ان کاموں کے بارے میں فصل جن کو دائیں ہاتھ سے کرنا مستحب ہے اور جن کو بائیں ہاتھ سے کرنا مستحب ہے۔ اشیا کو لینا دینا، کھانا، پینا اور مصافحہ کرنا دائیں ہاتھ سے مستحب ہے... رہا بایاں ہاتھ تو وہ اشیاے مستقذرہ، میل اتارنے، جیسے ناک جھاڑنے، استنجا کرنے، ناک صاف کرنے اور تمام نجاستوں کو صاف کرنے کے لیے ہے]

۲ مصافحہ عند اللقاء کے معنی ہیں ایک شخص کا اپنی ہتھیلی کو دوسرے کی ہتھیلی کے ساتھ ملانا۔

"لسان العرب" میں ہے:

"الرجل يصافح الرجل إذا وضع صفح كفه في صفح كفه، وصفحا كفيهما وجهاهما، ومنه حديث المصافحة عند اللقاء"[1] انتهى

[آدمی دوسرے آدمی سے مصافحہ کرنے والا اس وقت شمار ہوتا ہے جب وہ اپنی ہتھیلی دوسرے کی ہتھیلی کے ساتھ ملاتا ہے۔ جب وہ دونوں اپنی ہتھیلیوں کے چہرے ایک دوسرے سے ملاتے ہیں اور ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے والی حدیث اسی سے ہے]

یہ ظاہر ہے کہ مصافحہ کے یہ معنی متصافحین کے ایک ایک ہاتھ کے ملا لینے سے حاصل ہو جاتے ہیں، اس معنی کے حصول میں ہر ایک کے دونوں ہاتھوں کے ملانے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳ اگر متصافحین میں سے ہر ایک اپنے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملائیں تو اگر مقراضی طور پر ملائیں تو مصافحہ دوہرا ہو جاتا اور دو مصافحہ کا ثبوت ایک ملاقات کے وقت کہیں سے نہیں ہوتا اور اگر مقراضی طور پر نہ ملائیں تو ہر ایک کے بائیں ہاتھوں کو مصافحہ بمعنی مذکور میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ واللّٰه تعالیٰ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللّٰه (۱/ صفر ۱۳۲۷ھ)

سوال ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا موافق سنت کے ہے یا نہیں؟

جواب ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا موافق سنت کے ہے، اس واسطے کہ مصافحہ کے معنی لغت میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے کے ہیں۔ منتہی الارب میں ہے:

''مصافحہ دست یک دیگر را گرفتن'' [مصافحہ کا معنی ہے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنا]

---

[1] لسان العرب (۲/ ۵۱۲)

قاموس میں ہے: "المصافحة الأخذ باليد كالتصافح"[1] [مصافحہ کا معنی ہے ہاتھ پکڑنا، جیسے تصافح لفظ ہے] اس میں شرعاً کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں کہ دونوں ہاتھ کی شرط ہے، پس جب لغت سے مصافحہ کے معنی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے کے ثابت ہوئے، اس سے دونوں ہاتھ کی قید ثابت نہیں ہوئی اور شرعاً بھی اس میں ہر جانب سے دو ہاتھ کی شرط کا ثبوت نہیں تو ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا موافق سنت کے ہوگا اور ہر جانب سے دو ہاتھ کی شرط بے دلیل ہوگی۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

نومسلموں کے ساتھ برتاؤ:

سوال آنحضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، ان کے ساتھ آنحضرت ﷺ اور نیز اس وقت کے موجودہ مسلمان ان نومسلموں سے کیسا برتاؤ فرماتے تھے اور نومسلموں کو کیا حکم ہوتا تھا؟

جواب اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں میں (خواہ قدیم الاسلام ہوں یا نومسلم) یہی ایک رشتہ قائم فرما دیا ہے کہ ہر ایک دوسرے کے بھائی برادر ہیں، اس کے سوا مسلمانوں میں اور کوئی دوسرا رشتہ قائم نہیں فرمایا ہے۔ سورۂ حجرات میں فرمایا ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحجرات: ١٠] یعنی تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی برادر ہیں۔

ہاں فرق بتایا ہے تو صرف اس بات میں بتایا ہے کہ جس مسلمان میں جتنا تقویٰ زیادہ ہوگا، اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک عزت میں بڑا ہوگا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: ١٣] یعنی یہ بات بلاشک ہے کہ تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہی ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے۔ اور ایسا ہی آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے۔ مشکوۃ (ص: ۴۰۹) میں ہے: عن أبي هريرة قال: سئل رسول الله ﷺ أي الناس أكرم؟ قال: «أكرمهم عند الله أتقاهم»[2] (متفق عليه) [ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: لوگوں میں سب سے زیادہ معزز شخص کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان میں اللہ کے ہاں زیادہ معزز شخص وہ ہے جو ان میں سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہے] نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

«إن الله أوحى إلي أن تواضعوا حتى لا يفخر أحد على أحد»[3]

(رواه مسلم، مشكوة، ص: ٤٠٩)

[بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم تواضع اختیار کرو، حتی کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے]

نیز مشکوۃ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

« إن الله أذهب عنكم عبية الجاهلية، وفخرها بالآباء، إنما هو مؤمن تقي أو فاجر

---

[1] القاموس المحيط (ص: ٢٢٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥)

شقي، الناس كلهم بنو آدم، و آدم من تراب» [1] (رواه أبو داود والترمذي)

[یقیناً اللہ نے آبا و اجداد پر تمھارے جاہلی فخر و غرور کو ختم کر دیا ہے، بس وہ (فخر کرنے والا) مومن متقی ہے یا فاجر بدبخت، تمام لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے (پیدا ہوئے) ہیں]

اور بھی مشکوۃ (ص: ۴۱۰) میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: «ليس لأحد على أحد فضل إلا بدين و تقوىٰ» [2] واللہ تعالیٰ أعلم. [دین اور تقوے کے علاوہ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں]

کتبہ: محمد عبد اللہ (١٦/ شعبان ١٣٣١ھ)

سلام کرنے کا مسنون طریقہ:

سوال سلام علیک بشرع شریف بچہ گونہ جائز ست و اتباع کسے بزرگ و ولی بخلاف قول حق وفعل آنحضرت ﷺ و استدلال آوردن از آن بکدامی مسائل چہ حکم دارد جائز ست یا نہ و بہنگام گفتن السلام علیکم پشت خم کردن و دست برداشتن تا سینہ یا تا پیشانی و یکے را ازینہا لازم و ملزوم دانستن و بجہت اظہار عجز و تعظیم آداب و بندگی را ترجیح دادن و سلام علیک را معیوب و مسلم را متکبر پنداشتن جائز ست یا نہ؟ بينوا مستندين بالكتاب تؤجروا عند الله بحسن المآب.

[سوال: شرع شریف میں سلام علیک کس طرح سے کرنا جائز ہے؟ قولِ حق اور فعلِ رسول ﷺ کے برخلاف کسی بزرگ یا ولی کا اتباع کرنا اور ان سے استدلال کرنا کن مسائل میں کیا حکم ہے، جائز ہے یا نہیں؟ السلام علیکم کہتے وقت کمر کو جھکانا اور ہاتھ کو سینے یا پیشانی تک اٹھانا اور ان میں سے کسی کو لازم و ملزوم ٹھہرانا، عجز و تعظیم کے اظہار میں آداب و بندگی کو ترجیح دینا اور سلام علیک کو معیوب اور سلام کرنے والے کو متکبر خیال کرنا جائز ہے یا نہیں؟]

جواب اتباع کسے بخلاف قول و فعل آنحضرت ﷺ ہرگز جائز نیست چہ او تعالیٰ ہمہ کس را کہ او تعالیٰ را دوست دارد مامور باتباع آنحضرت ﷺ فرمودہ است در سورۂ آل عمران (رکوع ۴) مذکورست:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ﴾

وارسال رسل ـ على نبينا وعليهم الصلاة والسلام ـ برائے ہمیں اتباع و اطاعت است او تعالیٰ در سورۂ نساء (رکوع ۹) فرمودہ: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [النساء: ٦٤]

واطاعت رسول اللہ ﷺ عین اطاعت خدا ست جل و علا چنانچہ در سورۂ نساء (رکوع ۱۱) ے فرماید: ﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء: ٨٠]

پس مخالفت رسول اللہ ﷺ عین مخالفت خدائے عزوجل باشد و اتباع کسے بخلاف قول و فعل آنحضرت ﷺ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٧)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٥٨)

مخالفت رسول است ﷺ پس جائز نباشد۔ و چوں ثابت شد کہ اتباع کسے بخلاف قول وفعل آنحضرت ﷺ جائز نیست پس استدلال بقول وفعل کسے بر مسئلہ از مسائل بر خلاف قول وفعل آنحضرت ﷺ چہ گونہ جائز باشد کہ ایں عین اتباع دیگرے بخلاف قول وفعل آنحضرت ﷺ است و پشت خم کردن ہنگام سلام خلاف قول آنحضرت ﷺ است در سنن ترمذی رحمہ اللہ مطبوعہ فخر المطابع دہلی ۱۲۶۹ھ (ص: ۴۴۷) از انس بن مالک رضی اللہ عنہ مروی است:

"قال: قال رجل: يا رسول الله! الرجل منا يلقىٰ أخاه أو صديقه أينحني له؟ قال: «لا»[1] الحديث

اما دست برداشتن تا سینہ یا تا پیشانی پس حدیثے دریں باب بنظر نیامدہ البتہ ایں قدر بثبوت میرسد کہ آنحضرت باشارۂ دست سلام کردہ است۔ ترمذی در سنن خود (ص: ۴۴۳) از اسماء رضی اللہ عنہا روایت کردہ:

"أن رسول الله ﷺ مر في المسجد يوما، وعصبة من النساء قعود فألوى بيده بالتسليم"[2]

وامام بخاری رحمہ اللہ ہم در الأدب المفرد (ص: ۱۴۵ و ۱۵۱) ایں معنی را از اسماء رضی اللہ عنہا روایت کردہ۔[3]

وہمچنیں آداب و بندگی را بر سلام ترجیح دادن وسلام را معیوب ومسلم را متکبر پنداشتن خلاف قول خدائے تعالیٰ عزوجل وخلاف قول وفعل آنحضرت ﷺ است۔ خدائے تعالیٰ در سورۂ نساء (رکوع ۱۱) مے فرماید:

﴿وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا﴾ [النساء: ٨٦]

ودر سورہ نور (رکوع ۹) مے فرماید:

﴿ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً﴾ [النور: ٦١]

وامام بخاری رحمہ اللہ در صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد (۴/ ۷۱) در کتاب الاستیذان از ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کردہ کہ نبی ﷺ فرمودہ:

«لما خلق الله آدم قال: اذهب فسلم على أولئك لنفر من الملائكة جلوس فاستمع ما يحيونك فإنها تحيتك وتحية ذريتك، فقال: السلام عليكم. فقالوا: السلام عليك ورحمة الله، فزادوه: ورحمة الله»[4]

واز انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت (ص: ۷۲) کردہ کہ "أنه مر على صبيان فسلم عليهم، وقال: كان النبي ﷺ يفعله"[5] واز عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت (ص: ۷۲) کردہ کہ مردے رسول خدا ﷺ را پرسید کہ کدامی

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٢٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٩٧)

[3] الأدب المفرد للبخاري (١٠٤٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٧٣)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٦٨)

اسلام بہتر است؟ فرمود: «تطعم الطعام، و تقرأ السلام علیٰ من عرفت وعلیٰ من لم تعرف»[1] واز براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت (ص: ۷۲) کردہ:

”قال أمرنا رسول اللہ ﷺ بسبع، بعیادة المریض، و اتباع الجنائز، وتشمیت العاطس، ونصر الضعیف، و عون المظلوم، و إفشاء السلام، وإبرار المقسم“[2]

واز ابوایوب رضی اللہ عنہ (ص: ۷۲) روایت کردہ کہ نبی ﷺ فرمود:

«لا یحل لمسلم أن یهجر أخاه فوق ثلاث یلتقیان فیصد هذا، ویصد هذا، وخیرهما الذي یبدأ بالسلام»[3]

و نیز امام بخاری رحمہ اللہ در الادب المفرد (ص: ۱۴۳) از براء رضی اللہ عنہ روایت کردہ کہ نبی ﷺ فرمود: «أفشوا السلام تسلموا»[4] واز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (ص: ۱۴۳) روایت کردہ کہ نبی ﷺ فرمود:

«لا تدخلوا الجنة حتی تؤمنوا، ولا تؤمنوا حتی تحابوا، ألا أدلکم علی ما تحابون به؟ قالوا: بلیٰ یا رسول اللہ، قال: أفشوا السلام بینکم»[5]

واز عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت (ص: ۱۴۳) کردہ کہ رسولِ خدا ﷺ فرمود: «اعبدوا الرحمن، وأطعموا الطعام، و أفشوا السلام تدخلوا الجنان»[6] واز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت (ص: ۱۴۳) کردہ کہ رسولِ خدا ﷺ فرمود:

«إذا جاء أحدکم المجلس فلیسلم، فإن بدا له أن یجلس فلیجلس، وإذا قام فلیسلم، ما الأولیٰ بأحق من الآخرة»[7]

واز عائشہ رضی اللہ عنہا روایت (ص: ۱۴۴) کردہ کہ رسولِ خدا ﷺ فرمود: «ما حسدکم الیهود علی شيئ ما حسدوکم علی السلام والتأمین»[8] واز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت (ص: ۱۴۴) کردہ کہ رسولِ خدا ﷺ فرمود: «حق المسلم علی المسلم خمس. قیل: وما هي؟ قال: إذا لقیته فسلم علیه»[9] الحدیث واز عبداللہ بن عمرو بن

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۹)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۸۸۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۶۶)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۸۸۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۷۲۷)

[4] الأدب المفرد (۹۷۹)

[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵٤) الأدب المفرد (۹۸۰)

[6] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۸۵۵) الأدب المفرد (۹۸۱)

[7] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۷۰۶) الأدب المفرد (۹۸٦)

[8] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۸۵٦) الأدب المفرد (۹۸۸)

[9] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۱٦۲) الأدب المفرد (۹۹۱)

العاص رضی اللہ عنہما روایت (ص: ۱۵۱) کردہ: «قال: البخيل من بخل بالسلام»[1] و از ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت (ص: ۱۵۱) کردہ: «قال: أبخل الناس الذي يبخل بالسلام»[2] وطبرانی ایں معنی را از ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وعبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ مرفوعاً ہم روایت کردہ۔ حکاہ المنذري في كتاب الترغيب والترهيب (ص: ٤٩٤) وجود إسناده۔

از احادیثِ مذکورہ بالا ہویدا شد کہ آنحضرت ﷺ بر مرداں سلام میکرد و مرداں بروے ﷺ سلام میکردند تا آنکہ خود بنفس نفیس بر کودکاں سلام میکرد و میفرمود افشاء سلام کنید تا محبت زیادہ شود ے فرمود کہ از حقوق مسلم بر مسلم آنست کہ بوقت ملاقات بروے سلام کند و ے فرمود کہ چوں دو مسلمان با ہم دیگر ملاقی شوند پس ہر کہ از ایشان ابتدا بسلام کند او افضل از دیگرست و ایں سلام از سنن قدیمہ است کہ او تعالیٰ ایں تحیت آدم علیہ السلام و ذریت او گردانیدہ۔

وعلاوہ بریں معلوم ہر کس است کہ خداے تعالیٰ در نماز پنجگانہ فرستادن سلام را بہ نبی ﷺ و بر جملہ بندگان خود کہ صالح باشد بر ہر مسلمان واجب گردانیدہ پس با ایں ہمہ نصوص کہ دربارہ سلام وارد شدہ آداب و بندگی را بر سلام ترجیح دادن وسلام را معیوب و مسلم را متکبر پنداشتن چہ قدر راہ خلاف خدا عز وجل وحضرت پیغامبر ﷺ پیمودن است و حالِ مخالفت خدا و رسول کردن را خود خداے عز وجل در آخر سورہ نور می فرماید:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النور: ٦٣]

ومعلوم ہمہ کس است کہ حال ابلیس لعین انچہ شد نتیجہ ہمیں مخالفت حکمی از احکام خداوندی بود و بس۔ پس مسلمانان را باید کہ ایں قسم خیالات فاسدہ و وساوس شیطانیہ را در دلہاے خود جا نہ دہند و از اتباع ابلیس لعین و از دخول در زمرہ ابالسہ وشیاطین خود را بسیار دور دارند۔ قال اللہ تعالیٰ:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾
[الفاطر: ٦]

[جواب: رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل کے خلاف کسی کا اتباع کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص کو، جو اس سے محبت کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ سورت آلِ عمران کے چوتھے رکوع میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ﴾ [آل عمران: ٣١]

"کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا۔"

---

[1] الأدب المفرد (١٠٤١) یہ ایک موقوف حدیث کے الفاظ ہیں، جو سنداً بھی ضعیف ہے، البتہ اس معنی میں اگلی حدیث صحیح ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٠١)

[2] صحیح ابن حبان (٣٢٩/١٠)

رسل عظام -علی نبینا وعلیھم الصلاۃ والسلام- کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اسی اتباع کے لیے بھیجا گیا تھا۔ سورۃ النساء کے نویں رکوع میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ [النساء: ٦٤] ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا، مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔'' رسول اللہ ﷺ کی اطاعت عین اطاعتِ خدا ہے۔ چناں چہ سورۃ النساء کے گیارھویں رکوع میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ [النساء: ٨٠] ''جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی۔''

پس رسول اللہ ﷺ کی مخالفت عین خدا تعالیٰ کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کے برخلاف کسی کا اتباع کرنا رسول اللہ ﷺ کی مخالفت ہے، لہٰذا یہ جائز نہیں ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کے برخلاف کسی کا اتباع جائز نہیں ہے تو کسی مسئلے میں رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کے برخلاف کسی کے قول و فعل سے استدلال کرنا کیسے جائز ہوگا، کیوں کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کے برخلاف دوسروں کی اتباع کرنا ہے۔

سلام کے وقت پشت کو جھکانا رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے خلاف ہے۔ چناں چہ سنن ترمذی (ص: ٤٤٧ مطبوعہ فخر المطابع دہلی ١٢٦٩ھ) میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملاقات کرتا ہے تو کیا وہ اس کے سامنے کمر کو جھکائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔''

رہا سلام کے وقت ہاتھ کو سینے یا پیشانی تک اٹھانا تو اس موضوع پر کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری ہے۔ البتہ اتنا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ سلام کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن (ص: ٤٤٣) میں اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث بیان کیا ہے:

''بلاشبہہ ایک دن رسول اللہ ﷺ مسجد میں سے گزرے تو وہاں عورتوں کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی، پس آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو ہلا کر اشارے کرتے ہوئے سلام کیا۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ''الأدب المفرد'' (ص: ١٤٥، ١٥١) میں اسماء رضی اللہ عنہا سے اس مفہوم کی روایت نقل کی ہے۔ ایسے ہی آداب و بندگی کو سلام پر ترجیح دینا، سلام کو معیوب خیال کرنا اور سلام کرنے والے کو متکبر سمجھنا خدا تعالیٰ کے قول اور رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کے برخلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۃ النساء کے گیارھویں رکوع میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَآ اَوْ رُدُّوْھَا﴾ [النساء: ٨٦]

''اور جب تمھیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم اس سے اچھی سلامتی کی دعا دو یا جواب میں وہی کہہ دو۔''

اسی طرح سورۃ النور کے نویں رکوع میں فرماتے ہیں:

﴿ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ﴾ [النور: ٦١]

''پھر جب تم کسی طرح کے گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں پر سلام کہو، زندہ سلامت رہنے کی دعا جو اللہ کی طرف سے مقرر کی ہوئی بابرکت، پاکیزہ ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری ''کتاب الاستیئذان'' (۴/ ۷۱ مطبوعہ مصر) میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرمایا: جاؤ اس جماعت کو سلام کرو، اس جماعت میں چند فرشتے بیٹھے ہوئے تھے، وہ آپ کو جو جواب دیں، وہ غور سے سنیں، چنانچہ وہی جواب تمھارا اور تمھاری اولاد کا ہوگا۔ وہ گئے اور انھوں نے ان سے کہا: السلام علیکم! انھوں نے کہا: السلام علیک ورحمۃ اللہ! انھوں نے انھیں لفظ رحمۃ اللہ کا زائد جواب دیا۔''

نیز انھوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے (ص: ۷۲) روایت کی ہے: ''بلاشبہہ وہ (انس رضی اللہ عنہ) بچوں کے پاس سے گزرے اور انھیں سلام کیا اور کہا کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی کیا کرتے تھے۔'' اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے (ص: ۷۲) پر روایت کی ہے: ''ایک شخص نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، کون سا (آدابِ) اسلام بہتر ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « تطعم الطعام، و تقرأ السلام علیٰ من عرفت وعلیٰ من لم تعرف» ''(یہ کہ) تم کھانا کھلاؤ اور تم جسے جانتے ہو اسے بھی اور جسے نہیں جانتے اسے بھی سلام کرو۔'' ایسے ہی براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے (ص: ۷۲) روایت نقل کی ہے:

''کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات کاموں کا حکم دیا: مریض کی تیمار داری کرنے کا، جنازوں میں شرکت کرنے کا، چھینک مارنے والے کا جواب دینے کا، ضعیف و ناتواں کی مدد کرنے کا، مظلوم کی مدد کا، سلام کو عام کرنے اور قسم اٹھانے والے کو اس کی قسم سے بَری کرنے کا۔''

اسی طرح ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے (ص: ۷۲) روایت کیا ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے، دونوں ملتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کرتا ہے اور وہ اس سے، ان دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔''

نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے ''الأدب المفرد'' (ص: ۱۴۳) میں براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سلام پھیلاؤ، تم سلامت رہو گے۔''

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے (ص: ۱۴۳) روایت کیا ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگے، جب تک تم مومن نہیں بن جاتے اور تم اس وقت تک مومن نہیں بن سکتے، جب تک تم باہم محبت نہیں کرتے۔ کیا میں تمھیں ایسی چیز نہ بتاؤں؛ جس کے ساتھ تم باہم محبت کرنے لگ جاؤ؟'' انھوں نے عرض کی: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آپس میں سلام پھیلاؤ۔''

نیز عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے (ص: ۱۴۳) روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رحمان کی عبادت کرو، کھانا کھلاؤ، سلام پھیلاؤ، تم جنتوں میں داخل ہو جاؤ گے۔'' ایسے ہی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے (ص: ۱۴۴) روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص مجلس میں آئے تو سلام کہے۔ اگر تو وہ بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جائے اور جب وہ کھڑا ہو (اور جانے کا ارادہ کرے) تو سلام کرے، پہلی دوسری سے زیادہ حق نہیں رکھتی۔'' اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا سے (ص: ۱۴۴) روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہودی تمھارے سلام اور آمین کہنے پر جتنا حسد کرتے ہیں وہ تمھارے کسی اور عمل پر نہیں کرتے۔''
نیز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے (ص: ۱۴۴) روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں، پوچھا گیا وہ کون کون سے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اس سے ملو تو سلام کہو...الحدیث۔''

ایسے ہی عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے (ص: ۱۵۱) روایت کی ہے: ''انھوں نے فرمایا: بخیل ہے وہ جو سلام کہنے میں بھی بخل کرتا ہے۔'' اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے (ص: ۱۵۱) روایت کی ہے: ''انھوں نے کہا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ بخیل وہ ہے جو سلام کہنے میں بخل کرتا ہے۔'' امام طبرانی رحمہ اللہ نے اس مضمون کو ابو ہریرہ اور عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے۔ امام منذری رحمہ اللہ نے اسے کتاب ''الترغیب والترہیب'' میں (ص: ۴۹۴) ذکر کیا اور اس کی سند کو عمدہ قرار دیا ہے۔

مذکورہ بالا احادیث سے یہ واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کو سلام کرتے تھے اور مرد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے تھے، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود بچوں کو سلام کرتے اور فرماتے کہ باہم سلام پھیلاؤ، تاکہ آپس میں محبت بڑھ جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے کہ مسلمان کے مسلمان پر حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس سے ملاقات کے وقت سلام کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جب دو مسلمان باہم ملاقات کرتے ہیں تو جو ان میں سے پہلے سلام کرتا ہے وہ دوسرے سے افضل ہے۔ یہ سلام قدیم سنتوں میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا سلام قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ ہر ایک کو یہ بات معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے پانچ نمازوں میں نبیِ مکرم ﷺ اور اپنے نیک بندوں پر سلام کرنا ہر مسلمان پر واجب کیا ہے۔ سلام کے بارے میں وارد ہونے والی ان تمام نصوص کے باوجود آداب و بندگی کو سلام پر ترجیح دینا، سلام کو معیوب اور سلام کرنے والے کو متکبر خیال کرنا خدا تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی راہ کے خلاف راہ تلاش کرنا ہے۔ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کے انجام کو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور کے آخر پر یوں بیان کیا ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [النور: ٦٣]

''سو لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کا حکم ماننے سے پیچھے رہتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ آ پہنچے، یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔''

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ [الفاطر: ٦]

''بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے تو اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے گروہ والوں کو صرف اس لیے بلاتا ہے کہ وہ بھڑکتی آگ والوں سے ہو جائیں۔'']

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعین.

کتبه: محمد عبد اللّٰہ. الجواب صحیح. الفت حسین. ھذا الجواب صحیح. محمد أصغر۔ أصاب من أجاب. کتبه: جعفر بن عبد اللّٰہ. المجیب مصیب. أبو المعالی محمد إسماعیل. الجواب صحیح. شیخ حسین بن محسن عرب.

تفریقِ جماعت اور دوسروں پر لعن طعن کرنے کی ممانعت:

سوال ① اس طرف کچھ ایسے لوگ ہیں کہ آپس میں جب لڑتے ہیں، ایک دوسرے کو کافر مردود کہتے ہیں۔ وقت دینے الزام کے کہتے ہیں کہ ہاں ہم ایسے ہیں، ایسا کرتے ہیں۔ کیا مسلمانوں کو یہ الفاظ کہنا جائز ہے؟

② ہمارے یہاں ایک شخص آیا، کچھ مسائل میں گفتگو ہوئی۔ ہماری طرف سے چند تحریر پیش ہوئی۔ سب سوالات کا یہ جواب دیا کہ یہ سب غلط اور بے قاعدہ ہیں۔ کہا گیا غلطی دور کر کے بعد اصلاح قاعدے سے جواب دیا جائے۔ کچھ جواب نہ دیا، نماز کا وقت آیا۔ ہم میں سب عمل بالحدیث والے تھے، اس نے نماز جدا پڑھی۔ ہمارے علم میں اس دن کوئی کافر و مشرک نہ تھا۔ کیا تفریقِ جماعت کا الزام اس کے ذمہ نہ ہوا؟ ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ کے خلاف نہ ہوا؟

③ اس طرف کچھ لوگ ہیں کہ اپنے سوا دوسرے مسلمانوں کو مسلمان نہیں جانتے۔ اگر ان کی خدمت گزاری نقداً زائد کی جائے تو اگرچہ وہ برا ہو، اس کو اچھا کہتے ہیں۔ اگر ان کو نہ دیا جائے یا کم دیا جائے تو اس کی مذمت

کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ لوگ فی الشرع مذموم ہیں یا موصوف؟ موافق ادلہ شرعیہ جواب تحریر ہو۔

④ ان میں بعض ایسے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو برا کہتے ہیں۔ اگر وہ برے تھے یا صلحاے سلف کا برا کہنا ثواب ہو، اطلاع دیجیے۔ ہم لوگوں نے جو مسائل فقہ کے خلافِ حدیث تھے، ترک کیے، حدیث پر عمل کیا۔ ہم برا کہنا صلحاے سلف اور خلف سب کا مذموم اور معیوب فی الدین جانتے ہیں۔

⑤ جو شخص کسی عالم متبع شریعت اور مروج سنن مصطفویہ کو بد دین کہے، وہ شخص کیسا ہے؟ مدلل بآیات و حدیث جواب ارشاد ہو۔

⑥ آیت ﴿فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی﴾ کا شانِ نزول کیا ہے؟

⑦ اگر کوئی شخص دراز اللحیہ جس کے بال پھٹ کر خراب ہوتے ہوں، کسی قدر کترا ڈالے تو عند الشرع جواز اس کا ہے یا وہ شخص ملامت کیا جائے؟ بعد کترانے کے بھی ڈاڑھی ہنوز یکمشت سے زائد باقی ہے اور ہمیشہ کترانے کا عادی نہیں ہے، نہ اُس کے قصد کا عازم ہے؟

⑧ ایک شخص کہتا ہے کہ مرتکبانِ کبیرہ جو بدون توبہ مر گئے ہیں، اُن پر عذاب ہونا ضرور ہے۔ دوسرا کہتا ہے، مرتکبانِ کبائر کے واسطے قرآن و حدیث میں وعید آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے، چاہے عذاب کر لے، چاہے بدون عذاب محض بفضل و کرم اپنے یا بذریعہ شفاعتِ شافعان بخش دے، اس میں کس کا قول حق اور صواب ہے؟ کیا حدیث میں «إن شاء عذبه وإن شاء غفرله» اور قرآن میں ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ نہیں آیا؟ یہ بات مجرمانِ کبائر کے واسطے ہونا ضروری ہے۔ یہ عقیدہ اہلِ سنت کا ہے یا معتزلہ کا؟ اور گناہ کبیرہ بھی ﴿مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ کے تحت میں داخل ہے یا نہیں؟

جواب ① و ⑤ مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کی شان میں اس طرح کے الفاظ ''کافر، مردود و بد دین'' استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ جب کوئی شخص کسی کی شان میں اس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو جس کی شان میں استعمال کیا ہے، اگر وہ درحقیقت ایسا نہیں ہے تو کہنے والے ہی پر وہ الفاظ لوٹ پڑتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو ایسے الفاظ کے استعمال سے احتراز لازم ہے۔ کتاب ''الترغيب والترهيب'' (ص: ٥٠٣) للحافظ المنذري میں ہے:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا قال الرجل لأخيه: يا كافر! فقد باء بها أحدهما، فإن كان كما قال، وإلا رجعت عليه»[1] (رواه مالك و البخاري ومسلم و أبو داود والترمذي)

[سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی اپنے (مسلمان) بھائی کو کہے ''اے کافر! تو ان میں سے کوئی ایک ضرور (ایمان سے) کفر کی طرف لوٹا، اگر وہ جسے یہ کہا گیا ایسا ہے تو وہ کفر کی طرف لوٹا، ورنہ یہ حکم کہنے والے کی طرف لوٹ آتا ہے]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠)

وعن أبي ذر رضی اللہ عنہ أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: «ومن دعا رجلا بالكفر أو قال: عدوالله، وليس كذلك إلا حار عليه»[1] والله أعلم بالصواب.

(رواه البخاري و مسلم، في حديث "حار" بالحاء المهملة والراء أي رجع. اھ)

[سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جس شخص نے کسی شخص کو کافر کہہ کر پکارا یا کہا: اللہ کے دشمن! جب کہ وہ ایسا نہ ہو تو وہ بات اس (کہنے والے) پر لوٹ آتی ہے]

(۲) اس صورت میں ضرور تفریق جماعت کا الزام اس شخص پر آیا اور بے شبہہ ﴿وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ کا خلاف اس سے ہوا۔

(۳) ایسی حالت میں یہ لوگ شرعاً مذموم ہیں، نہ کہ ممدوح، جو لوگ دنیا کے بندے ہیں کہ جس سے ان کو دنیا ملے اس سے خوش رہیں اور جس سے نہ ملے ناخوش، ایسے لوگوں کے حق میں حضرت رسولِ خدا ﷺ نے سخت بد دعا فرمائی ہے۔ کتاب "الترغيب والترهيب" (ص: ٢٤٨) للحافظ المنذري رحمہ اللہ میں ہے:

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي ﷺ: «تعس عبد الدينار و عبد الدرهم وعبد الخميصة» زاد في رواية: «و عبد القطيفة إن أعطي رضي، وإن لم يعط سخط، تعس وانتكس وإذا شيك فلا انتقش»[2] الحديث (رواه البخاري)

[سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی مکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں: دینار، درہم اور پوشاک کا (پرستار) بندہ ہلاک ہوا، اگر اسے دیا جائے تو خوب اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہوتا ہے، وہ ہلاک ہوا اور ذلیل ہوا، جب اسے کانٹ چبھے تو نکالا نہ جائے...الحدیث]

(۴) صلحاے امت میں سے کسی کو، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہوں یا اور کوئی، برا کہنا جائز نہیں ہے۔ حدیث شریف میں عموماً اموات مسلمین صالحین کے برا کہنے سے نہی آئی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الجنائز کے آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: «لا تسبوا الأموات، فإنهم قد أفضوا إلى ما قدموا»[3] [فوت شدگان کو برا بھلا مت کہو، کیوں کہ وہ تو اپنے کیے کے پاس جا چکے ہیں] سورۂ حشر میں اپنے اور ان کے لیے یوں دعا کرنے کا حکم کیا ہے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الحشر: ١٠]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦١)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٠)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٩)

[اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے]

جو قول کسی کا خلافِ کتاب و سنت ملے، اس کو چھوڑ دینا اور مجتہدینِ دین کے ساتھ نیک گمان رکھنا چاہیے اور ان کا جو قول کتاب و سنت کے خلاف ملے، اس کو ان کی اجتہادی غلطی پر محمول کرنا چاہیے، جس میں وہ معذور ہیں، بلکہ ماجور اور اپنا عمل کتاب وسنت کے مطابق رکھنا چاہیے۔ سلف صالحین و ائمہ دین کا یہی طریقہ مرضیہ چلا آتا ہے۔

(۷) آیتِ کریمہ ﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ﴾ [الأنعام: ٦٨] [اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر کبھی شیطان تجھے ضرور ہی بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ] مع آیت ما بعد میں اس بات کا بیان ہے کہ جو لوگ اپنی مجلسوں میں جناب رسولِ خدا ﷺ یا قرآن شریف کی ہجو اور بُرائی بیان کریں یا احکامِ شریعت کے ساتھ ٹھٹھا کریں اور معصیت کے کام میں مشغول ہوں، اس وقت مسلمانوں کو ان کی مجلسوں میں بیٹھنا منع ہے اور اگر ایسے وقت میں بھی ان کے پاس بیٹھے رہ جائیں گے اور نہ اُٹھیں گے تو انھیں کے مثل ہو جائیں گے اور وہی مواخذہ و محاسبہ اللہ کا جو اُن سے ہوگا، ان سے بھی ہوگا اور اگر بھول کر بیٹھے رہ جائیں تو ان کو جس وقت یہ حکم یاد آ جائے، اسی وقت وہاں سے اٹھ کھڑے ہوں اور ذرا بھی اس میں دیر نہ کریں۔

ہاں جو لوگ نصیحت کرنے کے لیے بیٹھے رہ جائیں، اس امید پر کہ شاید ان کی نصیحت سے ان کو کچھ فائدہ ہو جائے اور نصیحت سن کر گناہ سے باز آ جائیں تو ان کو اجازت ہے۔ کفارِ مکہ اس قسم کی ناشائستہ حرکات اپنی مجلسوں میں کر کے اپنا منہ کالا کیا کرتے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان آیات میں مذکورہ بالا ہدایتیں فرمائیں۔ یہی ان آیات کا شانِ نزول ہے، لیکن حکم ان آیات کا ہر ملک اور ہر زمانے کے لوگوں کے لیے ہے۔

(۸) جو شخص کہتا ہے کہ مرتکبانِ کبیرہ جو بدون توبہ مر گئے ہیں، ان پر عذاب ہونا ضرور ہے، اس کا قول باطل و غلط اور عقیدہ معتزلہ و خوارج کے موافق ہے اور جو شخص کہتا ہے کہ وہ لوگ اللہ کی مشیت میں ہیں، چاہے ان کو عذاب کرے اور چاہے بدون عذاب بفضل و کرم اپنے یا بذریعہ شفاعتِ شافعان انھیں بخش دے، اس کا قول حق و صواب اور عقیدہ اہل سنت و جماعت کے موافق ہے اور ﴿مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ کے تحت میں سوائے شرک کے سب گناہ داخل ہیں، کبیرہ ہوں یا صغیرہ۔ شرح مواقف (ص: ۷۹۰ مطبوعہ نولکشور) میں ہے:

"أوجب جميع المعتزلة والخوارج عقاب صاحب الكبيرة إذا مات بلا توبة، ولم يجوزوا أن يعفو الله عنه" انتهى

[کبیرہ گناہ کا مرتکب جب بغیر توبہ کے فوت ہوگیا تو تمام معتزلہ اور خوارج نے اس پر عذاب کا ہونا لازم کیا ہے اور انھوں نے اس بات کو درست قرار نہیں دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے]

نیز اسی صفحہ میں ہے:

"قالت المعتزلة والخوارج: صاحب الكبيرة إذا لم يتب عنها فخلد في النار ولا يخرج عنها أبدا" انتهى

[معتزلہ اور خوارج نے کہا ہے کہ مرتکبِ کبیرہ نے جب اس سے توبہ نہ کی تو وہ ہمیشہ آگ میں رہے گا، اس سے کبھی نہیں نکلے گا]

صفحہ (۷۱۳) میں ہے:

"الثاني: الآيات الدالة عليه أي على العفو عن الكبيرة قبل التوبة، نحو قوله تعالیٰ ﴿وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨] فإن ما عدا الشرك داخل فيه، ولا يمكن التقييد بالتوبة، لأن الكفر مغفور معها فيلزم تساوي ما نفي عنه الغفران، وما ثبت له، وذلك مما لا يليق بكلام عاقل فضلا عن كلام الله، وقوله ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ [الزمر: ٥٣] فإنه للكل فلا يخرج عنه إلا ما أجمع عليه، وقوله ﴿وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ﴾ والتقرير ما ذكرنا آنفا إلى غير ذلك من الآيات الكثيرة" انتهى

[دوسری وجہ وہ آیات ہیں جو اس پر، یعنی توبہ سے پہلے کبیرہ گناہ کی معافی پر دلالت کرتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ "اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا" یقیناً شرک کے سوا ہر گناہ اس میں داخل ہے اور اس کو توبہ کے ساتھ مقید کرنا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ توبہ کے ساتھ کفر سے معافی مل جاتی ہے تو اس سے اس کی اس گناہ کے ساتھ برابری لازم آتی ہے، جس سے معافی کی نفی کی گئی ہے اور جس کے لیے معافی ثابت ہے اور یہ کسی عاقل کے کلام میں لائق نہیں ہے، چہ جائے کہ یہ کلام اللہ میں ہو۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ "بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔" بلاشبہہ یہ غفران و معافی تمام گناہوں کے لیے ہے، سوائے اس کے جس پر اجماع ہو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ﴾ "اور بے شک تیرا رب یقیناً لوگوں کے لیے ان کے ظلم کے باوجود بڑی بخشش والا ہے" ابھی جو ہم نے بات ثابت کی ہے، اس پر بہت سی آیات ہیں]

شرح فقہ اکبر (ص: ۸۷) میں ہے:

"المعصية تحت المشيئة عند أهل السنة والجماعة، لقوله تعالیٰ: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ

يُشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ أي من غير توبة، وإلا فهو سبحانه ﴿يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ﴾ [التوبة: ١٠٤] ويغفر بها الشرك وغيره بمقتضى وعده وإخباره خلافا للمعتزلة حيث يقولون: يجب على الله تعالىٰ عقاب العاصي... الخ"

[اہلِ سنت و جماعت کے نزدیک معصیت مشیت کے تحت ہے، کیوں کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ ''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔'' یعنی بغیر توبہ کے، ورنہ تو اللہ تعالیٰ: ﴿يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ﴾ ''اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے'' اور وہ اپنے حسبِ وعدہ و خبر توبہ کے ساتھ شرک وغیرہ کو معاف کرتا ہے، برخلاف معتزلہ کے، وہ کہتے ہیں: عاصی کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے...الخ]

نیز صفحہ (۱۸۱) میں ہے:

"وعند الخوارج من عصى صغيرة أو كبيرة فهو كافر مخلد في النار، إذا مات من غير توبة، وعند المعتزلة تفصيل في المسئلة، فإن كانت كبيرة يخرج من الإيمان، ولا يدخل في الكفر إلا أنه مخلد في النار، وإن كانت صغيرة واجتنب الكبائر لا يجوز التعذيب عليها، وإن ارتكب الكبائر لا يجوز العفو عنها، ورد عليهم بأجمعهم قوله سبحانه ﴿وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾"

[خوارج کے نزدیک صغیرہ و کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہے اور اگر وہ بغیر توبہ کیے مر گیا تو وہ ہمیشہ آگ میں رہے گا۔ معتزلہ کے نزدیک اس مسئلے میں تفصیل ہے: اگر تو اس نے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا تو وہ ایمان سے خارج ہو جائے گا اور وہ کفر میں داخل نہیں ہوگا، ہاں! وہ آگ میں ہمیشہ رہے گا۔ اگر اس کا گناہ صغیرہ ہو اور وہ کبیرہ سے اجتناب کرے تو اسے عذاب کرنا جائز نہیں ہے اور اگر وہ کبائر کا مرتکب ہو تو اسے معاف کرنا جائز نہیں ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا] ان تمام باتوں کا رد کرتا ہے]

"غنية الطالبين" (ص: ۱۵٦ چھاپہ لاہور) میں ہے:

"ونعتقد أن المؤمن وإن أذنب ذنوبا كثيرة من الكبائر والصغائر، لا يكفر بها، وإن خرج من الدنيا بغير توبة، إذا مات على التوحيد والإخلاص، بل يرد أمره إلى الله عزوجل إن شاء عفا عنه وأدخله الجنة، وإن شاء عذبه وأدخله النار" والله أعلم بالصواب

[ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ مومن کو، اگرچہ وہ بہت سے صغیرہ و کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہو چکا ہو، ان کی وجہ سے کافر نہیں قرار دیا جائے گا، اگرچہ وہ بغیر توبہ کے دنیا سے رخصت ہوا ہو، بشرطیکہ اس کی موت توحید اور

اخلاص پر واقع ہوئی ہو، بلکہ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا جائے گا۔ چاہے تو اسے معاف کر کے جنت میں داخل کرے اور چاہے تو اسے عذاب دینے کے لیے آگ میں داخل کرے]

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبدالرحمن المباركفوري، عفا الله عنه. مدرس مدرسه أحمديه آره

کیا مرتکبِ کبیرہ قابلِ مغفرت ہے؟

سوال مندرجہ ذیل افراد کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آیا ایسا شخص کبھی بخشا جائے گا یا نہیں:

① نشہ پینے والا۔ ② ہمسایہ کا حق ادا نہ کرنے والا۔ ③ ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا۔ ④ جماعت میں پھوٹ ڈالنے والا اور اس سے علیحدہ رہنے والا؟

جواب شرک و کفر کے علاوہ اور کسی گناہ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ضرور بخشا ہی جائے گا اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہرگز بخشا نہیں جائے گا، بلکہ کفر و شرک کے سوا ہر ایک گناہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے۔ چاہے تو بخش دے اور چاہے تو سزا دے دے، لیکن شرک و کفر کے سوا اور کسی گناہ کی سزا ابدی نہیں ہے۔ مگر آدمی کو ہر ایک گناہ سے ہر آن ڈرتے رہنا چاہیے اور گناہ ہو جائے تو اس سے جلد توبہ و استغفار کر ڈالنا چاہیے اور کسی گناہ پر ہٹ نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ چھوٹا گناہ بڑے گناہ کی طرف اور بڑا گناہ شرک و کفر کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور ابدی سزا کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨]

[بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا]

نیز فرماتا ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ [البقرة: ٦١]

[یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے اور نبیوں کو حق کے بغیر قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے]

نیز فرماتا ہے: ﴿وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا﴾ (آل عمران: ١٣٥) [اور انھوں نے جو کیا اس پر اصرار نہیں کرتے] تفسیر ابن کثیر (١٠/١٨٢) میں ہے:

"وقد روى ابن جرير و الترمذي والنسائي و ابن ماجه من طرق عن محمد بن عجلان عن القعقاع بن حكيم عن أبي صالح عن أبي هريرة عن النبيﷺ قال: إن العبد إذا أذنب ذنبا كانت نكتة سوداء في قلبه، فإن تاب منها صقل قلبه، وإن زاد زادت، فذلك

قول اللّٰہ تعالیٰ: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ [المطففین: ١٤] [1] وقال الترمذي: حسن صحیح. (إلی قوله) وقال الحسن البصري: هو الذنب علی الذنب حتی یعمی القلب فیموت، وکذا قال مجاهد وابن جبیر و قتادة و ابن زید وغیرهم" واللّٰہ تعالیٰ أعلم

[ابن جریر، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے کئی واسطوں کے ساتھ محمد بن عجلان سے روایت کی ہے، وہ قعقاع بن حکیم سے روایت کرتے ہیں، وہ ابو صالح سے، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبیِ اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے، اگر وہ اس گناہ سے توبہ کر لے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ گناہ میں بڑھتا چلا جائے تو وہ نکتے بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ زنگ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ ''ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر، جو وہ کماتے تھے'' امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے ...حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کا مطلب گناہ پر گناہ کرتے چلے جانا یہاں تک کہ دل اندھا ہو جائے اور وہ مر جائے۔ مجاہد، ابن جبیر، قتادہ اور ابن زید وغیرہ کا یہی موقف ہے]

(کتبه: ٣٠/ رمضان المبارك ١٣٣١هـ)

حق دار کا حق ادا کرنا ضروری ہے:

سوال اگر باپ اپنے لڑکے کو بچپن سے ستاتا ہو اور اس لڑکے کو کوئی اور رشتہ دار اس کا پالے اور جب وہ لڑکا بالغ ہو تو اس کو باپ کے پاس جانا چاہیے یا نہیں یا حق ادا کرنا چاہیے یا نہیں اور اگر لڑکے کی خواہش ہو کہ حق ادا کرے، مگر باپ کے پاس جانے یا رہنے سے ڈرتا ہو اور نہ کوئی ذریعہ ہے کہ اپنے باپ کو کچھ دے تو کیا حکم ہے؟

جواب اگر وہ لڑکا اپنے باپ کے پاس جا سکتا ہے اور باپ کا حق ادا کر سکتا ہے تو جائے اور باپ کا حق ادا کرے (خواہ خدمت مالی ہو یا بدنی یا جو اس سے ممکن ہو ادا کرے) اور باپ اگر اس کا حق ادا نہیں کرتا تو اس کا وبال باپ پر ہے، یہ لڑکا بری الذمہ ہے اور لڑکا اپنا حق اللہ سے چاہے۔ مشکوۃ شریف (ص: ٣١١ و ٣١٢ مطبع احمدی دہلی) میں ہے:

عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه قال: قال لنا رسول الله ﷺ: «إنکم سترون بعدي أثرة و أمورا تنکرونها» قالوا: فما تأمرنا یا رسول الله؟ قال: أدوا إلیهم حقهم، وسلوا الله حقکم» [2] (متفق علیه)

[سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا: ''تم عن قریب میرے بعد ترجیح دینے کو اور ایسے امور کو دیکھو گے جنھیں تم ناپسند کرتے ہو گے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٣٣٤) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٥٠٩) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٢٤٤)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦٤٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٤٣)

یا رسول اللہ ﷺ! آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کا حق انھیں دو اور اپنا حق اللہ تعالیٰ سے طلب کرو]

وعن وائل بن حجر قال: سأل سلمة بن يزيد الجعفي رسول اللهﷺ فقال: يا نبي الله! أرأيت إن قامت علينا أمراء يسألونا حقهم، ويمنعونا حقنا، فما تأمرنا؟ قال: «اسمعوا وأطيعوا، فإنما عليهم ما حملوا، وعليكم ما حملتم»[1] (رواه مسلم) والله أعلم بالصواب

[وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سلمہ بن یزید الجعفی نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا تو عرض کی: اے اللہ کے نبی ﷺ! مجھے بتائیں اگر ہم پر ایسے امرا مقرر ہو جائیں، جو اپنا حق ہم سے طلب کریں، جب کہ ہمارے حق سے ہمیں محروم رکھیں، تب آپ ﷺ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سنو اور اطاعت کرو، جو ان کی ذمہ داری ہے، وہ اس کے مکلّف ہیں اور جو تمھاری ذمے داری ہے تم اس کے ذمے دار و مکلّف ہو]

كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

کسی مسلمان کی بدخواہی کرنا حرام ہے:

سوال زید اپنی دختر بالغہ کی نسبت شادی نکاح بکر کے فرزند سے بغرض ادائے فرض و تبعیت سنتِ رسول مقبول ﷺ مقرر کرتا تھا اور زید کی یہ نیت خالص تھی کہ ایامِ قلیل میں حسبِ شرع شریف اس بارِ عظیم سے سبک دوش ہو کر ماجور اتباعِ سنت ہو، لیکن عمرو جو باعتبار افعال دنیاوی ایک ثقہ آدمی شمار کیا جاتا ہے، بجوش نفسانیت و بزعم اس کے کہ شادی میری دختر کی بکر کے دوسرے فرزند سے ہوئی ہے، بلا کوئی عذر حسب ونسب و حجت جو مانع شادی مومنین ہو، ایسا مخل ہوا کہ بکر کو استقرار شادی میں کمال تامل ہوا، حتی کہ مشکوک خاطر ہو کر تارک نسبت دختر زید ہو گیا۔ مزید برآں کہ عمرو تو بذات خاص ہر طرح سے کوشاں ہی تھا، اپنے اعزہ و اقربا کو بکوشش بلیغ و چاپلوسی کثیر جیسے کہ فی زماننا مروج ہے، بغرض چھوٹ جانے نسبت دختر زید کے آمادہ کیا، حالانکہ زید و بکر کا حسب ونسب یکساں ہے، بلکہ حسب ونسب بکر کا باعتبار حسب ونسب زید کے قابل کلام و حرف ہے۔ عمرو کا منشائے دلی بوجہ عناد و بغض اسباب زمینداری کے ہر پہلو سے یہی تھا کہ ہرگز ہرگز زید کی دختر بالغہ کا نکاح بکر کے فرزند سے نہ ہو اور یہ نسبت عجلت شادی دختر بالغہ کی ہر مومن کو جیسی تاکید اکید شرعی ہے، اظہر من الشمس ہے، خلاف اس کے عمرو قاطع و مانع ہوا تو ایسی صورت میں عمرو کی حیثیت باعتبار فعل متذکرہ بالا کے مطابق قول خدا و رسول کیا قرار پائی اور موردِ الزام شرعی ہوا یا نہیں؟ اگر ہوا تو کس الزام کا ملزم و کس جرم کا مجرم؟

جواب عمرو بوجہ اس فعل کے بدخواہ اپنے بھائی مسلمان کا ہوا اور جو شخص بدخواہی بھائی مسلمان کی کرے، اس کی نسبت امام مسلم و ترمذی و ابن ماجہ وغیرہم ائمہ حدیث نے ابو ہریرہ و عبداللہ بن عمرو و عبداللہ بن مسعود و عبداللہ بن عباس و انس بن مالک و ابو موسیٰ اشعری و براء بن عازب و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ حضرت رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (1846)

«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا» [1] [جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں] طبرانی کا لفظ بروایت قیس بن ابی غرزہ رضی اللہ عنہ یہ ہے: «مَنْ غَشَّ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ» [2] كذا في الترغيب والترهيب للإمام الحافظ عبدالعظيم المنذري. [جس نے مسلمانوں کو دھوکا دیا تو وہ ان میں سے نہیں] "مجمع البحار" میں ہے: "الغش ضد النصح أي ليس من أخلاقنا، ولا على سنتنا" [3] اھ [دھوکا خیر خواہی کی ضد ہے، یعنی دھوکا دینے والا ہمارے اخلاق پر کاربند اور ہماری سنت پر گامزن نہیں ہے]

نیز "مجمع البحار" میں ہے: "وهي (أي النصيحة) كلمة يعبر بها عن جملة هي إرادة الخير للمنصوح له" [4] اھ [وہ ایسا کلمہ ہے جس کے ساتھ ایک جملے کو تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ منصوح لہ کے لیے خیر و بھلائی کا ارادہ کرنا] ترجمہ حدیث یہ ہے: ''جو شخص ہم مسلمانوں کی بدخواہی کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔'' مجمع البحار میں ہے: یعنی وہ ہمارے اخلاق والوں میں سے نہیں ہے اور نہ وہ ہماری سنت و طریقہ پر ہے۔'' العياذ بالله منه، والله أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب. الجواب صحيح. محمد ضمير الحق، عفي عنه.

منتظم کی فرمانبرداری:

سوال زید مذہباً اہلِ حدیث ہے۔ مدت سے ایک عام تقویٰ شعار کو عقیدتاً اپنا مقتدا اور خلیفہ دین مانتا آیا۔ اب کسی دنیاوی معاملے میں سردار کو اپنے عندیہ میں اپنے حق کے خلاف پا کر اُس نے بیعت توڑ دی اور آزادانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ زید سردار کی تضحیک و تذلیل بھی کرتا ہے، لیکن صوم و صلاۃ کا اب تک ایسا ہی عامل ہے، جیسا کہ زیرِ اطاعت سردار پابند تھا۔ پس شرعاً اس کے ساتھ سلام و کلام کرنا اور نماز میں اس کی اقتدا کرنی وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس مسئلے میں سردار جو حکم کر دے، اُس پر لوگ کاربند ہوں۔ یہ مسئلہ سردار کے انتظام سے تعلق رکھتا ہے۔ والله تعالىٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (١٤/ ربيع الآخر ١٣٣٢هـ)

مسئلہ بیعت:

سوال ایک عالم تقویٰ شعار، جس عالم کی سند و اجازت و خلافت شرعاً معتبر ہے، ان سے سند و اجازت و خلافت

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١)

[2] المعجم الكبير (١٨/ ٣٥٩) مسند أبي يعلىٰ (٢/ ٢٣٣) اس کی سند میں حکم بن عتیبہ اور قیس بن ابی غرزہ کے درمیان انقطاع ہے اور ایک راوی "معاوية بن ميسرة بن شريح" کی توثیق نہیں ملی۔ دیکھیں: الجرح والتعديل (٨/ ٣٨٦)

[3] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٢٥)

[4] مجمع بحار الأنوار (٣/ ٣٦١)

حاصل کر کے موافق شرع شریف وعظ و پند سنا کر لوگوں سے بیعت لیتے، ممنوعات شرعیہ سے توبہ کرا کے تنبیہ و تاکید کے ساتھ جماعتوں کا بندوبست کیا کرتے، جس میں امر دین کی ترقی ہو، نیز قوموں نے ان کو اپنا پیشوا و سردار بھی گردان لیا۔ جماعتوں میں سے ایک شخص نے زنِ شوہر دار سے بلا طلاق نکاح کر لیا۔ یہ امر ناشائستہ دیکھ کر وہ عالم مذکور و سرداران جماعت کی بعد اظہار گواہان یہ رائے قرار پائی کہ جب تک وہ شخص پہلے شوہر سے طلاق لے کر بعد عدت تجدیدِ نکاح نہ کرے، تب تک جماعت سے الگ رہے گا۔ بعدہ ایک شخص ذی حیثیت نے چند لوگ سمیت اس مرتکبِ گناہ کے طرف دار ہو کر ضداً اس کے ساتھ اکل و شرب سلام و مصافحہ وغیرہ برتاؤ کر کے خلافِ شرع شامل کر لیے، حتی کہ اس خلیفہ مذکور کے زندہ رہتے ہوئے اس کی حکومت و سرداری میں غیر عالم کو بلا کر بلا عذر شرعی ان کی بیعت کے اوپر ضداً بیعت بھی کر لیے، اس لیے جماعت میں نہایت فتنہ وفساد برپا ہوا نیز انتظامِ جماعت بالکل بگڑ گیا۔ آیا اس قسم کی بیعت لینا و بیعت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز بیعت لینے والا عالم و بیعت کرنے والا از روئے شریف گنہگار ہوگا یا نہیں؟

جواب اس قسم کی بیعت لینا و کرنا شرعاً ناجائز ہے اور ایسی بیعت لینے والا اور کرنے والے سب کے سب گنہگار ہیں، ان سب لوگوں کو اس سے توبہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ [سورۂ مائدۃ، رکوع:۱] ''مسلمانو! تم لوگ نیکی اور پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر کوئی کسی کی مدد نہ کرے۔'' اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جس شخص نے زنِ شوہر دار سے بلا طلاق نکاح کر لیا، اس نے بلاشبہہ گناہ اور زیادتی کی اور حرام کاری کا مرتکب ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ [سورۂ نساء، رکوع:٤] ''تم لوگوں پر شوہر دار عورتیں حرام کی گئیں۔''

اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ جس شخص نے بیعت لی اور بھی جن لوگوں نے بیعت کی، ان سب لوگوں نے گناہ اور زیادتی پر اس شخص کی مدد کی، جس نے زنِ شوہر دار سے بلا طلاق نکاح کر لیا، پس ان سب لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم مذکور صدر کی خلاف ورزی کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی یہی تو گناہ ہے۔ پس بلاشبہہ یہ سب لوگ گنہگار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ [سورۂ ھود، رکوع آخر]

''مسلمانو! تم ان لوگوں کی طرف نہ جھک پڑو (یعنی ان لوگوں کا ساتھ نہ دو اور ان لوگوں کے طرف دار نہ بنو) جنھوں نے ظلم کیا (یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم اور قانون کی خلاف ورزی کی)۔''

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ظالموں، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کا ساتھ دینے اور ان کے طرف دار بننے سے منع فرمایا ہے اور بیعت لینے والے اور بیعت کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی خلاف ورزی کی کہ شخصِ ظالم کا جس نے زنِ شوہردار سے بلا طلاق نکاح کر لیا تھا، ساتھ دیا اور اس کے طرف دار بن گئے، لہٰذا اس وجہ سے بھی سب کے سب گناہ گار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا﴾ [سورۂ آل عمران، رکوع:۱۱]

’’اللہ کی رسی کو، یعنی اللہ کے حکموں اور قانون کو سب مل کر خوب مضبوط پکڑے رہو۔ اللہ کے حکموں اور قانون کی پابندی میں سب ایک جماعت ہو کر رہو اور فرقہ فرقہ نہ بنو۔‘‘

یعنی جماعت میں پھوٹ نہ ڈالو اور جماعت کو درہم برہم نہ کرو اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مذکورہ صدر لوگوں نے اس حکم اور قانون کی خلاف ورزی کی، ایک جماعت ہو کر نہ رہے، بلکہ شخص مذکور بالا کے طرف دار ہو کر جماعت میں پھوٹ ڈال دی اور جماعت کو درہم برہم کر دیا، پس یہ لوگ اس وجہ سے بھی گنہگار ہوئے، لہٰذا ان سب کو چاہیے کہ توبہ کر کے اس گندگی سے پاک ہو کر آپس میں مل کر اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جائیں۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد اللّٰه (۲۰/ صفر ۱۳۳۲ھ)



كتاب الحظر و الإباحة



کیا وعظ کا مندرجہ ذیل طریقہ درست ہے؟

سوال اشتہار مندرجہ ذیل ایک شخص موحد اہلِ حدیث نے بغرضِ وعظ چھپوا کر شایع کیا اور اس کی غرض اس مضمون کے اشتہار سے یہ تھی کہ اگر معمولی وعظ کا اشتہار دیا جائے گا تو بہت ہی کم آدمی جمع ہوں گے اور جب میلاد شریف کے نام سے اشتہار کی سرخی اور مضمون ہوگا، تو حسبِ عادت اکثر لوگ جمع ہو کر حق بات سنیں گے اور اس ضمن میں مجلسِ مولود مروجہ مخترعہ کا رد بھی ہو جائے گا اور دیگر مسائل ضروریہ کا، جس سے اکثر عوام الناس غافل ہیں، بیان ہو جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جناب مولانا عبدالتواب صاحب، جن کا نام اس اشتہار میں درج ہے، اول وعظ شروع کرتے ہی یہ کہا کہ میں اپنے تمام وعظ میں قرآن و حدیث کے سوا اور کچھ بیان نہیں کروں گا، چنانچہ اسی طرح سے ان کا وعظ اول سے اخیر تک ہوا اور مجلس مولود مروجہ مخترعہ کا نہایت عمدگی سے رد بیان کر کے یہ کہا کہ اگر مجلسِ مولود سے عوام الناس کی یہ مراد ہے کہ آنحضرت ﷺ کے مناقب و محامد اور معجزات کا بیان ہو تو میں صحیح صحیح حدیثیں اس بارے میں پڑھ کر ان کا بیان کرتا ہوں، اس سے بہتر ان کے نزدیک اور مولود کیا ہوگا، چنانچہ مولانا نے بہت سی احادیث بالفاظہا و بعباراتہا آنحضرت ﷺ کے مناقب و محامد و معجزات میں پڑھ کر ترجمہ کر کے بیان کیا اور مجلسِ مولود مروجہ کی خوب خوب تردید فرمائی، پھر بے نمازوں، تارکین اور زکاۃ نہ دینے والوں، سود کا لین دین کرنے والوں، ڈاڑھی منڈانے والوں، ٹخنوں سے نیچے ازار، پائجامہ لٹکانے والوں وغیرہ وغیرہ مخالفینِ شریعت کو ترہیب و ترغیب کے مضامین کی بہت حدیثیں پڑھ کر خوب فہمایش کی۔ غرض اول سے آخر تک اسی قسم کا بیان ہوا۔ کوئی بیان اہلِ حدیث کے خلاف نہیں ہوا۔

اس جلسہ میں حنفیوں کی بہت بڑی جماعت تھی اور اہلِ حدیث بھی بکثرت تھے۔ دونوں گروہ کے بعض علما بھی اس جلسہ میں موجود تھے۔ تمام اہلِ حدیث حاضرین ان کے بیان سے بہت خوش ہوئے اور کسی اہلِ حدیث کے نزدیک کوئی بات خلاف نہیں بیان ہوئی۔ منصفین مقلدین حنفیہ نے بھی ان کے وعظ کو بہت پسند کیا اور وعظ کے پر اثر ہونے کی تعریف کی۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسے عوام الناس کو جن کے کان میں کبھی حق بات نہیں پہنچی اور علمائے اہلِ حدیث سے بدظن اور بدعقیدہ رہتے ہوں اور ان کے وعظ سے نفرت کرتے ہوں اور اہلِ حدیث کا نام سن کر پاس تک نہ آتے ہوں اور اہلِ حدیث کی نسبت ظنی اور شیعا عتقاد رکھتے ہوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت ان کے دلوں میں نہیں ہے اور

آنحضرت ﷺ کے مناقب و محامد کے یہ لوگ منکر ہیں اور مجلسِ میلا د مروجہ محدثہ سے از حد اعتقاد رکھتے ہوں وغیرہ وغیرہ، حیلہ جلسہ میلا د شریف کے ذریعے سے، یعنی مولود کا نام لے کر جمع کرنا اور ان کو اسی مجلس محدثہ کا بعنوان احسن ردسنانا اور واقعی سچے سچے صحیح صحیح مناقب و محامد اور معجزات آنحضرت ﷺ کے سنانا اور دیگر مسائل ضروریہ کی طرف ترغیب دلانا جائز ہے یا نہیں اور جو شخص اس طریقے سے وعظ کہنے کو گمراہوں کا طریقہ بتلائے اور ایسا کرنے والوں کو بدعتی فاسق سمجھے اور مجلس مولود مروجہ محدثہ کے ارتکاب کا الزام لگائے وہ کیسا ہے؟ اشتہار یہ ہے:

جلسہ وعظ میلا د شریف

اے عاشقانِ محبانِ رسول! اگر آپ کو اپنے سچے پیغمبر کی ذرا سی بھی سچی محبت ہے تو میری اس خوش خبری کو جو اپنے لیے محض فلاحِ دارین ہے، گوشِ دل سے سنیے۔ ہمارے سچے پیغمبر سید المرسلین، خاتم النبیین کا ارشاد ہے کہ ایسی مجلس ایسے جلسوں کو خدا کے مقرب فرشتے کی جماعت ڈھونڈتی پھرتی ہے کہ جہاں خدا کا ذکر اور اس کے سچے پیغمبر پر درود پڑھا جاتا ہو اور اس مجلس میں بیٹھ کر ذکرِ خدا کے سننے والوں کے لیے خدا کے فرشتے دعاے مغفرت کرتے ہیں۔ بھلا آپ خیال تو فرمایئے کہ جس کے لیے خدا کے فرشتے دعاے مغفرت کریں، وہ اس جلسہ سے گنہگار جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

اے برادرانِ دینی! میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آج کل اس شہر کلکتہ میں نائب رسول فاضل اکمل و بے مثل مولانا مولوی حافظ حاجی عبد التواب صاحب غزنوی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ آپ کا بیان جادو کی طرح اثر کرنے والا، دلوں کو ہلا دینے والا، واقعی ایسا ہے کہ ممکن نہیں کہ جس میں ذرا سی بھی بو مسلمان کی ہو اور آپ کا بیان سن کر بے ساختہ نہ رونے لگے۔ یہ محض فضل خدا کا عنایت کیا ہوا ہے۔ آپ حافظ قرآن ہیں اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہمارے محبوب سید المرسلین کی احادیثِ شریفہ کے بھی حافظ ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس کا سینہ کلامِ ربانی اور حدیثِ نبوی سے منور ہو، اس کا بیان کس قدر پُر اثر پُر درد ہوگا؟ آپ نے ہزارہا مرتبہ مولود شریف اور وعظ سن کر فائدے اٹھائے ہوں گے، مگر مولانا صاحب ممدوح جس جس خوبی سے سرور کائنات، شفیع المذنبین، خاتم النبیین کے معجزات اور آپ کا ذکرِ ولادت بیان فرمائیں گے، آپ سن کر ہونٹ چاٹتے رہ جائیں گے۔ ممکن نہیں کہ آپ کے پُردرد، پُرزور، حیرت انگیز، دلوں کو ہلا دینے والا، سوتوں کو چونکا دینے والا بیان سن کر ہوش نہ آ جائے اور اپنی عاقبت کی درستی کی فکر نہ کرے۔

اے اہلِ اسلام! آپ کی ایسی حالت پر صد افسوس اور ایسی زندگی کو کف افسوس مل کر گزارنے پر کہ آپ جیسے ہادی برحق کی ہدایت سے محروم رہ جائیں۔ چونکہ یہ منشا ہے کہ عوام برادرانِ اسلام اس نعمت غیر مترقبہ سے محروم نہ رہ جائیں، اس لیے عام حضرات کی فرصت کا یہ دن یعنی اتوار کی صبح آٹھ بجے حافظ جمال الدین صاحب کی مسجد جائے جلسہ مولود شریف قرار دی گئی ہے، یعنی مسجد جمال الدین (واقعہ بازار سٹینڈ دریہ پٹی) میں ۱۹/ اگست ۱۹۰۸ء مطابق ۱۱/ رجب ۱۳۲۶ھ روز اتوار ۸ بجے صبح سے مولانا موصوف کا بیان شروع ہوگا۔ امید ہے کہ ہر مسلمان اس جلسہ میں شریک ہو کر فلاحِ دارین حاصل کرے گا۔ خیر خواہ احمد حسین مقیم۔ کولوٹولہ۔

جواب طریقہ وعظ مندرجہ سوال میری دانست میں جائز ہے، اس طریقے کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ مجھے معلوم نہیں ہوتی اور جو شخص طریقہ مذکورہ کو گمراہوں کا طریقہ بتلائے یا اس طریقے سے وعظ کہنے والوں کو بدعتی، فاسق سمجھے اور مجلس مولود مروجہ محدثہ کے ارتکاب کا الزام لگائے، اس کا بارِ ثبوت اس کے ذمہ ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (٢٩/ ذيقعدة ١٣٢٦هـ)

دوا کی حلت اور قسم کا کفارہ:

سوال ایک شخص کو مرضِ طحال ہے۔ طحال کے اوپر ایک دوا ضماد کیا، اس کے ضماد کرنے سے اس کو بہت سوزش و جلن پیدا ہوئی، اُس حالت میں نہایت بے قرار ہوا اور اُس وقت اس نے کہا کہ اے پروردگار! اگر جلن و سوزش ہماری تو رفع کر دے تو ہم آج سے کسی قسم کا علاج کھانے یا لگانے کا نہیں کریں گے۔ بعد ایک گھنٹہ کے سوزش و جلن اُس شخص کی جاتی رہی، مگر صحت نہیں ہوئی اور طحال موجود ہے، اس کے والدین و اپنے یگانے و محلے کے لوگ واسطے کھانے دوا کے کوشاں ہیں، مگر وہ شخص بوجہ کرنے وعدہ کے دوا کھانے سے انکار کرتا ہے، اس لیے ملتمس ہے کہ شرع اجازت دوا کھانے یا لگانے کی دیتی ہے یا نہیں؟

جواب صورت مسئولہ میں وہ شخص دوا کھائے اور لگائے اور جو صورت جائز علاج کی ہو، عمل میں لائے، شرعاً اُس کو سب جائز ہے، لیکن اگر ایسا کرے تو اس کو کفارہ دینا ہوگا اور اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ قسم کا کفارہ قرآن مجید پارہ ہفتم رکوع ۲ میں مذکور ہے، وہاں دیکھنا چاہیے۔[1] صحیح مسلم (۱/ ۴۵) میں ہے:

عن عقبة بن عامر أنه قال: نذرت أختي أن تمشي إلى بيت الله حافية فأمرتني أن أستفتي لها رسول اللهﷺ فاستفتيته فقال: «لتمش ولتركب»[2]

[عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری بہن نے ننگے پاؤں بیت اللہ کی طرف جانے (اور حج کرنے) کی نذر مان لی۔ پھر مجھے حکم دیا کہ میں ان کے لیے رسول اللہ ﷺ سے اس مسئلے کو دریافت کروں، سو میں نے آپ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ چلے اور سواری پر بیٹھے]

---

[1] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَ احْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [المائدة:٨٩]

''اللہ تم سے تمھاری قسموں میں لغو پر مواخذہ نہیں کرتا اور لیکن تم سے اس پر مواخذہ کرتا ہے جو تم نے پختہ ارادے سے قسمیں کھائیں تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، درمیانے درجے کا، جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک گردن آزاد کرنا، پھر جو نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھالو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم شکر کرو''

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث ([illegible])

وعن عقبة بن عامر عن رسول اللهﷺ قال: «كفارة النذر كفارة اليمين»[1]

[عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نذر کا کفارہ قسم والا ہے] والله أعلم بالصواب.

تمباکو یا سرتی کھانا:

سوال کیا تمباکو یا سُرتی کھانا درست ہے؟

جواب جو شخص تمباکو یا سُرتی کھاتا کھلاتا نہیں، وہ اس شخص سے بہتر ہے جو کھاتا کھلاتا ہے۔

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

غیر شرعی کتابوں کی فروخت اور شراب یا تاڑی کا سرکہ بنانا:

سوال ① کیا تصویر دار یا غیر مذہب کی کتابیں فروخت کرنا جائز ہے؟

② کیا ایسی کتابوں کی جلدیں باندھنا درست ہے؟

③ کیا شراب یا تاڑی کا سرکہ بنانا جائز ہے؟

جواب ① و ② تصویر دار یا غیر مذہب کی کتابیں فروخت کرنا یا ان کی جلد باندھنا جائز نہیں۔

③ شراب یا تاڑی کا سرکہ بنانا جائز نہیں اور اگر بنا ہوا مل جائے تو اس کا فروخت کرنا جائز ہے۔

تمباکو اور نسوار استعمال کرنا:

سوال زردہ تمباکو [تمباکو والا پان] کا کھانا اور سونگھنی [نسوار] کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: خاکسار محمد اسرائیل۔کفاہ الوکیل۔کرمجوی بیر بھومی، موضع کرمی، ڈاکخانہ رودرانگر، ضلع بیر بھوم (بنگال)

جواب زردہ تمباکو کا کھانا اور سونگھنی کا استعمال کرنا، اس شخص کو جس کو کسی بیماری کی وجہ سے ضرورت ہو، بقدر ضرورت جائز ہے اور بلا ضرورت جائز نہیں، کیونکہ اس قسم کی چیزیں از قبیل دوا ہیں اور دوا کا استعمال حالتِ مرض میں جائز ہے اور حالتِ صحت میں ناجائز، کیونکہ حالتِ صحت میں بجائے مفید ہونے کے مضر ہے اور مضر چیزوں کا استعمال جس وقت مضر ہو، جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ [البقرة: ٢٩] [وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے، سب تمھارے لیے پیدا کیا]

اس آیتِ کریمہ میں لفظ ﴿لَكُمْ﴾ جس میں لام نفع کے لیے ہے، ملاحظہ طلب ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز جس وقت مضر ہو، اس وقت اس کے استعمال کی اجازت نہیں ہے، بلکہ جس وقت مفید ہو، اسی وقت اس کے استعمال کی اجازت ہے۔[2] واللہ تعالیٰ أعلم

کتبہ: محمد عبد اللہ (٢/ ذي القعدة ١٣٣٥ھ)

---

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٤٥)

② مسودہ کتاب میں یہاں حاشیے میں سرقوم ہے: ''اس جواب میں نظر ہے، غور کر کے درست کرو'' کیوں کہ جب تمباکو اور نسوار نشہ آور چیزوں میں شامل ہیں تو پھر انھیں دوا کے طور پر استعمال کرنا بھی ناجائز ہے، اس لیے کہ حرام چیز کو دوا میں استعمال کرنے کی ممانعت ہے اور اس کے ذریعے شفا حاصل نہیں ہوتی، بلکہ وہ مزید نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ مزید برآں مولانا مختار احمد ندوی ←

ڈاکٹری علاج اور تمباکو کی خرید وفروخت کرنا:

سوال ڈاکٹری علاج اور تمباکو کو خرید وفروخت کرنا قرآن وحدیث کے رو سے جائز ہے کہ نہیں؟ راقم: کرامت علی

جواب ① تمباکو کی حرمت میں اختلاف ہے، اس کی حرمت پر کوئی قطعی دلیل قائم نہیں اور اصل اشیا میں حلت ہے۔ لقوله تعالیٰ: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ [البقرة: ۲۹] وأمثال ذلك. [وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے، سب تمھارے لیے پیدا کیا]

جب تک اس کی حرمت پر کوئی کافی دلیل قائم نہ ہو، حرمت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، ہاں بعض چیزیں اس قسم کی بھی ہیں، جن کی حلت یا حرمت صاف صاف وارد نہیں ہوئی ہے، اس وجہ سے بہت لوگوں پر اُن کی حلت اور حرمت مشتبہ رہتی ہے، اس قسم کی چیزوں کا حکم یہ ہے کہ ان کے استعمال سے، یعنی کھانے پینے اور بیچنے خریدنے سے پرہیز کرنا اولیٰ ہے اور ان سے پرہیز کرنے والے استعمال میں لانے والے سے بہتر ہیں۔ بخاری شریف (ص: ۱۳ مطبع احمدی) میں ہے:

«الحلال بين، والحرام بين، وبينهما مشتبهات، لا يعلمها كثير من الناس فمن اتقى المشتبهات استبرأ لدينه وعرضه، ومن وقع في المشتبهات كراع يرعىٰ حول الحمىٰ يوشك أن يواقعه»[1] الحديث

[حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، جبکہ ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں، بہت سے لوگ انھیں نہیں جانتے، پس جو شخص شبہات سے بچ گیا تو اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا اور جو شخص شبہات میں مبتلا ہوگیا، وہ اس چرواہے کی طرح ہے جو چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے، تو قریب ہے کہ وہ اس (چراگاہ) میں چرائے گا]

② اگر ڈاکٹری دوا میں کوئی حرام چیز نہ پڑی ہو تو جائز ہے، ورنہ بلا ضرورت ناجائز۔ ہاں ناچاری کے وقت وہ بھی جائز ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (البقرة: ۲۹) [وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے، سب تمھارے لیے پیدا کیا] والله أعلم بالصواب.

كتبه: عبد الأحد عفي عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله.

شطرنج کھیلنا:

سوال شطرنج بلا شرط کھیلنا جائز ہے یا نہیں؟

← نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حافظ صاحب غازی پوری پٹنہ تشریف لے گئے تو وہاں ایک مجلس میں آپ سے سگریٹ نوشی اور پان خوری کی بابت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ دونوں چیزیں حرام ہیں۔ اس لیے کہ یہ نہ دوا ہیں نہ غذا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی پاکیزہ چیزوں کو دونوں ہی مقصد سے پیدا کیا ہے کہ یا تو وہ دوا کا کام دیتی ہیں یا غذا کا اور سگریٹ بیڑی نہ دوا ہیں نہ غذا۔ اس لیے ان کا استعمال اسراف ہے اور اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (مجلّہ ''البلاغ'' اکتوبر ۱۹۹۹ء)

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵۹۹)

جواب شطرنج بلا شرط کے جواز یا حرمت پر کوئی قطعی دلیل نہیں قائم ہے اور اسی واسطے علما کی رائے اس مسئلے میں مختلف ہے۔شوافع اور جماع تابعین اس کی کراہت کے قائل ہیں۔امام مالک اور امام احمد حرام کہتے ہیں۔صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی مختلف اقوال منقول ہیں۔ابن عباس، ابن عمر، ابو موسیٰ اشعری، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے کراہت مروی ہے۔ابو ہریرہ و ابن عباس رضی اللہ عنہم سے دوسری روایت میں اباحت۔تابعین میں سے ابن سیرین، ہشام بن عروہ، سعید بن المسیبؒ اور ابنِ جبیر رحمہم اللہ اباحت کے قائل ہیں۔ایسی حدیثیں بھی روایت کی گئی ہیں، جو اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں، مگر ابنِ کثیر نے کہا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں اور چونکہ اس کی ایجاد بھی زمانہ صحابہ میں بیان کی گئی ہے، اس سے عدمِ صحت کی تائید ہوتی ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو مَیْسِر میں شمار کیا ہے اور میسر کی حرمت پر نصِ قطعی دال ہے۔
(نيل الأوطار: ٧/ ٣٠٨ تا ٣٠١)

بہر کیف شطرنج کی حرمت باسمہ ثابت ہو یا نہ ہو، مگر اس میں کچھ شک خلاف نہیں کہ یہ لہو میں داخل ہے اور لہو خود منہی عنہ ہے۔پس بہتر ہے کہ آدمی حتی الوسع اس سے احتراز کرے۔ واللہ أعلم بالصواب.

كتبه: علي أصغر، عفا الله عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله

عبادتِ بدنی کا معاوضہ:

سوال عبادتِ بدنی کا معاوضہ مال سے یا غلہ سے بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب صوم جو ایک عبادت بدنی ہے، اس کا معاوضہ تو ایک خاص صورت میں طعام سے آیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:
﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (البقرة: ١٨٤) [اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے] اس کے سوا اور کسی صورت میں عبادت بدنی کا معاوضہ کسی صحیح حدیث مرفوع میں مجھے یاد نہیں آتا۔

حقہ پینا:

سوال حقہ پینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جائز تو کس دلیل سے؟

جواب اس کی حرمت پر کوئی صریح دلیل نہیں ہے، لیکن بوجہ اختلاف اس سے اجتناب و تنزہ بہتر ہے اور نہ پینے والے پینے والے سے اچھے ہیں۔

شوہر کا عملِ ولادت سرانجام دینا:

سوال عورت حاملہ ہے، جس وقت اس کو لڑکا پیدا ہونے کا درد شروع ہو، اس وقت دائی کے بجائے اپنے ہاتھ سے عملِ ولادت سرانجام دینا چاہیے یا نہیں؟

جواب ولادت کے وقت کا کام جس عورت سے انجام پا سکے کر سکتی ہے، دائی کی شرط نہیں اور شوہر بھی اس کام کو کر سکتا ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

كتبه: أبو العلىٰ محمد عبد الرحمن المباركفوري. عفا الله عنه. الأجوبة صحيحة. كتبه: محمد عبدالله. المجيب مصيب عندي، والله أعلم بالصواب. أبو محمد إبراهيم، مهتمم مدرسه أحمديه، آره.

حلال جانور کا چمڑا اُتارنا:

سوال حلال چیز یعنی گائے اور بھینس مرجانے کے بعد اس کا چمڑا نکالنا چاہیے یا نہیں؟

جواب حلال جانور کے مرجانے کے بعد اس کا چمڑا نکال لینا چاہیے۔

عن ميمونة رضي الله عنها قالت: مر رسول الله ﷺ بشاة يجرونها، فقال: «لو أخذتم إهابها؟» فقالوا: إنها ميتة! فقال: «يطهرها الماء والقرظ»[1]

(أخرجه أبو داود والنسائي. بلوغ المرام، ص: ٥، مطبوعه بهوپال)

[میمونہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک بکری کے پاس سے گزرے، جس کو لوگ گھسیٹے جا رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ تم اس کا چمڑا ہی اُتار لیتے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مردار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پانی اور قرظ (کیکر کی مانند ایک درخت جو چمڑا صاف کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے) اسے پاک کر دیتا ہے]

تائب ہونے کے بعد سود کا پیسا حلال ہے:

سوال ایک آدمی نے سود سے پیسہ جمع کیا اور اللہ نے یک بیک ہدایت کیا تو توبہ کر ڈالا اور سود چھوڑ دیا، اب وہ پیسہ کیسا ہے؟

جواب جس آدمی نے سود سے پیسہ جمع کیا تھا اور بتوفیقِ خداوندی سود سے تائب ہوگیا تو اب وہ پیسہ حلال ہوگیا:

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ [البقرة: ٢٧٥]

[پھر جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت آئے، پس وہ باز آجائے تو جو پہلے ہو چکا، وہ اسی کا ہے]

تائب ہونے کے بعد زنا والی آمدن حلال ہے:

سوال ایک عورت نے زنا سے پیسہ جمع کیا اور پھر توبہ کر ڈالی، اب اس پیسے سے زکوۃ دے سکتی ہے اور حج کر سکتی ہے اور صدقہ دے سکتی ہے اور کھانا کھلا سکتی ہے یا نہیں اور کھانے والے پر الزام شرعی آ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب جس عورت نے زنا سے پیسہ جمع کیا اور پھر بتوفیقِ الٰہی اس سے تائب ہوگئی تو وہ پیسہ بھی حلال ہوگیا:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [الفرقان: ٧٠]

[مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا نیک عمل تو یہ لوگ ہیں، جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٠)

بدل دے گا اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے]

جب پیسہ حلال ہوگیا تو اس پیسے سے صدقہ وزکوۃ بھی دے سکتی ہے اور حج بھی کر سکتی ہے اور دوسروں کو کھانا بھی کھلا سکتی ہے اور کھانے والے پر کوئی الزام شرعی بھی نہیں آ سکتا۔

بیل گاڑی پر سواری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال بیل گاڑی پر سواری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب بیل گاڑی پر سوار ہونا جائز ہے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ ایک بقر (بیل) ہانکے لیے جاتا تھا، اتفاقاً تھک کر اس پر سوار ہولیا، اللہ تعالیٰ نے اسے بولنے کی طاقت دی، وہ بولا کہ ہم سواری کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں، ہم تو کھیتی کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس کے بولنے پر لوگوں نے تعجب کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ کی قدرت سے بعید نہیں ہے، میں بھی اس پر ایمان رکھتا ہوں اور ابوبکر وعمر بھی، حالانکہ وہ دونوں صاحب رضی اللہ عنہما اس جگہ موجود نہ تھے۔

حدیثِ مذکور کے الفاظ یہ ہیں:

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال: « بينما رجل يسوق بقرة، إذا عيي فركبها فقالت: إنا لم نخلق لهذا، إنما خلقنا لحراثة الأرض » فقال الناس: سبحان الله! بقرة تكلم. فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: « فإني أومن به أنا و أبو بكر و عمر » وما هما ثم.[1] الحديث

(متفق عليه، مشكوة شريف، ص: ٤٦٦)

[سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس اثنا میں کہ ایک آدمی گائے ہانک رہا تھا، جب وہ تھک گیا تو وہ اس پر سوار ہوگیا، اس نے کہا: ہمیں اس لیے نہیں پیدا کیا گیا، ہمیں تو کھیت کاشت کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔'' لوگوں نے کہا: سبحان اللہ! گائے کلام کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس پر ایمان رکھتا ہوں، ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔'' اور وہ دونوں اس وقت وہاں موجود نہیں تھے]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بقر پر سواری کرنا ناجائز ہے اور چونکہ بیل گاڑی میں بھی بیل جوتتی ہیں، اس لیے بیل گاڑی پر بھی سواری کرنا ناجائز ہوگا، تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بیل گاڑی پر سوار ہونا اس حدیث سے ناجائز ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ جو شخص بیل گاڑی پر سوار ہوتا ہے، حقیقت میں وہ شخص گاڑی پر سوار رہتا ہے، نہ کہ بیل پر، ہاں بیل اس گاڑی کو کھینچتی ہیں تو اس حدیث سے بیل گاڑی کی سواری کی ناجوازی ثابت نہیں ہوتی۔ والله أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ) الجواب صحيح. محمد عبد الرحمن المباركفوري. المجيب مصيب. وصيت علي.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٨)

کیا جانوروں کو خصی کرنا درست ہے؟

سوال جانوروں کا خصی کرنا کیسا ہے؟ قرآن اور حدیث سے مدلل ارقام فرمایا جائے۔

جواب قرآن اور حدیث سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جانوروں کا خصی کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تغییر خلق اللہ ہے اور تغییر خلق اللہ ناجائز ہے۔ سورۂ نساء میں ہے: ﴿وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ [النساء: ۱۱۹]

[اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت بدلیں گے]

مشکوۃ (ص: ۳۷۳) میں ہے:

"عن عبداللّٰه بن مسعود قال: لعن اللّٰه الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق اللّٰه" الحديث.[1] (متفق عليه)

[سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے بدن گودنے والیوں اور بدن گدوانے والیوں، (چہرے اور پلکوں کے) بال نوچنے والیوں اور حسن کی خاطر دانتوں کو باریک اور تیز کرنے والیوں، اللہ کی تخلیق کو بدلنے والیوں پر لعنت فرمائی]

تفسیر ابن جریر (۳/ ۱۹۶) میں ہے:

"﴿وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ قال ابن عباس: يعني بذلك خصى الدواب، وكذا روي عن ابن عمر و أنس و سعيد بن المسيب وعكرمة وأبي عياض وقتادة وأبي صالح والثوري، وقد ورد في حديث النهي عن ذلك" اھ

[عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت: ﴿وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ "اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت بدلیں گے۔" میں اللہ کی خلق کو بدلنے سے مراد جانوروں کو خصی کرنا ہے۔ ابن عمر، انس، سعید بن میسّب، عکرمہ، ابی عیاض، قتادہ، ابو صالح اور ثوری رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے اور حدیث میں اس (خصی کرنے سے) ممانعت موجود ہے]

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ بدھیا [خصی] کرنا کسی جانور کا جائز ہے یا نہیں؟

محمد حنیف۔ عفا اللہ عنہ (۴/ ذیقعدہ ۱۳۱۳ھ)

جواب بدھیا کرنا کسی جانور کا جائز نہیں ہے۔ یہ تغییر خلق اللہ ہے اور اس کی نسبت اذن خداوندی کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں ہے اور تغییر خلق اللہ بلا اذن خداوندی جائز نہیں ہے۔ ﴿وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ (سورہ نساء، رکوع ۱۷) [اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت بدلیں گے]

واللّٰه أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد اللّٰه

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢٥)

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خصی کرنا جانوروں کا درست ہے یا نہیں؟[1]

جواب درست نہیں ہے۔

"عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: نهى النبي ﷺ عن إخصاء الخيل والبهائم، قال ابن عمر: فيها نماء الخلق"[2] رواه أحمد كذا في المنتقى

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے گھوڑوں اور چار پایوں کو خصی کرنے سے منع فرمایا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ اس (خصی کرنے) میں خلق کی نشو و نما اور فروغ ہے۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے، جیسا کہ منتقی الاخبار میں ہے]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ "نیل الأوطار" میں فرماتے ہیں:

"حديث ابن عمر في إسناده عبد الله بن نافع، وهو ضعيف، وأخرج البزار بإسناد صحيح من حديث ابن عباس رضي الله عنهما أن النبي ﷺ نهى عن صبر الروح وعن إخصاء البهائم نهياً شديدا، قوله: "عن إخصاء الخيل" الإخصاء سل الخصية، قال في القاموس: وخصاه خصيا: سل خصيته. وفيه دليل على تحريم خصي الحيوانات، وقول ابن عمر رضي الله عنهما: فيها نماء الخلق أي زيادته، أشار إلى أن الخصى مما تنموا به الحيوانات، ولكن ليس كل ما كان جالباً لنفع يكون حلالا، بل لا بد في عدم المانع، وإيلام الحيوان ههنا مانع لأنه إيلام، لم يأذن به الشارع بل نهى عنه"[3] انتهى

[عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی اسناد میں عبداللہ بن نافع راوی ضعیف ہے۔ امام بزار نے صحیح اسناد کے ساتھ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے ذی روح چیز کو باندھنے (اور اسے قتل کرنے) اور جانوروں کو خصی کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اخصا کا معنی خصیے کو نکالنا اور ایسے ہی فیروز آبادی نے قاموس میں لکھا ہے، اس میں حیوانات کو خصی کرنے کی حرمت کی دلیل ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا خصی کرنے کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے خلق کی نشو و نما ہوتی ہے، یعنی اس میں بڑھوتری ہوتی ہے، انھوں نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ خصی کرنا ایک ایسا عمل ہے، جس سے حیوانات میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ چیز، جو کسی نفع کو حاصل کرنے والی ہو، وہ حلال ہو، بلکہ یہاں عدمِ مانع کا ہونا ضروری ہے اور یہاں جانور کی اذیت مانع ہے، کیوں کہ خصی کرنے میں جانور کو ایک ایسی

[1] فتاویٰ مولانا ابو المکارم مئوی (ص: ۴۸)

[2] مسند أحمد (۲/ ۲٤) اس کی سند میں عبداللہ بن نافع ضعیف ہے۔

[3] نيل الأوطار (۸/ ۱٦۷)

تکلیف دینا ہے، جس کی شارع علیہ السلام نے اجازت نہیں دی، بلکہ اس سے منع کر رکھا ہے]

آیت: ﴿وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ بھی اس کی موید ہے، نیز وہ آثار جن کو مفسرین نے اس آیت کے تحت نقل کیا ہے۔ درایہ تخریج احادیثِ ہدایہ میں ہے:

"وذكر ابن أبي شيبة عن ابن عباس قال: خصاء البهائم مثلة، ثم تلا: ﴿وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ وأخرجه عبد الرزاق عن مجاهد نحوه، وعن شهر بن حوشب قال: الخصاء مثلة"[1] انتهى

[ابن ابی شیبہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: جانوروں کو خصی کرنا مثلہ ہے، پھر انھوں نے اس فرمانِ باری تعالیٰ کی تلاوت کی: ﴿وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ عبدالرزاق نے مجاہد سے بھی اسی طرح کی روایت بیان کی ہے۔ نیز شہر بن حوشب سے بھی یوں روایت کی ہے کہ خصی کرنا مثلہ ہے]

گو علماے حنفیہ و شافعیہ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اگر یہ حدیث ان پر حجت ہے (تو) جو صاحب اس کے جواز کے (قائل) ہوں تو ان پر اس حدیث کا جواب معقول دینا واجب ہے۔ درصورت معقول جواب ہم بھی اپنے اس فتوے سے رجوع کر جائیں گے۔ (ہم کو) امرِ حق کے قبول کرنے میں کچھ عار نہ ہوگا۔ درصورت رجوع بھی اس قدر ہم ضرور کہیں گے کہ احتیاط قولِ حرمت میں ہے: "إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام" [جب حلال و حرام مجتمع ہو جائیں تو حرام ہونا غالب ہوتا ہے] اصول کا مسئلہ ہے۔

والله أعلم وعلمه أحكم وأنا الفقير الراجي إلى رحمة الله العلي: أبو المكارم محمد علي -وقاه الله كل دين وحلاه بكل زين- المئوي الأعظم گڈھی. **ابوالمکارم محمد علی (۱۳۰۵)**

الجواب صحيح على الراجح عندي، و لما ذكره المجيب دلائل أخرى سواه. والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

مسروقہ مال مالک کی وفات کے بعد کس کے سپرد کیا جائے؟

سوال بکر نے اپنی ممانی ہندہ کا طلائی زیور چرا لیا اور خرچ کر ڈالا، جس کی قیمت مبلغ ۸۰ر روپیہ تھی، بعد ازاں جب بکر کو خوفِ خدا غالب ہوا، تب اس نے ادا کرنا چاہا، لیکن کوئی صورت اس کے یک مشت یا تھوڑا تھوڑا ادا کرنے کی نہ تھی اور اسی وجہ سے بکر نے ہندہ سے اس امر کو پوشیدہ رکھا اور ہندہ کو بکر کی جانب کسی قسم کا خیال دزدی [چوری] کا نہ ہوا۔ بعدہ ہندہ نے انتقال کیا۔ بعد انتقال کے بکر ہندہ کی طرف سے جس قدر قیمت مال مسروقہ کی تھی، مثل تیاری مسجد، مدرسہ و مساکین وغیرہ میں خرچ کرتا ہے اور اس کی نیت یہ ہے کہ کل روپیہ جس قدر کہ اس نے چرایا تھا، اسی طرح خیرات کر دی، تو اب خدا کا مواخذہ اس پر ہوگا یا نہیں اور ہندہ مال کے پانے کی مستحق قیامت میں ہوگی یا نہیں؟

[1] الدراية لابن حجر (۲/ ۲۳۰)

جواب اس صورت میں اگر ہندہ کے وارث موجود نہیں ہیں، تب خیرات کرنا بکر کا ہندہ کی طرف سے درست ہے اور اگر ہندہ کے ورثہ موجود ہیں تو وہ مال وارثوں کا ہوگیا، کیونکہ یہ مال ہندہ کا متروکہ ہے اور جو مال متروکہ ہوتا ہے، وہ حق ورثہ کا ہوتا ہے، اس لیے یہ بھی حق ورثہ کا ہے، پس اگر ورثہ کو دے دے گا یا ورثہ معاف کر دیں گے، تب مواخذہ نہ ہوگا اور اگر نہ دے گا یا ورثہ معاف نہ کریں گے تو ورثہ مستحق اس مال کے قیامت میں ہوں گے اور بکر سے مواخذہ ہوگا۔ واللہ أعلم بالصواب. كتبه: محمد حنيف. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله

ملازم کو رشوت دینا:

سوال مستغیث لوگ موافق دستور کے ایک روپیہ محرر تھانہ کو دیا کرتے ہیں، تحریر کے لقب سے، یہ رشوت میں داخل ہے یا نہیں؟ اور یہ روپیہ لینا قانوناً جرم بھی ہے اگر باضابطہ شہادت گزرے تو سزا بھی ممکن ہے۔

جواب اس قسم کی تحریر کا روپیہ لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ محرر تحریر ہی کے عوض میں تنخواہ لیتا ہے، پھر تحریر کے لقب سے کچھ اور لینا ناجائز ہے۔

عن أبي حميد الساعدي رضي الله عنه قال: استعمل النبي صلی اللہ علیہ وسلم رجلا من بني أسد يقال له: ابن اللتبية، على صدقة، فلما قدم قال: هذا لكم، وهذا أهدي لي، فقام النبي صلی اللہ علیہ وسلم على المنبر فحمد الله وأثنى عليه، ثم قال: «ما بال العامل نبعثه فيأتي فيقول: هذا لك وهذا لي، فهلا جلس في بيت أبيه وأمه فينظر أيهدى له أم لا؟»[1] الحديث

بخاري شريف باب هدايا العمال (ص: ١٠٦٤، مطبوعہ نظامی)

''ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنی اسد کے ایک شخص کو جس کو ابن لتبیہ کہا کرتے ہیں، تحصیلدار کر کے بھیجا۔ جب وہ واپس آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ یہ مال حضور کا ہے اور یہ مجھ کو ہدیہ دیا گیا ہے، تو آپ نے منبر پر یہ فرمایا کہ کیا حال تحصیلداروں کا ہے کہ ہم ان کو تحصیل کے لیے بھیجتے ہیں تو وہ آ کر کہتے ہیں کہ یہ مال آپ کا ہے اور یہ میرا ہے؟ اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھے، پھر دیکھتے کہ ان کو ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں؟'' (آخر حدیث تک) والله أعلم بالصواب.

حرره: محمد حنيف المحمد آبادي وفاه الله ذو الأيادي. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله. صح الجواب، والله أعلم بالصواب. حرره: راجي رحمة الله أبو الهدى محمد سلامت الله الأعظم گڈھی.

گھریلو جانور کا دوسروں کا اناج وغیرہ کھانا:

سوال کبوتر و مرغیات و بط جن کو بیشتر لوگ پرورش کرتے ہیں اور خوراک نہیں دیتے ہیں یا خوراک مالا یکفی دیتے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٢)

ہیں کہ جس سے ان کی سیری نہیں ہوتی اور وہ جانور ان دوسروں کے مال و جائداد سے پرورش پاتے ہیں، ان جانوروں کا گوشت کھانا پالنے والے کے لیے حلال ہے یا حرام اور ایسے جانوروں کی بیع جائز ہے یا ناجائز اور اس کی خریداری کیسی ہے اور اس طرح پرورش جانوروں کی جائز ہے یا نہیں؟

جواب ان جانوروں کا گوشت کھانا حلال ہے اور ان کا دوسروں کے مال و جائداد سے پرورش پانا، ان کی حرمت کا موجب نہیں ہے اور ایسے جانوروں کی بیع اور خریداری سب جائز ہے، لیکن اس طرح پرورش جانوروں کی کہ ان کو رات کو چھوڑ دیا کریں کہ دوسروں کے مال و جائداد کو ضرر پہنچائیں جائز نہیں ہے، بلکہ اگر وہ جانور رات کو چھوڑ دیے جانے سے کسی کے مال و جائداد کو کچھ ضرر پہنچائیں گے تو ان جانوروں کے پالنے والوں کو اُس کا تاوان دینا لازم ہے، ہاں جانور کو دن کو چھوڑ دینا منع نہیں ہے۔ دن کو خود اہلِ جائداد کو اپنی جائداد کی محافظت کرنی لازم ہے۔

مشکوۃ شریف "باب الغصب والعارية" میں ہے:

عن حرام بن سعد بن محيصة أن ناقة للبراء بن عازب رضی اللہ عنہ دخلت حائطا فأفسدت فقضىٰ رسول الله ﷺ أن على أهل الحوائط حفظها بالنهار، وإن ما أفسدت المواشي بالليل ضامن على أهلها"[1] (رواه مالك و أبو داود و ابن ماجه)

[حرام بن سعید بن محیصہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک اونٹنی کسی باغ میں جا گھسی اور اسے خراب کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ باغوں کی حفاظت دن کے وقت ان کے مالکوں کی ذمے داری ہے اور رات کو جانور جو کچھ خراب کریں، اس کی تلافی جانوروں کے مالکوں کے ذمے ہے] والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

غیر مسلم حکومت کا مسلمانوں کے قبرستان وغیرہ امور میں مداخلت کرنا:

سوال میونسپلٹی مسلمانان سے چاہتی ہے کہ تم اپنے مردے باہر شہر کے دفن کرو اور اگر امر مانع ہو تو اُس قطعہ زمین میں دفن کرو، جو اس کام کے لیے میونسپلٹی اپنے روپیہ سے خرید کرے۔ انتظام اس زمین کا اور مسلمانوں کے مردے دفن ہونے کا میونسپلٹی اپنے ہاتھ میں رکھے گی اور تم سے بابت دفن، ان مردہ مسلمانوں کے جن کی فیس ناداری کی وجہ سے کسی طرح ادا نہ ہوسکتی ہو، ایک فیس مقررہ لے گی اور خام و پختہ میں فرق ہوگا۔ میونسپلٹی یہ قاعدہ بنانے پر اس لیے مجبور ہوئی ہے کہ اس کو خیال ہے کہ متفرق اندرون آبادی مردوں کے جابجا دفن ہونے سے صحت کو ضرر پہنچتا ہے۔

میونسپلٹی ایک ایسا محکمہ ہے، جس نے حقوق و احکام شاہی سے رفاہِ عام کے لیے قریب قریب تمام اشیاء پر (مستثنیات جزوی کے سوا) جو باہر سے اندرون میونسپلٹی بغرضِ تجارت یا خاص استعمال آئیں، چنگی لینے کا عام رعایا

[1] موطأ الإمام مالك (٢/ ٧٤٧) مسند أحمد (٥/ ٤٣٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٣٢)

سے قاعدہ مقرر کیا ہے، خواہ رعایا کسی قوم و مذہب کی ہو۔ واجب الادا مال کی چنگی نہ ادا ہونے پر وہ مال ضبط ہو جاتا ہے یا جرمانہ لیا جاتا ہے۔ بہت زیادہ حصہ رعایا کا اس چنگی کو بہت کراہت اور مجبوری کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ میونسپلٹی اس رقم چنگی سے جس میں ہندو مسلمانوں وغیرہ کا روپیہ شامل ہے، مسلمان مردوں کے لیے قطعہ زمین خرید کرنا چاہتی ہے اور زمین خریدنے کا یہ قاعدہ ہے کہ گو بیچنے والا راضی نہ ہو، بیچنا نہ چاہتا ہو یا کتنی ہی تعداد میں قیمت مانگتا ہو، مگر اُس کی پروانہیں کی جائے گی، نہ وہ راضی کیا جائے گا، بلکہ قاعدہ سرکاری کی مقررہ قیمت اس کو دے دی جائے گی اور اس زمین پر مالکانہ قبضہ کر لیا جائے گا۔

ایسی صورت میں میونسپلٹی کی آمدنی سے جس کی تشریح اوپر کی گئی اور اس طرح زمین کا معاوضہ بالجبر کے ساتھ خریدنا جیسا کہ بیان کیا گیا، شرعاً ناجائز وغصب ہے یا نہیں اور اُس میں مردوں کا دفن ہونا غیر مذہب والوں کو فیس ادا کر کے جائز ہے یا ناجائز؟ مکروہ ہے یا حرام اور مردہ دفن کرنے والا داخل معصیت ہے یا نہیں؟ ریاض الاخبار پریس، گورکھپور

جواب گورنمنٹ کا زمین کو معاوضہ بالجبر کے ساتھ خریدنے کے جواز و عدم جواز کے ہم جواب دہ نہیں ہیں۔ رہا اس میں مسلمان مردوں کا دفن ہونا غیر مذہب والوں کو فیس ادا کر کے مجبور مسلمانوں کے لیے تو یہ جائز ہے اور وہ زمین مسلمانوں کے حق میں مغصوب نہیں ہے۔ شاہی قانون نے اپنے قانون کے رو سے اس کو حاصل کیا ہے اور اپنے قانون کے رو سے ہم کو مجاز کیا ہے۔

یہاں یہ سوال زیادہ مفید ہے کہ مسلمانوں کے مذہب کے رو سے مردوں کا دفن کرنا مسلمانوں کا مذہبی کام ہے یا نہیں اور اس کے متعلق کوئی قید بڑھا دینا مذہب میں دست اندازی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو گورنمنٹ کو اپنے معاہدے اور قانون کے رو سے مسلمانوں کے مذہبی کاموں میں دست اندازی کرنے سے بچنا ضرور ہے یا نہیں؟

جواب: دفن کرنا مسلمانوں کے مذہبی کاموں میں نہایت ضروری کام ہے اور اس میں کوئی قید بڑا دینا مذہب میں بہت بڑی دست اندازی ہے۔ عادل گورنمنٹ کو اپنے مسکین رعایا پر مہربانی فرما کر ان کے زندہ اور مردوں کو اس نئے اور نہایت تکلیف رساں قانون سے ضرور بچانا چاہیے۔[1]

الجواب صحيح. كتبه محمد عبد الله. صح الجواب والله أعلم بالصواب. كتبه: أبو الفياض محمد عبد القادر أعظم گڑھی مئوی. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الرحمن عفي عنه (مہر مدرسہ)

چوری کا مال واپس کرنا اور توبہ کرنا ضروری ہے:

سوال ایک مسلمان مذہب حنفی بے نمازی عمر سولہ برس عرصہ سے بیمار تھا اور اس کی ماں نے ایک کسی دوسرے مسلمان کا ایک مرغ چرا کر اور مار کر بلا ذبح کئے ہوئے خود بھی کھایا اور اپنے بیٹے کو بھی کھلایا۔ بعد کھانے گوشت مرغ مذکور ایک ہفتہ تک بیٹا اس عورت کا زندہ رہا۔ آج تاریخ (۲۰/شہر جمادی الاول ۱۳۱۲ھ) یوم چہار شنبہ کو قضا کر گیا، جس کی

[1] اصلی مجیب کا نام درج نہیں ہے۔ حافظ صاحب وغیرہ کی صرف تصحیح درج ہے۔ [هٰكذا في الأصل]

نمازِ جنازہ مصلحت سے مسلمانوں کے نہیں پڑھی گئی، یہ سمجھ کر کہ اول تو بے نمازی دوسرے گوشت حرام کھایا۔ خیر بیٹا تو اس عورت کا مر گیا، اب اُس عورت کے واسطے کیا ہونا چاہیے؟ تحریر جواب مسئلہ اسلام سے آگاہ فرمائیں۔

جواب جس عورت نے مرغ چرا کر آپ بھی کھایا اور اپنے بیٹے کو بھی کھلایا، اُس پر واجب ہے کہ جس شخص کا مرغ چرایا ہے، اگر وہ معاف نہ کرے تو اُس مرغ کا اُس کو تاوان دے۔

عن سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «على اليد ما أخذت حتى تؤديه»[1]

(رواه أحمد والأربعة وصححه الحاكم، بلوغ المرام)

[سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاتھ نے جو کچھ (قرض یا عاریت کے طور پر) لیا، وہ اس کے ذمے رہتا ہے، حتی کہ اسے ادا کرے]

جو اس عورت نے اس مرغ کو مار کر بلا ذبح کھایا اور کھلایا ہے، اس گناہ سے نادم ہو اور اللہ تعالیٰ سے معاف کرائے اور سچے دل سے توبہ کرے کہ پھر ایسی حرکت نہ کرے۔

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ﴾ [سورة التحريم: ٨]

[اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی طرف توبہ کرو، خالص توبہ]

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ ﴾ [سورة الزمر: ٥٣۔ ٥٤]

[کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ اور اپنے رب کی طرف پلٹ آؤ اور اس کے مطیع ہو جاؤ] والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبدالله

حرام کام میں نوکری کرنا:

سوال [1] زید ایک انگریز کا نوکر ہے اور اس کے واسطے شراب خرید کر لاتا ہے، ظرف میں ڈال کر پلاتا ہے یا سور کا گوشت پکاتا ہے تو یہ نوکری جائز ہے یا نہیں اور اس تنخواہ سے جو روپیہ حاصل ہو، اُس کا لباس بنا کر پہنے اور اُس سے کھانا غذا خرید کر کھائے تو اُس کی عبادت قبول ہوگی یا نہیں اور اس کے یہاں دعوت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

[2] زید ایک شخص کا نوکر ہے اور اُس آقا کے یہاں سود اور مے فروشی اور زمینداری کی آمدنی ہے اور اسی مجموعی آمدنی سے تنخواہ ملتی ہے، پس زید کو یہ نوکری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب [1] ایسی نوکری جائز نہیں اور اگر ایسی نوکری کی تنخواہ سے لباس بنا کر پہنے یا غذا خرید کر کھائے تو اس کی عبادت

[1] مسند أحمد (٥/ ٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٦٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ٤١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٠٠) اس کی سند ضعیف ہے۔ دیکھیں: ضعيف الجامع، رقم الحديث (٣٧٣٧)

قبول نہیں ہوگی اور اس کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے، اگر اس کو اس دعوت قبول کرنے سے گناہ پر مدد پہنچتی ہو۔

۲ ایسی نوکری کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں ناجائز کام کرنا نہ پڑتا ہو۔ واللّٰہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللّٰہ

فلم دیکھنا:

سوال بائی سکوپ کا دیکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: بائی سکوپ ایک تماشے کا نام ہے، جس میں شہر، جنگل، عمارتیں اور جاندار وغیرہ چیزیں نظر آتی ہیں۔

جواب اگر کوئی غرض محمود ہو تو جائز ہے، ورنہ ہر قسم کے کھیل تماشے (باستثنا تین قسموں کے جو حدیث مذکورِ ذیل میں مذکور ہیں) ناجائز ہیں۔

عن عقبة بن عامر رضي الله عنه قال: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ يقول: «كل شيئ يلهو به الرجل باطل إلا رميه بقوسه وتأديبه فرسه وملاعبته امرأته، فإنهن من الحق»[1] واللّٰہ تعالیٰ أعلم

(رواہ الترمذي وابن ماجه و أبو داود و الدارمي، مشكوة المصابيح)

[عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''ہر وہ چیز جس سے انسان کھیلتا ہے اور اس کے ساتھ مشغول ہوتا ہے، وہ باطل (بے کار) ہے، البتہ اس کا کمان کے ساتھ تیر اندازی کرنا، اپنے گھوڑے کی تربیت کرنا اور اس کا اپنی اہلیہ کے ساتھ مشغول ہونا، کیونکہ یہ حق ہیں]

کتبہ: محمد عبد اللّٰہ (۱/ صفر ۱۳۲۸ھ)



---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۵۱۳) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱٦۳۷) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۵۷۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۸۱۱) سنن الدارمي (۲/ ۲٦۹)

کتاب الوصایا

وصیت کا طریقہ کار:

سوال مسماۃ بی بی کلر کو کوئی اولاد ذکور یا اناث بحالتِ حیات نہیں تھی، اس نے اپنی نواسی مسماۃ زینب کو بجائے دختر پرورش کیا اور مرتے دم تک اس کو دختر کہتی رہی اور یہ کہتی رہی کہ ہم اپنی کل جائداد ملکیت کو بذریعہ دست آویز مروج کے اس کو عطا کریں گے، جو بعد مرنے میرے وہ اس پر قابض دخیل ہو کر متصرف ہوگی۔ مسماۃ زینب نے اس کے ارادے کو قبول کیا اور وہ دست آویز جس کے ذریعے سے جائداد پر ملکیت مسماۃ کلر کی تھی، اس کو اس نے قبضہ میں مسماۃ زینب کو عطا کیا۔ لیکن وہ دست آویز جدید جس کے ذریعہ سے عطا کرنا منظور تھا، تکمیل نہیں ہوا کہ مسماۃ کلر نے یکا یک قضا کیا اور موت نے اس قدر مہلت بھی نہیں دی کہ اس وقت کچھ وصیت کے طور پر اپنے وارثان سے کہتی۔ لیکن قبل موت، جبکہ بحالت صحت تھی، اکثر کہا کرتی تھی کہ ''ہم نے اپنے بعد اپنا وارث مسماۃ زینب کو گردانا'' اور اپنے بعض وارث اور دیگر آدمی سے یہ بھی کہا کہ ہم نے جائداد ملکیت مسماۃ زینب کو دیا، البتہ صریح طور پر جیسے وصیت کی جاتی ہے، نہیں کہا۔ چونکہ ہندوستان کی عورتیں اکثر جاہل ہوتی ہیں، لفظ وصیت کو نہیں جانتی ہیں کہ کیا شئے ہے، صرف اپنی بول چال کے محاورے میں کہا کرتی ہیں کہ ہم نے یہ جائداد ملکیت کل یا جزو فلاں کو دیا۔ فقط

جواب طلب امر یہ ہے کہ یہ وصیت میں داخل ہے یا نہیں اور مسماۃ زینب ایسی وصیت کے ذریعے سے متروکہ مسماۃ کلر پا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر پا سکتی ہے تو کل یا ثلث؟ وارث مسماۃ بی بی کلر کے سوائے نواسی مسماۃ زینب کے تین ہیں، ایک شوہر مسمی عبدالصمد، دو برادر عمومی حقیقی مسمیان عبداللہ و حبیب اللہ۔ شوہر مسماۃ متوفیہ چاہتا ہے کہ کل جائداد متروکہ مسماۃ زینب کو دیا جائے۔ برادران عمومی چاہتے ہیں کہ کچھ نہیں دیا جائے؟

جواب یہ صورت وصیت میں داخل ہے، کیونکہ مسماۃ کلر کا یہ قول کہ ''ہم نے اپنے بعد اپنا وارث مسماۃ زینب کو گردانا اور ہم نے اپنی جائداد ملکیت مسماۃ زینب کو دیا'' تملیک مضاف الی ما بعد الموت ہے اور ایسی تملیک کا نام وصیت ہے، اس وصیت کے ذریعہ سے مسماۃ زینب (بعد تقدیم ما تقدم علی الوصیۃ) دو ثلث جائداد متروکہ مسماۃ کلر کی پائے گی۔ ایک ثلث تو اس وجہ سے کہ شرعاً ایک ثلث میں وصیت کے نفاذ میں کوئی گفتگو ہی نہیں ہے اور ایک ثلث اور اس وجہ سے کہ عبد الصمد شوہر مسماۃ کلر اس وصیت سے راضی ہے اور جب وارث ثلث سے زائد کی وصیت پر راضی ہو، اُس میں بھی وصیت نافذ ہو جاتی ہے، اس وجہ سے جس قدر حصہ عبدالصمد مذکور کا جائداد مذکورہ میں ہوتا ہے، یعنی دو ثلث باقی کا نصف کہ ایک ثلث ہوتا ہے، وہ بھی زینب کو ملے گا تو زینب کو اس وصیت کے ذریعہ سے دو

ثلث ملے۔ باقی رہا ایک ثلث وہ فیما بین عبداللہ و حبیب اللہ برادران عمومی حقیقی کے نصفا نصف تقسیم ہوگا، یعنی ہر ایک کو اس باقی ثلث کا نصفا نصف ملے گا۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

سارا مال خیرات کرنے کی وصیت کرنا:

سوال زید نے قریب موت کے کہا کہ میرا کل مال متروکہ خیرات کر دینا۔ اب زید کا انتقال ہوگیا، بعد تجہیز و تکفین زید جو کچھ از قسم غلہ و پارچہ تھا، فقراء و مساکین کو تقسیم کر دیے۔ اب چند روپے زید کے باقی رہ گئے ہیں، ان روپوں کو مدرسہ اور مسجد میں لگا دوں یہ از روئے شرع شریف جائز ہے یا نہیں؟

جواب خیرات خیر کی جمع ہے اور خیر کے معنی نیک اور اچھے کام کے ہیں تو اگر زید کی مراد خیرات کر دینے سے اس کے مال کا اچھے کاموں میں خرچ کر دینا ہے تو اس صورت میں اُس کے مال کا دینی مدرسہ اور مسجد میں لگا دینا جائز ہے اور اگر زید کی مراد خیرات کر دینے سے فقرا اور مساکین پر تقسیم کر دینا ہے تو اس صورت میں مدرسہ اور مسجد میں اس کا مال لگا دینا جائز نہیں ہے۔

لقولہ تعالیٰ: ﴿فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَآ إِثْمُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهُ﴾ [البقرۃ:۱۸۱]

[پھر وہ شخص اسے بدل دے، اس کے بعد کہ اس سن چکا ہو تو اس کا گناہ انھی لوگوں پر ہے جو اسے بدلیں]

واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

اگر ناجائز امر کی وصیت کرے تو وہ نافذ نہیں کی جائے گی:

سوال کیا فرماتے ہیں ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص کسی معصیت اور ناجائز امر کی وصیت کرے تو اس کی وہ وصیت شرعاً معتبر اور قابلِ نفاذ ہوگی یا نہیں؟

جواب ایسی وصیت شرعاً معتبر اور قابلِ نفاذ نہ ہوگی، اس لیے کہ ایسی وصیت کے نافذ کرنے میں تقریرِ معصیت پائی جاتی ہے، جو محض ناجائز ہے۔ ہدایہ میں ہے: ''الوصیة بالمعصیة باطلة لما في تنفیذھا من تقریر المعصیة''[1] اھ [معصیت کی وصیت باطل اور ناجائز ہے، کیوں کہ اس کے نافذ کرنے سے تقریرِ معصیت پائی جاتی ہے] ہاں اگر ایسی وصیت کو تبدیل کر دیں (یعنی بجائے معصیت کے طاعت قائم کر دیں) تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ إِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ [البقرۃ: ۱۸۲]

[پھر جو شخص کسی وصیت کرنے والے سے کسی قسم کی طرف داری یا گناہ سے ڈرے، پس ان کے درمیان اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے]

[1] الهداية (٤/ ٢٥٦)

تفسیر فتح البیان میں ہے:

"قال القرطبي: لا خلاف أنه إذا أوصىٰ بما لا يجوز مثل أن يوصي بخمر أو خنزير أو بشيئ من المعاصي أنه يجوز تبديله، ولا يجوز إمضاؤه كما لا يجوز إمضاء ما زاد على الثلث. قاله أبو عمرو"[1] اھ واللّٰہ تعالیٰ أعلم

[امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ابوعمرو نے کہا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب وہ (وصیت کرنے والا) کسی ناجائز کام کی وصیت کرے؛ جیسے وہ شراب یا خنزیر یا کسی معصیت کی وصیت کرے تو اسے تبدیل کرنا جائز ہے، اسے جاری کرنا جائز نہیں ہے، جیسے تہائی مال سے زیادہ کی گئی وصیت کو نافذ کرنا ناجائز ہے]

کتبہ: محمد عبد اللہ (۱۳/ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ) الجواب صحیح: کتبہ أبو یوسف محمد عبد المنان غازی پوری. مدرس مدرسہ ریاض العلوم شہر دھلی.



[1] فتح البیان (۱/ ۳۰۶)

كتاب الفرائض

کیا عورت اپنا حصہ معاف کرسکتی ہے؟

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عورت عاقلہ بالغہ نے اپنے طیب خاطر سے خواہ اپنے بھائیوں کی خوشامدانہ درخواست سے بدون کسی جبر و اکراہ اور خدع و فریب کے اپنا وہ حصہ جو اس کو اس کے باپ کی میراث سے ملنا تھا، اپنی بھائیوں کو معاف کر دیا اور کہا کہ مجھ کو اس حصہ سے کوئی دعویٰ نہیں ہے، میں وہ حصہ نہ لوں گی، میرے برادر اور برادرگان اس کو باہم تقسیم کر لیں تو یہ معاملہ شرعاً درست ہے یا نہیں اور بعد فوت اس عورت کے ورثہ اس کی اس جایداد کا دعویٰ دائر کر سکتے ہے یا نہیں اور ان کو اس جایداد کا لینا درست ہے یا نہیں؟ ابسطوا الجواب فلكم الثواب والحكم لله.

جواب یہ معاملہ شرعاً درست ہے۔ اب اس عورت کے ورثہ اس جایداد کو شرعاً واپس نہیں لے سکتے۔ عورت عاقلہ بالغہ اپنے مال میں ہر طرح کا تصرف کرسکتی ہے۔

قال البخاري: "قالت أسماء للقاسم بن محمد و ابن أبي عتيق: ورثت عن أختي عائشة بالغابة، وقد أعطاني معاوية مائة ألف فهو لكما"[1] اهـ و غير ذلك من الأحاديث *ما يدل على هذا.*

[امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: اسما رضی اللہ عنہا نے قاسم بن محمد اور ابن ابی عتیق کو کہا کہ غابہ نامی جگہ سے مجھے میری ہمشیرہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے وراثت ملی ہے، جس کے عوض معاویہ رضی اللہ عنہ نے مجھے ایک لاکھ (درہم) دیے ہیں، میں وہ تم دونوں کو دیتی ہوں۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک احادیث ہیں جو اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں]

صورتِ مذکورہ سوال میں اس عورت نے اپنا حق معاف کر دیا ہے اور معاف کر دینا حقوق کا عین ہو یا دین، احادیثِ صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہے۔

قال البخاري: "قال عمر رضی اللہ عنہ: إني أشهدكم يا معشر المسلمين على حكيم إني أعرض عليه حقه من هذا الفيئى فيأبىٰ أن يأخذه"[2] اهـ

[امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت! میں تم کو حکیم رضی اللہ عنہ پر گواہ بناتا ہوں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٦٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٩٩)

کہ میں ان پر اس مالِ فے میں سے ان کا حق پیش کرتا ہوں تو وہ اسے لینے سے انکار کرتے ہیں]

اس میں تصریح ہے کہ حکیم رضی اللہ عنہ نے اپنا حق مال میں چھوڑ دیا اور نہ لیا جو دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پہنچایا گیا۔

روى أبو داود عن أم سلمة قالت: قال رسول الله ﷺ: «إنما أنا بشر، و إنكم تختصمون إلي، ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض فأقضي له على نحو مما أسمع منه، فمن قضيت له من حق أخيه شيئا فلا يأخذ منه شيئا، فإنما أقطع له قطعة من النار»[1]

[امام ابو داود رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں ایک بشر ہوں، تم اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی دوسرے کے مقابلے میں اپنی حجت پیش کرنے میں زیادہ چرب زبان ہو اور پھر میں اس سے سننے کے مطابق فیصلہ کر دوں، تو جس کسی کے لیے میں اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کر دوں تو وہ اس سے کچھ نہ لے۔ میں تو اس کے لیے آگ کا ٹکڑا کاٹ رہا ہوں]

وفي أخرىٰ لهٗ عنها قالت: أتى رسول الله ﷺ رجلان يختصمان في مواريث لهما، لم تكن لهما بينة إلا دعواهما. فقال النبي ﷺ: فذكر مثله فبكىٰ الرجلان، وقال كل واحد منهما: حقي لك، فقال لهما النبي ﷺ: أما إذا فعلتما ما فعلتما فاقتسما وتوخيا الحق، ثم استهما ثم تحالا، وفي أخرى له عنها قال: يختصمان في مواريث وأشياء قد درست"[2] اهـ

[امام ابو داود رحمہ اللہ کی ایک دوسری روایت میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ہی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو آدمی آئے جن کا میراث کے معاملے میں جھگڑا تھا اور ان کے پاس سوائے اپنے دعوے کے اور کوئی گواہ نہ تھا، تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا، پھر مذکورہ بالا حدیث کے مثل بیان کیا۔ چنانچہ وہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک دوسرے سے کہنے لگا: میرا حق تیرے لیے ہے۔ پھر نبیِ مکرم ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا: جب تم ایسا کرتے ہو تو آپس میں تقسیم کر لو اور حق کا قصد کرو، پھر (حصے کی تعیین کے لیے) آپس میں قرعہ ڈال لو، پھر ممکن زیادتی ایک دوسرے سے معاف کرا لو۔ ابو داود ہی کی ایک دوسری روایت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان دو آدمیوں کا وراثت میں جھگڑا تھا اور بھی چند دوسری چیزیں تھیں، جن کے نشانات مٹ گئے تھے]

ان روایات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ معاف کر دینا اپنے حقوق کا خاص عین اور مواریث میں بہر کیف جائز ہے، جیسا کہ حضرت نے مخاصمین فی المیراث کو فرمایا کہ "ثم تحالا" یعنی ایک دوسرے کو معاف کر دو۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٨٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٨٤)

وارث کو محروم کرنا حرام ہے:

سوال ماں یا باپ امور دنیاوی میں اپنی اولاد سے اگر ناخوش ہوں اور اس ناخوشی کی وجہ سے اپنی جائداد ان کو نہ دیں، بلکہ اپنے پوتے وغیرہ کو دے دیں تو ماں باپ کا شرعاً یہ دینا کیسا ہے اور پوتے وغیرہ کا لینا کیسا ہے اور جو لوگ کوشش اس اَمر کی کریں کہ ماں باپ اپنی جائیداد اپنی اولاد کو نہ دیں تو وہ لوگ کیسے ہیں؟

جواب وارث کو میراث سے محروم کرنا بڑا گناہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن جنت کی میراث سے محروم کرے گا۔

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللهﷺ: «من قطع ميراث وارثه، قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة» [1] (رواه ابن ماجه، و رواه البيهقي في شعب الإيمان عن أبي هريرة، مشكوة شريف، ص: ٢٥٨)

[انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس کی جنت کی میراث سے محروم فرما دے گا]

جو لوگ اس امر میں کوشش کریں کہ ماں باپ اپنی اولاد کو میراث سے محروم کریں، وہ لوگ سخت گنہگار ہیں۔ سورۂ مائدہ رکوع اول میں ہے: ﴿لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ [المائدة: ٢] یعنی گناہ اور زیادتی پر آپس میں مدد نہ کرو۔ والله أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

سوتیلی ماں کے حصے سے وراثت:

سوال زید اپنی سوتیلی ماں کے حصے سے حصہ پا سکتا ہے یا نہیں؟ جیسا کہ ہندہ چھوڑ گئی بعد موت کے دو لڑکے، دونوں الگ ماں سے ہیں۔ باپ ایک ہے۔ اب دوسرا لڑکا اس ہندہ سوتیلی ماں کا حصہ لے سکتا ہے کہ نہیں؟ ہندہ کا لڑکا عمرو سوتیلے لڑکے زید کو حصہ دینے سے منکر ہے۔ صورت یہ ہے:

ہندہ

ابن علاتی	ابن عینی
زید	عمرو

جواب ہندہ کے عینی لڑکے کا یہ بیان کہ ''ہندہ کا سوتیلا بیٹا ہندہ کے ترکہ سے نہیں پا سکتا'' واقعی اور صحیح ہے۔ مسئلہ شرعی یہی ہے۔ والله أعلم وعلمه أتم. كتبه: محمود، عفا الله عنه. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الله

مشترکہ جائداد کی تقسیم اور کاروبار میں زیادہ محنت کرنے والا بیٹا:

سوال زید کے چار لڑکے عمرو، بکر، خالد، ولید ہیں، جن میں سے عمرو اپنے باپ اور بھائیوں سے بالکل الگ رہنے لگا،

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٠٣) اس کی سند میں ایک راوی ''عبد الرحیم بن زید'' متروک اور دوسرا راوی ''زید العمی'' ضعیف ہے، لہٰذا یہ حدیث سخت ضعیف ہے۔

اس اثنا میں زید نے اپنے کاروبار کا مالک بکر کو بنا دیا اور خانہ داری و نیز بیرونی کاروبار ازقسم تجارت وغیرہ بکر (بڑا لڑکا) سرانجام دیتا رہا۔ اگرچہ بقیہ اور بھائی بجز عمرو کے و نیز زید کاروبار میں اعانت کرتے رہے اور کاروبار میں بہت ترقی ہوئی، مگر بکر کو اس حیثیت سے کہ باپ زید نے کارکن قرار دے دیا تھا۔ اب جبکہ باپ قضا کر گیا، جائداد موجودہ منقولہ و غیر منقولہ بکر کو کچھ حصے زائد بہ نسبت اور بھائیوں کے پہنچے گا؟ اور عمرو جو الگ رہا، اس جائداد پیدا کردہ باپ بھائیوں بکر وغیرہ سے محروم قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو کس قدر اس کا حصہ ہوسکتا ہے؟ اور اب بعد وفات زید بکر کا یہ کہنا کہ باپ کے پاس کوئی اثاثہ یا مال نہیں تھا، یہ کل پیدا کردہ ہم تین بھائی: بکر، خالد، ولید کی ہے، شرعاً کہاں تک قابل تسلیم ہے اور عمرو پر بکر کے قول کا ازروئے شرع کیا اثر پہنچ سکتا ہے؟

حاجی محمد یعقوب و محمد ثناء اللہ مئوناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڑھ

جواب اگر جائداد مذکورہ بالا اصل میں زید کی تھی اور زید اور اس کے تینوں بیٹوں نے مل کر اس جائداد کو بڑھایا تو اس صورت میں یہ کل جائداد زید کی ہے، اس لیے کہ جو کچھ اصل جائداد پر ترقی ہوئی ہے، وہ سب نماءِ ملکِ زید ہے اور جب اس صورت میں یہ کل جائداد زید کی ہے تو زید کے قضا کر جانے کے بعد اس جائداد میں سے زید کے چاروں بیٹوں کو جن میں عمرو بھی ہے، برابر حصہ ملے گا، نہ کسی کو زیادہ نہ کسی کو کم اور اگر جائداد مذکورہ اصل میں زید کی نہ تھی، بلکہ کل جائداد پیدا کردہ تینوں بھائیوں (بکر، خالد، ولید) کی ہے تو اس صورت میں اس جائداد میں سے عمرو کو کچھ نہیں ملے گا۔

باقی رہا بکر کا یہ قول کہ "باپ کے پاس کوئی اثاثہ یا مال نہیں تھا، یہ کل جائداد پیدا کردہ ہم تینوں بھائیوں کی ہے۔" یہ قول بکر کا ایک دعویٰ ہے تو اگر عمرو بکر کے اس دعویٰ کو تسلیم کرتا ہو یا درصورت انکار کرنے کے بکر اپنے اس دعوے کو حاکم یا ثالث کے روبرو ثابت کر دے یا بکر عمرو کو اس دعوے کے انکار پر حاکم یا ثالث کے روبرو حلف دے اور عمرو حلف لینے سے بھی انکار کر دے تو ان تینوں صورتوں میں بکر کے قول مذکور کا اثر عمرو پر یہ ہوگا کہ عمرو جائداد مذکور سے محروم ہو جائے گا اور اگر عمرو حلف لے لے تو اس صورت میں حسبِ مضمون حلف عمرو بھی جائداد مذکور میں حصہ دار ہو جائے گا۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم. كتبه: محمد عبد الله (۷/ ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ)

سوال شیخ مظہر علی کے چار بیٹے: بادل، اعظم، بندھو، حافظ رمضان علی ہیں۔ مظہر علی نے قضا کیا، ان چاروں بیٹوں میں سے ایک (حافظ رمضان علی) نے اپنے باپ مظہر علی کے وقت میں خاص کما کر کچھ روپیہ الگ جمع کیا اور اپنے باپ کو باوجود ضرورتوں کے نہ دیا۔ اب اس روپے میں دوسرے بھائی لوگ دعویدار ہیں کہ اس روپیہ کو ملا کر مظہر علی متوفی کا ترکہ قرار دیں اور باخودہا تقسیم کریں۔ ازروئے شرع شریف اس خاص روپے میں رمضان علی کے دوسرے بھائی پائیں گے یا نہیں؟

جواب مورث جس مال کا مالک ہوتا ہے، اسی میں وارثوں کا حق اور حصہ ہوتا ہے، پس جب حافظ رمضان علی نے اپنا حاصل کردہ روپیہ اپنے باپ مظہر علی کو نہیں دیا تو وہ روپیہ مظہر علی کی ملک میں نہیں آیا، اس لیے اس روپیہ میں مظہر علی

کے کسی وارث کا حصہ نہیں ہوسکتا۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: أبو العلیٰ محمد عبد الرحمن المبارکفوري، عفا اللہ عنہ. الجواب صحیح. کتبہ: محمد عبد اللہ.

منہ بولا بیٹا اور بیٹی وراثت کے حق دار نہیں:

سوال زید پانچ بھائی زمیندار ہے، مگر بوجہ نا اتفاقی برادران دو بھائی اپنا اپنا حصہ زمینداری جدا کر کے اپنے اپنے اہل وعیال کے نان نفقہ کے مختار ہوئے اور تین بھائی شراکت میں زمینداری اور نان ونفقہ میں اہل وعیال کے متفق ہیں۔ اتفاقاً قضائے الٰہی سے چھوٹا بھائی شریک دار زید لا ولد نے انتقال کیا، اب بعد وفات برادر مذکور کے بی بی ثیبہ شریکہ نے شوہر متوفی کے بڑے بھائی جدا کردہ کے لڑکے کو پتکر بنایا، یعنی اپنی جگہ زمینداری پر جانشین کیا، بعدہ چند عرصہ گزرا کہ بیوہ مذکورہ اپنی لڑکیوں کی پرورش میں مصروف ہوئی، اب لڑکا پتکر کردہ ارادہ کرتا ہے کہ اپنی جانشینی وراثت عمویان شریک سے جدا کر کے اپنے تصرف میں لائے اور عمویان مذکور اور بیوہ شریکہ منکر ہے، اس صورت میں لڑکا جانشین حق حصہ عموی متوفی کا رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر رکھتا ہے تو آیات یا احادیث کی تحریر کے ساتھ بیان فرمایئے؟

جواب جو لڑکا معلوم النسب ہے، یعنی یہ معلوم ہے کہ اس کا باپ فلاں شخص ہے، اس کو اگر کوئی شخص اپنا بیٹا کہہ دے تو اس سے وہ اس کا بیٹا ہو نہیں جاتا، وہ جس کا بیٹا ہے، اسی کا بیٹا باقی رہتا ہے۔

﴿ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاهِکُمْ ﴾ [سورۂ أحزاب، رکوع اول]

[اور نہ تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارے بیٹے بنایا ہے یہ تمھارا اپنے مونہوں سے کہنا ہے]

پس اس صورت میں لڑکا جانشین حق حصہ عموی متوفی کا نہیں رکھتا۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبد اللہ. الجواب صحیح. کتبہ: محمود، عفي عنہ

سوال قرآن و حدیث نبویﷺ سے یہ فرمایئے کہ ایک شخص مر گیا اور اس کی بی بی موجود ہے۔ اس مرد نے ایک لڑکی دوسرے سے لے کر پرورش کیا تھا اور شادی وغیرہ بھی کر دیا اور وہ اپنے شوہر کے گھر ہے۔ آخر کو وہ مرد پرورندہ قضا کر گیا اور کچھ معیشت نہیں چھوڑا ہے، فقط مکان اور اسبابِ مکان وغیرہ ہے اور مکان اس زید کے ہیں، وہ اس بی بی کے نام سے نوشتہ کر دیا ہے، اب بحمایت اُس لڑکی متبنیٰ کے اس کی طرف سے لوگ کہتے ہیں کہ نصف حصہ بی بی لے اور نصف اس لڑکی کو دینا ہوگا۔ لہٰذا خدمت مبارک میں آپ کی گزارش ہے کہ کیا حق اس متبنیٰ لڑکی کا ہوگا؟

جواب اس صورت میں اس لڑکی کا اس شخص کے ترکہ میں، جس سے اس کو پرورش کیا تھا، کچھ حق نہیں ہے۔ شرع شریف میں جو بیٹا اور بیٹی کا حق مقرر ہے، وہ اس بیٹا اور بیٹی کا حق مقرر ہے، جو اپنے صلبی بیٹی اور بیٹا ہوں، نہ کہ ان کا جو صرف پروردہ اور متبنیٰ ہوں۔ پروردہ اور متبنیٰ شرعاً اس شخص کے بیٹا اور بیٹی نہیں ہیں، جس نے ان کو پالا اور متبنیٰ بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ احزاب رکوع (۱) میں فرماتا ہے:

﴿ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ﴾ والله أعلم بالصواب.

[اس نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارے بیٹے نہیں بنایا ہے] کتبہ: محمد عبد الله

نومسلم کا کافر باپ کی جائداد میں حصہ:

سوال ایک گاؤں باشندگان اہلِ اسلام کا ہے، اس میں ایک حویلی ایک شخص سراوگی مذہب اہلِ ہنود کی ملکیت سے ہے، اس حویلی ہی کے ایک گوشے میں ان کے پارس ناتھ کا مندر ہے، جس کا دروازہ حویلی کے اندر صحن میں ہے۔ وہ شخص مر گیا، اس کے دو بیٹے ہیں، ایک مسلمان ہوگیا ہے، جس کے چار لڑکے مسلمان ہیں، دوسرا ہندو ہی ہے، جس کے ایک لڑکا ہندو ہے۔ آیا متوفی کے مسلمان بیٹے کو اس حویلی کے اپنے حصے کا دعویٰ کرنا جائز ہے؟

(۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ مستفتی عبد اللطیف نومسلم۔ از رتیرہ۔ تحصیل ہانسی۔ ضلع حصار)

جواب صورتِ مسئولہ میں متوفی کے مسلمان بیٹے کو اس حویلی کے اپنے حصے کا دعویٰ کرنا جائز ہے، اگر اپنے باپ کے مرنے کے بعد مسلمان ہوا ہے، کیونکہ جب باپ کے مرنے کے وقت مسلمان نہیں ہوا تھا تو باپ کے ترکہ کا مستحق ہوگیا، کیونکہ استحقاق ترکہ کا وقت موت کا وقت ہے اور جب موت کے وقت مسلمان نہیں ہوا تھا تو اس میں اور باپ میں اختلاف دین اور ملت کا نہ تھا، جو مانع ارث ہے۔ پس مسلمان بیٹا اس صورت میں اپنے متوفی باپ کے ترکہ کا ضرور مستحق ہے، لہٰذا اس کو اس حویلی کے اپنے حصے کا دعویٰ کرنا جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (۱۷/ ربيع الأول ۱۳۳۱هـ) الجواب صحيح والمجيب نجيح. كتبه: محمد عبد الله المئوى. (۱۷/ ربيع الأول ۱۳۳۱هـ) أصاب من أجاب. كتبه: أبو يوسف محمد عبدالمنان وفا غازيپورى، مدرس مدرسه رياض العلوم دهلى. الجواب صحيح. محمد لطف الرحمن. من يرد الله به خيرا يفقه في الدين. كتبه: عبد العزيز مباركپورى (۱۷/ ربيع الأول ۱۳۳۱هـ)

میت کی خلافِ شرع تقسیم کالعدم ہوگی:

سوال زید کے تین لڑکے مثلاً عمرو، بکر، خالد و چار لڑکیاں مثلاً ہندہ، بتول، آسیہ، آمنہ ہیں۔ زید نے اپنی زندگی میں اپنا مال کل جائداد تین حصے کر کے اس میں سے ایک حصہ بڑے لڑکے عمرو کو دے کر علیحدہ کر دیا اور بقیہ دو حصہ بکر و خالد کو دیا۔ وہ دونوں، یعنی بکر و خالد ایک جا کاروبار کرنے لگے اور دونوں کے باپ و ماں، یعنی زید و ماں مریم نے بکر و خالد کے شامل زندگی بسر کیا، جس کا زمانہ عرصہ پچیس برس کا ہوتا ہے۔ بعدہ منجھلے بھائی بکر نے چھوٹے بھائی خالد کی شادی وغیرہ کر دیا، جس کو زمانہ نو یا دس برس کا ہوتا ہے۔ چھوٹے بھائی خالد نے رحلت کیا اور اپنا ترکہ منجھلے بھائی بکر کی شرکت میں چھوڑا اور ماں مریم کو اور بیوی خاتون کو بھی چھوڑا، ان دونوں کا نان ونفقہ بکر دیتا ہے اور عمرو نان ونفقہ دینے سے، یعنی مریم و خاتون کے انکار کرتا ہے اور کوئی اولاد خالد مرحوم کی نہیں ہے۔ پس ایسی حالت میں بڑا بھائی عمرو جو اپنے والد کی زندگی سے جدا تھا، چھوٹے بھائی خالد کے ترکہ کا وارث اور حقدار ہو سکتا ہے یا نہیں؟

واضح ہو کہ زید نے بکر اور خالد کو جو اپنے کل مال کا حصہ دیا تھا، اس کی مقدار بہت قلیل تھی، بعدہ اس کی مقدار زیادہ ہوگئی، جو منجھلے بھائی بکر و خالد کا حاصل کردہ شدہ ہے اور خالد کے ذمہ دس بیس روپیہ قرض ہے، عمرو اس قرض کے ادا کرنے سے انکار کرتا ہے اور دونوں بھائی، یعنی بکر و خالد کی جائداد ایک جا ہے۔ ایسی حالت میں مرحوم کی جائداد قائم کرنے کی کیا صورت ہے؟ الراقم: محمد شفیع و غلام محمد مقام جگن ناتھ پور۔ ضلع سنگھ بھوم

جواب ایسی حالت میں عمرو خالد کے مال متروک کا وارث اور حقدار ہوسکتا ہے۔ جس کی تفصیل جواب میں آتی ہے۔ زید نے اپنی زندگی میں اپنی کل جائداد صرف لڑکوں کو دی اور لڑکیوں کو کچھ نہیں دیا، یہ دینا زید کا ناجائز اور نادرست ہوا۔ لہٰذا کل جائداد مذکورہ بدستور زید ہی کی ملک رہی اور زید کے لڑکے اس دینے سے اس جائداد کے مالک نہیں ہوئے، لہٰذا بعد مرنے زید کے کل جائداد مذکورہ متروکہ زید قرار پائی اور زید کے وارثوں میں اس کے مرنے کے بعد اس طرح تقسیم ہوگی کہ (بعد تقديم ما تقدم على الارث ورفع موانعه) ثمن، یعنی آٹھواں حصہ جائداد مذکورہ کا زید کی بی بی مریم کو ملے گا اور باقی زید کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بحساب ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾، یعنی ہر ایک لڑکے کو ہر ایک لڑکی کا دونا ملے گا۔ پس اگر زید کے مرتے وقت اس کے تینوں لڑکے (عمرو، بکر، خالد) اور چاروں لڑکیاں (ہندہ، بتول، آسیہ، آمنہ) زندہ رہی ہوں تو جائداد مذکورہ اسی سہام (حصوں) پر تقسیم ہوکر دس سہام مریم کو اور چودہ چودہ عمرو و بکر و خالد کو اور سات سات سہام ہندہ، بتول، آسیہ، آمنہ کو ملے گا، پھر جو کچھ خالد کو ملا ہے، خالد کے وارثوں میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ (بعد تقديم ما تقدم على الارث و رفع موانعه) ربع، یعنی چوتھائی خاتون کو اور ثلث، یعنی تہائی مریم کو ملے گا اور باقی خالد کے بھائی بہنوں میں بحساب ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ تقسیم ہوگا، پس اگر خالد کے مرتے وقت اس کے دونوں بھائی اور چاروں بہنیں زندہ رہی ہوں تو خالد کا کل ترکہ چھیانوے سہام پر تقسیم ہوکر چوبیس سہام خاتون کو اور بتیس مریم کو اور دس دس سہام عمرو و بکر اور پانچ پانچ سہام ہندہ، بتول، آسیہ، آمنہ کو ملے گا۔

واضح ہو کہ تقسیم مذکورہ بالا اسی صورت سے تعلق رکھتی ہے کہ زید کی چاروں لڑکیاں زید و خالد کے مرتے وقت زندہ موجود رہی ہوں، ورنہ یہ تقسیم قائم نہیں رہے گی، بلکہ جیسی صورت ہوگی، اس کے مطابق تقسیم ہوگی اور یہ بھی واضح رہے کہ خالد کے ذمہ جو قرض ہے، اس قرض کے خالد کے ترکہ سے ادا کرنے کے بعد جو بچ رہے، وہ خالد کے وارثوں میں بطریق مذکور بالا تقسیم ہوگا۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔ كتبه: محمد عبد الله (۷/ جمادى الاولىٰ ۱۳۳۱هـ)

کون سا کافر وراثت سے محروم ہوتا ہے؟

سوال (۱) اگر ایک شریک (برادر عینی) اپنے شرکاء سے ایک ہی شہر میں بذریعہ مراسلہ رجسٹری شدہ یہ پوچھے کہ ''میں مشترکہ جائداد میں سے اپنا حصہ بذریعہ تقسیم علیحدہ کرنا چاہتا ہوں اور اس میں جو حصص شرعیہ ہماری والدہ اور ہمشیرہ کے ہیں، وہ بجنسہا آپ ان کے حوالے کر دیں گے یا حسبِ رواج زمیندارہ انھیں خرچ و گزارہ دیں گے؟ اس

مراسلے کا جواب اگر آپ نے تین دن کے اندر نہ دیا تو آپ کی خاموشی کو میں جن معنوں میں محمول کروں گا، مجاز ہوں گا۔" کیا مکتوب الیہم کا سکوت بعد انقضاءِ میعاد معینہ یا تقریباً گیارہ ماہ زائد عمرو کے انکارِ عمد (آیت شریفہ ورثہ) مفہوم ہوکر وہ کاتب کے ورثہ سے محروم ہوسکتے ہیں، جس حال میں کہ وہ بے اولاد مر جائے؟

(۲) حدیث شریف میں آیا ہے: «لا یرث الکافر المؤمن»[1] [کافر مومن کا وارث نہیں ہوگا] کیا اس سے "لا یرث المشرك المؤمن" [مشرک مومن کا وارث نہ ہوگا] استنباط ہوسکتا ہے، جس حال میں کہ ہر دونوں کافر و مشرک کا انجام خلود فی النار ہے؟

(۳) کیا کوئی فرد اہل السنۃ والجماعت اپنے ورثا میں سے اہل البدعۃ کو بحکم آیتِ شریفہ ﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ﴾ [اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو] محروم الارث کرسکتا ہے؟

(۴) کیا حدیث: «الدال علی الخیر کفاعله»[2] [بھلائی کی طرف راہنمائی کرنے والا بھلائی کرنے والے کی طرح ہے] کا قضیہ سالبہ "الدال علی غیر الخیر (شر) کفاعله" درست ہوکر اس سے مبتدعہ ورثہ کا محروم الارث ہونا تخریج ہوسکتا ہے؟

(۵) اگر ورثا بنیت فریب دہی اپنے مورث کے ظاہری طور پر اپنے مبتدعانہ اعمال کی اصلاح کر چھوڑیں، مگر عقائد بدستور ویسے ہی ہوں تو کیا وہ مورث بخیال حفظِ ما تقدم یا علی طریق الاحتیاط ان کو مطلقاً محروم الارث کرنے کی وصیت کرنے پر معذور ہوسکتا ہے؟

(۶) کیا ایک موصی بے اولاد وصیت مشروط بدیں مضمون کرسکتا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا، خود مالک و قابض رہوں گا اور بعد میری موت کے فلاں وفلاں مالک و قابض متصور ہوں اور کہ اس وصیت کا عمل درآمد بشرط نہ پیدا ہونے میری اولاد کے ہوگا اور بروقت پیدا ہونے میری اولاد کے یہ وصیت کالعدم سمجھی جائے یا موصی لہم میں کوئی نقص پا کر اوران کی جگہ مقرر کرسکتا ہے؟

راقم الحروف: خاکسار سعد اللہ خان (۵/صفر ۱۳۳۵ھ) ہیڈ نقل نویس انگریزی محکمہ سیشن جج متصل کاں پنجاب۔ ملتان

جواب (۱) مکتوب الیہم صورت مصرحہ سوال میں کاتب کے ترکہ سے محروم نہیں ہوسکتے، جب تک کہ وہ اپنے آپ کو دینِ حق (اسلام) سے انکار کر کے دوسرے کسی دین (یہودیت، نصرانیت، مجوسیت وغیرہ) میں داخل نہ کریں۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

(۲) حدیث شریف مذکور میں کافر سے ایسا شخص مراد ہے، جو اسلام سے منکر ہے اور کسی غیر دین میں داخل ہے۔ خلود فی النار احکامِ آخرت سے ہے اور حدیث احکامِ دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

---

1. صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۰۳۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۱۴)
2. سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۶۷۰)

(۳) محروم الارث نہیں کرسکتا، جب تک کہ اہل البدعۃ اپنے آپ کو اسلام سے منکر ہو کر کسی غیر دین میں داخل نہ کر دیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

(۴) محروم الارث ہونا تخریج نہیں ہوسکتا، جب تک کہ مبتدعہ ورثہ اپنے آپ کو اسلام سے منکر ہو کر کسی غیر دین میں داخل نہ کر دیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

(۵) محروم الارث کرنے کی وصیت کرنے پر معذور نہیں ہوسکتا، جب تک کہ شروطِ مصرحہ جوابات سابقہ متحقق نہ ہوجائے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

(۶) وصیت مشروط بدیں مضمون کرسکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

كتبه: محمد عبد الله (١٩/ ربيع الأول ١٣٣٩هـ)

کیا ولد الزنا اور اس کی ماں کو وراثت ملتی ہے؟

سوال ولد الزنا وام ولد الزنا کو ترکہ ملتا ہے یا نہیں اور یہ کسی طرح سے موانع ارث سے ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

جواب ولد الزنا کو زانی سے ترکہ نہیں مل سکتا، اس لیے کہ ولد الزنا شرعاً زانی کی اولاد نہیں ہے، اسی طرح ام ولد الزنا یعنی جس عورت کے ساتھ زانی نے زنا کیا اور اس سے لڑکا پیدا ہوا، اس کو بھی ترکہ زانی سے نہیں مل سکتا، اس لیے کہ وہ عورت شرعاً زانی کی زوجہ نہیں ہے، جس طرح وہ عورت جس سے زید نے نکاح کیا ہو اور شرعاً زید کا نکاح اس سے ہو نہیں سکتا، زید سے زوجیت کا ترکہ نہیں پاسکتی، کیونکہ وہ شرعاً زید کی زوجہ نہیں ہے اور جس طرح اس عورت کے بطن سے نطفہ سے زید کے جو اولاد پیدا ہو، اس کو زید سے ترکہ نہیں مل سکتا، اس لیے کہ وہ شرعاً زید کی اولاد نہیں ہے۔

عن عائشة رضي الله عنها قالت: قال النبي ﷺ: «الولد للفراش، وللعاهر الحجر»[1]

(صحيح بخاري مطبوعه أحمدي: ١/ ٩٩٩)

[عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا: بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا ہے اور زانی کے لیے پتھر ہیں]

كتبه: محمد عبد الله (مہر مدرسہ)

سب سے پہلے میت کا قرض ادا کیا جائے:

سوال ایک شخص بہت اسباب چھوڑ کر مر گئے، ان کی ماں، بی بی، لڑکی، بھائی، بھتیجا ہیں۔ اس میت پر قریب ہزار روپیہ کے قرض ہے، اس کے بقیہ ورثا کو معاش اس قدر ہے کہ ادا کر دیں، مگر بہت دیر میں ادا ہونے کا خیال ہے، جس کی وجہ سے اس میت کو تکلیف ہوتی رہے گی۔ کل اسباب بھتیجا کے اختیار میں ہے۔ بھتیجا کو خیال ہوا کہ ان کی نجات و خلاصی جہاں تک جلد ہو سکے، قرض ادا کر کے ہوجائے، اس لیے اس نے سمجھا کہ اس میت کی چیزیں وافر رہتے ہوئے کیوں تکلیف میں مبتلا رہے؟ یہ خیال کر کے اس بھتیجے نے اس کے اسبابوں کو ہر چھوٹی و بڑی (بغیر خیال

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٧)

کیے ہوئے کہ ورثا کے کام کا کوئی اسباب ہے) چیزوں کو بیچنا شروع کیا اور قرض تھوڑا ادا کیا، بعد ازاں کچھ دن کے بھتیجے کو خبر ملی کہ بھائی نے اپنے اوپر ذمہ ادائے کاری میت کا لے لیا ہے کہ اس میت کے سر سے بار اتر جائے۔ تب اس نے بیچنا موقوف کیا، اس فعل سے اس بھتیجا کے لوگ اس سے رنج ہیں۔

① تو کیا ایسی حالت میں وہ بھتیجا اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت میں میت کی چیزوں کے ضائع کرنے کے جرم میں عذاب میں گرفتار ہوگا اور پرسش ہوگی؟ آیا اس کو ایسا کرنے سے ثواب ملے گا یا گناہ ہوگا؟

② کیا بوجہ چیزوں کے بیچنے کے وہ خیانت کا مجرم ہوگا؟

③ کیا اس نے خلاف شرع کیا ہے؟ اگر اس نے صرف باجازت ماں اور بی بی کے بیچا ہے، کیا وہ گنہگار ہوگا؟ اگر اس نے بغیر اجازت کسی وارث کے چیزوں کو بیچ ڈالا ہے یا مستحق ثواب؟

④ جو چیزیں بکی ہیں، ان کو بھتیجا بیچنے والا واپس شرعاً خریدار سے لے سکتا ہے؟ اگر کوئی وارث واپس لینے کو کہے، کیا وہ گنہگار ہوگا یا باعث رنجش اللہ تعالیٰ کے ہوگا، اگر وہ چیزیں واپس خریدار سے لے لے؟

⑤ کیا بیچنا چیزوں کا شرعاً بے شرمی ہے؟

⑥ کیا رنج ہونا چچاؤں کا اس پر جا ہے یا بے جا شرعاً؟ کیا یہ رنجش باعث رنجش اللہ تعالیٰ کا بھی بیچنے سے ہوگا؟ کیا گنہگار رہوگا بھتیجا اس کے لیے؟

⑦ کیا میت کی چیز کو بیچ کر اس کی طرف سے کارِ خیر میں دینا افضل ہے؟ خاص کر قرض اس کے ذمہ ہو یا تقسیم ہونا وارثوں میں بہتر ہے؟

⑧ ماں مرگئی ہے تو کیا اس کے لڑکے کو اس قدر اختیار وحق شرعاً حاصل ہے کہ اس کی چیز کو اپنی نانی سے بزور لے کر بیچ کر اپنی ماں کی طرف سے قرض جو باقی رہ گیا ہے، ادا کر دے اور کارِ خیر میں لگا دے؟

جواب قانونِ شرع یہ ہے کہ ترکہ میت سے بعد تجہیز وتکفین کے جو کچھ بچ رہے، اگر میت مدیون ہو تو اس میں سے اولاً اس کا دین ادا کیا جائے۔ ادائے دین کے بعد جو کچھ بچ رہے، اگر میت نے کچھ وصیت کی ہو تو اس بچے ہوئے کی ایک تہائی میں سے اس کے وصیت میں لگایا جائے، اس کے بعد جو کچھ بچ رہے، وہ حسبِ قانونِ شرع شریف ورثہ میں تقسیم کیا جائے، اس میں سے قبل تقسیم کے بلا رضا مندی کل ورثہ کے اور کسی کام میں صَرف کرنا جائز نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں جو بھتیجے نے (جس کے اختیار میں کل ترکہ ہے) اگر قبل تقسیم ترکہ میان ورثہ اس ترکہ میں سے بعض چیزیں بیچ کر دین میت ادا کرنا شروع کیا تو اس پر مواخذہ اخروی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے یہ کوئی خلافِ شرع کام نہیں کیا، بلکہ اگر اس نے نیک نیتی سے یہ کام کیا ہے تو امید ہے کہ اس کو اجر ملے گا۔ اگر ورثہ میت خود دین کے ادا کرنے کو تیار ہوں اور فروخت شدہ چیزیں واپس کر لینا چاہتے ہوں اور خریداران بخوشی واپس کر دیں تو اس میں کچھ گناہ نہیں ہے۔

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

میت کا ترکہ ورثا کے سپرد کرنا ضروری ہے:

سوال کوئی مسلمان شخص کسی کے گھر میں مر جائے اور صاحبِ خانہ کے قبضے میں اُس مردہ کی کوئی چیز اسباب ہو تو اس کو کیا کرے؟

جواب اس صورت میں یہ حکم ہے کہ اولاً اُس مردے کا حتی الامکان وارث تلاش کیا جائے۔ اگر کوئی وارث ٹھہر جائے تو وہ چیز و اسباب اس وارث کے حوالے کر دیں اور اگر حتی الامکان تلاش کرنے کے بعد کوئی وارث نہ ٹھہرا اور اس قدر تلاش کیا کہ اس قدر تلاش کے بعد وارث کے ملنے کی امید باقی نہ ہو تو اُس چیز و اسباب کو خیرات کر دیں۔ بخاری شریف (۳/ ۲۲۹ چھاپہ مصر) میں ہے:

"اشترى ابن مسعود جارية، والتمس صاحبها سنة فلم يجده، وفقد، فأخذ يعطي الدرهم والدرهمين، وقال: اللهم عن فلان فإن أتى فلان فلي وعلي، وقال: هكذا فافعلوا باللقطة، وقال ابن عباس نحوه" اھ

[سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی خریدی، ایک سال تک اس کے (فروخت کنندہ) مالک کو تلاش کیا، مگر وہ نہ ملا۔ سو اسے گم پا کر انھوں نے اس کی قیمت سے ایک ایک دو دو درہم صدقہ کرنا شروع کر دیا اور کہا: اے اللہ! یہ (صدقہ) فلاں (اس لونڈی کے فروخت کنندہ مالک) کی طرف سے ہے، اگر وہ فلاں آ گیا (اور اس نے میرے اس صدقے کا انکار کیا) تو اس صدقے کا ثواب میرے لیے ہوگا اور اس کو اس کی قیمت دینا میرے ذمے ہوگا اور انھوں نے فرمایا کہ لقطے کے ساتھ بھی یہی کچھ کرو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے]

جو بعض جگہ مردے کا کھانا برادری میں بانٹتے ہیں یا برادری کو کھلواتے ہیں، جیسا کہ ہندوؤں کے یہاں رسم ہے، شرع شریف میں اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ واللّٰہ أعلم بالصواب. كتبه: محمد عبد الله

قبضے سے پہلے جائداد تقسیم نہیں کر سکتے:

سوال ① ایک شخص احمد تھا، اس کے ایک پسر محمود زوجہ اولیٰ سے ہے۔

② احمد نے بعد انتقال زوجہ اولیٰ کے عقدِ ثانی کر لیا، جس کے بطن سے سات پسر متولد موجود ہیں۔

③ احمد نے محمود کے نام کچھ جائداد بھی کسی وجہ سے کھیوٹ کرا دیا تھا۔

④ اب محمود خواستگار تقسیم جائداد ہے اور احمد اب تک باحیات مستعار قائم ہے تو محمود جائداد تقسیم پانے کا مستحق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس طرح حصص شرعیہ ہوسکتا ہے یا بعد انتقال احمد کس طرح برادران مختلف بطن میں شرعاً حصص ہوگا، نیز جائداد محمود میں پسران بطنِ ثانی کے حصہ پانے کے مستحق ہوں گے؟

جواب اگر احمد کا مطلب محمود کے نام جائداد کے کھیوٹ کر دینے سے جائداد مذکورہ کا محمود کو ہبہ کر دینا ہے تو اس

صورت میں کہ احمد نے محمود کو ہنوز جائداد مذکورہ پر قبضہ نہیں دیا ہے، محمود جائداد مذکورہ کے تقسیم کرا پانے کا مستحق نہیں ہے۔

"روى أحمد والطبراني عن أم كلثوم بنت أبي سلمة، وهي بنت أم سلمة، قالت: لما تزوج النبيﷺ أم سلمة، قال لها: اني قد أهديت إلى النجاشي حلة وأواقي من مسك، ولا أرى النجاشي إلا قد مات، ولا أرى هديتي إلا مردودة علي فإن رُدّت علي فهي لك، قال: وكان كما قال. الحديث، وإسناده حسن" (فتح الباري، طبع دهلى: ٢/ ٥٤٠)

[امام احمد اور طبرانی رحمہ اللہ نے ام کلثوم بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے جو اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی ہیں، وہ بیان کرتی ہیں کہ جب نبیِ مکرم ﷺ نے ام سلمہ سے شادی کی تو انھیں کہا: ''میں نے نجاشی کے پاس ایک حلہ اور چند اوقیے مسک کا ہدیہ ارسال کیا ہے، میرا گمان ہے کہ نجاشی فوت ہوگیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا ہدیہ میرے پاس واپس آ جائے گا۔ اگر وہ میرے پاس آ گیا تو وہ تیرا ہوگا۔'' راوی کہتے ہیں کہ ایسے ہی ہوا، جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا...الحدیث۔ اس کی سند حسن ہے]

"عن مالك عن ابن شهاب الزهري عن عروة عن عائشة زوج النبيﷺ أنها قالت: إن أبا بكر الصديق كان نحلها جاد عشرين وسقا من ماله بالغابة، فلما حضرته الوفاة قال: والله يا بنية ما من الناس أحب إلي غنىً بعدي منك، ولا أعز علي فقرا بعدي منك، و إني كنت نحلتك جاد عشرين وسقا فلو كنت جددتيه واحتزيته كان لك لأن الحيازة والقبض شرط في تمام الهبة، وقال أبو عمر: اتفق الخلفاء الأربعة على أن الهبة لا تصح إلا مقبوضة، وبه قال الأئمة الثلاثه، وقال أحمد و أبو ثور: تصح الهبة بلا قبض، وروي ذلك عن علي من وجه لا يصح وإنما هو اليوم مال وارث، وإنما هما أخواك وأختاك فاقسموه على كتاب الله"

(موطأ مالك مع شرحه الزرقاني، مطبوعه مصر: ٢/ ٢١٧)

[امام مالک رحمہ اللہ محمد بن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں، وہ عروہ سے روایت کرتے ہیں، وہ نبیِ مکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان (عائشہ رضی اللہ عنہا) کو غابہ نامی اپنی زمین سے بیس وسق کا عطیہ دیا، پھر جب ان کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے کہا: اے بیٹی! مجھے اپنے بعد غنا کی حالت میں تجھ سے زیادہ محبوب کوئی نہیں اور مجھے تیرا فقر اپنے بعد سب سے زیادہ ناگوار ہے، میں نے تجھے بیس وسق کا عطیہ دیا تھا، اگر تو ان کو توڑے اور ان کی مالک بنے تو وہ تیری ہی ہیں۔ کیوں کہ مالک بننا اور قبضہ کرنا ہبہ کے مکمل ہونے کی شرط ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: چاروں خلفا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہبہ اس صورت میں درست ہے جب اس پر قبضہ کیا جائے۔ ائمہ ثلاثہ کا بھی یہی

موقف ہے۔ امام احمد اور ابوثور نے کہا ہے کہ قبضہ کیے بغیر بھی ہبہ اور صدقہ صحیح ہے۔ علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک غیر صحیح سند کے ساتھ یہی موقف مروی ہے۔ آج وہ وراثت والا مال ہے اور وہ (وارث) تیرے دو بھائی (عبدالرحمن اور محمد) اور دو بہنیں ہیں۔ لہٰذا اسے کتاب اللہ کے مطابق تقسیم کر لینا] واللہ أعلم بالصواب

کتبہ: محمد عبد اللہ (۲/ ذی القعدة ۱۳۲۹ھ)

فرائض کے بعض اختلافی مسائل میں ترجیح:

سوال دریں مسائل فرائض بین العلماء خلافے رودادہ و حاجت تصفیہ ثالث فتادہ کشف استار فرمانید

[فرائض کے درج ذیل مسائل میں علما کے مابین اختلاف واقع ہوگیا ہے، کسی ثالث کی طرف سے اس کے تصفیے کی ضرورت ہے، لہٰذا آپ ہی حقیقت حال سے نقاب کشائی کیجیے]

1 حسینی بیگم

مسئلہ ۳، تصحیح ۸۴

ابن الخال	ابن الخال	ابن الخال	بنت الخال	ابن خالہ	بنت الخالہ	بنت الخالہ
مظہر علی خاں	احمد خاں	ولی محمد خاں	بی بی عمرہ	علی حسین	بی بی بدہن	بی بی سدہن
۱۶	۱۶	۱۶	۸	۱۴	۷	۷

2 مسئلہ ۱۱، تصحیح ۳۰۸

ابن اخ الام	ابن اخ الام	ابن اخ الام	بنت اخ الام	ابن اخت الام	بنت اخت الام	بنت اخت الام
مظہر علی خان	احمد خاں	ولی محمد خان	بی بی عمرہ	علی حسین	بی بی بدہن	بی بی سدہن
۶۴	۶۴	۶۴	۳۲	۴۲	۲۱	۲۱

جواب درصورت مسئلہ نمبر ۲ بہر گونہ، یعنی ہم مسئلتاً وہم تصحیحاً صحیح است و نمبر ۱ بہر گونہ خطاست چہ حساب ثلث و ثلثین در اولاد صنف رابع ذوی الارحام وقتیست کہ حیز قرابت شان مختلف باشند یعنی بعضے از ایشاں فریق اب باشند (چوں اولاد عمات و اولاد اعمام اخیافی و اولاد بنات اعمام) وبعضے از ایشاں فریق ام (چوں اولاد اخوال و اولاد خالات) و اما اگر حیز قرابت شاں متحد باشد یعنی ہمہ فریق اب باشند یا ہمہ فریق ام دراں صورت حساب ثلث و ثلثین نیست بلکہ دراں صورت اگر یکے ازاں ایشاں ولد عصبہ نباشد (حسب قول امام محمد رحمہ اللہ مفتی بہ در مذہب حنفی ہمان است) تقسیم ترکہ بر اول بطن اصول کہ اختلاف بذکورت وانوثت دراں رودادہ باشد بحساب ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ باید کرد حصص اصول را بفروع ایشاں باعتبار صفات فروع باید داد۔

و در ما نحن فیہ سہ ابن الخال و یک بنت الخال و یک ابن الخالہ و دو بنت الخالہ اند حیز قرابت شان متحد است کہ ہمہ فریق ام اند و یکے از ایشاں ولد عصبہ ہم نیست، پس حسب قول امام محمد رحمہ اللہ ہر چہار خال و سہ خالہ کہ اصول ایشا نند

ومختلف اند بذکورت وانوثت بحساب ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ تقسیم کردہ بایشان باعتبار صفات شاں باید داد پس چوں در ما نحن فیہ چہار خال و سہ خالہ اند و چہار خال بمنزلہ ہشت خالہ می شوند پس مجموع گویا یازدہ خالہ شدند پس بر یازدہ سہام تقسیم کردہ شد۔ پس ہشت سہام ازاں بر چہار اخوال و سہ سہام بسہ خالات دادہ باشد و چوں چہار اخوال و سہ ابن و یک بنت اند سہ ابن بمنزلہ شش بنت می شوند پس مجموع گویا ہفت بنت شدند و چوں ہشت سہام کہ حصہ اخوال است برہفت کہ عدد رؤس فروع ایشان است مستقیم نیست و بینہما تباین است حسب قاعدہ تصحیح کل عدد چہار محفوظ داشتہ شد و فروع سہہ خالات یک ابن و دو بنت اند و یک ابن بمنزلہ دو بنت می شود پس مجموع گویا چہار شدند و سہ سہام کہ حصہ خالات است بر چہار کہ عدد رؤس فروع ایشاں است مستقیم نیست و بینہما تباین است کل عدد چہار محفوظ داشتہ شد باز در عددین محفوظین (۷و۴) ہم تباین است پس یکے را در دیگرے ضرب نمودہ حاصل ضرب (۲۸) را در اصل مسئلہ ۱۱ ضرب نمودہ شد حاصل ضرب ۳۰۸ برآمد بہمیں تصحیح مسئلہ می شود۔

پس منجملہ آں ۲۲۴ بچہار اخوال رسید کہ بر فروع ایشان بحساب ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ تقسیم کردہ شد و ۸۴ بسہ خالات رسید کہ بفروع ایشان بہمان حساب دادہ شد۔

في السراجية وشرحها الشريفية:

"إن استووا في القرب إلى الميت وكان حيز قرابتهم متحدا بأن يكون قرابة الكل من جانب أب الميت أو من جانب أمه فمن كانت له قوة القرابة فهو أولى بالإجماع"[1] اهـ

وفيها أيضاً: "وإن استووا في القرب (بحسب الدرجة) وفي القرابة بحسب القوة، وكان حيز قرابتهم متحدا فولد العصبة أولى"[2] اهـ

وفي الشريفية: "وإن اجتمعوا واتحد حيز قرابتهم فالأقوى منهم أولى ذكرا كان أو أنثى، وإن استوت قرابتهم فللذكر مثل حظ الأنثيين" اهـ

وفي السراجية والشريفية: "ثم ما أصاب لكل فريق من فريق الأب والأم عند محمد رحمه الله يقسم المال على أول بطن اختلف مع اعتبار عدد الفروع والحساب في الأصول" اهـ والله أعلم بالصواب

في العالمگيري: "فإن كان قوم من هؤلاء من قبل الأم من بنات الأخوال والخالات و قوم من قبل الأب من بنات العمات والأعمام لأم فالمال مقسوم بين الفريقين أثلاثا"[3] اهـ

وفي رد المحتار: "وإن اختلف حيز قرابتهم فالثلثان لمن يدلي بقرابة الأب، والثلث

---

[1] شرح السراجية للسيد الشريف الجرجاني (ص: ۱۹۷)

[2] المصدر السابق (ص: ۱۹۸)

[3] الفتاوىٰ الهندية (٦/ ٤٦٣)

لمن يدلي بقرابة الأم. وفي السراجية وإن اختلف حيز قرابتهم فلقرابة الأب الثلثان ولقرابة الأم الثلث"[1] اھ

[جواب: مسئلہ نمبر ② مسئلتاً اور تصحیحاً دونوں صورتوں میں صحیح اور درست ہے اور مسئلہ نمبر ① ہر لحاظ سے غلط ہے، کیوں کہ ذوی الارحام کی صنف رابع کا حساب ثُلث اور ثُلُثَین کے ساتھ اس وقت ہوتا ہے، جب ان کی قرابت کا جزو مختلف ہو، یعنی ان میں سے بعض اَب کے فریق ہوں، جیسے پھوپھیوں کی اولاد، اخیافی چچوں کی اولاد اور چچوں کی بیٹیوں کی اولاد اور ان میں سے بعض ام کے فریق سے ہیں، جیسے ماموؤں کی اولاد اور خالاؤں کی اولاد اور اگر ان کی قرابت کا جزو متحد ہو، یعنی سب فریقِ اَب ہوں یا سب فریقِ اُم ہوں تو اس وقت ثُلث اور ثُلُثَین کا حساب جاری نہیں ہوتا، بلکہ اس صورت میں ان میں سے اگر کوئی ولد عصبہ میں سے نہ ہو (امام محمد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق حنفی مذہب میں مفتیٰ بہ قول یہی ہے) تو اول بطن کے اصول پر، جن میں ذکورت و انوثت کا اختلاف رونما ہو چکا ہو، ترکہ کی تقسیم ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کے حساب پر کرنا ہوگی۔ ان کے اصول کے حصے ان کے فروع کو صفاتِ فروع کے اعتبار سے دیے جائیں گے۔ رہا وہ مسئلہ جس پر ہم بات کر رہے ہیں، اس میں تین ماموں کے بیٹے، ایک ماموں کی بیٹی، ایک خالہ کا بیٹا اور دو خالہ کی بیٹیاں ہیں، ان کی قرابت کا جزو متحد ہے، کیوں کہ وہ فریقِ اُم ہیں اور ان میں سے کوئی ایک ولدِ عصبہ بھی نہیں ہے۔ پس امام محمد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ہر چار ماموں اور تین خالائیں، جو ان (ماموؤں اور خالاؤں کی اولاد) کے اصول ہیں اور ذکورت و انوثت میں مختلف ہیں، ان میں ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کے حساب سے ان کی صفات کے اعتبار سے ان کو حصہ دیا جائے گا۔

پس زیرِ بحث مسئلے میں چار ماموں اور تین خالائیں ہیں، چار ماموں بمنزلہ آٹھ خالاؤں کے ہوئے، لہٰذا کل گیارہ خالائیں بن گئیں۔ پس اس کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا تو ان میں سے آٹھ حصے چار ماموؤں کے اور تین حصے تین خالاؤں کو دیے گئے اور جب چار ماموؤں کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے تو تین بیٹے بمنزلہ چھے بیٹیوں کے ہوئے، گویا یہ کل سات بیٹیاں ہوگئیں اور جب آٹھ حصوں کو، جو ماموؤں کے حصہ ہے، سات پر جو ان کی فروع کے رؤس کا عدد ہے، وہ مستقیم نہیں ہے، ان کے درمیان نسبت تباین ہے۔ تصحیح کے قاعدے کے مطابق تمام سات حصوں کو محفوظ رکھا گیا۔ تین خالاؤں کی فروع ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹا بمنزلہ دو بیٹوں کے ہے، گویا مجموعی طور پر چار بیٹیاں ہوئیں۔ پھر تین حصے، جو خالاؤں کا حصہ ہے، چار پر، جو ان کی فروع کے روؤس کا عدد ہے اور وہ عدد مستقیم نہیں ہے، ان کے درمیان نسبت تباین ہے، لہٰذا کل چار حصوں کو محفوظ کر دیا گیا۔ پھر دونوں محفوظ عددوں (۷ اور چار) میں بھی تباین کی نسبت ہے، لہٰذا ایک کو دوسرے سے ضرب دی گئی تو حاصل ضرب (۲۸) ہوا۔ پھر اس کو اصل مسئلے (۱۱) کے ساتھ ضرب دی گئی تو حاصل ضرب (۳۰۸) ہوا۔ اس سے مسئلے کی تصحیح

---

① رد المحتار (۷۹۶/۶)

ہوگی، پس ان میں سے (۲۲۴) چار ماموؤں کو ملیں گے اور ان کو ان کی فروع پر ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کے قاعدے پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ باقی کے (۸۴) حصے تین خالاؤں کو ملیں گے اور ان کو مذکورہ حساب کے ساتھ ان کی فروع پر تقسیم کر دیا جائے گا۔

السراجیہ اور اس کی شرح الشریفیہ میں ہے:

''اگر وہ میت کی طرف قرب میں برابر ہوں اور ان کی قرابت کا جز و متحد ہو، یعنی سب کی قرابت میت کے باپ یا اس کی ماں کی طرف سے ہو، تو جس کو قوت قرابت حاصل ہوگی تو بالا جماع وہی زیادہ حق دار ہوگا۔''

اسی میں یہ بھی ہے:

''اگر وہ قرب میں حسبِ درجہ اور قرابت میں حسبِ قوت برابر ہوں اور ان کی قرابت کا جز و متحد ہو تو ولدِ عصبہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔''

شریفیہ میں ہے:

''اگر وہ مجتمع ہوں اور ان کی قرابت متحد ہو تو ان میں سے جو قوی قرابت والا ہے، وہی زیادہ حق دار ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور اگر ان کی قرابت برابر ہو تو پھر ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کے قاعدے کے مطابق تقسیم ہوگی۔''

السراجیہ اور الشریفیہ میں ہے:

''پھر باپ اور ماں کے فریق میں سے ہر فریق کو جتنا حصہ ملے تو امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک اول بطن میں مال تقسیم کیا جائے گا اور اصول میں فروع اور حساب کے عدد کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔''

عالمگیری میں ہے:

''پس اگر ان میں سے ایک فریق ماں کی طرف سے ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیوں کی صورت میں ہو اور دوسرا فریق باپ کی طرف سے پھوپھیوں اور اخیافی چچوں کی بیٹیاں ہو تو دونوں فریقوں میں ثلث اور ثلثین کے حساب سے مال تقسیم ہوگا۔''

رد المحتار میں ہے:

''اگر ان کی قرابت کا جز و مختلف ہو تو دو ثلث اس کو ملے گا، جس کا باپ کی قرابت کے ذریعے رشتہ ہے اور ایک ثلث اسے ملے گا، جس کی ماں کی قرابت کی وجہ سے رشتے داری ہے اور السراجیہ میں ہے: اور اگر ان کی قرابت مختلف ہو تو قرابتِ اَب کے لیے دو ثلث اور قرابتِ اُم کے لیے ایک ثلث ہے۔''

کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ

حصص کی تقسیم

خاوند، دو بیٹیاں، ایک پوتا اور ایک پوتی:

سوال ہندہ ایک زوج و دو دختر و ایک پوتا و ایک پوتی چھوڑ کر فوت ہوگئی۔ بعدہ زوج ہندہ متوفیہ فوت ہوگیا۔ وارثان مذکورین چھوڑے، پس عند الشرع ترکہ وارثان پر کیونکر تقسیم ہوگا؟

جواب: ہندہ

زوج	بنت	بنت	ابن الابن	بنت الابن
کأن لم یکن	۳	۳	۲	

واللہ أعلم بالصواب۔

یہ جواب صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ وارث میت سابق کأن لم یکن [گویا وہ موجود ہی نہیں] اس وقت قرار دیا جاتا ہے، جبکہ وارث مذکور کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ بھی باستثناء اس کے وہی ہوں، جو ورثہ میت سابق تھے اور طریقہ تقسیم ترکہ ہر دو میت (میت سابق ومیت لاحق) بھی یکساں ہو۔ صورتِ مسئولہ میں ایسا نہیں ہے اور اگر کأن لم یکن قرار دینے کی یہ شرط نہ ہو تو ہوسکتا ہے کہ بعض ورثہ کی حق تلفی ہوجائے، مثلاً صورتِ مسئولہ میں ترکہ ہندہ سے بنتین کو پانچ سدس اور ابن الابن و بنت الابن کو ایک سدس ملنا چاہیے اور کأن لم یکن کی تقدیر پر بنتین فقط ثلثین، یعنی چار سدس اور ابن الابن و بنت الابن کو ایک ثلث یعنی دو سدس ملتا ہے، یعنی کأن لم یکن کی تقدیر پر بنتین کے حق میں ایک سدس کی کمی لازم آتی ہے۔ الحاصل کأن لم یکن وہاں قرار دیا جاتا ہے، جہاں بلا لزوم حق تلفی کسی وارث کے عمل میں اختصار حاصل ہوتا ہو اور جہاں حق تلفی لازم آجائے، وہاں کان لم یکن قرار دینا جائز نہیں ہے۔ (دیکھو: فرائض شریفی، آغاز باب المناسخہ)

اس جواب کے عدمِ صحت کی یہی ایک وجہ اس وقت ہے کہ ورثہ مذکورین جس طرح ہندہ کی بنتیں و ابن الابن و بنت الابن ہیں، اسی طرح اس کے زوج مذکور کے بھی ہوں، ورنہ اس جواب کے عدمِ صحت کی وجہ علاوہ وجہ مذکور کے اور بھی ہوسکتی ہے۔

خاوند، بھائی اور والدہ:

سوال کسی شخص کی بی بی نے لا ولد قضا کیا اور اس کے تین وارث ہیں: شوہر، برادر کلاں، والدہ۔ اس کے دینِ مہر کے لینے کا حق ان میں سے کس کو ہے: تینوں کو یا ایک کو؟ اگر ایک کو ہے تو کس کو اور تینوں کو ہے تو کس کو کتنا حق ہے؟

جواب مسماۃ مذکورہ کے تینوں وارث اس کے دینِ مہر کے لینے کے مستحق ہیں۔ اس کا مہر صرف چھ سہام پر تقسیم ہوگا، اس میں سے نصف، یعنی تین سہام شوہر کو اور ثلث یعنی دو سہام والدہ کو اور باقی ایک سہم برادر کو ملے گا۔ والدہ اور برادر اپنا اپنا حق شوہر سے لے سکتے ہیں۔

ایک بیٹا، ایک بیٹی، ایک پوتا اور ایک بہو:

سوال زید نے اپنی جائداد میں سے بوقت حیات ایک مکان بڑے بیٹے کو اور ایک مکان چھوٹے بیٹے کو دیا، لیکن یہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ مکان برائے سکونت دیا یا ملکیت میں، اور دختر کو کہا کہ ہم تم کو دوسرا مکان خرید کر دیں گے۔ بعد چند زمانہ کے زید نے انتقال کیا اور نیز بعد زید زوجہ زید نے بھی انتقال کیا، بعد انتقال زید و زوجہ زید دونوں لڑکوں نے بقیہ جائداد میں سے تقریباً دو سو روپیہ کا زیور و کپڑا و برتن مسی اپنی ہمشیرہ کو دیا، بعدہ دونوں لڑکوں میں سے چھوٹے لڑکے نے انتقال کیا اور اس نے اپنی ایک بیوی اور ایک دختر چھوڑا۔ اب بضرورت سرکار گورنمنٹ دونوں مکان سڑک میں آ گئے ہیں، لہٰذا اس کا روپیہ بموجب شرع شریف کس طرح تقسیم ہونا چاہیے۔ ورثاء میں سے چار اشخاص ہیں، یعنی زید کا ایک لڑکا اور ایک دختر اور دوسرے لڑکے مرحوم کی ایک بیوی اور ایک دختر۔

جواب ہر دو مکان کا روپیہ بہ تفریق ذیل تقسیم ہوگا۔ زید کا تمام ترکہ بطریق اختصار پانچ سہام پر تقسیم ہوگا، دو دو سہام ایک ایک لڑکے کو اور ایک حصہ لڑکی کو۔ ازاں بعد جو لڑکا مر گیا ہے، اس کے مال کے آٹھ سہام کے ایک حصہ بیوی کو اور چار دختر کو اور دو بھائی کو جو زید کا بیٹا ہے، دیے جائیں اور ایک بہن کو۔ عرف میں جب مکان وغیرہ کسی کو دیا جاتا ہے تو تملیک مراد نہیں ہوتی، لہٰذا تمام ترکہ زید مع ہر دو مکان مذکورۃ الصدر ترکہ زید مالک بطریق مذکورہ تقسیم ہوں گے۔

هكذا في كتب الفقه والفرائض. عبد الكريم علوى فقيه اول دار العلوم. الجواب صحيح. محمد عبد الله (١٤/ ربيع الآخر ١٣٣١هـ)

زید کے موجودہ ورثاء چار شخص ہیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور ایک پوتی اور ایک بہو۔ پس زید کے متروکہ مال میں سے نصف، یعنی آدھا اس کے لڑکے کو ملے گا اور ربع، یعنی چوتھائی اس کی لڑکی کو اور بقیہ ربع کے پانچ حصے کر کے ان میں سے چار حصے اس کی پوتی کو ملیں گے اور ایک حصہ بہو کو، یعنی بیس روپیہ میں سے دس روپیہ زید کے لڑکے کو ملیں گے اور پانچ روپیہ اس کی لڑکی کو اور چار روپیہ اس کی پوتی کو اور ایک روپیہ اس کی بہو کو ملے گا۔ والله أعلم بالصواب.

کتبہ: ابو یوسف محمد عبد المنان غازیپوری۔ مدرس مدرسہ ریاض العلوم، شہر دہلی.

بے اولاد بیوی سے باپ اور خاوند کا حصہ:

سوال زید کی اہلیہ نے بقضائے الٰہی زید کی زندگی میں وفات پائی، مرحومہ کی کوئی اولاد نہیں، نہ ہی اُس کے بھائی بہن ہیں، مگر اس کا والد زندہ ہے اور خاوند سے شرعی حصہ مانگتا ہے۔ مرحومہ کی کوئی جائداد نہیں ہے، صرف زیور اور پارچہ جات ہیں۔ زیور کا کچھ حصہ مرحومہ کو اس کے والد نے دیا تھا اور کچھ حصہ اس کے خاوند نے بعد نکاح وقتاً فوقتاً بنوا کر دیا۔ مرحومہ نے اپنے خاوند کو یہ وصیت بھی کی ہے کہ اس کے زیور میں سے حج بدل کرایا جائے۔ مرحومہ کا خاوند زید اب یہ کہتا ہے کہ جو زیور اس نے (زید نے) مرحومہ کو وقتاً فوقتاً بنوا کر دیا تھا، وہ اس نے اپنی زوجہ کی ملکیت میں نہیں کیا تھا،

اس لیے وہ مرحومہ کا ترکہ نہیں ہے، البتہ جو زیور مرحومہ کو والدین کی طرف سے ملا تھا، وہ مرحومہ کا ترکہ ہے، پس خاوند زید یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنا زیور وغیرہ الگ کر کے باقی ماندہ مال میں سے رقم حج نکالے گا، پھر جو بچے گا، اس میں سے نصف والدِ مرحومہ کے حوالے کرے گا۔

جناب والا کی خدمت میں التماس ہے کہ شرعی فتوی مندرجہ ذیل امور کی نسبت تحریر فرمائیں:

① مرحومہ کا ترکہ کیا ہے؟ صرف وہ زیور اور پارچہ جات جو اس کو والدین کے ہاں سے ملے یا وہ زیور بھی ترکہ میں داخل سمجھا جائے گا، جو خاوند نے اس کو وقتاً فوقتاً بنوا کر دیا، مگر اس کی ملک نہیں کیا؟

② وصیت تقسیم کرنے سے پہلے پوری کرنی چاہیے؟

③ باپ اور خاوند کا کس قدر حصہ ہوگا؟ مسکین: ڈاکٹر عبدالرحیم سب اسسٹنٹ سرجن۔ محلّہ اقبال گنج، شتر خانہ، لودھیانہ

جواب ① مرحومہ کا ترکہ صرف وہ زیور و پارچہ جات ہیں، جو اس کو اس کے والدین کے ہاں سے ملے، بشرطیکہ خاوند نے جو زیور اس کو وقتاً فوقتاً بنوا کر دیا، اس کے دینے کے وقت تصریح کر دی ہو کہ یہ زیور تم کو مستعار دیتا ہوں، تمھاری ملک نہیں کرتا اور اگر تصریح نہ کی ہو تو ایسی صورت میں رواج پر فیصلہ ہوگا، یعنی اگر یہ رواج ہو کہ زیور جو خاوند دیتا ہے، وہ بھی زوجہ کی ملک سمجھا جاتا ہے تو زیور مذکورہ بالا مرحومہ کی ملک اور مرحومہ کے ترکہ میں داخل سمجھا جائے اور اگر زیور جو خاوند دیتا ہے، مستعار سمجھا جاتا ہے تو زیور مذکورہ بالا مرحومہ کے ترکہ میں داخل نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ وہ خاوند کی ملک ہوگا۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

② وصیت تقسیم ترکہ سے پہلے پوری کرنی چاہیے، مگر صرف تہائی ترکہ سے اور وہ بھی اس ترکہ کی تہائی سے جو مرحومہ کی تجہیز و تکفین سے و نیز ادائے دین سے (اگر مرحومہ پر کسی کا کچھ دَین آتا ہو) بچ رہے، بشرطیکہ ورثہ تہائی سے زیادہ وصیت پوری کرنے پر راضی نہ ہوں، ورنہ جس قدر تہائی سے زیادہ سے وصیت پوری کرنے پر راضی ہوں، اس قدر سے وصیت تقسیم ترکہ سے پہلے پوری کرنی چاہیے۔ واللہ تعالیٰ أعلم.

③ وصیت پوری کرنے کے بعد جس قدر بچ رہے، اس میں سے نصف باپ کا حصہ ہے اور نصف خاوند کا، اگر مرحومہ نے اولاد نہ چھوڑی ہو۔ واللہ تعالیٰ أعلم کتبہ: محمد عبد اللہ (۲۳/ محرم ۱۳۳۵ھ)

حقیقی بھائی، دو علاتی بھائی اور ایک علاتی بہن:

سوال غلام قادر مر گئے، وارث چھوڑا: شیخ خیراتی برادر حقیقی اور عبدالرشید و عبدالصمد برادران علاتی اور مسماۃ بتولن ہمشیرہ علاتی کو، ترکہ ان کا کس قدر کن کو پہنچا؟ راقم: عبدالرشید ساکن بکسر، محلّہ خلاصی ٹولہ

جواب اس صورت میں (بعد تقدیم ما تقدم علی الإرث ورفع موانعه) کل ترکہ غلام قادر کا شیخ خیراتی برادر حقیقی کو پہنچا اور کسی کو نہیں۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

ایک بہن اور علاتی بھائی:

سوال ایک عورت لا ولد نے انتقال کیا، ایک حقیقی بہن اور ایک علاتی بھائی کو وارث چھوڑا، پس متروکہ میت کیونکر تقسیم ہوگا؟

جواب صورت مسئولہ میں کہ مسماۃ لا ولد، ایک حقیقی بہن اور ایک علاتی بھائی چھوڑ کر قضا کی، بعد تقدیم ما تقدم علی الارث ورفع موانعہ کے ترکہ مسماۃ مذکورہ سے نصف حقیقی بہن کو اور باقی علاتی بھائی کو ملے گا۔ سراجیہ میں ہے: "وأما للأخوات لأب وأم فأحوال خمس، النصف للواحدة" [یعنی بہنوں کے پانچ احوال ہیں: اگر وہ ایک ہوتو اسے نصف ملے گا] نیز اس میں ہے:

"أولهم بالميراث جزء الميت ... إلى قوله: ثم جزء أبيه أي الأخوة"[1] والله أعلم بالصواب.

[ان میں سے میراث کے سب سے زیادہ مستحق میت کے اجزا ہیں... پھر اس کے باپ کے اجزا، یعنی بھائی ہیں]

کتبہ: محمد عبد الله

ایک لڑکی، ایک بہن اور ایک سوتیلا بھائی:

سوال ایک عورت نے کچھ جائداد چھوڑ کر انتقال کیا اور چھوڑا ایک لڑکی اور ایک بہن حقیقی اور ایک بھائی سوتیلا۔ اس کی جائداد میں کس کو کتنا ملے گا اور کس کو نہیں ملے گا؟ بینوا تؤجروا.

جواب اس صورت میں (بعد تقدیم ما تقدم علی الارث ورفع موانعہ) اس عورت کی جائداد میں سے نصف لڑکی کو اور نصف باقی حقیقی بہن کو ملے گا اور سوتیلے بھائی کو کچھ نہیں ملے گا۔ والله أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد عبداللہ. ابو الفیاض محمد عبدالقادر اعظم گڑھی مئوی

دو بیویاں اور ایک بیٹی:

سوال زید مر گیا، اس نے ایک بی بی چھوڑی اور ایک ایسی عورت جس کو زید نے کسی شہر میں، جہاں بذریعہ تجارت کے رہتا تھا، رکھ لیا تھا اور وہ عورت اپنے شوہر اور وطن سے جدا ہو کر آئی تھی اور زید کے ساتھ ہمیشہ مثل بی بی کے رہتی تھی۔ ایک لڑکی اس عورت کی رفاقت میں زید کے پیدا ہوئی اور زید نے اس کی شادی اپنی بیٹی کہہ کر اپنی قوم میں کر دی اور یہ عورت کہتی ہے کہ ہمارا نکاح صحیح زید سے اس کی دکان پر ہوا تھا اور یہ لڑکی اس کے نطفہ کی ہے، لیکن نکاح کا کوئی گواہ نہیں اور نہ معلوم کہ اس عورت کو شوہر اول نے طلاق دی تھی یا نہیں؟ پس اس صورت میں ترکہ زید کا کیونکر تقسیم ہوگا اور کس کو کس قدر ملے گا اور اس لڑکی کا نسب زید سے ثابت ہوگا یا نہیں؟

جواب وہ عورت جب زید کے ساتھ مثل بی بی کے برابر اس کے مرنے تک رہی اور اس عورت سے جو لڑکی پیدا ہوئی تو زید نے اس کو اپنی بیٹی کہہ کر اپنی قوم میں اس کی شادی کر دی اور وہ عورت کہتی ہے کہ ہمارا نکاح صحیح زید سے ہوا ہے اور یہ لڑکی اسی کے نطفہ سے ہے، پس اس صورت میں وہ لڑکی اور وہ عورت دونوں زید کے ترکہ سے حصہ پائیں گی اور

---

[1] السراجی فی المیراث (ص: ١٦)

اس کی لڑکی کا نسب زید سے ثابت ہوگا۔ ترکہ زید سولہ سہام پر تقسیم ہو کر ازاں جملہ ایک سہم اس کی بی بی کو اور ایک سہم اس عورت کو اور چودہ سہام اس لڑکی کو پہنچیں گے۔ واللہ أعلم بالصواب.

کتبہ: أبو العلی محمد عبد الرحمن، عفي عنه. الجواب صحیح. کتبہ: محمد عبد اللہ (مہر مدرسہ)

شوہر، بیٹا، والد اور دو بیٹیاں:

سوال ① زید ایک پسر مسمی بکر اور ایک دختر مسماۃ زینب رکھتا تھا اور اکثر جائداد و غیر منقولہ بنام بکر اور زینب بطورِ اسم فرضی کے خرید کی۔ حیاتِ زید میں زینب نے قضا کی، پس اس جائداد غیر منقولہ فرضی میں حق زینب کا ہے یا نہیں؟

② جو جائداد منقولہ زینب کی ہے، اس میں زینب نے ایک شوہر مسمی خالد اور دو دختر مسماۃ ہندہ و حفصہ اور یک پدر مسمی زید اور ایک برادر مسمی بکر وارث چھوڑے۔ پس تقسیم متروکہ زینب کی ازروے شرع شریف کیونکر ہوگی؟

③ دینِ مہر زینب کا نہ خالد نے ادا کیا نہ خالد کو زینب نے معاف کیا، اس صورت میں زید پدر زینب مستحق دینِ مہر کا ہے یا نہیں؟

④ ابتدائے زمانہ عقد زینب و خالد سے تادم ممات زینب زید پدر زینب پرورش کنندہ زینب و خالد کا رہا، خالد کبھی کفیل نان ونفقہ نہ ہوا، حتی کہ تجہیز و تکفین بھی زینب کی زید پدر زینب نے کی، اس صورت میں ولی جائز ہندہ و حفصہ صبیہ زینب کا کون ہوگا؟

جواب ① اگر زید نے جائداد مذکورہ نج کے زرِ ثمن سے خرید کی تھی اور زینب کو اس کے نام کی جائداد پر قابض اور دخیل نہیں کیا تھا یا کیا تھا، لیکن ورثہ زینب کو جائداد مذکورہ کی خریداری کا بطورِ اسم فرضی ہونا تسلیم ہے تو اس صورت میں جائداد مذکورہ میں زینب کا کچھ حق نہیں ہے اور اگر جائداد مذکورہ زینب کے زرِ ثمن سے خرید کی تھی یا نج کے زرِ ثمن سے خرید کی تھی اور زینب کو اس پر قابض اور دخیل نہیں کر دیا تھا، لیکن ورثہ زینب اس کی خریداری بطورِ اسم فرضی تسلیم نہیں کرتے اور نہ ان کے مقابلے میں باضابطہ ثبوت اس کے باسم فرضی ہونے کا دیا گیا تو اس صورت میں جائداد مذکورہ میں زینب کا حق ہے اور وہ جائداد بعد ممات زینب کے زینب کا ترکہ ہے، جس کی تقسیم کا طریقہ سوال نمبر ② کے جواب میں مذکور ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ایک کارروائی جو باسم فرضی ہوتی ہے، وہ شرعاً ہزل کہلاتی ہے اور ہزل تین چیزوں (نکاح، طلاق، رجعت) میں شرعاً جد، یعنی سچ مچ کی کارروائی متصور ہوتی ہے:

«ثلاث جدھن جد، وھزلھن جد، النكاح و الطلاق و الرجعة»[1]

(أخرجه أبو داود و ابن ماجه والترمذي)

یعنی اگر کوئی شخص نکاح یا طلاق یا رجعت ہزلاً کرے تو وہ شرعاً سچ مچ کا نکاح یا طلاق یا رجعت سمجھا جائے گا۔

بیع یا ہبہ میں مثلاً ہزلاً کرے تو وہ ہزل ہی متصور ہوگا، سچ مچ کی بیع یا ہبہ متصور نہ ہوگا۔ پس صورت مذکورہ میں

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٣٩)

اگر ورثہ زینب اس خریداری کو بطورِ اسم فرضی تسلیم کر لیں تو ضرور ہزل ہی متصور ہوگی، ورنہ ہزل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جب تک کہ ان کے مقابلے میں باضابطہ ثبوت اس کے باسم فرضی ہونے کا نہ دیا جائے۔ واللّٰہ أعلم.

② ترکہ زینب (بعد تقديم ما تقدم على الإرث ورفع موانعه) تیرہ سہام پر تقسیم ہوگا، اس میں سے تین سہام شوہر (خالد) کو اور چار چار سہام ہر ایک دختران (ہندہ وحفصہ) کو اور دو سہام پدر (زید) کو ملے گا۔ واللّٰہ أعلم.

③ دینِ مہر زینب کا جو اس کے شوہر (خالد) کے ذمہ باقی ہے، وہ بھی زینب کا ترکہ ہے، جس کی تقسیم کا طریقہ وہی ہے، جو سوال نمبر ② کے جواب میں مذکور ہوا، یعنی تیرہ سہام پر تقسیم ہو کر اس میں سے تین سہام شوہر کو اور چار چار ہر ایک دختر کو اور دو سہام پدر کو ملے گا، اب دختران اور پدر چاہیں اپنا اپنا حق شوہر سے وصول کریں یا معاف کر دیں۔ واللّٰہ أعلم بالصواب.

④ اس صورت میں ولی جائز ہندہ اور حفصہ دختران زینب کا ان کا پدر (خالد) ہے۔ پدر کے رہتے ہوئے نانا ولی جائز نہیں ہے، اگرچہ بوجہ نہ ادا کرنے حق پرورش اولاد کے گنہگار قابل مواخذہ اخروی ہو اور نانا بوجہ اس حسن سلوک کے مثاب و ماجور ہو۔ واللّٰہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللّٰہ

بیوی، بیٹی، بہن اور چچا:

سوال ایک شخص فوت ہوا اور زوجہ اور بنت اور اخت لاب و ام اور عم کو حینِ حیات میں چھوڑا، چنانچہ ظاہر سیاق عصبات سے معلوم ہوتا ہے کہ عم عصبہ بنفسہٖ ہے اور اخت عصبہ مع غیرہ، پس عصبہ بنفسہٖ کو مقدم کیے ہیں مع غیرہ و بغیرہ پر اور ترجیح قرب درجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اخت عم سے اقرب ہے ازروئے قرب قرابت کے اور مستحق ارث بقیہ کی ہوتی ہے، اس مسئلے میں ہم لوگوں کو بہت خلجان پڑا ہے، خلاصہ طور پر جواب تحریر فرمائیں کہ حرمانی اخت کو ہے یا عم کو؟ اگر اخت کو ہے تو "یرجحون بقوة القرابة" سے کون کون مراد ہیں اور اگر عم محروم ہے تو اس کی محرومیت کی کیا دلیل ہے؟

جواب اس صورت میں محروم عم ہے، نہ کہ اخت۔ اخت کو بعد دینے حصہ زوجہ و بنت کے باقی ملے گا۔

لحديث: «اجعلوا الأخوات مع البنات عصبة»[1] انتهى على ما في السراجية، والله أعلم بالصواب

[اس حدیث کی بنا پر: "بہنوں کو بیٹوں کے ساتھ عصبہ بناؤ" جیسا کہ یہ سراجیہ میں درج ہے] کتبہ: محمد عبد اللّٰہ

عصبہ کی اقسام:

سوال جملہ کتبِ فقہ میں سلسلہ عصبیت کا قسم چہارم کا عم الجد تک قائم رکھا ہے تو اس سلسلے میں عم الجد میں میت کے سگے دادا کا چچا مراد ہے یا اور کوئی اوپر کا جد مراد ہے؟ اگر اوپر کا جد مراد ہے تو سلسلہ عصبیت عم الجد کی کے پشت تک اوپر جائے

[1] یہ حدیث نہیں، بلکہ بعض علما کا قول ہے۔ البتہ اس کا معنی صحیح ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٤) سنن الدارمي (٢/ ٤٤٦) سنن البيهقي (٦/ ٢٣٣) صحيح ابن حبان (١٣/ ٣٩٦)

گا؟ اگر سلسلہ عم الجد محدود نہیں تو عم حضرت آدم علیہ السلام کا لازم آتا ہے۔ علاوہ اس کے سلسلہ عصبیت لا یتناہی پایا جائے تو باب ذوی الارحام وغیرہ بے سود ہوجاتے ہیں کہ قبائلِ عرب و نیز ہندوستان وغیرہ میں شجرہ آدم علیہ السلام تک موجود ہیں، پس کسی وقت میں مسئلہ عصبیت کا زائل نہ ہوگا۔ امید ہے کہ مراتب کا جواب بحوالہ کتاب ارقام فرمائیں گے۔

جواب جواب سے پہلے امورِ ذیل کا جان لینا ضرور ہے۔

① عصبہ نسبیہ کی چار صنفیں ہیں: ① جزوِ میت یعنی ابن میت، ابن الابن میت، ابن ابن ابن المیت، علی ہذا القیاس جہاں تک سلسلہ نیچے کو چلا جائے۔ ② اصل میت یعنی اب میت۔ اب اب میت، اب اب اب میت، علی ہذا القیاس جہاں تک سلسلہ اوپر کو چلا جائے۔ ③ جزء اب میت یعنی اخ المیت لاب وام یا لاب فقط۔ ابن الاخ میت لابن وام یا لاب فقط۔ ابن ابن اخ المیت لاب وام یا لاب فقط وعلیٰ ہذا القیاس جہاں تک سلسلہ نیچے چلا جائے۔ ④ جزوِ جد میت یعنی عم لاب وام یا لاب فقط۔

② ان اصناف اربعہ میں یہ شرط ہے کہ ہر ایک ازقسم ذکور ہیں، نہ اناث اور یہ کہ بے واسطہ انثی کے میت کی طرف منسوب ہوں، جیسا کہ عصبہ بنفسہ کی تعریف "ذكر لا تدخل في نسبته إلى الميت أنثى" اس پر دال ہے۔

③ صنف چہارم میں جد سے جد صحیح (یعنی اب الاب یا اب اب الاب یا اب اب اب الاب، یعنی جس کی نسبت الی المیت میں انثی نہ داخل ہو) مراد ہے، نہ کہ جد فاسد، یعنی نانا، کیونکہ نانا خود ہی میت کی طرف بواسطہ انثی، یعنی ام کے منسوب ہے، تو جو شخص کہ بواسطہ نانا کے میت کی طرف منسوب ہو، وہ بھی بالضرور بواسطے انثی کے منسوب ہوگا اور جب وہ شخص بھی بواسطہ انثی کے منسوب ہوا تو عصبہ بنفسہ باقی نہ رہا تو یہ عصبہ بنفسہ کی کسی صنف میں کیونکر معدود ہوسکتا ہے؟

④ صنف چہارم میں عم سے عم عینی یا عم علاتی یعنی عم لاب وام یا لاب فقط مراد ہے، نہ کہ عم اخیافی، یعنی عم لام، کیونکہ عم اخیافی بھی میت کی طرف بواسطہ انثی، یعنی ام کے منسوب ہے۔

اب جواب سنیے:

عم الجد جو عصبہ بنفسہ کی صنف چہارم کے افراد میں سے ایک فرد ہے، اس میں بھی جد سے جد صحیح مراد ہے اور وہ بھی عام، یعنی خواہ میت کا باپ ہو یا میت کے باپ کا باپ ہو یا میت کے باپ کے باپ کا باپ ہو وعلی ہذا القیاس۔ جہاں تک سلسلہ اوپر کو جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام تک، یعنی حضرت آدم علیہ السلام بھی ہر شخص کے جد صحیح ہیں، باستثنائے حضرت مسیح علیہ السلام کے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو ان کے حق میں حضرت آدم علیہ السلام صرف جد فاسد ہی ہیں، نہ کہ جد صحیح، چونکہ عصبہ بنفسہ کی ہر ایک صنف میں اصناف اربعہ سے یہ شرط ہے کہ خود از قبیل ذکر ہو اور یہ کہ صرف انثی ہی کے واسطہ سے میت کی طرف منسوب نہ ہو اور عموماً ذوی الارحام میں یہ شرط مفقود ہے، یعنی ان کی کسی صنف میں یہ شرط نہیں پائی جاتی، کیونکہ ذوی الارحام از قبیل ذکور ہی نہیں ہیں یا ہیں تو انثی ہی کے واسطہ سے میت کی طرف منسوب ہیں، لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے کے مباین ہیں اور دونوں کے سلسلے الگ الگ جاتے ہیں، کوئی کسی سے ملتبس نہیں ہے اور نہ ایک کے

اعتبار سے دونوں کے باب کا مسدود ہونا لازم آتا ہے اور نہ ایک کا اعتبار دوسرے کے اعتبار سے مغنی ہے اور چونکہ کسی کتاب میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ہر جد کے لیے عم کا ہونا ضرور ہے، لہٰذا یہ شبہہ بھی ''کہ اگر سلسلہ عم الجد محدود نہیں تو عم حضرت آدم علیہ السلام کا لازم آتا ہے۔ وارد نہ ہوگا۔ واللہ أعلم بالصواب. کتبہ: محمد عبد اللہ

شوہر، بیٹی اور باپ:

سوال زید نے اپنی حیات میں کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ مع حق پدری مسماۃ حامدہ اپنی دختر کو دے کر بجائے اپنے اپنی لڑکی مذکورہ کو مالک کامل کل جائداد کا بہ اختیار مالکانہ کرا دیا، لیکن بتقدیرِ الٰہی مسماۃ حامدہ مذکورہ نے بحالت حیاتِ زید کے وفات پایا اور چھوڑا اس نے باپ، شوہر، دختر، اور بعد وفات کے باپ مذکور نے یہ کہا کہ اب بجائے دختر کے ہماری نواسی ہماری کل جائداد کی وارث و مالک ہے، مزید برآں انتظام بھی آج تک ویسا ہی چلا آتا ہے، جیسا کہ دختر (حامدہ) کی حیات میں تھا، پس جائداد مذکور الصدر کا شرعی وارث کون کون ہوگا اور ہر ایک وارث کا کس قدر حصہ ہوگا؟ بیان فرمایئے مطابق کتاب اللہ و کتاب رسول اللہ کے۔

جواب ترکہ مسماۃ حامدہ کا حسبِ فرمانِ الٰہی بارہ سہام پر منقسم ہوگا، جس میں سے نصف اعنی چھ سہام اُس کی بیٹی کو ملیں گے۔

کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ [النساء: ١١]

[اور اگر ایک عورت ہو تو اس کے لیے نصف ہے]

اور رُبع اعنی تین سہام شوہر کو، جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے:

﴿فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ﴾ [النساء: ١٢]

[پھر اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو تمھارے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے، جو انھوں نے چھوڑا]

بقیہ تین سہام باپ کو سدس من حیث فرضیت کے، جیسا کہ کلامِ خدائے علام میں وارد ہے:

﴿وَ لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ [النساء: ١١]

[اور اس کے ماں باپ کے لیے، ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے، جو اس نے چھوڑا، اگر اس کی کوئی اولاد ہو]

اور ایک باعتبار عصوبت کے:

«قال رسول اللہ ﷺ: ألحقوا الفرائض بأهلها، فما بقي فهو لأولىٰ رجل ذكر»[1] (رواه البخاري)

[رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مقررہ حصے ان کے مستحقین کو دو اور جو باقی بچے وہ (میت کے) قریب ترین مرد (رشتے دار) کا حصہ ہے]

اس موقع میں باپ ہی کا حسبِ ہبہ اس کے اس کی نواسی اعنی حامدہ کی بیٹی کو ملے گا تو اب میت کی بیٹی کو نو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٥)

سہام ملا، چھ بحسب ترکہ اور تین بحسب ہبہ، میت کو اس کے باپ کا اپنا حق پدری دینا کچھ نافع نہ ہوگا، کیونکہ وہ اس وقت وہ اس کا مستحق نہ تھا۔

کتبہ: أضعف عباد الرحمن محمد سلیمان، غفرله المنان. من أجاب فلقد أصاب نذير الدين حسين عفا الله عنه. الجواب صحيح. كتبه محمد عبد الله. الجواب كذلك وصيت علي، عفا الله عنه. المجيب مصيب. محمد أصغر، عفا الله عنه. الجواب صحيح. شيخ حسين بن محسن عرب.

تین بیویاں، ایک بیٹی اور ایک بھائی:

سوال چہ میفر مایند علماے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ شاہ محمد عبد الرزاق وفات فرمودند و از وارثان شرعی مسماۃ بی بی مسکین زوجہ و مسماۃ بی بی مہتاب زوجہ دوم و مسماۃ بی بی محمدی زوجہ سیوم، و یک دختر مسماۃ بی بی پیرن از بطن بی بی مسکین و یک برادر حقیقی مسمی شاہ عبدالکریم گزاشتند، پس چہ قدر حصص ہر یکے ازینہا گردیدہ و کدام محجوب الارث شدہ از حصص ہر یکے جداگانہ ممتاز فرمودہ آید۔ وکرسی نامہ ذیل میں مندرج ہے:

شاہ عبدالرزاق

بی بی مسکین زوجہ اولی بی بی مہتاب زوجہ ثانیہ بی بی محمدی زوجہ ثالثہ بی بی پیرن دختر شاہ محمد عبدالکریم برادر حقیقی

[سوال: علماے دین اور مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ شاہ محمد عبد الرزاق صاحب فوت ہوگئے ہیں اور ان کے شرعی وارثوں میں زوجہ اول مسکین بی بی، زوجہ دوم مہتاب بی بی، زوجہ سوم محمدی بی بی، مسکین بی بی کے بطن سے ایک بیٹی پیرن بی بی اور ایک حقیقی بھائی شاہ عبد الکریم ہیں۔ پس ان میں سے ہر ایک کو کتنا حصہ ملے گا؟ کون وراثت سے محروم ہوگا؟ ہر ایک کا حصہ الگ الگ بیان فرما دیں۔ کرسی نامہ ذیل میں مندرج ہے:

شاہ عبدالرزاق

بی بی مسکین زوجہ اولی بی بی مہتاب زوجہ ثانیہ بی بی محمدی زوجہ ثالثہ بی بی پیرن دختر شاہ محمد عبدالکریم برادر حقیقی]

جواب بعد تقدیم ما تقدم علی الارث و رفع موانعہ ترکہ شاہ محمد عبدالرزاق بر بست و چہار سہام انقسام یافتہ از انجملہ یک یک سہم بہر یکے از سہ زوجگان و دوازدہ سہام بدختر و باقی نہ سہام بہ برادر حقیقی میرسد۔ واللہ أعلم بالصواب.

[بعد تقدیم ما تقدم علی الارث و رفع موانعہ شاہ محمد عبدالرزاق کا ترکہ چوبیس (۲۴) حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک ایک حصہ تین بیویوں میں سے ہر ایک بیوی کا ہے، بارہ حصے بیٹی کے اور باقی کے نو (۹) حصے حقیقی بھائی کو ملیں گے]

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. محمد أصغر، عفا الله عنه. الجواب صحيح.

شيخ حسين بن محسن عرب. مہر مدرسہ احمدیہ

دو بیویاں اور دو بیٹے:

سوال زید کی دو زوجہ ایک مسماۃ رابعہ و ثانی مسماۃ ہندہ۔ مسماۃ رابعہ سے ایک پسر مسمی خالد اور مسماۃ ہندہ سے ایک پسر مسمی عمرو۔ زید نے بعد وفات مسماۃ رابعہ کے دوسری شادی مسماۃ ہندہ سے کی تھی اور مسمی خالد پسر زوجہ اولی اور مسماۃ ہندہ اور اس کے پسر عمرو کو وارث چھوڑ کر مر گیا اور زید متوفی کے متروکہ پر خالد و عمرو قابض ہیں۔ مسماۃ ہندہ بدعویٰ حق زوجیت، یعنی ہشمی حصے کی خالد اور عمرو سے دعویٰ دار ہے۔ پس ایسی صورت میں دعویٰ ہندہ کا دونوں۔ یعنی خالد و عمرو سے متعلق ہے یا صرف اس کے پسر صلبی عمرو سے متعلق ہے اور ایک موضع زید نے اپنی حیات میں بنام خالد و عمرو قبالہ لیا جس پر ہر دو پسران قابض و دخیل ہیں، پس اس موضع میں اور دیگر متروکہ متوفی میں کوئی حق زوجیت ہے یا نہیں یا صرف حصہ عمرو صلبی ہیں؟ المستفتی. محمد عثمان، عفي عنه

جواب اس صورت میں (بعد تقديم ما تقدم على الارث ورفع موانعه) ہندہ کا حق زوجیت زید متوفی کے کل متروکہ میں ہوتا ہے، خواہ وہ متروکہ از قسم اموال غیر منقولہ (زمین، حویلی، باغ وغیرہ) ہو یا از قسم اموال منقولہ ہو، اور ہندہ کا دعویٰ زید کے کل متروکہ مذکورہ بالا سے متعلق ہے، اس متروکہ پر جو شخص قابض ہو، اس پر ہندہ اپنے حق کا دعویٰ کر سکتی ہے، چونکہ خالد و عمرو دونوں اپنے متروکہ زید پر قابض ہیں، لہٰذا ہندہ کا دعویٰ دونوں پر ہو سکتا ہے۔ والله أعلم بالصواب.

كتبه: محمد عبد الله. الجواب صحيح. كتبه: محمد عبد الرحمن المباركفوري، عفي عنه. الجواب صحيح. والله أعلم بالصواب. حرره راجي رحمة الله: أبو الهدى سلامت الله المباركفوري، عفا الله عنه.

دو لڑکے، تین لڑکیاں اور ایک بیوی:

سوال زید کے ذمہ ایک مہاجن کا قرض دینا تھا۔ مہاجن نے زید پر اپنے قرض کے بارہ میں نالش دائر کر کے ڈگری حاصل کر لی اور نصف جائداد زید کی نیلام کرائی اور نصف زید کی ہمشیروں کے لیے چھوڑ دی، اس عرصے میں زید کا انتقال ہو گیا۔ زید نے اپنی تین لڑکیاں ایک بالغ دو نابالغ ایک لڑکا نابالغ ایک بیوی وارث چھوڑے۔ زید کے لڑکے اور زید کے بہنوئی اور بھانجوں نے مہاجن کو زید کی جائداد نیلام شدہ پر دخل نہیں ہونے دیا۔ کچھ عرصہ بعد مہاجن کی دکان نقصان میں آ کر دوالا نکل گیا اور وہ مہاجن بھی فوت ہو گیا۔ جب زید کا لڑکا بالغ ہوا تو اس نے مہاجن کے قرض کے متعلق جو اس کا حق تھا، مہاجن کے وارثوں سے معاف کرا لیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اب جو جائداد زید متوفی کی ہے، وہ اس کے ورثاء لڑکے لڑکیوں زوجہ کو ملے گی یا زید کے بہنوئی اور بھانجوں کو، جنھوں نے مہاجن کو زید کی جائداد پر دخل نہیں ہونے دیا؟

جواب اس صورت میں وہ جائداد جو زید متوفی کی تھی زید کے ورثہ (لڑکے لڑکیوں زوجہ) کو ملے گی نہ کہ زید کے بہنوئی اور بھانجے کو، اس لیے کہ مہاجن کے وارثوں سے حق معاف کرا لینے کے بعد وہ جائداد زید کے وارثوں کی طرف عود کر آئی۔ والله تعالیٰ أعلم. (۲۶ محرم ۱۳۲۷ھ)



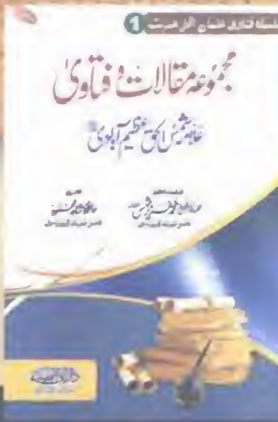
مجموعہ علوم القرآن



مجموعہ رسائل عقیدہ
نواب سید محمد صدیق حسن خان

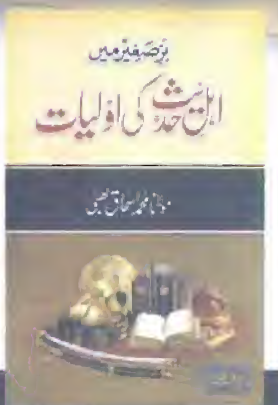


تاریخ وتعارف
دار الحدیث رحمانیہ دہلی



مجموعہ مقالات وفتاویٰ
علامہ شمس الحق عظیم آبادی





برصغیر میں
اہل حدیث کی اولیات
مولانا محمد اسحاق بھٹی